إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ

[illegible] کتب جمعیت خدام عزا کی جس نے [illegible] بلا قیمت [illegible]

- جنگ آزادی کی تباہ کاریاں، حب وطن میں تن من دھن کی بازی لگانے والوں کی دست بدست جنگ
- وطن دشمن عناصر کے کرتوت، عروس اودھ کے رنگین نظارے، تحقیقات کی حشر سامانی
- شعرا کے تبسم، عوام کے قہقہے "تیرھویں صدی" کے لکھنؤ نے جو نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے یعنی

=۱=۱

تاریخ لکھنؤ

(مع تصاویر)

*

[illegible]

مصنف

زبدۃ العلماء سید آغا مہدی مدظلہ العالی

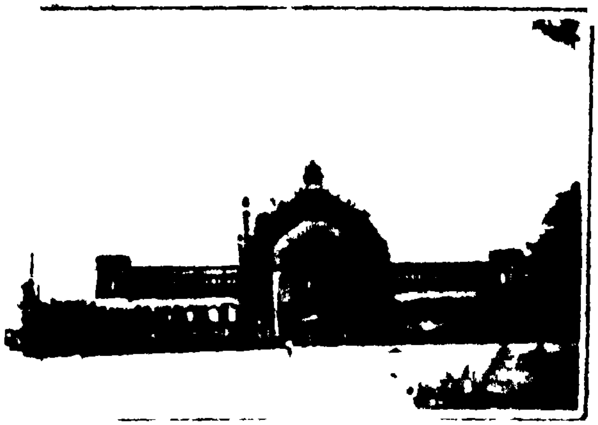
(سابق مدیر الواعظ، مجلہ فکریہ اسلامیہ لکھنؤ)

*

ناشر

جمعیت خدام عزا

"النجف" اے ۱۷/۱۴۲ فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۳۸



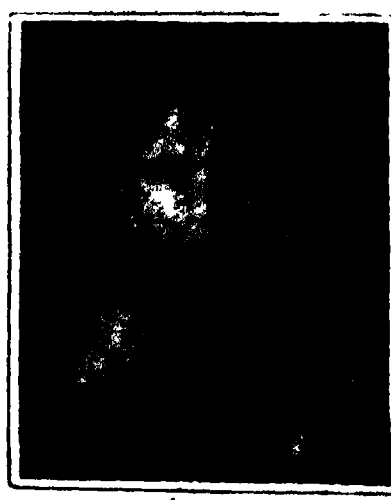
رومی دروازہ (امامباڑہ آصفی) کا پھاٹک



عہد آصفی کی مشہور "مسجد تحسین" چوک میں عظیم الشان عمارت



کربلا حاجی مسیتا



سید احمد نقوی (سیکریٹری ادارہ)

جملہ حقوق محفوظ

مصنف ـــــ زبدۃ العلماء سید آغا مہدی

ناشر ـــــ سید احمد نقوی (سیکریٹری ادارہ)

تعداد ـــــ ایک ہزار

سن طبع ـــــ ستمبر ۱۹۷۶ء

ضخامت ـــــ ۴ صفحات

مطبوعہ ـــــ کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ کراچی

کتابت ـــــ مرکز کتابت ۲۰/۴۳۸ فیڈرل بی ایریا

طباعت ـــــ پہلی بار

قیمت ـــــ صرف بیس (۲۰) روپے علاوہ مح

ملنے کا پتہ:

جمعیت خدام عزا

البحر ۱۷/۲/۴ فیڈرل بی ایریا کراچی

(پاکستان)

فہرست مضامین

وراثت زبان یا محلہ کے نام مع جن شعراء کے ابیات شاہد میں پیش کئے ہیں اُن کے اسماء

نمبر	نام	نمبر	نام
[illegible]	مجمر	۹۳	حکیم
[illegible]	ختیم	۹۴	کیوان
۶۸	مرد	۹۵	گویا
[illegible]	طریقت	۹۶	لطافت
[illegible]	مجرور	۹۷	ماہر
[illegible]	عاشق	۹۸	مانوس
۷۲	ماکول	۹۹	محشر
۷۳	ماتم	۱۰۰	مشیر
۷۴	مرتعش	۱۱	معنی
۷۵	مرقع	۱۰۲	معنی میرواں
۷۶	مشرعہ	۱۳	منیر
۷۷	عزیز	۱۰۴	مہر
۷۸	عشق	۱۰۵	مونس
۷۹	علی حسن	۱۰۶	میر
۸۰	عیش	۱۰۷	ناسخ
۸۱	کالک	۱۰۸	ناصری
۸۲	غافل	۱۰۹	نصرت
۸۳	فاخر	۱۱	نفیس
۸۴	فصاحت	۱۱۱	وحید
۸۵	نیرح	۱۱۲	وزیر
۸۶	فہم	۱۱۳	طاقت
۸۷	قبول	۱۱۴	واثق
۸۸	قتیل	۱۱۵	ہوس
۸۹	قدیر	۱۱۶	ہدایت
۹۰	قمر جم		
۹۱	قلق		
۹۲	کیاق		

پیرانِ طریقت اور عہد رفتہ کے درویش و فقراء

نمبر	نام	نمبر	نام	نمبر	نام
۱	ابراہیم چشتیؒ	۱۴	ڈنکا شاہؒ	۲۵	شاہ عنایتؒ
۲	احمد کبیرؒ	۱۵	رکن الدینؒ	۲۶	گلشن علیؒ
۳	احمد اللہ شاہؒ	۱۶	شیخ سار محمدؒ	۲۷	میاں عطاء الدینؒ
۴	بودلی شاہؒ	۱۷	سعد اللہ	۲۸	قیام الدینؒ
۵	مبارک شاہؒ		کمروریؒ	۲۹	قادر علی شاہؒ
۶	پیر بخاریؒ	۱۸	شیر خان	۳	کوکا پیرؒ
۷	پارس شاہؒ	۱۹	شاہ چھڑاؒ	۳۱	کلیم اللہ شاہؒ
۸	جھنڈے شاہؒ	۲	شاہ صلاحؒ	۳۲	شاہ دبیر محمد
۹	پیر جلیلؒ	۲۱	شاہ مسیؒ	۳۳	سید محمود کا اجمال
۱	حاجی الحرمینؒ	۲۲	طاہر پیرؒ	۳۴	شاہ میاںؒ
۱۱	احمد اللہ شاہؒ	۲۳	شاہ عبدالجلیلؒ	۳۵	شاہ وحدتؒ
۱۲	خادم علی شاہؒ	۲۴	شاہ		
۱۳	دوست محمد		عبدالرحمٰنؒ		

مطابع

نمبر	نام	نمبر	نام	نمبر	نام
۱	اثنا عشری	۹	حسینی مطبع	۱۸	محمدی
	پریس	۱	حیدری	۱۹	مرتضوی
۲	آئینہ حق نما	۱۱	مطبع یحیائی	۲	مصطفائی
	پریس	۱۲	سلطانی	۲۱	مظہر العلوم
۳	اصغری	۱۳	شگوفہ	۲۲	مولائی
۴	اسدی		گلزار اودھ	۲۳	نولکشور
۵	تصویر عالم	۱۴	علوی	۲۴	ولی محمد
۶	تمنائی پریس	۱۵	قاسمی		
۷	جعفری	۱۶	کارنامہ		
۸	چشمہ فیض	۱۷	کنز العلوم		

اخبارات

۱	اخبار الاخیار	۶	حق اودھ	۱۱	اودھ گزٹ	۱۶	تحریک	۲۱	طلسم
۲	آ ق ہند	۷	صبح الاخبار	۱۲	اودھ پنچ	۱۷	ریاض الاخبار	۲۲	مخبر صادق
۳	تار العصر	۸	امامیہ گزٹ	۱۳	بوستان ہند	۱۸	سحر سامری	۲۳	مہر ظرافت
۴	اخبار جلیل	۹	رامیہ	۱۴	بوستان الخیر	۱۹	شمس الاخبار	۲۴	ہند
۵	الحکم		مدد اخبار	۵	تہذیب الاخبار	۲	صحیفہ	۲۵	ہندوستانی

لکھنؤ کی نامور خواتین

۱	آتو جی	۱۳	پیارو	۲۴	خدیجہ بیگم	۳۵	شہزادہ بیگم	۴۵	لاڈو خانم
۲	اعاگر	۱۴	پنڈتائن	۲۵	دوامر	۳۶	عالم آرا بیگم	۴۶	لطف النساء
۳	اختر محل	۱۵	تاج آرا بیگم	۲۶	خورشید	۳۷	عسکری بیگم	۴۷	مبارک محل
۴	اشرف النساء	۱۶	جعفری بیگم		رمانی بیگم		ستیا	۴۸	مجلسی بیگم
۵	افسر بہو	۱۷	چھوٹی شاہزادی	۲۷	دھنیا مہری	۳۸	فرخندہ محل	۴۹	مرشد زادی
۶	امۃ الزہرا	۱۸	چودھرائن	۲۸	رکھی	۳۹	قدسیہ بیگم	۵	معشوق محل
۷	امیر محل	۱۹	حاجی بیگم	۲۹	راحت السلطان	۴	قطبن	۵۱	مصری
۸	بادشاہ محل	۲۰	حسینی ناصری	۱	تندہ نوم	۴۱	کیسرن	۵۲	ملکہ جہاں
۹	بی بی	۲۰	حضرت محل	۳۱	رنگ محل	۴۲	گوڑسے	۵۳	ملکہ زمانی
۱	بی مصری	۲۲	حیدر جان	۳۰	سلطان دلہن		دانی بیگم	۵۴	ملکہ کشور
۱۰	کھولا کھٹیارکا	۲۳	سیدہ خانم	۳۳	سہانی بی بی	۴۳	لکھدن بیگم	۵۵	ملکہ عہد
۱۲	سرو بیگم	۲۳	خانم نواب	۳۴	سمندر	۴۴	گوہر بیگم	۵۶	محل ماہ
								۵۷	ممتاز محل
								۵۸	نامان محل
								۵۹	نوری بیگم

۴۳ ویں کتاب

بحمد اللہ ہر آن چیز کہ خاطر میخواست — آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

ادارہ بھارت میں جو نشریات چھوڑ کر پردیس کی کشش میں یہاں آیا اور یہاں حرکت سے زمین ہموار کی۔ [illegible] کے بعد دوسرا اقدام کیا اور وقت تاریخ لکھنؤ پیش کرنے کی آرزو جس کو دارالاثار کا درجہ حاصل اور دل [illegible] دم کہنا صحیح ہے کراچی ایسے عظیم شہر میں جو نو حوالوں کے لئے حوادث کا مرکز ہے یہ جانیکہ بڑھاپے کی [illegible] پر پہونچکر خانہ نشین مصنف کا برسوں دھن گرد و پیش کے ناسازگار حالات میں کام کرتا رہا فضل رب [illegible] ہی تو وہ ہے جس نے ادارہ کی آخری پیش کش لکھنؤ سے متعلق عالم جتری سن ۱۹۶ء میں شائع کرکے [illegible] میں بھی دم نہ لیا۔ دنیا گواہ ہے کہ صحت دم میں قلم چلتا رہا اور تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کی تعداد [illegible] ہے تاریخ لکھنؤ ماضی بعید کی صحیح عکاسی ہے۔ عروس ادب کے رنگین لٹاریے، تحقیقات کی حشر سامانی، شعراء [illegible] رشحۂ افکار، علماء کے تبحر مطالعے کا نتیجہ ہوں تو کہیں جنگ آزادی کی تباہ کاری، حب وطن میں [illegible] بازی لگانے والوں کی دست بدست لڑائی، وطن دشمن عناصر کے کرتوت، اسلاف کے نو لودہ خصوصیات [illegible] کی وجہ سے ہر مذہب و ملت کے لوگ چشم براہ ہیں۔

مصنف کے اصل نسخے میں انڈکس اسی تقطیع پر ۲۰ صفحات میں ہے اور بجائے خود ایک کتاب ہے۔ ۳۰ علماء اسلام، ۳۰ علماء شیعہ اثنا عشریہ، ۱۲ مشاہیر، ۷ شخصیات، ۶ ہندو مسلم ملیدیا یہ خواتین کا ذکر ہے مندر اور گرجا [illegible] دا۔ عہد نوابی و شاہی کے تمام آثار قدیمہ کے تعاویر، مسجدیں، کربلائیں، امام باڑے کوئی مقدس عمارت [illegible] جس پر قلم نہ اٹھایا ہو۔ صرف اہم ترین عنوانات کی فہرست درج ہو سکی ہے۔ شیعت ایزدی پر ہر مہاجر [illegible] کچھ ایسے ہیں جن کی زبان پر یہ شعر ہے ؎

مرغ جاں کو قفس تن سے رہائی ہوتی — لیکن اس جان جہاں سے نہ جدائی ہوتی

الحاج سید منظور امام زیدی (صدر شعبہ نشر و اشاعت)

۲ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ



مصنف

زبدۃ العلماء

جناب سید آقا مہدی صاحب قبلہ لکھنوی

تاریخ لکھنؤ



مصنف

زبدۃ العلماء

جناب سید آغا مہدی صاحب قبلہ لکھنوی

مغفرت جو وجسا پہ باراں ہو رہے عفراں مآب
۱۳۹۶ھ
(حضرت رئیس امروہوی)





آیۃ اللہ حضرت مولانا
سید دلدار علی صاحب قبلہ غفراں مآب مجتہد اول رحمۃ

(ومد حضرت زینبؑ زینبیہ)





سید غلام قنبر صاحب نقوی امروہوی ۱۸ سال سے
ادارہ سے وابستہ ہیں اور قابل قدر خدمات دیانت سے
انجام دے رہے ہیں ان کے پُرخلوص تعاون پر مسرت کے
ساتھ رکن جمیعت قرار دیا ہے۔
(ادارہ)

پاکستان اور لکھنؤ

مجھے تو ہے خطۂ مجنوں دہلی   لطراپی ایی لپ ای ای

تاریخ لکھنؤ بھارت میں سر دقلم ہوئی ور شاعت کا ارادہ لکھنؤ ہی میں تھا اس لئے عنوان بالا پر قلم اٹھانے کی
اس مصلحت بھارے

ہوا ایسی ۔ آپ ایسے   کھلے کیسے گلاب اپنا

اس عد کا الاکھ لاکھ شکر جس نے ہجرت کے سولہویں برس مجھے کا دن دکھایا اور اظہار حقیقت میں قلم آزاد ہے ۔ کتاب
شروع سے پہلے اس بود تیں کیجئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ پہلا جلسہ جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت تقسیم ملک کا
سمجھوتہ مرادہ لکھنؤ کی قرارداد تھی اور تحریک آزادی کا ہر سپاہی روح محمود آباد ۔ ان ہستی ازلی پر آگے بڑھا چودھری خلیق الزماں
مولوی عبدالباری قدس سرہٗ جو میرے مدرسہ معقولات کے استاد تھے اور مولوی سید ابن حسن جارچوی کے اقدام ریاست محمود آباد
کے سارے ہی ہوئے تلک پیلس اور محمود آباد ہاؤس جدید اور قدیم عمارتوں میں آزادی کے سو خواب دیکھے گئے تھے اس کی تعبیر ملی'
بس حقیقت کی اسٹیٹ سے آبیاری ہوئی ریاست محمود آباد اور ملہرہ کا خزانہ کھلا دل اور اسٹیٹ کے مورث اعلیٰ انگریزوں میں
باغی قرار پاچکے تھے ان کی عظیم جدوجہد سے نسل میں جو بیج بویا تھا وہ رنگ لانے والے پودے کی شکل میں نمودار ہوا اور شہر کی
دیوار پر اشتہار نظر آئے ۔

> آل انڈیا مسلم لیگ کے میر مجلس کا استقبال
>
> مسٹر محمد علی جناح
>
> جو امسال آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے پریسیڈنٹ ہیں ۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء بوقت ۹ بجے صبح
> کا پور کی سمت سے چارباغ اسٹیشن لکھنؤ پہونچیں گے تمام باشندگان شہر بالخصوص مسلمانان لکھنؤ سے
> استدعا ہے کہ پریسیڈنٹ موصوف کے استقبال میں وقت اور مقام معینہ پر شرکت فرمائیں ۔
>
> سید نبی اللہ چیرمین کمیٹی استقبالیہ ۔ سید وزیر حسن آنریری سکریٹری

سید احمد شہید کے دیس رائے بریلی کے میر واجد علی وکیل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس خاندان اجتہاد سے علامہ
ہندیؒ حکیم سید علی آشفتہ وفات ۱۹۶۲ء جیل گئے کھدر پوشی نے ولایتی کپڑوں کو آگ لگادی خطابات واپس ہوئے [illegible]
[illegible] کر لکھنؤ سے ہفت روزہ پاکستان جاری ہوا اس کے سرورق کا عکس روزنامہ جنگ کراچی آزادی نمبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا [illegible]

مطالبات کا نقیب تھا جو ارہ ہو جانے پر [illegible] میں جا بکا، کئت دو دن ہوئے مگر لکھنؤ خونریزی سے بچا رہا، یہ باشندگان شہر کی [illegible] اور ہندو مسلم اتحاد کا وہ اعلیٰ نمونہ تھا جس کی نظیر ملک بھر میں نہ تھی۔

ڈاکٹر جعفر حسین اور یوسف حسین خاں پر شائع کرنے کے بعد پہچانا تو تعجب نہ تھا۔ عراق کی پہلی زیارت میں میں نے وہاں کے بازاروں پر "مصنوعات وطنیہ کے بورڈ دیکھے" "دیس کا کپڑا" اور یہ معلوم کر کے میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ سرکار آغا سید ابوالحسن اصفہانی اعلی اللہ مقامہ نے [illegible] کی ملت میں نئے حق کا رد یہ مخلصین سے یہ ہو کہ ہم تمہارے یہاں آئیں تو کیا کھلاؤ گے اور تم آؤ تو ہمارے لئے کیا لاؤ گے۔ وہ فرمائش کو جرم سمجھتے مگر بھارت کے کسی رئیس کے اصرار پر کہ حضور مجھ سے کچھ فرمائش کریں جناب نے کھدر کی فرمائش کی۔

قاسم رضوی جس نے ۱۹۴۸ء کے بعد مظالم دیکھ کر دکن میں رضاکار تیار کئے اور مملکت نظام میں بیداری کی لہر دوڑا دی[1] وہ فرنگی محل لکھنؤ کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔

وہ لکھنؤ جہاں اگلے لوگوں کو کم از کم سات پارچے[2] کا خلعت ملتا تھا اسی روشنی میں وہاں کے لیڈر فقط کرتہ پہنے نظر آئے اور پرانی تہذیب کا مجھ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ ٹھیک ہے تو میں اُس تہذیب کا دلدادہ ہوتے ہوئے کہتا کہ مہاجن سے روپیہ قرض لے کر کشمیر والی شال خریدنے یا کلاتھ مرچنٹ کو ادھار کا تقاضہ سننے سے بے خوف ہو کر ٹھاٹھ سے بہتر یہ ہے کہ اسی گاڑھی مشقت کا صرف کرتہ جسم میں ہو رزمگاہ صفین میں مولا کرتہ پہنے ہوئے تھے اور کربلا میں قاسم نوشہ کے جسم پر قمیص ہے۔

دنیا تقطیع کی جس شہر پر دور دور سے نگاہ پڑتی اس کی تاریخ مرتب کر چکا ہے شکراً للمنعم سرزمین وطن پر آباد ہوں سورج کی پہلی کرن سے لے کر غروب آفتاب تک کے کوائف آپ کو ملیں گے اور مامی لعید کے جن اسلاف پر قلم اٹھایا ہے ان کی شخصیت پرکشش تھی ارباب ادب کے لطیفے اگر آپ نے پڑھ لئے تو مسرت و انبساط کا دعوال سامنے آئے گا۔ طبیعت میں زندہ دلی پیدا نہ ہو تو ہم اپنا نام بدل دیں۔ برصغیر کے سرخیل صوفیائے کرام کے حالات لکھی ہیں تمام اودھ کے شبستان عیش و عشرت کی تصویر کشی بھی کی ہے اور چنگ و رباب کی صداؤں میں وہ کیف نہ ہوگا جو ادبا کے جملوں میں۔ بیگمات کی حاضر جوابی سنکر حاصل ہوگا۔ آپ یہ بھی معلوم کریں گے کہ معاشرے میں عورتوں کا مقام اب نہیں جب ملتا تھا جب وہ مسند نشین تھی فاہم و تدبر۔

حریت کے دلدادہ اور آزادی کے علمبردار برطانوی استعماریت کے پول کھولنے پر یقیناً خوش ہوں گے اور کوئی کہی کہ کتاب کے مطالعے سے ناظر شعلہ بیان مقرر بن جائے۔ یاد رکھئے کتاب کا موضوع سلاطین اودھ کی لائف نہیں ہے۔ ان کے بسائے ہوئے شہر کا تعارف مقصود ہے ادبی محفلیں شعر و سخن کی صحبتیں مظاہرہ کمالات کے موقف مٹی ہوئی تصویریں ابھر نہ آئیں تو ہمارا ذمہ مذہبی اقدار کا تحفظ کسی باب میں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور پرانے اقدار کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اسلاف جو شاعر نہ تھے ان کی نثر اپنے رنگ میں البیلی پائیں گے۔

میرے ۴۲ مطبوعات میں جو موٹی موٹی کتابیں ہیں ان کے تصنیف کی مدت اگر بتاؤں تو ممکن ہے کچھ لوگ باور کریں [illegible] صدی کا لکھنؤ جو تاریخ لکھنؤ ہے برسہا برس کی ریاضت بے پایاں کوشش کا شاہکار ہے اور بغیر کسی سرمائے

---

[1] [illegible] [2] دستار، رومال، کامدار چکن جبری، کرتہ، ازارجامہ، موزہ، دستانہ

کے چھپنے میں جو عرق ریزی ہوئی اس کو نہ پوچھو دانتوں پسینہ آگیا اور یہ کہنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے طباعت میں تعاون کیا وہ رسمی شکریہ سے برتر ہیں۔

میری محنت بلکہ عرق ریزی کا صلہ تو وہی دے گا جس کے بندوں کو پیش کیا اور ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور خوبیوں کو ضبط تحریر میں لایا ہوں مخلوق سے خالق پہچانا جاتا ہے۔ اثر سے مؤثر کا پتہ چلتا ہے تو یہ نقوش قدرت خدا ہیں طول کے ڈر سے کہیں کہیں کمی کی ہے۔ تصحیح کے وقت جو اضافے ذہن میں آئے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ تصاویر سب مگر نہیں پا سکیں قیصر باغ میں انگریزوں کا دور شروع ہونے پر تا حال جو تغیرات ہوئے اس کو نظر انداز کیا ہے۔

صوفیائے کرام میں آپ کو وہ نام اپنے اپنے علاقے میں نظر آئیں گے جن میں کچھ تو یقیناً روحانی پیکر تھے مگر علمائے فرنگی محل اور خاندان اجتہاد کے مرجع خلق ہادیان دین نے تہذیب لکھنؤ بہ حقی کہ ان کو باستثنائے بعض مرکزیت نہ دی اور تجدیت کی وبا بھی پھیلنے نہ دی حتیٰ کہ ایک طبقہ وہ ہے جس کی قبر کا بھی پتہ نہیں صرف نام باقی ہے اور بہت کم وہ مزار ہیں جہاں شاذ و نادر قوالی ہوتی ہے۔ دفینوں کا تو ہم نے نام بھی نہ سنا تھا میں صحیح معنوں میں بزرگان دین کے خدمات کا نشر اپنا اسلامی فرض سمجھتا ہوں اور روحانی افراد کے نام مٹنے پر رنجیدہ ہوں ہمارا اور ہر مسلم کا مسلک صراط مستقیم سیدھا راستہ ہے اور شفاعت کا حق صرف مصطفیٰ خاندان کو حاصل ہے۔

معزز ہمعصر کوثر نیازی سے

حشر میں ساقی کوثر کی سواری پہنچی — ہر طرف شور اٹھا شافع عصیاں آیا

مشاہیر ملت اور جانے پہچانے ہوئے اہل قلم کا تاثر

میں خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ قوم میرے گوشہ نشیں ہو جانے پر فقیر خانہ پر قدر کرتی ہے اور اشاعت سے پہلے لکھے ہوئے صفحات سنانے والے مسلسل مل رہے ہیں اور بیرون ملک سے بھی صدائے تحسین و آفریں بلند ہے دامن قرطاس تنگ ہونے سے میں صرف پرانے دوست مولوی محمد ایوب صاحب قادری بدایونی ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر اردو کالج کراچی جن کو ادارت [illegible] کے وقت سے جانتا ہوں ان کا گراں قدر عطیہ بصد مسرت پیش کرتا ہوں جو اس تاریخ اور سادات کے خدمات سے بھی زبردست تعارف ہے[1]

آغا مہدی خلف مولانا سید محمد تقی آل غفراں مآب

۳۰ مئی ۱۹۷۰ء

---

[1] روزنامہ جنگ کراچی یکم ستمبر ۱۹۷۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الکبیر القدیر
۱۳۹۶

۱۔ کامیاب تاریخ لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۲۔ تاریخ ناصیۂ لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۳۔ جمال تاریخ لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۴۔ تاریخ پاکان لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۵۔ تاریخ جمال لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۶۔ تاریخ باب مسعود ۱۳۹۶ھ
۷۔ تاریخ اقبال دوام ۱۳۹۶ھ
۸۔ تاریخ احباب صفا ۱۳۹۶ھ
۹۔ تاریخ القدیم ۱۳۹۶ھ
۱۰۔ تاریخ وادی قدس ۱۳۹۶ھ
۱۱۔ تاریخ قدوسیہ ۱۳۹۶ھ

* * * * * * *

۱۔ تاریخ ندرت لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۲۔ تاریخ صحبت قدیم لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۳۔ تاریخ مشہور زمانہ لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۴۔ تاریخ گلشن مطہر لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۵۔ تاریخ مطلع شہر لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۶۔ تاریخ شمع دانش ۱۹۷۶ء
۷۔ تاریخ جاہ و رفعت ۱۹۷۶ء
۸۔ تاریخ شہر بزم طرب ۱۹۷۶ء

۹۔ تاریخ شہر نادرہ ۱۹۷۶ء
۱۰۔ تاریخ شہر ماہ • یہ علم ۱۹۷۶ء
۱۱۔ تاریخ شہر ریب ارم ۱۹۷۶ء
۱۲۔ تاریخ شہر جامع علوم ۱۹۷۶ء

* * * * *

۱۔ مؤلفہ حکیم زمن آغا مہدی ۱۳۹۶ھ
۲۔ مؤلفہ فرید عصر آغا مہدی لکھنوی ۱۳۹۶ھ
۳۔ مؤلفہ یگانۂ دہر مولانا سید آغا مہدی صاحب لکھنوی ۱۹۷۶ء
۴۔ زبدۃ العلماء علامہ سید آغا مہدی صاحب لکھنوی ۱۹۷۶ء
۵۔ مورخ اہل دل آغا مہدی ۱۹۷۶ء

* * * * *

۱۔ قدیم جمعیت خدام عزا ۱۳۹۶ھ
۲۔ سادی جمعیت خدام عزا مصورہ کراچی ۱۹۷۶ء
۳۔ احوال جمعیت خدام عزا کراچی نمبر ۳ ۱۹۷۶ء

* * * * *

۱۔ منشی دل افگار محمد ایوب قادری کراچی ۱۳۹۶ھ
۲۔ پیش کردہ فکر لطیف۔ محمد ایوب قادری ۱۳۹۶ھ
۳۔ رقم آثم ملا زادہ محمد ایوب قادری ۱۳۹۶ھ
۴۔ ہدیۂ نو، از راقم آثم محمد ایوب قادری ۱۳۹۶ھ

* * * * * *

۱ یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ آیۂ کریمہ کے ۷۸۶ عدد ہیں یا ۷۸۷، اس موضوع پر تحقیق باسم اللہ مرزا محمد شاہ عالم مرحوم لکھنوی کی کتاب پہلی مرتبہ ... طبع سے آراستہ ہوئی نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء کا ایڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہے محمد الاسلام صاحب ندیم رحمۃ اللہ نے ... اس خدمت دین کو استحسان سے دیکھا ہے۔

وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کا گرامی نامہ

---

70 Clifton
Karachi

?-2-71

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قطعہ تاریخ

سنہ طبع

عمدۃ الحکما واحد یادگار خانوادہ کامل حکیم سید حیدر نواب یدی لکھنو

ہے سرگذشتِ علم و کمالاتِ آگہی — ماضی کی داستاں ہے تاریخ لکھنؤ

اہلِ نظر کا قول ہے حیدر کا ہے خیال — اک مستند بیان ہے تاریخ لکھنؤ

۱۹۷۶ء

مصنف کے مراسلات پر ہمبرگ سے ہدیۂ تبریک

Herzliche Glückwünsche

Zum Neuen Jahr 1342

Frühlingsanfang

Am Donnerstag, den 21. März 1963

um 9.20 Uhr MEZ

ISLAMISCH-IRANISCHE GEMEINDE IN HAMBURG E.V.

Hamburg 13, Isestr. 13

M. MOHAGHEGHI

مبارک‌ترین تبریکات بمناسبت آغاز سال نو تقدیم و امیدواریم

هر روز را با خوشی و سعادت سر بریم

ساعت تحویل سال ۱۳۴۲ بوقت اروپای مرکزی:

۹ و بیست دقیقه صبح، روز پنجشنبه ۲۱ مارس ۱۹۶۳

روزهای پنجشنبه اول و جمعه دوم فروردین در محل جمعیت برای

پذیرش دوستان منتظر خواهیم بود

جمعیت اسلامی ایرانیان، هامبورگ

محمد محققی

مولوی محمد رضا فرنگی محلی مدیر قومی آواز لکھنؤ کے کلمات استحسان

[illegible]

[illegible]

گرامی تسلیم۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

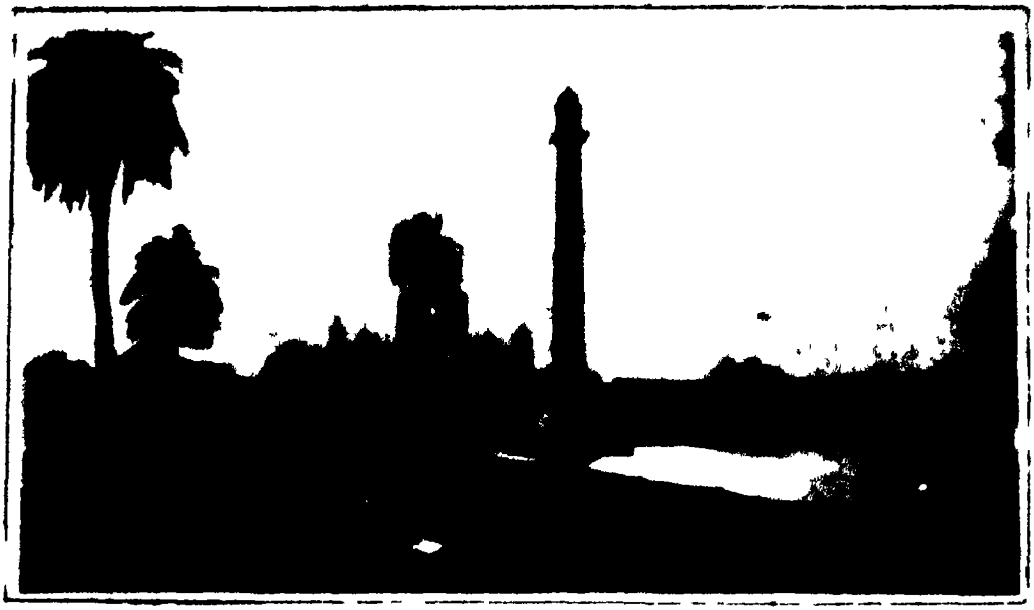
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مخلص محمد رضا [illegible]



لامارٹینیر کالج

قطعہ تاریخ کتاب تاریخ لکھنؤ

حلیف اہلبیتؑ سید سعید جاوید جعفری ایم ایس سی

نگاہ میں بہ ہوا کون یہ منظرِ لکھنؤ
تمہید شاہد و مشہود و مقصدِ لکھنؤ

نقیش و حازن و زین اور زبدۃ العلماء
سعید سعد و مسعود و مقصدِ لکھنؤ

ہوا + کون + ے + منظر + لکھنؤ = ۱۳۹۶ھ
نقیش + حازن + زین + اور زبدۃ العلماء = ۱۹۷۶ء
ۃ + زین + او = ۸۰ سال عمر تربیت مؤلف مدظلہ العالی حضرت مولانا آغا مہدی لکھنوی

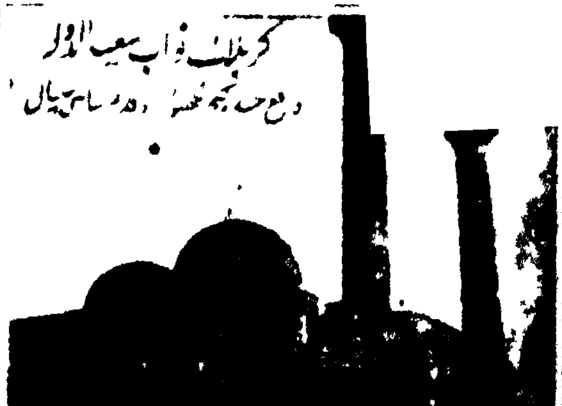


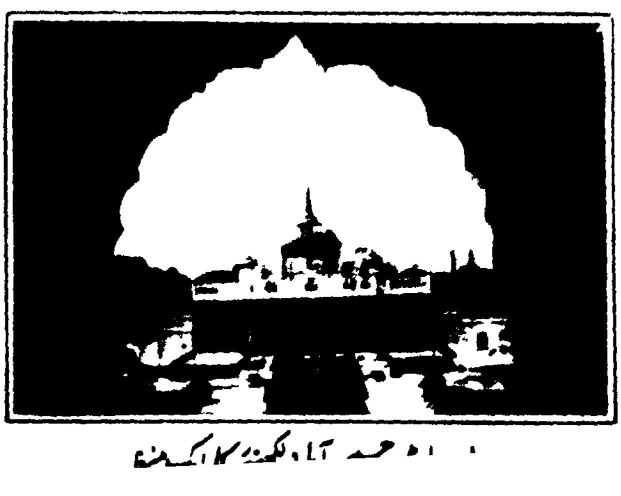
شاہ نجف ۔ غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ
کی عظیم الشان یادگار

کربلائے نواب ملکہ آفاق



کربلائے نواب سیف الدولہ
واقع حسین گنج لکھنؤ ، عمر ساٹھ سال





سعادت آباد، لکھنؤ کا ایک منظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

براتیں میں دولہا، چمن میں گل، پھول میں خوشبو، چراغ میں لو، جسم میں روح، آنکھ میں نور، دل میں سرور، سیپی میں موتی، ناؤ میں لنگر کی جو حیثیت ہوتی ہے وہی حیثیت مشہور شہروں میں زمین لکھنؤ کی تھی۔ کس کو علم تھا کہ جنگل میں منگل ہوگا

ہر منزل کو ہے اک رنگ ترقی دہر میں — اے جہاں گلشن نظر آتا ہے آگے بیشہ تھا

عہد نوابی اور شاہی میں شہر کی کیا شان تھی، یہاں کی گلیوں میں کتنی رونق اور بازاروں میں چہل پہل ہوگی، آزادی کے متوالے اور دیسی حکومت کے جاں باز کہاں کہاں رہتے تھے۔ صاحبانِ کمال کی لاتعداد ڈیوڑھیاں تھیں اس سچی کہانی کے سننے والے تو بہت ہوں گے مگر ذمہ دارانہ بیان دینے والا اس کے طول و عرض میں مجھے ایک بھی نظر نہیں آتا ______

TAMES HENERY HEXLAY[1] اپنی جوانی کے زمانے میں کہا کرتا تھا کہ علمائے سائنس کو ساٹھ برس کے سن میں دنیا سے علیحدہ ہو جانا چاہئے تاکہ وہ اپنی قدامت پسندی سے رفتارِ ترقی میں حائل نہ ہوں لیکن جب بیچارے خود ساٹھ سال کا ہو گیا تو اس کو خود اپنی بات کی جانچ پڑتال کا موقع ملا۔ ہم اپنی موجودہ حالت سنبھل میں اپنی بے مائیگی اور زبوں حالی کے اسباب کی تلاش جب کرتے ہیں تو ہماری نظر دور نہیں جاتی اور ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی گزشتہ تاریخ کا کافی مطالعہ نہیں کیا اور عمیق غور و خوض سے کام نہ لیا یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ ایسے مرکزی شہر کی ہمارے پاس کوئی مکمل تاریخ نہیں۔

جب نوجوان اپنی عزیز زندگی کے توجہات کو علمی مشاغل کی طرف مشغول نہ کریں تو ہم بڑھاپے میں کہ ہمت مستحکم نہ کریں تو کون ہے جو اس میدان میں آگے بڑھے۔ جس علم اور ذوق دور میں یہ کام ہونا چاہئے تھا وہ گزر گیا اب تو کمالات کا سورج ڈوب چکا ہے شفق باقی ہے اگر اندھیرا ہو گیا تو پھر چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے حقائق نہ ملیں گے اور ناکامی کا روز سیاہ سامنے آئے گا۔

فن تاریخ میں سچائی کام کی جان و روح ہے مگر یہ آمد आनमा ڈھونڈنے سے بھی بمشکل ملتی ہے اصلیت کا نہ جاننا ملک کی بڑی بدنصیبی ہے۔ آثارِ قدرت دیکھیں ذوقِ سلیم کا وہ حق ہے جو فطرت نے اس کو دیا۔ ہمارے یہاں وہ لوگ جو زمانے کے مٹتے ہوئے نقوش کی تصویر کھینچتے ہیں شیخ محی الدین ابی محمد عبدالواحد بن علی تمیمی نے تاریخ اندلس مدرقرطاس کی صالح بن یحییٰ نے تاریخ بیروت لکھی شیخ محمد بن شحنہ نے تاریخ حلب مدون کی اسی طرح تاریخ شام تاریخ بغداد وغیرہ۔ یا کے مشہور شہروں کی تاریخیں سامنے ہیں مگر لکھنؤ پر جس نے لکھا وہ یا تو افسانوی حدود میں رہ کر لسنہ و نظر کی کسوٹی پر ٹھیک نہ اترا یا عصبیت کے رنگ میں قلم فرسائی ہوئی اور مطالعہ کرنے والے اسلوب نگارش پر کفِ افسوس مل کر رہ گئے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کی جد و جہد مقالات کی صورت میں عبدالحلیم شرر کی کاوش ناول کے رنگ اور تجارت کو کامیاب بنانے کی دھن میں بے شک موجود ہے مگر تاریخ کہے جانے کے لائق ایک کتاب بھی نہیں ہے ہر واقعہ نگار محدود پہلوؤں کے اجاگر کرنے میں سیرت نگاری کے تمام گوشوں کو طے نہیں کر سکا۔

---

[1] جامس ہنری ہکسلے ۴ مئی ۱۸۲۵ء کو اطراف لندن میں پیدا ہوا یہ مشہور سائنسداں ہے۔

تاریخ اودھ کے مطالعے میں میرا دل و دماغ بار بار اس بات کو سوچتا رہا کہ کاش یہ حاصل بحث ہوتی زبان تک
میرے دادا صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک طومار[1] پرانے کاغذات میں ملا جو پیچ کا ایک ٹکڑا تھا شروع اور آخر سے ضائع
ہو چکا تھا اس نوشتے میں لکھنؤ کے سربرآوردہ لوگوں کی محلہ وار فہرست تھی اس متبرک اور مقدس تحریر کو برسوں مرتبان
میں رکھ کر محفوظ رکھا اس انتظار میں کہ حسب وقت آنے کا قلم اٹھاؤں کا ممکن ہے کہ طبعی ذوق توارث کے ذریعے اس تمنا کی
بر آوری کا موقع دے اور میری یادداشتوں کی بہتات اور پرانی جو کشکول[2] کی مختلف صدوں میں جو کہ آسمان کے تاروں کی
مانند بکھرے ہوئے ہیں یکجا ہو جائیں

میرے ارادوں کا اساس اگر طومار تھا تو یہ جذبہ بھی عزائم کی بنیاد ہوا کہ زمانہ گزرنے سے پرانے نقوش مٹتے جا رہے
ہیں شہر کی کتنی عمارتیں اور سربلند قلعے گر گئے اور جو باقی ہیں ان کے حسن سیاست پردۂ اخفا میں ہیں ڈر ہے کہ ماضی بعید جس طرح سے مٹا
ماضی قریب بھی مٹ نہ جائے لکھنؤ کے ہمہ گیر خصوصیات کو زندہ رکھا جائے دیکھ کر ان کی بنیاد دریافت کرنا پچھلے زمانے سے
چلے روایات کا مواد ہے وہ عدالت اور اساس کے اندر ہیں جن کو محدود اتو م لگاتار کوششیں کرکے [illegible] ہے
ہیں سرمایہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے ایسا ہی تھا شہر لکھنؤ [illegible] قدم قدم پر گرد پر ان کی طرح پھرتے تھے وہ منزل محبوب کے
اکھڑے ہوئے خیموں کی افتادہ زمین کو اکسیر سمجھ کر سرمۂ چشم اور طلسم کی یاد میں علامت بنائے رہتے کو مقصد سمجھتے تھے
شامیانۂ حبیب کی میخوں کے نشان ان کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے اور راستے گزر جانے والے ناقۂ لیلیٰ کی مینگ کو میوۂ دل سمجھتے
تھے۔ بعد میں کوچۂ متبنی، کو دیں مالک اشتر لیں (تاریخ مالک اشتر) [illegible] ہے مگر ہمیں نہیں معلوم کہ میر امانت علی مرثیہ خوان
متخلص بہ افسردہ[3] کہاں رہتے تھے مفتی غلام مرتضیٰ[4] خلف ملا محمد رضا کا مکان کہاں تھا۔ تاریخ اودھ پر قلم اٹھانے والوں سے
شکوہ ہے کہ انھوں نے صاحبان کمال کے ناموں کو باقی رکھنے کا کوئی خیال نہ کیا اور وہ ملیا میٹ ہو گئے ؎
نام نیک رفتگاں ضائع مکن ✦ تا بماند نام نیکت پائدار ' عہد سعادت علی خاں کے داستان گو میر[5] لکھنؤ کے کس محلے میں تھے ان
کے بیٹے سید[6] قاسم علی کا مکان کدھر تھا۔ عہد آصفی کی طوائف [illegible] ان پر عاشق تھی دنیا دار طبقے کے ساتھ دیندار لوگوں کے
گھروں کا بھی پتہ نہیں امام علی خاں[7] اور نوازش علی خاں حفاظ کے صرف نام باقی ہیں یہ سب دیار وطن کے جگمگاتے ہوئے تارے تھے
جن کا نہ کوئی تذکرہ ہے نہ کوئی تعارف ہے اس ادھیڑبن میں میں نے طے کر لیا کہ ارض وطن کے چپے چپے پر بحث ہو اور تہذیب رفتہ کی مٹی
ہوئی تصویر کا ایک صحیح عکس میں اپنے ہاتھ سے پیش کر دوں مجہول مقامات کی حقیقت اور اولیت کا پتہ چلایا جائے اور زمانۂ ماسبق کا
چہرۂ خط و خال دیکھا ہے وہ کسی طرح اٹھ جائے مشرقی علوم کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہر محلے کے نام قرار پانے کی وجہ وہاں کے تاریخی خصوصیات

---

[1] طومار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس کے ختم ہونے پر دوسرا کاغذ جوڑ کر اس کو اتنا طولانی بنا دیا جائے کہ وہ دس دس بیس بیس تحریر یا بغیر ورق لئے ہوئے ایک ہی سلسلے پر ختم ہو
اس کو لپیٹ کر بیلن کے چونگے میں یا کسی دوسری طرح محفوظ رکھیں [2] مؤلف کی کتاب دواث کی طرف اشارہ ہے جو تین جلدوں میں علمی ادبی تاریخی ادبی یادگار
کشکول ہے [3] تاریخ اودھ مؤلفہ نجم الغنی ص ۱۲۶ ج ۱ [4] ایضاً جلد ۴ ص ۲۳۳ [5] تاریخ اودھ ج ۱ ص ۲ [6] تاریخ اودھ مؤلفہ کما
[illegible] [7] تاریخ قیصری ص ۱۲۱

ادبی تحقیق، قدیم جغرافیہ، تیرھویں صدی کے قومی رہنما اور خاص خاص پیدا شدہ لوگوں کے حالات اور زندگی کے کارنامے کسی طرح ضبط تدوین میں آ جائیں۔

کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ماحول تیار کرنا پڑا میرے عزیز دوست شیخ تصدق حسین صاحب بی اے، ایل ایل بی، بی کام، سابق ٹاؤن ہال کی آخری ملک سبھا... یہ کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے، اور وہ وقت ہے کہ میرے ہاتھ میں دوسری مرتبہ مدرسۃ الواعظین کے علمی تاریخی آرگن الواعظ رسالہ کی ادارت آئی اور بلا تکلف مذہب کے مقالات جدیدہ مذکور میں دینا شروع کئے اور آٹھ سات برس تک کبھی کبھی مدد و احتیاط کے بعد اور کبھی میرے اضافی نوٹ کے ساتھ مضامین چھپتے رہے اور فاضل مضمون نگار نے اپنے علمی مقالات میں میرے تعاون کا ذکر بھی کیا لکھنؤ اور اودھ کے سلسلے میں اپنی حسن خدمات پر مجھ سے سند بھی حاصل کی۔

اس علمی اقدام کے بعد ایک مرتبہ اندھیری رات میں مائیک اودھ کے دوسرے والد وثیقہ نوجوان راجہ مجتبیٰ ایڈوکیٹ ان ... کا شہرہ سلطنت عالیہ پر آئے یہ ملک کے ان نوجوانوں میں ہیں جن کے مستقبل سے ہوش آئندہ ترین امیدیں وابستہ ہیں میرے عزائم کی قدر کرتے ہوئے تاریخ اودھ کے موضوع پر کتاب میں سمجھ کر جانے کا وعدہ کیا اور اسی کار پر بعض آثار قدیمہ دکھانے میں زحمت بھی ... کی بات ہے جب میں اپنے پیرے میں معلومات کا دریا سمجھ رہا تھا شمس الدین خاں کی بھاؤنی، میڈو خاں کی سرائے، موہنی ... کا جائزہ لیا ... کر دیکھ چکا تھا اور سواری نہ ہونے کا عذر بار بار بڑھاپے کی اطاقتی سے میرے کام میں سستی کی جھلک نہ تھی ... مقامات لکھتے وقت بعض پیاری تحریریں پڑھنے کے لئے جھکے میں لٹکے آثار ادھر ڈھلے جاتے تھے۔ مجھے افسوس رہ گیا کہ بعض تحریریں بہت اونچے پر تھیں میں پڑھنے سے محروم رہا اور ایک آدھ عمارت تک خود نہ پہونچ سکا چنانچہ امام باڑہ آصفی کی ... اگر اپنی آنکھ سے دیکھتا تو اس انوکھی راہ پر اس سے زیادہ لکھتا بہت کچھ لکھ سکا ... مگر ماحول ناساز گار ہونے اور زعفرانی ... کی وجہ سے کبھی واقعات باصرار OH WHAT A DIRTH FRIENDS AND HELPENS اور کبھی آہ من قلۃ الزاد۔—— کہتا ہوں پھر بھی جو آثار قدیمہ اس کتاب میں لکھ رہا ہوں ان میں OH WHAT A DIRTH OF NESSARIE ... JOURNE ... اور حال دل میرے دیکھے ہیں ... یاں پر انتہا نہیں کی۔ سب پر خود جا جا کر لطف کی یہاں تک کہ پرانے تکیوں ... قبر کے پتھر تک پڑھوائے اور اس دوڑ دھوپ میں مجھے ایسے اتفاقات ہوئے کہ اگر ان کو بھی قلمبند کروں تو عمر ... کی عقلیں ... آواز آرہی ہے ... ایکہ ... امن کشاں ... اخلاص الحمد بخواں

آن سے پہلے لکھنؤ کے آثار قدیمہ کے تحفظ کا خیال خود اس ظالم طبقے کی فردوں کو ہوا تھا جو قدیم لکھنؤ کے مٹانے میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ زوال سلطنت کے بعد جس کو بعد میں ملکی حکومت کے حوالہ باغی قرار دے گئے اس کتاب کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ انگریزوں نے انقلاب غدر میں ... لکھنؤ باقی رکھا اور پورے شہر کو کھود کر پھینک دیا مجھے یاد ہے کہ جنگ عظیم کے اضطراب ... اور ... موقع پر PARIS کی گولہ باری کا تصور کر کے بین الاقوامی شخصیتیں لرزہ براندام تھیں مگر لکھنؤ میں آنے والے جنگجو خان نے شہر کے بچنے کا تصور بھی نہ کیا اور جذبہ انتقام میں کامیاب ہوئے ... صدی تک انگریز آزادی کے حامیوں کو قہر آلود

ف سیرۃ حیات علامہ ... ۱۳۱ پر نقل سند بخط موصوف موجود ہے ف وفات ۱۸۹۶ء

سے دیکھتے رہتے بات پرانی ہونے اور نسلیں گذرنے پر شہر کے رہنے سہنے در و دیوار کے نظارے سے جب مشرقی کمالات کو عدیم المثال قرار اور عظمت کی آگ بجھی تو وہی انگریز آثار قدیمہ قائم کرکے حفاظت پر تیار ہوئے ؏ چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ یکم اکتوبر [illegible] L. N. JAPLING DEPUTY COMMIS.SIONER نے شمس العلماء مولانا سید ناصر حسین صاحب کو PRESEDNT قرار دے کر ایک کمیٹی بنائی اور نائب صدر شاہزادہ مرزا ثریا قدر بہادر کو مقرر کیا جیسے آثار قدیمہ کے تحفظ کا اس سے بہتر انتظام اور نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر [illegible] جس طرح سیکڑوں انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اداروں کی تشکیل ہوتی ہے اور شیرازہ بکھر جاتا ہے اسی طرح انگریزوں کا یہ منصوبہ بھی برباد ہوا۔

ہاں خوب یاد آیا اس سلسلے میں مجھ سے بھی ایک غلطی ہو گئی جس کا افسوس عمر بھر کرتا رہوں گا ماہ صفر ۱۳۶۵ھ میں میرا قیام حیدرآباد دکن میں تھا اور نواب محمد ہمت علی خاں گھنشالہ جاگیردار بارہ دری تاڑ شاہ راہ کوہ شریف ملنے آئے لکھنؤ کا ذکر آیا تو فرمایا کہ اگر تم نگراں ہو جاؤ تو میں کم از کم لکھنؤ کی تمام کربلاؤں اور امام باڑوں کی مرمت اور نقار کی اسکیم بناؤں میری پالیسی ہمیشہ مالیات سے دور رہنا ہے اس لئے انکار کیا اور ان کو جواب دیا کہ آپ شیعہ لیڈران سے جو کچھ کہنا ہے کہیں یہ جواب اصول سلکی کے ڈر میں اس وقت صحیح تھا مگر اب دست تاسف ملتا ہوں مواقع گذر کر انحطاط قومی و ملکی کا دور آ گیا۔ ذوق سلیم کی رخصت نہیں ہوا۔ محسوسات اور غیر محسوسات دونوں میں انقلاب آیا کبیرؔ اس کو اپنے زمانہ کا شکوہ تھا ؎

رنگی کو نارنگی کہیں نقد مال کو کھویا + چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا" آج وہ ہوتے تو کیا حال ہوتا وقار رفتہ ختم ہوا زبان پر پانی پھرا اب تو ہم خالی ہاتھ ہیں پھر بھی ؎ یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ ۔ سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

کن لوگوں نے مدد دی اور کون کون زندہ ہوتا تو کتنی مدد ملتی

یہ تاریخ اگر میں بیس برس پہلے لکھنا شروع کرتا تو لکھنؤ میں ایسے لوگ تھے جو معلومات کا سمندر تھے نواب سید صادق حسین عرف امیر صاحب رؤسا خاقان مرزا کے آخری چراغ انگریز حکام ان کے شاگرد تھے کوئی گزرا لکھنؤ کا ایسا نہ تھا جس سے وہ واقف نہ ہوں یہ نہ تھے تو کاش داروغہ سید محمد صاحب جو گول دروازہ کے عالیشان مکان میں رہتے تھے زندہ ہوتے وہ مجسم تاریخ تھے یہ بھی نہ رہے۔

پھر بھی اس وقت میرے پاس علم سینہ اور ذاتی مشاہدات حاصل کرنے کے کچھ ذریعے تھے جن کو غنیمت سمجھا۔

(۱) نواب مرزا محمد شاہ عالم صاحب۔ خاندان شاہی میں سب سے بوڑھے چوکی کے معرر ماتمدہ اور تحقیق بسم اللہ کے کامیاب مؤلف، ایک وقت وہ تھا کہ موصوف میرے پاس دن میں دو مرتبہ آتے تھے اور کتاب مذکور کے تینوں ایڈیشن میرے دیکھتے دیکھتے تیار ہوئے اب چوراسی برس کی عمر ہونے پر ناتوانی ان کو آنے سے روکتی ہے سامعہ باصرہ جواب دے رہے ہیں۔

(۲) نواب طاہر علی خاں صاحب۔ خاندان شجاع الدولہ کے بڑے نامور اور سن رسیدہ شخص تھے ان کے خیالات کا عمق اور طرز بیان کی صفائی لکھنؤ بھر پر روشن ہے پچھلے سال انتقال ہوا ہے میں ان کے معلومات سے دامن بھر چکا۔

(۳) نواب حسین علی خاں اور ان کے دونوں فاضل بھائی اس کتاب سے خاص شغف رکھتے ہیں اور ہر سہ برادران [illegible]

اور خاندانی وقار کے حامل ہوتے ہوئے نکتہ سنج نکتہ رس ادیب اور شاعر ہیں۔ میں نے سعدی کے اشعار پر ان کی تضمین دیکھی وہ میرے اوقات مدرسہ کے قیام کے لحاظ سے پڑوسی ہیں میرے دل میں ان کی عزت ہے وہ گھر والے ہیں لکھنؤ ان کا گھر ہے سٹھری کی پہلی خشت انھیں کے گھرانے نصیب ہوئی ان کے علم سینہ سے فائدے اٹھائے اور کتاب کے بعض مقامات ان کو بھی سنائے اور کہیں کہیں کے ورق مطالعے کے لئے دئے اختلافات میں ان کی رائے کو صحیح سمجھا اور بھروسا کیا ان ذرائع کی موجودگی میں مجھے [illegible] منزیوں تک جانے کی نوبت نہیں آئی جو سلطنت اودھ کے نام بہ پیٹ بھر رہے ہیں جن کی ترجمانی افسانوی حیثیت سے زیادہ درن نہیں رکھتی شیخ اور سفیقت میں زمین آسمان کا فرق ہے تصدق حسین وکیل اور نئے دور لکھنؤ کے بعض اہل قلم انگریزوں کے اقوال کو قرآن و حدیث سمجھ کر بڑی دقیع نظروں سے دیکھتے ہیں مگر میری نظر میں حقائق والی کے لئے جذباتی مزاج سم قاتل ہے ان کی ماں سے رہا... حیثیت نہیں ہے انگریز وہی ہیں جو کلاہ ئے لکھنؤ پر گرے طوفان ہو کر خوبصورتیوں کو بہلا گئے قہر و غضب کی گھٹا ہو کر خطرناک بجلیں میں دل کھول کر برسے صاعقہ بن کر چمکے بادل کی طرح گرجے۔ جب مطلع صاف ہو گیا تو دلوں میں ٹھنڈک پڑی گو انگریزوں ہی کے زمانے میں آزادی کے حامی ماہی کی کھوئی لفظ سے پکارے گئے یہ وہی آزادی تھی جو آنریبلنڈ کے سامنے ہے۔ جو فی افریقہ میں نہرہی کر دو دیکی تھی اسے ملک بند ہر نے سامنے رکھا اور آخر میں مسلم لیگ اور کانگرس کی لوکی ہوئی سلسلۂ تحریر میں دوسری کتابوں کی عبارتیں نقل کرتے ہوئے میرے احتیاط ہو از قلم سے بھی عادت کی لفظیں نکل گئی ہیں ان کو دیکھ کر ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ میں بھی انگریزوں کا پارٹ لے رہا ہوں وہ صرف نقل قول ہے اور بس۔

میری نظر میں تاریخ اودھ کا وہ قلم ایک حیثیت رکھتا ہے جو برٹش راج میں ہندوؤں کے ہاتھ سے ترتیب پا گیا۔ اس میں نہ فاصلہ رشکوہ ہے نہ فرقہ وارانہ دندیہ، بلکہ یہ اودھ کا ہمکوار ہونے سے جو کہتے تھے سچ تھا اور جو لکھتے تھے وہ اثر میں ڈوبا تھا ان کے دامن بھی تعصب بیزاری کے رنگ سے آلودہ نہیں ہوئے۔

لکھنؤ کے کتب خانوں میں ۳۰ ہزار سے زیادہ وہ کتابیں ہیں جن کو میں گھر بیٹھے دیکھ سکتا ہوں اور نظر تعمق سے دیکھتا رہتا ہوں اور مجھے آج تک کے علمی تجربے نے بتایا ہے کہ چیز ہمیشہ مارکیٹ ہی میں نہیں ملتی بلکہ کبھی نظر انداز کو اس دوکان پر بھی سودا مل جاتا ہے جو اس کے فروخت ہونے کا ٹھکانہ نہ ہو چنانچہ میں نے مذہب امامیہ کی فقہی کتاب شرائع الاسلام مطبوعہ سلطانی تک سے فائدہ اٹھایا ہے اور جہد سٹا ہی کے پریس میں اور چھاپہ خانوں میں کام کرنے والوں کے نام اس کتاب سے حاصل کئے۔ پرانے زمانے میں یہ دستور تھا کہ پریس میں "کاپی پتھر پر بیٹھنے سے پہلے کاتب اپنا نام لکھ دیتا اور کاغذ موڑنے پر وہ نام پلیٹ میں آجاتا مگر پتہ چلانے والے سمجھ جاتے کہ یہ کاپی کس ورکر کی خدمت کا پھل ہے۔

اب رہا یہ امر کہ میں نے اس کتاب کو کن کتابوں سے مدد لے کر تالیف کیا ہے اس سوال کے جواب میں آپ کو دو فہرستیں اور ملیں گی پہلی وہ فہرست ہے جو دیباچہ ہذا سے پہلے جگہ دی گئی ہے اور دوسری لسٹ وہ ہے جو دیباچہ کے بعد ہدیۂ ناظرین ہے اس فہرست میں صرف ان کتابوں کا نام اور تعارف ہے جو اودھ کی خاص ہسٹری ہیں اگرچہ فٹ نوٹ میں ہر کتاب کا حوالہ اپنی جگہ آتا ہے مگر اس کتاب کے مصادر اور مآخذ دریافت کرنے کے لئے ایک نقشہ کا ہونا ضروری ہے وہ آئندہ صفحات میں آپ پڑھیں۔

آخر میں کچھ اور ضروری باتوں کا اظہار بھی بہتر معلوم ہوتا ہے کتاب کے اختتام تک شباب لکھنؤ اور [illegible]

زیادہ کتابیں مجھے دستیاب نہیں ہوئیں جن کی فہرست پیش کی جا سکتی ہے جو کتابیں نہیں مل سکیں اس کی کوئی سند اور تحقیقی حیثیت نہیں ہے ایسی ہی کچھ وہ بھی ہوں گی جو کہ میں دیکھ چکا ہوں اس کتاب کی ترتیب اور تیاری کی اطلاع اخبارات میں آنے پر بھی کسی شخص نے کوئی قلمی مدد نہیں کی اور میں نے یہ تمام صفحات بلا شرکت غیرے لکھے اور کتاب کی بین الاقوامی حیثیت قرار دی ہے جس کو لکھنؤ سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص پڑھے اور جذبات برانگیختہ نہ ہوں۔

لکھے ہوئے حالات میں تہذیب لکھنؤ اور معاشرت پر بھی بحث ہے اور ان عنوانات پر تیر روشنی ڈالی ہے۔ جن پر اب تک تذکرہ نگار سیر حاصل بحث نہیں کر سکے یا ان موضوعات پر قلم فرسائی میں ان کو توجہ نہیں ہوئی اور ان کا حقیقت کی گہرائی تک ذہن نہیں پہونچا اس کو میں نے ضبط کیا ہے اور بیش بہا افادہ موضوعات پر ستارہ دار کر کے چھوڑ دیا ہے۔ کتاب کا نام سیر لکھنؤ یا ایرانا دور لکھنؤ لکھنؤ وغیرہ ہو سکتا تھا مگر میں نے اس ذخیرہ کا نام رکھا ہے تیرہویں صدی کا لکھنؤ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ میرے گوناگوں علمی مشاغل میں یہ کام اس قدر جلد انجام کو پہونچے گا اور سوا دو برس کے اوقات فرصت میں عمر بھر کی محنت سمٹ آئے گی جو ارادہ تھا وہ پورا ہوا لیکن اور صرف یہی تھی سے اے کارساز قبلہ حاجات کار ما + آغاز کردہ ام تو رسانی بانتہا " نظر ثانی اور طباعت پر میری محنت ٹھکانے لگے گی اس کتاب میں تیرہویں صدی کے پیدا شدہ لوگوں کے کچھ حالات کم ہیں سے لکھے ہیں اور بعض نامور حال بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اس لئے کہ دوسرے ذرائع سے ان کے حالات دریافت ہو سکتے ہیں اور بعض غیر نمایاں شخصیتوں کے حال پر جم کر بحث کر دی ہے صرف اس لئے کہ ان کے واقعات زندگی دریافت کرنے کا دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور کتاب کے موضوع سے ہٹتے ہوئے عصر حاضر کے بعض لوگوں کے بھی نام لے دئے ہیں۔ چونکہ وہ نمونہ ہیں تیرہویں صدی کا اس لئے خارج از بحث گفتگو کا مجھ الزام نہیں ہے اور یہ خامہ فرسائی ضمنی ہے نہ مستقل پھر بھی مجھے یہ ڈر ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرنے والے تمام صفحات پڑھ کر الزام دیں گے کہ فلاں شخص کا نام نہیں ہے اور فلاں انسان چھوٹ گیا یہ شکوہ اس وقت صحیح ہوتا جب میں دعویٰ کرتا کہ کتاب تمام نامی پر حاوی ہے اور یہ سب ارباب کمال کی لائف ہے۔

اب میں اس قدر عرض کر کے تمہید ختم کرتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں کہ یہ دیکھئے کہ مجھ سے کیا کیا چھوٹ گیا یہ دیکھئے کہ تاریخ اودھ کے صرف ایک جز لکھنؤ پر اتنا لکھا جتنا آپ کو پورے صوبہ پر ملے گا امید ہے کہ نقل میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو دامن عفو میں اس کی جگہ ہے اختلافی مقامات پر اگر میری رائے ظاہر ہو گئی ہے تو اس لئے کہ اہل البیت ادری بما فی البیت گھر کی باتیں ہی جانتے ہیں دوسرے شہر کے لوگ یہاں کے اختلافات کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ والسلام

آغا مہدی الرضوی
مسجد تحسین چوک لکھنؤ بھارت

اس کتاب کے مصادر اور جن کتابوں سے خصوصی مدد لی ہے ان کے نام مع تعارف

نمبر شمار	نام کتاب	نام مؤلف	سنہ طباعت یا تحریر	زبان	کیفیت
۱	آئینہ اختر	شیخ غلام حیدر متغیر	مخطوطات	مثنوی اردو	مصاحب خاص جان عالم کی تالیف
۲	آثار اکبری تاریخ فتحپور سیکری	محمد سعید احمد مارہروی	طبع آگرہ ۱۳۲۲ھ	اردو	
۳	آثار یادگار	راجہ محمد امام علیخاں آف محمود آباد	تصویر عالم پریس ۱۳۰۲ھ	″	
۴	احوالات رسولک یا تمثال العلماء مع مولف	آغا مہدی	مخطوطات	″	
۵	احسن التواریخ	منشی رام سہائے تمنا	مطبع تسالی ۱۲۹۳ھ	″	
۶	سری لورتس	پیر ورسنز	طبع لاہور ۱۹۵۶ء	″	
۷	اودھ اینڈ آگرہ پورتر جلد پنجم	مشیر تالوی	ییتا یہ	انگریزی	خلاصہ مقدمات دیوانی
۸	بوستان اودھ	درگا پرشاد	″	فارسی	
	وغیرہ تاریخ ہندوستان	یادویہ پلتہ	طبع جاوڑی بازار دہلی ۱۹۵۵ء	اردو	عصر حاضر کی تاریخ
	تاریخ سعادت	پنڈت کنہیالال محرم ریاست مہاراجہ گڑھ امیٹھی	نولکشور ۱۸۶۱ء	″	اس کتاب کا دوسرا نام محاربہ عظیم ہے
	تاریخ اودھ کامل	نجم الغنی رامپوری	نولکشور ۱۹۱۹ء	″	
	تاریخ بہو بیگم	شیخ خادم علی سندیلوی	طبع ۱۲۶۲ھ	″	
	تاریخ قیصری معروف بہ روستا اودھ	عمیم الدولہ سید زین العابدین	اثنا عشری پریس ۱۳۰۶ھ	″	یہ کتاب وزیر اودھ نواب علی نقی خاں کے بیٹے
	تجلیات	مرزا محمد ہادی عزیز	نور المطابع لکھنؤ	″	بزم جان عالم کے ایک عالم کی لائف
	حقیقۃ الاخبار	راجہ کسری لال	مطبع کلاں کوٹھی حاجی ولی محمد ۱۲۸۲ھ	فارسی	
	ثقلین نادری	سید محمد عسکری صفی پوری	مخطوطات	اردو	
	جان عالم	عبدالحلیم شرر	ادارہ فروغ اردو لاہور طبع اول ۱۳۵۱ھ	″	
	مثنوی حزن اختر	حضرت محمد واجد علی شاہ بادشاہ		″	
	ذات یقین	محمد تحسین علیخاں ابن دلیل خاں افغانی	مخطوطات	″	عہد نصیر الدین حیدر کے خواجہ سرا کی سرگزشت
	رقعات مرزا قتیل معروف بہ معدن الفوائد	خواجہ امام الدین سمرقندی	عہد شاہی اور نولکشور پریس میں کئی بار طبع ہوئی	فارسی	عہد آصفی کے شاعر اور ادیب کے خطوط
۲	روح ادب	گھانسی رام ابہل	میرٹھ	اردو	کورس کی کتاب
۲	سرور سلطانی	مرزا رجب علی بیگ سرور	مطبع کٹاکی کانپور ۱۲۸۵ھ		بیگم شاہ اودھ تاریخ تالیف

۲۳	بہجتہ المذہب معیار الادب	حکیم علی اکبر شاہ	طبع ۱۳۰۹ھ	عربی	مقرہ جناب عالیہ کے ایک عربی داں کے قلم سے مشاہیر قوم کے حالات
۲۴	سفیر اودھ	مولوی مسیح الدین علوی	الناظر پریس ۱۹۲۲ء	اردو	آپ وکیل کی حیثیت میں لندن والدہ شاہ کے ساتھ گئے
۲۵	سوانح لکھنؤ	کفایت حسین خاں نجیب آبادی	مخطوطات یونیورسٹی	فارسی	عہد امجد علی شاہ کا سیاح
۲۶	طومار	شمس العلما سید محمد ابراہیم	مخطوطات	اردو	عہد جان عالم کے آخری عالم جن کو سید العلما الثانی کا خطاب حاصل تھا۔
۲۷	طلسم اخبار	فرنگی محل	طبع ۱۸۵۶ء	"	زمانہ غدر کا آرگن
۲۸	عہد نامجات جلد دوم	نولکشور	نولکشور ۱۸۶۶ء		والیان اودھ اور انگریزوں کے عہدنامے
۲۹	عماد السعادت سوانح نواب سعادت علیخاں	غلام علی ابن محمد اکمل خاں	نولکشور ۱۸۶۷ء	فارسی	
۳۰	قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ و لکھنو	شہزادہ اسرار حسین	طبع ۱۹۳۶ء	اردو	
۳۱	گذشتہ لکھنؤ	مولوی عبدالحلیم شرر	چھاپہ	"	
۳۲	محامد حیدریہ	قاضی محمد صادق خاں اختر	مخطوطات قلمی پرشادی لال تحریر ۱۲۶۲ھ	فارسی	مکتبہ ریاست مرشدآباد کا قلمی نسخہ ہے بعض تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ طبع ہو چکی ہے
۳۳	مرآة البلاد	ہاشم علی رضوی	مخطوطات کتب خانہ ممتاز العلماء کا قلمی شاہکار	فارسی	
۳۴	نیا دور لکھنؤ	ماہوار رسالہ اڈیٹر صباح الدین عمر لکھنؤ		اردو	
۳۵	ہسٹریکل البم آف اودھ	داروغہ حاجی عباس علی میونسپل کمشنر	نولکشور ۱۸۹۰ء	"	
۳۶	وضعداران لکھنؤ	محمد ہادی ابن محمد عباس لکھنوی	تصویر عالم پریس ۱۹۰۰ء	"	
۳۷	بہار ہند حصہ اول	مرزا محمد مرتضی عرف مچھو بیگ	مطبع شوکت جعفری ۱۸۹۰ء	"	

نوٹ، شاب لکھنؤ اور مرقع اودھ دو کتابیں مجھے دستیاب نہیں ہوئیں اول الذکر کتاب منشی محمد احمد علی ندلے کی تالیف ہے اور شاعت منیجر مسلم بکڈپو پرنٹنگ ہاؤس امین آباد لکھنؤ نے اپنی فہرست اور تعارف میں لکھا ہے ـــــ نصیر الدین حیدر کے دربار اور سلطنت کے چشم دید واقعات، شاہی محلات کے اسرار شاہی رہن و شکار کے سامان امراء دربار کے جوڑ توڑ ایشیائی معاشرت عیش کے حالات اگلی برائی وغیرہ

قیمت عہ

کتب فروش نے کتاب مذکور کو ترجمہ ظاہر کیا ہے ممکن ہے کہ محامد حیدریہ کا ترجمہ ہو۔ مؤخر الذکر کتاب کے مختصر حال فہرست مذکور میں ہے ملک [illegible] تاریخ فلسفہ تاریخ کے اصول قیمت عہ ممکن ہے یہ کسی منشی صاحب موصوف العدر کی تالیف ہو لکھنے والے کا نام فہرست میں درج نہیں ہے۔

تاریخ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صوبہ اودھ

لکھنؤ اودھ کی راجدھانی ہے اور اس شہر کے حالات پر قلم اٹھانے سے پہلے میرے لئے اچھا ہے کہ پرانی تحریر بھی کچھ لکھتا چلوں اودھ میں کوئی نقطہ دار حرف نہیں ہے۔ ابجد کی رو سے اس کے عدد بھی دس اور چھ۔ سولہ ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں مثل بنارس اور شام اودھ کی لفظ تاریکی میں نہیں ہے اور روز روشن کی طرح چمکتی ہے اس کی ساخت میں کون کارفرما ہے؟ صوبہ کا نام اودھ یوں رکھا گیا کہ اودھیش[۱] شری رام چندر جی کا نام ہے اور وہ مالک اودھ تھے اس نکتہ کا پتہ سوائے رتن بھاگ کے قلم سے مجھے کہیں اور تو نہیں ملا۔ یہ صوبہ اس وقت یک طرف گورکھپور سے قنوج تک طول میں ایک سو پینتیس[۱۳] کوس اور چوڑائی[۲] میں نوہ شمال سے الہ آباد تک ایک سو سولہ کوس تھا اس کا دوسرا نام اکھترپرگنہ ہے اور صوبہ بھر میں (۱۷) پرگنے ہیں۔ عہد اکبری میں راجہ ٹوڈرمل نے "اکھتر نگر" نام رکھا اب رہا "اختر نگر" تو جس طرح ہندی میں ہڑبہیڑا آنولہ کو ترپھلا کہتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگوں نے اس کا نام اطریفل رکھا۔ یہی حال اکھتر نگر کو اختر نگر کا اس زمانے میں ہے۔ پہلی تبدیلی کے بعد وہ وقت آیا پندرہ ذیقعدہ ۱۱۳۰ھ کو جب سادات بارہہ کی کوشش سے روشن اختر محمد شاہ پسر جہاندار شاہ ولد بہادر شاہ نے نظربندی سے چھٹکارا پاکر سولہ برس کے سن میں فتحپوری تخت پر بیٹھے اس وقت اختر نگر کی لفظ میں روشنی بڑھی۔ آخر میں سلطان عالم حضرت محمد واجد علی شاہ مرحوم کے اختر تخلص نے فقط لکھنؤ کو اختر نگر بنا دیا شاہی محلات اور سلطانی بزم سخن میں کہیں کہیں اس کا پتہ ہے شاہ مرحوم کی انصاف پسندی تھی کہ اپنے نام کو باقی رکھنے کی دھن میں پہلا نام مٹنے نہ دیا۔ شیخ محمد بخش شہید ناسخ کے شاگرد تھے۔ مرزا حیدر صاحب رئیس کے مصاحبوں میں ان کا شعر ہے ؎

حق ہے شہید اپنا مقدر اگر پھرے اختر ستارہ جانب اختر نگر پھرے

لکھنؤ

ہندو کہتے ہیں لکھنؤ میں پہلی بستی رام چندر جی کے بھائی نے بسائی جس کا نام لچھمن جی تھا یا راجہ یدھسٹر کے پوتے راجہ جنم جی نے یہ زمین رشیوں اور منیوں کو آشرم بنانے کے لئے دی تھی مگر اس وقت کے حالات کا کوئی سچا خاکہ سامنے نہیں ہے اس بستی کا نام لکھنؤ کیوں ہوا؟ تاریخ اودھ میں مجھ کو جو کچھ بھی نظر آیا وہ یہ ہے اب آپ کی سمجھ میں جو کچھ آ جائے وہی ٹھیک ہے۔

(۱) شہرت تو یہ ہے کہ لکھنا پاسی یہاں کا مشہور آدمی تھا اس کی یاد میں لکھنؤ نام رکھا گیا۔

(۲) کوئی شخص تھا لکشن سنگھ جس کا نام بعد میں لاکھو خاں ہوا سرزمین وطن میں وہ نظرانداز نہ ہوا۔

(۳) لچھمن تو نام ہی تھا کبھی کہیں کہیں پتہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ لفظ بگڑ کر لکھنؤ ہو گئی منشی رام سہائے اس رائے کو صحیح کہتے

---

۱ احسن التواریخ منشی رام سہائے ۲ ۔۔۔ ۳ رام سہائے نے اس بیان کی تائید میں دو مصرعے کہے ۔۔۔ اس محل پر نام کا تفصیل کی ہے ۔۔۔ اختر ۔۔۔ نما صفحہ ۔۔۔ ۴ ہسٹوریکل البم آف اودھ ۔۔۔ از زمان بہادر شاہ شد

[illegible] بکرم دم ہندی لکھنؤ کو منسوب لکھن مراد سری رام چندر کے کرتے ہیں کیونکہ کتب زبان بھاشا سے اردو ہے اہل ہند میں [illegible] دی اور لکھن بھی ایک معنی رکھتا ہے اور تحریر نشان لکھنؤ سے پایا جاتا ہے کہ جو مقام ٹیلہ شاہ پیر محمد مشہور ہے اس کا نام [illegible] تھا۔ کتاب مراۃ البلاد میں بھی اس شہرت کو چھپایا نہیں گیا ہے۔

(۴) ایک رائے یہ بھی ہے کہ جس تموتی نے یہاں کی پہلی عمارت "مچھی بھون" کی تعمیر میں کام کیا تھا اس کا نام لکھا پیر تھا۔

(۵) لکھنؤ نام ہونے کا یہ راز تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ندی کے کنارے گوماتی میں گوگھاٹ مانکیا گھاٹ پر ایک لاکھ ماد میں رکھی جاتی تھیں یا یہاں پورے ایک لاکھ مائی رہتے تھے دیہاتی بار بر کو "ناؤ" کہتے ہیں ساریں ناؤ اور مائی کے نام سے لفظ کی ساوٹ میں سہاما دے کر لکھنؤ نام رکھا یہ سب یہاں کی آبادی کے زیادہ سے زیادہ ثبوت ہیں۔

(۶) نواب شجاع الدولہ نے اعادہ میں حال جو آخری حکومت اودھ کے ذمہ دار شخص ہیں لکھنو کی اصل "لکھنوع" قرار دیتے ہیں محمد عامہ دیانت کے خلاف [illegible] ان کی رائے کو نظر انداز کر دوں۔ اصل فارسی عبارت فٹ نوٹ میں ملاحظہ ہو اردو ترجمہ ان کی رائے کا یہ ہے۔

جب آصف الدولہ اور ان کی ماں میں رنجش ہو گئی تو وہ فیض آباد سے لکھنو چلے آئے یہاں شہر کی آبادی بڑھنے لگی لکھنوٗ کے نام میں اصلی حروف یہ ہیں ل ک ھ ن و ع اس قرارداد سے لکھنو نام ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہاں سو ہزار آدمی بستے تھے آخر کا حرف ع گر گیا واؤ [illegible] جگہ لکھنو ہوا۔ یہ قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ اہل تحقیق کا اس پر اتفاق ہے اس صورت میں لکھنو کا استقاق لک نوع ہے نوع کی جمع ہے انواع بمعنی اقسام۔

(۷) جس دولت پر ماشہ راجیس جس مقام پر گرا ہے وہ مقام "لنہ لو" کہا جاتا تھا جس کے معنی ہیں زیرہ ناف اس لئے ذرا سی تبدیلی میں لکھنو ہوا۔ اس صورت سے نام میں ناف کی شرکت پر روشنی پڑتی ہے۔

(۸) اس جگہ سید رکن الدین اور شہاب الدین دریہ شاہ مسعود کی اولاد ہے ہجرت کی اور شوکت علی بس گئے تھے جن کے بیٹے کا نام "رحم رحمن" اور بیٹی کا نام امۃ الزہرا تھا وہ سپاہی تھی ملیح آباد کا راجہ گھومتا پھرتا لکھنا پوری یہاں پہونچا اور اس نے عصمت پر نگاہ بد کی شادی کا پیام دیا رحم رحمن اس رشتے کو نامسعود بے جوڑ سمجھتے تھے چپ ہو گئے آس پاس کے بسنے والے لوٹ مار، لڑنے بھڑنے، لوٹ بہلنے والے رعایا تھے ماہ جہاراہ لیسے پرجوں سے عاجز آ گئے تھے ایسے غنڈوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے ۳ لاکھ روپے سالانہ کی پیش کش سے سادات بسائے گئے تھے۔ رحم رحمن نے لکھا میرے دل کا بھید بتایا اس سے سیاست سے سلئے دی کہ راجہ کی منگنی منظور کر لو اور تین مہینے کی مہلت مانگو اس عرصے میں کوئی بچاؤ ہو جائے گا۔ راجہ خوشی خوشی شادی کا سامان فراہم کرنے لگا اور سادات نے عبدالرحیم سردار فوج کی مدد سے دشمن کی ٹڈی دل فوج کا مقابلہ کیا اور رحم رحمن ۲ ہزار سواروں دو ہزار شتر مال اور لڑائی کا سامان لے کر بیالیس ہزار آدمیوں پر اچانک ٹوٹ پڑے اور راجہ کی اکثریت اگر شراب کے نشے میں نہ ہوتی تو شکست کا روز سیاہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ رام سہائے

[illegible] رضوی ملفوظات ۲ گزشتہ لکھنؤ شرر ۳ ہفت قلزم واحسن التواریخ منشی رام سہائے طبع ۱۸۷۹ء

[illegible] ان اصف و مادر شدہ لکھنؤ آباد افزون ترشد اصل نام لکھنو بازیب بدین لام وکاف وہا ونون وعین دو تسمیہ شد امی قرار لفظ [illegible] عدد من ملفت در مرہ برداقعہ اند این قیاسے نیست بل احلاع خواهد تاریخ قیصری ۵ احسن التواریخ منشی رام سہائے تمنا چاپ لکھنو [illegible] معنی پیسہ فاطمہ زہرا کی کنیز مسلمانوں میں امۃ الفاطمہ امۃ الحسین نام عموماً رکھے جاتے ہیں۔

اس علاقے کو پیدا لکھ کر فرماتے ہیں۔

جو مدہوش و مخمور تھے تہ تیغ ہوئے اور بہت سے آدمی تاب آتش صمصام خون آشام کی نہ لا کر دریائے گومتی میں غرق ہوئے۔ تین ہزار آدمی گرفتار بھی ہوئے۔ رحم رحمن سے اس کامیابی پر لکھنا اہیر کو حس کی رائے سے راجہ کی زد سے بچ کے شیخ عبدالرحیم سے خلعت دلایا اور اس سیاست پر مفتوحہ علاقے کا نام اسی کے نام پر لکھنؤ کیا ور دوست زمان خان اور عبدالحکیم خاں کی حکومت شروع ہوئی۔ یہ سب پیشین گوئیاں ہمیشہ درست رہیں۔ در کئے ہوتی ہیں ور علم اس کو رخصت کر دیتا ہے۔

سنہ ۱۹۱ء لکھنؤ نام شہر و قیام الدین نے رکھا اس کی تفصیل آگے آئے گی عراق کی تحریروں میں جو عصر حاضر میں وہاں سے آتی ہیں لکھتا ہے کہ لکھنا ہے یہ مانی ہوئی بات ہے کہ عہد اکبر میں یہاں شہریت نہیں تھی یہ مولوی عبدالحلیم شرر جو ۱۹۲۶ء میں مرگئے لکھنؤ پہ تاریخ مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لکھنؤ نام اکبر سے پہلے نہیں ثابت ہوتا ہمایوں نے لکھنؤ میں چار گھنٹے قیام کیا اور یہاں کے زمینداروں نے ۱۰ ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے دے کر نمایاں مدد کی۔ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی۔ یہاں کے برہمنوں کو باج پئی چڑھانے کے لئے ایک لاکھ روپے دے اور اسی وقت سے لکھنؤ کے باج پئی برہمن مشہور ہو گئے۔ اس آخر دور کے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے سے پہلے پایا۔

شرر کی یہ رائے نہیں مانی جا سکتی تیموری دور کی ابتدا کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی پھیلی تو بہلول لودھی اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست قائم کر رکھی تھی لیکن اس کے ہمعصر مبارک شاہ نے اس کے پاؤں جمنے نہیں دیے اس سلسلے میں لکھنؤ کا نام تاریخ میں نظر آتا ہے اور ابن بطوطہ جو عہد تغلق ۷۳۴ھ میں ہندوستان آیا اس کے سفرنامے میں بھی لکھنؤ کا نام موجود ہے ۹۳۷ھ میں ہمایوں تخت نشین ہوا اور سلطان ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے جو اپنی سرگزشت لکھوائی اور زبان فارسی ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کے نام سے مشہور ہے اس تاریخ میں تین مقام پر لکھنؤ کا نام موجود ہے (الف) غرض لعداد چندرو رخبر رسید کہ شیر خان نزدیک لکھنؤ رسید۔ (ب) تا آنکہ خبر رسید کہ شیر خان از لکھنؤ گذشت حضرت کوچ کردند۔ (ج) چون بادشاہ بدولت و سعادت جانب لکھنؤ رسید۔ میرزا رفتند میرزا فرمان بادشاہی را نمودند دست مدد کر۔ ایضاً ہمراہ میں بیاید ص ۴۹ طبع اول مطابع امین آباد لکھنؤ

یہ تینوں عبارتیں ہمایوں کے دور حیات میں اس کے خاص حواریوں کی مدد قرطاس کی ہوئی لفظیں تمام تر پرگواہ ہیں بیگم موصوفہ نے ۸۰ سال کی عمر ۱۰۱۱ء عہد اکبر میں وفات پائی

دور اکبری کی ابتدا میں لکھنؤ کا علاقہ جاں نثار بیگ کی جاگیر میں تھا اور ۹۷۴ھ میں جب مہدی قاسم خاں حج سے واپس ہوئے تو یہ بستی ان کو دیدی گئی۔

نور باڑی کا سربلند مقبرہ اور کھلے کی بازار کی مسجد اور دو چھوٹے مقبرے آمنے سامنے ممکن ہے کہ اسی عہد رفتہ کی یادگار ہوں قدیم طرز تعمیر کے یہ عبرت نمونے ہیں۔ القصہ یہ اک مکان ہو تھا ویرانہ و دشت چار سو تھا

لکھنؤ اس وقت ایک جنگل تھا جس میں شیر بھیڑیے، چیتے، لومڑیاں، گیدڑ اور حشرات الارض کے سوا کچھ نہ تھا کہیں کہیں کچھ قوم آباد تھی ان کو ہرگز یہ خبر نہ تھی کہ ایک وقت میں جنگل میں منگل ہو گا۔ سرمایہ دار اس میں آباد کے قدم کھینچ کر پہلے پہل لکھنؤ آئے / نواب آصف الدولہ

۱؎ گزشتہ لکھنؤ شرر

۲؎ اکبری نورتن ص ۴۹ طبع چہارم ۱۹۵۶ء پاکستان

... شکار کرنے آنا اور جذب کمال میں زمین کا ان کے قدم چومنا مقناطیسی طاقت تھی جس نے سونا چاندی زمرد یاقوت کو سمیٹا اور شجاع الدولہ
کے نواب نے اپنی راجدھانی بنایا۔ آب و ہوا پسند آئی اور جس ریت پر دن کو فقط سورج کی کرنیں پڑتی تھیں اور رات کو اکیلا چاند
جھانک پہونچاتا تھا وہاں ہر طرف علم و کمال کے آفتاب روشن ہو گئے جہاں سو کا مقام تھا وہاں تکبیر کی صدا سنائی دی جہاں بستی
نہ تھی وہاں تھالی پھینکو تو سر ہی سر، قدم قدم پر عمارتیں، نو آبادیاں جگہ جگہ دیسی مصنوعات کا جلوہ، زبان کا فروغ، ادب کی چمن بندی
علم و حکمت کے چشمے، فلک نما قصر، خوبصورت باغ، اونچے اونچے مندر، عظیم الشان مسجدیں اور لمبے لمبے منارے، جا بجا پل اور
مسافروں کی راحت رساں سرائیں، ٹھنڈے پانی کے امارے، کنویں، نو بیاں، جوڑے چکلے تالاب، راستے میں گھیرے درخت، مریضوں
کو بلا قیمت دی جانے والی دوائیں، دارالشفا، مکتب، تعلیم گاہ، رصد خانے دکھائی دئے۔

ـــــا ۔ آصف الدولہ نے دیدۂ لکھنؤ کا بادا آدم بن کر دیا ان زمین کو بسایا اور علم و حلم و شجاعت تہور دولت و صباحت ان کی
اولادوں کی ایلی اور تہذیب لکھنؤ کا آوازہ چار دانگ عالم میں بلند ہو۔ اور یہاں کے تمدن میں وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ دنیا تقلید پر
فخر کرتی ہے۔

نوابی کے بعد لکھنؤ شاہی کے سایۂ عاطفت میں آیا اور اس بلندی تک پہونچا جس کے بعد رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پرانے
زمانے سے جنت نظیر کی تعلیں، خلعت کشمیر قرار پا چکی تھیں اور یہ اوتر لکھنؤ کے قد و قامت کے لئے اچھی رہی۔ دارالسلطنت میں ہر فن کا
کامل ہر حقیقت کا اعلیٰ نمونہ موجود تھا کوئی شہر ایسا نہیں جس کا منظر یہاں نہ ہو نینی تال کی سیر کی، دیرہ دون کی آبشار، کشمیر کی ہریالی، پنجاب
کی فضا اور آب و ہوا صاحبان کمال کو وطن میں ملتی تھی اور پُر سکون فضا میں جو ہر ذاتی نمو پا رہے تھے۔

شہر کی چوحدی

ملک بیت سرمایہ داران اودھ کے مبارک ہاتھوں سے جب ایک سو باون گاؤں شہر کی صورت میں آ گئے تو اب حدود اربعہ کا دریافت
کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں لکھنؤ ستر تکیہ نو دلی سے بی بی پور تک پانچ کوس میں اور چار باغ سے
علی گنج تک پھیلا ہوا تھا۔ لکھنؤ کے گرد و نواح میں جو گاؤں تھے ان کے نام اس قطعہ سے واضح ہیں سہ ساری کسمی اوڑھ کے میں جھلیا
بہلیان جاؤں بہ سکراؤ وما کا ٹھوکے گدر بیٹھے ریوڑی کھدؤں رتنگ سے مسافات لکھنؤ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے بہتر نمونہ نہیں ہے۔
نوابی کا خاتمہ اور شاہی کے آغاز میں یہ حدیں دھنیا مہری کے پل اور بدھے سردں سے گزرتی ہوئی غرباً شہدرہ اور شرقاً چھٹے پر
ختم ہوتی تھیں تکیہ نو دلی شہدرہ میں تھا اور بی بی پور دلکشا میں۔ لاہور اور دہلی کے مسافروں کو شہر میں آتے وقت پہلے شہدرہ پڑتا ہے۔ اس
مناسبت سے یہاں کی پچھم حد کا نام شہدرہ ہوا۔ نوابی کے ناکے تو اب باقی نہیں ہیں مگر چھوٹی لائن کے اسٹیشنوں سے پرانے شہر کا ایک خاکہ
نظروں کے سامنے آ سکتا ہے۔ سب سے پرانی حد اسٹیشن بادشاہ نگر جہاں کا عہ کاکوری کا رفاہ میر پل ہے پھر ڈالی گنج اسٹیشن شیعہ کالج کی بلڈنگ کے
سامنے اس کے بعد شہر کا درمیانی حصہ سٹی اسٹیشن واقع ڈیوڑھی آغا میر ہے۔ پھر عیش باغ اور چار باغ کا بڑا اسٹیشن آخر میں عالم نگر B N W R
کی طرف کھلے پہلے مسلسل بستی تھی جن کی گواہی ٹوٹی ہوئی مسجدیں، رہٹے کے منارے دے رہے ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں دریا پار کی کوٹھیاں
... قریب منازل فنا ہو گئے۔ پار کا دیہات میں شمار ہوا۔ عیش باغ ویران ہو گیا میدان میں سبزا اور سوار اور درختوں پر چمگادڑیں رہ گئیں

[illegible] ۱۹۵۵ء ص ۱۹ لکھنؤ

اور سو برس پورے ہونے سے پہلے جمہوری حکومت میں پھر یہ مقامات آباد ہوئے اور اب نشاط گنج، چاند گنج، ڈالی گنج میں ایک طرف ماڈل نگر ہے دوسری سمت شہریت بڑھتی جاتی ہے ظاہر ہیں مکان اگر تو وہ کہیں دور ہے نہ غیرت جو پہلے نہیں رہی ہے۔ ہر جگہ نئی بستی ہے

عہد شاہی کا شہر اور گومتی

اگلی تمام عمارتیں جو پیرس کا نمونہ تھیں دریائے اس طرف تھیں گومتی بیچ کا ایک خط تھا اور درمیانی دونوں کناروں پر فلک نما طرز محلوں کا ایک حسین سلسلہ تھا راج سلطانی کی تبدیلی سے قلعہ مچھی بھون سے جب پایۂ تخت چھتر منزل پہونچا تو عہد آصفی کی کچھ عمارتیں تو ویران ہو گئیں کچھ باقی رہیں لیکن نئی عمارتوں کا سلسلہ دریا کے پہلو ہی میں جاری رہا اور آب رسانی کی سہولت نے ہر بلڈنگ کو دریا کنارے ساحل پر محصور کیا ہوا تھا یہ وہ ... کاٹھ والے پل تک دور دور سرکاری عمارتیں زیادہ تر جگہ گھیرتی رہیں دریائے گومتی سارا شہر سے ہوتا ہوا شہر کر جو بیور زیر حصہ ہوتا ہے اور گومتی نام ہونے کی وجہ یہ ہے۔ دریا کا پاٹ مستقیل نہیں ہے اور ندی گھومتی ہے کثرت استعمال نے گومتی نام قرار دیا ہندوؤں کی آبادی یہاں کی پرانی بستی تھی اور ان کے عقائد میں تڑکے دریا جانا، نہانا شیوۂ زندگی تھا اس لئے تنہ گھاٹ، کلیا گھاٹ، راج گھاٹ، موتی محل گھاٹ یہ مقامات بہ رتبہ تھے جہاں روزانہ مرد، عورت بچے خاص کر چندر گرہن اور سورج گرہن اور گنگا کے نہان والے دن مرد و عورت کی بھیڑ ہوتی اور پیتل کی تھالیوں میں پھول نیدے کے لے کر اور پیتل کی لوٹیا میں پانی لیکر پلٹنا عام چیز تھی برسات کے علاوہ سارے دنوں میں گومتی سے کسی کو کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا گھڑیال۔ مگر یہاں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ کچھوے البتہ بہت سے تھے کہ جس وقت کوئی عامل دریا کنارے آٹے کی گولیاں لیکر آجاتا اس وقت مچھلیاں دب دب کر سیر انداختہ ہو کر جھنگ کھو دیتیں اور آگے بڑھتے ہوئے نعل کچھوے نظر آتے۔

قلعہ

لوگ مدت عہد شاہی تک لکھنؤ میں ایک بھی قلعہ نہ تھا اس وقت کے لڑنے والے قلعہ میں بند ہو کر دشمن کے مقابلے کو بہادری نہیں سمجھتے تھے میدان میں لڑنے والے دلیر کہے جاتے تھے اور اس مورچہ کا نام گڑھی ہوتا تھا زبان اردو کے محاورے میں کسی بڑے کام کو تمام ہونا گڑھی فتح کرنا آرا بھی کہتے ہیں پیر جان کی گڑھی" یحیم گنج لکھنؤ[۱] میں اب تک ہے جو ایک مضبوط مورچہ تھا۔

آبادی میں وسعت اور محلوں کے نام

محلوں کے نام قرار دینے میں ہر محلے کے آباد کرنے والے اپنے نام کو جاننا، مصاحب الدولہ کا آباد کردہ مصاحب گنج، وزیر علی خاں کا وزیر گنج اسی طرح تمام محلے "گنج" اور "ٹولہ" اور سرائے، باغ اور کٹرہ کی اصطلاحوں کے ساتھ آباد ہوتے اور وہ ہجوم علاقہ ہو کر نیا گھر بنانے کی پبلک کو جگہ نہ ملتی تھی اس لئے بعض چالاک لوگ مسجد یا امام باڑہ کے نام سے زمین مانگتے اور لپیٹ میں اپنے رہنے کی جگہ بھی نکل آتی مشہور ہے کہ اس وقت ۵۲ گنج تھے جہاں غلہ بکتا تھا ۳۵ ترکاری منڈیاں تھیں جہاں ساگ پات (سبزی) بکتا تھا اور مہاجنوں کی ۶۰ کوٹھیاں

۱؎ گڑھی کی لفظ کو گڑھا سمجھنا صحیح نہیں ہے پیر جان کی گڑھی اور عالم بیگ کی گڑھیا دونوں ایک دوسرے سے جداگانہ نام ہیں مکانات جو اس کے ... کسی زمین مکان کی مٹی کام میں لانے سے جو گڑھا پیدا ہو جاتا ہے اس میں برساتی پانی جمع ہو کر اس نشیب کو گڑھیا کہتے ہیں گڑھیا عالم بیگ، گڑھیا گھنڈ بیگ اسی معانی میں نام رکھے گئے ہیں اور صاحب بحر ... نے اپنی لغت میں گڑھ کے ذیل میں لکھا ہے۔ مکان محمود کہ از احاطۂ دشمن ... [illegible]
کہ گڑھی مورچہ بندی کی جگہ کو کہتے ہیں اور گڑھیا وہ جگہ ہے جہاں ایک چھوٹے تالاب کی طرح فی الحال پانی بھرا کبھی پانی تھا۔

تھیں وہ بڑی خوش معاملگی سے لین دین کرسکتے اور دولت کھینچ کھینچ کر ان کے ہاتھ میں جارہی تھی رہی سے نواز گنج تک ۱۸۴۲ ڈیوڑھیاں امیروں کی تھیں جہاں دروازے پر ہاتھی اور وقت بتانے کے لئے گھڑیال بجتا تھا۔

قبرستان

کسی گھرانے میں خدانخواستہ غمی ہوجاتی تو قانون یہ تھا کہ قبرستان کے سوا مردہ کہیں دفن نہ ہو بعض مردے گھروں میں اور بعض دروازے کے سامنے دفن ہوجاتے تھے کربلائیں اور امام باڑے طبقہ شیعہ کے عام قبرستان تھے یا کچھ قبرستان خاص گھرانوں کے تھے جہاں دوسرا دفن نہیں ہوتا تھا گورستان کو ہر واڑا اور تکیہ بھی کہتے تھے تکیہ پیر خلیل، تکیہ حاجی نصرت، پہرے داروں کا تکیہ مشہور محلے ہیں۔ کچھ کچھ ہندو گھرانے ایسے تھے جہاں میت دفن بھی ہوتی تھی پرانے حیدر گنج میں بعض قبریں غیر مسلموں کی پائی گئی ہیں۔ کرامت، چھلکت، دریا میں بہا دینا یہی تین طریقے ہیں جو اہل ہنود میں تھے اور اب بھی ہیں۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ میں پہونچنے کے بعد ان کے گھرانے میں جب کوئی سانحہ ہوا تو نابلست میں لاش اٹھی۔ راج گھاٹ کا غسلخانہ اسی مقصد سے تھا پاٹا نالہ کا غسلخانہ پرانی یادگار ہے۔ غسل کون دیتا تھا اس پر آگے چل کر مقبرہ جناب عالیہ کے ذیل میں روشنی ڈالی جائے گی بچوں کی میت عموماً میس میں رکھ کر اٹھتی تھی اور یہ تھا کہ غسال ہاتھوں پر لے کر قبرستان تک آئے فاتحہ خوانی کی محفلوں میں غریبوں میں الائچی دانہ اور امیروں میں حسب حیثیت حرے، ستیر مالیں، روٹی سالن قورہ بندی ہوتی تھی۔ برعکس یہ تھا کہ کسی خوشی کی تقریب میں مٹھائی بٹتی وقت حرے تقسیم ہوں یا فاتحہ خوانی میں لڈو، پیڑے، گلاب جامن کا حصہ ہو۔ شادی میں پچ میل مٹھائی، دودھ بڑھائی میں کھجوریں، حصہ اور بسم اللہ میں لڈو، نکاح میں نقل، قرص قند کا کورہ۔ میوہ تقسیم ہوتا تھا۔

بخت کے موقع پر شادی اور غم میں یہ امتیاز رکھا گیا تھا کہ اگر ولیمہ و ضیافت ہے تو شیرمال اور کباب اور فاتحہ خوانی ہے تو شیرمال اور حلوہ۔ قورہ بندی میں بڑے امرا کے یہاں سوئم کے بعد چالیسویں کا حصہ اس شان کا ہوتا تھا (۱) کشتی میں کمخواب یا زربفت کا تھال (۲) سیپارہ (۳) ایک جوڑا قرخوانی جس پر ڈھائی تین پاؤ کا میٹھا تھیلیوں میں چکی ڈلی۔ الائچی اور ایک مینڈھا یا بکرا یا دمہ فرد پر حصہ پانے والوں کے نام مع القاب و آداب لکھے ہوئے محلہ دار بھنگیوں[۲] پر کھانا تقسیم کرتے پھرتے حصہ کے ساتھ مزدوری دینا اور انعام بھی ضروری۔ فاتحہ خوانی کا حصہ کبھی محلسرا کے اندر نہ جاتا لوگ فکر میں لگے رہتے اور دیوان خانے سے مستحقین آ کر لے جاتے۔

عدل گستر بادشاہ کے دور میں اقلیت کو پوری آزادی تھی اور لکھنؤ میں پرانے زمانے کے جو گرجا تھے ان میں خدابخش کا گرجا تو عیسائی عبادت گاہ ہے جس کے بارے میں کسی مذہبی شاعر کا مصرعہ ہے ع الٰہی معبد نصاریٰ گرجا

آلات حرب پر قبضہ:- جنگ آزادی میں انگریزوں کو آلات حرب سے جو نقصانات پہونچے ان کی تلافی اس طرح ہوئی کہ امن دوبارہ ہونے پر رعایا سے ہتھیار چھین لئے گئے اور بندوق کے لئے لیسنس حاصل کرنا ضروری ہوا حیدر بیگ کی ماڈل میں جس کا اپنے مقام پر ذکر آئے گا۔ تلوار، برچھا، نیزے، قرولی، پیش قبضیں ڈال دی گئیں اور شمشیر زنی تو یک قلم موقوف ہوگئی نشانہ بازی کے جو کرمالی ہاتھ رہے بجائے غلیل سے کبھی چھوٹی چڑیوں کو شکار کرنے لگے اور مسجدوں کے طلائی کلس کی حفاظت کرتے ہوئے بندروں کو بھگاتے تھے غلیل درحقیقت

---

[۱] میر انیس نے اسی محاورے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بستر سے سروکار نہ بالیں سے کام ہے + اپنا کسی تکیہ میں کچھ نہ ہو گا

[۲] بھنگی دو ڈھالوں کو ایک بانس میں باندھ کر کسی کاندھے پر اٹھاتے ہیں اور تقسیم حصوں کا خرد ملازم کے پاس رہتا ہے۔

یہ وکمان کے مقام پر خونریزی سے بچانے اور شکار کو مدد رسیدہ کرنے کا ہتھیار ہے جو عام طور پر تو کمان کی شکل کی اور دوسری طرح دستکاری
اس کا طرز جو چند ڈوریوں کی مدد سے غلہ پھینکتا ہے۔ دربار رام پور میں ایک شاعر کمان کاندھے پر رکھے ہوئے غلیل ہاتھ میں عجیب ہیئت سے
علاوہ بیگم نے نواب سے کہا غلیل پر کسی شاعر نے کچھ نہیں کہا تمام حاضرین دعوی سخن غور کرتے رہے کوئی شعر جب یاد نہ آیا تھا ایک شاعر
نے برجستہ کہا ۔ غلے ہمارے حاک ہیں ان کے ہاتھ میں   اس وصل مختصر کی بھی بخشش غلیل ہے
تحسین و آفرین کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں بیگم کے ماتھے پر شرم سے پسینہ آگیا علاوہ لیسدار مٹی میں روی کوٹ کر بنائے جاتے ہیں
اور ۔ ۔ ۔ ہوسے پر کام میں آتے ہ قطع الساق کی تصویر کشی میں یا ہوکے پر نجاو، ۔ ۔ ۔ سے دیدے۔

مہینہ دن تاریخ

شہر میں آباد ہونے والے زیادہ تر دہلی اور فیض آباد کے لوگ تھے وہ کیسے ہی علم دوست اور علم نواز سہی اکثریت عوام کی تھی
اور وہ چاند کے مہینوں کے نام آسانی سے زبان پر جاری نہیں کر سکتے تھے نہ وہ انگریزی داں تھے جو جنوری فروری رٹ لیتے اس
دور کے سال کے بارہ مہینوں کے نام یہ تھے محرم، تیرہ تیزی، بارہ وفات، میراں جی، مدار، خواجہ معین، ہمسایہ، خواجہ معین، شبرات، رمضان، عید، خالی
بکرعید۔ یہ نام کیوں رکھے گئے۔ اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ملک کی تاریخ پر ایک نظر ضروری ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک میں تعزیہ داری
کا دور دورہ تھا۔ محرم نام تو نہیں بدلا صرف اگلے تیرہ دن بہت منحوس سمجھے جاتے تھے اور ان دنوں میں لوگ اپنے کاروبار کو بھی روک دیتے
تھے اور انتظار ہوتا تھا کہ کسی طرح سے جلد یہ دن گذریں اس لئے سال کے دوسرے مہینے کا نام تیرہ تیزی رکھا ربیع الاول کو پیغمبر اسلام کی
پیدائش اور روضہ کے سبب سے بارہ وفات رکھا اور ربیع الثانی کو میراں جی اس لئے کہا کہ اس مہینے کی چھٹی کو میراں شاہ داتا کا عرس
پنجمی کوٹ میں ہوتا ہے۔ جان عالم واجد علی شاہ مرحوم اپنی محرومی سلطنت کا ذکر اس مہینے کا حوالہ دیتے ہوئے یوں کیا ہے ———
کہا۔ میراں جی کا مہینہ رقم کہ جس میں ہوا یہ حکم تھا غم۔ دولت وہ ختم تھی اس ماہ کی، چھٹی سلطنت جس میں محمد شاہ کی۔ اسی طرح
جمادی الاول کی ستہ کو شاہ بدیع الدین قطب المدار کا عرس مکن پور میں ہونے سے یہ مہینہ مدار کا مشہور ہوا اور جمادی الثانی کو ہمسایہ
ہوا اور رجب کی چھٹی کو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی تاریخ وصال ہونے سے خواجہ معین ہوا جو مخفف ہے خواجہ معین الدین کا۔ خواجہ
صاحب ہندوستان کے بہت بڑے بزرگ ہیں ان کے عرس میں اجمیر شریف میں ہر سال بڑی بھیڑ ہوتی ہے رمضان شریف، محرم کی طرح اپنی حالت
پر باقی۔ عید کی عربی لفظ کو اردو نے اپنایا اور ترجمے سے عید کر دیا اور چونکہ عید و بکرعید میں ایک مہینے کا فاصلہ تھا اس لئے سال کے گیارہویں
مہینے کو خالی کہنے لگے اور بکرعید پر بارہواں مہینہ پہونچ کر برس دن پورے ہوگئے۔

ناموں کا معیار۔ دیش کے رہنے والوں میں یادگار کا جذبہ فطرتاً موجود تھا اور نئے پیدا ہونے والے بچوں میں نام رکھتے وقت ماں باپ نے
سال کے چھ مہینوں کو یاد رکھا اور مردوں کے نام محرم علی، رجب علی، شعبان علی، رمضان علی اور ربیع ثانی میں شبراتی، رمضانی، عیدو
اور بکریدی رکھے گئے اور عورتوں کے ناموں میں اس طرح تانیث کی جھلک پیدا کی شبراتن، رمضانو، ادیا، کبرن، بکرین اسی طرح
نام رکھنے میں یہ لوگ مہینے کے ساتھ دن کو بھی ۔ ۔ جمعرات جمعہ کو پیدا ہونے والے بچے کا نام مرزا جمعہ یا آدینہ بیگ یا جمن منگل کو پیدا ہونے والے کا

۱؎ واجد علی جنتری ۱۹۲۹ء ص ۔ طبع کانپور ۔ ۲؎ مثنوی حزن اختر از واجد علی شاہ
۳؎ دیکھو ۔ ۔ ۔ اور FRIDAY کو اہل علم آدینہ بھی کہتے ہیں (مؤلف)

نام عورت ہے تو منگو، مرد ہے تو منگل خاں۔ چہارشنبہ کے دن پیدا ہونے والے کا نام مرد ہے تو بدھو، عورت ہے تو بدھیا دوسری قوموں میں شاید ہی یہ جذبہ ہو۔

زبان

سلطنت میں داخل ہونے والے کچھ تو فتحمند فرمانرواؤں کی اولاد تھے جن کی مادری زبان فارسی تھی اور ایک بڑا آنے والے حصہ [illegible] اس زمانے کی اردو تھی جو دکھن سے پیدا ہو کر دہلی میں پرورش پا رہی تھی اور انقلاب زمانہ سے بھرپور جوانی میں قبل از وقت اس کو دہلی چھوڑنا پڑا سرزمین لکھنؤ نے پناہ دی یہاں کی تراش خراش آب و ہوا گرد و پیش نے خاص اثر ڈالا اور لب و لہجہ میں نرمی کے ساتھ ساتھ وہ شگفتگی ہوئی زبان پروری کی گراں قیمت یک قلم چھوڑ دیں اور آگے ادب میں اب ایسے کمال کو دیکھ کر بکھرے ہوئے بالوں کو اس طرح سنوارا۔ اگر دوار میر نے محبت کا دم بھرا۔ انیس تا حیات عقیدت کے پھول نثار کرتے رہے دبیر نے کلمہ پڑھا اور نہ جانے کتنے ادیب اپنے زمانے میں زبان پر پروانہ وار تصدق اور نثار ہوتے رہے۔ چکبست[1] نے اس چمن کی گلچینی کی اور آخر میں مولانا سجاد حسین[2] نے نثر میں وہ کیف پیدا کیا جو ابھی تک نظم کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ غرض یہ کہ عدالتی کاغذات شاہی فرامین اگلے زمانے میں فارسی میں لکھے جاتے تھے اور لکھنؤ کے امراء اور عام باشندگان کی وہی زبان تھی جو ابھی تک رستوگی لوگ اشرف آباد سوندھی ٹولہ راجہ کے بازار میں ہے اور جدید آنے والے اردو میں چار چاند لگاتے رہے۔ سمجھے تھے کہ حکومت بدلی ملک بدلا وہ نقشہ نہ رہا نیا سکہ چلا مگر زبان بدل نہیں سکتی لیکن افسوس ہے کہ صاحبان زبان کے مرنے سے لطف زبان بھی فنا ہو گیا شہروں شہروں کے رہنے والے اقطار و اکناف عالم سے سمٹ کر آباد ہوئے اور پردیسیوں کی معاشرت نے زبان کو مسخ کر دیا اور وہ وقت آگیا کہ

؎ وطن میں بیٹھ کے روئیں گے ہم زباں کے لئے

چوکیدار اور پہرہ

عہد شاہی کا پہرا جس کی ہم عنقریب نقشہ کشی کرتے ہیں انگریزی ہوتے ہی رفتہ رفتہ موقوف ہو گیا اور اب راتوں کو چوکیدار گلی گلی ڈراؤنی آواز سے کھنکھارتے پھرنے لگے اگر کوئی بچہ جاگتا ہو تو ماں باپ کے پہلو میں سہم جائے اور "جاگتے رہو" کی صدا برداشت نہ کر سکے اس حکم نادری کا مطلب یہ ہے کہ پیسہ والے جاگتے رہیں اور مفلس سوئیں یا سب جاگتے رہیں ادھر تو حفظ صحت میں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اُدھر جاگتے رہو کی آواز، اگر اس حکم پر رعایا عمل کرے تو صبح کو نہ دفتروں میں کوئی اہل کار پہونچے نہ کوئی دوکان وقت پر کھلے سب سوتے رہیں گے اور نہ سوئیں گے تو بے شمار بیماریاں پیدا ہوں گی عہد شاہی میں انگریزوں کے زمانے کا ایسا معرصت پہرا نہ تھا بلکہ یا علی[3] حیدر" حکم حیدر" کہہ کر پہرا ہوتا تھا جرائم پیشہ کے سامنے کسی الصاف در بہادر کا نام آئے تو وہ ڈر جاتا ہے اور ارادے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ عہد نصیر الدین حیدر بہادر میں "حکم حیدر" کی لفظ نے اور لطف پیدا کیا تھا۔ حکومت کی طرف سے چوکیداروں کے علاوہ امیر تک رئیسوں کی ڈیوڑھی پر بھی پہرہ دار نوکر تھے جو تمام رات اپنے مالک کی محلسرا کے گرد اسی طرح پہرہ دیتے تھے۔ آغا ئی صاحب کی ڈیوڑھی پر بلندہ میں اور چوک میں چودھرائن طوائف کے یہاں اسی طرح پہرہ ہوتا تھا۔

---

[1] [illegible] ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے بریلی میں آپ کا جام عمر لبریز ہوا قیصر باغ میں چکبست روڈ انگریزوں کے وقت سے اب تک ہے [2] ۲۸ محرم ۱۳۵۲ھ کو یہ شہنشاہ مملکت [illegible] کی نذر ہو گیا۔ [3] منادی دہلی جلد ۱۴ شمارہ [illegible] میں گوپی ناتھ امن کے مضمون میں بھی یہ ذکر ہے۔

لکھنؤ کی بنی ہوئی خاص چیزیں

جو اشیاء اپنے خصوصیات کے لحاظ سے کہیں نہ ملیں ان میں پنج گوشہ ٹوپی لحاف اور رضائی کی فردیں مٹی کے کھلونے اور تصویریں، عطر، چکنی ڈلی، چکنی مٹی، چکنی کا جوڑا، چکن، کامدانی، ستارہ دار، سماری، تیرمال، گاؤ سیان، گھیتلا جوتہ، زیرپائی، کمتی، انگوٹھیاں، سادہ کاری، مدریہ حقہ، صراحی، جھجری کاغذی، آبخورہ، کاسنی ہانڈی، ہماوان، عماری جالیاں، اونی چھپیں، جوتیاں، پائجامہ، انگرکھے، تلنگے کے برتن، کشتیاں یہاں کی عام چیزیں ہیں ان میں ہر چیز ہندوستان کے کسی بازار میں نہیں ملتی اور اگر ڈھونڈنے سے مل بھی جاتی تو لکھنؤ کی بنی ہوئی یا یہاں کے نمونے پر تیار کی ہوئی ہوگی عقیق اور دھات پر نام کندہ کرنے والے بھی ایسے باکمال اور خوشنویس تھے جو اپنا جواب نہ رکھتے تھے جو اشیاء اب رواج نہ ہونے سے پائی نہیں جاتیں ان کا آگے اپنی جگہ پر ذکر ہے کا بعض مصنوعات کا اس مقام پر ذکر کیا جاتا ہے جو اب بازار میں نہیں ملتے اور کچھ دن کے بعد ان کا نام بھی باقی نہ رہے گا ملاحظہ ہو۔

گھیتلا جوتہ:- ایک زمانہ وہ تھا کہ شرفاء کی عام وضع یہی تھی جسم پر اچکن سر پر کلاہ اور کرتے کے نیچے کلیدار پائجامہ پاؤں میں یہی گھیتلا جوتہ پچھتر برس پہلے کے فوٹو دیکھو۔ مشکور الدولہ اور اصغر جان فوٹوگرافر کی اتاری ہوئی تصویروں میں مخملی جوتہ ضرور ملے گا یہ ایک قسم کی سلیپر تھی مگر اس میں ایک لپٹی ہوئی سونڈ کا اضافہ تھا جس کی جگہ گھوما ہوا حصہ تسمہ کی آمد کی



طرح عہد شاہی ختم ہوتے ہوتے اس کا رواج ختم ہوا اور صرف شادی بیاہ میں مبارک سمجھ کر دولہا کو پہنایا جاتا تھا رفتہ رفتہ نوجوانوں نے جو شرماکر اس وقت بھی پہننا چھوڑ دیا اور کاریگر جن کا کوئی دوسرا روزگار نہ تھا فاقوں سے مرنے لگے۔ یہ جوتے عام طور پر زردوزی مخمل کے ہوتے تھے اور شادی بیاہ میں بھاری اور کامدار پہنائے جاتے تھے۔

کفش:- عالم اور بوڑھے عبادت گذار ہمیشہ کفش پہنتے تھے جس کی صورت گھیتلے جوتے اور سلیپر کی درمیانی تھی۔ پیچھے کی طرف سے پوری سادہ چمڑے کی گوٹ اوپر مخمل یا کیمخت جو ایک دمدار گھر چمڑا ہوتا تھا تو بیچ جو طوطی انداز نہ تھا مگر ایڑی میں لوہے کا ایک خاص طرح کا نعل ہونا ضروری تھا اس کو پہن کر چلنے میں ایک قسم کی تکلیف ہوتی تھی جس کو تارک دنیا راحت سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اگر قبلہ کو غصہ آجائے اور کسی گنہگار کے سر پر کفش رسید کردیں تو اس کے سر پھٹنے میں ذرا بھی دیر نہ لگے۔ کفش بنانے والا لکھنؤ کا پہلا کاریگر تھا پھر رمضان خاں اور کریم بیگ کی سرائیں بنا کر بیچتے تھے اس وقت ارزانی میں دو ڈھائی روپیہ قیمت تھی۔ آخر میں ماحسن جدت فروش مرمنس تنے پر تیار کرتے تھے۔ پہننے والے نہ رہے تو یہ کام بھی بند ہوگیا مگر اس سے ملتی جلتی نعلین اب ہوتی ہے مگر وہ بات کہاں جو کفش میں تھی عراق و حجاز کے سفرناموں میں کفش کی بابت اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں انشاء پردازی میں آپ کا "کفش بردار" برابر لکھا جاتا ہے اور یہ استعارہ اسی کی طرف ہے۔ آتش کے شعر میں کفش کا ذکر اس طرح ہے۔

اس قدر ناگوار ہے کبر اپنی خلق کو — کفش سے رکھتے ہیں مردم نعل آہن زیرپا

زیرپائی:- ترلور کے بیچ جو لوگ شوقیہ کھاتے ہیں ان کے بیچ دانت سے کھلنے پر بیچ کے دو درجوں میں سے ایک رخ کا آدھا حصہ اگر کترلیں اور رہے وہی زیرپائی ہے رمضان خاں، ذاکر حسین اس کے آخری کاریگر تھے اور بیچ کی سرا میں چھ سات آنے کو بکتی تھی بچکانہ کی ... آنے قیمت تھی کسی لڑکے کو جوتا پہنانا ہو تو سب سے سستا جوتہ زیرپائی تھی بردوں چمڑے اور کبھی کبھی ... مخمل کی

میں پہلے اس کا رواج تھا مگر مرقومہ بالا دونوں کاریگروں کے بعد یہ کام بند ہو گیا۔

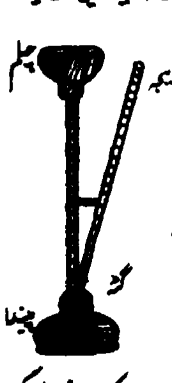
مدریہ حقہ:۔ مشرقی تہذیب کی بزم میں حقہ ہمیشہ زینت محفل سمجھا گیا اور صاحبان ذوق نے اس کی مختلف صورتیں کئی کئی طرح کے نام قرار دے بڑے طبقے میں پیچوان، گڑگڑی، ڈیڑھ خما سنک۔ نعل دار مدریہ تھے جس کو ہندو مسلم امیر بہار سے پیتے تھے اور نیچے طبقے میں ناریل نے یہ جگہ لی تھی۔ جو کہار، کنجڑے اور ہندو مزدور پیتے تھے سلسلہ شعر و سخن میں بھی حقہ کا ذکر ہے۔ حکایت شیخ امام بخش ناسخ غازی الدین حیدر بہادر کے دربار میں حاضر تھے سرکار کے سامنے حقہ تھا حکم ہوا شیخ صاحب حقہ پر کچھ کہئے۔ ناسخ نے بادب عرض کیا ؎

حقہ جو ہے حضور معلیٰ کے ہاتھ میں — گویا کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر — بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

حکیم پیٹ کے بیماروں کو حقہ تجویز کرتے ہیں اس پر تنگس۔ تمباکو یا دھوئیں کا معدہ اثر نہیں پڑتا حقہ کی ہر چیز دکھ درد کی دوا ہے گل پسا ہوا دانتوں کی صفائی میں ٹوتھ پاؤڈر کا کام دیتا ہے۔ کیٹ مرہم کی جگہ بعض بیماریوں میں لگائی جاتی ہے' آب قلیاں کہہ" بہت دل کے بجھے ہوئے حقہ کا پانی جو بدلا جاتا ہو سانپ کے کاٹنے پر مار گزیدہ کو پلایا جاتا ہے اور بار بار قے آنے کے بعد اثر جاتا رہتا ہے حقہ کا سارا ساز و سامان یہ ہے مہنال، نیچہ، تعلی، گڈہ، چینا، چلم، توا، گنج، جھر، دست پناہ، نفاست پسند لوگ حقہ کو پیتل کے ایک تھال میں رکھتے ہیں تاکہ فرش پر انگارہ یا چنگاری نہ گرنے پائے۔ باہر کے لوگ پیندے کو فرشی کہتے ہیں جو لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے چوک میں حقہ پلانے والے بھی سیر کرنے والوں کو آرام کرنے کے لئے اپنی خاص وضع قطع میں پھرتے تھے اور گھریلو زندگی میں حقہ مرد و عورت برابر سے پیتے تھے۔ میر حسن کہتے ہیں ؎

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقہ کے لے — چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

اگلے زمانے میں ساری محفل میں دو ایک پیچوان یا بڑے حقے ہوتے تھے اور وہی مشاعرہ کی شمع کی طرح صاحبان ذوق کے سامنے گشت کرتے تھے حکیم اللہ خاں نے مدریہ حقہ ایجاد کیا اور اس کو درجہ بالا نشیں نے وہ فروغ حاصل کیا کہ محفل میں جتنے حاضرین ہوں اتنے ہی حقے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قد و قامت میں چھوٹا، بڑے مجمع میں جگہ کم گھیرنے والا نقشہ دو نرکل سیدھے جوڑ دیتے ہیں حقہ تیار ڈیڑھ حقے میں نگالی نکلے موڑے نعل کی زحمت اور ایک طول عمل تھا قیمت کے لحاظ سے سستا بھی تھا چلم اور تمباکو بھرا بھرایا اکبری دروازے میں دو موٹے پیسے کو بکتا تھا منشی ہرگوند سہائے کو غالب نے جو خط لکھا ہے وہ یہ ہے۔



"ہم تو آپ کو سکندر آباد قانون گویوں کے محلہ میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدریہ حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔"

یہ تمام مصنوعات دیسی نہ تھے بلکہ دور دور سے اہل ہنر آئے اور قدر دانی دیکھ کر بس گئے نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے صاحبان کمال اس زمین میں جذب ہو گئے اور یہ ہرشے لکھنؤ کی ہی ہوئی شمار ہونے لگی۔

حقہ پر علماء اسلام کے تالیفات ہیں ملاحظہ ہو۔

(۱) اقامۃ البرہان علی حلۃ القلیان از تصنیف مولانا سید ابوالحسن صاحب مرحوم لکھنوی
(۲) فصل الخطاب در حلۃ قلیان از تاج العلماء سید علی محمد مجتہد لکھنؤ
(۳) قول فیصل در مناظرہ تاج العلماء متعلق حقہ
(۴) تبیان در حکم قلیان ملا معین الدین نولکشوری فہرست میں اس رسالہ کی قیمت تین پیسہ ہے۔
(نوٹ) اخباری حضرات حقہ پینا جائز نہیں سمجھتے یہ ان کے حوالہ جات ہیں

باہر کے آدمیوں کی پہلے پہل آمد

چھ سو برس پہلے دیس کا کیا حال ہوگا دیہاتیت کی چار سو ہوا، کنوئیں سے دور بسنے والوں میں پانی کی نایابی، قحط آب شہریت کا پتہ نہیں گاؤں کی سادی زندگی آبادی ہوئی تو کھیتی باڑی کرنے والے مرد و عورت کے ساتھ گائے بیل، ہل، رتھ چھپروں میں زندگی اور کہیں کہیں کھپریل اوپلوں کے جابجا ڈھیر، کھنیاں ان کے بعد سناٹا ویرانہ ہوا گیدڑوں کی آوازیں لومڑیاں، سور، منڈیلے کی بھیانک صورتیں دو دو کوس پر کچی سرائیں، آدمیوں کا کہیں کہیں پڑاؤ مگر چوروں کا ڈر، مسافر کے کانٹے زیر پا، سارے دن درندوں کی آمد و رفت، رات بھر کتے بھونکنے کی آوازیں، سورج ڈوبتے وقت اور صبح کے سہانے لمحات میں پرندوں کے چہچہے ہنڈیوں کا سیرا دلفریب تھا ورنہ ہر گھڑی جان و مال کا ڈر۔ لیکن کچھ ایسے نڈر تھے کہ نہ ان کو اونچی چھتوں کے زیر سایہ آرام کی عادت تھی نہ فکر آب و دانہ ان کے ارادہ کو پس و پیش میں کھلتا تھا ماحول کی تلاش میں سرگرداں تھے صحرا نوردی عادت تھی جہاں جس میں آتا اتر پڑتے اور رزاق پر بھروسا ہوتا وہی زمین ان کی جاگیر تھی وہی مٹی ان کی آخری خواب گاہ ہوتی اور جو رہ رہتے گویا دلوں میں چھوڑ جاتے سب سے پہلے لکھنؤ میں صوفیائے کرام کے قدم آئے اور میں سمجھتا ہوں کہ بھارت کی ہر بستی میں اولاً اولیاء اللہ مہمان ہوئے وہ بھکاری کی صورت میں تھے مگر ان کی جھولی میں بہت سے گوہر آبدار تھے چہروں پر رعب، سچائی میں جذب، زبانوں میں اثر، ارادوں میں استقلال، دشمن سے ہمیشہ بے خوف ہوتا۔ سارا جہان اگر ان کو ولی نہ مانے تو کم از کم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سچ بولتے تھے مکر و فریب کا نام نہ جانتے تھے۔ فرقہ وارانہ جذبہ سے ان کے دل خالی تھے یہی وجہ ہے کہ ملک کی اکثریت میزبان بن کر ان کی عزت کرتی تھی اور ان کے پڑاؤ میں رکاوٹ پیدا نہ کی وہ نڈر ہو کر ایسا بسے کہ مرتے دم تک اس زمین کو نہ چھوڑا آج ان کی بود و باش کے رہے سہے نشانات باقی ہیں۔ حالات صوفیائے کرام پر جو کتابیں لکھی گئیں کچھ تو صرف عقیدت ہی عقیدت ہیں فکر و نظر کی گنجائش نہیں اور جو تاریخ کی روشنی میں نذر قرطاس ہوئیں ان کے فرد فرید ہونے سے جانچ پڑتال کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔

اس مجمع میں کچھ تو ایسے ہیں جن کے فقط نام نظر آتے ہیں نہ سکونت کا پتہ ہے نہ یہ معلوم کہ کس سال انھوں نے جام وصال نوش کیا اور کہاں سپرد خاک ہوئے کچھ وہ ہیں جن کے نام اور سالہائے وفات تو ہیں مگر کہاں رہتے اور کہاں مدفون ہوئے ان کا حال نہیں کھلا۔ ہاں کسی کسی کی فرودگاہ اور مزار کا سنہ وفات کے ساتھ ذکر ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قریب [illegible] سرزمین پر حاجی الحرمین آئے اور [illegible] سے قبل وہ اپنا حلقہ اثر دیہی کر چکے تھے۔ مخدوم شاہ مینا اور ان کے گرو [illegible]

٭ مرد سیاہ رنگ تھے جن کو عوام نے بجائے سیاہ رنگ سارنگ کہنا شروع کیا۔

[illegible] کے نام لیے جاتے تھے ان کے بعد شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ کندوری فرزند آئے اور ۲۲ ربیع الاول ۱۰۲۳ھ کو ان کے پاس بھی
پیام موت آیا اور دنیا سے گذر گئے یہی زمین ان کا بھی مدفن ہوئی پھر شاہ پیر محمدؒ نے اس ویرانہ میں قدم رکھا اور ۱۰۸۰ھ میں
[illegible] خلق کے بعد وہ بھی پیوند خاک ہو گئے ان کا پرشکوہ مقبرہ ٹیلے کی مسجد کے سامنے اب تک موجود ہے یہ پانچ شخص لکھنؤ
[illegible] بادی پہلے آنے والوں میں تھے جو اپنی موت سے مرے اور ان کے کردار نے عقیدتمندوں کو یاد رکھنے کا ذریعہ بخشا۔ وہ
[illegible] کا ذکر بھی جرم عظیم تھا وہاں کے رہنے والے بھلا یہ ممکن تھوڑی تھا کہ آدمی کا خون بہاتے مگر اچھے اور برے اس دنیا
[illegible] رہے اور کوئی زمانہ ایسا نہ تھا جو پاپ سے خالی رہا ہو۔ گیارھویں صدی ختم ہو کر بارھواں قرن شروع ہو رہا تھا کہ
[illegible] ایرانی جنگ بانسوارہ میں شہید ہو گئے کتابوں میں ان کا نام اور سنہ وفات تو میں نے دیکھا مگر کیفیت شہادت
معلوم نہ تھی یہاں تک کہ کھنڈرات میں ان کی قبر برآمد ہوئی اور سنگ مزاریوں پڑھا گیا: دوست محمد ولد عوض علی اصفہانی در جنگ
بانسواڑہ در سنہ یک ہزار و یک صد و یک ہجری شہید شدہ

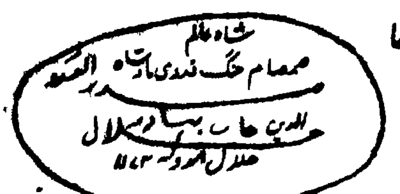
مؤلف کے گھر سے قریب یہ سینیری روڈ کا واقعہ ہے جو تفصیل سے آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے یہ کس دار وگیر کا واقعہ ہے
[illegible] قاتل تھا؛ کچھ خبر نہیں۔ اس قدر مشاہدہ ہے کہ مرقوم افراد کی قبروں جن کے نشانات باقی ہیں قوالی ہوتی ہے اور یہ قبر قوالی
[illegible] بھی محروم ہے شاید اس مرنے والے کے ذوق کے خلاف عقیدت مندوں کا یہ اقدام تھا جو رواج نہ پا سکا۔ محراب قبر پر
مظلومیت برستی ہے۔

پیر محمد شاہ وحدت کے قدم آئے اور رجب ۱۱۲۰ھ کی چوتھی کو خاک ہستی ذرات ارضیہ میں مل گئی۔ ان کے بعد شیخ غلام
نقشبندی نے اس سرزمین پر ۱۱۲۲ھ میں قدم رکھا اور آخر میں مولوی نظام الدین کا دور دورہ ہوا اور یہ محترم ذات ۱۱۶۱ھ تک بقید
حیات تھی۔ اول الذکر دو شیوخ کی آمد میں قریب سو برس کے فاصلہ تعجب ہوتا ہے اور ثانی الذکر کے تیسرے دور تک ۲۶۵ برس کا خلا
رہ کر پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مہاجرین کی آمد میں تقرار کا نام ملا مگر تاریخ اس بات کے بتانے سے قاصر ہے نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اب
بھی زمین بیابان رہی اور شہر کہے جانے کے قابل نہ تھا۔ بستی بسانے کا سہرا آصف الدولہ کے سر رہتا ہے پہلی عمارت کہاں بنی اور کیا نام
قرار پایا لفظانے بگڑ کر کیا صورت اختیار کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ملے گی منتظر رہیے۔

عالم اور فاضل

عہد عالمگیر میں مسلمانان لکھنؤ کے قاضی حافظ امان اللہ بنارسی تھے جنہوں نے ۱۱۳۳ھ میں جانشی موت سے دنیا چھوڑی۔
[illegible] کا زمانہ شروع ہونے پر عہد نواب سعادت علی خاں میں محکمہ قضا چار شخصوں کے سپرد تھا مفتی محمد نعمت اللہ، مفتی غلام حسین خاں
مفتی سعد اللہ خاں، مفتی گھسیٹ خاں اور مفتی اعظم کا عہدہ مفتی حلال کے سپرد تھا ان کی خطابی مہریں جو محکمہ قضا کے وکیل
[illegible] اسد علی بن میر دلیل خاں تھے جو ان عالموں کے سامنے بحث کرتے تھے۔ ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۱۱ھ تک ان کا فیصلہ اور تحریریں میں نے دیکھی

[illegible] ان آنے والوں کے حالات محلہ وار اپنے مقام پر آئیں گے ۔ ۲ یہ حالات زیادہ تر گلشن فقیری اور حیات الاحیار مؤلفہ عبدالرحمن رکن الدین حاجی محمد احسن دمشقی صابری
[illegible] عبدالحلیم سے ماخوذ ہیں ۔ ۳ تاریخ صدرلیہ از خادم علی سندیلوی ص۱۱۱ ۔ ۴ مقدمہ زیارت گاہ قدم رسول نوبہ لکھنؤ کے ساتھی ماہ میں یہ مہریں [illegible]
[illegible] شیعہ عالم غفران مآب کے ہمعصر تھے اس دستاویز پر ان کی بھی دستخط ہے۔



اس کے بعد صدر الصدور کا عہدہ مولوی مدن کو ملا جن کا اصل نام مولوی مجید الدین تھا ، وہ شاہجہانپور محلہ شرقی کے رہنے والے تھے ۔ امیر مینائی کا یہ شعر ان کے بارے میں بہت مشہور ہے ۔

بڑھائی شیخ نے ڈاڑھی سن کی سی + مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

مولوی مدن کے بھائی مولوی سدن تھے ہر دو برادران کی کوٹھیاں وطن میں موجود ہیں ۔ ان کے بعد دیوانی مولوی ظہور اللہ انصاری کو یہ دستوری ۔ تاریخ میں ہے کہ وہ اس قدر جلد نوشتے تھے کہ مات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی ۔ خادم علی سندیلوی ان کے شاگرد تھے معقولات میں منفرد تھا ۔ دینیات کی کتابوں پر ان کے حواشی ہیں منطق کی کتاب میر زاہد رسالہ پر ملا عاری الدین حیدر کا لکھا ہوا حاشیہ نسخہ اور حاشیہ مکتبہ ممتاز العلما میں موجود ہے اور حاشیہ پر جو نوٹ ہے اس سے واضح ہوتا ہے آپ ۱۲۲۳ھ تک زندہ تھے یہ حال تو علماء اہلسنت کا تھا ۔ امامیہ کے مقدمات دیوانی معتمد الدولہ سید محمد باقر اور فوجداری علامہ سید مرتضیٰ مجتہد العصر والزمان کے دونوں کے سپرد تھے بادشاہ کے زیر حکومت ہوئے پر تاج کسی عالم کے ہاتھ سے شاہ کو پہنایا جاتا ۔

اخبار ۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ عہد شجاع الدولہ میں تیاں[۱] الاخبار لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اس وقت لکھنؤ آباد کہاں تھا ۔ پریس کس کا تھا یہ بیان سمجھ سے باہر ہے پھر بادشاہ معتمد الدولہ میں اخبار مجید[۲] جاری ہوا جو کلکتہ سے چھپ کر لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا ۔ پرانے کتب خانوں میں اخبار طلسم کے نمبر بھی ملتے ہیں ان اخباروں کے سوا کوئی مشہور ادبی اور تاریخی جریدہ نہ تھا ۔

پریس ۔ عہد نصیر الدین حیدر تک شاہی پریس ٹائپ کے حروف میں چھپتا تھا شاہ موصوف سے مسٹر آرچر کو ۱۸۳۰ء کے قریب کا یورپ سے بلا کر لکھنؤ میں پتھر کی طباعت کو رواج دیا ڈاکٹر اسپرنگر کے قول کے مطابق ۱۸۴۸ء میں شاہی مطبع کے علاوہ بارہ غیر سرکاری مطبع تھے حسن خط ، شان طباعت ، صفائی ، پختگی کا نمونہ ہر فنی پریس اور پبلیشنگ کی طباعت آج تک پیش نہ کر سکی ۔ شاہی پریس سے ہر علم و فن کی کتابیں چھاپی گئیں ادبیات ، مذہبیات ، اخلاقیات ، درسیات ، فقہ ، حدیث ، تفسیر ، لغت جو کتاب سلطانی مطبع میں چھپی وہ پرانی مشینوں سے چلنے والی تاج کیسی بھی برتری حاصل نہیں کر سکی ۔ اردو زبان میں مذہب امامیہ کی پہلی تفسیر اس پریس میں طبع ہوئی ۔ شاہنامہ اردو سی چھپا ہفت قلزم معرکہ آمار لغت زیور طبع سے آراستہ ہوا ۔ یہ وہ علمی اور ادبی کارنامے ہیں جو سلطنت دہلی پیش نہیں کر سکی

عوامی ذوق ۔ آج جبکہ ہر طرف عربیت کو فروغ کی کوشش اور مائنڈ اسکول عربی تعلیم کے لئے کھل رہے ہیں پچاس سال پہلے کا قصہ ہے کریم بخش ۔ جو تراش جو زیادہ تر علماء مجتہدین کے بال کاٹتا تھا اس نے آموں کی فصل میں دسہری آم لینا چاہے آم والا سمجھتا تھا کہ یہ نائی ہے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا جواب میں کہا کہ یہ عام گاہکوں کے لئے نہیں ۔ خاص خریدار لیں گے ۔ کریم بخش نے عام و خاص کی اصطلاح سنکر بے ساختہ کہا مجھے مطلق ضرورت نہیں ۔

عام ، خاص ، مطلق تینوں اصطلاحیں اصول فقہ کی ہیں کریم بخش علماء کو قوانین الاصول پڑھاتے سنکر انہوں نے لفظیں دل نشین کیا تھا سننے والوں کو حیرت ہوئی ۔ لطف یہ تھا کہ اس موقع پر بھی سنجیدہ طبقہ تھا جس نے لطف حاصل کیا [۳] ، گلگر کے کوچہ سے ایک طرف

---

[۱] تاریخ اودھ حصہ ۵ نجم الغنی [۲] تاریخ اودھ جلد دوم ص ۵۵ نجم الغنی [۳] مرقع جلد چہارم ص ۱۱۱

گزرہا تھا کہ ایک کریہ منظر سیہ فام عورت خاموش راستے سے گزر رہی تھی دوسری عورت سے ملاقات ہوئی صاحب سلامت کے بعد اس نے کہا جب انوار منزل چھوڑی جاتی ہو تو ساسا ہوتا ہے۔

ان جملوں کو سنکر اس نے جواب میں کوئی کال اٹھا نہیں رکھی جو دی رہو۔ سننے والے اس چھیڑ پر بھڑک گئے دوسم شخص بنا رمخاصمت کچھ نہیں سکتا تھا عام طور پر منزل ادا ہوتا۔ کو لوگ بھٹکا صدقہ کرکے چھوڑتے ہیں اور وہ لاسر لگے ہوئے پر ملاحظہ پوری طاقت سے اڑھی نہیں سکتا مارا مارا پھرتا ہے۔ چھیڑنے والی عورت نے اس کی مدموری کو صدقہ کا کھڑکا کہا

شعــــرار

اگر شاعر ترجمان ملت اور صحیح معنوں میں خدمت گزار ادب ہو سکتا ہے تو سلطنت اودھ میں اردو فارسی عربی داں شعراء نے اپنے نتائج افکار اور گردش قلم سے وہ کوس لمن الملک بجایا جس نے دنیا کو عرفی انوری خاقانی امرا ریقس کا عہد یاد دلا دیا اور وطن میں وہ تاثیر بھی کرعورمیں کیے۔ ایک والے کھوڑے موزوں طبع تھے۔

<u>عربی داں شاعر</u> ۔ اردو فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ عربی کلام بھی شعراء کا اس قدر ٹھوس اور پختہ تھا کہ عراق و حجاز اہل زبان بے ساختہ داد دیتے تھے اور قادر الکلامی کو مانتے تھے چنانچہ غیر ملکی زبان میں طبع آزمائی کرنے والوں کی فہرست بسیط ہے اور مشہور شعراء میں شمس العلماء مفتی میر عباس صاحب اور ان کے ہمعصر صاحبان ذوق کا کلام جن کے تذکرے چھپے ہوئے موجود ہیں نظر انداز کرکے غیر معروف شعراء کا تعارف کرتے ہیں۔ سلطنت اودھ نے ہر خانوادہ ہر نسل میں عربیت کا ذوق پیدا کر دیا تھا جو عالمانہ لباس میں رہتے تھے وہ عربی ادب میں نمایاں اور ممتاز رہتے۔

(۱) نواب باقر علی خان تشنؔ رئیس شہر ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر اور اوّل درجے کے متکلم تھے مناظرانہ چاشنی نے اشعار میں اور زیادہ سامعہ نوازی پیدا کر دی تھی اور یہ مثنوی[1] پڑھ لینے والا آسانی سے مناظر بن سکتا تھا۔ اس مثنوی کے افتتاحیہ شعر ملاحظہ ہوں

حمدت الذی وحدہ بالیقین + شکرت الذی ارحم الراحمین

علیمٌ حکیمٌ سمیعٌ بصیر حبیر علی کل شیٔ قدیر

(۲) مرزا دبیر علی قدیم اساتذہ میں تھے سلطان العلماء مجتہد العصر والزمان جن کا ذکر خطوط غالب میں بار بار آیا ہے تاریخ وفات میں ان کا یہ مصرعہ تاریخ روح ادب ہے ع الکمیت شمس سماء العلم ۲۸۴ قدیم کے دو استعار بھی مخطوطات ممتاز العلماء میں موجود ہیں۔

(۳) مرزا علی حسن کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں کہ کس کے بیٹے اور پوتے تھے تاریخ گوئی میں اپنے ہمعصروں کے پہلو میں اشعار بھی ملتے ہیں وہ ایک لڑکے محمد اصغر کی تاریخ پیدائش میں فرماتے ہیں دھومس دس بیۃ ابراھیم ۱۲۸۱ھ کا یہ پورا عربی میں میری خاندانی بیاض پر لکھا ہے پیدا ہونے والے بچے کے باپ کا نام ابراہیم تھا۔

(۴) کیوان خاندان علم سے نہ تھے لکھنؤ کے علمی ماحول نے ان کی ظرف علم میں وہ صلاحیت پیدا کی کہ عربی میں باتیں کر

---

[1] یہ مثنوی مطبوعہ ۱۲۸۳ھ کو اردو میں چھپی ہے جو میرے پاس موجود ہے گو دیباچہ عربی میں ہے۔

بھی تو یکیں عربی مخطوطات میں موجود ہیں۔ نواب امین الدولہ کی کربلا میں لوح تعمیر پر انہیں کا قطعہ تاریخ ہے ان ھذا مرقد العباس مسلط ہیں۔ اودھ کے زمانے میں عربی لٹریچر جو ضبط و تدوین میں آیا اس میں اوراق الذہب، طل ممدود، سبیکۃ الذہب وہ بلند پایہ کتابیں ہیں جو حریری سے کم نہیں ہیں۔

فارسی شعراء :- ملک میں داخل ہونے والے متصد فرما سرداروں کی اولاً فارسی بول چال تھی اور اردو کو ان کی بزم میں ثانوی حیثیت حاصل تھی اس لیے شعر و سخن میں کمال حاصل کرنے والے زیادہ تر فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ لکھنؤ کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے علمی حقائق پر کوئی توجہ نہیں کی اور فکر رسا نے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا۔ سلطنت اودھ کے فارسی شعراء میں ہم کو تین طبقے قرار دینا پڑتے ہیں (۱) وہ حضرات جن کا کلام ۱۲۲۷ھ کی یادداشتوں، زود رباعیوں، علمی تذکروں میں ملتا ہے (۲) ۱۲۲۷ھ تک ادبی خدمات میں عمر بسر کرنے والے جو عروس سخن کے سنگار کا خواستگار رہا تھا اور دور رس نگاہوں کو کمال کے بعد زوال کا خطرہ محسوس ہوتا تھا (۳) وہ فردیں جنھوں نے عہد شاہی ختم ہونے کے بعد لٹی ہوئی بستی میں گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کی اور اپنے آثار کی ریاست کو کسی نہ کسی طرح مر کر انجام تک پہونچایا۔

پہلے طبقے میں مشاہیر کے علاوہ عزیز نہیں کے اشعار ہیں وہ علمی موشگافی اور بلندی پائی جاتی ہے جو ان کے شایان شان تھی۔ سبب یہ کہ ریو را نام معلوم ہے رضائے قیام اشعار شعر قرطاس پر موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ دوسرے طبقے میں عابد علی تمنا علی گڑھ، نواب علی خاں سحر، میر غلام رضا جو داماد میر لاقی، حکیم سید محمد علی خاں قدیر شاگرد دبیر، تسوں، عیش، صفار فردوس، آنند دروازے ہیں جن کے نمونہ کلام پیش کرنے میں خوف طول ہے۔ تیسرے طبقے میں جو ۱۲۷۳ھ کا آخری دور ہے اس وقت بزم کی روشن شمعیں بجھ رہی تھیں اور دور انقلاب میں ادب کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ گل ہو رہے تھے حکیم رضا حیدر شہیر بلگرامی، حسین آرا، مرزا دبیر علی، سید محمد تیر، شیخ محمد خاں شاد، منشی اشرف علی اشرف، وارث علی فہم، میر علی خاں سروش، نواب مہدی علی خاں جلیس، شارقاں وغیرہ فلک ادب کے تابندہ ستارے تھے جن کا کلام عام طور پر سحاب غفلت میں نگاہ پوشیدہ ہے اور نہ ان کے امثال کا شمار ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان خدام ادب کے نام بھی قعر گمنامی میں ہیں اور اشعار ردسمس میں۔ عزیز کی ایک تاریخ ملاحظہ ہو: نہ برج امید بید تھی، ماہ آفتاب و طلعت قمر   چوں مختوں شد از فضل

بہرہ بمود سر   زردے ادب گفت سال شش ہجری" ہلاے راز تنگ شد بدر
۱۲۷۶ھ

اس قطعہ میں عالم رندہ ہونے سے ادب کی لفظ اور رکرتہ کس قدر لطیف ہے اور مادۂ تاریخ کا کیا کہنا۔

چوتھا طبقہ :- اس دور میں علاوہ خرد، قدیر، فہم، جلیس، شاد کے جن کا کلام تیرہویں صدی کی ابتدائی یادگاروں میں ہے رنگ تغزل کرتے ہیں جو زبان کی سلاست، الفاظ کی تہذیب، بندش کی خوبصورتی، صحت تغزل ہر عنوان میں یگانہ روزگار یورپ میں ایک SHAKESPEAR جو بین الاقوامی شہرت کا حامل ہوا۔ لکھنؤ میں مصحفی، آتش، ناسخ، انیس، دبیر، متین، لق، میر وزیر علی، صبا، وحید، امانت، شوق، رشک، امیر، سودا، میر، قتیل اور ایسے کے علاوہ کتنے صاحبان کمال گزرے جن کی مثال پیدا نہیں کر سکا۔ شاہان اودھ نے چپہ چپہ میں علم و فضل کی آبیاری کی کمالات کی نہریں بہائیں زمین وطن میں صلاحیت پاکر فنون رقیہ کی تخم ریزی کی لاتعداد ہنرمند پیدا کئے جن کی طرف مختصر اشارہ ہوگا۔

طب یونانی :- اس فن کو سلطنت اودھ نے وہ فروغ دیا کہ پہلے عنبر گنج اطباء کا مرکز قرار پایا پھر جھوائی ٹولہ اور آخر میں ہری محلہ خط یونان معلوم ہوتا تھا ایسے ایسے صاحبان کمال پیدا کئے جن کے نام رہتی دنیا تک باقی رہیں گے ہندوستان کے ل و عرض میں جو طبیب پہلے وہ انہیں باکمال ہستیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے والے تھے حکیم یعقوب صحت الدولہ ع الدولہ حکیم ساجن، حکیم کوچک اور آخر میں شفاء الدولہ نے انگریزی ادویہ کو یونانی مفردات کے ساتھ مدغم کر کے غیر معمولی ل حاصل کیا۔ غرض ہر فن کا صاحب کمال اس عہد میں موجود تھا ڈاکٹر ناصر علی، ڈاکٹر احسان حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین شروع ریزی کے پہلے ڈاکٹروں میں تھے اور کامیاب معالج سمجھے جاتے تھے استخارے دیکھ دیکھ کر مریضوں کو نسخہ دیتے تھے۔

پردہ :- ہندوستان کے باکمال مصوروں نے شاہان دہلی کی بیگمات کے تصاویر تو مختلف سائز پر چھاپے رضیہ سلطانہ، نورجہاں ہاں، ممتاز محل کے عکسی فوٹو تصویریں اور چہار لیش کے تھال پر، اولی جرائد، مسٹر لیوں، کلنڈروں پر برابر چھپے مگر ناظرین کو ی بیگمیں ملکہ کشور، ملکہ جہاں، حضرت محل، اسمر محل کے فوٹو اس طرح عام طور پر نہ ملیں گے یہ اس کسر کی تہذیب قدیم تھی۔ ہوری حکومت کے دور آزادی میں اب حضرت محل کی تصویریں دور لکھنؤ کے صفحات میں اور معشوق محل کا فلاک کتاب مگر کے سٹر نے چھاپا ۱۸۷۴ء برٹش حکومت کے آثار پر جو تصاویر تعلقہ داران اودھ کے نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے اس میں بجائے خالی بارڈر نظر آتے ہیں اور پردہ نشین لکھ کر جگہ چھوڑ دی ہے۔

دنیا بھر کے مشہور شہروں سے لکھنؤ کا موازنہ

مقابلہ کا جذبہ مزاج انسانیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ جب دو ہمسر ایک جگہ ہوں تو فیصلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ کون اچھا ہے لکھنؤ اور عظیم آباد سے ٹکرا ہوا تو مرزا قتیل مشہور ادیب المتوفی ۱۲۳۳ھ نے بے دھڑک کہہ دیا "بیت الخلا لکھنؤ بہتر است[1] از عظیم آباد" منشی علاء الدین احمد اکبر آبادی نے عہد واجدی میں لکھنؤ کو ہندوستان کی آنکھوں کا تارا کہا۔ ایک ایرانی شاعر ناطق جب لکھنؤ پہنچا تو کہا "گدائے لکھنؤ بر سلطنت[2] ربع مسکوں خندہ دارد" لکھنؤ کی بھیک دوسری جگہ کی سلطنت سے بہتر ہے۔ غرض کسی نے ربع مسکوں سے بہتر اور کسی نے کلکتہ سے اچھا اور کسی نے راجہ اندر کے اکھاڑے سے عمدہ کہا۔ شعراء کے ذہنی تخیلات ملاحظہ ہوں۔

(مرزا فصیح)

لکھنؤ اب سر دارِ ہند ہے　　دمبدم اندروں بہار ہند ہے

(مفتی صاحب)

ہست در کلکتہ گو سیم و زری　　کیمیا باشد تراب لکھنؤ
ہر کہ رفت از لکھنؤ خواہش نہ کرد　　در خیال خورد و خواب لکھنؤ

(انشاء اللہ خاں انشاء)

ہزاروں دیووں کو یہاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے　　یہ لکھنؤ راجہ اندر کا اکھاڑا ہے

---

[1] ہسٹوریکل البم آف اودھ　[2] رقعات مرزا قتیل　[3] لسان الواعظین مطبع سلطانی لکھنؤ

عارف علی شاہ عارف

ہندوستاں ندیدیم موضع دلچسپ چو لکھنؤ — اگرچہ در طریق سرتاسر جہاں رفتم

ضیغم

شہر طہراں ایں زماں اے بیک جو — شد چو دہلی یا دکن یا لکھنؤ

مصحفی

کیوں نہ دل لگا ئے گی کا جائے لوٹ — لکھنؤ میں حسن کی منڈی ہے لوٹ

لا اعلم

کوئی قصہ مجھ کو خوش آتا نہیں — ہاں مگر اس داستانِ لکھنؤ

تمنا

لکھنو کی کوئی دم دل سے نکلتی نہیں یاد — اے تمنا کہیں پردیس میں کیا ہم ٹھہرا

حاور مگرامی

میسر ہو نہیں سکتیں وہ علمی مجلسیں حاور — رلا دیتا ہے یاد آتا ہے جس دم لکھنؤ اب بھی

ناسخ

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ — لکھنؤ مجھ پہ فدا ہے میں فدائے لکھنؤ
تو نے دیکھے ہیں کہاں رنگیں ادائے لکھنؤ — لالہ و گل کے چمن ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ
پھر رہے ہیں گل عذار لکھنؤ — ہے چمن ہر رہ گذار لکھنؤ
گل سے رنگیں تر ہیں خار لکھنؤ — نشہ سے بہتر خمار لکھنؤ
یاد ہیں سب گل عذار لکھنؤ — ہے تصور میں بہار لکھنؤ

رجب علی بیگ سرور

ملک شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور — اصفہاں اس سے کہیں ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

ناصری

نہیں جب لکھنؤ تو ناصری کیا لطف جینے کا — وطن سے ہم بساں بہر و ملک عدم نکلے

نقشہ سلاطین اودھ تا سنِ جلوس و سنِ وفات اور مقام سلطنت آسانی معلوم کرو

نمبر	نام فرماں روا	سنِ جلوس	مقامِ حکومت	سنِ وفات	کیفیت
	محمد امین سعادت خاں برہان الملک	۱۱۳۴ھ	فیض آباد	۱۱۵۱ھ	
	نواب منصور علی خاں صفدر جنگ	۱۱۵۱ھ	٫٫	۱۱۷۰ھ	
	جلال الدین نواب شجاع الدولہ بہادر	۱۱۷۰ھ	٫٫	۱۱۸۹ھ	
	نواب آصف الدولہ بہادر	۱۱۸۸ھ	لکھنؤ	۱۲۱۲ھ	
	مرزا وزیر علی خاں بہادر	۱۲۱۲ھ	٫٫	۱۲۱۲ھ	بنارس روانہ ہوئے
	نواب سعادت علی خاں بہادر	۱۲۱۲ھ		۱۲۲۹ھ	
	غازی الدین حیدر بادشاہ	۱۲۲۹ھ	٫٫	۱۲۴۳ھ	
	نصیر الدین حیدر بادشاہ	۱۲۴۳ھ		۱۲۵۳ھ	
۱	منا جان	۱۲۵۳ھ		۱۲۵۳ھ	چند گھنٹہ حکومت کے بعد چنار گڑھ روانہ کر دئے گئے
۱	محمد علی شاہ ابو الفتح معین الدین	۱۲۵۳ھ		۱۲۵۸ھ	
۱۰	امجد علی شاہ ابو الظفر مصلح الدین ثریا جاہ	۱۲۵۸ھ	٫٫	۱۲۶۳ھ	
۱۱	واجد علی شاہ سلطان عالم	۱۲۶۳ھ		۱۲۷۲ھ	کلکتہ روانہ ہوئے
۱۲	مرزا برجیس قدر گیارہ برس کے سن میں تخت نشین ہوئے ۵ ماہ اقل سلطنت کی	۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء	٫٫		۱۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو نیپال روانہ ہوئے

نوٹ) اودھ پر قلم اٹھانے والوں نے برجیس قدر کو سلاطین کی فہرست میں نہیں رکھا ہے اگر کم دنوں تک بادشاہ رہنا اس کا سبب تھا تو منا جان کی حکومت چند گھنٹہ تھی اور ان کے ذکر سے تاریخیں معمور ہیں ہم برجیس قدر کو اس فہرست میں اس لئے برخلاف دیگر مورخین کے کوشش کر کے جگہ دے رہے ہیں کہ وہ صحیح وارث تخت و تاج تھے اور پبلک نے ان کو حکومت کے لئے چنا تھا۔ جنگ آزادی کے حامی احمد اللہ شاہ رح کو انگریزوں نے باغیوں کے لقب سے یاد کیا تھا بھی برجیس قدر کی سلطنت کو تسلیم کر چکے تھے اس لئے تیرہویں صدی کے لکھنؤ میں ان کا نام روحِ رواں ہے برجیس قدر کی تصویر قیصر باغ کے میوزیم میں موجود ہے۔

انقلاب سلطنت

غدر ۱۸۵۷ء میں یہ خوبصورت شہر جس کے آباد کرنے میں آٹھ بادشاہ ایک کے بعد دوسرا کوشش کرتا رہا تلنگوں، گوروں بلائتیوں کے ہاتھ سے لٹا اور دریا کے کنارے کی زیادہ سے زیادہ عمارتیں گرا دی گئیں لوٹ عام میں جو گورے ہندوستانیوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے ان کے جوش انتقام میں شاہی عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی حیرت ہوئی کہ امام باڑہ انگریزوں

سے تند سا باتھا دریہ بھی نہ بچا۔ سرکاری عمارتیں شاد و آباد باقی رہیں۔ متمول رعایا کے سربلند قصر، غربا کے بیشمار مکانات بھی جو کہ دکھوں کی زد میں تھے نہ رہے ان روسا کی ڈیوڑھیاں باقی رہیں جنھوں نے اپنی رحم دلی اور سیاست سے بدن کو بچایا تھا اور وہی انگریزی راج میں خطابات اور شرکت دربار کی عزت سے سرفراز ہوئے غدر کے بعد شہر کی آبادی ملہ عرب عہد گنج سے حیدر گنج تک، اور دوسری طرف گومتی کے کناروں کو چھوڑ کر پورب پچھم مضافات گنج سے برھئی تک اور کمس ماہ نا کاضی سے شروع ہو کر دوگا توسے کے پل تک رہ گئی چار باغ میں دن کو سور چرتے تھے۔ عیش باغ میں بندروں کی ... تھی۔

ادبی دنیا میں تلاطم

... دنیا نے سخنورکو خون کے آنسو رلایا اور بزم علم وادب میں وہ ہلچل تھی جو یادگار رہے۔

(ناسخ المتوفی ۱۲۵۴ھ)

سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں نقش ہیں نقش و نگار لکھنؤ

(محمد رضا صاحب عاشق)

کہاں ہیں وہ سلطاں کہاں ہے وہ فوج نہیں لکھنؤ کا وہ باقی اب اوج

(مفتی اسیر المتوفی ۱۲۹۹ھ)

چوں ویراں شہرہ زار لکھنؤ شد خزاں تازہ بہار کرد شد
مکاں ویراں مکیں آوارہ دشت الٰہی ایں چہ دور آسماں گشت

(مرزا دبیر المتوفی ۱۲۹۲ھ)

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا کہ عدل کبھی ظلم کبھی جور رہا
اللہ وہی ہے تو یہ مقصد ہو دبیر کیا تم جو رہیں اور ملک اور رہا

(میر انیس المتوفی ۱۲۹۲ھ)

کیونکر کوئی غم زدہ نہ فریاد کرے جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم دل ٹوٹے ہوئے لکھنؤ کو آباد کرے
کیوں سرخرو نہ ہو یہ چمن سرو دار ہے دیکھو کہ اس خزاں پہ بھی ایسی بہار ہے

(مونس المتوفی ۱۲۹۴ھ)

کہنے میں نہ اب دل ہے نہ قابو میں ہے بیاں حضرت سے کریہ عرض کہ اے سرو پیر ماں
غمگین ہیں مومنیں انھیں شاد کیجئے گلزار لکھنؤ کو پھر آباد کیجئے

(مفتی میر عباس صاحب)

سلطنت رفت از اسلام بیاد ایہا مرزبوم است ہمایوں وچوں عنقا است ہا

(ولہ)

گرچہ زائل شد شباب لکھنؤ   عشوہا دارد حباب لکھنؤ
غیرت معمور ہائے عالم است   شہر ویران خراب لکھنؤ

(سلطان عالم واجد علی شاہ)

انگریز بہادر نے ظلم کیا   مری چھین لی لکھنؤ نگری

(ایک وفادار عورت نے گایا شہر میں)

واجد علی پیا نا کلکتہ کو سدھارا   سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

(آغا ٹھوتر ف)

مردیکھئے لکھنؤ لٹ گیا   ہر لیجئے لکھنؤ لٹ گیا

(فہیم پسر ودیر ادہ)

لکھنؤ ے افسردے شاد شد   ہریکے زیں کوہ غم چوں کاہ شد

(ایک عراقی شاعر ادیب عالمیں)

انجہ اندر لکھنؤ بر مردوزن بیداد شد   بے کس آں شد کہ دریک دم بقوم عاد شد
سال تاریخ ار ازشیخ واعظ زود رسم   لکھنؤ برباد شد دنیا و دیں برباد شد
۱۲۷۴ھ

(ولہ)

سالہا شد کہ تحت سکیم   وعدہ داد و کرد تسکیم
چونکہ بگذاشت باعباں قضا   گل ار باغ آرزو چیم
لعدازیں ما و دست و جامہ   ہم ما دے راشک رنگیم
اولیں مدنوشتم ایں تاریخ   لکھنؤ را خراب می بیم
۱۲۷۴ھ

(ولہ)

العکم جاء واعلی الاسلام لیتھم   قد اعدموا حتیلا شاع العمر حصر
فی لکھنؤ ما جری ارحتہ اسعا   فاصحوا الا یری مس اھلھا اثر
۱۲۷۴ھ

(میر انیس)

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ   انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

پہلی مسجد اور پہلا مندر

<u>سی شہر کا ماحول مذر قرطاس کرنے کے ساتھ واقعہ نگار کا یہ بھی فرض ہے کردہ ابا بیان شہر کی مذہبی تمدنی، معاشرتی زندگی</u>

حسن جلال الدین حیدر نام تھا   ۲ سرود المومنین فارسی طبع بمبئی

پرکٹ کرے لکھنؤ میں پہلی آبادی اس غیر مسلم طبقہ کی تھی جس کی مٹھی میں صدیوں سے یہ زمین تھی اور جس پر وہ بلاشرکت غیرے قابض تھے مسلمان اپنی سفری زندگی میں ادھر سے گذرتے رہتے۔ ورود مغلیہ میں یہاں مسلم زمیندار کا انتظام ہوا برہمن اور ایسر اور دوسری ذات کے آدمی یہ حکایات کرتے تھے دریائے گومتی اس کو سیراب کرنے کے لئے بہت تھا تاریخ سے صاف صاف ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت کے مندروں میں کون سب سے پرانا ہے بڑی کالی جی کا مندر عہد آصفی کے پہلے یا بعد کی عمارت ہے مگر تاریخ میں کہیں صراحت نہیں ہے کہ کس سنہ میں اس کی بنیاد قائم ہوئی۔ مذہب سے مرتا گیا تم مدعا سے ماخوذ پرانا مندر سعادت گنج سے کے واقع ہے مگر صراحت سے کہیں نہ ملا کہ اس کے یہ آثار ہیں اسی طرح مسجدوں میں سمجھا جاتا ہے کہ ٹیلے کی مسجد سب سے پرانی عمارت ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ پہلی مسجد ٹھنڈی، ٹولہ میں ہے جو بادشاہ عالم ۶۳۱ھ کی بنیاد ہے۔ شاہ عبدالرحمن جنہوں نے ایک روایت سے لوالی میں کوس لس الملک بنایا اسی مسجد کے پاس دس میں سپرد خاک ہوئے اور ان کا مزار آج تک وہاں موجود ہے اس مسجد کے قریب جھوائی ٹولے CONNING STREET ہے اور مسجد کا حال آئندہ اپنے محل پر آئے گا۔

پیسہ اور کوڑی

انگریزی راج سے پہلے موٹے پیسے تھے پھر چلنے لگے ہوئے پیسے کے دو گئے تھے ان پر کوئی سکہ نہ تھا اور تین موٹے پیسے دے کر انگریزی پیسہ ملتے تھے۔ انگریزی سکہ کا دو پیسہ سولہ آنے یا سولہ گنڈہ کا اور انگریزی روپے کے چوبیس گنڈے یا چوبیس آنے قدیم ۹۶ موٹے پیسے ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک انگریزی پیسے دو دھیلے ہوا کرتے تھے لیکن دھیلا کئی کوڑیوں کا تھا۔ اس میں اختلاف تھا سب موٹے دھیلے اور موٹی دمڑی اور موٹی آدھی تھا جس کی تفصیل طول تحریر کا باعث ہے۔ انگریزی پیسے کی ۹۶ کوڑیاں ہوتی تھیں سب سے چار کوڑی کا ایک گنڈا، ۲ گنڈے کی ایک آدھی ۲ آدھی کی ایک دمڑی۔ دو دمڑیوں کا ایک دھیلا۔ دو دھیلوں کا پیسہ۔ دھیلا ½ پیسہ اور دمڑی ¼ اور آدھی ⅛ تھی۔ دو پیسوں کو ٹکہ یا ادھنا کہتے تھے۔

پیسہ خالص تانبے کا تھا اور کوڑی سیپ کی طرح پانی کا وہ جانور ہے جو زرد اور سفید مختلف رنگوں کی دریا سے نکلتے تھے۔ حکیم لکھنؤ میں "کرمہرہ" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بہی کھاتہ میں ایک پیسہ کا حساب اس طرح لکھتے تھے۔ ہرا دھنیا۔ لسن۔
۱۲ دام ۶ دام
۔ ہری مرچ میزان ایک پیسہ (...)

حلوائیوں کی رہائش عموماً دروازے کے قریب یا کسی مسجد کے حجرہ میں ہوتی تھی لکھنؤ کے صاحبان میں نواز رستم علی خاں وہ سالے جنہوں نے ستیتے میں حرم کھانا رنے پر قابو پایا تھا وہ بڑے ہردلعزیز تھے۔

لکھنؤ کے بانکے

یہ طولانی مضمون ہے جس پر عصر حاضر کے ادیب ماہوار میگزینوں میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں اس میں کوئی افادیت نہیں اس لئے مختصر اس قدر لکھنا ضرور کلہ ہے کہ یہ کمن پرند لوگوں کا ایک گروہ تھا جن کا قول یا بدعمل تھا جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ زمانہ میں راج کا پارا چڑھا تا تھا تلوار کھینچنا ان کے لئے معمولی بات تھی سر پر پٹے رکھتے تھے یا زلفیں، اور اس کا راز یہ بتاتے تھے کہ اگر قتل ہو جائیں تو قاتل کان پکڑ کر سر نہ اٹھائے اور بال ہاتھ میں لے کر سر اٹھائے گھسیٹا جوتا اس لئے پہنتے تھے کہ بھاگ نہ سکیں اور دشمن کو پیٹھ دکھائیں کلی دار پائجامے کا پہننا وا بھی اس لئے تھا کہ لڑتے وقت پائجامہ گرا دیتے تھے کہ اب راہ فرار نہیں اختیار کرنا ہے خدمت کی سوگند

اور منحنہ میں ململ کا کرتہ پہنتے تھے اور روئی دار دگلا یا مرزائی خلاف شان تھا غیرت دار ایسے تھے کہ سر پر ہاتھ رکھ کر جگہ سے اٹھے ۔ گڑ سے صدا پیدا ہوئی ہیلوشین نے آواز دی کچھ اور خیال کیا انھیں اپنی کمزوری خود محسوس ہوئی ۔ نتیجہ مار لیا اب محبت احباب میں منہ دکھانے کے قابل نہیں عہد شاہی ختم ہونے کے بعد قریب تک یہ لوگ ۔ جس بستی میں کہ بانکوں کا وجود تھا وہاں کی تاریخ پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں ۔

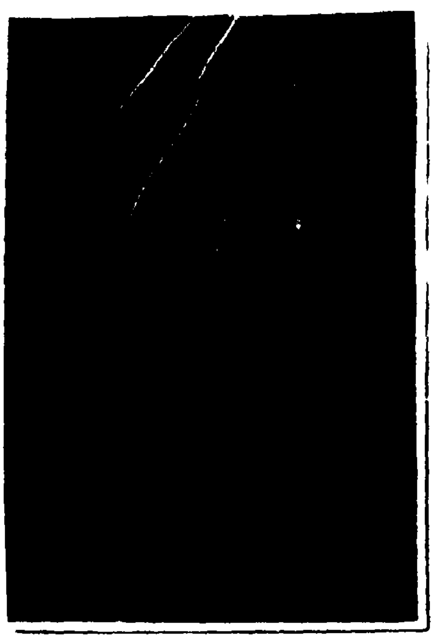
فتو چوٹا

اس زمانے کا مشہور ڈاکو تھا تو سنا ہے کہ فقط کھار ، ور مشرکیں میں چوریاں کرتا تھا اس کی دلیری سے انگریز حیران رہ جاتے تھے ۔ حکام کو چیلنج دے کر وقت مقرر کرکے میم صاحب کا زیور بنگلے سے لے گیا اور مسلح پہرہ دار کچھ نہ کر سکے ۔ یہ بیتیں دولت یتیموں بیواؤں کا پیٹ بھرنے میں صرف کرتا تھا کنیا کی شادی اس کی توجہ سے ہوتی تھی اپاہج پرورش پاتے تھے جس سے جو وعدہ کیا وہ ضرور پورا ہوتا تھا آئندہ صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر آئے گا ۔



جناب مرزا محسن صاحب خاتم ہمعصر انیس

[illegible]



(معنف مجالس علویہ)

استاد مولوی میر سید علی صاحب سید المحدثین

وفات ۱۳۰۸ھ

پہلا باب

کمپنی باغ سے اکبری دروازہ تک

...ہینڈنگ میں ہم کو EASTINDIAN COMPANY کے نام پر پہلی بنیاد کمپنی باغ سے اکبری گیٹ اور درمیانی ... باب لکھا ہے اور جو محلہ درج نہ ہو تو سمجھا جائے کہ اس جگہ کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نئے آباد شدہ ... یا عمارت کا محض اشارہ کے تیرہ و سط کے ساتھ کوئی ذکر نہ ہو گا۔

کمپنی باغ

ایسٹ انڈین کمپنی ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی کرنل سکیس اس کے آخری ڈائریکٹر تھے غدر کے بعد انگریزوں کا اقتدار بڑھنے پر کمپنی ختم کر دیا گیا اس کا ٹریڈ مارک یہ تھا  اور جو سکہ کمپنی مذکور کا ہندوستان میں چل رہا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ بیچ میں یہی مارک اور دونوں طرف دو پیروں سے کھڑے ہوئے شیر ان کے ہاتھوں میں جھنڈیاں اور اوپر کے حصہ میں ایک بہت چھوٹا شیر دہ کمی پرچم کے نیچے دو پٹیوں میں باریک قلم سے کچھ لکھا ہوا اور سن عیسوی۔ پیسے کی تعداد کا لحاظ ہو یہ پیسہ وزن میں ساڑھے چھ ماشہ تانبے کا تھا ۱۸۳۶ء کے بعد پیسہ کے دوسرے رخ پر سے ترازو ہٹا دی گئی ... ہندوستان رہا اور آخر تک جو پیسہ جاری رہا اس پر ایک خوبصورت بیل تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کا لقب حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے ٹریڈ مارک میں ذرا سی تبدیلی کی اور اوپر کے چھوٹے ستبہ کی جگہ کوہ نور والا تاج اور داہنے پہلو میں جو شیر تھا اس کو بدل کر گھوڑا ... دیا جس کے سر پر ایک شاخ سرکاری کاغذات اور دربار کے ٹکٹ میں یہی نشان آخر تک بنتا رہا گئیں وہ مرتبہ کے سہارے شیر کھڑے ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کا مارکہ ہے۔

اس باغ کا قوم پرور انگریزوں سے خدمت کی یاد میں کمپنی باغ ہی نام رکھا اور بہرا سعد گھروں کو کھدوا کر ہندوستانی اور ولایتی درخت اور طرح طرح کے پودے لگائے اور ساری زمین پر سرسبز گھاس بچھایا عہدشاہی کے لوڑھے جن کی نگاہوں کے سامنے یہاں کی اگلی گنجان بستی تھی بتاتے تھے کہ یہاں کی گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ کہار پالکی موڑ نہ سکتے تھے اور پیدل چلنے والوں کے سوا سواری کا گذر نہ تھا۔

کمپنی باغ کی حدوں کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ شاہ جی کی ڈیوڑھی سے گذرتے ہوئے امام باڑہ حسین آباد کی برجیوں کے سامنے سے گھوم کر روحی فوارے کی طرف چلو اور اس گیٹ کو داہنے ہاتھ کی طرف چھوڑ کر گول دروازہ آگے جتنی

پاولیر تاریخ ہند

زمین تمہارے دورہ میں پڑے، وہ کمپنی باغ ہے اس باغ کے ایک حصّہ میں انگریزوں کی کچھ قبریں بھی ہیں جو غدر میں کام آئے ہوں گے کمن کمن جی کی نئی کوٹھی کے سامنے باغ کا وہ حصّہ ہے جو وکٹوریہ پارک کہا جاتا ہے یہاں ملکہ وکٹوریہ کا کالا اسٹیچو نصب تھا جس کو جمہوری حکومت نے ہٹا دیا ہے۔ کمپنی باغ میں دو سڑکیں ایک بلند اور دوسری پست اوّل و آخر میں تھیں اونچی سڑک سرخی کی تھی۔ فوارہ اسٹک ہے جس کے سامنے بنچ پر لوگ بیٹھ کر تفریح کرتے ہیں باغ کے مصارف حسین آباد ٹرسٹ ادا کرتا ہے ان دلفریب مناظر اور مغربی سیمیریوں کو دیکھ کر بھی ملک خوش نہ تھی نے خوشبو کے ولایتی پھول اور پھل کے کوہ پیکر درخت نگاہوں میں، موت پیریت معلوم ہوتے تھے اور آزادی کے حامی اگر مہر سکوت توڑتے تھے تو جلے ہوئے دل سے آواز آتی تھی ۔

کیوں اے فلک یہ دل کا جلانا ہے کب تلک، تخت اے اودھ میں رہا ہے کب تلک،
یہ تیر کب تلک یہ نشانہ ہے کب تلک، اس دور کمپنی میں رہا ہے کب تلک،

یہ پورا مسدس کتنے لوگوں کو زبانی یاد تھا آزاد خیال شاعر کسی انعام کی امید پر اپنی حق گوئی کے سلسلے میں قانونی شکنجے میں آ رہا تھا عزت بچانے کے لئے دیس چھوڑ دیا اور گومتی کا ڈوبا ہوا کارتی میں نکلا۔

قلعہ مٹیا برج میں اگر کوئی مجرم بادشاہ کے زیرسایہ پناہ لے تو کلکتہ کے انگریز چشم پوشی کرتے تھے تاریخ اور ادب تو مفقود الخبر مسافر کا پتہ چلانے سے خاموش ہے مگر عبدالحلیم شررؔ نے احسان کیا جو بتایا کہ اس آزاد منش کی موت کلکتہ میں واقع ہوئی گارڈن ریچ کے ایک مکان میں وہ دفن ہوئے مرنے والے شاعر کی روح سے ہوا نا گذارش ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۸ء کے بعد ختم ہو گئی اور ملکہ وکٹوریہ بھی ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو آنجہانی ہو گئیں رہے نام اللہ کا۔ آپ سمجھے یہ شاعر کون تھا؟ میاں مظفر[1]

کمپنی باغ میں پورے سو برس تک بھی نباتات کی عملداری رہنے نہیں پائی تھی کہ حدود ۱۹۴۵ء میں وکٹوریہ اسٹریٹ کا پرانا زنانہ اشفاخانہ یہاں لایا گیا اور میڈیکل کالج کی سڑک کے سامنے کمپنی باغ کے ایک حصّے کو شامل کر کے نئی بلڈنگیں بننا شروع ہوئیں اور چوک کا شمار یہاں سے ہونے لگا پھر تقسیم ہند ہوئی اور کمپنی باغ کے دوسرے حصّے میں جو حسین آباد سے نزدیک تھا۔ ہجرت کرنے والوں کے کوارٹر بنے اور کچھ کم سو برس کے بعد پھر ویران زمین پر انسانوں کی بستی دکھائی دی اور سات رفیوجی کالونی کی سہولت کے لئے پرائمری اسکول، پن چکی، بازار، دوکانیں، پانی کے نل، بجلی کی روشنی یا محلہ سا نظر آ رہا ہے یہ وہی زمین ہے جس پر سبزہ مدتوں تنہائی میں گردش لیا رہا۔

۱۹۵۸ء میں اس کتاب کی تالیف اور ترتیب کے وقت سو سال کے بعد گول دروازہ سے امام باڑہ حسین آباد جانے والی سڑک کو جمہوری حکومت نے نیپئر اسٹریٹ تک زیادہ سے زیادہ چوڑا کر دیا اور گومتی جانے والوں کو سہولت اور سنڈیلہ، کاکوروی، ملیح آباد کی راہ کو اتنا وسیع کر دیا کہ لکھنؤ میں اس سے چوڑی سڑک اب دوسری نہیں ہے دنیا اسی السٹریٹ کا نام ہے ۱۹۲۱ء سے کمپنی باغ میں کانگریس کی تحریک آزادی پر جلسے ہوئے۔ گول دروازے کے سامنے سے گرفتاریاں ہوئیں۔ امین الدولہ پارک میں جلسے[2] سیاسی اجتماعات اسی سرزمین پر ہوتے تھے اور جب مولانا سید حسن

[1] ... ۱۹۵۸ء
[2] پایونیر تواریخ ہند ص ۵۳۳

صاحب نے انتقال کیا تو ان کی لاش کے ساتھ اتنے لوگ تھے کہ کہیں نماز جنازہ نہیں ہو سکتی تھی کیننگ باغ میں نماز ہوئی۔ ۵ ر مارچ ۱۸۸۱ء کو وکٹوریہ پارک میں مختلف صنعتوں کی نمائش ہوئی۔

مسجد و امام باڑہ نواب حسن رضا خاں

نواب کا سرفراز الدولہ خطاب تھا۔ عہد آصفی میں ریاست کے معزز عہدے پر فائز تھے اور بڑی ایمانداری سے فرائض منصبی انجام دئے وہ بہت موٹے تازے اور دوہرے بدن کے تھے، اور ریزیڈنسی میں نواب کی طرف سے کاغذات گزارنے میں اتنی دیر تک کھڑے رہتے تھے بسا اوقات آپ سنبھال رکھتے تھے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے ۱۲۱۶ھ میں پیام موت آیا مرقومہ بالا امام باڑہ اور مسجد جس کی ایک اینٹ بھی اب باقی نہیں، ان کی یادگار تھا لسان الملک مرزا محمد ہادی عزیز المتوفی ۱۹۳۵ء اپنے حسب ذیل الفاظ میں اس عمارت کا پتہ دیتے ہیں اور آخری تاجدار اودھ کے عالم معتمد متقی میر عباس صاحب کا روزمرہ ان کی لائف میں لکھتے ہیں۔

نماز شب کے بعد چند کش حقہ پیتے تھے اتنے میں حسین علی جمعدار ملازم فانوس جلا کر تیار کرتا تھا اور آپ خراماں خراماں باچشم گریاں نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں کی مسجد کی طرف کوچہ سلطان العلماء سے ہوتے ہوئے داخل مسجد متبرک ہو کر صحن امام باڑہ مقدسہ میں ٹہلا کرتے تھے اور آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری رہتے تھے کبھی کبھی اکثر احباب یا اہل محلہ جو ساتھ والے تھے ہمراہ ہوتے تھے۔ اس طرف جناب سید العلماء پالکی میں سوار ہو کر ادھر ادھر دو مشعلچی اپنے مکان سے مسجد میں نماز جماعت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ یہ مسجد اب وکٹوریہ پارک میں مستملک ہو گئی ہے کھجور کا درخت اس کی شہادت کے لئے باقی ہے کبھی وہ پہلے تشریف لاتے یہ صحن میں چہل قدمی کر کے ان کا انتظار کرتے۔ اچھی طرح تاروں کی چھاؤں اور آثار شب نمایاں رہتے ہی طلوع صبح کاذب اور صبح صادق کی دید اور اس مسئلہ کی استاد شاگرد میں گفت و شنید و بحث شدید رہا کرتی تھی شاہی توپ خانہ سے صبح کاذب کی توپ بہت ہی سویرے چلتی تھی اور چھاؤنی کی توپ طلوع صبح صادق بلکہ طلوع آفتاب پر سر ہوتی تھی لیکن حضرت سید العلماء نماز صبح اول طلوع فجر بغیر انتظار ان علامات کے ادا کر چکتے تھے اور بعد ادائے وظائف سائلین و محتاجین کا اجرا کر کے فراغت تمام مسجد سے دولت سرا تشریف لاتے تھے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب تک گھڑیوں کا عام رواج نہیں ہوا تھا اور اوقات کا فیصلہ علامات سے ہوتا تھا۔

اس امام باڑہ کی عہد شاہی ۱۲۸۰ھ میں مرمت ہوئی تھی جو اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے۔

امام باڑہ پاک حسن رضا خاں را — درست از سر نو کرد شاہ عدل را
عمارتش کہ دا گشت بہتر از اول — دروغ را نبود در کلام حق مدخل
خدا بایں کرم و لطف و ساماں دارد — بحکم شہ ز سر نو شد ایں بنا لطیف
صحیح و سالم و سرور در جہاں دارد — رضا بگفت برائے سنین جا لطیف

عہد شاہی کے ترشے امام باڑوں کی جو فہرست قومی جریدہ ۱۸۵۹ء میں چھپی ہے اس میں اس امام باڑہ کا نام نہیں ہے پہلی نماز جماعت امامیہ کی اسی مسجد میں باقتدار سید دلدار علی مجتہد (غفران مآب) ہوئی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۸ء میں جب بڑے امام باڑہ

؎ مرقومہ جناب شیخ عباس علی صاحب حصہ دوم صفحہ ۱۲ کتاب اودھ کی تہذیب ... جو سلطانہ اودھ کی محبت سے لکھنؤ میں سرفراز ہوئے تھے اخبار سرفراز ... ۱۹۴۵ء لکھنؤ

کو قلعہ بنایا اور چاروں طرف پانچ سو گز تک سارے مکانات کھود دیے گئے۔ اس وقت یہ مسجد و امام باڑہ بھی شہید ہوا۔ کھجور کا درخت آج سے پہلے میں نے خود دیکھا اور ۱۹۶۳ء میں گول دروازہ کا یا تازہ تعمیر ہونے کے سلسلے میں کاٹ دیا گیا

محلہ چکلہ

یہ محلہ گول دروازے سے قریب تھا ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے پڑاؤ کو چکلہ کہتے ہیں اس محلے سے کچھ بڑھ کر نصیر الدین حیدر کی ملکہ پھول محل کی دولت سرا تھی یہ حاتون رام دیال چودھری کی بہن تھیں۔۔ اس گھرانے میں جھاؤ لال صفی کے راجہ مہرا کی دولت چھ سات لاکھ روپے آ گئی تھی کاروبار چمکا اور خوشحال بہن ملکہ اودھ ہوئیں خود راجہ کا خطاب پایا۔ وزارت کی آرزو بھی دل میں تھی جو پوری نہیں ہوئی پھر بھی روز روز بڑوں کی طرح دربار لگتا تھا جوڑی والی گلی میں ان کی محلسرا اب تک ہے جو ۱۸۵۷ء کی غارت میں گر گئی۔ یوڑی والی گلی کے آگے ایک محلہ فرسٹس راجہ رام دیال کے نام سے اب بھی ہے رام دیال کے باپ بھی رام نواز گنج کے رہنے والے تھے چکلہ کا صرف نام رہ گیا ہے۔

ڈیوڑھی محسن الدولہ

شہر کے بہت بڑے رئیس تھے ان کے بیٹے کا مشہور نام مرزا عالی قدر اور خطاب افسر الدولہ مرزا زعلی خاں افراسیاب جنگ تھا۔ چوک کی کوتوالی انہیں کی محلسرا کے ایک حصے پر بنائی گئی ہے اور ایک قطعہ مکان پولیس اسٹیشن سے متصل اب بھی باقی ہے جو وارث مرزا سید محمد صاحب کے قبضے میں تھا یہ سب سے بڑا مکان ہے اس میں پرانے تک آثار کہیں ہیں اور کا پ جو نئے معلوم ہوتے ہیں بنائے گئے ہیں۔ لق و دق صحن، لاب، دالان، امام باڑہ، سہ دریاں، اونچا پھاٹک، وسیع ڈیوڑھی، کشادہ رہیے۔ چھٹے وقت نواب صاحب محلسرا سے برآمد ہوتے تھے اور پالکی، نالکی، تھامر دار، لوچہ، ہوادار، رتھ، ہاتھی۔ ران سواری کا گھوڑا جتنی سواریاں تھیں وہ تیار رہتی تھیں جس پر جی چاہتا سوار ہوتے اور ہوا خوری کو نکلتے سوار ہوتے وقت محتاجوں کو زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ دیا جاتا یہ امرائے لکھنؤ کی وہ رسم تھی جو کسی حالت میں بند نہیں ہوتی تھی۔ یہ جائداد آخر میں "پھلکی قدر" کی ملکیت عدالت سے قرار پائی تھی اس نام کی وجہ یہ ہے کہ وہ نثار علی قدر ہیں ایک لڑکا یتیم ہو گئے اپنی وراثت ثابت نہ کر سکا۔ ماں نے بسر اوقات کے لئے پکوان پکا کر بیٹے کو دیا اور وہ خوانچہ والوں کی طرح پھلکیاں، سہال، تاصیں بیچ کر پیٹ پالتا رہا چونکہ خاندانی تھا ظریف مزاج لوگوں نے "پھلکی قدر" نام رکھ دیا یہاں تک کہ سید صاحب موصوف نے اس کی طرف سے مقدمہ لڑ کر حق دلوا دیا اب وہ لڑکا صاحب جائداد ہو گیا۔ پبلک کی دوسری مستم ظریفی یہ ہوئی کہ سید صاحب کو وارث سید محمد کہنا شروع کیا جس پر وہ بہت بگڑتے تھے پرانے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ لکھنؤ کی زندہ تاریخ اور رؤسا و امرا کے حسب نسب پر اچھی طرح واقف تھے۔ رستوگی ٹولہ کے ابن ہو دیں وہ اس قدر ہر دلعزیز تھے کہ شادی بیاہ کے موقع پر دلہن کی مانگ میں سیندور وہی بھرتے اور ان کی ضیافت کا مکمل سامان مسلمان باورچی کی زیر نگرانی تیار ہوتا جس میں کئی طرح کے کباب ہوتے۔ محسن الدولہ کے یہاں ۱۴ ہاتھی تھے۔ امجد علی قدر کے زمانے تک ۵ ہاتھی باقی تھے دو فیل خانوں کے آثار اب تک موجود ہیں گول دروازہ کے سامنے نواب محسن الدولہ کی کوٹھی کے بعض حصوں میں شیر اور ریچھ کٹہروں میں بند تھے جن کو دیکھنے کے لئے خلق کا ہجوم ہوتا تھا نواب عالی قدر کے وقت تک یہ جانور رہے۔

گول دروازہ

چوک میں پہونچے کا بڑا پھاٹک جو سادگی و صنعت میں کوئی خاص بات نہیں رکھتا جس پر ناظرین کو توجہ دلائی جائے ۔ مگر شہرت میں اس قدر ممتاز ہے کہ بچہ بوڑھا، مرد، عورت تمام راہگیر واقف ہیں ۔ یہ عہد آصفی کی یادگار ہے اور جمہوری حکومت نے کسی مانع سے آنے والوں کے لئے سامنے کی زمین کو دائرہ بناکر ایسا نظر فریب بنا دیا ہے جو گول دروازہ کے لئے ہونا بھی چاہئے تھا ۔

باہر کے رخ پر عہد شاہی سے FRUIT پھلوں کی منڈی ہوتی ہے جو میوہ کہیں نہ ملے وہ اب بھی گول دروازہ میں مل جاتا ہے ۔ یہاں کے کنجڑے دولت مند اور رئیسوں کے پابند، منہ مانگے دام لینے کے عادی ہیں ۔ رنگترا، نارنج، لیموں، نارنگی، کولہ، چکوترا، ترلو، بیہیڑہ، آملہ، شفتالو، چکیا آڑو، انار بیدانہ، قندھاری سیب، بہی، ترنج، استپاتی، پٹاری کے انگور، سنگھاڑے، پپیتہ، پھلیہ، سوٹھ، ناس گوندی، کیلہ، پیوندی بیر، کسیرو، ککڑی، کمرکھ، شکرقند، ترلیہ، کٹھل، بڑھل، بکریا خربوزے، آم، مل، جامن، پھلیندے، امرود، شہتوت، لکھوٹ، فالسہ، کھرنی، گردندے، لیچو، بیل، کیتھہ، رس بھری، کنول گٹہ، بھٹے، رطب، زمیں قند، پل کھجور، گنڈیریاں، پونڈے، مرن، السابری جو چاہے فصل پر خریدو یاد رہے کہ موسم پھل اور موسمی ترکاری کی پیداوار ہیں ترکاری کی دوکانیں بھی ہیں سونے کے زیورات، چاندی کے برتن، گنگا جمنی چیزیں، جڑاؤ سامان ۔ چکن، بیتی سب بڑے خاص بیچتے ہیں اور گول دروازہ کے پہلوؤں میں بڑی بڑی دوکانیں ہیں چوک میں گول دروازہ کی مرکزیت اس سے ثابت ہے کہ جو جلوس نخاس سے نکلتا ہے اس پھاٹک سے گذر کر جو برات چوک میں آتی ہے وہ گول دروازہ سے ہوکر سوراج حاصل کرنے کے ایجی ٹیشن اور دور کانگریس کی گرفتاریاں گول دروازہ کے سامنے ہوئیں

تاریخی مناظر ۔ حالات اودھ کے سچے ترجمان خواجہ عبدالرؤف عشرت نے تیس برس پہلے جو حالات اخبارات اور ادبی جرائد میں طبع کرائے اور مقبول ہوئے ان میں سے وہ ملاحظہ ہوں ۔

نواب آصف الدولہ گول دروازہ کی چھت پر پتنگ اڑا رہے تھے حسب معمول بہلا چکے تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت چہرا لاکھ کی ... دکھا رہی ہے حاجتمند سمجھ کر اس کو اپنے سامنے بلایا

نواب ۔ کیا ہے؟

بڑھیا ۔ فرمان عالی تسبیح ہے ۔

نواب ۔ کیا قیمت ہوگی؟

بڑھیا ۔ قیمت کیا لاکھ کی تو ویسی یوں ہی حاضر ہے ۔

نواب ۔ لاکھ تو بہت ہوئے واجبی کہو اچھا تم کو دس ہزار روپے دئے جائیں گے ۔

بوڑھیا دس ہزار کی لفظ سن کر مارے خوشی کے آنسو بھر لائی دل میں کہنے لگی کیسا بھولا نواب ہے ۔ لاکھ کی چیز کے دس ہزار روپے دیتا ہے ۔ شاید ہنسی سے یہ کہا ہو سوچکر بولی ۔

بوڑھیا ۔ حضور تسبیح حاضر ہے میں ایک بے حقیقت چیز کی قیمت کیا کہوں لاکھ کی تو بتائی ہے ۔

جواب: - لاکھ تو بہت ہوتے اچھا پندرہ ہزار لے لو اس سے زیادہ نہیں ملیں گے۔

بوڑھیا نے مارے شرم کے سر جھکا لیا اور کہا خدا ایسے نواب کو رہتی دنیا تک قائم رکھے پندرہ ہزار روپیہ اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ لاکھوں دعائیں دیتی ہوئی چلی۔ حضرت کہتے ہیں کہ یہ عطا اس لئے دی تھی کہ دولت نثار ہوتے تھے یا سمجھتے تھے لکھنؤ کو آباد کرنا تھا رعایا کو مرفہ الحال بنانا تھا اگر وہ فاقہ کرتی تو کسی دوسری طرف نکل جاتی۔ اس کا پھل یہ ملا کہ وہ خوش ہوئی - اس کا گھر بھرا۔ اس کے رفتہ رفتہ کے ٹھک سن سن کر چل پڑے لکھنؤ بسنا شروع ہوا) اس روپیہ سے سچ پوچھو تو ملک کا کتنا فائدہ ہوا۔ کسی جزیرہ کو جرائم پیشہ لوگوں سے آباد کرنا اور حبس دوام عبور دریائے شور والی آبادی اور بستی اور ہے اور شوق کمال رکھنے والی پبلک اور ہے۔

ایک اور دن کا واقعہ ہے کہ نقلی صحیحوں میں گول دروازہ کی نواب جلوہ افروز تھے عورت ردی کا مدلے ہوئے گزری پنساری کی دوکان کی طرف جا رہی تھی اس خیال میں کہ دو چار پیسے کو بک جائے گی آپ کی نظر پڑ گئی ایک ہزار روپیہ دے کر خرید لی اور بڑی بی سے اس شفقت سے گفتگو کی کہ وہ کبھی بھی نہیں کہ یہ رقم لیا وہ بے قیمت ہے۔ فرمایا تو ہم دیکھیں شاید اس میں ہمارے کام کا کوئی کاغذ نکل آئے۔ تو اب دکھانے کا واقعہ بھی چوک ہی کا ہے جو اشرفیوں سے بھر دیا تھا اور ظاہر سطر میں جو فعل سیدھا۔ تھا اس کو یہ کہہ کر سنبھال دیا کہ یہ مجھے پارس بھیجتی ہے جو لوہا دکھانے سے سونا ہو جاتا ہے۔

گھڑیالی

گھڑیالی گول دروازہ سے نکل کر بائیں ہاتھ پر ایک محلہ ہے گھڑیالی اور جوہری محلہ پاس پاس ہیں چوک کی حد ملی ہونے سے اس پر اسی جگہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے گھڑیالی اس مقام کو کہتے ہیں جہاں گھنٹہ بجتا ہو اور لوگوں کو گھر بیٹھے وقت معلوم ہو جائے۔ کسی شاعر کا شعر ہے ؎

صدا ہے گھڑیال کی یہ ٹن ٹن گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

چار بجے، آٹھ بجے اور بارہ بجے گجر بجتا ہے موگری سے دو گی ضرب اور دو بہری آواز۔ جب بارہ بجیں تو ۲۴ دفعہ صدا آئے۔ فرق صرف اس قدر کہ پہلے بارہ ٹھہر ٹھہر کر اور دوسرے بارہ جلدی جلدی یہ شعر سنا ہے ؎

آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے وہ سویرے پہلے دل پہ گھونسا سا سبِ وصل گجرے مارا

اس محلہ میں شرف الدولہ غلام رضا خاں کا ایک امام باڑہ تھا اور ۸ محرم کو حضرت عباسؑ کی حاضری بڑی دھوم سے ہوتی تھی انگریزوں کی عملداری میں شرف الدولہ نے اس امام باڑہ میں افسران فوج اور اعلیٰ عہدیداران لطامت کی پر تکلف دعوت کی تھی۔ یہ امام باڑہ بھی باقی نہیں ہے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

مچھلی والی بارہ دری



لکھنؤ کی تہذیب میں مسافر کے ساتھ مچھلی ہونا یا دسترخوان پر مچھلی کی تصویر یا گھر سے نکلتے وقت دہی مچھلی کہنا نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اور سلطنت اودھ میں مچھلی کا خصوصی تذکرہ آئندہ صفحات میں اپنے محل پر آئے گا۔ یہ بارہ دری سلطان عالم محمد واجد علی شاہ نے جو گول دروازہ سے گذر کر بنوائی اور کھمبوں پر سرتا سر دوہری مچھلیاں تھیں اس لئے مچھلی والی بارہ دری مشہور ہوئی۔ انگریزی دور ہوئے پر چوک کا پولیس اسٹیشن اس عمارت میں مدت تک رہا اور پولیس کا تھانہ ہو گئے۔ م میں وہ دفعتاً در ذرسا گیا تھا کر جس کو کہا مچھلی والی بارہ دری کے جاذوہ دیکھ گیا اور کوتوالی نظروں میں ہونے لگی کوتوالی کی موجودہ عمارت تیار ہوئے پر تھانہ چوک کے اندر سے باہر آگیا اور عمارت مذکور گرتی پڑتی نئی تعمیر کے بعد کھولا ماتھر کی دھرم شالہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہے اس عمارت کے نیچے اور دوسرے رخ پر سامنے دو رویہ سونے چاندی کے زیورات، چکن کے کرتے، دوپلی ٹوپیاں، میرٹھ کی گول ٹوپی، امروہہ کی کشتی نما ٹوپی، ترکش کیپ، جگر کی ٹوپیاں، مری بیمدے کے پلے سیلدار تھوک مال کے طور پر بکتے تھے دھرم سالہ کی موجودہ عمارت میں قدیم در کی ایک ستون پر مچھلی اب بھی موجود ہے۔

کوچہ آفرین علی خاں

میاں آفرین علی آصف الدولہ کے غلام تھے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صاحب اثر ہوگئے تھے میر خدا بخش جن کی تا لکٹورہ میں کربلا ہے آپ ہی کے نائب تھے آپ نے چوک میں ایک محلہ آباد کیا تھا جو اب آفرین ٹولہ کہا جاتا ہے۔

کٹاری ٹولہ

یہ محلہ بھی اس بستی میں ہے جو گول دروازہ سے نکل کر چوک کی سڑک پر داہنے اور بائیں ہلالی کی طرح واقع ہیں یہ عہد اکبر کا آباد محلہ ہے یہاں اونچے اونچے اگھائی دار مکانات گنجان گلیاں، دروازے بند ہیں اور اس قدر محفوظ آبادی ہے کہ گلی شروع ہونے پر دروازہ اور ختم ہونے پر دوسرا پھاٹک، رہنے والے قلعہ بند یہاں راجپوت آباد ہوئے نام میں رہنے والوں کے جنگجو ہونے کی جھلک ہے کٹاری پرانے زمانے کا ایک ہتھیار تھا آتش کہتے ہیں ؎

اس زمانے میں یہ سپاہی بہیر بیگاری ہیں   نہ تو تلوار کسی ہے نہ کٹاری تیار

میر انیس تلوار کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

دو دم کی زبانوں سے بھی آنچ اس کی کڑی تھی   برچھی تھی سرو ہی تھی کٹاری تھی چھری تھی

بہرائچ کا کٹاری گھاٹ انھیں لوگوں کی تیرتھ ہے بعض پرانے اہل محلہ کہتے ہیں کہ کٹاری ٹولہ بختیار خلجی کے وقت سے آباد اور پرانا محلہ ہے

چوڑی والی گلی

گول دروازہ کے قریب ہے اور یہاں بھینسوں والی گلی میں شیر والی نیم کے قریب ایک امام باڑہ کا بھی قدیم یادداشتوں میں ہے

ملہ مرثیہ میر انیس جلد ۵ ص۲۲۵ طبع نولکشور جس کا مطلع یہ ہے ع اے خضر بیابان سخن ساہیری کر

سوندھی ٹولہ

عہد اکبری یہاں آبادی اور مضافات چوک میں غیر مسلم بستی یہاں دوارکا دھیش کا ٹھاکر دوارہ ہے جو ۱۷۹۰ء کی بنیاد ہے۔ دھنسی گنگوال نے اپنی عورت سہانی بی بی اور اس کے سگے بھائی جوگی مل کے بزرگوں کے پیسے سے ۱۸۳۸ء میں بنوایا۔ گنگوال غدر کے ۲۳ برس بعد ۱۸۸۰ء میں مر گئے بہنوئی کے مرنے کے بعد ۲۵ برس بعد تک سکھوں کی حالت سے تبدیلی ہوئی یہ ٹھاکر دوارہ اب بھی موجود ہے۔ تحسین علی اسی محلہ کے رہنے والے تھے وہ مکان جو اب بھائی چترمل کو سر منزلہ تو اب تک موجود ہے۔

ہرن کی سرائے

چوک میں مسافروں کے ٹھہرنے کی جو جگہیں تھیں ان میں یہ محلہ بھی اب تک موجود ہے ہرن کو عربی میں ظبی انگریزی میں DEER ہندی میں مرگ کہتے ہیں۔ یہ نام کیوں رکھا گیا عقل کو کاٹ کر لینے والے اگر ایسے ناموں پر شہرت پائیں تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ مجھے سفر ہوتا ہے کہ تاریخ اودھ میں اسی سرائے کا ایک مقام پر ذکر ہے غلام علی ممدوح نے وزیر علی خاں کی معزولی میں جو رائیں مدر قرطاس کی ہیں۔ وہاں لکھا ہے۔ چنانچہ[1] روایت کنند کہ شے در سرا ہرن والی کہ سرائیست مشہور در لکھنؤ گذرانیدہ۔

زیورات

گول دروازہ کے حصے میں سونے چاندی کے زیورات بنے بنائے اور فرمائش پر گاہک کے کہے کے مطابق ان خصوصیات کے ساتھ ہوتے تھے جو لکھنؤ کا حصہ تھا اس سلسلہ میں ممتاز علی عطیمی کی دوکان قابل ذکر ہے دو دربار قد و قامت رامپوری ٹوپی پہنے ہوئے مہندی سے رنگیں مدور داڑھی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا شان سے بیٹھے ہوئے موٹے حرفوں کا قرآن شریف پڑھ رہے ہیں بڑے نظر باز پہلی نگاہ میں جواہر کو پرکھ لینے والے، دلال کی گھاتوں سے واقف، کاریگروں کے سلیقہ و فرار سے ماہر۔ ان کی دوکان پر بالیاں، بندے، جھمکے، پچلڑی، ست لڑی، دھکدکی، جگنو، کرن پھول، چمپا کلی، چندن ہار، موتی مالا، موہن مالا، نورتن، لونگ، جوشن، تیر دھان کے کڑے، سرے، پتہ، ست لڑی، بری بند، پہونچی، گھنگرو، ہیکل، حمائل، ندھی، تھیکا پری، جھپک، ناک کی کیل، پیروں کے چھلے، چھڑے، پازیب، جھانجھ، منتقے، ٹھک، سرکان، جوشن، جوشن دتی، جہانگیری، چندن ہار، گلوبند، بالے، زنجیر، گلے کے طوق، کنگن، آرسی، لونگ، ہیکل، مارون، طوق بند، بہترین مال تھا اگر ان زیورات کی تشریح کی جاتی ہے تو بہت طول ہو جائے گا ناظرین کو لونگ کی لطف بہت اچھی معلوم ہوتی ہوگی اگر اس کو پہچاننا ہے تو ناسخ کا یہ شعر پڑھئے ؎

میں نے دیکھی اس کے کان میں لونگ — کیوں نہ جوش آئے مجھ کو پان میں لونگ

غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں میاں مشیر کہتے ہیں ؎

مٹی کے مول موتیوں کے جوڑے بکے — گر میں کے بیسے تو دس کے چھڑے بکے
ایسی کڑی اٹھائی کہ آخر کڑے بکے — چھوٹی غدر جو آج بکے کل بڑے بکے
گردن میں ڈھولنا ہو تو قرآن کی قسم — انگشتری کبھی ہو تو سلیماں کی قسم

---

[1] موقع ہو دوده ایڈ آگرہ پریس جلدہ منفصلہ ہر مارچ ۱۹۱۹ء ص ۲۳۳ ایلیٹ ہرگوبند داس رسپانڈنٹ مسٹر گورکن، تمعرا

[2] عماد السعادت ص ۱۱۱

کچھ زیور نئی دلہن سے خاص ہیں اور کچھ فقط بچے کو پہنائے جاتے ہیں میر عشق کے چار مصرعے ملاحظہ ہوں[1]

طوق اجل کی شکل تھیں مست کی ہنسلیاں　　معصوم کا کفن ہے یہ کرتے سے ہے عیاں
ہیکل کی تھی صدا کہ اٹھتا ہے دم یہاں　　گھنگرو تھے پاؤں کے سر میدان امتحاں

نتھ دلہن کے لئے اسباب شادی میں بہت ضروری زیور ہے اس کو سہاگ کی نشانی کہتے ہیں اور یہی زیور طوائف کی زندگی میں ہو تو اس کو نتھنی کہیں گے جو اس کی آوارہ زندگی شروع ہونے پر اترتی ہے ناسخ مرحوم نے غالباً کسی کی ہجو میں کہا ہے ؎

ناک رگڑے ہر گھڑی کیونکر نہ اس کے سامنے　　مہر نتھنی نے سلیماں کی ہے خاتم ناک میں

لاق قدیم زیور ہے جو عورتیں ناک میں پہنتی ہیں کسی شاعر کے کلام میں ہے ؎

آئی یہ عرش معلیٰ کا گوشوارہ　　پھر کہاں سے تمہارے لاق میں آیا

(دو موتی) اب بہت کم زبانوں پر آتا ہے قلق نے امتیوں کا تعارف کیا ہے ؎

کان میں دو دو امتیاں سادی　　جو کریں دل کی صفت برباد

انہوں میں دو دو موتی اور بیچ میں سبزہ یا یاقوت کا ہوتا ہے اگر کان کی لو میں پہنے تو امتیاں اور اوپر پہنے تو مالیاں کہیں گے۔

میر اولاد حسین دفتری:۔ جلد سازی کا فن شہر میں اس بلند درجے پر پہونچا تھا کہ چمڑے کی جلد میں ایرانی وضع کے گل بوٹے اور بیچ میں خوشنما گلدستہ چاروں طرف بیل پتے بنے ہوں۔ صحافت کو اعلیٰ درجہ ملا تھا مکتبۂ ممتاز العلماء لکھنؤ میں حدیقۂ سلطانیہ کی ایک جلد جس پر سنہری کام اول سے آخر تک ہے جو آج بے نظیر ہے ان کمالات کی آخری فرد میر اولاد حسین رہ گئے ہیں۔ جو اسی صدی شروع ہونے پر دنیا سے گئے۔ دفتری کے کام پر آئندہ بحث ہوگی۔

انگوٹھی والے

میر حامد حسین عاشق حسین دو سگے بھائی مگر صورتیں ایک دوسرے سے جداگانہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دو بھائی ہیں۔ ایک کی دکان پیماں کے کنویں سے مسجد حیدر بخش کی طرف جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر۔ دونوں سری منڈی میں رہتے تھے دوسرے کی دکان اس وقت شہرۂ آفاق تھی دوسرے بھائی مسجد تحسین کے پھاٹک میں گداز بدن گورے چٹے کم سخن موٹے تال کی عینک لگاتے تھے۔ ملک میں انگشتری سازی کا فن انہیں دونوں بھائیوں کی وجہ سے پھیلا اور سب کا سلسلہ ان دو تک پہونچتا ہے۔ پہلے حامد حسین دنیا سے گئے پھر عاشق حسین نے سفر آخرت کیا ان دوکانوں پر عقیق سرخ و زرد و سفید مارکی، تیلیہ آسمانی، در نجف، جزع، شوشی، لعل، حدید چینی، موردھن فرنگ، لیسنیہ، مونگا، فیروزہ، یاقوت، نیلم، پکھراج، کالا سنگ، ترشادہ، ہمیا، تابڑا، زبرجد ملتا تھا۔ کندہ نگینہ اور فرمائش پر اپنے نام سے مناسب الفاظ نگینہ یا پتھر پر لکھائے جا سکتے تھے اور یہ فن عروج پر تھا سواری کی انگوٹھی عاشق حسین سے ستر کوڑی میں مل سکتا تھا۔

شعراء کے دل و دماغ میں بھی یہ جواہر ہیں ؎

انگشتری کا حلقہ ہے وہ صاف حلقہ دار　　خال سیاہ اس میں نگین حدید ہے　　آتش

---

[1] گلزار نسیم جلد ۲ صفحہ ۹۵

اور دوسرا شعر ہے

اک بوٹے سے قد کا ہے زمیں نقش جو بیٹھا　　　دل رنگ دکھاتا ہے عقیق شجری کا　　　آتش

چند دل کاغذی

مسجد تحسین کے دو کا نداروں میں ۱۲۱۳ھ کا زمانہ ہے اور ہانس کا کاغذ بھی کٹا ہے جو استقاد حمل کے موقع پر حاملہ کو ا جاتا تھا ا دھرایک سفید کاغذ اردو لی کے نام سے کٹ تھا انگریزوں کے دور میں سب سے پہلے ہاتھی مارکہ کاغذ رائج ہوا ۔ ملکیب ائن مارک اور رف کاغذ کا ایسا بودا ، عہد شاہی میں کاغذ سادا بھی گھریلو صنعت تھا اور بازار میں بھی یہ کاغذ آجاتا تھا ۔ طوطات میں اس کے نمونے اب بھی ملتے ہیں ۔ کاغذ ساری یہ جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کاغذ کے مختلف رنگ ہیں ۔ جن میں رنگ رومک ، رنگ پیازی ، رنگ نخودی رنگ صندلی ، رنگ سروردد ، رنگ چنپئی ، زعفرانی ، حنائی ، بستانی ، افروری ، معشی ، طاؤسی لمہ برگ نئے رنگ گلگوں رنگ لیموئی ، کی ، بارکانی ، پستئی ، طوطئی ، عودی ، لاجوردی ، فیروزئی ، گلناری ، سب چھبیس قسمیں قرار ی تھیں جس میں دو رنگ کا کاغذ بھی شامل تھا آدھا سفید آدھا سرخ اور زرد و سرخ بھی تھا ۔ خوشنویسی کی کتابوں میں اس کی ترکیبیں درج ہیں ۔ کاغذ پر چمک پیدا کرنے کے لئے بڑی کوڑی سے گھرا کیا جاتا تھا اس زمانے کا کاغذ آج کے کاغذ سے یقیناً پائدار اور اچھا ہوتا تھا

پارچہ والی گلی :- چوک میں گول دروازہ سے گذرتے ہوئے بائیں ہاتھ پر جو موڑ ہے اس کو پارچہ والی گلی اس لئے کہتے ہیں کہ نونے بے سلے پٹے ، کڑھی ہوئی ٹوپیاں ، کڑھے ہوئے کرتے ، چکن کے پارچے فروخت ہوتے ہیں ۔ یہی گلی فرنگی محل کو جاتی ہے اور دو تین پرانی مجدیں اس کوچہ میں بھی ہیں جن کے بارے میں کوئی شہرت نہیں عہد شاہی میں یہاں تماکو کشیدنی دو سرا ملتا تھا اخبار مرآۃ الہند ں سوالہ ہے کہ ——— پارچہ والی گلی کا دو سیرا تماکو کسی نے اد کہیں پیا ہے ، اگر یورپ کے شاہزادہ ایک دفعہ بھی اس کو پی لیں تو مرہ ہوا سگار اور مسلاچرٹ کا مزہ بالکل دل سے بھول جائیں ۔ اطلس پرا و توی صرف یہی ایک دوکان تھی اور تو ریشمی کپڑے پر ٹھپہ سے پھولوں کے نشان بنانے کو کہتے ہیں جیسے کاغذ پر مسطر پاردل کیپ پیپر ۔ حضرت ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک کسی کی ہجو میں کہتے ہیں

مارکر تلوار اپنے تیرہ بخت　　راریر　　یعنی کہتے ہیں سیہ اطلس پر اد تو ہو گیا

لساطیوں کی مسجد

شاہی دار الشفا سے قریب مسلمانوں کی چھوٹی بڑی دو مسجدیں ہیں جس میں فریقین نماز پڑھتے ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں رن پرانی ہے ۔ قدیم زمانے کے آثار تو رہے نہیں اگلی بنیاد پر دونوں کی جدید عمارت ہے اور تاریخ میں اس کا ذکر آ بھرے ہوئے الفاظ میں یہ منقش نام سہانے کہتے ہیں ۔

جس وقت محمود غزنوی نے قصد ہندوستان کیا اور پہلی مرتبہ ۳۹۹ھ میں نگر کوٹ کو فتح کیا اور دوسری مرتبہ ۴۰۷ھ میں قنوج کو گھیر کر راجہ ہند کو برباد کیا اور صورت سوم جنگ مع راجہ ہند کو مقام غزنیں میں لے گیا ۔ ایک درویش مسمی شاہ قیام الدین کر اور ملک تھا جدا ہو کر اس سرزمین لکھنؤ میں پہونچے اور لساطیوں کی مسجد کے قریب زیر درخت برگد قیام پذیر ہوا ۔ مسمی لکھنا قوم اہیر

۱۔ الاتنگ چمن مولانا منشی ربہ پرشاد طبع چہارم نولکشور ۱۹۳۰ء

۲۔ مولانا بسلسلہ محمود بعد جوری ۱۹۰۸ء ومع بحوالہ نیا دور بابت دسمبر ۱۹۰۸ء

ساکن موضع متصل کاکوری جو کہ اسی سرزمین میں ہے اپنے مویشی چراتا تھا ایک روز ایک گائے اس کی گم ہوگئی۔ امیر مذکور نے ہر چہار طرف جستجو کی لیکن پتہ نہ پایا از روئے اعتقاد شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچا۔ شاہ صاحب نے مراقبے سے سر اٹھایا۔ امیر نے اپنی حاجت کو بیان کیا۔ درویش نے زبان فارسی اس امیر کے ضمیر کو مطمئن کرکے ہٹا دیا۔ امیر نے آگے بڑھ کر گائے میش گمشدہ کو پانی سے بھیگی ہوئی پایا اس دن سے امیر مذکور ہر روز شیر تازہ شاہ صاحب کے پاس لانے لگا اور خدمت نیت دل سے کرنے لگا۔ امیر مذکور بہ برکت خدمت درویش اہل کمال سے روز بروز دولت وکثرت اولاد سے بہرہ ور ہونے لگا اور پس از حصول حکم حاکم ایک گاؤں اسی مقام پر آباد کیا جس کا نام درویش صاحب سے مناسبت نام لکھنؤ امیر کے لکھنو رکھ دیا جبکہ فقیر صاحب نے قالب عنصری چھوڑا تو ان کی ہنسی اسی درخت کے تیار ہو کر زیارت گاہ ہوئی۔ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ خلد مکان میں مسمی میر نظیر علی نے قبر کو کھدوا کر خاک میں ملا دیا۔

اسماعیلیوں کی دوسری مسجد جو فرقہ امامیہ کے قبضہ میں ہے یہ بھی چوک کے شاہی شفاخانہ سے پہلے کی تعمیر ہے۔ بانی کا نام معلوم نہیں ہو سکا دارالشفا کی دیوار اسی مسجد کے پہلے سے موجود ہونے کی وجہ سے کج واقع ہے اس وقت دونوں مسجدیں چوک کے دو کانداروں کی توجہ سے بنی ہیں کر اگلے آثار کو یاد دلا رہی ہیں۔

دونوں مسجدوں کے نیچے سرمہ، مسی، حقہ کی سلائی، کاٹھ کی سرمہ دانی، مسواک، کنگھیاں اور پیتل کے تار، کچا سوت شیشے کی تسبیحیں ہمیشہ سے بکتی ہیں۔ دوکانات بساطخانہ طول وعرض میں بڑھی نہیں ہیں اور ان کو بساط خانہ پرانے زمانے سے کہا جاتا ہے دوکاندار سب مسلمان ہیں۔

کپتان کا کنواں

تاریخ اودھ میں ظفر الدولہ کپتان فتح علی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے جو خزانہ شاہی کی نگرانی اور اہتمام ان کے متعلق تھا۔ یادگار مقبرہ لکھنؤ میں ان کے آثار قدیمہ میں کنواں سب سے مشہور ہے اور جس سے کپتان کا کنواں کہو وہ چوک میں شفاخانہ کے سامنے پہونچ کر رک جائے گا۔ اس حصہ بازار کی دو منزلہ دوکانیں گول دروازہ کے جدید گنبد گاہ کی طرح گول ہیں اور جاندار نہیں اور نیچے ہوتے ہوتے اس وقت حاجی کلو میمار کی ملکیت ہے دوکانوں میں سادہ کار، انگوٹھی والے، زیور بنانے کے کاریگر نگینہ پر جلا اور نگینہ کو راستہ اور ظروف مرکی و مسی میں مناسب مرمت اسی جگہ ہوتی ہے ساٹھ برس پہلے یہاں کندہ گری کے کاریگر بھی کام کرتے تھے جن کے نسخ ونستعلیق کے نمونے چاندی کے نمونے، عقیق اور درخش یا فیروزہ پر اب بھی نظر باز کو دستیاب ہو جاتے ہیں یہ فن ۱۳۱۳ھ تک زندہ تھا اور مہر کن اس وقت یہاں اپنے حسن خط اور طغرا نویسی کے جوہر دکھلاتے تھے۔ عقیق یمنی کے ایک پر آیۃ الکرسی شریف، نادِ علی، سورۂ توحید یا دیگر مناسب آیات قرآن جیسا یہ طبقہ کندہ کر گیا وہ اب مفقود ہے [۱] سبز عقیق پر حروف نورانی یا مقطعات قرآن اگر دستیاب ہوتے ہیں تو یہ اسی سلف صالحین کی یادگار ہے ان کے حسن خط سے اگر کوئی تحریر نوک پلک سے اچھی ہوتی تو اس کو خط ولایت کہتے یعنی ایران و عراق و حجاز کا کندہ ہے لکھنؤ کے خطاط کمال میں عرب و عجم کا مقابلہ کرتے تھے اب ان دوکانات میں کوئی مہر کن نہیں ہے اور عصر حاضر میں دستاویزات، عہدنامہ جات، رسیدوں، قبالوں پر مہر کا

---

[۱] احسن التاریخ صفحہ ۳۳

رواج ختم ہو کر دستخط کافی سمجھی جاتی ہے خطابی مہریں جو عطیہ شاہ ہوا کرتی تھیں سب اسی زمین کا کرشمۂ صنعت ہے۔

کندہ کرنے والے کو حکاک کہتے ہیں آتش کہتے ہیں ؎

دلِ صد پارہ کے ہر پارہ پر نقشِ محبت ہے　　　کہاں ہو سکتے ہیں ایسے نگیں حکاک سے پیدا

۱۸۵۸ء[1] میں جب لکھنؤ کی چیف کمشنری توڑ دی گئی اور اخبارات میں یہ سوال اٹھا کہ یوپی کا دارالحکومت الہ آباد قرار پائے۔ اس وقت اخبارات نے لکھنؤ کی برتری پر نوٹ لکھے اس میں استفساریہ لب و لہجہ میں پوچھا ہے۔ کپتان کے کنویں کی برفی کے مقابلہ میں ہندوستان بھر میں کہیں ایسی برفی نصیب ہے

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں برفی کی نمایاں دکان بھی تھی جس کے اخبارات[2] میں آج تک تذکرے موجود ہیں۔

کنواں :۔ اوسط درجے کا ہے چاروں طرف موٹی لوہے کی سلاخوں کا کٹہرا اور پورب کی طرف مزید چند آہنی ستون ہیں جو پانی بھرنے کی قدیم مشین کا باقی ماندہ حصہ ہیں اندرونی حصہ میں ہگت سے تا آب تک لوہے کے ٹکڑے پاؤں رکھ کر چڑھنے اور اترنے کے لئے اور اسی کے پہلو میں جو لوہا سرتا سر لگا ہے وہ بظاہر آب کشی کے آلات کا بچا ہوا سامان ہے کنویں میں نیچے سے اوپر تک پتھر کی چٹانیں دیوار میں آویزاں ہیں اور ابتدائی دور (لگائی) میں جو پتھر ہیں ان پر جلی خط میں اشعار کندہ ہیں اور مصرعوں کی ترتیب اس طرح ہے جیسے ریاض پر کاتب اشعار لکھتا ہے رنگ نہ ہونے سے شعر پڑھنے میں مدد نہیں ملتی۔ درمیانی چوکھٹے میں جلی قلم سے لکھا ہے ۷۸۶ جاہ ظفرالدولہ ۱۲۴۹ھ ایک عبارت اور کی منڈیر سے قریب ہے۔ جو صاف پڑھی جاتی ہے۔ کوٹھی سنگیں دفرود رفت بچاہ درعہ متقف آہنی در بہ رہیں کہ تمگی ار سطح رہیں ہشاد و پنج درجہ کرد دید آب ـــــ اشعار بظاہر 'صاحب رائے' شاعر کے نتیجہ فکر ہیں اور سطح آب پر کوڑا کرکٹ پڑا ہونے کے باوجود اہل محلہ کہتے ہیں کہ پانی بہت گہرا ہے۔

کنویں کی منڈیر سے پچھم کی طرف ایک بیٹھا ہوا ہاتھی ہے جو بھاری لوہے کا ہے اور اس کے مستک پر سوراخ ہے جس سے پانی کسی وقت میں مشین نکالتی تھی۔ اس ہاتھی کے سامنے انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت کا نل لگا ہے جس سے لوگ پانی بھرتے ہیں کنواں انقلاب سے پہلے قابل دید ہوگا اور پانی نکالنے کی ہندوستانی مشین' افسوس ہے کہ باقی نہیں ہے حیات مرزا سادہ کار یہاں کے مشہور اور بطرز سادہ کار رہتے۔

دارالشفا شاہی

نصیر الدین حیدر بادشاہ نے طب یونانی سے ہر مذہب و ملت کے مریضوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے عارضی طور پر حضرت گنج میں کونسل چیمبر کے سامنے دارالشفا قائم کی تھی اب تک وہ محلہ دارالشفا کہا جاتا ہے چونکہ مرکزیت چوک کو حاصل تھی اس لئے اسپتال اٹھ کر چوک آیا اور ۱۸۳۲ء میں شاہ موصوف اور محمد علی شاہ بادشاہ کے تین لاکھ روپے سرمائے سے خدمت خلق شروع ہوئی ہر سال لاکھوں مریض اچھے ہوتے ہیں پہلے یہاں مریضوں کو ٹھہرایا بھی جاتا تھا شفاخانہ کے پہلے ملازم حکیم مرزا علی اکبر فرزند حاجی عوض خانی تھے اور انگریزی دور حکومت کے آخری حکیم خان بہادر مرزا ظہیر حسن خاں مرحوم رئیس محلہ کٹرہ ابوتراب خاں

---

[1] مرآۃ الہند جمادی ۱۸۵۸ء　　[2] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

جو پہلی دسمبر [illegible]ء کو رحلت کر گئے ان کے آخری زمانہ اور ان کے بعد تک دار الشفا کسی دن بند نہ ہوتا تھا اور روزانہ ہر دن مطب کرتے تھے۔ دار الشفا کے قبضہ میں دو کانات طویل مدت سے ہیں ہیں اور نزول کی عملداری ہے جس سے واقعہ مدد پہونچتا ہے۔

سوانح لکھنؤ میں مسجد دار الشفا کا ذکر اس طرح ہے ...... کمامت حسین خاں عظیم آبادی نے یہاں سے ۲۰ صفر [illegible]ھ مدفن شیخ خدابخش کے تعزیہ کی زیارت کی تھی۔

یہ تعزیہ عہد امجد علی شاہ میں بڑی شان سے نکلتا تھا شیخ خدابخش شاہی آتشبار تھے اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کا اصلی مدار بارعاں تھا کمامت حسین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسجد دار الشفا کے نزدیک پہونچکر اس کی چھت کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ اثنا میں تعزیہ کا جلوس قریب آگیا سب سے پہلے سات سانڈنیاں نمودار ہوئیں جن پر سیاہ جھول پڑی ہوئی تھی ان پر جو لوگ تھے وہ بھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے سانڈنیوں کے پیچھے سترہ ہاتھی تھے۔ سیاہ بانات کی جھول تھی ہاتھیوں پر سر فلک علم بر جم تھے جن پر سرخ و سیاہ اطلس کے خوبصورت غلاف تھے ان غلافوں پر طلائی و نقرئی حروف میں اللہ اور رحمٰن کے اسمائے گرامی نقش تھے۔ ہاتھیوں کے بعد عہدہ داروں کی آمد ہوئی ان لوگوں کے ہاتھوں میں چوبدی سونے اور گنگا جمنی برچھیاں، علم اور عصا تھے ان کی تعداد احاطہ و شمار سے باہر تھی ان کے پیچھے پیچھے پیادہ تھے جو شمشیر و سپر سے مسلح تھے جلوس کے اس حصّے کی لمبائی دو کوس سے زیادہ ہوگی اس کے بعد باجوں کے طائفہ آئے۔ روشن چوکی جھانجھ ترہی دف اور نئے نئے قسم کے نقارے اور باجے تھے وا حسینا کی جگر گداز آواز نکل رہی تھی جس کو سن کر سنگدل سے سنگدل انسان بھی مثل موم کے پگھل جاتا تھا یہاں تک شہنائی کی آواز سے بھی جو بہت ہی مکروہ ہوتی ہے طبیعت میں افسردگی پیدا ہوتی تھی جلوس کے ساتھ آبدار خانے بھی تخت رواں تھے۔ تخت پر برف لگے ہوئے قند کے شربت سبوچوں اور کوروں میں رکھے تھے اور جلوس کو پلاتے جاتے تھے جو لوگ زیارت کے لئے راستے کے دونوں طرف کوٹھوں پر مجتمع ہیں ان تک بھی شربت کے پیالے لمبے لمبے بانسوں میں باندھ کر پہونچائے جاتے تھے آبدار خانوں کے بعد نقرئی اور طلائی مرصع کا ربجہ اور علم نمودار ہوئے اور ان کے پیچھے دو تین دلدل اور تابوت تھے جن پر نرمیلے ہوئے تھے دلدل کی چادریں سرخ ستھائی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ علم کے پیچھے اور مدار بارعاں کے تعزیہ کے آگے غربا کے سیکڑوں تعزیے تھے اور ان سب کے ارد گرد بے شمار روتے ہوئے آدمی تھے۔ سر دیا برہنہ، اشک ریزاں، آنکھیں جوش گریہ سے سرخ۔ سینہ زنی کی کثرت سے بے شک لگا رہے لوگ تعزیہ کے آگے رقت انگیز اور حزن آمیز لہجوں میں مرثیے اور نوحے پڑھتے جاتے تھے چند قدم چل کر رک جاتے اور حلقہ باندھ کر شیون و ماتم کرنے لگتے۔ ماتم کرنے والوں کے بھی کئی کئی حلقے تھے کوئی حلقہ تو اہل شہر کا تھا اور کوئی حلقہ حبشیوں کا، کسی حلقے میں ولایتی مغل تھے۔ ان سب حلقوں میں اس دردناک آواز میں ماتم ہوتا تھا کہ عزاداروں کے دل پنج غم پر کباب ہو جاتے تھے اگر شمر بھی اس ماتم کو دیکھتا تو شہیدان معصوم کے غم میں آنسو بہانے لگتا۔

عزاداروں کی کثرت تخمینہ و اندازہ سے زیادہ تھی سامان جلوس میں بعض امور خلاف شرع بھی تھے لیکن چونکہ ان تمام تکلفات کا مقصد گریہ ہے لہٰذا قبیح نہیں ہے جلوس کو دیکھنے کے لئے ہزار ہا آدمی اکٹھا ہوگئے تھے۔ امیروں، وزیروں، نوابوں اور شاہزادوں کی سواریاں کثرت سے موجود تھیں ہجوم کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار تھا خاں صاحب بمشکل تمام جلوس سے نکل کر لبِ دریا نزدیک آگئے۔

صحیح وسلامت گھر واپس گئے اور سجدہ شکر بجالائے کیونکہ انھیں خوف تھا کہ ہجوم و بزغہ کی وجہ سے ان کا دم گھٹ جائے گا۔
یہ لکھنؤ کے کوچہ کا سفر ہے جو میرے علم میں ۱۲ر صفر کو اٹھتا تھا۔ ۲۰ر صفر کو تسلیم ہیں۔

چوک

چوک گول دروازہ سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے اور جو عنوانات اب تک سپرد قلم ہوئے ہیں وہ چوک کے ابتدائی محلے ہیں یا بازار کی اہمیت کے لحاظ سے مخصوص زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے اور خاص مقامات چوک کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے
ہندوستان کے اکثر شہروں میں آباد ترین حصہ کو جس میں دلچسپیوں کے تمام سامان پائے جائیں چوک کہتے ہیں دہلی میں چاندنی چوک مشہور مقام ہے لکھنؤ مشرقی تہذیب کا گہوارہ تھا وہاں خصوصیات دہلی کے نمونہ ہونا لازم و ملزوم تھا۔ بازار کو وہ حیثیت حاصل ہوئی کہ چوک کے بانکے، چوک کے گنڈے، چوک کے دلال، چوک کے تماشائی، چوک کے پان والے تمام بعض معنی رکھتی ہیں۔
مرلفہ اور چاندی بازار میں دلالوں کی وہ بھیڑ کہ آنے والوں کی صورت یہ دیکھتے ہی تاڑ گئے اس کو ملاقات کی ضرورت ہے گھیر لیا ایک لپے بچہ ہر ہے دوکاندار کے پاس لے جانا چاہتا ہے دوسرا اپنی طرف کھینچتا ہے چاندی بازار میں ان مٹے حال بڑا ستک طلا و نقرہ کا یہ عالم ہے کہ مہتر نالیوں کو صاف کرتے وقت بیچ کی مٹی تسلہ میں رہنے دیتے ہیں اور اس کو صاف پانی سے دھو دھو کر چاندی کرتی کرتے ہیں اور یہ چاندی ان سے کل کر پھر ریت گلو ہوئی تھی دلالوں کے محاورے ہماری اردو سے بالکل علیحدہ ہیں۔ وہ اشاروں اشاروں میں ایک ستو کی رکھتی رمال جسی سے طے کر لیتے ہیں ؎

چوک کا بازار تیرے راستوں کا چوکا   دلال رہال ہے جو ادھر کبھی ہے ادھر کبھی

پان والے گلے میں لواز ڈالے ہوئے پیتل کی کھلی ہوئی پٹاریاں لیے ہوئے گلوریاں، بیڑے اور دست پان کھانے والوں تک پہنچاتے ہیں اور ایک ایک پان پر انعام پاتے ہیں پان والوں کی دوکانیں الگ ہیں جن پر یاں کے شوقینوں کا ٹھٹ لگا ہے۔ پیتل اور سنگ کی اچاری سانچے چونے کی کلہیاں، پسی پان، خوشبودار مسالہ، تمباکو اودھ، تمباکو سار، شیشیوں میں قوام اور دیسی جو پسند کیجئے وہ حاضر ہے چاندی کے ورق کے پان علیحدہ بالائی کی گلوریاں گاہک کسی پر کہے گا۔ پان لگا دو۔ دم کا پہلو ہے ہمیشہ پان بنا دو کی آواز آئے گی اور اس سے زیادہ لطافت پسند لوگوں کا طرف دوکان کے سامنے آکر کھڑا ہو جانا کافی ہے مزاج داں دوکاندار حاجت جانتا ہے۔ کہنے میں صورت دیکھتے دیکھتے پان تیار۔ حقہ والوں کی شان اور زیادہ نرالی ہے سر پر سادہ ما ٹوپی، گلے میں لیٹا سکہ کا معرقہ پشت پر جھولا۔ ہاتھ میں گڑگڑی گول دروازہ سے اکبری دروازہ تک گشت کرتے ہوئے جس نے دو کش پیئے گاہک ہے اپنی شان کے مطابق دے دے اور کبھی کبھی حقہ میں نال لگا کر کوٹھوں تک پہنچا جائیں اور دھواں آسمان کی خبر لے۔ بڑے حقہ کو اردو میں گڑگڑی کہتے ہیں، آتش کا قول ہے ؎

سیک بھونہ آہ عاشق شیدا کو بے سبب   اگر کی بو دھواں دیتا ہے لکڑ کا

چوک میں سب سے بڑی مصیبت گھوڑا گاڑی۔ یکے چلنے کی روک تمام ہو جائے اور راہگیروں کا وہ اژدہام کہ اگر اتفاقیہ کوئی فینس یا پالکی آ جائے تو شور مچ جائے کہ بچے ہوئے کہاروں کا تختوں میں دم ہو جائے اور کسی شریف کے دھکا لگ ہی جائے۔
چوک میں انسان فرصت کی تمام چیزیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ آتش کہتے ہیں ؎

دل کو لٹک میں مار کے رے تو چلے ہیں چوک — کہتی ہے کیا نگاہِ خریدار دیکھئے

لطافت کی فردیں اور سوانگ بھرنے کا سامان، مصنوعی داڑھی مونچھیں، لکڑی کے کھڑاویں اور صندوقچہ، قلمدان، زیور، آٹا گوندھنے والے، پٹوے، جو اس وقت ہیکل، نورنگے، جوشن ریشمی اور سوتی ڈوروں میں تیار کریں۔ صندوقچہ کا کاروبار کئی اب بند ہے مرقومہ بالا سودا گو لدر دانہ کلھے۔

(۱) ایک طوائف نے توبہ کی بڑھاپے میں صدا یاد آیا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ خمس کی فکر ہوئی ڈہر کی کربلا گئی گنبد مبارک نظر آیا آپے سے باہر ہوگئی جو غزل زبان پر چڑھی ہوئی تھی شروع کی "اللہ بالمٹے بھاگ جاگے پیا را نجر آیا" کفش کنی میں پہونچتے پہونچتے یہی راگ الاپتی رہی۔ خادموں نے روکا واپس گئی رات کو بشارت ہوئی کلید بردار نے آنے دیا داخلے کا اذن بڑھا حاں تحت تسلیم ہوئی محبت کا آخری درجہ ہے دیوانگی یعنی عقل رخصت ہو جائے اور جب عقل پر بن جائے تو داد ہے نہ فریاد

(۲) میاں وحید الہ آبادی شاعری میں عاشق مزاج اور حسن پرست مشہور تھے الہ آباد سے لکھنؤ آئے شام کو چوک سے نکلے۔ گرمی کا زمانہ تھا مسرت آگئیں دعلنے نظریں اٹھانے پر مجبور کیا سامنے پر تماشہ دیکھا کہ ایک مجسمہ حسن خربوزے کی قاشیں چاقو سے تراشنے میں مصروف ہے۔ راستہ چلتے چلتے رک گئے اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھا ؎

معروف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے — رکھ لیجئے گا دل بھی ہمارا تراش کے[1]

دل سے نکلی ہوئی صدا بڑی عزت کے کانوں سے سنی گئی اور گذرگاہ کا ادنی حربہ قدرا فزا دماغ میں ساکن ہوگیا۔

(۳) لکھنؤ کے نامی چوروں میں محمدو گلکا ز تھا عہد واجدی میں اس کے دونوں رخساروں پر چوری کرنے کی سزا میں گل دئے گئے تھے اس وجہ سے گل مار کہتے تھے۔ ایک دن محمدو اپنے لڑکے کو گود میں لئے چوک سے گزر رہا تھا ایک مہاجن کی دوکان پر جڑاؤ پنکھا دیکھا لڑکا مچل گیا میں لوں گا۔ محمدو نے مہاجن سے کہا کہ بھائی پنکھا دیدو بچہ رو رہا ہے[2] بہلا کر دیدوں گا۔ مہاجن نے انکار کیا محمدو یہ کہہ کر چلے کہ اچھا ہوشیاری سے رکھنا اس نے حفاظت کی مگر پنکھے غائب ہوگئے۔ چوری میں کامیابی کے بعد صبح کو محمدو حسب وعدہ پنکھا دے گئے مہاجن کو حیرت ہوگئی۔

(۴) پروفیسر مسعود حسن ادیب مشہور اہل قلم کہتے ہیں کہ ایک طوائف کسی مشہور طبیب کے مطب میں گئی اور حکیم صاحب سے عرض کیا کئی دن سے مجھے وہ شکایت ہے کہ نماز نہیں پڑھ سکتی حکیم صاحب نے دافع ادرار نسخہ لکھ دیا اور ایام کی خرابی سمجھ گئے۔

(۵) حکیم سید علی آشفتہ اصل حاں کے شاگرد تھے مطب سے اٹھ کر بالا خانہ جارہے تھے ایک مسخرا ساتھ ہوگیا۔ طوائف کو ذہنی شکایت تھی جس کا اوپر ذکر ہوا مسخرہ نے راستے میں کہا کہ گدّہ رکھوا دیجئے اچھی ہو جائے گی حکیم صاحب جو پہونچے تو اس کی حالت غیر تھی نسخہ تجویز کرنے کے ساتھ ہدایت کی کہ مسہری کے پائین یا بیجا نہ رہے دونوں پایہ گدّہ پر رہیں اور سرہانہ پست رہے۔

(۶) آغا سرور مرحوم و مغفور ناقل تھے کہ چوک میں ایک طوائف کے حسن صورت و سیرت کا ہمہ گیر شہرہ تھا۔ شیریں زبانی اور حاضر جوابی میں اس کا جواب نہ تھا مذاق میں اس سے کوئی کامیاب نہ ہوتا۔ بڑے بڑے ادبا اس کی بزم سے شرمندہ ہو کر واپس ہوتے ایک نامور ادیب اور حسن پرست مقابلے کے لئے پہونچے اور نام پوچھا اس نے کہا آغا جان عموماً بالائی

---

[1] بزم خیال ص۱۳۱ [2] قدیم ہنر ص۲۱۷

عورتوں کا اسی طرح نام ہوتا ہے الہی جان، مستی جان، خورشید جان۔ اماں جان سننے پر اس نے بلاتکلف پوچھا اور آپ کا اسم گرامی کیا ہے۔ مولا بھلے۔ برجستہ جو جواب دیا اس کو۔ پوچھیں مادر کی لفظ تو سنی اس کے بعد وہ قہقہہ ہوا کہ دور کے بیٹھنے والے بھی سمجھے یہ کہا۔ قلم صراحت کی جرأت نہیں کر سکتا۔

نوٹ۔ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ میں کرات کے دوران تالاب میں حکومت کی طرف سے چوک سے طوائفیں ہٹائی گئیں۔

چوک کا سین نجابت حسین خاں کی زبانی عہد امجد علی شاہ کی چہل پہل

نجابت حسین خاں:- جن کا نام آپ کے محلے کے معزز رئیس تھے ۲۰ محرم ۱۲۵۹ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۸۴۳ء جھکے کے راستہ گھوڑے پر عظیم آباد سے روانہ ہوئے اور ۱۰ صفر مطابق ۱۰ مارچ کو لکھنؤ پہنچے ان کے شہر میں ٹھہرے اور لکھنؤ کی سیر کا مکمل بیان کچھ یہاں کچھ آئندہ صفحات میں اپنے مقام پر پیش کرنے آنے کا مناسب مقام ان کی سیاحت کا یہ حصہ ہے جو سوانح لکھنؤ ایک قلمی روزنامچے کی شکل میں پٹنہ یونیورسٹی کے مخطوطات میں محفوظ ہے بازار چوک کے حال میں دیکھ لکھے ہیں

دوکانوں سے بائیں طرف دونوں جانب بلند عمارتیں ہیں جو بارہ دری آصف الدولہ کے نام سے مشہور ہیں اس کو پرانا چوک بھی کہتے ہیں یہاں پھرنے کے وقت اکثر دست فروش مختلف رنگ کے بیچ جو گوٹے بوٹے دار میلوں رنگین کی ٹوپیاں لئیں اور جوش قماش دریاں، شطرنجیاں اور کیسیں، گلاب، موتیا، بیلا، چمپا اور دوسرے پھولوں کے ہار ہاتھوں میں لئے دلکش آوازیں لگاتے ہیں ہار بیچنے والوں کی صدائیں کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں، کیا معطر پھول ہیں حسینوں محبوبوں کے گلوں کے ہار ہیں۔ جوہری بازار ایک دروازہ سے گذر کر پہونچا قدم رکھتے ہی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں بے اختیار زبان سے سبحان اللہ تعالیٰ شہر نسبت دلپذیر و بہ مقامیت بے مثل دے بیجا بیست دلفریب و مکانیست مطبوع سرہ اللہ عجب۔ مدینت سن دلچسپ و حرت سواد دو کاہا لس مملو د آباد معمورہ ایست از اقسام و انواع چیزہا۔

دوکانوں کے بارے میں خاں صاحب لکھتے ہیں یہاں ہر قسم و قماش کی چیزیں موجود ہیں لکھنؤ کے کاریگر موجدانہ طبیعت رکھتے ہیں اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں یا پرانی چیزوں کو نئی تراش خراش کے دیدہ زیب دلکش بنا دیتے ہیں ان کی صنعت گری دیکھ کر سامان چین کی عقل بھی دنگ ہے۔ بازار میں اہل حرفہ، بزازوں، صرافوں، جوہریوں، زردوزیوں کی دوکانیں ہیں بزازوں کی دوکانوں میں دیسی اور ولایتی کپڑے بھرے ہیں یہاں ململ، جامدانی، ڈوریا، چارخانہ، کامدانی انواع و اقسام کے پارچہ جات موجود ہیں ڈھاکہ سے آیا ہوا مال بھی بکتا ہے جالی لیٹ، کامدار، بیل سکہ، کھمی سمٹی، انگریزی اور فرانسیسی کپڑوں میں سوتی اور ریشمی، چھینٹ، مشروع، دانہ دار گلبدن اور ساٹن بھی ہیں۔

بنارس کے دوپٹے تھان اور زری کے تھان بھی رکھے ہیں عام لکھنؤ کے بنے ہوئے کپڑے ——— میلدار اور گل کار زرتار وکارچوبی زری کمخواب بھی فروخت ہوتے ہیں ان دوکانوں میں جو بزاز بیٹھے ہوئے ہیں ان کا لباس یہ ہے ——— سر پر دستار محمد شاہی بدن میں نیم جامہ اور پاؤں میں اورنگ کانپوری جامہ، صرافوں کی دوکانوں میں ایک طرف پیسوں اور روپیہ کے ڈھیریاں اور دوسری طرف سیم و طلا کے نقرئی کے انبار ہیں جوہریوں کی دوکانیں لعل و یشم مرصع کاری زیورات سے آراستہ ہیں زردوزوں کی دوکانوں

---

[1] نجابت حسین خاں بحوالہ مکتوبات میں ۱۸۴۳ء منا

ں تو ایک طرف ہر قسم کے گوٹے پٹھے اور بٹ رکھے ہیں اور دوسری جانب زردوزی ٹوپیاں اور پاپوش سجی ہوئی ہیں خاص پر ان پر، کمانی، حلوائی، تنبولی اور میوہ فروش کی دوکانوں سے وہی تکلف اور ستھرا اور سلیقہ نمایاں ہے۔ گوٹے والوں اور بھنگ فروشوں کی دوکان پر تخت بچھا ہوا اس پر خوشنما رنگ کپڑے کا فرش اس فرش پر پچیس تیس قلیاں گڑگڑا اور اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ پیالیاں سجی ہوئیں ایک جوان شوخ و شنگ عورت خوش وضع پوشاک پہنے نہایت ناز و انداز سے بیٹھی ہے اور گڑ اور بھنگ کے شائقین کو قلیاں اور تازہ بھنگ کی پیالیاں بڑے دلفریب ادا کے ساتھ پیش کرتی ہے جام پینے والے اس شعر کے مضمون کے مطابق ؎

دل مرا پی کے محبت کی شراب — نشہ میں بھنگ رہا کرتا ہے

مدہوش اور خود فراموش ہو جاتے ہیں اور حالت سرور و غایتِ بیخودی میں آتش کے دو شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

عارضے عارضہ ہے مجھ محزوں کو — سنگ سے سنگ رہا کرتا ہے
کھنچی حال میں ہے ایسا — کچھ عجب ڈھنگ رہا کرتا ہے

دوکانوں کے آگے ماتی بولنے والے فقیر آزاد بے طریقت اور بد طینت گویا شعار طریقانہ گاتے اور صدا لگاتے پھرتے ہیں ؎

کہیں تو نقلیں کرتے ہیں کھڑے بھانڈ — کہیں آزاد پھرتے ہیں بے سانڈ
کہیں قوالی گاتے ہیں ترانے — کہیں لڑتے ہیں بھکڑ کچھ سالے

قلفی اور فالودہ فروشوں کے یہاں بھی اسی قسم کا تکلف ہے کپڑا بچھے تخت پر کئی سینیاں لگی ہیں جن میں چینی کی تشتریوں میں قلفی رکھی ہے چینی اور تانبے کی پیچیاں بھی پاس ہی دھری ہیں فالودے کے پیالے ہیں جو عرق کیوڑہ، عرق گلاب سے بسے ہوئے خریداروں کے انتظار میں قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ سبزی اور میوہ فروشوں کی دوکانوں میں شریفہ، شہتوت، شربتی، لیمو، کمرک، ناشپاتی وغیرہ پھلوں کے علاوہ مختلف قسم کی ہری ترکاریاں مثلاً کدو جسے لوکی کہتے ہیں کھنٹا جسے کدو لی سیر پر تولتے ہیں شلغم، چولائی اور میتھی کا ساگ نظر فریب طریقے پر لگے ہوئے ہیں اکثر دوکانوں میں آبدار رکھا ہے تاکہ جو لوگ گرمی بازار سے تشنہ ہو جائیں وہ پانی پی کر سیراب ہوں۔ اس کے علاوہ بہت سے سقہ پُر آب مشکیزے اور کٹورے ہاتھوں میں لئے ہوئے صدائیں لگا رہے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ تشنہ کام چند خرمہروں کے عوض ٹھنڈا پانی خریدیں اسی طرح جابجا پسلے بھی بٹھائے ہوئے ہیں اور کئی کئی ہندو ہاتھ میں ڈول اور کٹورے لئے ہوئے پیاسوں کو پانی پلانے کے لئے تیار ہیں راستوں میں شریفوں اور سفید پوش خریداروں کی آمد و شد سے بھیڑ لگی ہے ان میں سے اکثر چوگوشیاں ٹوپیاں، بدن میں چھ کلیوں والے انگرکھے کے مقابلے میں بالا بردار کلیدار پاجامے پہننے والے کم ملتے ہیں روسائے شہر کی سواری میں ہاتھی اور گھوڑے ہیں جو زریں ساز و یراق سے آراستہ ہیں بعض رئیس اور امیر پالکی میں ہیں سوار جا رہے ہیں اور اس طرح اپنی حشمت و جاہ کو نمایاں کرتے ہیں ان کی سواری بڑے تجمل اور کروفر سے جا رہی ہے شاہی کہار کار چوبی بانات کی وردیاں پہنے ہیں پالکی کے پہلو میں سوار پیادے بھی ہیں جو زرق برق لباس پہنتے ہیں عورتوں کی ڈولیاں بھی گذر رہی ہیں نازک اور خوش قطع ڈولیاں ہیں جن کے منقش پایہ نقرئی و چوبی ہیں پردے رنگین ایک رنگ کے ہیں جن کے کنارے پٹھے اور سہنت ٹنکے ہوتے ہیں ان ڈولیوں کے اندر خورشید رو حسین سواریاں اس طرح بیٹھی ہیں جیسے آفتاب ہالہ میں ہو ان ماہ رویوں کا ایک ہی جلوہ دیکھ کر انسان ہوش و حواس کھو [illegible]

ہوش من از سر برگ بوئے گل   از نگاہ ساقی سرشار رفت

بادشاہ کی سواری: امیرالدولہ کے دور اقتدار میں جب ایک فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا اور میرن نامی ایک شخص نظر بند کئے گئے اور بعد ازاں بحالی عمل میں آئی تو انہیں وزارت عطا ہوئی۔ ماہ میں سلطان عالم نے درگاہ حضرت عباسؑ جانے کا ارادہ کیا اور شرف الدولہ غلام رضا خاں کو چوک کی آراستگی کا حکم ملا۔ اس دن تمام دوکانیں بند تھیں اور حکم کے باوجود بازار نہ کھلا۔ غلام رضا خاں نے لاچار ہوکر بڑی بڑی کوٹھیوں اور سرکاری توشہ خانے سے زربفت، کمخواب، اطلس، بانات کے تھانوں سے چوک کو جوتی کی دولہن کی طرح سنوار دیا۔ آغا مہدی نے ترنگ اور سجاوٹ دی اور چوبدار لگادئے۔ منشی رام سہائے تمنا جنھوں نے یہ جلوس اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ دو گھڑی دن چڑھے سلطان عالم ہوادار صبح و دربار پر بالائے پشت فیل جلوہ فرما ہوئے کہ دولت پیش سواری علم و نقارہ دہل کی کڑک شادیانوں کی آواز اور نوبت کی صدا بلند تھی سواران حلقہ پیادگان پیش رو سواران دعا گویوں کا ہجوم ہر طرف تہنیت اور مبارکباد کی صدا۔ سواری بادشاہی گلستان دو سرا سے روانہ ہوئی سواری جب چوک پہنچی۔ تماشائیوں کا دروازہ دولت سے تا درگاہ انبوہ تھا فقرا و مساکین کو آگئیں روپیہ داریں کی بوچھار تھی۔ اس کارگزاری کے صلہ میں سلطان عالم نے شرف الدولہ کو خلعت اور علاقہ تحصیل عنایت کردیا

حضرت محل کی آخری سواری

یا تو وہ ترک و احتشام تھا کہ سلطان عالم کی سواری کے وقت کوئی نظر بھر کے نہیں دیکھ سکتا تھا نقاروں کی صدا، تہنیت کی آوازیں، ہر طرف تماشائیوں کے ٹھٹھ لگے۔ حقیقت اور دوکانیں بند ہوئے یہ چوک میں وہ رونق تھی کہ چشم فلک نے ایسا منظر دیکھا تھا یا ۱۰ مارچ ۱۸۵۸ء کا دن وہ روز محشر تھا کہ لکھنؤ لٹ چکا تھا اور قدم قدم پر خطرۂ جان خوبصورت عمارتوں کے شکستہ ڈھیر، خلائق کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی ہوئی درود دیوار پر اداسی چھائی ہوئی تھی اور وہ اس بازار سے بے سروسامانی کے عالم میں گذرتی ہیں نہ کوئی ہٹو بچو کہنے والا نہ نقیب نہ زر و جواہر کے عوض سواری پر حسرت برس رہی ہے اور جان سے زیادہ عزت کا خطرہ ہے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے کہ کون گذر رہا ہے اور پالکی میں کون سا چاند چھپا ہوا ہے جو اسی کمال کی صورت میں تھا کہ گہن لگا۔

ایک نامور ستارہ بھی اس برج غم میں بے بس کی گیا۔ نویں سالگرہ تو بڑی دھوم سے ہوئی تھی اور چاہنے والی ماں کو حسرت تھی کہ مارچ میں سالگرہ یہاں کی گھاٹیوں میں پہونچ کر دی جانے والی ہے۔ حضرت محل عورت ذات نے پھر بھی خاندانی وقار بچانے میں وہ بے پناہ کوشش کی وہ آج ان کی عقل و دماغ اور ہمت و طن کا سارا ملک قائل ہے۔

سلطنت جانے کے بعد جب عزت پر بن گئی تو اس شیر دل خاتون نے خودکشی کرکے اپنی جان نہیں دی اور حرام موت مرنا پسند نہ کیا۔ اور صبر و شکیب کے شیریں جام پی کر قیصر باغ کو بڑے اطمینان کے ساتھ چھوڑا صاحبات محل اور خادماؤں کے جھرمٹ میں قصر شاہی سے نکل کر گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے نکیں عورتوں کا غول منیں باندھے ہوئے پیچھے پیچھے تھا برجیس قدر کو ایک سیدانی اور رسولؑ کی گود میں دے کر ساتھ لیا وہ نوجوان کسمسے چلتا ہوا ریع فتک کے لئے عالیہ اور بہادروں کی آڑ میں لے چلے جو شہزادی کبھی چند قدم نہ چلی تھی وہ گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی ہر گام پر الجھتی ہوئی ٹیلے شاہ پیر علی سے گذر کر مولوی گنج کے پل پر آئیں جواہر علی خاں نے اپنی پینس اور کہار پیشتر سے جہاں پہنچا دیئے تھے قریب نصف آفتاب جناب عالیہ اور برجیس قدر پالکی میں سوار ہوئے پیدل چلنے والی عورتوں نے اپنی اپنی راہ لی کچھ سوار

دستکشے اور شاگرد پیشہ ہر طرف سے جمع ہو کر ساتھ ہو گئے یہی گھ نخاس چوک ہو کرنال دروازہ میں ہو کر غلام رضا کے یہاں قیام کیا۔
اس سواری کے گذرنے میں وفا دار رعایا کا کیا حال تھا یلک کے جذبات کس حد تک ابھر آئے ہوں گے اس کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے جس کو ذوق سلیم ہے۔

اس حلقہ کے مشہور لوگ

"محلہ چوک گھڑیالی و سڑک متصل آں" اس ہیڈنگ کے تحت میں طلبار سے جو نام میں نقل کر سکا ہوں وہ یہ ہیں میر عسکری صاحب
راس ¹ غاغاں خاں صاحب، مرزا محمد تقی صاحب، مرزا رئیس اعابدین صاحب، میاں علی صاحب، میر انعام حسین صاحب، نواب صارم الدولہ
بہادر، داروغہ میر صادق صاحب، میر علی بہادر صاحب، میر مغل ² صاحب ³ میر عباس حسین صاحب، ممن خاں صاحب، حکیم مرزا محمد جعفر صاحب،
حکیم میر علی عباس صاحب نواب محمد تقی خاں صاحب، میاں محبوب علی خاں صاحب، سید حسن صاحب طویل ⁴، احمد علی جمعدار، احمد علی ریڈ پوری۔

پہلا چارخانہ اور دوکاندار کی ناکامی ۔ عبدالحلیم شرر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے عہد سے تیس پینتیس برس پہلے خاص چوک میں میر محمد حسین صاحب مرحوم ڈائرکٹر زراعت و تجارت نے گورنمنٹ کی اعانت سے ایک چارخانہ کھلوایا تھا جس میں فرنیچر بھی اچھا تھا اور سوا ناجائز چیزوں کے تمام قسم کے مشروبات رہتے تھے مگر کسی نے توجہ کی اور آخر میر صاحب کو نقصان اٹھا کے بند کردینا پڑا اور حیدرآباد دکھن ⁵ چلے گئے بازار میں چاء پینا اور ہوٹل میں کھانا اس وقت بداخلاقی تھا

ٹکسال COINAGE

جہاں سکہ تیار کیا جائے اس کو عربی میں دار الضرب کہتے ہیں اس محلہ میں سکہ تیار ہوتا تھا روپیہ پیسہ اشرفی ڈھالنے میں خالص تانبہ چاندی اور سونا صرف ہوتا تھا اور سکہ کی عبارت ایک فاضل مجمع مقرر کرتا تھا جس کا بادشاہ کی منظوری اور مجتہد العصر کی نظر ثانی کے بعد نفاذ ہوتا تھا۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے ایک سکہ پر یہ عبارت تھی "سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن" ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں آزادی کے حامی احمد اللہ شاہ تھے جو محمدی گاؤں میں فوج کی کمان کر رہے تھے انہوں نے بھی نیا سکہ جاری کیا تھا جس کی عبارت یہ تھی "سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ، حامی دین محمد احمد اللہ شاہ" حسب صورہ بھر کے لڑاک سمٹ سمٹ کر لکھنؤ پہونچ گئے تو ایک پردہ دار خاتون نواب سیدہ بیگم کے کان تک بات پہونچی تو آپ نے بھی اپنے خطوط میں احمد شاہ کا ذکر کیا تھا ــــــ سنا ہے کہ ایک صوفی احمد اللہ شاہ آئے ہوئے ہیں نواب جیلانی کے صاحبزادہ کہلاتے ہیں"

اس سے پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ ایسٹ انڈین کمپنی کے پیسہ میں دو شیروں کی تصویر تھی اور یہ پیسہ ملک میں ہر دلعزیز تھا۔ مسافروں کے امام ضامن میں عورتیں یہی پیسہ بازو پر باندھتی تھیں۔ ہندوستان پر اقتدار حاصل ہونے کے بعد انگریزوں نے سکہ بدلا جس کو مسلمان تحریر کی تصویر سمجھ کر نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اس روپیہ پر نے تاج اور کلاہ کا صرف ایک سر تھا اور شعرا کو کہنے کا موقع ملا ع سر کٹ کے کمپنی کا بکا سولہ آنے کو۔

نیاز فتحپوری اپنے مقالہ لکھنؤ کی پھبتیاں مندرجہ اخبار جنگ کراچی میں لکھتے ہیں ایک بار نواب غازی الدین حیدر نے مشاعرہ کیا جس

---

¹ آخریں سیر جنگ کے باغ میں رہتے تھے ² سجاد حسین صاحب سوز خواں موصوف کے نواسہ تھے ³ کوئی دربار قامت شخص ہوں گے۔
⁵ گذشتہ لکھنؤ ص ۲۵۲

لکھنؤ کے تمام شعراء جمع ہوتے تھے ناسخ بھی آتے اور آتش بھی۔ جس وقت مرزا تقی علی خاں نے ناسخ کو دیکھا تو بے ساختہ کہا یہ دم کٹا بھیڑیا کہاں سے آگیا یہ پھبتی ایسی مشہور ہوئی کہ اس دن سے تمام مرزا ناسخ کو دم کٹا بھیڑیا کہنے لگے۔

ناسخ کا گھر :۔ ٹکسال کو شیخ امام بخش ناسخ کی سکونت کا بھی فخر حاصل ہے۔ اس محلہ ٹکسال کا محلہ میں رہنا، شاگردوں کا ہجوم اصلاح کا بیان حالی ہیں۔ مولانا شمس العلماء آزاد لکھتے ہیں ناسخ، لکھنؤ کے دارالخلافہ ہونے سے یہاں آئے اور یہیں عمر بسر کی ٹکسال اب تک محلہ مشہور ہے اس میں بیٹھ کر شعر کہا کرتے تھے [illegible] سکے لگاتے تھے نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

دل لیتا ہے وہ [illegible] سکۂ نام ہمارا   کھتا ہے چراغ آج سر شام ہمارا

معرفت الٰہی میں ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

آرام سے ہیں ہے تو پھیرے مدام سے   دیکھو ہے مرغ قبلہ نما اضطراب میں

ناسخ دنیا کو دکھ درد کا [illegible] بڑے فیروزہ کی انگوٹھی پر نام کندہ کرایا اور بدنصیبی سے وہ انگوٹھی کھو گئی اس وقت کہا ؎

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا   گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

۱۸۳۸ء میں [illegible] ٹکسال ہی میں [illegible] اور جس مکان میں رہتے تھے وہیں سپرد خاک کردئے گئے۔ اس وقت ینگ پرائمری اسکول جس مکان میں ہے اس سے متصل ہوئے مکان کی کوٹھری میں ان کی قبر ہے جو عام لوگ نہیں جانتے یہ مکان پچاس سال پہلے حکیم مرزا محمد باقر صاحب اور ان کے والد زین العابدین کی جائے قیام اور امام باڑہ تھا حکیم صاحب ڈاکٹر عبدالرحیم کے دوست خاص تھے ٹکسال کے رہنے والوں میں شمس العلماء مولوی عبد محمد صاحب ایک مشہور عالم تھے طالب علموں کو پڑھاتے تھے۔ ۱۹۲۵ء ان کا سن وصال ہے۔

بیچ کی سرائے

ماہی کی سرائے اور جوہری کی سرائے کے بیچ میں ہونے سے اس سرا کا یہ نام ہوا دوسرا نام میوہ والی سرائے ہے۔ ۱۹۱۵ء تک یہاں انار، انگور، ناشپاتی، سیب، ترو تازہ میوے بکتے تھے اب پھلوں کی ایک دوکان بھی نہیں ہے اس کوچہ کا اچار مربہ بھی شہرۂ آفاق تھا اور جہانگیر خاں اچار والے بڑے مشہور تھے ان کا مکان سڑک کے نالے پر تھا اب یہ دوکانیں بھی اجاڑ ہیں اس کا ایک پھاٹک چوک میں تھا جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کبھی یہ جگہ محفوظ تھی آگے بڑھ کر پریانی والوں کی دوکان تھی جو بہت با کاروبار تھا۔ آثار قدیمہ میں محلہ ختم ہونے کی جگہ صرف ایک مسجد باقی ہے سرائے کے دروازہ کا ایک پٹ باقی تھا۔ میلہ میں [illegible]ت دار لوگ اس کو اکیلے کھولنے بند کرنے کے کرتب دکھاتے تھے سال بھر سے وہ پٹ بھی گر گیا ؎

ہیں مکاں صورت شکستہ دلاں   در کھلے مثل دیدۂ حیراں

بنی کا امام باڑہ :۔ بنی بی عہد نصیرالدین حیدر کی طوائف تھی اس کی لڑکی کا نام تو پردۂ خفا میں ہے۔ پاگل ہونے سے لوگ خبطن کہتے تھے جب کبھی طبیعت ٹھیک ہوتی تھی اور باہر آجاتی اور کسی محل میں تھوڑی دیر کے لئے چلی جاتی تو لوگ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ناچ گانے میں اس کا جواب نہ تھا۔ بنی بی نے میوہ والی سرائے میں امام باڑہ بنوایا اور آخری دور سلطنت کے بعد عمارت گرنے لگی

۱؎ آب حیات ص [illegible]

سے چودھرائن طوائف نے خاطرخواہ دولت صرف کرکے اسے سے مرثیے سے بوا دیا اس وقت سے چودھرائن کا امام باڑہ مشتبہ رگیا کسی منچلے نے چودھرائن کے امام باڑہ میں مجلس کی ۔ ظرافت سے رقعہ لکھ دیا جس کے سب اشعار تو میں پیش نہیں کرسکتا ۔ بیچ کی سر محل استعمال دیکھنے کے لئے دو شعراور تیسرے شعر کی ایک بیت ملاحظہ ہو ۔

رہ تاریخ کو محرم کی + پہلے جو آئے اس کی ہے باری : چوک میں بیچ کی سرا ہے جہاں + در رحس حاپہ آپ آئیں وہاں سقام کے قت لائیں سب تشریف

کایت :۔ غدر کے بعد میر مصطفٰے[2] حسین خاں سے جو مفتی گنج کے رہنے والے تھے ایک شخص سے بیچ کی سرا میں تلوار چلی خبر مشہور ہونے پر ر صاحب کی مدد کو پلٹن آئی مگر آپ نے گوارا نہ کیا کہ فوج مدد کرے ایک سے ایک کا مقابلہ بہتر ہے میر صاحب زخمی ہوئے اور گرے اور ٹی کو لڑنے کی پھر بھی اجازت نہ دی یہ کہہ کر خون میں نہاتے ہوئے گھر لائے گئے کہ اچھا ہوا تو خود مقابلہ کروں گا ایک ہفتے میں دار کے گھاؤ اچھے ہوگئے ۔ انتقام کا ارادہ تھا کہ دشمن مزاج پرسی کو خود سے آگیا اور گردن جھکا دی میر صاحب کا دل صاف ہوگیا ور تاحیات دوستی رہی ۔

میوہ والی سرا کے اچار اور مربہ

مربہ انبہ سبز مسلم	(آم)	اچار انبہ ترش	اچار انجیر
مربہ انبہ سبز	مربہ شلجم	اچار ارنڈ خرلوزہ	اچار مولسری
مربہ انبہ سادہ	مربہ اترج	اچار مولی	اچار انبہ زعفرانی
مربہ انبہ زعفرانی	مربہ گگروندا	اچار ادرک	اچار ککڑی
مربہ انگور مصنوعی	مربہ املی سرخ	اچار گلوری	اچار چھوارہ
مربہ گدر (گاجر)	مربہ ناشپاتی	اچار کشمش	اچار پیاز
مربہ سیب	مربہ لعاب مصری	اچار لیمو	
مربہ بہی	مربہ شقاقل	اچار کروندا	چٹنی لورتی
مربہ اناس	مربہ موصلی	اچار گوبھی	چٹنی برق دم
مربہ آملہ	مربہ ہلیلہ	اچار آڑو	چٹنی سادہ
مربہ نارنگی سرخ	مربہ پیٹھہ	اچار شلجم	چٹنی زعفرانی

۱۹۴۷ء تک یہ خوش ذائقہ سامان فروخت ہوتا تھا

ہاتھی دانت کا سامان

چوک میں ہاتھی دانت کے سامان کی بھی دوکان تھی کاغذ کاٹنے کی چھری، قطزن، قلمدان اور پیش کرنے کی کشتیاں اور ہاتھی کے کھلونے انتہائی نفاست سے بنتے تھے ۔

---

[1] دلگداز تحریک   [2] دخمداران لکھنؤ ص۲۴۲

چکنی ڈلی

چھالیہ ڈلی کو دودھ میں جوش دے کر مناسب ترکیب سے چکنی ڈلی بنائی جاتی تھی اور چھوٹی کے برابر چکنی ڈلیاں پان والے شوقین مزاج لوگ [illegible] کے علاوہ بھی کھاتے تھے دوکاندار بڑے بڑے آہنی سروتے لئے ہوئے کھٹا کھٹ کام کرتے خوبصورت ڈلیاں ہوتی تھیں اور [illegible] علیحدہ [illegible] لوگ استعمال کرتے یا بٹوہ میں رکھنے والے دیہاتی کھاتے یہ وہی ڈلی اور کا تحفہ ہے جس کو [illegible] نے [illegible] سے [illegible] کیا ہے

[illegible] چکنی ڈلی — [illegible] دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
[illegible] کہیے — [illegible] ہر نگہ [illegible] کہ اسے کیا کہیے
[illegible] کی — [illegible] دائے شکر [illegible] کہیے
[illegible] سیاں [illegible] — [illegible] سیدا کہیے
[illegible] سی — مرستان [illegible] سے ماما کہیے
[illegible] دیک — [illegible] دلکش [illegible] کہیے
[illegible] کیجے [illegible] — [illegible] عشق کا کہیے
[illegible] کھئے [illegible] — رنگ میں [illegible] مسیحا کہیے
[illegible] — [illegible] حقیقت [illegible] کہیے
کیوں اسے [illegible] — کیوں اسے [illegible] کہیے
کیوں اسے [illegible] — کیوں اسے [illegible] کہیے
[illegible] پرور کے کف دست کو دلکش [illegible] — اور [illegible] چکنی سپاری کو سویدا کہیے

مسجد حیدر بخش

میوہ والی سرائے کے سامنے اونچی کرسی کی یہ خوبصورت مسجد کشادہ اور ہوادار ہے پچاس برس پہلے لوگ اس کو مکہ مسجد کہتے تھے بانی مسجد عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں الماس علی خاں کا کارندہ تھا اس کو ملکی سیاست کی لپیٹ میں کئی کئی دفعہ مصیبتوں کا سامنا ہوا تاریخ اودھ میں کشمکش حیات کی یاد تازہ ہے۔

چوک سے مسجد پر پہونچنے میں [illegible] زینہ کے بعد صحن مسجد ہے دروازہ پر تلے اوپر کئی پتھر لگے ۔ ان تحریروں کو پڑھنے سے مسجد بنانے والے اور مسجد کا تعارف ہوتا ہے خانۂ خدا میں دوہرے دالان ہیں [illegible] لکھے دئے ہوئے ہیں اور [illegible] کی چھتیں ہیں — نمازیوں کے لئے مسجد میں پہونچنے کے لئے پانچ در ہیں چھٹا ہندوستانی رخ پر صحنچی میں جانے کا راستہ ہے گنبد کا ئے پہلے یا دوسرے درجے کے طلوع کی صحنچی پر ہے پہلے درجے میں زیر گنبد صحنچی کے رخ پر جو سنگ مرمر ہے اس پر باب جبرئیل اور اس کے سامنے جو صحنچی ہے اس پر باب الرحمۃ خط نسخ لکھا ہے محراب مسجد پر جہاں امام جماعت کا سجادہ ہوا کرتا ہے پتھر پر دو سطریں بخط عرب موجود ہیں پہلی سطر پر بسم اللہ اور اس کے نیچے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً لکھا ہے اس مسجد میں سب ملا کے پانچ منارہ ہیں

ہاتھی طرف اور دو بائیں طرف پانچواں منارہ کمزور ہونے سے ایک ستون سے کمربستہ کے طور پر روک دیا گیا ہے
دو طرف پہلوؤں سے چھت کا راستہ ہے اور مؤذن اور امام کے قیام کی جگہ ہے اور ٹھنڈے پانی کا کنواں موسم
میں پیاسوں کو بڑی راحت پہونچاتا ہے اوپر کی لوح پر یہ قطعہ لکھا ہے ؎

شافع من بود رسول اللہ ۔۔۔ بالیقیں لا الٰہ الا اللہ
وضع کردم بہند بہر ثواب ۔۔۔ صورت مسجد رسول اللہ

درمیانی پتھر پر یہ عبارت ہے۔

الٰہی از کرم در دین و دنیا ذات باری را ۔۔۔ بنام پاک حیدر بخش حل کن جملہ مشکلہا
فروغ از عرش اعلیٰ داد او شان این مسجد ۔۔۔ تعالیٰ شانہ اللہ اکبر کعبہ دلہا

تیسرے پتھر پر حیدر بخش کا وصیت نامہ ہے دو سطروں میں نقل خفی جو بلندی اور نگاہ نہ پہونچنے سے حرف بحرف پڑھا ۱۲۹۳
نہ جا سکا۔ زبان اردو میں بانی نے وصیت کی ہے کہ کرایہ دو کانات مصارف مسجد کے لئے ہے اور امامت تا حیات مولوی
ہاں الحق صاحب کرتے رہیں قطب شاہی سلاطین نے ایسے وصیت نامہ اپنے لوح قبر پر نصب کئے ہیں ۔ حیدر بخش
نے کسی کاغذات تلف ہو جانے کے ڈر سے ایسا کیا ہے قطعہ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ کہ مسجد نہ کہو تو یہ مدینہ شریف کی نقل ضرور
ہے لکھنؤ بازار راجہ میں مسجد نبوی کی ہو بہو نقل نواب رضا حسین خاں کی بنوائی ہوئی موجود ہے مگر یہ قدیم عمارت نہیں ہے اس
لئے اس کا ذکر نہ ہوگا مسجد میں پیش امام باتنخواہ نماز پڑھاتے ہیں زیر مسجد ہمیشہ سے جفت فروش (جوتہ والے) بسے ہوئے ہیں۔
زیرپائی کا ذکر پہلے کے صفحات میں گذرا اس وقت آرام پائی ایک نئے قسم کا جوتہ ایجاد ہوا تھا جس کا مختصر بہت پرانے
شاعر کے کلام میں ذکر ہے ؎

دوگانہ تیسری کے چاند پر پڑھتی کہیں ہیں ے ۔۔۔ کسی محبوب کی اتری ہوئی آرام پائی ہے[1]

نواب اسرار حسین خاں لکھتے ہیں کہ عہد شاہی میں ایک نئی قطع کا جوتا ایجاد ہوا جس کو یہاں کے دستکاروں نے بہت پسند
کیا اس جوتہ کو جوڑ دلو کا کہتے تھے یہ جوتے لال نرمی کے نہایت سبک اور صاف بنائے جاتے تھے یہاں تک کہ بعض موچیوں
کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ پیسوں بھر سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ گرمیوں کے خشک موسم کے لئے کاشانی مخمل کے، برسات کے لئے
کیمخت کے بننا شروع ہوگئے کیمخت بنانے کے بہت سے کارخانے جاری ہوگئے ۔ چند دن کے بعد جوتوں کی آرائش میں اور ترقی ہوگئی
اور رکمی ستارہ کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے جس میں مقیش کے پھندنے لگاکے عجیب چمک دمک اور آب وتاب
پیدا کردی جاتی تھی ۔ اس کے بعد جب جھوٹا سلمیٰ اور کلا بتو آیا تو جھوٹے کام کے چڑھواں جوتے بننے لگے جو بہت سستے داموں
کے آتے تھے گھٹیلا جوتا اور ادگیاں یہاں کی ایسی کہیں نہ بن سکیں ان کی مانگ اس قدر بڑھی کہ آبادی کا ایک معتد بہ حصہ انہیں
کی تیاری میں زندگی بسر کر رہا تھا چوک میں ہر قسم کے کاریگروں کا مال فروخت ہوتا تھا ڈلی چمار[2] کا ایک یورپین کے لئے اس کے ایک
پیر کا گمشدہ جوتا بنا کر دینا اور انعام تاریخ میں محفوظ ہے یہ عہد واجدی کا باکمال تھا۔

---

[1] بہار ہند لغت میرے ہمعصر مرزا کاظم حسین محشر سے پہلے جو محشر تھے یہ شعر ان کا ہے
[2] قدیم ہنر و ہنرمندان لکھنؤ ص۱۲۰

یوسف خاں کا انتظام چوک میں :۔ انقلاب سلطنت کے بعد جب بر جیس قدر بہادر کا وقت آیا تو یوسف خاں کو چوک کی
نظامت سپرد ہوئی انہوں نے گول دروازہ کی بارہ دری میں کچہری کھولی اور کلکٹر کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ مخبری سے
سپاہیوں کے گھروں کا روپیہ لینا شروع کیا افسوس جدید حکومت کو دیا نہ ملنے سے۔

چوک کے کنکوے والے :۔ سب کے روبرو مشہور کنکوے والے کی دوکان قابل ذکر ہے دور سادی تلبوری، ماکھ،
تیرہ تاری، گول، تکلّا، چرخیاں، چرخا، پتنگ، مثلث، یکتارا، سوائے تین، سوائے دو، سوائے چار، پون تائی، ڈیڑھ کنا، ڈیلی،
دمڑی، ماہی کے علاوہ رنگینیوں میں چپ، پٹی دار، دو کنیا، ایک آنکھا، چاند تارہ، مانگدار، العیہ، گرد ندیا، لعل دار طوقیہ،
لعل دار طوقیہ، دوپٹی طوقیہ، دوپٹی، دوپن شیشے دار، تین پٹی، بہردیہ، دوباز، کٹ مانگیا، اماملیہ، محمد ھر، محمد ھر طوقیہ، ہیریا،
خط کنگھی، پہنچے دار، نول، کھڑ پید، مثلثی بر طرف سے تیار کنکوے جتنے لیے ترے میدان مدے کے لئے اور ریوں تائی وغیرہ جیسم پانا تڑلنے
میں اس کثرت سے نمری تھی بازار وضعت سے دوت حاصل کرکے دوسرا کاروبار ترک کر دیا۔ کنکوے کا موجد کون ہے میدان کہاں
رہتے تھے پیشا تو ڑا کیا سےگمں حرم تھا کنکوے بار۔ اور لوتیرہ واں آبارے دے کساں تھے ان عمارات پر محلہ وار روشنی ڈالی گئی ہے
جنگلوں کے دن تو یہ ہوں گا کہ کنکووں سے آسمان مشکل سے نظر آتا تھا مگر دھائی پہل پہل کا سب سے بڑا دن گرمی
اور برسات میں بازار سرد رہتا مگر یہ فکرے اس وقت بھی شوق رتے کنکوے سازی کا اچھا روزگار تھا اور گکیاں کوڑی کے
حساب سے ملتی تھیں ایک شاعر نے کنکوے کی کچھ چیزیں اس شعر میں درج کی ہیں سے

گڈیاں دل کے ٹکڑوں کی رلف دوتا کی ڈور الفت میں پیچ پڑ گیا اب مانگدار سے

بیرون لکھنو کے لوگ کنکوے کو عموماً ایک زبان پتنگ کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہ خلاف محاورہ ہے کنکوا یہی ہے
جو اڑایا جاتا ہے پتنگ بہت بڑے کنکوے کا نام تھا جو کبھی اڑتا ہے ملحوظ خاطر رہے کہ داؤد پرستہ مدہے اور رماد، تر صاحب زبان
اسے "کن کیا" کہتے ہیں۔

ہاں خوب یاد آیا کنکوے کے آخری حصہ میں بعض اوقات کاغذ کی لاسی چٹ تیرہ چودہ انچ کی تقریباً لگاتے ہیں اور لڑکے
اس مصنوعی سانپ کی لہر فضا میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کنکوے بازی کی اصطلاح میں کنکوے کو چھتا بھی کہتے ہیں ایک پریشان خاطر
شاعر کا دوسرا مصرعہ مجھے یاد ہے جو اپنی کوچہ گردی کا پہلے مصرعہ میں ذکر کرکے کہتا ہے ع بجائے چھتا ہوں کہ چھتے کا پچھلا ہوں
پچھلا دہی کاغذ کا سانپ ہے جو بیقرار ہے شیخ محمد جان شاد نے کسی کی ہجو میں کہا ہے سے

مونچھوں کو دم سگ سا پڑھاتے ہے وہ حبشی کنکوے کی دم کھل کی طرح وہ لٹکی ہے داڑھی

حالی نے کنکوے پر ایک مثنوی نظم کی ہے جو پیسہ اخبار لاہور میں چھپی تھی اس کے بعض شعر یہ ہیں سے

کچے تلگے پر عبث کرتا ہے زور کیوں بڑھا رکھی ہے تو نے اپنی ڈور

آسماں پر گو کہ میرا دور ہے پر مرا دوار کوئی اور ہے

اور ایک شعر یہ ہے سے

---

۱ چھتا غیر معروف استعمال ہے اللہ ظاہر تعریف تھی کہ صاحبان دہلی کسی کے بات پر رکھتے ہیں آپ آسی ہیں یا غرضع

> رشتہ در گردنم افگندہ دوست — میکشد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

حیدر حسین خاں کا پھاٹک

سید حسین خاں عہد برہان الملک کے افسر توپ خانہ تھے۔ ان کے کٹڑہ میں حیدر حسین خاں نے چوک میں آنے والوں کے لئے ایک پھاٹک بنوایا جو بجائے محراب دار ہونے کے صرف ایک چھت ہے اور سقف پر رہائشی کمرے نیچے دوکانیں ہیں دھوپ اور برسات میں پانی سے بچنے کے لئے راہ چلنے والوں کو چھتری کا کام دیتا ہے چوک سے پرانا سرائے جانے کا قدیم راستہ یہی ہے پچاس برس پہلے کے لوگ اس کو سید حسین خاں کا پھاٹک کہتے تھے[۵۵] معمولی پتھر پر دو تاریخیں بھی کندہ ہیں جو پڑھی نہیں جاتیں اس پتھر پر مرمت کا سنہ ہے نہ کہ بنیاد قائم ہونے کا حیدر حسین خاں کو محمد علی شاہ بادشاہ نے اہتمام الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب امین الدولہ امداد حسین خاں مہتمم دیوان خانہ تھے اور آپ ان کی پیشی میں تھے۔

حیدر حسین کا پرانے کاغذات میں جا بجا ذکر ہے دو کاغذات مسجد تحسین علی خاں پر جبر نزول کا قبضہ ہوا تو ۸ ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ کو ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقی مجتہد العصر نے دو ہزار روپے اپنی جیب سے دے کر آپ ہی کے ذریعے بھگوان داس تحویلدار کو بھیجے تھے اور داروغہ صاحب ۴ ستمبر ۱۸۷۹ء تک زندہ تھے جارج کوپر لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی وچیف کمشنر اودھ کے نام محلہ کے ایک فرقہ وارانہ تحریک کے خلاف جو میموریل بھیجا گیا اس پر داروغہ حیدر حسین کی بھی دستخط ہے ان کے ہمعصر داروغہ وزیر خاں تھے جیسا کہ میاں مستیر کہتے ہیں ؎

> داروغہ دونوں شیعہ عالی ہیں الاماں — حیدر حسین خاں ہیں وہاں یہاں وزیر خاں

شیخ عبد الرحیم کلیم :- اس محلہ میں ایک بڑے شاعر کلیم رہتے تھے جو خواجہ وزیر اور رشید کے ہمعصر سید حسن لطافت کے شاگرد تھے اردو فارسی ہر صنف میں اصناف سخن سے ان کا کلام پایا جاتا ہے۔ صاحب دیوان تھے ایک بہت چھوٹے مکان میں تمام عمر رہے میانہ قد سیہ فام کریہہ منظر تھے صادق پرستہ پوری نے مخمس تب بحر کی پھبتی ان پر کہی تھی

مدرسہ فرقانیہ :- اس محلہ کا بہت اچھا مدرسہ ہے جس میں علم تجوید اور قرآن شریف کی مسلمان بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے مدرسہ مولوی شاہ معین القضاۃ صاحب نے قائم کیا اور ۲ رجب ۱۳۴۲ھ ان کے وصال کے بعد سے تیرہ ہزار روپے[۵۶] سالانہ کے مصارف کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی برداشت کرتا ہے عمارت جدید ہے آثار قدیمہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی :- یہ کارخانہ ۱۲۵۴ھ سے عطر اور خوشبویات کی تیاری میں شہرہ آفاق ہے۔ جنا پوسٹ آفس اسی کارخانے کے کاروبار کا ڈاکخانہ ہے اس فرم کے نوکروں نے یہاں سے علیحدہ ہو کر دوسرے ناموں سے بڑے بڑے فرم بنا کر اور عطر کے کھولے اور مرکز سے پورا فائدہ اٹھایا حال میں اس مشہور دوکان نے عظیم الشان کوٹھی کی صورت اختیار کی۔ یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کو کارخانہ کی طرف سے مزاح نویس مرزا محمد تقی عرف مچھو بیگ عاشق نے مزاحیہ[۵۷] ماہنامہ بہار ہند جاری کیا

حافظ مبین :- پھاٹک حیدر حسین سے نکل کر چوک میں حافظ مبین کی دوکان تھی جہاں شوز پمپ وغیرہ فروخت ہوتے تھے اور موقوف

---

[۵۵] دفتر فہرست کتب سید سجاد علی تاجر کتب چوک لکھنؤ مطبوعہ ۱۳۱۰ھ — [۵۶] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۵۸ء

[۵۷] سب رنگ لکھنؤ ۱۹۵۹ء

زندہ مریضوں کو لال مرہم مجرب دیتے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بعض رؤسا کے علاج میں ڈاکٹر عہدہ دار کے ساتھ شامل علاج رہتے تھے۔ معمر اہل تحقیق کہتے ہیں کہ اس نسخہ میں استخوان سرمیت کا ماکسٹر شامل ہے۔

سرائے تحسین

حیدر حسین کے پھاٹک سے گزر کر بیگم چوک میں سرائے نواب ناظر میاں تحسین علی خاں ہے جو عہد آصفی میں تحسین نے رفاہ عام کے لئے اپنے پیسے سے بنوائی تھی سرکاری کاغذات، دربار کے دستاویزوں میں یہ محلہ کٹرہ تحسین کی لفظ سے بھی ملتا ہے تحسین عہد شجاع الدولہ کے خواجہ سراؤں میں قوم کے کھتری تھے مسلمان ہونے سے پہلے ان کا نام سولا ناتھ تھا راجہ بخشی ایڈوکیٹ ساکن قیصر باغ لکھنؤ کے پاس ان کے مکان اور برتن فرنیچر اور اس پردہ کا فوٹو موجود ہے جس کے سامنے وہ پوجا پاٹ کرتے تھے یہ عکس و صورت بڑی کاوش سے حاصل کئے ہیں نواب کی وفات کے بعد وہ صاحبزادیوں پر ناظر[1] مقرر ہو گئے اور ۱۷۷۵ء عہد آصفی میں لکھنؤ آئے پہلے نظارت خاص ناظر ماں کا کام سپرد ہوا پھر توسیع جاگیر کے داروغہ ہوئے مسلمان ہونے پر بھی ان کو اپنے رشتہ داروں کا خیال تھا اور ان پر روپیہ صرف کرتے رہتے۔ وزیر علی خاں کی معزولی میں ان کا ہاتھ تھا اور یہ کوشش تک جاری رکھی ملکہ دوراں بیگم۔ وہ ناراض تھے اس لئے جب اس بھید پر اطلاع ہوئی تو چاہا کہ تحسین علی خاں کو قتل کر دے مگر وہ اپنی سیاست سے کبھی زد پر نہ آئے آخر کار وزیر علی خاں نے چیر قیاتیوں سے ایک پارٹی کی نجو تر فرع کی جس کا ایک شعر یہ ہے

ناپ جوتوں نے کیا جب ہوا ... پیر تے اور دو الف اک جے دے

تین نے سے مراد اس دور کے ارکان سلطنت تفضل حسین خاں، تحسین علی خاں راجہ ٹکیت رائے اور دو الف سے اشارہ الماس علی خاں اور اشرف علی خاں کی طرف تھا جو نواب کے خسر تھے اور جیم نام ہے نواب حسن رضا خاں کا اور بہو بیگم صاحبہ مادر نواب سے گٹھ بندی کی تھی وزیر علی اس سیلاب مخالف کو بھلا کہاں روک سکتے تھے۔ تحسین علی کے قتل میں کامیاب ہوئے نہ وقار رفتہ واپس لا سکے تحسین ان کے دست ظلم سے بچنے کے لئے ریزیڈنٹ کی کوٹھی پر آئے۔ انگریز ان کی وفاداری اور کردار کو خوب جانتے تھے اس لئے اس ہلاکت آفریں موقع پر بال بال بچ گئے اور وزیر علی کو جو ان کی گود کا پالا تھا سلطنت سے محروم ہونا پڑا۔[2]

تحسین علی خاں اور ان کے حاشیہ نشین جو ناظر تھے سب کی تنخواہ ... ماہوار سلطنت سے ملتی تھی اور چین کرتے تھے وہ آدمی وجیہہ اور خوش شکل تھے چہرہ سڈول اور کتابی رنگت گوری تصویر میں سر پر لٹو دار پگڑی اور کاندھے سے دوشالہ اوڑھے ہوئے گلے میں سبز چغہ جس کے نیچے ڈھیلے پائجوں کا پاجامہ۔ یہ تصویر کلکتہ کے وکٹوریہ میموریل میں موجود ہے اور عبدالحق کا بیان ہے کہ نواب ناظر کے منہ پر داڑھی تھی۔[3] مزاج میں غریب پروری، دل میں خدمت خلق کا جذبہ ہمیشہ دولت کو محل پر صرف کرنے کا سوچا، چوک کی روز افزوں آبادی اور بازار کو ہر چیز کی منڈی ہوتے دیکھ کر سرائے بنوائی ایک لمبی چوڑی زمین لیکر مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ نکالی بھٹیاریوں کو بسایا۔ بہت بڑا احاطہ بنوایا سایہ دار درخت لگوائے ملکہ وکٹوریہ کے آخری زمانہ تک بھٹیاریاں[4] باقی تھیں بھٹیاریوں میں خوش اخلاقی اور مروت نام کو نہیں ہوتی آپس میں خوب لڑتی ہیں سراؤں کا دنگا فساد ضرب المثل

---

[1] جنتری ڈائری صفحہ ۱۸ لکھنؤ [2] تاریخ اودھ صفحہ ۳۱ ج ۲ نجم الغنی [3] تاریخ اودھ ج ۲ صفحہ ۱۰۲ ج ۲ صفحہ ۲۶۳ ج ۳

[4] قیصر نامہ صفحہ ۱۵۱ نول کشور پریس لکھنؤ [5] تاریخ اودھ

یہ ایک قومی آرگن نکلنے پر ظریف نے کیا خوب کہا ہے ؎

متانت سے کرے گا بحث یہ قومی مسائل پر　　　لڑے گا یا کہ پنجے جھاڑ کے جس طرح بھٹیاری

تحسین علی خاں کا بنوایا ہوا اندارا اب بھی موجود ہے مرزا مچھو بیگ کی تحقیق ہے کہ بڑے کنوؤں میں عموماً تواوہ کا دیا جاتا ہے۔ شعراء کے کلام میں بھی لفظ موجود ہے ؎

کیا کمی ہے برکت جا پیئے ساقی ترے　　　جام سب حوض ہیں خم جتنے ہیں اندارے ہیں

ریل نکلنے پر سرائیں اجاڑ ہونا شروع ہوئیں اور یہ جگہ ڈاک بنگلہ، ویٹنگ روم، ہوٹل نے لی۔ عہد تحسین علی خاں کا پکھریا درخت اور کنواں اب بھی موجود ہے تحسین علی خاں نے اپنی خرید کردہ زمین میں ملکیت باقی رہنے کے لئے کوئلہ دفن کرا دیا تھا جو برس تک مکانات کی بنیاد اور گڑھے کھودنے میں نکلتا رہا تحسین علی خاں کی صحبت کے لوگوں میں منشی آفتاب رائے، سیتل پرشاد، گلشن سعیدی ملال، میاں[1] حرم دھان میاں، قاسم علی سعیدی مبارک، ہدایت اللہ شیخ رمضان تھے

چوک کی مرکزیت کو دیکھتے ہوئے یہاں ایک عظیم الشان مسجد کی ضرورت تھی میاں تحسین کے حساس دماغ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اکبری دروازہ سے جانب شمال بہت بڑی مسجد چوڑی چکلی بنوائی۔ آصف الدولہ کی تخت نشینی کے سترہ برس کے بعد اس کی بنیاد پڑی۔ ٹکو خاں دھاڑی نے جو چوک کے پاس رہنے والے تھے اپنے باپ دادا کی زبانی سنا ہے کہ مسجد میں وہ مصالحہ صرف ہوا ہے جو بڑے امام باڑہ کی تعمیر میں سادات اور شرفاء اپنے ہاتھوں سے رات بھر صرف کرتے تھے اور صبح کو وہ بدلوا کر تا نہ مصالحہ کا ٹھیک جو ناپ نکلتا تھا تحسین نے نواب سے اجازت لے کر عرض کیا کہ اگر مجھے یہ مصالحہ مل جائے تو چوک میں ایک مسجد بنوا دوں۔ نواب نے خوشی سے منظور کیا اور زمانہ قحط کا استعمال شدہ سامان زور زور اٹھوانے لگے اور دوراندیش بانی نے سرا سے قریب زیادہ سے زیادہ بھراؤ دے کر سنگ بنیاد رکھا اور مسجد کے نمایاں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بیچ میں مسجد اردگرد دوکانیں اور دو دوہری کوٹھریاں اوپر صرف پچھم کی طرف دو منزلہ ہوا دار دالان اور حجرے، کونوں پر دو خوبصورت برج جن کی کھڑکیاں سرا کی طرف چھت پر جانے کا پہلوؤں سے راستہ پشت مسجد کی پہلے تو یہ حیثیت تھی کہ سیاح ایک رخ سے گذر کر دوسری طرف سے دیکھتا ہوا نکل آئے۔ مگر شرقی مسجد نے آنا جانا روک کر تین قطعہ مکان پیش امام اور مؤذن وغیرہ کے لئے بنوائے جو قریب رہ کر مسجد کی نگرانی کریں۔

چاروں طرف کی دو کانوں کی تعداد ماؤنٹ ہے دو اوپر پچاس کی تعداد اس زمانہ میں مبارک سمجھی جاتی تھی دیکھو مچھی بھون میں ۵۲ مچھلیاں ہیں آئندہ اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

مسجد کا پھاٹک رومی دروازہ سے ملتی جلتی صورت کا زیر محراب اسی طرح تین در آنے جانے کے لئے جس میں لکڑی کے پھاٹک اور موٹی زنجیر اوراوپر مختصر جگہ میں بھول بھلیوں کا ایسا راستہ باہر کی سمت روشن دان اور جس قدر گنجائش اسی قدر غلام گردش چھت کے قریب پہونچکر ردکار کی محراب کا اہتمام ہوتا ہے اور مسجد میں آنے والوں کے لئے بارہ زینوں کے بعد فلک

---

[1] میاں کی لفظ زیادہ تر خواجہ سرا کے لئے استعمال ہوتی ہے یا بچوں کو بڑے بوڑھے پیار سے میاں کہتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی سجادہ نشین یا عالم میاں کی لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

عمارت نظر آتی ہے۔ پھاٹک کی چھت پر جانے کے لئے پہلوؤں میں دو دروازے بنے ہیں۔ اس کے روبرو پانی سے چھلکتے ہوئے دو حوض قد آدم گہرائی شمالی سمت کا حوض پانی پہونچانے کی درازی سے گہرائی میں کچھ کم حوضوں کے بیچ میں سرنگ تاکہ بہلنے والے ایک طرف سے پیر کر دوسری طرف نکلیں اگلے زمانے میں کسی شخص کی جان مرن گئی تھی اس لئے یہ راہ بند کردی گئی۔ کاری دار مسجد کے اندر ونی حصہ کی پھول پتیاں محراب کے کنارے دروں کے بیل بوٹے ان نقش ونگار کا نمونہ ہیں جو مسجد آصفی میں بنے ہیں یہاں کی گل کاری میں وہاں کا عکس ہے۔ فرق نہیں لکھ دونوں مسجدوں کا کتبہ بھی جس سے سن تعمیر واضح ہوتا ہے ایک ہی کاتب کا خط ہے حافظ نوراللہ جو ایسا نستعلیق نہیں لکھ سکتا تھا۔ اور یہ کاسعید پتھر ان کے ہاتھ کا ادریجے کا زردی مائل پتھر ان کے بیٹے حافظ ابراہیم کا دوہرا ہے اور محراب کے اوپر سنگ مرمر کی چھپڑیوں پر لکھا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایں جائے کہ جلوہ گاہ انوار علیست	تعمیر مقدس سعید اریست
آصف زپئے سال سایش فرمود	گفتا کہ بگو مسجد تحسین علیست

۱۲۰۸ھ ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آصف تاریخ کہنے والے آصف کا تخلص ہے اور اس میں ایک لطیف استعارہ اس طرف بھی ہے کہ آصف الدولہ نے تعمیر مسجد کی بابت ہوش مند سے پوچھا تو جواب ملا کہو "مسجد تحسین علیست" اس کتاب کی تالیف کے وقت ۳۰ سال مسجد مذکور کو بنے ہوئے ہیں محراب سے ملا ہوا دوسرا پتھر اس مضمون کا ہے سہ

از حکم شاد شاہاں چوں جلوہ سعیدی	آمد بگو مسجد بسیار نیک زیبا
تاریخ شرح از کلک طوح تمیں	کرہ رقم سعیدی مانو رید بیعا

۱۲۵۵ھ

یہ تحریر مسجد کی تعمیر کے ۴۵ سال بعد زیب مسجد ہوئی اس وقت تحسین علی خاں مر چکے تھے۔ اس پتھر کے نصب کرنے کا سبب یہ تھا کہ نصیر الدین حیدر بہادر نے ۱۲۵۰ھ میں شہر بھر کی مسجدوں کی مرمت کرائی تھی جامع مسجد تحسین اور مسجد آصفی کی بھی مرمت ہوئی۔ مسجد آصفی میں بھی دوسرا پتھر اسی مضمون کا آویزاں ہے۔

روکاری کی ساخت میں خوشنمائی کے لئے نیچے سے اوپر تک تلے اوپر جو کھنڈے کاریگر نے ملائے ہیں ان میں ایک ماڈرن کی پیمائش سے دیوار کے آخری کنگرہ تک عمارت کی بلندی معلوم کی جا سکتی ہے سارے پہلی لمبان میں بہت زیادہ نمایاں ہیں برساره تین کھنڈ کا ہے اور تینوں طبقہ گلائی اور لمبان برابر ہیں چوتھا کھنڈ چھوٹا ہے جس میں خوبصورت محرابیں اور اندر پردوں کو سیرا لینے کا موقع دیا گیا ہے ٹیلہ کی مسجد میں یہ بات نہیں ہے وہاں کوئی چڑھا میار کے اوپر کھوسلا نہیں جا سکتی یہیں گئی پر گنبد ہے جو یاکواں رکن ہے کلس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ تکے کا ہے یا پیتل کا دونوں مینار سہتر کے پورب اور پچھم دور دور سے نظر آتے ہیں ادھر چاندنیوں کی موڑ سے تحسین کی مسجد دیکھو اور پچھوا تو ادھر پہرہ سے نکلتے ہوئے سڑک پر آکر میناروں کو دیکھو تو بھکاری کی طرح دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے بہ نیاز سے طالب رحمت ہیں۔

ف مسجد تحسین پر مؤلف نے الاعلا بابتہ ماہ مئی ۱۹۳۳ء دو قسطوں میں روشنی ڈالی ہے اور ۱۹۵۰ء کے جریدہ مذکور میں شیخ تصدق حسین صاحب بی اے وکیل کا [illegible]

مسجد میں دو درجے ہیں آگے کا دالان پختہ اور بہشت پر ٹوٹا پڑا ہے، دو سرے درجہ کی چھت پر ایک گنبد [illegible]
بڑا قبہ ہے کلس سونے کے پتروں سے منڈھے ہوئے ہیں اور طلائی آب و تاب باقی ہے ہر کلس چودہ ٹکڑوں پر فٹ کیا گیا ہے نیچے کا حصہ
قد میں ایک مٹکے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ آخر میں مخروطی کھمبی پر ایک بڑا لٹو نصب ہے جو معمولی دیگچی کے برابر ہے۔ پہلوؤں کے کلس
درمیانی کلس سے چھوٹے ہیں اور درمیانی بہت بڑا ہے جولائی ۱۹۵۵ء میں جنوبی پہلو کا کلس بندروں کے ہلانے سے گر گیا تھا اس کو کاغذ
شیشم کی لکڑی پر چڑھایا گیا تھا۔ موجودہ ٹرسٹیان نے آہنی سلاخ پر فٹ کر کے دوبارہ نصب کیا ہے۔

پہلے دالان میں قالب دار چھت بہت خوشنما گل کاری اتر دکھن ہوا دار دروازہ دوسرا دالان گنبدوں کے سبب سے بہت
اونچی چھت اور بیچ کا قبہ بہت وسیع اور بلند جس کی تحت میں پیش امام کی محراب اور خطبہ پڑھنے کا منبر اور طاق ہے یہ ہال مسجد
آصفی کے درمیانی درجے کا نقش ثانی ہے۔

کوٹھی پر جانے کا راستہ پہلو کے جدید مکانات سے ہے اور بالائے بام سے چار باغ اسٹیشن چھتر منزل گھنٹہ گھر پورے شہر
کا دکھاؤ ہے۔ پہلو کے دو گنبدوں میں جانے کا راستہ اور قالب پر قالب ہے یہ گول کمرے ہیں جن میں اچھی خاصی جگہ ہے بڑے درمیانی
گنبد میں یہ بات نہیں ہے وہ اکہری چھت ہے۔ محترم بانی مسجد کے زمانہ میں صحن حوض کی سطح سے برابر تھا اور عمارت کی کرسی نالا نو
تھی۔ ممتاز العلما فخر المدرسین نے نمازیوں کی کثرت دیکھ کر زمین کو بلند کر کے چبوترہ بنوایا جو ان کی یادگار ہے۔

<u>دوکانات</u>:۔ اس عمارت میں ۵۲ دوکانیں ہیں جن کا کرایہ غریب پرور بانی نے مسجد کے رہنے والوں، مسافروں اور محتاجوں کے
لئے صرف کیا جانا وصیت کیا تھا اور چوک کی دوکانیں ٹرسٹی نمبر ۲ کی تعمیر کردہ ہیں جس کو انہوں نے اپنی جیب سے بنوایا امور خیر میں
اس کا بھی صرفہ ہوتا رہا جدید عمارت بازار چوک کے رخ پر آراضی مسجد پر چوبی چھت کی صورت میں ہے ورنہ مسجد تحسین میں کہیں بھی
لوہے اور لکڑی کا استعمال نہیں ہوا ہے۔

<u>متولیان</u>:۔ ٹرسٹی نمبر ا ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقی مجتہد العصر والزمان تھے ان کی وفات کے بعد ۱۲۸۹ھ میں ان
کے بیٹے شمس العلماء سید محمد ابراہیم نے مسجد کو غیر معمولی فروغ دیا پھر ان کے بعد ۱۳۰۷ھ میں ان کے خلف اکبر مولانا سید محمد تقی مجتہد
نے ۱۳۱۸ھ تک خاطر خواہ خدمات انجام دئے اس کے بعد مسجد زیر انتظام عدالتی بورڈ آگئی۔

<u>پیش امام</u>:۔ لکھنؤ میں فرقۂ امامیہ کے مجتہد اول مولانا دلدار علی صاحب غفرانمآب کے بیٹے مولانا سید علی صاحب قبلہ جنھوں نے
سب سے پہلے اردو تفسیر قرآن لکھی، اس مسجد میں تحسین علی خاں کے وقت سے نماز پڑھاتے تھے ان کے سفر زیارات ۱۲۵۶ھ میں ان
صاحب کے بھتیجے ممتاز العلماء کی اقتدار میں نماز ہوتی رہی غدر ۱۸۵۷ء میں چند شورش پسند مسلمانوں نے مسجد پر قبضہ کیا اور ۲۷ مارچ
۱۸۵۸ء سے پھر نواب محسن الدولہ کے حکم سے ممتاز العلماء نے نماز پڑھائی اور یہ عہدہ ان کی اولاد میں بلا تنخواہ اب تک ہے۔

مسجد کی تاریخی حیثیت

رمضان شریف میں اس مسجد کی رونق اس حد تک پہونچی کہ ظہر کا وقت آنے سے پہلے رئیسوں کے مصلے بچھا دئے جاتے تھے۔ [illegible]
صاحب جگہ روکے ہوئے بیٹھے رہتے تھے اور جو امیر جس وقت آیا اس کو جگہ نہ ملنے کی شکایت رہی۔ انیس و دبیر ایک وقت [illegible]
میں جمع ہوتے تھے اور قدر دانان سخن اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے تھے کہ یہ دونوں صاحبان کمال آپس میں کس طرح ملتے ہیں۔

[illegible] دکانیں کھلتی تھیں اور تبرکات کے بازار میں انگوٹھیاں، تسبیحیں، سرمہ، کنگھے، تماردانہ، قرآن شریف، حمائل [illegible] قلب شاعر جواہر مجموعے اور تعویذات مناسب قیمت پر فروخت ہوتے تھے روزانہ سہ پہر کو مختلف صاحبان کمال اپنے [illegible] اور دوستوں کو لئے ہوئے کوئی قرأت سکھا رہا ہے کوئی ادبی گفتگو اور اشعار پر اصلاح میں مصروف ہے بعض اہل علم مسجد [illegible] بھی دیتے تھے۔

[illegible] تصدق حسین ایڈوکیٹ لکھنوی نے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ میرے سامنے اس مسجد کی سیڑھیوں پر کچھ سعید پوش بیٹھا کرتے تھے [illegible] پاکیزہ مزاج ہوتے ہوں گے [illegible] لوگوں کی سیر دل بہلایا کرتے اور کچھ ترقیں مزاج ہوتے جو [illegible] کے نظارے [illegible] ملاقات سے متاثر ہوئے [illegible] معلی تماشہ بیوں کا مسجد میں ہے قیام حسین آباد کی ضریح اور [illegible] کا تعزیہ اور جلوس جب گذر رہے۔ وقت [illegible] کوٹھوں کا ہجوم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

نوچندی کو درگاہ حضرت عباس کی طرف [illegible] مسجد کے سامنے سے نکلتی تھی اور بادشاہ حاضری چڑھا کر واپس ہوتے تھے۔ میر تقی میر کی خودداری [illegible] آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خان [illegible] میں جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن نواب کی سواری چوک سے نکل رہی تھی [illegible] مسجد پر [illegible] بیٹھے تھے [illegible] ہوئے میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے سید انشا خواص میں تھے۔ نواب نے پوچھا [illegible] یہ کون شخص [illegible] دیا عرض کیا یہ وہی متکبر ہے۔ جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے [illegible] عالم [illegible] سعادت علی خان نے [illegible] خلعت کی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ [illegible] انکار کر گیا [illegible] دیا [illegible] کہلا [illegible] محتاج نہیں ہے سعادت علی خاں کو تعجب ہوا اور پھر انشا کے ہاتھ یہ خلعت [illegible] سمجھایا [illegible] بادشاہ وقت کا [illegible] میر صاحب نے کہا وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپیہ ماہوار کے نوکر کے ہاتھ خلعت بھیجا

امان علی سحر کا مشہور قطعہ بھی مناظر مسجد کی تصویر کشی کرتا ہے [illegible] گہری نظر سے دیکھنے والے اس کو امام کی نذر عصب کہتے ہیں سے

احباب کی صحبت سے دل ایسا نہ اٹھے گا — [illegible] کا کوثر تب یہ سہانا نہ اٹھے گا
اللہ کے گھر میں بھی ہیں گھوروں گاتوں کو — تحسین کی مسجد سے مصلیٰ نہ اٹھے گا

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے [illegible] تک یہ مسجد جامع بھی رہی اور جمعہ و عیدین بڑے طمطراق سے ہوتا رہا حمام اور پھاٹک کی چھت پر نمازیوں کی صفیں ہوتی تھیں۔

چھوٹی مسجد اور حمام:۔ مسجد تحسین اپنی وسعت کے باوجود جب نا کافی ہونے لگی تو تحسین سرائے مسجد کے بائیں طرف اپنے پیسے [illegible] مسجد بنوائی اور غریبوں کے نہانے کے لئے حمام وا ہی جانب بنوایا احمد علی حمامی اس علاقہ کا ہوشیار کام کرنے والا تھا ۱۹۱۵ء [illegible] مسجد گر گئی اور حمام شکستہ حال میں اب بھی موجود ہے۔

[illegible]

امام باڑہ تحسین

بازار چوک سے مسجد کے پچھواڑے جانے پر بازار تحسین شروع ہوجاتی ہے اور داہنے ہاتھ پر جو محراب دار پھاٹک ہے وہی امام باڑہ ہے یہ پہلے ایک احاطہ کی صورت میں تھا پھر اصطبل ہوا اور تاریخ ۲۹ شعبان ۱۲۲۲ھ م اگست ۱۸۰۷ء کو تحسین کے مرجانے کے بعد ان کا مقبرہ قرار پایا۔ نواب ناظر نے عہد سعادت علی خاں مرحوم میں دنیا چھوڑی اور یہ پہلا امام باڑہ ہے جو جان بیلی ریذیڈنٹ اودھ کے زیر نگرانی ساعیان موصوف کے مصالح نے ان کو مجبور کیا تھا کہ وہ انگریز کو اپنا وصی قرار دیں اور ۲۴ اگست ۱۸۰۷ء کو سفیر اودھ سے وصیت کی کہ وہ ان کی تمام جائداد منقولہ یا غیر منقولہ اور سواری کے ہاتھی، اونٹ، گھوڑوں کا ان کے بعد انتظام کریں اور شرائط وصیت نامہ کا سختی سے لحاظ رکھیں وصیت نامہ کے ضروری الفاظ یہ ہیں۔

عرصہ ہوا کہ میں نے اکبری دروازہ کے قریب چوک میں ایک قطعہ آراضی اپنے مدفن کے لئے خرید کر ایک مسجد اور اصطبل اور پکا بازار اپنے باقی روپے سے تعمیر کرایا تھا اور اس کی کل آمدنی مسجد کے فقرا اور مساکین کو تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ میری تمنا ہے کہ آپ اس بارے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے جب میری روح جسم سے پرواز کر جائے تو میرا جنازہ شان و شوکت سے اٹھا کر لاش چوک بازار کے احاطے میں دفن کرا دیں اور ایک پختہ مقبرہ بھی میرے مرقد پر اس روپیہ سے بنوا دیں جو کمپنی کے حوالے میں جمع کیا جائے گا مسجد اور بازار کی دوکانوں کا کرایہ جس کو اب تک جنرل سیٹھ کے ملازمین وصول کر کے فقرا کو تقسیم کیا کرتے ہیں میرے بعد بھی اسی طرح سے وصول کر کے مسجد اور مقبرہ کے فقرا و مساکین کو تقسیم کیا جائے

<u>پکا بازار</u> :۔ کچھ نہیں معلوم کہ یہ بازار عقب مسجد تحسین تھا یا کسی اور جگہ چوک کے اس حصے کو جو مسجد کے سامنے ہے تحسین علی خاں کا پکا بازار کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وہ خود اسی عبارت میں چوک بازار کی لفظیں سپرد قلم کر رہے ہیں۔ نواب ناظر کے مرنے کے بعد ہی امام باڑہ کی بنیاد پڑی اور جان بیلی نے ان کی وصیت اور آرزو کے مطابق مقبرہ امام باڑہ کی وضع پر بنوایا۔ جس امام باڑہ کہو یا ______

<u>مقبرہ تحسین</u> :۔ پھاٹک مذکور سے اندر آؤ تو ڈیوڑھی کی چھت ہے جس پر لکڑی کی دھنیاں اور چھاپ لگائی گئی ہے۔ دونو پہلوؤں میں دو چھوٹے دالان اور داہنے ہاتھ کی طرف کوٹھری صحن بہت چوڑا اور چکلا، پچھم کی طرف اصل عمارت ہے جو برآمدہ کے بعد وسیع ہال کی صورت میں ہے۔ پرانے طرز کی قالب دار چھت بیچ میں نواب ناظر کی قبر جس پر کوئی کتبہ اور پتھر نہیں ہے بغل میں ان کی رفیقۂ حیات کی دوسری قبر ہے جو صرف دلبستگی کے لئے زندگی بھر ساتھ رہیں ورنہ خواجہ سرا کے لئے بی بی بے جوڑ رشتہ ہے۔ اس درجے میں لکڑی کا منبرا اور ہر ستون پر علم نصب کرنے کے علامات ہیں تیسرا درجہ شہ نشین ہے جس میں بہت ہی قدیم لکڑی کی فرجیں ہیں اور پشت پر علم کھڑے ہوتے ہیں کسی وقت میں یہ تعزیہ خانہ شیشہ آلات سے آراستہ اور آرائشی سامان سے بھرا ہوا تھا۔ حسب دستور ضریح کے دالان کی کرسی اونچی ہے اور بغلی صحنچیں سامان خانہ رکھنے کی زیادہ گنجائش ہے جنوبی رخ پر بھی کچھ عمارت تھی جس کے صرف آثار باقی ہیں تحسین علی خاں نے وصیت نامہ میں یہ بھی خواہش کی تھی۔

"اس رقم کے علاوہ میری وصیت ہے کہ میرے زرامانت کے سود میں سے چھ سو روپے سال محرم کے مراسم عزا اور میرے مقبرہ پر صرف کئے جائیں۔"

تحسین علی خاں کا دیسہ [illegible] قرشی شہاب الدین جیجو کے وقت تک ۱۰ شعبان کو ہوتا تھا ۲۴ جنوری ۱۹۱۵ء سے مقبرہ و مسجد ممتاز العلماء کمیٹی کے تحت میں آگیا اور بورڈ آف قرشیز کی طرف سے عزاداری ہوتی ہے اور دیسہ کی مجلس بیخ وفات سے ایک دن پہلے ۱۰ شعبان کو ہوتی ہے انتقال تحسین علی خاں کا مادہ تاریخ " آج احتہ مدعا طویلے میں " نہیں ہے شاعر کا یہ فقرہ مصرعہ کسی دوسرے واجد مرزا کی موت پر ہے جو تحسین کے مرنے کے ۷ برس بعد فوت ہوا۔ افسوس ہے کہ تاریخ اودھ بر ماہ فرسالی میں زیادہ تر تعصب اور قیاس آرائی سے کام لیا گیا اور لٹریچر میں افسانہ نویسی کے فرض کو ادا کر کے عوام کی حیثیت صرف شہرت کو فروغ دیا تحسین کے عاشقی حوالے میں دیسہ کے دن پانی کے گھڑے اور طورہ طعام کے ساتھ انگرکھا جوڑی مہری کا پیجامہ میا پائل نوٹ کا اوڑھنے والا رومال یادگار کا دست پاک پنجگوشیہ ٹوپی کھیلا ہوتا ہوتا تھا۔

<u>ایک خوشنویس کی یادگار</u>۔ دروازہ مقبرہ سے نکلتے ہی برآمدہ کے قریب ایک زمین دوز قبر ہے جو حکیم علی حسین ایک طبیب وقت کی آخری آرامگاہ ہے اور سنگ مزار سے واضح ہوتا ہے کہ ان مرحوم نے ۱۲۷۵ھ میں انتقال کیا تحریر امیر اللہ تسلیم کا قطعہ تاریخ ہے جو نولکشور پریس کے پہلے دور میں خوشنویس تھا کاتبوں میں شمار کئے جاتے تھے شاعری میں بھی کمال تھا۔ کلیات تسلیم دو جلدوں میں چھپی ہوئی شائع ہو چکی ہے لکھنو میں ان کی خطاطی کے نمونے جا بجا موجود ہیں متی وطن میں رہتی دکن میں جاکر رحلت کی امیر مینائی کے سامنے جب اس خطاط کے سمر دکن کا ذکر آتا تھا تو کہتے تھے ؎

میرے دل سے تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے ۔۔۔ مگر مرگ مریضے وطن کچھ اور کہتی ہے

مقبرہ تحسین علی خاں اب ماضی کی اصل یادگار ہونے کے ساتھ امیر اللہ تسلیم کو بھی فراموش نہ ہونے دیگا جب تک یہ سنگ مزار باقی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ نسلیاں انگلیاں لکی رہیں تو پختہ فرش سے آراستہ کر کے اس پتھر کو مٹنے سے بچائیں ؎

ڈر ہے کہ کہیں نام بھی مٹ جائے نہ آخر ۔۔۔ مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

قبر ایک تاریخی انسان کا مزار اور تعویذ قبر ایک خطاط کی یادگار ہے

<u>باغ ممتاز العلماء</u> ۔ مسجد کے پچھواڑے مجتہد العصر کا باغ تھا جس کے تین دروازے تھے تکاس کا پھاٹک عقب مسجد سرائے تحسین کے پچھم میں جواب تک ہے۔ اس دروازے پر تختی میں لکھا تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم ربنا لا یحسنا واحفظنا، بلا له لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔ یہ تختی باقی ہے۔ دروازے کے پٹ اور چھت کی ڈیوڑھی کے بعد دوسرا دروازہ تھا جس میں لکڑی کی جوڑی تھی۔ اس کے بعد باغ میں پہونچنے کا زینہ اور چمن بندی تھی لیمو کاغذی، جامن، شریفہ، مولسری، کاغذی بیل، کروندا، کامنی، گولر، کھجور، بیری اور املی وغیرہ کے درخت تھے نہیں کہا جا سکتا کہ درخت کھجور والی ممتاز العلماء کی پیدائش سے پہلے پیڑ تھے یا انہوں نے تمام پودے خود لگائے۔ باغ میں اب کوئی درخت نہیں ہے املی کا درخت چار پانچ برس پہلے تک تھا امام باڑہ پر اس کا سایہ شامیانہ کی طرح فائدہ بخش تھا۔ درختوں کو سیراب کرنے کے لئے کھاری پانی کا ایک گہرا کنواں بھی تھا جو اب بند ہے۔ باغ کا جنوبی دروازہ سبزی منڈی کوچہ میر انیس کی طرف اور شمالی دروازہ حمام کی گلی عقب امام باڑہ تھا یہ راستے بھی اب بند

۱؎ مولانا کا سید احمد علی کا بندوی اور قاضی رامپور مفتی محمد سعد اللہ کے معاصر تھے باقر کی طرف سے حسب قرآن مجید کی صحت پر علماء کی دستخطیں میں مولانا حکیم علی حسین کی بھی مہر ہے۔

اس پچھم کی طرف باغ کی تنانی دیوار تھی جس کا قدیم حصہ ابھی باقی ہے اس دیوار کی سمت اوسط درجے کی ——————

<u>مسجد باغ</u> ۔ بغیر مینار اور گنبد کے صرف ایک درجہ اور چبوترہ جنوبی رخ پر موجود ہے مسجد میں صبح کی نماز ممتاز العلماء میر آغا صاحب مجتہد باجماعت پڑھاتے تھے اس مسجد کو یہ تاریخی خصوصیت حاصل ہے کہ مؤذن کا نام تو کسی کو یاد نہیں "شیخ" کی لفظ سے اذان کہنے والے مشہور رہتے ۔ جو تورے سے پہلے ڈاکو تھے ممتاز العلماء نے ان کو راہ راست دکھائی ۔ بڑھاپے یا کسی بیماری کی وجہ سے بیرون ملنے جواب دے دیا تھا ۔ آواز اس قدر بڑی تھی کہ جب اذان دیتے تھے تو صبح کی صدائے اذان محلے والوں کے رہنے والے سنتے اور آواز پہچانتے تھے مؤلف نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جو شیخ کی آواز اپنے گھروں میں سنا کرتے تھے اور ان کی صدا کی رسائی پر متحیر تھے۔

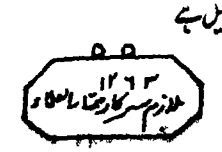
مکان ممتاز العلماء اور آزادی کے حامی شاہ کی آمد
سلاطین اودھ کے قصر میں باریابی کا آئین

یہ مکان باغ کے جنوبی رخ پر سری منڈی سے متصل تھا جس کا اب نشان بھی نہیں ہے ممتاز العلماء کا سرا جس میں مکان بنوا کر سکونت اختیار کر رہا تھا ۱۲۷۶ھ کے پہلے کا ذکر ہے اس مکان کی خصوصیت دہ عشرۂ محرم کی مجلسیں ہیں جو اب تک یادگار ممتاز العلماء ہر سال ہوتی ہیں پہلے ذاکری کا عہدہ مولوی امداد علی صاحب کیرانوی کو ملا تھا وہ ملتان سے مجلسیں پڑھنے لکھنؤ آتے تھے ۔ مخلصین ممتاز العلماء کے اجتماع سے جب یہ مکان بھر جانے لگا تو امام باڑہ کی تعمیر ہوئی ۔ اس زمین کو میں نے کھنڈر کی صورت میں دیکھا ۔ آخر میں حکیم سے آغا حاشق مشہور حکیم شہر کے جوہری محلہ سے اٹھ کر آئے اور اسی جگہ بہت دنوں تک کوٹھی بنوا کر پبلک خدمات انجام دیتے رہے ان کی موت کے بعد ورثا نے ہجرت کی اور یہ عمارت نئے انتظامات کے تحت میں آئی ۔ اس مکان پر شاہان اودھ کی سواری آتی تھی اور خود ممتاز العلما اپنی ڈیوڑھی سے قیصر باغ جاتے تھے ۔

<u>مجتہد صاحب کی پالکی</u> ۔ ہیس میں امیر رئیس اور اہل علم دونوں طبقے سوار ہوتے تھے اور علماء کی نشست کا یہ انداز تھا کہ وہ امراء کی طرح نیس کے بیچ میں اپنے تئیں نمایاں کر کے نہیں بیٹھتے تھے وہ گوشہ میں ہمیشہ تکیہ کر کے بیٹھتے سامنے خاصدان اور گھڑی کی چوبی نیس آبادی صندوقچی مراد آبادی لٹیا کا ساتھ ہونا ضروری تھا اور بعض عالموں کے ساتھ صندوقچہ رہتا تھا ۔ نماز عید کا موقع ہوا تو تلوار پہلو میں ورنہ گرڈوے یا دام کا عصا نوکر فانوس لئے ہوئے ساتھ ساتھ' پالکی عام طور پر چار کہار اٹھاتے تھے چھ یا آٹھ کہاروں کا ہونا خاص اوقات میں ضروری تھا اور کبھی سولہ اور کبھی ۳۲ کہاروں کی نوبت آجاتی تھی جب چار شخص تھک جاتے تھے تو دوسرے شریک ہوتے تھے اور کاندھا بدلنے کے وقت تک یہ سواری کے ساتھ دوڑتے تھے ایک کہار سب کا افسر ہوتا اس کو مہرا کہتے جس کی وردی میں امتیازی شان اور قیصر باغ میں داخلے کے وقت اس تختی کا ہونا ضروری ہے ہشت پہل تقطیع پیتل کی ہے اور جو جگہ سادی چھوڑتا ہے اس پر گل کاری ہے نقش و نگار معمولی ہیں سرکار کی لفظ لکھنے کا حق صرف مجتہد کو تھا دیگر لوگوں کے پاس داخلہ میں یہ لفظ ممنوع تھی اس کے علاوہ پگڑی میں دوسرا تمغہ تھا جو نمبر داخلہ اور باریاب ہونے والے کے نام پر مشتمل تھا اس کی صورت درج ذیل ہے



پچھلی ←



تقطیع

سواری اٹھاتے وقت سب کہاروں کا بیک آواز بسم اللہ الرحمن الرحیم کہنا وہ رواج تھا جو آخر تک ترک نہیں ہوا قبلہ وکعبہ کے لئے وقت اور اجازت کی ضرورت نہ تھی مگر علما خود سلطنت کے احترام میں اطلاع دے کر تشریف لے جاتے تھے اور حفظ مراتب کا بے حد خیال [illegible]

کرنوٹ، [illegible] نے جو کچھ لکھا ہے وہ جدا شکستہ ہے اور مٹا جاں۔ دق میں اس تحریر کے پڑھنے میں بڑا اختلاف ہوا۔ آخری نتیجہ یہ تھا کہ فقط برای بیعت شمشیر حکم است۔ ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ تلوار حمائل کرکے آنے والے لڑنے کے لئے ملوا نہیں باندھے ہیں بلکہ آداب داخلہ میں کہ تلوار سمیت آئیں اس وقت کے مالکے اور چادر چونکہ بغیر شمشیر گھر سے قدم نکالتے ہی نہ تھے اس لئے حکومت نے ان کے ہدایات میں تغییر نہیں لگائی

نئے بادشاہ کی سواری ممتاز العلماء کے شریعتکدہ پر

زبدۃ العلماء سید حسین مجتہد جن کا لقب بعد وفات "علیین مکاں" قرار پایا تھا غفرانمآب سید دلدار علی کے چھوٹے بیٹے تھے در مذہب امامیہ میں بڑے واجب التعظیم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے تصانیف ہندوستان سے باہر تک مشہور ہیں ۔۔۔ وقت صبح اودھ کی تباہی ہوئی تو گاؤ تکیہ پر سر رکھ دیا اور کھانسی آنے سے اگالدان میں خون کی قے کی۔ انگریزوں کی عملداری وطنی حکومت کا حسن دانا یہ حاصرہ ہوئے ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۶ء کو ہمیشہ کے لئے دنیا چھوڑ دی۔ اس حادثے کا پورا دماغ پر تعزیت ہو ۔ کلکتہ میں یہ پہونچی ہوگی سلطان عالم کا مٹیا برج سے ماتم پرسہ کا خط[1] آیا اور اپنے چشم و چراغ کو حکم دیا کہ سیدین اودھ کے ذاتی خلوص و عقیدت کی بنا پر شریعت کدہ ممتاز العلماء پر جا کر تعزیت کی رسم ادا کرو۔ بر عید قدر دن دیکھ کر در سر پر آئے اور ماتمی[2] کے اندر دیرینہ خلوص کو تازہ کیا۔ اس منظر کے جانے والے سب زیر زمین ہیں مگر عرفی کا شعر ہے

یلوح الخط فی القرطاس دھرا ۔۔۔ وکاتبہ رمیم فی التراب

صحیح ہے نہ آنے والا رہا نہ جن کے پاس آئے تھے وہ باقی ہیں مگر یادداشت دنیا تک رہے گی اس وقت کے اخبار کی ایک کٹنگ ملاحظہ ہو۔

۱۷ ربیع الآخر جمعہ کے دن صبح دم صاحب عالم مرزا رحیم قدر بہادر حسب الحکم حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ جناب مجتہد العصر کے مکان پر تشریف لائے رسم تعزیت بآئین شائستہ ادا کی حضرت جناب میرن[3] صاحب قبلہ کی دلجوئی فرمائی خلعت عطا ہوئے وہ گویا فیض عمیم اور مزاج مبارک حلیم ہے کہ باوجود ایسے مکروہات اور پریشانی کے ان آفات آسمانی کے کہ نصیب دشمن ہوں جس وقت شاہزادہ کی سواری نکلی تھی شہر کی بیچاری خلقت دیکھنے نکلی تھی جو گھر سے باہر آیا جس کو سواری کا اہتمام نظر آیا بے ساختہ ہر لب سے یہ مذکور رہا ہے

تجھے معصل کرتے نہیں لگتی بار ۔۔۔ نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

ہرچند کہ اس روز کچھ سامان سواری کا نہ تھا جلوس دھوم دھڑکے کی تیاری کا نہ تھا وہ معدودے چند خود دردولت پر مقیم تھے وہی ہمراہ تھے اور صدقہ علی اللہ تھے لیکن عجب شان و شوکت تھی دیکھنے والوں کو حیرت[4] تھی۔

۱۔ ملاحظہ ہو اعجاز الآثار مخطوطات ۲۔ ۱۷ رمضان کو ۔۔۔ ربیع الآخر کو آپ کا واقعہ ہوا اسی تھا مرزا غالب نے اس موقع پر مرثیہ نظم کیا وہ آپ کے حالات [illegible] ۳۔ سید العلماء کا عرف میرن صاحب تھا ۴۔ اخبار طلسم جلد ۲ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء

کتب خانہ LIBRARY

ممتاز العلماء نے کربلائے تحسین میں سکونت اختیار کرتے ہی ایک دو منزلہ پختہ عمارت مکتبہ علوم مشرقیہ کے لئے بنوائی اور دو ہزار سے زیادہ مخطوطات جمع کرکے قیامت تک کے لئے فضل و کمال کے چراغ روشن کردئے اس ذخیرۂ کتب میں وہ نوادر و عجائبات ہیں جو عرب اور مصر اور یورپ میں بھی نہیں ہیں کتب خانہ کی عمارت اب بھی بجنسہ موجود ہے مگر ورثہ کا قبضہ نہیں ہے۔ کتابیں اس وقت تک اسی محلہ میں موجود ہیں اور کتب خانہ ممتاز العلماء اس کے وقف کے شعبہ امامباڑہ تحسین علی خاں کو میں محفوظ ہے اور بورڈ کے زیر انتظامات تمام اوقات ہیں اس لائبریری کے خصوصیات میں حسب ذیل اقسام کی کتابیں بہترین شمار کی جاتی ہیں۔

(۱) مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اور اصل نسخہ (۲) عہد مصنف کے مکتوبات (۳) علماء کی تصحیح کردہ اور ان کے علمی افادات سے مزین کتابیں (۴) سلاطین کے کتب خانے کے نسخے (۵) حرم کی روشنائی سے لکھی ہوئی کتابیں (۶) مشہور افراد قوم کے دست مبارک کی تحریریں (۷) غیر مطبوعہ نوادر اور شواہد (۸) آلات ریاضی اور کرے (۹) خارجی اسباب میں تلف نہ ہونے والی کتابیں۔

<u>کتب خانہ کا غدر میں انجام</u>:۔ یہ کتب خانہ ایک اتفاقیہ صورت درپیش آنے سے بچا ڈیوڑھی میں بڑی بلٹیں پلی ہوئی تھیں اور مکانی کا چھتہ ایک بلندی پر تھا گورے سنگینیں لئے ہوئے آئے شہد کی مکھیاں چھتہ پھوٹ جانے سے اڑیں بلٹیں پیچھیں وہ بلٹوں کو پکڑ کے لے گئے اور مکھیوں نے اندر آنے نہ دیا۔ اس طرح علمی خزانہ تلف ہونے سے بال بال بچ گیا۔



<u>خاص کتابیں</u>:۔ مرقومہ بالا خصوصیات کے علاوہ چھٹی صدی ہجری کی پرانی کتابیں جن کی لکھائی کو آٹھ سو برس سے زیادہ ہوئے اور وہ مخطوطات جن پر طلائی لوح اور سنہری بیلیں اور طلاکار پیشانی اور طرز قدیم کے گل بوٹے اور مختلف دیدہ زیب رنگ یا کوئی صنعت ہے مثلاً ہر سطر قرآن شریف کی الف سے شروع اور ہر ورق پر پارہ ختم یعنی ۳۰ ورقوں میں پورا قرآن پاک۔ ان تمام کتابوں کا اگر ہم نام بنام ذکر نہ کریں تو وہ کتاب نظر انداز نہیں ہو سکتی جو بصرہ کے سمندر میں گری۔ اور مسقط سے برآمد ہوئی کتاب پر پانی کا کوئی اثر نہ تھا۔ سمندری راستہ مچھلی کے پیٹ میں طے کیا۔ ایک ساحل پر شکم ماہی میں گئی اور دوسرے ساحل پر مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کی طرح اگل دیا۔ اس کتاب کا نام ہے دلائل الاحکام علم فقہ میں کتاب الطہارۃ عراق سے کاپی سائز کا غذ پر لکھ کر مکتبہ ممتاز العلماء کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کو یہ شرف حاصل تھا کہ اصل مؤلف کی کتاب کے مطابق صحیح ترین نسخہ تھا اس کتاب کے معجزانہ طور پر ہندوستان پہنچنے کا ذکر تیرھویں صدی کی عربی تاریخوں میں ہے۔ کتب خانہ میں

---

[1] بادشاہ اور امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے کتب خانے کے بلند پایہ مخطوطات ملاحظہ ہو احیاء الآثار صفحہ ۳۶۸ عہد عالمگیر شاہی کتب خانہ کا لٹریچر صفحہ ۳۴ ۔ اور عہد محمد شاہ کا صفحہ ۳۹ احیاء الآثار اور قطب شاہ کے لائبریری کے نسخہ صفحہ ۲۹ [2] الدرالمنضود (مخطوطات) مفتی سید محمد عباس صاحب شوستری عربی ... سفینہ کا فوٹو کا ... مفتی علیہ ما سعد۔

[illegible] پر بھی زیادہ وقت زیادہ ذخیرہ موجود ہے اور مسائل ریاضی طلبہ کو سمجھانے کے لیے کرہ بھی موجود ہے۔ کئی کرے ایک بہت [illegible] ہے جس کی تصویر یہ ہے  GLOBE اس کرہ پر شکلیں اور دائرہ اور خطوط ہیں جو عکس [illegible] اسطرلاب ممتاز العلماء [illegible] آلہ ہے۔ [illegible] کے دارو [illegible] میر [illegible] تھے جو [illegible] گاؤں ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے بہت [illegible] ہوا [illegible] ہوئے تھے ان کے بیٹے دارو [illegible] حسین مطبوعات معروف [illegible] مدرسہ سلطان المدارس کے بھی نگراں [illegible] سرکار ممتاز العلماء سے علیحدہ ہوگئے [illegible] سید حسن [illegible] کی وفات کے [illegible] اور [illegible] مولوی [illegible] گوہر موضع پٹنا صوبہ ضلع اعظم گڑھ [illegible] بڑے گاؤں ضلع فیض آباد [illegible] اب بھی موجود ہے۔ [illegible] سید حسن [illegible] موجود ہیں [illegible] جانے کے دو [illegible] سے تھے پہلا باغ کے پھاٹک سے ملا ہوا [illegible] حسین علی خاں [illegible] ہونے والے [illegible] کے سامنے تھی [illegible] دروازہ ہمیشہ بند رہتا [illegible]

[illegible] العلماء [illegible] اسی راستے مسجد میں امامت کے لیے جاتے تھے ۱۹۱۵ء میں یہ چھت [illegible] مولوی میر محمد حسین[1] صاحب میر حیدر حسین صاحب، میر احمد حسن صاحب [illegible]

امام باڑہ ممتاز العلماء

باغ مذکور کے آثار قدیمہ میں امام باڑہ ہے جس کا [illegible] ممتاز العلماء کے ہاتھ سے نصب ہوا تمام عمارتی سامان [illegible] ۱۲۸۶ھ میں تیسرے برس بعد عالیشان درجے اور دالانوں کے [illegible] سیڑھیاں تاکہ اوپر کے حصے میں عورتیں شریک مجلس ہوں [illegible] کربلا معلیٰ کی مٹی کی ضریح [illegible] پر پتھر نصب ہے جس میں عربی قطعہ تاریخ لکھا ہے [illegible] اس امام باڑہ[2] کا قطعہ تاریخ حسب ذیل نظم کیا ہے ؎

فیلسوف [illegible] و اکمل — [illegible] و رہنما

مجتہد جامع الشرائط ہیں — [illegible] حدا

علماء میں بہت ہیں یہ ممتاز — [illegible] سید العلماء

ہے جو ان کا امام باڑہ رفیع — [illegible] دریا

اس مکان شریف واقدس کی — جب ہوئی اس جگہ [illegible]

[illegible] تعزیت سرا رحسین — بس لطافت نے سال ہجری کا

---

[1] [illegible] ہے نامور جیسے مقبرہ [illegible] کی عمارت سے متصل [illegible] اس کی قبر ہے اور [illegible] میں موجود ہے۔

[2] [illegible] بادشاہ اودھ [illegible] شاہ کا دعویٰ ڈسمس ہوا۔

[illegible]

بن چکا جب تمام و کمال　　　ہو گئی مجلس عزا برپا
کی رقم دل نے دوسری تاریخ　　　تعزیہ خانہ حسینؑ ہوا
۱۲۸۷ھ

ممتاز العلماء کے بعد ان کے بیٹے شمس العلماء سید محمد ابراہیم نے تیسرا دالان پشت عزاخانہ کی طرف بڑھایا اور چبوترہ اضافہ کیا۔ ستہ نشین درجہ دوم سے منتقل ہو کے تیسرے درجے میں آئی۔ اس وقت حجرہ ضریح مبارک کا نشان یہ ہے کہ تا کمر مدری۔ وکاریں پیتل کا کٹہرا اور گنبد کا آدھا بصورت سقف اندر ضریح خاک شفا پہلوؤں میں بڑے اور سادے فولاد کے علم حسن ریلیے رنگ کا پٹکا اور اس پر بہشت کے چھپے ہوئے روپہلی نام اس کے سوا کوئی ظاہری ساز و سامان نہیں۔ چھت قدیم طرز کے بٹے دیواروں پر نصب کر کے دھنیاں دی ہوئی۔ امام باڑہ میں مکان ممتاز العلماء کی مجلسیں جب اٹھ کر آئیں تو جلوس اور گریہ کے لحاظ سے اور زیادہ شہرہ آفاق ہوئیں یوں محرم کی مجلس میں کئی گھنٹے پہلے ذکر شروع ہو سکے شمع کی روشنی میں اندھیرے منہ سے آکر لوگ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے اودھ اخبار اور دوسرے جرائد میں اس مجلس کے تذکرے میں حکام ضلع بھی شرکت کرتے تھے۔ اس زمین کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں کتنے مجسمۂ کمال زیر خاک محو خواب ہیں صحن کی طرف بیچ کے درجے میں ممتاز العلماء اور شمس العلماء کی قبریں ہیں جن پر کاٹھ کی روغنی ضریحیں نصب ہیں اور سنگ مرمر کے بڑے پتھروں پر سرہر سرگاہ دہیں کی تاریخ وفات پر مشتمل علی میاں کامل کے اشعار لکھے ہوئے ہیں جو کہ لئے خود ایک خط نستعلیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۱۲۸۹ھ میں علامہ کنتوری نے امام باڑہ میں ایک مدرسہ کھولا اور مدت تک وہی درس طلبہ کو دیتے رہے۔

<u>قبر لطافت</u> :۔ امام باڑہ میں اولاد ممتاز العلماء کی قبریں ہیں اور اب کہیں جگہ باقی نہیں ہے۔ باغ کی آراضی کو بھی دور اندیش واقف نے قبور کے لئے تجویز کیا تھا اور اپنی ایک تحریر میں ظاہر کیا ہے کہ درخت بحیثیت باغ نہیں لگائے گئے ہیں بلکہ قبروں پر سایہ کے لئے پیڑ ہیں چنانچہ مجلسیں کو ان کی استدعا پر یہاں قبر کی جگہ دی گئی اور سید حسن لطافت سپرد خاک ہوئے لطافت ایک مشہور گھرانے کے شخص تھے آغا حسن امانت کا نام تو تاریخ اودھ سے دلچسپی رکھنے والوں کو معلوم ہی ہے امانت لطافت کے باپ تھے۔ لطافت کی قبر غربی دیوار گوشہ شمال میں ہے جس پر اب مکان تعمیر ہو گیا ہے اور اس کی بغل میں حاجی میر احمد حسن کی قبر ہے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے لطافت، شیخ محمد جان شاد کے ہمعصر تھے ان کے شاگردوں میں مومن علی محبت، مرزا شبیر علی رسا، نواب مجید الدولہ محمد تقی خاں سطوت سید محمد تقی فرحت خوش نویس، میر ملک علی نجابت، منشی محمد سجاد تبر وغیرہ تھے۔ لطافت کے زمانے کے اساتذہ نے ان کو خان نظم، مرد میدان سخنوری، شاعر رنگیں بیان، افتخار الشعراء مانا ہے مفتی میر عباس صاحب نے اسی عربی تاریخ میں "فرد وحید" کہا ہے لطافت ماہ ربیع الاول کی تیئیسویں شب کو دنیا سے گذرے وضع مفاصل مرض الموت ثابت ہوا ہے

ہو گیا ویران باغ شاعری　　　گل ہوا لاسد چراغ شاعری
۱۸۹۴ء

پسماندگان میں سید عباس حسن مصاحب بھائی اور باقر حسن عرف اچھے صاحب شہرت بیٹا چھوڑا۔ مرقع ماتم بیس نوحوں کا ان کے کلام کا وہ نمونہ ہے جس کا تجارتی فہرست کتب میں نام پایا جاتا ہے۔

<u>ادب اردو کا ایک اور تابندہ ستارہ</u> :۔ اسی حصہ باغ میں جواب شمال مکان ہے مولوی میر حسن علی صاحب کی قبر ہے جو حسین آباد میں رہتے تھے اور خاندان اجتہاد کے معلم تھے لڑکوں کو صرف و نحو کی تعلیم دیتے تھے اپنے فن میں کامل تھے۔ اور [illegible]

...کتابوں میں وہ کڑان کو ید طولیٰ تھا ... یورپ ... ایشیا ہر جگہ پہیلی کو اہمیت حاصل ہے سنسکرت کی کتاب کا دبارشی پہیلیوں کا مجموعہ ہے اور سولہ قسمیں پہیلیوں کی قرار دی ہیں۔ امیر خسرو کو اس فن میں کمال حاصل تھا آپ خوشنویس بھی تھے موصوف کے ساتھ تفنن طبع ... کی ... تھی کی لاتعداد پہیلیوں میں سے دو یاد ہیں

زمین پردہ نشیں ... سے ... گھر کے نکلنے سے — اک لحظہ فرصت نہیں لے دن رات چلے سے

قاضی ... ت ... دار ... — شہتوت خورد روزہ ادکال ماند

نبض اور شہتوت پر طلبا کی ... کے لئے یہ دو شعر مرحوم کے پیش کئے گئے ایسے ایسے کتنے صاحب کمال ... میں دفن ہیں۔ ایک باغ ممتاز العلماء کا ... طاہری ... ہے ... حشر کے دن ان کے ساتھ اٹھے گا۔

نوٹ، امام باڑہ کی جگہ ... ہے ... امام باڑہ، امام باڑہ آصفی، امام باڑہ جہاد ولاں، امام باڑہ ملکہ زمانی کے بعد چھوٹے نمبر پر ہے اور اس سے ... فراموش نہیں ہے

سبزی منڈی

بہت پرانا محلہ بازار جوک کی ... سے ... تک ... ممکن ہے کہ عہد نوابی میں ترکاری منڈی ہو لکھنؤ پر جو کتابیں آج موجود ہیں ان سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ یہاں سبزی کا بازار ... تھا۔ یہ محلہ ... مسلم ... کر آباد ہے مہاجنوں کی کوٹھیاں پرانے مندر، آتشبار ... ہیں۔ ... غدر کے بعد میر ... نے اس محلہ میں سکونت اختیار کی۔ ان کے قدیم مکان کا ذکر شاہی ... کے سلسلے میں آ ... کا میر صاحب کے گھرانے نے اس محلہ کو شہرت دی اور ... محلہ کو چہ میر انیس کے نام سے مشہور ہے محلہ کے پرانے ... میں ... میر ... ساری ... کی ... کی ... پرانی دوکان ہے جو آج تک باقی ہے۔ اور سوداگر کی مسجد عہد قدیم کی یادگار آگے بڑھ کر ہے اس مسجد میں ہر سال ماہ مبارک تراویح ہوتی ہے مفتی ... یہ کہتے ہیں سہ

مرتبہ ... کو ہو ... دل کی صلت ... — ایسی آنکھوں ... اہل معارف کہتے ہیں

ناہر حسن کا شعر بھی ... ہے سہ

... کہ ... رہبری ... — ... شوق ... سر ...

مقبرہ میر انیس ۔ یہ ... کو یہ ... جانب ... کی طرف ہے جو ... صورت میں ہے میر انیس کی ... سے بھی اس کو شہرت تھی اور قبرستان صرف ایک ... دالان کی صورت میں تھا۔ چالیس برس پہلے ۱۲ ذیقعدہ کو میر انیس کی مجلس ... میں مجھے شرکت کی نوبت آئی۔ نواب حامد علی خاں بیرسٹر نواب مرزا شمس الدین حیدر چھوٹے صاحب عالم بہادر مرحوم اس مجلس میں شریک تھے عارف نے یہ مجلس پڑھی جو اپنے دور میں جانشین اسلاف تھے۔ اب ... صحبت کہیں نظر آتی ہے۔ ایسے پڑھنے والے اس جگہ خاندان انیس کے تمام صاحبان کمال سپرد خاک ہیں جن کے نام اور کلام دنیائے ادب میں آسمان کے درخشندہ ستاروں کی طرح روشن ہیں۔ خاندان انیس میں ابو صاحب ... ایک نامور شاعر تھے جنہوں نے جمادی الاول ۱۳۲۳ھ میں داغ ... موت ... ماتم ... کے تاثرات ملاحظہ ہوں سہ

شب کی تاریکی تھی ایسی کہ ... آباد — شمع کے اشک بھی رونے میں نکلتے تھے سیاہ

شمع نے آنسوؤں سے گو کہ وہ دھو ڈالے تھے ‏ ‏ ‏ دستِ گلگیر میں جتنے تھے وہ گل کالے تھے

پانی بند ہونے پر کہتے ہیں ؎

دم بدم بادِ صبا خاک بسر آتی ہے ‏ ‏ ‏ مٹی خیمے میں تیمم کے لئے جاتی ہے

ساقی نامہ میں فرمایا ہے ؎

نکل پڑتی ہے میرے نام کی شیشی سے شراب ‏ ‏ ‏ ہم اٹھنے کو ہیں لے اس کی خبر آ کے شتاب
دلِ رنجور کے مانند ہے ساغرِ بیتاب ‏ ‏ ‏ خود بخود شیشے سے پیالے میں سے جا نکلی
لبِ ساغر سے صہبا کی صدا آنے لگی

میر و آتشباز ۔ فنونِ مشرقیہ میں آتشبازی بہت پرانا فن ہے جس کو آج کل کے متمدن ممالک نے بھی اپنی تجارت کا ذریعہ قرار دیا ہے گزشتہ لکھنؤ کی آتشبازی میں انار، پھلجھڑی، مہتاب، گیجگ، ہوائی، چھچھوندر، پڑاقے، قلعہ گولہ چرخی کون نہیں جانتا تارے چھٹنے والی ہوائی اور بار بار چھٹنے وقت ایک پھولا پھلا درخت سامنے آ جائے ۔ آخر میں موتیوں کا گرنا ۔ چرخ کا زمین پر چرخ کھا کے سورج مکھی بن جانا، آسمان پر نور ناچنا، مہتاب سے چاند کا اتر آنا ، قلعہ چھوٹنے سے طرح طرح کے مناظر اور دیدہ زیب سین گڈی کے پڑاقے گلوری نما پڑاقے ست آوازے تانت سے بندھے ہوئے، اس کا پٹاقہ "دو آوازہ" پٹاس کا پڑاقہ ۔ ۔

چوبداری محلہ ۔ سلاطینِ اودھ کے ساتھ جو خدمت گذار نوکر رہتے تھے ان کے ہاتھ میں چاندی کے خول چڑھی ہوئی لاٹھیاں جن کو شان و شوکت کے لئے انہیں دے رکھا تھا کسی کو بلانے کے لئے عموماً چوبدار آتا تھا میر انیس ؎

محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا ‏ ‏ ‏ چلئے اب چوبدارِ مرگ آیا ہے

۔ اس محلہ میں جو سرینڈی کے حدود میں ہے شاہی نوکروں کے مکانات تھے اس لئے چوبداری محلہ مشہور ہوا ۔

سامانِ جنگ ۔ چوبداری محلہ میں عہدِ واجدی کے مرزا عبدالعزیز رہتے تھے جو ۱۹۲۶ء میں مرے ہیں سفیر آباد میں ان کی دوکان بندوق بنانے کی تھی ایک مرتبہ اس نے دونالی بندوق بنائی ۔ کل پرزے ، کندہ ، نال اپنے ہاتھ سے تیار کئے اور نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب رئیس شیش محل کے روبرو پیش کی نواب خود بڑے شوقین اور مبصر تھے یہ بندوق بالکل ولایتی اور مشین میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ نواب نے مرزا مذکور کو کافی انعام دیا اس کا لڑکا بھی آبائی کام سے واقف ہے عہدِ واجدی میں ایسی توپیں بنتی تھیں جس کا گولہ بارہ کوس جاتا تھا (قدیم مہر ص ۱۶۸)

میر آغا صاحب مجتہد ۔ ۔ مذہب امامیہ کے زبردست اور نامور عالم بڑی رعب دار صورت نورانی چہرہ آصفی مسجد میں نماز جمعہ و عیدین پڑھاتے تھے ۔ پورا ہندوستان ان کی عقیدت سے چھلک رہا تھا مسئلہ مسائل اس کثرت سے آتے تھے کہ ڈاک ان کی یکہ پر بار کر کے سرینڈی سے گول دروازہ جاتی تھی بڑے خوش خوراک تھے پلاؤ زردہ خانہ ساز دسترخوان پر ہوتا تھا ۔ نیچا کرتا کنٹھے دار گلا اور کلیوں دار پہنتے تھے مسلوں کے جواب صاف دیتے تھے بے علم سمجھنے والوں کو ذرا بھی تکلف نہ ہوتا تھا ایک شخص نے نمازیوں کی صف سے نکل کر جبکہ اقامت ہو چکی تھی پوچھا حضور ڈور ٹوٹ کر تسبیح گوندھی ہے فرمایا جس کا لنگوٹا تھا اس نے یہ تو نہیں کہا اسے چھوڑ دے اگر ایسا ہے تو نہیں ورنہ کیا مضائقہ ہے ۱۱ رمضان ۱۳۲۲ھ آپ کے سفرِ آخرت کی تمناک تاریخ ہے ۔

[illegible] "چراغ ہند گل" تاریخ ہی
[illegible] مضافات چوک کا حال لکھنے کے بعد ہم پھر بازار چوک کی کیفیت لکھتے ہیں اور ملحوظ خاطر رہے کہ چوک کا آباد ترین حصہ وہ [illegible] جو حیدر حسین کے پھاٹک سے شروع ہو کر مسجد تحسین تک پہونچتا ہے شب برات میں آتشبازی عریضے نوروز میں پنکھے، ستو، رنگین [illegible] گلاب کا پھول، طرح طرح کی مٹھائیاں، بت کھیل کھلونے، تسبیح، لکڑی مدر کے واسطے اسی جگہ بکتے تھے۔

خیراتی حلوائی

تحسین کی مسجد کے سامنے مشہور دوکان تھی جو عہد نصیر الدین حیدر سے کئی پشت تک برقرار رہی اس دوکان کی میدہ والی پوریاں اور کچے بھرے آلو دور دور مشہور تھے دو پیسے کی پوریوں میں اس وقت پیٹ بھر جاتا تھا۔ خیراتی کے بعد اس کا بیٹا مصاحب حلوائی اور آخر میں قدرت حلوائی کے زمانے میں دوکان سات پشت کے بعد ختم ہوئی۔ مصاحب کے زمانے میں شکر ڈھائی آنہ سیر اور حلوہ سوہن بارہ آنے سیر بکتا تھا۔ سال بھر تک امرتیاں، برفی، امرتی، جلیبی، گلاب جامن، حلوا، نمک پارے، شکر پارہ، کھٹیاں، ریوڑیاں، پاپڑ، مشکی حلوہ سوہن اور ریسے کی گولیاں تھے ناریل کی سموسے، دال موٹ، کچوریاں، لڈو، پیڑے، رس گلے، نکتیاں، گوجھے کھجور کھاجا تیار رہتا تھا کلکتہ دہلی بمبئی کے تمام بڑے دوکاندار سب کے سب مصاحب کے شاگرد ہیں۔

کستوری حلوائی

مسجد تحسین کی دوکانات میں ہندو حلوائی کی بہت بڑی دوکان تھی جس میں دو گھنٹے رواج کے مطابق نصب تھے اور آدھی رات تک بھٹی گرم رہتی تھی حلوہ پوری اس دوکان کا شہرۂ آفاق تھا اور ۲۴ گھنٹے بکری رہتی تھی کستوری کا بیٹا جگن ناتھ مدت تک یہ کاروبار انجام دیتا رہا اس وقت چودہ روپیہ ماہوار پر یہ دوکان کرایہ پر اٹھتی تھی۔ اس دوکان کو ختم ہوئے چالیس سال ہوئے ہیں جگن ناتھ کی اولاد ڈالی گنج میں موجود ہے۔

یہی دو دوکانیں وہ ہیں جو ہولی اور نوروز کے دن مٹھائی کی کوٹھی بنانے کے موجد ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں پہل کس نے کی اور قدیم واقعات میں حالات کی خرید و فروخت تھی ان دوکانوں کا قصہ یادگار یہ ہے مصاحب حلوائی کے یہاں سیاہ لکڑی کا ایک حیرتناک مصنوعی سانپ تھا اس کے منہ پر رکھ دینے سے چڑیاں ڈر ڈر کے اڑ جاتی تھیں اور صانع نے لکڑی ایسے سخت عنصر میں ایسے مناسب جوڑ قرار دیئے تھے جس میں لچک پیدا ہوتی تھی

خیراتی کی دوکان پر ایک مرتبہ نوروز کے دن مٹھائی کی اس پراشنی کی تصویر ایک طرف ملکہ وکٹوریہ سر سے چادر اوڑھے ہوئے [illegible] اور دوسرے رخ کا ذکر اس روز کا شہسوار ہاتھ میں کوڑا، حکومت نے اعتراض کیا اور الزام عائد کیا کہ تم گستاخی ملکہ کا سادہ سامان رکھتے ہو اس وقت سے یہ نوبت ختم ہوئی

(نوٹ) کھلونے اور تاشے کی چوک پر بکری ہوتی تھی۔

نان بائی

عبداللہ مسجد تحسین کے روبرو عماروں میں اور معالی اکبری دروازہ کی سائڈ میں دو مشہور نان بائی تھے جن کی دوکانیں دو [illegible] بہت چلتی تھیں بڑے دلے سیات کے لئے چوک کا اہتمام اور اس کے خرید و فروخت کا عالم دوسری بانس کی منڈی گڑھے والی

سرا اور خود سرائے تحسین کا قریب ہونا مسافر اپنی قیام گاہ سے نکلیں اور کھانا کھا سکیں یا جائے قیام پر پہنچتے پہنچتے کھا پی لیں، مسافروں کا ہجوم ہوتا تھا اور نان بائی کو دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ مسافروں اور بازاری لوگوں کے ساتھ امیروں کے نوکر جو اپنے مالک کے لئے پسند کی چیزیں لینے آتے ہیں یا وہ گاہک جو کھانا گھر لے جاکر نوش کریں گے۔ نہاری کا پیالہ لئے جا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوکان پر ہر نعمت موجود ہے کتنی چیزیں فرمائش کے بعد تیار ہوتی ہیں اور تنور دن رات ٹھنڈا نہیں ہوتا شیرمال باقرخانی گاؤ زبان، گاؤ دیدہ، نان جیری، نان ٹیڑی، نان تنک، پھلکا، چپاتی، تورئی، پراٹھے، توے کے پراٹھے، شامی کباب، حقانی کباب، گولر کباب، نرگسی کباب، کوفتے، پسندے، مرغ مسلم، قلیہ قورمہ شش رنگ، دو پیازہ، تلی ہوئی اروی، یخنی پلاؤ مزعفر متنجن، دست پیچ، تیتر برنج یاقوتی سموسے، شب دیگ، نان حلیم، سیخ کے کباب، گولے کے کباب، سفیدہ بریانی، نان افلاطونی فرمائش پر تیار ملتا تھا۔ نان افلاطونی اس روٹی کو کہتے ہیں۔ جو پھول جانے کے بعد صرف چھلکا مریضوں کو ہلکا سمجھ کر دیں پلاؤ کی چالیس قسم اور ستیوں بھیے قرار دی ہیں۔ چوک کے نان بائی کا قاعدہ تھا کہ تنور سے پہلی روٹی اترے پر ایک آدمی کی خوراک مسجد بھیج دیتا عبد اللہ نان پز حسن کی پیرانہ سالی مجھے یاد ہے ٹرسٹ مسجد تحسین کے کامیابی مقدمہ پر جو ڈھول دیا تھا اس میں ایک پراٹھا تھا جس پر بادام اور پستہ جڑے ہوئے تھے میں نے آج تک اس کی نظیر کسی دسترخوان پر نہیں دیکھی۔ میاں میرے اس زمانہ کے کھانوں کو یاد کیا ہے؎

اب وہ محل رہے نہ وہ شہزادیاں رہیں — وہ بیش صدمتیں نہ وہ مغلانیاں رہیں
وہ لوری تندکی نہ وہ اب ماکیاں رہیں — نہ شیرمالیں خستہ نہ وہ آئیاں رہیں
ٹکڑے ہیں سوکھے ساکھے فقط نان بائی کے — وہ تر بتر طباق کہاں ہیں پلاؤ کے

آزادی کے حامیوں نے کارتوسوں کی طرح ڈبل روٹی کا بھی بائیکاٹ کرنا چاہا تھا کہ اس میں شراب ملی ہوتی ہے مجتہد العصر نے فتویٰ دیا کہ جب تک آمیزش ثابت نہ ہو پاک ہے۔

یونس عطار۔ عطار کے معنی در اصل تو عطر اور خوشبو بیچنے والے کے ہیں مگر بازار کی اصطلاح میں دوا فروش کو عطار کہتے ہیں جو طب یونانی کے نسخے اور پڑیا باندھے خطمی، بنفشہ، عرق بادیان، شربت عناب، شربت دینار، معجون کمونی، سکنجبین، زہر مہرہ خطائی غرض تمام یونانی دوائیں جہاں ملیں وہ عطار کی دوکان ہے بوتلیں قرابے مرتبان اچاریوں میں مرکبات تیار رکھتے ہوں۔ قرع انبیق سے عرق کھینچتا ہو تیل حنا اور دوسری ترکیبوں سے طلاء اور لیپ تیار کئے جاتے ہوں چوک کا نامور عطار یونس تھا پھر مجو صاحب نے فروغ حاصل کیا۔ ان کے کیسے لوگ کوئی تھانیدار، کوئی ڈپٹی کوئی قانون گو اب بھی ہیں پھر شیخ امید علی نے اس پیشہ میں بہت کچھ پیدا کیا اور رفتہ رفتہ ڈاکٹری دواؤں کے فروغ نے اس تجارت کو گویا ختم کر دیا۔ میر تقی میر کو عطار کی دوکان پر جاکر بجائے فائدہ کے سعدی والا روگ ستاتا تھا؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

آتش کہتے ہیں؎

وہ تنگ مشرب ہیں ہم جو خمخانہ افلاک میں — نشہ زر ہو پئیں گر شربت دینار کو

۱؎ گذشتہ لکھنؤ

... دروازہ میں ... اور تصویروں کا فریم بنانے والے کچھ جنرل مرچنٹ اور دوسرے قسم کی دوکانیں تھیں جو قابل ذکر ہیں ... کے چوکھٹوں میں خط نسخ و نستعلیق کے قطعات راہگیروں کے لئے نظر افروز تھے اور میر خادم حسین جواد حسین کی ... اور کشتی دار ٹوپیاں فروخت ہوتی تھیں۔ کلاہ گول چکن کلاہ سوزنی کلاہ چکن دوپلڑی کلاہ کشتی دار ریشم اور کلابتو کی ... کی دوسری دوکانوں پر دستیاب ہوتی تھی۔

اکبری دروازہ

یہ ... کا گول چوک کی پہلی بنیاد ... چوک کا تصور تو نوابی میں ہوا اور نوابی سے کچھ اوپر دو سو برس کی بنیاد ... اکبر ... تخت حکومت پر آیا اور ... میں موت کی نیند سو گیا۔ دوران سلطنت میں یہاں کا صوبہ ... دہلی میں رہتا تھا مگر ان کا نائب قاضی محمود ... یہاں کا باشندہ تھا اور اکبری دروازہ اسی بادشاہ ... دروازہ کو چوک کی آبادی کے لحاظ سے چوک کی آخری حد کہو۔ یہ دروازہ زمین کے نشیب و فراز کے لحاظ سے ... اس دروازہ سے ... میں ... واقعات رہاں ... کا تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ہے لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سزائے موت کے ... کی نوبت آتی تو مقتول کا سر اکبری دروازہ ہی میں لٹکایا جاتا غلام علی ... محمد الملک خاں اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

در وقت نواب ... مکان ... دیگر ... رنگ ... نمایاں ... کردہ دست کدا بر ... [1] ... تہدید و عبرت در اکبری دروازہ است[1]۔

یہ واقعہ عہد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ہے اور ... اکبری دروازہ کے نیچے ... ہے اس کو سرکٹا نالہ آج تک کہتے ہیں یہ تاریخی نوٹ تو بے شک بتاتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس جگہ مجرم کا سر کٹ کر دور ... ہوا ہو اور امرا اودھ نے اپنی حکومت میں اس روایتی حکایت کو باقی رکھا۔

... حسین خاں عظیم آبادی نے عہد امجد علی شاہ میں اکبری دروازہ کے بارے میں لکھا ہے یہ دروازہ بہت بلند اور کشادہ ہے ... واقعہ ہے ... شاہی مجرموں کو جو ... یا فتنہ انگیزی کے جرم میں قتل یا پھانسی کی سزا ملتی ہے وہ اسی بازار میں ... کئے جاتے ہیں اور ان کے سر کو دروازہ کی محراب میں لٹکا دیا جاتا ہے مملکت کے دیگر حصوں سے متمردوں اور مجرموں کے سر آتے ہیں انہیں بھی اسی دروازہ میں لٹکایا جاتا ہے تاکہ شہر کے لوگوں کے لئے باعث عبرت ہو چند قدم ... آگے ... اور شاں کا دوسرا دروازہ ہے ان دونوں دروازوں پر چھت پاٹ دی گئی ہے جس سے راستہ مسقف ہو گیا ہے۔ (نیا دور مئی ۱۹۶۰ء)

اکبری دروازہ میں دونوں طرف ... کی دوکانیں جن میں سلطنت سے آج تک مٹی کے کھلونے اور تصویریں فروخت ہوتی ہیں وہ دوکان ... سمت ... جس پر خوبصورتی سے مجسمے چنے ہوئے ہیں آدمی، جانور، پھل ترکاری ... دوکانات کی ... کونی کا ... کی تصویر ... لوہار کی دوکان، طوائف کا ناچ سارنگی ... سقہ مشک پیٹھ پر رکھے ہوئے ... بند ... بیمار ... یہ صنعت لکھنؤ کے سوا کسی شہر میں نہ ملے گی یہاں سے پیکٹ میں رکھ کر دور دور

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ... [2] ... ص ۱۲۲ طبع لکھنؤ۔

تحفہ میں لے جاتے ہیں ؎

نہ طفل ہی، نہ دلا موحسن صورت ہو — کھلونے مٹی کے کرتے ہیں بے شعور پسند (آتش)

مٹی کا دوسرا سامان بھی ان دونوں دوکانوں پر ملتا ہے صراحی کے پیالے اور روغنی چلم بڑے حقہ کے قابل یہاں سے خرید یہ کام اس قدر نازک، باریک اور خوبصورت ہوتا ہے کہ اگر چلم ٹوٹ جاتی ہے تو مالک کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ تمنا مرحوم کسی دوست کے حقہ کی چلم ٹوٹنے پر کمال تاثر سے کہتے ہیں ع ٹوٹی ہے مثل دل یہ چلم آہ آہ (۱۳۳۳ھ)، نجم الغنی مورخ اودھ کی وہ خامہ فرسائی جس سے نہ عوام خوش ہیں نہ خاص۔ اس فہرست الزامات میں یہ بھی ہے کہ سعادت خاں برہان الملک نے جب لکھنؤ پر حملے کا ارادہ کیا تو کئی مہینہ زین لوح کو لئے ہوئے اکبری دروازہ کے سامنے بامنجوب ٹھہرے رہے اور دعوت کے حیلہ سے تمام شیوخ کو جمع کر کے دسترخوان سے اٹھتے وقت حملہ کر دیا لوگ قتل ہوئے اور سرعت گرفتار ہوا لکھنؤ پر پہلے حملے کی سرگزشت شیخ محلہ کے ذیل میں آئندہ آئے گی۔ ناظرین انتظار کریں۔

بانس کی سرائے

دوکانات مسجد تحسین کے سامنے اس سرائے کا پھاٹک تھا۔ ایک محرابدار دروازہ سے قریب تھی جو اب بھی نئے لباس میں اچھی حالت سے موجود ہے اور دوسری مسجد سرائے کے آخری حصہ میں اگلی ساخت میں اب بھی موجود ہے۔ اس سرائے میں داخل ہو کر مغرب پچھم کی طرف ایک دروازہ تھا جس سے ٹھہرنے والے واپس ہوتے تھے اور یہ کوچہ غیر نافذہ سمجھا جاتا تھا اس سرائے میں زیادہ تر کابلی لوگ اترتے تھے جو ہینگ زعفران، مومیائی، پیروزہ، میوہ وغیرہ بیچتے تھے اور سودی روپیہ چلاتے تھے دس کے بارہ قرضداروں سے لینا ان کا کاروبار تھا۔ سیکٹری روڈ نکلنے پر یہ سرائے کھد گئی اور چوک کو وکٹوریہ اسٹریٹ سے ملحق کر دیا اس سڑک کے بعد مسجد تحسین کا دکھاؤ بازار سے بڑھ گیا۔

بانس کی سرائے نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بیچ کی سرائے کا ایسا چوبی پھاٹک رکھتا تھا صرف بلیوں اور بانس سے دروازہ بنایا تھا اور ضعیف امکان یہ ہے کہ بانس کی سرائے نام قرار پانے کی وجہ یہ ہو کہ بانسواڑہ جس کا تاریخ اودھ اور آثار قدیمہ میں بار بار ذکر ہے یہی آراضی ہو۔

مطبع ولی محمد ۔ عہد شاہی کے چھاپہ خانوں میں مطبع حاجی ولی محمد مشہور پریس تھا جس کے مطبوعات دیدہ زیب اور صحت وطباعت کے لحاظ سے ممتاز رہتے ایک وقت یہ مطبع بانس کی سرائے میں تھا چنانچہ تحریر الشہادتین ایک کتاب اس پریس کی چھپی ہوئی میرے کتب خانہ میں ہے جس پر عبارت لکھی ہوئی ہے "مطبع ولی محمد چوک قدیم لکھنؤ متصل دروازہ سرائے بانس قدیم آثار میں ایک مکان باقی ہے جس کے درجے امام باڑہ کی طرح ہیں اور اس میں تمباکو خوردنی کا کارخانہ ہے۔

مزار اصفہانی

اکبری دروازہ سے بڑھ کر سیکٹری روڈ کے بائیں گوشہ میں بلندی پر ایک چھوٹی سی مسجد اور صحن مسجد کے پچھم کی طرف وہ محراب ہے جس کے بالائی حصہ خانۂ خدا کی نگہبانی میں شہید مرد کی قبر ہے۔ سڑک نکلنے سے پہلے زمین تعویذ قبر کے برابر بلند تھی۔ سیکٹری روڈ نے قبر کو بلندی پر پہونچا دیا اور لوح مزار کو بجائے سطح قبر کے حصہ زیریں میں نصب کیا غربی محراب پر ہار چڑھانے کا طاقچہ اور ایک تختہ ہے جس پر یہ لکھا ہے۔

"دوست محمود ولد عوض علی اصفہانی در ملک ماسواڑہ تعمیر شد۔ در سن یک ہزار و یک صد و یک" ایسا معلوم ہوتا ہے یہاں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا چنانچہ اس قدرے جواب میں دو [illegible] ابھی کچھ پرانی قبریں موجود ہیں جن کو سڑک نے بیچ و راست چھوڑ دیا ہے۔ سڑک مذکور کی تعمیر تو [illegible] اور [illegible] آدمیوں نے دیکھا کہ مست کھن پوشش موجود ہے اور خوشبو تیز پھیل رہی ہے جنگ ماسواڑہ [illegible] قتل دو شخصوں کے دست و گریباں ہونے سے واقع نہیں ہوا بلکہ [illegible] کا تصور [illegible] ذکر ہے اور یہ واقعہ آخر عہد اورنگ زیب کا ہو سکتا ہے [illegible] ذرائع نہ تھے اس لئے یہ رجحان ہوتا ہے کہ ماسواڑہ شاید یہی جگہ تھی [illegible] اکبری گیٹ تک بانس کا جنگل تھا آخری [illegible] چراغ سلطنت [illegible] تاریخ میں [illegible] ماسواڑہ آتا ہے کے قریب ماٹی لوگ تیر [illegible] آگئے تھے [illegible] کے نام بندوبست کر دیا۔ ان کے بعد اس علاقہ کا ناظر [illegible] علی خاں اور [illegible] کو منتقل ہو گیا۔ کئی بار عہدہ داری [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ ماسواڑہ محمود آباد سے قریب ہے اور وہاں سے سیدھا [illegible] واضح نہیں ہوا کہ ماسواڑہ کہاں تھا۔

حمام کی گلی ۔ اکبری دروازہ [illegible] حمام کی گلی مشہور ہے اور کہیں نہ تو تاریخ سے حمام کا پتہ ہے نہ آثار قدیمہ سے [illegible] عمارت تک پہونچ کر باغ میں راستہ کو پہونچاتی تھی اب یہ راستہ بند ہے اور آثار قدیمہ میں [illegible] ایک چھوٹی عمارت [illegible] باقی ہے جس شخص کی اولاد زندہ نہیں رہتی اس کے پیدا شدہ بچے کو [illegible] قرار دیتے ہیں اور یہ ٹوٹکا عورتوں میں تیزی سے مقبول ہو رہا تھا۔ نواب [illegible] ایک [illegible] کی مسجد میں [illegible] مرزا صاحب جو بڑے منطقی مگر تنگ مزاج آدمی تھے خود طہارت میں مصروف رہتے تھے ۱۹۱۵ء کے بعد یہ مسجد محلہ کے مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ اس محلہ میں کچھ ڈھاڑی اور ایک چوہدری رہتے تھے جن کا مکان مسجد سے ملا ہوا تھا [illegible] آخری شخص تھے [illegible] نواب بندگا کا بھی یہی محل سکونت تھا۔

نواب بندگا: ۔ رؤسا کے مزاج میں عموماً بٹ اور مرد اتکی ہوتی تھی ان کو سلام [illegible] سلام کے جواب میں اگر کوئی بندگی کہتا تھا تو لفظ میں تانیث کی جھلک معلوم ہوتی تھی اس لئے ان کے زمانے میں بندگی کو بندگا کہا گیا اور اس وقت کی [illegible] کے مطابق ان کا نام ہو گیا۔ لکھنؤ میں سلام کی جگہ آداب تسلیمات اور کبھی تسلیم کورنش [illegible] آداب عرض ہے یا فقط تسلیمات لفظیں استعمال ہوتی تھیں ۔ سلام علیکم کا رواج فقط علماء میں تھا۔

لکھنؤ میں کتنے مقامات ایسے آئیں گے جہاں حمام کا اب بھی کچھ [illegible] مگر یہ گلی مرقومہ بالا خصوصیات پر حاوی ہوتے کے حمام کا نشان بھی نہیں بتاتی ۔

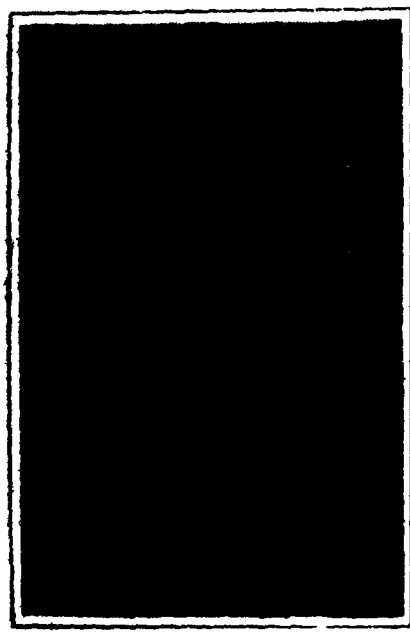
حمام :۔ حمام کے لئے حوض ٹھنڈے اور گرم پانی کے علیحدہ علیحدہ برگرم پانی کا چھوٹا حوض جس میں شدت حرارت سے اترنا ناممکن ہو اس کے

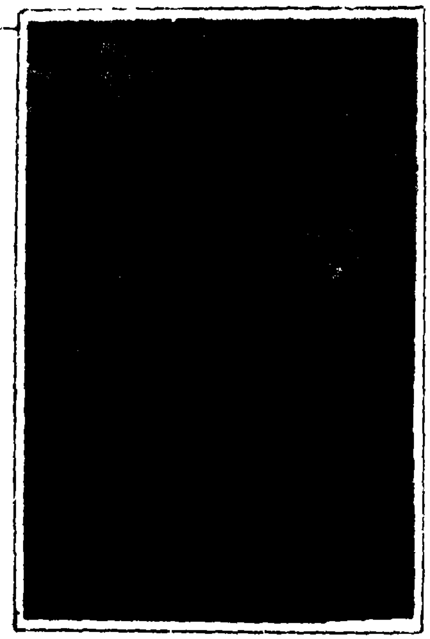
---

[1] احسن التواریخ ص۳۱۱ [2] ص۳۱۱ [3] احسن التواریخ ص۳ [4] ص۳

بیچ آہنی توا اور آگ کی بھٹی جس کا منہ بیرون دیوار۔ اندرونی حصے کے سامان میں کھڑاویں، لنگیاں، تولیے، جھانویں، کھیا، بیسن سامان حسب ضرورت اور اس گرم حجرے سے جہاں ہوا کا کہیں گذر نہ ہو نکل کر جامہ خانہ آنا۔ وہاں شیشوں سے روشنی اور معتدل فضا، چٹائی لنگی اتارنے کی جگہ اور سوکھی لنگی پہن کر فرش پر قدم رکھنے کی چوکی، سامنے کی جس میں آئینہ لگی اور کھونٹیوں کا ہونا ضروری، حمامی جو مستت مال بھی کرنا جانتا ہے یہاں پہونچ کر صاف کپڑے پہن کر بھنوائی لے گا اور حمام اگر گرم نہ ہو تو حمام نہیں الٹ کہتے ہیں ؎

آگیا تیری رضائی میں پسینہ مجھ کو   گرم ایسا بھی نگوڑا کوئی حمام ہو نوج







دوسرا باب

از محمود نگر تا چھاؤنی حسین الدین خاں

گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا کہ قاضی محمود خاں کو نواب ۔۔۔ نے ۔۔۔ دار قرار دیا تھا اور وہ بحیثیت حاکم لکھنؤ میں افسر تھے محمود نگر انہیں کا بسایا ہوا محلہ ہے اس محلے میں غازی الدین حیدر بادشاہ کی بیگم حسنی خانم سرفراز محل رہتی تھیں۔ غدر سے پہلے بیگم کا قیام یہیں محلہ میں ہوا کرتا تھا ۔۔۔ عمارت ۔۔۔ کو ۔۔۔ قصد کیا تو سرفراز محل نے محمود نگر میں ایک عالیشان عمارت بنوائی اور ۱۸۰۷ء ۔۔۔ کی عمر ۔۔۔ اتفاقیہ موت ۔۔۔ ہر سال میر مونس نے ان کے چالیسویں کی مجلس پڑھی الفت ۔۔۔ دیکھو مرے ۔۔۔ کرے گا۔ یہ محل سرا اب باقی نہیں ہے مگر سرفراز محل کا وہ روپیہ باقی ہے جو انہوں نے کربلائے معلی اور نجف اشرف میں بانٹنے اور تعلیم کے لئے وقف کیا تھا عراق میں "خیریہ اودھ" اس فنڈ کا نام ہے اور مرد و عورت طالب علم اور مسافر اس رقم سے پرورش پاتے ہیں یہاں ۔۔۔ کے ایک کامل ۔۔۔ میر فضل علیؒ رہتے تھے جن کا نام تاریخ میں موجود ہے۔

مطبع مصطفائی ۔ عہد شاہی کے بہترین چھاپہ خانوں میں مصطفائی پریس تھا جو محمد مصطفےٰ خاں ولد حاجی روشن خاں کے اہتمام سے جاری تھا اس پریس کی مطبوعات زیادہ تر درسی کتابیں ہیں جو کتابت چھپائی کے لحاظ سے کیا کہنا۔ لٹریچر پر مطبع کا ذکر ان الفاظ میں ہے

"مدینت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر ۔۔۔ اکبری دروازہ طبع شد ۔۔۔ لکھنؤ محلہ محمود نگر میں اکبری دروازہ کے پیچھے چھپ کر تیار ہوا
مصطفےٰ خاں شیشے کے بڑے تاجر تھے پتھر پر معکوس لکھنا انہیں کی ایجاد ہے اصلاح سنگ کو فروغ بھی مصطفےٰ خاں نے دیا۔
مصطفےٰ خاں کی جانب انگریزوں سے ملاقات میرے نزدیک صحیح نہیں۔

مصطفائی مطبع پر محمد ۔۔۔ کسی عالم کے حاشیہ بھی ہیں جو مردِ خاص تھے بڑے سلیقہ اور انتہائی خوبصورتی سے یہ مطبع اپنے فرائض انجام دیتا تھا ۱۲۵۹ھ میں اس مطبع کے فروغ کا زمانہ تھا عبدالعزیز ۔۔۔ پر جاتے ہوئے ۔۔۔ کی ٹھیکی کے پاس جو لکھوری اینٹوں کی دیواریں باقی ہیں اس ۔۔۔ حصہ میں یہ پریس تھا۔

مطبع مرتضوی ۔ عہد شاہی کے علم اور زمانہ میں جا بجا مطابع تھے اور لا تعداد عالم فاضل عربی فارسی کے فروغ میں مصروف تھے مطبع مرتضوی کو محمد نصیر الدین دہلوی نے اس محلہ میں جاری کیا تھا لٹریچر پر پتہ یہ ہے "محمود نگر متصل چاہ سرخ" اب لال کنویں کا تو کہیں پتہ نہیں ہے

۱؎ گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۹۱ مؤلفہ عبدالحلیم شرر و قدیم ہندوستان اودھ

پریس کے کاتب مولوی الٰہی بخش تھے جن کا نسخ و نستعلیق دیکھنے کے قابل تھا مولوی محمد صالح شوق کاپی کی صحت کرتے تھے ان کا منظوم کلام اس قطعہ تاریخ میں واضح ہے ؎

گشت چو میر قطبی ز نصیر الدین طبع — شوق پرسید چو سالش ز خرد گفت شوق
عرض احسنت شد از کل و جزی مسموع — ہن مطلق شد از میر بہر دل مطبوع
۱۲۶ھ

اس پریس کا وجود سنہ ۱۳۱۱ھ تک تھا چنانچہ سلم الافلاک سہ مذکور کی طبع شدہ جو میرے سامنے ہے اس میں یہ عبارت درج ہے۔

فی البلدۃ المشہورۃ بالکھنؤ محمود نگر حفظ اللہ عن الضرر والفتن ۔

تکیہ ۔ اس محلہ کے آثار قدیمہ میں مذکورہ بالا دیوار اور ایک چھوٹا سا قبرستان باقی ہے جو ۱۲۱۹ھ عہد نواب سعادت علی خاں میں مرزا انور بیگ خاں خلف مرزا مغل بیگ خاں نے اپنے کنبے کے دفن کے لئے محدود کیا تھا دو پرانی مسجدیں ہیں ایک قبرستان سے متصل دوسری شہر دیوار کے آثار ہیں۔

امام باڑہ حیدری ۔ یہ وہ امام باڑہ ہے جس کو حیدر خاں طوائف نے آخر عہد واجد علی شاہ میں بنوایا تھا جب تعزیہ کے بعد کسی دن اتوار کو یہاں ایک محفل سرود بڑی دھوم سے ہوتی تھی اس وقت امام باڑہ ذاتی استعمال میں اور مقفل رہتا ہے۔

کلن خاں ۔ محمود نگر کے رہنے والوں میں عہد واجدی کے کلن خاں غدر کے بعد مرے وہ معمولی پتھر کے دانہ کو صاف کر کے ایک سوا ایک دانہ کا کنٹھا بناتے تھے جو ان کے ہاتھ میں رہتا تھا جس نے دیکھا وہ یہی سمجھا کہ سلیمانی پتھر ہے بڑے بڑے جوہری پہچان نہ سکتے تھے وہ ویلکا ایسا بناتے تھے کہ ماہران بھی دھوکا کھا جاتے تھے سیکڑوں دو پلکے بیچے کہ کر بیچے بمبئی والوں کو منہ توڑ دیا بے مثل کاریگر تھے دو دو تین نگینہ کو کئی رتی کا سا کر بیچ لیتے تھے۔

قائم علی بھانڈ ۔ عہد واجد علی شاہ کا باکمال نقال تھا جو اسی محلہ کا رہنے والا تھا نواب علی نقی خاں مع اپنی زوجہ کے قائم کی نقلیں دیکھنے آئے ۔ ان معززین کو دیکھتے ہی قائم سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحب کو قائم رکھے۔ نہایت مختصر تھا مگر انعام دینے کے سوا چارہ نہ تھا ۔ قائم کا کمال یہ تھا کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک نہ ہنساتا رہا ۔ ہر دفعہ[۱] کا موضوع دوسرے سے جداگانہ تھا۔

نواب حیدر خاں بنگش ۔ پہاڑی ملکوں کے رہنے والوں کو بنگش کہتے ہیں دہلی میں بل بنگش ایک مقام اب تک ہے آپ فرخ آباد کے پیدا شدہ عہد سعادت علی خاں میں لکھنؤ آئے شہسواری میں کمال رکھتے تھے کیسا ہی گھوڑا کیوں نہ ہو بغیر کانوں کے فوراً سوار ہو جاتے تھے ان کی قوت کا یہ عالم تھا کہ دو زبردست جوانوں کے سر ٹکرا کر دونوں کو مار ڈالتے تھے کاسہ سر چور ہو جاتا تھا آپ کا معمول تھا کہ زور ورزش کے بعد لوٹا بھر دودھ ایک سانس میں پی جاتے تھے وہ تانبہ کا لوٹا مؤلف قدیم نے خود دیکھا اس پر لکھا ہے

"حیدر خاں سنہ ۱۲۶۱ھ یہ زمانہ عہد امجد علی شاہ کا ہے لوٹے کا وزن ڈھائی سیر درچھ سیر تین پاؤ آدھی چھٹانک پانی اس میں آتا ہے"

حیدر خاں غدر ۱۸۵۷ء میں مع اپنے اکلوتے نوجوان فرزند کے جن کا نام محمد عسکر خاں تھا کاکوری روڈ[۲] پر قتل ہوئے۔

مطبع چشمہ فیض اس محلہ کا آخری پریس تھا سنہ ۱۲۹۶ھ میں نادر حسین خاں نے یہ چھاپہ خانہ جاری کیا۔ عطائی نامہ اس پریس کا

---

[۱] قدیم نمبر ۱۹   [۲] قدیم نمبر ۸۲   [۳] قدیم نمبر ۱۷۷

مقبرہ میرے سامنے ہے۔

سر کٹا نالہ

اس نام سے اکبری دروازہ کے بعد ایک محلہ آباد ہے اور آدھے شہر کا گندا پانی نالیوں سے ہو کر یہاں گرتا ہے حکیم عبدالعزیز روڈ نے اس شہر کو رونق بخشی ورنہ دن کو سنسان رہتے تھے محلہ کی آبادی کی پہلی بنیاد یہ سڑک ہے اور شہرت کا اس پہلو سے وہ خان بہادر احمد حسین تھے جن کے مقامات، دکانیں، کارخانہ تمباکو عہد شاہی کے مکانات اور ایک قبرستان کھیت کی جگہ ہے اور گندگی بڑی حد تک دور ہوئی۔ کارخانہ تمباکو کی پشت پر اس نالہ کی جو شاخیں یہاں سے کالی جی کے مندر تک گئی ہیں وہ دونوں طرف سے خام زمین ہونے کی وجہ سے عموماً پست طبقہ کے مکانات، جھونپڑے، کھپریل میں رہنے والوں کے حاصل ہو کر رہ گئیں۔

سرکٹا نالہ اس وقت ایک چوراہا ہے ایک راستہ گومتی میرآئیں کی طرف اور دوسری راہ محمود نگر کی طرف اور ریلوے سے کے رخ پہ سینٹری روڈ اور جنوبی پہلو میں چوپٹیوں کی سڑک ہے یہاں چونکہ شہر کی پستی اور بلندی کا کامل فیصلہ ہوتا ہے کیننگ اسٹریٹ سے وکٹوریہ اسٹریٹ پست واقع ہے اور وکٹوریہ اسٹریٹ سے چوک نیچے ہے اور چوک سے آگے چوپٹیوں سے بلندی پر ہے برسات میں نالہ کا زور اور پانی برسنے وقت خطرناک بہاؤ ہوتا ہے

نوابی سے چوک شہر کا سینٹر تھا اور سزائے موت پانے والے مجرمین کا سر قلم کر کے عبرت کے لئے اسی علاقے میں لٹکایا جاتا تھا۔ اس لئے سرکٹا نالہ مشہور ہوا۔ مشہور ہے کہ پہلا سر بیہا ماسی کا جو ایک قول کی سابرڈ کا تھا عہد اکبری میں اکبری دروازہ میں لٹکا تھا اور بادشاہوں میں یہ قانون بن گیا کہ سر اسی دروازہ میں آویزاں ہو۔ ظریف کہتے ہیں ؎

تماشہ کسی کی تیغ ہو اور اپنی گردن ہو   پھر اس کے بعد یارب سرکٹے نالے میں مدفن ہو

سید کا اکھاڑہ ۔ لکھنؤ کے نامی پہلوانوں میں دو بھائی چھوٹے سید اور بڑے سید گزرے ہیں نالہ پر پچھم کی سمت ان کا اکھاڑہ تھا جس سے سیکڑوں ہندو مسلم ورزش کر کے پہلوان بن گئے۔ اس اکھاڑے کے نزدیک مسجد ... اب بھی کچھ کچھ نشان باقی ہیں یہ دونوں کشتی کے فن میں اپنے زمانے کے چار سورج تھے

بڑے سید چھریرا بدن میانہ قد ملا کے پھرتیلے اور کھیر لگانے میں طاق ان کی پہلی کوشش میں دیوپیکر پہلوان زمین پر جم نہیں سکتا تھا نواب امیر حسین ماترہ جو رئیس ریاست اور شہر کے دوسرے رؤسا ان کے قدردان تھے بڑے سید ادھیڑ عمر سے پہلے مر گئے چھوٹے سید دراز قامت تنومند اور صورت سے پہلوان معلوم ہوتے تھے ان کے داؤں پیچ میں بھی چھوٹے بڑے کا فرق تھا بڑھاپے تک زندہ رہے آخر میں اونچا سننے لگے تھے اور یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو وہ بھی ملک عدم کی راہ چلے گئے اخبارات نے ان کی موت پر نوٹ لکھے ؎

کہیں اکھاڑے ہیں کرتے ہیں پیچ کشتی گیر   کہیں ٹھوک ٹھوک کے خم لڑتے ہیں جواں سے جواں

احمد حسین تمباکو والے ۔ یہ کارخانہ اپنی دیانت داری کی عمدگی اور ... سے تمام ملک بھر میں مشہور اور مقبول ہے تمباکو سازی کا فن اصغر علی محمد علی کی فرم کا ایک جز تھا خان بہادر موصوف نے جب اس کو اپنایا اور تجارت میں انفرادی صورت اختیار کی تو چپہ چپہ میں یہ تمباکو مشہور ہو گئی بانی کارخانہ جو رئیس ہوئے انتقال کیا اور تاریخ وفات اس مصرعہ سے ظاہر ہے ع

سوئے سعدی رفت تمباکو فروش   ۱۹۵۵ء

میر نیولا :- مرکٹے تلے پر ایک دبلے پتلے لانبے غریب شخص رہتے تھے جن کو ان کے اعزا اندام ہونے سے لوگ میر نیولا کہتے تھے یہ بیرونے میں لکھنؤ کی آخری فرد تھے چہلم کے پہلے یا بعد ایک مجلس کرتے تھے جس میں ان کے احباب کا ہجوم ہوتا تھا لکھنؤ میں انسان کی شہرت کا مدار کسی رمز گی پر تھا لوگوں کو مدعو کیا اور کوئی پھبتی ہوگئی نام لوگ بھول گئے۔

خاندان برچھیت :- نیزہ باز کو لکھنؤ میں برچھیت کہا جاتا تھا اور برچھا عموماً پیادہ اور سوار دونوں چلاتے تھے بعض صاحبان فن نے اس لڑائی کے لئے اونٹ کی سواری قرار دی تھی۔ چنانچہ بیکانیر کے شتر سواروں کی نیزہ ماری کا جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں اخبارات میں تذکرہ آچکا ہے۔ سلطنت اودھ کے ابتدائی دور میں میر محمد علی عرف میر کلو زبردست برچھیت تھے ان کے چھوٹے بھائی میر احمد علی بھی استاد فن تھے یہ لوگ نواح لکھنؤ میں موضع خیرلیہ کے رہنے والے تھے اور خراسانی سید تھے جار قیام کی وجہ تسمیہ خیرلیہ اسی لئے تھی کہ وہ مہاجر خراسان سے آکر بسے تھے اور آصف الدولہ بہادر کی سلطنت میں ان کے قدم پہلے یہاں آئے۔ عہد نواب سعادت علی خاں میں کمالات نے معراج کمال پر پہونچایا اور مصاحبت کی عزت حاصل ہوئی اس شالوطری دشتہسواری اور نیزہ ماری میں ان کا جواب نہ تھا نواب سعادت علی خاں فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں صرف ۲½ سوار ہیں پہلے وہ خود دوسرے میر کلو اور آدھے آغا ابو نصیر جو نواب کے بھانجے تھے۔

دہلی سے ملک نیز اشہسوار جب مقابلے کو لکھنؤ آئے تو کمالات کے مظاہرے میں میر کلو ان سے برتر ثابت ہوئے اور شکست دے کر لکھنؤ کی دہلی پر فضیلت ثابت ہوئی اور خلعت فاخرہ اور خصوصی انعام واکرام سے وہ سرفراز ہوئے۔

دوسرے مقابلے میں ان کے بھتیجے میر برکت علی نے یاسین خاں دکھنی کو نیزہ ماری میں شکست دے کر نام کیا۔

میر کلو لاولد تھے ان کے بھائی میر احمد علی کے تین بیٹے تھے میر کاظم علی برچھیت اور میر ہدایت علی و میر برکت علی یہ سب نوابین و سلاطین اودھ کے مقرب اور مصاحب تھے میر کاظم علی مرکٹے تلے پر رہتے تھے اور لکھنؤ کے ہر طبقے میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ میر ببر علی انیس بھیکتی میں میر کاظم علی کے شاگرد رشید تھے مع " اک طول عمل ہے نیزہ حلی کا ہلا ما " انیس کے تاثرات کا آئینہ ہے۔

میر کلو صاحب کے سلسلے میر احمد صاحب برچھیت ریاست امہوڑا ضلع فیض آباد میں نوکر تھے اور ذاتی کمالات و نسلی خصوصیات میں قابل فخر تھے۔ امہوڑا، فیض آباد اور گورکھپور کی سرحد پر پانچ لاکھ کی ریاست تھی میر احمد صاحب کی اولاد کا ذکر نو ہے کے پل پر پہونچ کر ملے گا۔

مشرقی فنوں میں ورزش کے بھی اچھے اچھے طریقے تھے اور کثرت کرنے والا نوجوان کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا تھا مگر استاد کی نصیحت تھی کہ دشمن سے پہل نہ کرنا۔ ایک کامیاب طریقہ لڑنے کا "باندرا" تھا جس میں تین لٹھ او پہلا ور ایک پیچھے لگا رہتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے جتھے دشمن کے شکست کھا جاتے ہیں لکھنؤ میں اس فن کے ماہر تھے اور سادات گوپال پور ضلع سارن نے اس فن میں خاص کمال پیدا کیا تھا۔

ایک اور طریقہ لڑنے کا یہ تھا کہ جب چاقو لے کر نکلنا ممنوع ہو لاٹھی ناجائز ہو، ہتھیار ساتھ نہ ہوں اس وقت مخروطی شکل کی دو لکڑیاں شیشم کی اپنے ہاتھ کی مٹھی کے برابر کھرادی سے تیار کراؤ اور وہ بالکل اوسط شکل کی گاجر کے برابر ہوں اس کی نوک سے ماہر فن صفوں کو چیرتا ہوا مجمع سے ریلے سے نکل جاتا ہے اس فن کے آخری جاننے والے مرزا مظفر حسین مرحوم جوہری تھے مو صوف نے

کی کمرادیوں سے نقش امن کے زمانے میں اپنی حفاظت کے لیے حویلی تیار کرائی تھی۔

ناظم علی رفوگر ۔ رفوگری کا فن لکھنؤ میں کشمیری شال کے ساتھ ساتھ پہونچا اور یہاں ایک سے ایک بہتر رفوگر تھا جو کپڑا اگلے پے کپڑوں پر داغ دھبوں کی بہترین مرمت کیا کرتے تھے چوک میں کئی رفوگر تھے مگر سر کٹے نالے کے ناظم علی پستہ قد لاغر بارک اندام فن بہت بڑے شخص تھے جو صرف روئی ہی [illegible] رہتے تھے مگر کپڑوں اور رنگتیاں کھلتے ہوئے دوست لے جاتے تھے اور رنگ میں رنگ ملا دیتے تھے حوالہ [illegible] ۔

اس حلقے کے مشہور لوگ

لوگوں میں "محلہ محمود نگر" [illegible] کو ملا کر کے [illegible] لوگوں کے نام ملتے ہیں حکیم محمد علی صاحب، حکیم میر عابد علی صاحب، حکیم سید محمد خاں [illegible] صاحب، میر [illegible] حسین صاحب، میر محمد شاہ صاحب، میر ابوالحسن صاحب، سید مرتضیٰ صاحب خادم حسین خاں صاحب، [illegible] عنایت علی صاحب، میر محمد [illegible] صاحب، [illegible] میر بادی حسین صاحب، میر باقر علی صاحب رسالدار حیدر علی خاں [illegible] پہلوان

چوپٹیاں

کئی نالوں کے بیچ میں ہونے سے اس محلے کو چوپٹیاں کہتے ہیں۔ [illegible] کا نالہ کاظمین [illegible] چوک گزرتا ہوا معرلی لکھنؤ سے دریا میں گرتا [illegible] مختلف [illegible] تھے جن میں کچھ [illegible] نہیں

کنکوے کا ایک میدان ۔ ۱۹۰۵ء میں چوپٹیوں [illegible] کنکوے کا شوق ہوا اور دوستوں سے میدان تھا کنکوے [illegible] آدھ پاؤ ڈور ایک ایک پیچ میں صرف [illegible] کی کنپ کٹ گئی اس کا چہرہ فق ہو گیا جس سے کاٹا وہ فتحمند مسکراہٹ [illegible] توڑ لیا [illegible] ہو گیا چند لمحے دوڑ پڑے دو سوالیاں دیں [illegible] بارہ دری [illegible] ۔ آس پاس کے رہنے والوں کی زندگی تھی [illegible] کنکوا [illegible] چوپٹیوں سے صدا آئی "تمنا کا پیچا تھا" [illegible] اپنے دادا کے مکان میں [illegible] رہتے تھے [illegible] سکرپٹ مرتبہ [illegible] یہ شعر موزوں کیا ہے

بیچ آیا ہے کالوں کالوں میں ۔۔۔ عمل کٹیا [illegible]

لکھنؤ کے [illegible] محمد [illegible] طبیعت موزوں ہے وہی ہوا مجاور جس تمنا جوان ہوتے ہوتے آسمان کے ستارہ ہو گئے

دل آرام کی بارہ دری ۔ یہ چوپٹیوں کی وہ تاریخی اور مشہور عمارت ہے جہاں میر [illegible] علی عہد شاہی کے ایک مرد پیر میر انیس کے پڑھنے کی سالانہ مجلس [illegible] کرتے تھے۔

عہد شاہی میں بارہ امام چہاردہ معصومین کی پیدائش اور شہادت کی تاریخوں پر جو مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں وہ تو درگاہ و دعا نیز امام منہدم ہو جانے پر درہم برہم ہو گئیں [illegible] شہادت کو منانا [illegible] دیا اور

[illegible] لکھنؤ، جلد اول ملفوظات

دل آرام کی بارہ دری میں اس تاریخ مذہبی اجتماع ہوتا رہا عمارت غیر مسلم ہاتھوں اور ملکیت کی تعمیر مگر ہندو مسلم دونوں شریک تھے کہ یہاں مدت دراز تک مجلس ہوتی رہی اور اس مجلس میں میر انیس کے پوتے تک پڑھی۔ بیچ میں یہ مجلس ۱۹۳۱ء سے ہیبتناک بارش میں عمارت مخدوش ہو جانے سے امام باڑہ ممتاز العلماء میں آئی اور میر انیس کے پوتے سید خورشید حسن عرف دولہا صاحب کا تمام فروغ کلام اس منبر سے ہوا۔

دل آرام کی بارہ دری میں صحن کا ایک حصہ سیکڑوں کی تعداد میں کایستھ اور دیگر غیر مسلم علم دوست اساتذہ فن کا ہوتا تھا جو بڑی خوشی سے مجلس میں آتے تھے میں نے لکھنؤ کا جو مٹا ہوا دور اس بارہ دری کی مجلس میں دیکھا اس وقت تک میر مصطفیٰ حسین تعلقہ دار مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی، سید آغا حسن بیرسٹر زید پوری، میر حامد علی صاحب رائے بریلی اور اکثر جانے کہاں کہاں کے شائقینِ مرثیہ گوئی پہلے سے آتے تھے اور محویت میں دادِ سخن دیتے تھے۔ یوں تو لکھنؤ میں ہر شاعر کے زیرِ منبر اس کے شاگرد بالخصوص اور حلقہ اثر تعریفیں کرتا تھا مگر ۲ رجب کی مجلس میں دولہا صاحب کی شان میں پورا شہر اجتماعی حیثیت سے داد دیتا تھا۔ گرد و نواح کے دیہاتوں سے لوگ سمٹ آتے تھے اور سال بھر کے بعد دل آرام کی بارہ دری قلوب کو راحت پہونچاتی تھی مجھ سے کئی مستند اور معتبر بیانات میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔

<u>میر نفیس</u> :۔ مرثیہ پڑھ رہے ہیں صاحبزادگان ریبٹ کا حال ہے میر اولاد حسین صاحب تعلقہ دار کنتور جو انیس و مونس کو دیکھے ہوئے تھے سرکار سے اندر سے شہ نشین میں بیٹھے ہیں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ بارہ دری بالکل امام باڑہ کی ایسی ساخت اور پہلے دالان شہ نشین کا ایسا ہے۔ منبر پر میر نفیس نے جب یہ بیت پڑھی ؂ ستم شعاروں کو گھیر گھیر کے مارا

تعلقہ دار صاحب نے کہا مصرعہ نہیں کھلا ان کو اتنے بڑے شخص پر تنقید میں تکلف نہ ہوا اور آواز اس قدر بلند تھی کہ مجمع نے بھی سنا اور میر صاحب کے کان تک میں صدا گئی۔ اس نقد و نظر کے بعد زیرِ منبر کے لاتعداد حاضرین کی نگاہیں میر اولاد حسین تک اٹھیں اور میر اولاد حسین نے کہا کہ دیکھو میں اس مصرعہ کو پڑھتا ہوں اس ولولہ اور شان سے مصرعہ پڑھا کہ پوری مجلس قابو میں آگئی اور سامعین کو زیر و زبر کر دیا۔ میر صاحب مجمع کی اس بے وفائی کو دم بخود دیکھتے رہے جو مجمع ان کے قابو میں تھا وہ اب غیر کی طرف ہے۔ جب میر اولاد حسین مصرعہ ادا کر چکے تو میر صاحب نے فرمایا۔ اچھا اب مجھے دیکھئے پھر اس مصرعہ کو اس ٹھاٹھ سے ادا کیا کہ مجمع کا جو حال تھا وہ نہ پوچھئے میر اولاد حسین نے اپنی جگہ سے کہا ——— "آج تو آپ نے بڑے میر صاحب کو یاد دلا دیا"

میر نفیس نے جواب الجواب میں صرف نگاہیں نیچی کر کے کہا ——— "ادنیٰ کو اعلیٰ سے کیا نسبت" سامعین کو اس معمہ کے حل میں رہے دیا کہ ادنیٰ کون ہے اور اعلیٰ کہاں ہے۔ یہ بیت نفیس کے اس مرثیہ کی ہے جس کا مطلع ہے ؏ ہاں صبح کا جب چرخ پہ جلوہ تھا پورا سند یہ ہے۔

عون و محمد کی جنگ

اُدھر تو اُس نے دبا کر پرے کئے مسمار ؂ اِدھر سے رول لیا اس نے فوج کو یکبار
وہ سوئے میمنہ پہونچا علم کئے تلوار ؂ یہ میسرہ پہ اڑاتا ہوا گیا رہوار
عنا میں تازیوں کی پھیر پھیر کے مارا ؂ ستم شعاروں کو یوں گھیر گھیر کے مارا

اس مجلس میں عمائدین بہادر نواب سید محمد مہدی حسن صاحب رضوی اور مولانا سید ناصر حسین مجتہد، سید محمد الیاس بیرسٹر لکھنؤ کی
[illegible] افسوس ہے کہ اولیٰ الذکر بہرہ ور ناقل ہی جو روایت و درایت کی جان تھے نہ رہے۔
[illegible] نے ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق [illegible] انتقال کیا

چوپٹیوں کا بڈھا:۔ محاورات اہل لکھنؤ میں اگر کسی مرجھائے ہوئے بوڑھے کو دیکھیں تو کہتے ہیں کہ چوپٹیوں کا بڈھا ہے اگر کسی دبلے پتلے بڈھے جس کی ہڈی پسلی دکھائی دے تو کہا جاتا ہے کہ چوپٹیوں کا بڈھا ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ اگلے زمانے میں یہاں ایک بڈھا جس کی سن ایسی داڑھی اور بڑھاپا جیسے ایسا بڈھا ان کہ بڑی عمر گزار گیا تھا۔ محرم میں بڑے شوق سے تعزیہ رکھتا تھا اور رمضان میں ہوئی شب ماہ تو روزہ رات بھر جاگ کر بسر کرتے تھے اس کے مرنے پر محلہ کے مسلمانوں نے اس کی طرف سے تعزیہ رکھنا شروع کیا اور یہ عقیدت کی کہ بڈھے کی تصویر بنا کر حجرہ میں رکھ دی عوام نے اس کی یادگار ہوتے دیکھ کر اس کام کو قدر کی نظر سے دیکھا اور تعزیہ کے ساتھ ساتھ اس جگہ بڈھا بابا کی رسم بھی باقی رہی اور کثرت [illegible] پیدا ہوئی۔ اکبری دروازہ کے مجسمہ ساز کاریگر نے بھی دیوالی کے موقع پر مسلمانوں کا دل بہلانے کے لئے چوپٹیوں کا بڈھا بنایا اور مٹی کے کھلونوں کی تصویروں کے سلسلے میں آج تک ایک چوپٹیوں کا بڈھا کہہ کر اس تصویر کو خریدتے ہیں جس کا یہ تصویر بھی ہوا ملاحظہ ہے الغرض ہر سال عشرہ کی رات کو محلہ کے مسلمان جو صورت بناتے ہیں وہ ایک سفید داڑھی کا مرد پیر لاغر اندام سامنے رحل کھلی ہوئی اور وہ بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت میں معروف بڑھیا بھی سامنے بیٹھی ہے اور دو دیا روشن رہتا ہے۔ دوسرے پہلو میں حجرہ کے اندر تعزیہ رکھا جاتا ہے۔
اور سامنے لیمپ جلتا ہے اور تمام رات لوگ زیارت کرتے ہیں

رام جی مل مہاجن:۔ چوپٹیوں پر رام جی مل کا کاروبار بس دینے بہت مشہور تھا ان کی دوکان پر مہدی بیگم صاحبہ دختر امجد علی شاہ بہادر کے ہاتھ کی ہیرے کی انگوٹھی تین سو روپے میں رہن ہوئی تھی جو پچیس ہزار روپے کی مالیت کی تھی اور آئی گئی پر ہاتھ سے جاتی رہی۔

قاری صاحب:۔ اس محلہ میں علم تجوید کے جاننے والے قاری مرزا مہدی صاحب ایک صاحب کمال تھے جو میرے ہوش میں اٹھ بیٹھ نہ سکتے تھے ایک رات بھی باقی نہ تھا مگر فن قرأت میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ مؤلف کو ان کے زندگی کے آخری سال شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مسجد[1] اب تک قاری صاحب کی مسجد کے نام سے سڑک کے کنارے مشہور ہے ان کی اولاد باقی ہے۔
وضاحت، فاضل لکھنوی[2] نے محلہ چوپٹہ کے نام سے جو ستی ظاہر کی ہے وہ میری رائے میں طباعت کی غلطی ہے اور چوپٹیوں کو کاتب نے چوپٹہ لکھا ہے ان کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں حکیم لطافت حسین[3] ایک صاحب کمال رہتے تھے جو مفتی سعد اللہ مراد آبادی کے شاگرد تھے۔

منشی دبیر الدولہ کا پھاٹک:۔ دروازہ کی کوئی اہمیت نہیں یہ مقام موجودہ حالت میں کچھ مکانات کا احاطہ ہے دبیر الدولہ

---

۱ مسجد صافیہ بیگم کی بنوائی ہے اور بہت قدیم عمارت ہے قاری مرزا علی احمد صاحب کے وقت تک یہ سامان مسجد میں آباد رہا چھوٹے قاری صاحب محرم [illegible] اور سلسلہ خدمت ملحق کرتے رہے ۲ تذکرہ مہ بہاستش بر تاریخ الصفار ۳ حکیم صاحب کا ایک رسالہ زیارت [illegible] کے موضوع پر یادگار رہا ہے ص ۲۵۱

بھی پرانے زمانے کے ایک رئیس تھے جن کا نام ابھی تک چل رہا ہے۔ احمد رضا جائسی نے سلطنت اودھ کے مجوزہ عہدیداران کے کچھ نام نذر قرطاس کئے ہیں۔ کتاب مناظرہ کی ہے جس میں سے فقط فہرست امراء پر مؤلف کی چند لفظیں نقل کر رہا ہوں "ظہیر الدولہ[1] شرف الدولہ۔ دبیر الدولہ مرزا علی رضا بیگ کوتوال و رشید الدین خاں ساکن کاکوری داروغہ اخبار و ہمیں فقیر محمد خان و سمع شکر خاں و عبدالرحمن خاں قندھاری وغیرہا بسیارے از سیاں دولت ایں خانہ ملک کاشانہ بجاہ منزلت و مدعہ عزت و ظلومت دائر گشتہ کسے سیر و کسے دریوزہ کنے خرا۔ دارد کسے رسالہ دار گردید"

(نوٹ، ۱۳۱۰ھ میں اس محلہ میں برکات احمد کتب فروش تھے اور بو علی سینا کی لائف چھپ کر شائع ہوئی۔)

مہانرائن کا باغ ۔ اس مقام پر برہان الملک کے زمانے سے آبادی ہے اب بھی پرانے قطعے کے مکانات یہاں پائے جاتے ہیں۔

اہیری ٹولہ :۔ عبدالعزیز روڈ پر واقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ عہد اکبر[2] سے آباد ہے۔

کٹرہ وفا بیگ ۔ وفا بیگ برہان الملک کے سرداران فوج میں تھے بیگمات اودھ میں نواب قدسیہ بیگم زوجہ نصیر الدین حیدر بادشاہ آپ کی نواسی تھیں یہ ترکستان کی ایک غیور خاتون تھیں جن کے بزرگ نامور بہادر تھے۔ وفا بیگ کے دو بیٹے نوروز بیگ خاں اور ہمایوں[3] بیگ خاں تھے۔

صورت سنگھ کا احاطہ

عہد آصفی میں صورت سنگھ کو مہاراجہ کا خطاب حکومت کی طرف سے حاصل ہوا[4] تھا اور بانس بریلی کے علاقے سے پچاس لاکھ روپیہ سالانہ سیر دیتا تھا ان کی رہائش کا مکان محلہ کی صورت میں مشہور ہوا۔

تاج محل کی بغیہ

تاریخ اودھ میں تاج محل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے عراق تک اس خاتون کی سرمایہ داری کا فیض پہونچ رہا ہے مرزا جمعہ کے باغ سے قریب تاج محل کی ایک نصب اب تک باقی ہے لکھوری اینٹوں کی چاردیواری اور پچھم کی طرف کچھ عمارت باقی ہے ۳ صفر کو بوقت صبح یہاں تعزیہ اٹھتا تھا تاج محل نے ۱۲۵۰ھ[5] میں سفر آخرت کیا۔

مرزا جمعہ کا باغ

زبان اردو کی خصوصیت ہے کہ اہل زبان بچوں کے نام رکھنے میں دن کا لحاظ رکھتے ہیں جہلا اور پست طبقہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں جیسے منگل کے دن پیدا ہونے والے لڑکے کو منگل خاں لڑکی کو منگلو، بدھ کے پیدا شدہ کو بدھوا اور جمعہ کو جمعہ پیدا اس کو جمن یا مرزا جمعہ کہتے ہیں۔ آدینہ بیگ خاں نام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جمعہ کو روز آدینہ کہتے ہیں گویا ہفتہ کے مرد نام ہی دنوں پر نام رکھے جاتے ہیں عوام کی ذہنیت نے مرزا جمعہ کی نعط کو مرزا جما کہہ دیا۔ مرزا جمعہ کا نام تاریخ میں اس طرح ہے مرزا زادۂ آفاق مرزا مظفر بخت بہادر عرف مرزا جمعہ خلف وسطی مرزا جہاندار شاہ مغفور مبرور۔ اور دوسری تاریخوں سے واضح کہ مرزا جما سالار جنگ کے بیٹے اور جہاں بخت کے نواسے تھے ان کے داماد کا نام شمس الدولہ تھا نواب وزیر علی خاں نے حکومت اودھ سے معزول ہونے کے سلسلے میں جن لوگوں کو کمک پر تیار کیا تھا ان میں یہ بھی تھے جسم پر ہتھیار لگا کر ہاتھی پر سوار ہو

---

[1] ذکر الحافظ منہ [2] گزشتہ لکھنؤ ص۲۵ [3] بیگمات اودھ ص۱۲۵ [4] احسن التواریخ ص۱۱ [5] عماد السعادت فارسی

بہو بیگم صاحبہ میں بھی مرزا جمعہ کا ذکر ہے یہ باغ اس وقت ایک لمبی چوڑی چٹیل زمین کی صورت میں ہے باغ کی طرح برساتی پانی کی گزرگاہ ہے۔

بھولا ناتھ کا کنواں

بھولا ناتھ کو عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں راجہ کسی کا عہدہ تفویض ہوا تھا اور منشی رام سہائے تمنا[1] کا بیان ہے کہ بقول بھولا ناتھ کے مکان پر دو مرتبہ نواب آصف الدولہ تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ زندگی میں دوسری مرتبہ اس کے مرنے کے بعد تعزیت کے لئے۔ ان کے بھائی کا نام ٹیکا رام تھا جو حکیم مہدی کے مصاحبان اقتدار میں شمار کیا جاتا تھا[2]۔ بھولا ناتھ کا کنواں اب تک موجود ہے مال چاہ کے حالات زندگی میں یہ واقعہ نظر انداز نہیں ہو سکتا کہ نواب بڑے ذی علم اور خوشنویس تھے کاغذات میں اگر کسی تحریر کا ملاحظہ دیکھتے تو چڑھ جاتے ان کے آزردہ ہونے کے ردوادب میں مختلف لطیفے ہیں ایک مرتبہ خود نواب کے لکھنے میں غلطی رہ گئی۔ بھولا ناتھ نے اس خوبصورتی سے گرفت کی اور عرض کیا کہ آج خانہ زاد کو اس لفظ کی صحت ہوئی نواب نے تعریف کا احساس کیا اور خود اپنے اوپر اس طرح جرمانہ کیا کہ جتنے منشی دفتر میں کام کرتے تھے سب کی تنخواہیں[3] دوگنی کر دیں۔

<u>**سعادت حسین دفتری**</u> :- اس محلہ میں کئی مسلمان دفتری رہتے تھے جو بہت مشکل سے لڑکوں کو شاگرد کرتے تھے جلد بندی کچا اور پختہ کام ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا لکھنؤ کے جلد ساز (صحاف) بعض انہیں کے شاگرد ہیں یہ کمال بھی اب رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اس زمانے کے دفتری دستی جو بنایا کرتے تھے اور کاغذ بڑا کر روئی کوٹ کر بورڈ تیار ہوتا تھا اوراق کو تراشنا صرف قینچی کی مدد ہوتی تھی۔ چرمی جلد پر گلکاری اصل سنہری ماڈرسا مانس کا علم تھا جو ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی کتابوں میں عموماً شیرازہ بندی ہوتی تھی اور بائیس[4] طرح کی سلائی جاننے والے کو کامل سمجھا جاتا تھا۔ چٹے بندی اس فن کی جان تھی مخطوطات کو داغ دوزی کر کے باقی رکھنا اور بوسیدہ ترین کتابوں پر پورا حاشیہ چڑھا دینا بہت بڑی بات تھی دفتری مسطر بھی بناتے تھے مسطر نظم و نثر کے علیحدہ ہوتے ہیں۔ مرثیہ کا مسطر بند وار ہوتا ہے اگر مسطر کی لکیریں کجی ہوں تو لکھنے والے کی سطروں میں بھی ٹیڑھا پن ہو گا شاعر کہتا ہے ؎

اس عہد میں راستی کا کیونکر ہو رواج — مسطر کج ہے قلم کی تقصیر نہیں

ولہ

مجموعۂ خاطراں دلوں ابتر ہے — جو رگ ہے بدن پہ رشتۂ مسطر ہے
اہل حق نے رہ تسلیم میں غلطاں کر کے — جسم کو مشق ریاضت سے بنایا مسطر — اسیر

دفتری وصلی بھی تیار کرتے تھے جس پر طالب علم خوشخطی سیکھتا تھا یہ ایک قسم کا موٹا کاغذ ہے جو دو کاغذوں کو جوڑ (وصل) کے تیار ہوتا تھا اور دواسازی کے بھی کام میں آتا تھا آتش کہتے ہیں ؎

خوشخطوں پر جو طبیعت مری آئی ہوتی — مجھ سے وصلی کی طرح پھر نہ جدائی ہوتی

---

[1] فواد السعادت خاں ص [illegible] [2] احسن التواریخ ص [illegible] [3] تاریخ اودھ کراچی ج ۴ ص [illegible] [4] تاریخ اودھ ج ۴ ص [illegible]

جلد سار کے ادوار میں شکوہ بڑی مشہوری چیز ہے آتش کہتے ہیں ؎

کریں گے جمع معنی ہم اجزائے پریشاں کو — شکنجے میں بہت کھینچیں گے صحافت اپنے دیوان کو

دوسرا شعر ؎

کتابی چہرہ کے سطارے سے آنکھیں منور ہوں — دل احباب کو کھینچے شکوہ تپ حسان کا

گاماں کا پل

مرکنا مار کئی محلوں سے گذرتا ہوا دریا میں جا کر گرتا ہے اندرون شہر چلنے والوں کو جگہ جگہ اس کے سدراہ ہونے سے جو دشواری تھی وہ کسی طرح اس ندی سے کم نہیں جس کو پار کرتے ہیں مسافر چلتے چلتے رک جاتا ہے رعایا عاجز اہال تھی اور حکومت کی توجہ کا آسانی سے ظاہر کوئی آئین نہ تھا۔ اس لئے نالے سے جہاں ندی یا محلہ کا کوئی دل چاہا ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پل سا دیا۔ کمہاروں کا پل، کچا پل۔ اس کی کھلی ہوئی مثالیں تہ بہ تہ موجود ہیں گاماں والدہ نصیرالدین بہادر کے رنگریز کا نام تھا اس کی کنیا جب شادی کے لائق ہوئی اور بادشاہ بیگم کو صدق ہوئی کہ گاماں شادی رچا رہے ہیں تو مہمانوں کی سہولت کے لئے داروغہ تعمیرات کو حکم ہوا کہ پل بن جائے کام شاہی پیسے سے تھا مگر نام گاماں کا چلا۔ رنگ سازی میں گاماں کا جواب نہ تھا گلنار، پستئی، دھانی، سرکاہی، ماشی، زنگاری، اودا، کشمشی، عنابی، عباسی، کپاسی، پستئی، بادامی، زعفرانی، سوسی دانا فرمانی، کاسنی، شربتی، صندلی، سرمئی، ملاگیری، آبی، کاکریزی، سردئی، سیمی، پیازی، کاہی، نارنجی، سپہری، اگرئی، طوسی ہر رنگ میں پورے رنگتے میں اس کو کمال تھا طول ہو جائے گا اگر میں ہر رنگ کی کیفیت بتاؤں دو رنگوں کا اس شعر میں غزل کے پتہ ہے ؎

اگرئی کا ہے گماں دھیان ہے ملاگیری کا — رنگ لایا ہے دوپٹہ میرا میلا ہو کر

میر عشق کہتے ہیں ؎

تیعون سے کچھ عمامہ محبوب دو الحلال — طوسی قبا میں تیر گریباں ہوئے لال

قرمزی رنگ گہرا سرخ اور شاساف کا ایسا ہوتا ہے ثبوت میں مصحفی کا یہ واقعہ کافی ہے کہ آپ نے ایک بہشتن کو پانی بھرتے دیکھا دل سینے سے نکل گیا منہ میں پانی بھر آیا۔ غزل کہی جس کے بعض شعر یہ ہیں ؎

پانی بھرے ہے یار وہاں قرمزی دوشالہ — لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک لیکر جب قد کو خم کرے ہے — کافر کا نشہ حسن ہو جائے ہے دوبالا

دریائے خوں میں کیونکر ہم سیم تن نہ ڈوبیں — لنگی کے رنگ سے جب واقف تاکر ہو لالہ — نت نیاں

فخرالدین مصور ۔ گاماں کے پل پر فخرالدین مصور رہتے تھے جو مصوری میں یکتا اور مخطوطات کا سرورق یعنی لوح سازی میں طاق تھے طلائی کام صفحۂ قرطاس پر کرنے والا ان کے بعد کوئی نہیں رہا یہ ۲۶ سال سے زیادہ کا ذکر ہے۔

مکان کلیم اللہ شاہ :۔ آپ گاماں کے پل پر رہتے تھے اور سنی بخش شاہ کے نام سے مشہور تھے باپ کا نام فیض بخش تھا پیری مریدی مشغلہ زندگی تھا تحسین کی مسجد کے مینار دور دور سے دکھائی دیتے تھے ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ اس مسجد کو مسلمانوں

سلہ گلزار غم صفحہ ۹۶

کی خانقاہ بنانا چاہتے انگریزوں کی نئی نئی عملداری تھی حق دار تر سہیں انکار سے رسمیں کا مضمون قرار دے کر شاہ صاحب نے حکومت میں ایک درخواست اس مضمون کی دیدی"۔ یہ مسجد اہلسنت کے پیش امام کی نماز پڑھانے کے لیے سنی طلبا کے جائے قیام کے واسطے تمیں خواجہ مراد نے معین کی تھی اور ۱۲۹۶ھ تک اس پر اہل تسنن کا قبضہ رہا امجد علی شاہ کے عہد میں ممتاز العلما سید محمد تقی نے اس پر قبضہ کیا جو کسی طرح جائز قبضہ شمار نہیں کیا جاسکتا۔ کلکتہ سے واجد علی شاہ کا فرمان اسے پر یہ مقدمہ ڈسمس ہوا ہے۔

جھوائی ٹولہ

اکبری دروازہ سے جھوائی ٹولہ دروازے کے قریب یہ محلہ ہے اور چوک کی صفائی میں صاف شہر کے صاف ستھرا رکھنے کے لئے امر حصہ نمبر کو گوند انگور ملا تھا۔ صفائی کی سہولت یہاں لپے ٹوکرے لئے ہوئے گاڑی آنے کی منتظر رہتی تھیں کہ جھوا خالی کرکے گھر پلٹیں گاڑی کو ایک موٹا اردیل یا کسی بھینسا کھینچتا تھا اور اس کو کرچی کہتے تھے ہنکانے والا بھی مہتر ہی ہوتا تھا جو جاکر سب لیٹ جائے کراچی چھوٹ جاتی تھی اور۔ بیٹ سے بھرے ہوئے ٹوکرے یہاں رکھے جاتے تھے اس لئے جھوائی ٹولہ نام ہوا گندگی دور ہونے میں عبدالعزیز روڈ سے اچھا خاصہ حصہ لیا یہ ریز خدمت تاہی سے یونانی طبیبوں کا مرکز رہی اور خاندان طبابت کے مورث اعلیٰ حکیم یعقوب تھے جو حکیم سید محمد شفیق کے سرد تھے۔ مفردات سے علاج کرکے ان لوگوں نے طبابت کو آسمان پر پہنچا دیا اور ایسے ایسے نامور حکیم پیدا ہوئے جو [illegible] زمانے میں لاثانی سمجھے گئے اور انگریزوں نے اس گھرانے کے حکیموں کو شفاء الملک کے لقب سے سرفراز کیا حکیم یعقوب نے مطب کے نسخے ان کے شاگرد حکیم اکرام رضا نے جمع کئے اور "دستور العلاج" نام رکھ کر مطبع قاسمی سحان [illegible] لکھنؤ سے ۱۳۰۵ء میں چھپوایا لکھنؤ اور دہلی کے حکیموں میں یہ فرق رہا کہ یہاں کے حکیم کشتہ سے علاج نہیں کرتے تھے۔

تیرہویں صدی کے آخر میں اس خانوادہ نے ملکی خدمت کو اور زیادہ ٹھوس بنایا اور ملک سے چندے لے کر ڈسپنسری کھولی اور غریبوں کو مفت دوا دی جانے لگی اس اسپتال کی تاریخ مندرجہ ذیل کے قطعہ سے واضح ہے ؎

مسیحائے ثانی ہیں عبدالعزیز — مطب کے لئے ان کے گھر جا ہے
لکھی کلک اشرف نے تاریخ ہجری — یہ دارالشفا ہے یہ دارالشفا ہے ۱۲۹۴ھ

حکیم عبدالعزیز نے ۱۳۰۰ھ میں اس دنیائے ناپائدار سے سفر آخرت کیا تکمیل الطب ان کی یادگار ہے اطبائے جھوائی کے نسخہ مفرد و مرکب مرزا سجاد حسین عطار کے دواخانہ میں تیار ہوتے تھے۔ کاکوری کی علمی حتری مؤلفہ عبداللہ عظم سوداگر کے پورے صفحے پر دواخانہ کے بانی کی قلمی تصویر کے ساتھ اشتہار نکلتا تھا۔

<u>حکیم حاجی ابراہیم علی خاں</u> :- جھوائی ٹولہ کے طبیبوں میں ایک زبردست حکیم تھے میں نے ان کا عکس دیکھا ہے میانہ قد کتابی چہرہ آنکھیں بڑی اور خوبصورت داڑھی گھنی اور مدور شاندار بڑا شالی رومال جو قدموں تک پہونچا ہے جسم پر سے اوڑھے ہوئے جسم پر شال جامہ وار کا ہے جس میں کلابتوں کی بیل دوہری معرّی کی گوٹ ہاتھ میں سکھ کا آدھ گز کا کھلا ہوا رومال سر پر عمامہ پیروں میں [illegible] کفش ہو سن ۵۰ سے تجاوز کر چکا ہے کوئی بال کالا نہیں ہے غدر کے بعد آپ نواب کلب علی خاں والی رامپور کی سرکار میں گئے اور پانچ سو روپیہ مشاہرہ پر مقرر ہوگئے۔ ایک مرتبہ آپ لکھنؤ سے رامپور جارہے تھے۔ شاہجہاں پور

۱۔ گزشتہ لکھنؤ ص [illegible] حکیم صاحب موصوف کے دادا سید محمد علی ایک مشہور شخص تھے جو مولوی محمد علی صاحب المتوفی ۱۲۱۲ھ کے شاگرد تھے (تذکرۂ اطبا)

ریل کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کے کسی رئیس کی بیٹی ایک شبانہ روز سے غش میں پڑی تھی کسی طرح ہوش نہ آتا
تھا تو م حکیم اور ڈاکٹر عاجز آ گئے رئیس کو حکیم صاحب کا پتہ چلا منت سماجت کر کے اپنے گھر لے گئے حکیم صاحب نے کیفیت پوچھی
لڑکی کی ہجولیوں نے بتایا کہ جھٹپٹے وقت صاحبزادی کوٹھی پر کھڑی تھیں ایک کھیت میں گائے بیل بھینس چر رہے تھے اس میں سے
ایک بیل جفتی کھانے لگا صاحبزادی دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑیں حکیم صاحب نے لڑکی کے والد سے کہا کہ اسی وقت ان کا نکاح کر کے
رخصت کرا دیجئے۔ لڑکی کے والد نے کہا کہ نکاح ہو چکا ہے رخصتی نہیں ہوئی ہے حکیم صاحب کے اصرار پر رخصتی کا انتظام ہوا اور
تعمیل حکم کی گئی مریضہ اچھی ہو گئی حکیم صاحب نے چند دوائیاں لکھ دیں اور رامپور چلے آئے حکیم صاحب کے پوتے حکیم عبدالقوی صاحب
مرحوم وارثی تھے ان کے پاس تصویر موجود تھی۔ اطبا کے کمالات میں ان کے کمالات اس قدر وزن رکھتے ہیں کہ انسان ان کے عقل
و دماغ کی تعریف پر مجبور ہوتا ہے۔ کسی رئیس کی لڑکی دوا پینے پر تیار نہ تھی اور باپ فرط محبت سے اصرار بھی نہ کرتا تھا حکیم نے
ایک شکل میں اس کے مناسب مزاج دواؤں کا سکا تیار کیا جو حاد مہ جھلتی تھی ہوا سے اس کو صحت دی۔

حکایت :- مدرسہ تکمیل الطب کے طلبا میں ایک مرتبہ بحث ہو رہی تھی کہ غذا جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو جزو بدن ہو جاتی
ہے خواجہ عشرت نے مسکرا کر کہا مجھے اس کلیہ سے اتفاق نہیں ہے سب نے کہا کہ آپ کے پاس کوئی دلیل بھی ہے۔ آپ نے یہ شعر
موزوں کر کے پڑھا ؎

حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزو بدن   ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے

سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ فی الحقیقت یہ آپ کی شاعرانہ تحقیق کا ایک کلیہ ہے پھر اسی زمین میں مطلع کہا ؎

زم ابتر ہوئی نکلی جو وہ میخانے سے   شیشے توڑے گئے پھینکی گئی پیمانے سے

مصنوعی جامہ وار

عہد شاہی میں اونی جیبیں سائی عانی تھیں جس کا مرکز معلوم نہیں مگر جھوائی ٹولہ لحاف کی فردیں اور پلنگ پوش، فرد
رضائی کے نام میں کافی شہرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء کے پہلے اور بعد جامہ وار شال کی نقل کاریگروں نے تیار کی یہ کپڑا بالکل شالی
معلوم ہوتا تھا دور سے دیکھنے والا تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ اصلی شال ہے یا نقلی، لوگ انگرکھے اور اچکنیں بناتے تھے اور اسی
کپڑے کے زنانہ اور مردانہ رومال پختہ رنگ کے تیار کئے جاتے تھے رضائی اور لحاف کی فردیں اب اسی شان کی ہوتی ہیں۔ مگر
پارچہ جات بنا موقوف ہو گئے۔

اسرار حسین خاں نے جھوائی ٹولہ کے جھاویں خاص مصنوعات میں شمار کئے ہیں[1]   (دیکھو قدیم ہنر صـ۱۱۶)

معین العلاج :- مرزا سجاد حسین مذکور کے دواخانہ کا نام تھا اور ۱۹۲۶ء میں مرزا صاحب نے قائم کیا تھا مدت تک بڑی نیک نامی
کے ساتھ جاری رہا اور پبلک خدمات میں جھوائی ٹولہ کے ساتھ مرزا سجاد حسین کا نام باقی ہے۔

امامباڑہ میر فجو :- پرانے زمانہ کے سید تھے جن کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکا مدرسہ تکمیل الطب اسی امامباڑہ کی آراضی پر قائم ہے[2]
یہ وہ حصہ زمین ہے جو فخر کی قبر سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ صـ۱۱۹   [2] بزم خیال صـ۱۵۱

ڈیوڑھی بادشاہ محل :- اس محل میں نصیر الدین حیدر بہادر مرحوم کی فرانسیسی ملکہ کی دولت سرا تھی جس نے نومبر [illegible] میں سلام
ڈاکٹر بی حسینی" نام تبدیل یا اور شاہ کی طرف سے بادشاہ محل خطاب ہوا۔ اس محل سرا کی اب بنیاد بھی باقی نہیں ہے بادشاہ
محل بیوہ ہونے پر تھوڑے دن زندہ رہیں اور محمد علی شاہ بادشاہ نے ان کی تنخواہ صرف دو ہزار روپے ماہوار باقی رکھی ——
[illegible] تک اس عالیشان مکان کے دو روز رہاتی تھے۔ باپ کے ساتھ بادشاہ محل کربلا معلی روانہ ہوئیں بادشاہ محل کی ایک
[illegible] لڑکی کا نکاح مولوی سید امداد علی سے یہ قلندر علی کیرانوی کے ساتھ ہو گیا تھا داماد کربلا کے رہنے والے تھے اور شاہ کی
طرف سے محلات میں مجالس پڑھنے کا عہدہ عطا ہوا تھا۔ یہ پرائیویٹ مجلسیں ہوتی تھیں پردہ ہوتا۔ بیگمات درپردہ ہر مجلس میں آتیں
شاہ اور ارکان سلطنت سامعین میں مجلس ختم ہونے پر پانچ پارچہ کا خلعت اور پانچ سو روپے ماہوار مقرر ہوئے مستند الذاکرین کا خطاب
ملا شادی کے سارے مصارف سلطنت نے برداشت کیے۔ اس کے بعد مولوی صاحب موصوف وہاں بادشاہی جاگیر کی گرانی تفویض
ہوئی اور سات سو روپیہ ماہوار پانے لگے بیگم صاحبہ کو ان کے علاوہ دو سو روپے ماہوار ملتے تھے بادشاہ محل میں
شریعت اپنے ہاتھ سے ان کے سامنے پیش رکھتے تھے یہ صاحب تالیفات [illegible] اور شاگردوں نے بھی شاعری کے نام
پر عزت حاصل کی اور صاحب تصنیف ہوئے [illegible] سید امداد علی کا وثیقہ متروک عام ہے بادشاہ محل کے دو شعر [illegible]
پر گیا ہے جو بہت تجارتی کتب خانوں میں سے رکھی۔

امام باڑہ بادشاہ محل :- بادشاہ محل کا ذاتی امام باڑہ تھا اور مرحوم سے مجالس ہوتی تھیں یہ امام باڑہ محترمہ
بانی عمارت کے نام کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسینیہ کہا جاتا تھا اور یہ سید صحیح اور رنگ محل تھی بادشاہ محل کے بعد امام باڑہ کا سامان
تلف ہو گیا۔

مطبع محمدی :- حاجی ولی محمد نے اسی امام باڑہ میں کچھ عرصے کے لیے پریس کھولا جو کتابت چھپائی اور کام کی عمدگی کے لحاظ سے معیاری
پریس تھا جو کتاب شائع ہوتی وہ قدیم خصوصیات کی حامل ہوتی مطبع محمدی کے چھپے ہوئے کام میں وہ قرآن شریف ایک یادگار ہے جو
ضیاء الدولہ معتمد الملک نواب کاظم علی خاں دوالفقار جنگ خلف یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر جنگ نے ۱۲۵۵ھ
میں صرف سو کاپیاں علماء کے لئے چھپوائیں اور وقف کیں اس کی چھپائی کی تحریک مولوی علی نقی یک دوسرے عالم نے کی تھی۔ قرآن
شریف میرے پاس موجود ہے لمبان ۱۲ ½ انچ چوڑان ۹ انچ صفحات ۸۴۰۔ ہر صفحہ میں گیارہ سطریں مطبع سلطانی کے قرآن مجید کے بعد
جس پر جہر کوع کی جگہ تاج بنا ہے یہ قرآن پاک بہترین شاہکار ہے مطبع حاجی صاحب کے مرنے پر ان کے بیٹے عبداللہ کی زیر نگرانی
آیا اور ۱۲۶۳ھ کا شائع شدہ لٹریچر بھی کچھ کم نہ تھا پھر ۱۲۶۶ھ میں محمد حسین ولی محمد کی شرکت سے پریس نے تیسری منزل طے کی۔ اس
پریس کے مطبوعات کلاں کوٹھی کے سلطانی مطبع میں بھی تیار ہوئے اور ۱۲۶۶ھ کے نشریات پر مطبع حاجی ولی محمد کے ساتھ کارخانہ علی بخش
خاں کا اضافہ ہے ممکن ہے کہ پرنٹر اور پبلشر تبدیل ہوا ہو چھاپہ خانہ کے یادگار ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

مطبع اسدی :- جھوائی ٹولہ کا دوسرا پریس ہے اس کے مطبوعات میں کوئی خاص بات نہیں پھر بھی صحت و صفائی کے لحاظ سے پریس

[illegible] اصلاً معروف ہے تذکرہ بے بہا میں ہے کہ ذکر العمائد اور بہر العمائد واقعہ کربلا میں اسی بیاض ملکہ کے سرمایہ سے چھپے کہ عزاداری منظوم کربلا میں معین ہوگئی۔
[illegible] انوکھا کے نسخہ سے واضح ہے کہ امام باڑہ بادشاہ محل کا مطبوعہ ہے تک [illegible] کا وہ نادر نسخہ دیکھو جس میں تھپے باذر ہیں۔

اچھا تھا ۱۲۸۱ھ کی چھپی ہوئی کتابیں سابق کے معلومات سے کم۔ تھیں۔

وضعداری کا ایک اعلیٰ نمونہ:- یہاں ایک شخص تھے مرزا مہدی حسین[1] ان کے پاس وقت مقررہ پر مفتی گنج سے ان کے ایک دوست آتے تھے اور آدھی پانی کوئی ان کو روک نہ سکتا تھا غدر کے دن مرزا صاحب جب بھاگنے پر تیار ہوئے تو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ دوست آجائیں تو گھر چھوڑیں دفعتہً مرزا صاحب سے آکر گلے میں باہیں ڈال دیں اور توپ کے گولے نے ایسی بھیانک صورت دونوں کو جدا کیا اپنا اپنا راستہ اختیار کیا محبت اس کو کہتے ہیں[2]۔ کوئی طاقت آنے کے وقت روک نہ سکی جھوائی ٹولہ میں فرد رضائی پلنگ پوش کی چھپائی کا کام عہد شاہی سے اب تک ہوتا ہے جس کی دور دور مانگ ہے مرادہ میں مال اسی جگہ سے سپلائی ہوتا ہے[3] اس محلے کے جانور بھی اچھے ہوتے تھے۔

مسجد رکھی:- جھوائی ٹولہ میں تکمیل الطب سے پہلے داہنے ہاتھ کی طرف ایک بلندی پر چند زینوں کے بعد یہ مسجد ہے دروازہ کی بغل میں ایک خوشنما محراب ہے جس میں میٹھے پانی کا کنواں ہے۔ سطح زمین سے متصل کنواں زیر محراب اس طرح ملا ہے کہ چبوترا اور صحن مسجد سے اس حصہ زمین میں ڈول رسی پہونچا کر پانی بھرا جائے اور مسجد کے نیچے اترنا پڑے۔ نجم الغنی[4] کا بیان ہے کہ عہد آصفی میں سندر نامی طوائف سید قاسم علی شاہ پسر میر انور داستان گو پر عاشق تھی۔ کچھ تعجب نہیں اگر سندر کے کار خیر پر میلان میر صاحب کی محبت ہی ہو سندر اپنے ابتدائی دور میں بہترین گانے والی عورت تھی تان سین اور بیجو باورے کی یاد اس کے نغموں سے تازہ ہوتی تھی رکھی سندر کا عرف تھا۔ حوض کے پہلو میں اس کی قبر اب تک موجود ہے پتھر ٹوٹ کر محلہ کے لوگ لے گئے میں نے جب تلاش کرنے میں بہت بڑی کوشش کی تو دلِ عشاق کی طرح ٹکڑے دستیاب ہوئے جو ایک دوسرے سے فٹ نہ ہو سکے چار ٹکڑے ملنے پر جو کچھ پڑھا گیا وہ ناقص لوحِ مزار کی صورت میں یہ ہے۔

سندر کہ بود در رحلت از ملک جہاں	و مشتری شد مدا اشک فشاں
ناہید زروئے گفت کبیر	دردا کہ عبارا شدہ خورشید نہاں
م معرر دو رحمہ	۱۲۲۴ھ

دوسرے مصرعہ میں جو لفظ نہیں پڑھا گیا وہ شاید زہرہ ہو تیسرے مصرعہ میں جو جگہ خالی ہے وہاں زروئے اعداد ہو سکتا ہے اور اس مصرعہ کے آخر میں کبیر کی لفظ مشتبہ ہے ممکن ہے کہ میر پھر خوش قسمتی سے مادہ کا مصرعہ صاف اور درست برد زمانہ سے بچ رہا آخر میں نثر سطر بھی ناقص ہے بظاہر رحمہ یا بسم مصرعہ ہے۔ اگر یہ پتھر نہ ہوتا تو کوئی بتانے والا نہ تھا کہ سندر اور رکھی ایک عورت ہے جا کے جو معتنا سا قبر کو بانی مسجد کی قبر بتلاتے ہیں[5] سندر کے کمالات کا ہنرمندانِ لکھنؤ میں بھی ذکر ہے۔

مسجد میں چند دوکانیں ہیں اوپر مختصر چبوترا اور داہنے ہاتھ کی طرف مزید کچھ عمارت تھی بعض محرابیں کہنہ دیواریں بتاتی ہیں کہ اس سمت مکانات تھے اور پہلوئے مسجد سے راستہ تھا محلہ کے بوڑھے لوگ بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں یہ حصہ کھنڈر کی شکل میں [illegible] سے بھی تین در اب تک قدیم ساخت کے ثبوت میں گواہ ہیں۔ صحن مسجد میں حوض ہے اور مسجد صرف ایک درجہ ہے تین گنبد سقف پر ہیں اور [illegible] گوشوں پر مینارے ہیں بانی مسجد کی نسل میں لکھنؤ میں کوئی موجود نہیں جن لوگوں کو اس مسجد کے مالکانہ حقوق حاصل تھے ان [illegible]

---

[1] دفعساماں لکھنؤ [2] دبستانِ لکھنؤ ص ۲۹ [3] قدیم ہنر [4] تاریخ اودھ ۵ ص ۷۱

[illegible] جوانی میں دکھن چلے گئے یہ جان صاحب کے آخری شاگردوں میں بہت بڑے صاحب
[illegible] میں بہت شاعر ہوئی ۔ دراز قامت، وجیہہ کشادہ رو مہر پر داڑھی، پیرانہ سالی کے باوجود خمیدہ پشت نہ
[illegible] محلہ میں رہتے تھے مجذوب وطن میں غالب جنگ کی ڈیوڑھی پر مومن سے ملنے آئے اور مسجد کے چپہ چپہ کو پوچھا اور
[illegible] کے سلسلے میں ہم اور دوسرے لوگ بھی جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے مسجد پر آتے جاتے تھے اور مسجد۔ تھی
[illegible] کا گلدستہ تھا بیگم کے اشعار حیدرآباد کے بچہ بچہ کو یاد ہیں ایک شعر مجھے بھی یاد رہ گیا ہے

درا ما پا ل ے بھر دے لگن کو کہ میں آج دیکھوں گی سورج گہن کو

کسوف دیکھنے کا یہ پیمانہ طریقہ تھا کہ آفتاب سے آنکھ لڑانا تو تاریخ کے لئے مضر ہے اس لئے تسلہ میں پانی بھر کے
[illegible] کی کا [illegible] ہوئی تصویر پانی پر اتر آتی ہے اور سارے کے پاس مدد سمجھتے ہیں کہ اب سارے کا وقت جاتا رہا بیگم سے حیدرآباد ہی
[illegible] انتقال کیا ان کی صاحبزادی سے نسل موجود ہے شعر اس وقت اکثر یعنی حوالی نور کے یہ ا تمام ہے اد ساٹھ برس سے
[illegible] کا علم نو پچھ ، بہت کو اشتا ہے رکھی لی شعر اس قدر مشہور ہے کہ شہر بھر واقف ہے

توپ دروازہ :

اس محلہ میں عہد آصفی سے آبادی ہے شہر کے چیدہ ہوئے شعرا حکما یہاں رہتے تھے ایک امامباڑہ ہے جس کے حالات معلوم
نہیں ہو سکے اور کہیں توپ دروازہ کا کچھ اثر ہے یہ عہد نوابی کے ساط ہوں گے جس کا اب کوئی نشان نہیں ہے حضرت عباس
کی درگاہ کے قریب میں فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کے لئے حطرہ کی راہ پر دروازہ سا کر توپ نصب کی گئی تھی اس لئے اس محلہ کو توپ
دروازہ کہا گیا ہے ایک زمانے میں سڑک پر کئی حکیموں کے مطب تھے جام محمود نواب، حکیم محمد صاحب مدہوش طبیب ریاست خیرپور
[illegible] اور جفریں بھی ماہر تھے ان کا تعویذ تیر بہدف ہوتا تھا دتوں جیر پور کے روپیہ نوروز کے موقع پر ایک تقویم نکالتے رہے تھے
عامل تھے ۔ علاج مفردات سے کرتے تھے ان کے علم و عمل کے افسانے اب تک زبانوں پر ہیں یہ ذکر تو پچاس سال پہلے کا ہے اور اس
سے قبل محلہ کے باشندگان میں

<u>مولوی میر حیدر صاحب</u> :۔ مشہور شخص گذرے ہیں صاحب دیوان تھے عربی اشعار کا مجموعہ ان کا ملندیا یہ دیوان ہے آپ پیلہ
[illegible] آباد میں امامت جمعہ و جماعت فرماتے تھے اگرچہ مہینہ لکھنؤ میں قیام رہتا تھا۔ آپ کے شاگردوں میں حکیم علی اظہر صاحب کھجوی
اور مولانا سید محمد باقر صاحب مجتہد لکھنوی اور مولوی علی جواد صاحب بنارسی مشہور لوگ ہیں ۱۹ محرم کو ۱۳۰۳ھ میں لکھنؤ میں وفات
پائی اور درگاہ حضرت عباس امامباڑہ تحت اللہ نواب، صدر غربی کے گوشہ میں زیر آسمان سپرد خاک ہوئے ہے

بولا سرادب کو جھکا کر دل حزیں تاریخ لا جواب عدیم النظیر ہے

مرحوم کا نام میر حیدر علی تھا اور اس دور کی کتابوں میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے اولاد کلکتہ، لکھنؤ اور پاکستان میں موجود ہے
[illegible] عباس عامل :۔ شرفائے لکھنؤ کی وضع قطع سے زندگی بسر کرتے تھے اور صورت دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ دعا تعویذ
[illegible] کے کمالات خود سے اہل لکھنؤ اچھی طرح واقف ہیں مجھ سے ممدوح کے ہمسر نے بیان کیا کہ ہم سیتاپور پڑھا رہے تھے۔

[illegible] ۲۶ صفحہ ۱۲ تا دیکھو تاریخ عباس کواکب مدینہ طل محمد د

قبلہ کی طرف سے آندھی اٹھی زمین و آسمان تاریک ہو رہا تھا اور مسافر سراسیمہ ہو گئے۔ عامل موصوف نے راستے ایک اسم [illegible] پڑھ کر لکھا اور آندھی کی طرف پھینکا رخ پلٹ گیا اور قافلہ محفوظ رہا ان کے بیٹے تھے حسن عباس، وہ بیشک عامل معلوم ہوتے تھے بڑی زلفیں، لانبی داڑھی۔ بمبئی اور دیگر مقامات پر سفر کر چکے تھے۔ کمالات میں یہ تھا کہ چاول پر سورۂ توحید لکھتے تھے۔

__گلو کا تکیہ__ ۔ اس محلہ کا قدیم قبرستان تھا بعد گلو زکات پیش امام مشہد ی کے نام تکیہ دار ہوا پھر حیدر حسین غسال اموات کو غسل دیتے تھے محلہ کے اہل علم و کمال کا پرچھاواں پڑنے سے اس کے خاندان نے وہ ترقی کی کہ ذاکر، عالم، پروفیسر، شاعر اور اہل قلم پیدا ہوئے جن کے نام ظاہر کرنا مصلحت نہیں۔

کٹرہ محمد علی

محمد علی خاں عہد برہان الملک کے سردار اور ہمعصر ابو تراب خاں و خدایار خاں تھے حسن اتفاق سے طبیب شاہی حکیم محمد علی نے اس محلہ میں قیام کر کے علم و حکمت کے چشمے جاری کر دئے وہ بڑے فیاض اور رفاہ عام کے کام کرنے والے شخص تھے بقول حسین تاب لکھنوی حیات دبیر میں لکھتے ہیں کہ چار آدمی کٹیں کر پڑے ہوئے تھے جن میں مرتے مرتے محبت قائم رہی۔ خدا کی شان ہے ہر ایک اپنے فن میں کامل اور یکتا ہوا حکیم مرزا محمد علی و میر باقر تاجر اور مرزا دبیر اور میر علی حکیم (ص ۱۲۲ حیات دبیر) وہ ممتاز علماء کی تقلید میں تھے اور امور خیر انجام دینے کے لئے سترہ ہزار روپے کے نوٹ حساب کو دئے۔ جو آج تک باقی ہیں اور رشید یہ ٹرسٹ اینڈ چیریٹیبل کمیٹی لکھنؤ کے زیر اہتمام ہیں۔ حکیم محمد علی کا مقبرہ توپ دروازہ سے آگے بڑھ کر کھنڈر کی صورت میں اب بھی موجود ہے ساٹھ برس پہلے یہ ایک خوبصورت ہال تھا جس میں محلہ توپ دروازہ اور قرب و جوار کے رہنے والوں کی طرف سے مجلس مدح عقد کی محفلیں ہوتی تھیں ایک مکتب بھی تھا جس میں لکھنؤ کے مفتی اعظم مولوی احمد علی صاحب مجتہد نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت کٹرہ محمد علی میں کم قصاب رہتے ہیں جن کے پانچ سو سے کم گھر نہ ہوں گے۔

__حکایت__ ۔ حکیم صاحب سر راہ اپنے مطب میں مریضوں کو دیکھ رہے تھے کہ راستے سے جنازہ گذرا جس کے ساتھ میت کا باپ سرد سینہ پیٹتا ہوا جا رہا تھا اور حکیم صاحب کا شناسا تھا۔ انسانی ہمدردی میں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی اچانک مر گئی ہے۔ حکیم صاحب کو شبہ ہوا کہ شاید سکتہ ہوا اور موت نہ واقع ہوئی ہو جانے والوں کو روکا اور میت کا چہرہ دیکھ کر کہا کہ اس کو روکو جنازہ رکھ دیا گیا۔ دس سیر دودھ تیس تلے کا کڑھاؤ میں چڑھوا دیا جب ابال آیا اور دودھ اچھی طرح پک کر تیار ہوا کڑھاؤ چارپائی کے نیچے رکھوا کر بستر کے گرد چادریں اوڑھا دیں کچھ دیر کے بعد میت کے چہرے پر سرخی دوڑی اور چند لمحے کے بعد پسینہ پیشانی پر آیا اور زندہ معلوم ہوئی حکیم صاحب نے نسخہ لکھا اور عورت صحتیاب ہوئی۔

بدایوں کے حکیم عبدالعلی بھوانی ان کے شاگرد تھے نفیسی شرح موجز ان سے پڑھی تھی وقائع عبدالقادر خانی میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دوست عبدالعلی سے ملنے کے سلسلہ میں اچانک حکیم صاحب کے درس میں پہونچے بحث ہو رہی تھی کہ معتدل حقیقی کا اگر وجود بھی تو کہاں ہو کیونکہ ہر مرکب اپنے غالب جزو کے مکان میں ہوتا ہے اور معتدل میں کوئی جز غالب نہیں اس کا وجود محال ہے۔ عبدالقادر ہدایت الحکمۃ کی شرح ملا صدرا میں بحث دیکھ چکے ہے رباعی پڑھی ؎

نیکو بنگر کہ ہست در ملک وجود　　　خیر کلی ز سعر جزئی مقصود

بہ چہرہ …… بود خال سیاہ　　　　پیداست کہ جز حسن بہ خواہی افزود

…صاحب بہت خوش ہوئے اور … اشعار … سے نوازا۔ حکیم صاحب کا انتقال ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۹ء میں ہوا۔ میر علی اوسط

…نے تاریخ وفات کہی ہے

…… بو علی سینا　　　　اے محمد سابق و لاحق افسوس

تاریخ وفاتش … رشید … ت　　　　افسوس طبیب ہائے حاذق افسوس

علم دعمل کے ماحصل مصنف … ۱۵ ھ المختصر … حکیم وحید اللہ بدایونی مئی ۱۸۳۲ء مطبع احمدی ۱۲۷۳ھ سے

اخذ کیا ہے۔

مطبع علوی: اس محلہ کا مشہور چھاپہ خانہ تھا اس کے مطبوعات کی لیتھو پریس کا مادور اور الیکٹرک سے چلنے والے ترقی پریس پیدا نہیں کر سکے۔ مطبع کے مالک علی بخش خاں ولد پیر محمد تھے اور … علی اد … تھے ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ تک پریس کے باقی رہنے کا علم ہے علی بخش کے مطبوعات کلاں کوٹھی میں بھی چھپے ہیں۔ علوی مطبع کے پریس میں حیدر علی، امام بخش، امام الدین تھے۔ اس مطبع میں درسیات پر حواشی علما … کے ہو سکے۔ … مطبوعہ ۱۲۶۳ھ میں مولوی … مولوی احمد علی، مولوی تراب علی اور حکیم شریف خاں کے حواشی ہیں۔ ان میں بعض اہل علم … تھے محمد علی عثمان[۱] پور کے رہنے والے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مطبع … وطن … عثمان پور، دونوں اضلاع میں عثمان پور ہے محلہ کے آثار علمیہ میں مطبوعات ہر لائبریری میں موجود ہیں۔ اور حکیم محمد علی کے امور خیر جاری اور ان کے شاگردوں کی خدمت خلق سے کبھی ان کی قوم منقطع نہیں ہوئی ہے مولوی حماد علی ساکن … سادات کے حال میں ہے آپ نے معقولات ممتاز العلماء اور قائمۃ الدین سے اور کسب طب حکیم سبحان علی صاحب سے اور حکیم … صاحب سے پڑھیں، اور مطب حکیم مرزا محمد علی صاحب حکیم شاہی کے یہاں کیا

آقا سید ابراہیم موسوی اپنے ایک خط میں جو سید العلماء سید حسین مجتہد لکھنو کے نام ہے حکیم صاحب کے زیارت سے مشرف ہونے اور ان کے ہاتھ سے مشاہرہ وصول ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں

… کہ سابق … ارحامت …. … صاحب آقا میرزا محمد علی حکیم ارسال فرمودہ بود …

موافق خاطر خواہش ہر کس کہ حاجت … نفس گرفتہ مجموع را … خدمت … د　　خط نمبر ۲۶

کٹڑہ بزن بیگ

بزن بیگ اس افسر کا خطاب ہوتا تھا جو اپنے حکم سے فوج کو حملے کی اجازت دے آپ برہان الملک کے زمانہ میں سردار فوج تھے محلہ مذکور ان کا بسایا ہوا ہے اس جگہ کچھ مندر اور دریا پاٹ کے ٹھکانے ہیں ۱۸۵۸ء سے دلگداز رسالہ عبد الحلیم شرر مشہور ناولسٹ نے جاری کیا جو لکھنؤ کے خراد میں قدیم میگزین تھا محمد علی خاں نامی ایک شخص[۳] اس محلہ میں رہتے تھے جو علی مد کے موجد مانے جاتے تھے۔

---

[۱] فقہ امامیہ کی مشہور کتاب شرائع اسلام حسن شان سے اس مطبع میں طبع ہوئی کوئی پریس نہیں چھاپ سکا [۲] معیار الافکار کے مطالعہ سے واضح ہوا کہ علی بخش …

[illegible]

پیر خاں کی گڑھی

گزشتہ بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ ماکہ پر کچھ بہادر سپاہی تعینات رہتے تھے جو غنیم کا مقابلہ کریں اور اس وقت کی گڑھی گویا دیگر قلعہ تھی۔ پیر خاں عہد آصفی کے مرد میدان تھے محلہ شہری بستی سے دور اور ماکہ پر تھا یہاں پر کچھ شاہی نوکر چاکر اور کچھ دات کے گھر تھے ایک پیر ٹھیکا کا خاندان تھا ٹھیکا لفظ ہر پبلک کا رکھا ہوا نام ہے۔ دوا سازی کے اصول پر عرق جس طرح پایا جاتا ہے اس میں ایک طریقہ بھبکے سے کھینچا بھی ہے ممکن ہے کہ شاہی دوا ساز یہاں رہتا ہو اس محلہ میں کچھ آثار قدیمہ سے ہوتے بھی ہیں۔

<u>راکبر علی</u>۔ عہد شاہی سے ۲۵ صفر کو یہاں سے ایک تعزیہ اٹھتا تھا اور بانی مجلس بڑھاپے سے چل پھر نہ سکتے تھے۔ ڈولی پر بیٹھ کر دن پر روپے لیتے تھے اور روٹی سال کا حصہ خود پہنچاتے تھے بڑا کار خیر انجام پاتا تھا

<u>راجہ مہرا</u>۔ نواب آصف الدولہ کے کہار راجہ مہرا کا مکان اسی محلہ میں تھا یہ بہت بڑا عقلمند اور پڑھا لکھا آدمی تھا سرجی نام تھا نوکر ہوتے ہی پہلے کردار اور تعلیم و تہذیب سے بہرا ہو اخلاق۔ یہاں میں کہاری کو مہری اور کہار کو مہرا کہتے ہیں ترقی کی اور ڈیوڑھی پر متعین ہو رہتے تھے سب کا چودھری ہو گیا تنخواہیں اسی کے ہاتھ سے بٹتی تھیں اور نواب کی پالکی میں بھی بیٹھ بیٹھ تھا جان چیری ریزیڈنٹ نے چاہا کہ نواب گھوڑا گاڑی دیکھیں، پر نکلیں سرجی نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ گھوڑے سے تیز کہار چلتے ہیں رمنہ کے میدان میں مقابلہ ہوا اور کوس بھر تک سرجی ریزیڈنٹ کی بگھی سے آگے رہا اس ہار جیت پر نواب نے اس کو راجہ مہرا کا خطاب دیا اور بے تکلف لوگ راجہ مہرا ہی کہتے رہے۔ یہ شخص فارسی درسیات اور کچھ کچھ عربی اور سنسکرت بھی جانتا تھا عشرۂ محرم میں بڑی دھوم سے تعزیہ داری کرتا اور عشرہ کو سر و پا برہنہ تعزیہ لے کر کربلا جاتا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ آج تک (۱۹۳۱ء) اسی کے خاندان کے لوگ لال تعزیہ رکھتے اور اٹھاتے ہیں اور مرثیہ پڑھتے ہوئے جاتے ہیں اور مجلسیں بھی کرتے ہیں۔ راجہ مہرا کا مکان ان کے خاندان کے قبضے میں اب تک ہے راجہ مہرا کو سیاق میں طبعی لگاؤ تھا اور جھاؤ لال کہا کرتے تھے کہ یہ تو کسی کا بستہ کا بچہ ہے۔ راجہ مہرا نے عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ میں بہت بوڑھے ہو کر دنیا چھوڑی گھوڑے کے ساتھ پالکی لے کر ان کا آگے نکل جانا تاریخی واقعہ[1] ہے جس کو ہم نے مختصر لکھا ہے۔

<u>رانگے کی ضریح</u>۔ عہد شاہی کے تعزیوں میں پیر خاں کی گڑھی سے ۸ صفر کو رانگے کی ضریح کا جلوس نکلتا تھا اور امرا و رؤسا شریک ہوتے تھے۔

نور بیگ کا احاطہ

احاطہ نور بیگ ایک کابلی مشہور شخص کی طرف منسوب ہے حیدر بیگ اور نور بیگ افغانی دو بھائی تھے دونوں بڑے سخت مزاج اور بدخو تھے۔ نور بیگ نے راجہ بینی بہادر کی سفارش سے نواب شجاع الدولہ سے اعظم گڑھ اور سلطان پور ٹھیکہ پہلے رکھا تھا۔ جب ڈیڑھ لاکھ روپے مالگذاری کا ان کے ذمہ باقی رہ گیا تو دونوں بھائی قید کر لئے گئے اور طرح طرح کی سختیوں کے بعد بھی معافیہ دینے کا اقرار نہ کیا یہاں تک کہ نور بیگ دنیا سے گذر گئے۔

---

[1] ملاحظہ ہو دورِ ادب حصہ سوئم مؤلفہ گھاسی رام ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ طبع میرٹھ ص ۲۲

میر محمد باقر اس علاقے کے میر محلہ تھے جو ہندو مسلم جھگڑوں کو دور کرتے تھے اس محلہ میں کبھی چوری نہیں ہوتی تھی۔ دروازے [illegible] کھلے رہتے تھے۔

توکل کا مقبرہ :- اس محلے کی ایک قدیم نشانی ہے توکل شاہ فقیر تھے عمارت عہد آصفی کی ایسی قدیم معلوم ہوتی ہے

کشمیری محلّہ

وزیر علی خاں کی شادی میں دو لوگ کشمیر سے شرکت کے لئے آئے تھے اور پھر وطنی ہو گئے ان میں غیر مسلم گروہ تھے جنھوں نے یہ محلہ بسایا اور اب تک ہندو مسلم کشمیری لوگ آباد ہیں۔ حکومت کا عدل و انصاف فرقہ وارانہ عداوت کا قلع قمع کر چکا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ محلہ میں مسلمانوں کی آبادی بھی بڑھی اور اس وقت جو آثار قدیمہ ہیں وہ ملاحظہ ہوں

باؤلی حیدر بیگ - مجھے اس کا ماخذ مؤلف تحقیق لغات کے سلسلہ میں رقمطراز ہے کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ باؤلی کا لفظ اصل میں بابری تماشہ کا رواج شہنشاہ بابر کے وقت سے ہوا لیکن یہ خیال غلط ہے۔ باؤلیاں عہد بابر سے پہلے ملک میں تھیں پہلے انھیں بائیں یا وائیں کہا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اپنے سفرنامے میں یہ لفظ استعمال کی ہے بابر نے بھی اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ہندوستان چاہ کلانے را کہ زینہ دار باشد وائیں می گویند لیکن ، وں کا لفظ اصل میں باؤلی تھا بلکہ اس چشمے کو کہتے ہیں جو فوارے کے ذریعہ میں سے زور سے نکلتا ہے۔ تاریخ لکھنؤ میں کئی جگہ آپ کو باؤلیاں ملیں گی۔ یہ کنواں حیدر بیگ کا بنایا ہوا ہے اور عمارت کا کھنڈر اب بھی باقی ہے۔

نواب امیر الدولہ حیدر بیگ ایرانی نور بیگ وارث عہد شجاع الدولہ میں کابل سے ہندوستان آئے۔ سلطان پور میں جو عزت حاصل کی اس کا گزشتہ صفحوں میں ذکر ہو چکا ہے لکھنؤ میں جب ایلچ خاں کا اقتدار ختم ہوا تو جان برسٹو انگریز کی سفارش سے تعیناتی ۱۱۹۰ھ میں ان کی جگہ پر مقرر ہوئے اور امیر الدولہ حیدر بیگ خطاب ملا۔ ان کی زندگی کا یہ کارنامہ ہے کہ راجہ صورت سنگھ کو جو سعادت علی خاں مرحوم کے بعد ریل پر قابض تھا معزول کر دیا اور کندن لال کو مقرر کیا ان کو نجومیوں سے بڑی عقیدت تھی کوئی کام بغیر ساعت دیکھے ہوئے نہ کرتے تھے ضعف معدہ میں مبتلا ہو کر ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی اور کشمیری باغ میں دفن ہوئے قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

زیں جہاں نواب حیدر بیگ خاں — عازم ملک عدم گردید بائے
سال تاریخ وفاتش پیر عقل — گفت رحلت کرد امیر الدولہ وائے

امیر الدولہ کے بیٹے اکبر علی خاں نواب امین الدولہ وزیر کے نائب دست تھے اور یہ مرزا محمد تقی منصور نگر میں رہتے تھے حیدر بیگ کا ایک تالاب بھی موجود ہے جس میں کبھی پانی ہوگا باؤلی دو سو برس کی عمارت ہے جس کی پختگی اور پائیداری دیکھنے سے ہی واضح ہے۔ ۔ شوال ۱۳۲۰ھ کو میں نے بارہ دری حیدر بیگ کی ایک دیوار دیکھی جو اس قدر چوڑی ہے کہ اس پر کھٹولا بچھایا جا سکتا ہے اس دیوار کے محاذ میں کونے پر ایک چھوٹی سی مسجد اسی وقت کی ہے جو مسجد جامع ہے

مطبع سبحانی :- مسیح الزماں پسر نور محمد نے اس محلہ میں ایک چھاپہ خانہ کھولا ۱۲۶۰ھ کے مطبوعات اور درسیات بہترین طریقے پر چھاپے اور رسالہ عہد شاہی کی طباعتی خصوصیات کے حامل تھے۔

کشور گنج :- ناظ آرا بیگم دختر نواب حسین الدین خاں مرحوم کا آباد کردہ علاقہ اس وقت بالکل ویران ہے یہ خاتون آخری تاجدار اودھ

[illegible]

ماں تھیں۔ ان کے مورث اعلیٰ وزرائے دہلی کی نسل سے تھے جب بادشاہ چہارم حضرت امجد علی شاہ کی رفیقۂ حیات ہوئیں تو ملکۂ
ملکہ کشور کا خطاب ملا بڑی شان سے زندگی بسر کی انقلاب سلطنت کے بعد مصائب کا شکار ہوئیں اور جاہ و حشم اس طرح رخصت
ختم ہوا کہ انقلاب سلطنت کے بعد بیٹے[1] کی خاطر لندن روانہ ہوئیں۔ آغا حجو شرف نے اپنی مثنوی میں اس سفر کا ذکر کیا ہے ؎

یہ پھر ملکہ کشور نے تاخیر کی — سفر کی بہت جلد تدبیر کی
غرض ایک دخانی منگایا جہاز — سواری کی خاطر جب آیا جہاز

لندن میں جس اعزاز و اکرام سے آپ کا خیر مقدم ہوا تاریخ میں نمایاں الفاظ کے ساتھ موجود ہے ایک مورخ لکھتا ہے کہ ـــ
لندن میں ملکہ کشور کا آٹھویں دن دربار لگتا تھا جس کو سینکڑوں لیڈیاں ان سے ملنے آتی تھیں جب سے انگلستان کی سلطنت قائم
ہوئی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ملکہ وکٹوریہ نے زنانہ دربار کیا ہو۔ زنانہ دربار میں کوئی مرد نہ ہوتا دربار خاص میں ملکہ کشور اور دونوں
شاہزادے اور راقم گئے۔ ملکہ کشور سے ملکہ معظمہ نے ہاتھ ملایا۔ اور جیسی کرسی پر خود بیٹھیں ویسی کرسی ان کے لئے تھی ایک پہلو میں
مرزا ولیعہد بہادر اور ایک پہلو میں مرزا سکندر حشمت کھڑے[2] ہوئے۔ لکھنؤ میں غدر ہوجانے سے ملکہ کشور کا احتجاج کمزور ہوگیا
واپسی میں پیرس (فرانس) چلی آئیں اور وہیں مرگئیں واجد علی شاہ کا کلام ملاحظہ ہو ؎

جو تھیں ملکہ کشور جو تھا ان کا لقب — وہ تھیں والدہ میری اے ذی نسب
مقدم رجب پر جو ہوتا ہے ماہ — ہوا اس میں یہ واقعہ آہ آہ
وہیں تھی جو تاریخ اس ماہ کی — قیامت بپا ہوگئی آہ کی
مری والدہ تھیں جو عصمت مآب — وہ جنت کو راہی ہوئی ہیں شتاب
وہ دن مجھ کا ایسا قیامت ہوا — کہ مجھ دل جلے پہ آفت ہوا
لکھوں ماں کا سن میں بصد یاس — کئے سال تھے پانچ پر پچاس

۲۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو آپ نے رحلت کی سلطان روم اور بہت سے مختلف حکومتوں کے سفیر اور تعداد معززین اور مسلم
پبلک نے جنازے میں شرکت کی اور پیرس آپ کا مدفن ہوا مشایعت جنازہ کرنے والوں کا مجمع گاڑیوں اور پیادہ سمیت[3] دو میل تک شمار کیا گیا

کشمیری محلہ میں چوک سے جاتے وقت اس تک بائیں ہاتھ کی طرف ایک چھوٹی مگر خوبصورت مسجد موجود ہے جو مسجد کے بجائے
سے بہتر مسجد بنوانا بیگمات اودھ کے تصور میں بھی نہ تھا اور پھر سلوس بیت تک ہی فرق آجاتا۔ اس لئے مادر شاہ نے یہ مسجد بنوائی جو
نوبت کی منزل سے قریب رہی گرد و پیش کچھ عمارت بھی تھی جو کھنڈر کی صورت میں ہے اور نیچے دو دکانات ہیں۔ ناواقف اس کو
داب کمہاری کی مسجد کہتے ہیں۔ مسجد کے دو قدیم باشندے تھے۔

گندیوں کی مسجد :- انگوری باغ کے قریب سڑک کے دست راست کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے پہلو پر دیوار قبلہ سے قریب
تیلی اور کنجڑ کا ب چونے کا بنا ہے یہ کسی تیل اور عطر بیچنے والے کی یادگار ہے حال ہی میں اہل محلہ نے مرمت کی ہے۔

رفیق الدولہ کا پھاٹک :- آپ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب خاص تھے مزاج میں فروتنی اور غریب پروری تھی وزارت کی مہر

---
[1] سفیر اودھ لکھنؤ ص۹۵ [2] مثنوی حزن اختر [3] سفیر اودھ لکھنؤ

...کرم تھی اور وہ مثنوی کہی تھے پانچ تیہ [illegible] دیا ہے کہ دے صاحبزادوں کو تین تین لاکھ روپیہ ترکہ میں ملا۔ ایک بیٹے کا نام نواب جد...
...تخت نشینی کے بعد شاہ نے فرمایا۔ [illegible] سمجھ نہیں لائے۔ غرض کیا قبلہ عالم اس کا دماغ خراب ہے اور واقعی وہ مالیخولیا میں مبتلا تھے
...المطلب سمجھا بجھا کر دیا۔ میں [illegible] بیان مد کرنے کا وقت آیا تو باپ کے حسب ہدایت نذر دی مگر جب بادشاہ نے ہاتھ رکھا تو
ایک مٹھی لعل کہ [illegible] لے رکھا ہاتھ سمیٹ لیا۔ رفیق الدولہ مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ وہ تو پاگل ہے
میں تو پاگل نہیں ہوں یہ کہہ کر علاوہ [illegible] پانچ سو خلعت کے ایک رقم جو سوا لاکھ بتائی جاتی ہے مٹھائی کھانے کو دی۔
حکایت ہے کہ رفیق الدولہ [illegible] کی تقریب میں مجتہد العصر کے سامنے سونے کا اوگالدان تھوکنے کے لئے بڑھا دیا۔
آپ نے اس کو صورت دیکھ کر [illegible] سونے پر تھوکتے بھی نہیں۔ رفیق الدولہ کا عالیشان مکان موجود ہے اور ان کی
اولاد سکونت پذیر ہے۔ [illegible] کے سامنے تھا جو ذاتی مکان کی صورت میں باقی ہے۔

حسن پوریہ ۔ یہ محلہ منسوب [illegible] اور نواب حسن رضا خاں صاحب مرحوم کی طرف نسبت سے حسن پوریہ کہا جاتا ہے
اس محلہ کے بیشتر [illegible] شرفاء کی ہے کہ کمال لکھنو کے آخری دور میں اس محلہ میں ہر مکان کو تیغ، دانش، آفتاب،
ظریف [illegible] جاتے تھے اور ایسا نام بولتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد لکھنو کی قدیم تہذیب ختم ہوگئی۔

ایلچ خاں کا میدان

ایلچ خاں کا اصل نام [illegible] تھا جو افغان زادہ تھے اور مذہباً سنی تھے پہلے افلاس میں دن گزرتے تھے ۔ زمانہ شجاع الدولہ [illegible] لکھے پڑھے ۔ تھے عقل و دماغ سے ترقی کی اور آخر میں مختار الدولہ کی جگہ آصف الدولہ کے وزیر ہوگئے ۔ [illegible] واقعات زندگی تاریخ میں مخفی نہیں ہیں۔

مکان مفتاح الدولہ اودھ کے خریدار عہدے کے بعد میدان ایلچ خاں میں رہتے تھے اور یہ عہدہ ان کو موروثی اپنے باپ کپتان فتح محمد سے حاصل ہوا تھا یہ دہی یا مرد اور وفادار انسان تھا جس نے انگریزوں کو شاہی خزانہ نہ بتایا اور توپ کے منہ پر سد ہوا ہے تب بھی انگریز کامیاب نہیں ہوئے یہ مشہور ہے کہ خزانہ دو حصوں میں تقسیم تھا جوڑا مہورا ۔ جوڑا ملکی، سیاسی اور ذاتی ضرورتوں پر خاندان شاہی کی صرف ہوتا تھا اور مہورا فکسڈ ڈپارٹ تھا وہ تا حال محفوظ ہے اور وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکا مفتاح الدولہ کا وہ مکان جس میں ان کے صاحبزادے محزن الدولہ رہتے تھے پچاس برس پہلے کا میں نے دیکھا تھا ۔ ایک کچہری تھی اور شاید ایک دالان ۔ محزن الدولہ بہت بوڑھے گر خوبصورت وجیہ تھے گوری رنگت سہابی رنگ، نورانی چہرہ، خشخشی داڑھی عوام میں شہرت ہے کہ واجد علی شاہ کلکتہ جانے کے بعد بھیس بدل کر لکھنو آئے اور یہاں سے جواہرات لے کر مٹیا برج گئے اور محزن الدولہ نے اسی گھر سے ان کی ضرورتیں پوری کردیں تاریخی حیثیت سے دوبارہ شاہ مرحوم کا آنا ثابت نہیں ہے ۔ آخری شاہ اودھ مفتاح الدولہ کو چچا کہتے تھے اور کافی احترام کرتے تھے مفتاح الدولہ کا خاندانی شجرہ "موسیٰ کے پوردے" تک پہونچ کر آئے گا اور خزانہ پر مختصر بحث قیصر باغ اور لال باغ کے عنوان کی تحت انشاء آئے گی۔

رستم نگر

تاریخ میں صراحت نہیں ملتی کہ رستم نگر کس کا بسایا ہوا ہے۔ عہد نصیر الدین حیدر میں رستم خاں قاسم خاں کا کہیں کہیں ذکر ہے جو فتح مراد سارسی کی نسل سے تھے۔ ماں کا نام جمیل النساء اور باپ بیگ تھے اور کچھ تعجب نہیں۔ اگر یہ محلہ ان کی یادگار ہو۔ رستم نگر میں معززین لکھنؤ آباد تھے اور جگہ جگہ اہل دول کی ڈیوڑھیاں تھیں۔ ایک قبرستان کا بھی ذکر ہے جو کھیتوں کے حصے میں ہے اس محلے کے بہتیرے آثار قدیمہ مٹ گئے اور کچھ اب بھی باقی ہیں۔ تفصیل مرقومہ ذیل عبارتوں میں ملاحظہ ہو۔

مکان بی ملانی: - یہ ایک علم دوست خاتون تھیں نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ دس روپے ماہوار اور خوراک پر نوکر تھیں۔ آب و دانہ لکھنؤ لایا ہنرمندی نے یہاں بھی سر افتخار بلند کیا رستم نگر میں گھر لیا امراء اودھ نے اپنے یہاں کی اتالیقی اور تعلیم متعلق کی۔ بنارس کا وہ قافلہ جس میں حسینی بیگم آئندہ ہونے والی ملکہ زمانیہ تھیں[1] انھیں کے مکان میں اتری تھیں۔

نواب محبت خاں - حافظ رحمت خاں کی اولاد کو بھی لکھنؤ آنا پڑا اور نواب محبت خاں اور ان کے پیر بھائی شاہ خواجہ حسن و شاہ خواجہ حسین بھی ساتھ آئے۔ یہ دونوں بزرگ خواجہ حسن مودودی کی نسل سے تھے لکھنؤ کو وطن بنانے کے بعد اس خاندان کی ایک لڑکی سلطان عالم کے عقد میں آئی اور اشتیاق محل لقب قرار پایا شاہ کے ساتھ دیرینہ کینہ رکھنے والے افراد سسرال والوں نے دغا کی۔ وہ اس خاندان کے محمد شریف شاہ کے ساتھ کلکتہ بھی گئے اور ۷ راگست ۱۸۶۳ء کو ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا اور درد شکم سے جانبر نہ ہوسکے لاش چوب صندل کے صندوق میں لکھنؤ آئی اور مقبرہ رستم نگر میں دفن ہوے[2]۔

اس محلہ میں حسن مرزا کا تابوت بڑی مشہور تقریب عزا اور جلوس غم ہے جو ۲۱ رمضان المبارک وقت سحر اٹھتا ہے۔ اور جناب مولوی سید علی میاں صاحب مرحوم اجتہادی کی ذاکری بڑی پراثر ہوتی تھی۔ موصوف کوئی دولت مند شخص نہ تھے خود بھی غریب اور غریب پرور مزاج واقع ہوا تھا۔ مذہب امامیہ کا نادار طبقہ اور عام لوگ ان کے دینی خدمات سے فیض یاب ہوتے تھے عمامہ سر پر، عبا بردوش، داڑھی غیر مدور مگر کسی قدر بڑی۔ نیاز فتحپوری اپنے مقالہ "لکھنؤ کی ہستیاں" مندرجہ اخبار جنگ کراچی میں موصوف ہی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور مجتہد حسن کے یہاں چالیسویں کا سامان اور نماز روزہ کا نقد سامان جاتا تھا ان کا نام لوگوں نے جنت کا پٹواری رکھ دیا۔

بیمار کے حافظے نے غلطی کی یا جان بوجھ کر انہوں نے لفظ تبدیل کر دی مرحوم کو زندہ دل طبقہ باغ فدک کا پٹواری کہتا تھا ۱۳۲۲ھ کے کچھ پہلے انتقال کیا اور امام باڑہ ممتاز العلماء واقع عقب مسجد تحسین چوک سپرد خاک ہوئے موصوف مولانا مقبول احمد صاحب مرحوم کی پیش خوانی کے بعد اسی یوم غم میں پڑھتے قدیم خطابت کے ماہر تھے۔

باغ آغا مرزا: - نصیر الدین حیدر کے کوکا کا باغ اس مقام پر تھا جہاں اس وقت کاشت ہوتی ہے اور ایک بلند مسجد اس وقت کی یادگار ہے۔ آغا مرزا کے کردار سے پبلک عاجز تھی حکیم مہدی اور آغا مرزا سے چوٹ چلتی تھی۔

---

[1] بیگمات اودھ ص ۱۰۳ [2] بیگمات اودھ ص ۲۳۵

قدم رسول ۔ عہد آصفی یا شجاعوں کے زمانے کی مسجد [illegible] حکومت جو ایک معمولی سی چھوٹی مسجد اور حجرہ سے زیادہ حیثیت کی نہیں ہے۔ اگلے زمانے میں یہاں حضرت رسول صلعم کے قدم مبارک کا پتھر نصب تھا جو غدر میں تلف ہوگیا تھا۔ سرکار حسینی کا جدید امام باڑہ یا چھوٹی درگاہ، جو عہد موسوی میں تعمیر ہوئی ہے، روشن خیال بانی نے اس پرانی مقدس جگہ کو اپنا لیا ہے اور اب یہ دفعہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

امام باڑہ نوروز علی ۔ نوروز علی کو [illegible] کی بنائی ہوئی تھیں اور وہ شاہی آغا کے داماد تھے قوم کے سید تھے اور مذہبی دلچسپی میں لی دیتی۔ درگاہ حضرت عباس کے قریب امام باڑہ کو [illegible] آلات سے آراستہ کیا اس امام باڑہ کی سجاوٹ اس عہد میں نمایاں تھی۔ جب میر نوروز علی نے سفر آخرت کیا تو ان کی آرزو کے مطابق [illegible] کشور [illegible] کے قریب دفن کئے گئے ورثہ میں خدا نخواستہ کسی اختلاف کی بنا پر [illegible] تھی [illegible] ہوئی [illegible] کی [illegible] قریب [illegible] ۔

سرواراباغ ۔ عہد شاہی کے باغات میں [illegible] کا باغ [illegible] میں تمام [illegible] ایک کوٹھی کچی تھی جو اب کچی ہے۔ درخت کٹ کر زمین ہموار ہو گئی یہاں سید عمدا [illegible] ہوئی کا کتب خانہ [illegible] کی بہترین لائبریری کی جامعیت پر گواہ ہیں فرقین نے اپنے ایک [illegible] میں [illegible] کا یوں ذکر کیا ہے۔

لے گیا [illegible] کو [illegible] ہوئی [illegible] کا مکاں میاں [illegible] گئے ہیں

نواب بڑھن صاحب ۔ ان کا [illegible] سید علی نقی صاحب تھا اور [illegible] سات سو والی مشہور رئیس زادی آپ کی رفیقہ حیات تھیں لکھنؤ کے بڑے رؤسا میں شمار تھا لوگ آپ کا [illegible] پاس تھی [illegible] کو [illegible] سکتے تھے۔ میر علی جس کو جوان گھوڑا ہانکتے ہوئے [illegible] میں سیدی میاں [illegible] درگاہ حضرت عباس کے [illegible] دو منزلہ ہال میں تشریف رکھتے تھے اور یہی ملاقاتی کمرہ تھا آپ عادت [illegible] کے ایک [illegible] مخطوطات اور پرانی چیزوں کا بہت شوق تھا۔ خاندانی وقار کے مطابق عام طور پر [illegible] شرکت نہیں کرتے تھے اور محلسرا سے کم نکلتے تھے۔ غریب پرور مسافر نواز اور اصل [illegible] کے مالک تھے۔ عوام کو ان سے [illegible] فائدہ پہونچتا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کسی فقیر کا عطیہ آتشک کی گولیاں اپنی نگرانی میں بنوا کر مریضوں کو مفت بانٹتے تھے اور [illegible] کس مرض میں مبتلا لوگ دور دور سے آکر صحت یاب ہوتے تھے اس دوا سے مالی فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے اور مرض [illegible] مریض ہر وہ چیز کھا سکتا ہے جس کی تیاری مرچ سے ہوئی ہو اس کے سوا دوران علاج میں گھی دودھ کے سوا کسی قسم کی پرہیز نہ ہوا اور پہلی گولی کھاتے وقت پس پشت صرف پہلے دن ایک گولی پھینک دی جائے حالانکہ مرحوم نے یہ نسخہ اپنے صاحبزادے نواب سید حضور عالم کو بخش دیا ہے اور وہ بھی ایسے مریضوں کا بڑی دلچسپی سے علاج کرتے ہیں۔ [illegible] مریض [illegible] کے جسم [illegible] ہوں اس دوا سے اچھے ہوتے ہیں

نوٹ ، ایک وقت وہ تھا کہ دسترخوان پر بیٹھنے کے آداب یہ تھے کہ جو چیز کھائی جائے وہ تھوڑی زمین پر پھینک دی جائے۔ بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں "حق للناظرین" "نذر گذر" کا عکس ہے کہ دوا میں اس رسم کو محفوظ رکھا گیا ہو۔

اس حلقہ کے مشہور لوگ

ہمارے محلہ سعادت گنج و درگاہ و رستم نگر و محبوب گنج کے عنوان کے تحت میں جو نام درج ہیں وہ یہ ہیں صاحب [illegible] علی حیدر بہادر، نواب معز الدولہ بہادر، نواب شجاعت علی خاں صاحب، حکیم سید حسین صاحب، میر علی خان صاحب، عباس مرزا صاحب میر نواب صاحب، آغا علی حسن خاں صاحب، محمد مرزا خاں صاحب، بڑے مرزا صاحب، مرزا آغا حسن صاحب، نواب مرزا صاحب احمد علی خاں صاحب، قاسم مرزا خاں صاحب، ہادی مرزا خاں صاحب، مولوی سید علی صاحب، داروغہ میر فرزند علی صاحب، [illegible] صاحب، حکیم میر حیدر حسین صاحب، حکیم میر باقر حسین صاحب، نواب مہدی علی خاں صاحب، آغا قاسم علی خاں صاحب، آغا وزیر حسین صاحب، نواب فرج مرزا صاحب، مولوی سید حیدر صاحب، حکیم وزیر مرزا صاحب، حکیم میر جعفر صاحب، مرزا محمد عسکری عرف نواب مرزا صاحب، فخر الدین حسین خاں صاحب، مرزا خاں صاحب کمیدان، نواب پیارے صاحب، داروغہ میر آغا صاحب، نواب بہادر علی خاں صاحب۔

پرنس مرزا عظیم الشان بہادر۔ درگاہ میں ایک مسجد ہے جو شہزادہ صاحب کی کہی جاتی ہے مسجد میں کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہیں ہے۔ تاریخ میں ہے کہ نواب نے ایک مرتبہ ایک شادی کے موقع پر سمدھی کی دعوت کی تھی جس میں سلطان عالم شریک تھے اس دسترخوان پر نمکین اور میٹھے ستر قسم کے چاول تھے کھانوں کی بھی صدہا قسمیں تھیں۔

اعظم بیگ کی گڑھیا۔ یہ محلہ کشمیری محلہ اور رستم نگر کے بیچ میں واقع ہے اعظم بیگ اور گھسیٹ بیگ ہمعصر تھے۔ سلطنت اودھ میں ان کو تمنداری کا عہدہ ملا تھا۔

کٹرہ محبت خاں

جیتی لال اور ٹیکا رام دو سگے بھائی تھے ایک رستم نگر سے متصل علاقہ کا رہنے والا، دوسرا احسن پور یہ کا متوطن، چنانچہ ٹیکا رام کا احاطہ آپ کو آگے کسی دوسرے باب میں ملے گا۔ جیتی لال روضہ فاطمین کے بانی ہیں یہاں ایک سربلند مسجد ہے جو روضہ فاطمین سے پہلے واقع ہے اس مسجد کو محبت علی خاں نے بنوایا ہے۔ ان کا اس گروہ سے تعلق تھا جو قندھار کے رہنے والے سمت مزاج اور فتنہ پرور تھے مسجد پر پلاسٹر کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اینٹوں کی تنظیم اور بغیر استرکاری عمارت اسی طرح باقی ہے اور محلہ کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ محبت علی خاں کے گھرانے میں رضا میاں علی میاں تھے اور قندھاریوں کا قبرستان یہاں سے آگے بڑھ کر اب تک موجود ہے یہ قندھاری درگاہ کی عزاداری میں سدراہ ہوتے تھے اور کوئی جلوس کم ہی ایسا تھا جس میں تلوار نہ چلتی ہو ماتمی دستے کے نوجوان آزادانہ نعرے لگاتے تھے۔ اور قندھاریوں کا حملہ ہوتا تھا۔ فسادات کے [illegible] میں نواب اودھ نے چاہا کہ اس طبقے کو یہاں سے کسی دوسری جگہ بسا دیں شورش پسندوں نے عرض کیا کہ ماتمی جلوس کا یہاں اس راہ سے گذرنا تو کچھ کمال نہیں ہے۔ انتظام کے معنی یہ ہیں کہ رعیت اپنی اپنی جگہ رہے اور حکومت فریقین کو قابو میں رکھے۔ لڑائی عموماً انفرادی ہوتی تھی اور ایک کا مقابلہ ایک کرتا تھا کمیں گاہ سے کبھی حملہ نہیں ہوا۔ یلغار نہیں ہوئی واپسی میں کبھی دشمن ٹوٹ نہیں پڑے۔ مخالفت اسی وقت تک تھی جب تک نجف علم کے ساتھ ہوا اور رجز یا تی نعرے لگاتا ہو۔ نواب نے احتیاطاً قندھاریوں کے راستے پر دروازہ لگوا کر توپ رکھوا دی اور وہ علاقہ توپ دروازہ سے مشہور ہوا۔

دری والی گلی

درگاہ حضرت عباس کے آگے وزیر باغ کی راہ میں دری والے آباد ہیں اور یہ بستی بہت قدیم ہے۔

قطب اعظم :۔ نہیں کہا جا سکتا کہ حشمت خاں کا کڑہ یہاں تک ہے یا اس کا تعلق قندھاری قبرستان سے ہے بعض بن رسیدہ کہتے ہیں کہ قریب دروازہ سے امین الدولہ و امام باڑہ معل صاحب ہوتے ہوئے کربلائے دیانت الدولہ تک مسلسل قبرستان تھے جن میں بعض باقی ہیں اور بیشتر منہدم ہو کر بستان میں آگئے۔ قطب اعظم کا مقبرہ دست چپ کی طرف اب تک ہے اور پرانی عمارت ہے جس میں پتھر استعمال ہوا ہے۔ یہ محمد شاہ کے زمانہ میں تھے جن کے کمالات کے مظاہرے میں ایک دن حاضرات کا نقش کھا اور بادشاہ ہاتھی پر بیٹھ کر چلتے پھرتے آئے راستہ دہلی سے تھے رہ سواری تعویذ کا اثر ہے فقیر نے کہا کہ ایک مملکت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے فقیر نے عمل کیا کہ میں ہی مملکت کو چھوڑتا ہوں۔ باایں ہمہ فقیر با اور ایسی قدر شناس مملکت ایسے باکمال رعایا کو کہاں جدا کر سکتی تھی اور فقیہ کی قبر بھی اسی زمین پر ہوئی ہر سال گیارہ سے تیرہ ذی الحجہ تک حکیم دری والے کے اہتمام سے ان کا عرس ہوتا ہے اور وہی اس مختصر خانقاہ کا ٹرسٹی ہے۔

نواب کدورا کا مقبرہ بھی یہاں سے قریب ہے ان کے حالات زندگی اور وجہ تسمیہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

درگاہ حضرت عباس

درگاہ کے بانی کا نام مرزا فقیر بیگ ہے اور ان کی اولاد کا روضہ ہے کہ عمارت ہے مرزا صاحب کے بعد ان کے بیٹے مرزا فتح علی ٹرسٹی ہوئے۔ اس عمارت پر کثرت سے مقالات لکھے گئے ہیں اور مجھے عبدالطیف نوحانی خالص نوری کا بیان پسند ہے وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت عباس کی درگاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جو علم ہے وہ خاص حضرت عباس کا ہے جس کو ایک درویش ملک شام سے لایا تھا اور اکثر بزرگ اس طرح سے ناقل ہیں کہ جہاں حضرت عباس کی درگاہ ہے وہاں ایک شخص سید بہت افلاس کی حالت میں رہتے تھے ان کو بشارت ہوئی کہ یہاں پر حضرت عباس کا علم ہے جب وہ جگہ کھدوائی گئی تو حسب بیان ان کے وہاں سے علم برآمد ہوا"

(تعریف سیس مد ۳ مطبع بیج بہادر ۱۹۱۳ء)

بعض اہل قلم کا یہ شبہ قوی ہے کہ علم حضرت عباس تو از قسم تبرکات ہے اور حضرت محمت کے پاس تب وہ زمین سے برآمد ہوا ہو یا درویش کے ہاتھ سے اٹھا آیا بہر حال منسوب ہے اور منسوبات میں اسلامی لحاظ سے جو عظمت ہے وہ ظاہر ہے فقیر بیگ نے اپنے گھر رستم نگر میں اس علم کو نصب کیا اور شہر میں وہ غلغلہ ہوا کہ ہزار ہا آدمی زیارت کو آنے لگے نواب آصف الدولہ آئے اور مقبولیت دیکھ کر پختہ گنبد بنوا دیا۔ نواب سعادت علی خاں کے دل میں سلطنت کی آرزو تھی منت مانی کہ اگر مجھے حکومت مل جائے تو سونے کا گنبد بنوا دوں گا مراد بر آئی ان کے صرف سے عمارت میں گنبد طلائی نظر آنے لگا۔ عورتوں کے لئے زنانہ حصہ تعمیر کرا کے عمارت میں وسعت دی۔ غازی الدین حیدر نے اپنے عہد میں نقار خانہ بنوایا اور نوبت رکھی گھڑیال بجا نوبت ۱۹۱۰ء کے بعد تک تھی دروازہ رواق پر چاندی کی تا جدار نے چڑھائی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں حکم نامہ پہنے اور جی خانہ تعمیر کیا اور طے کیا کہ مردانی درگاہ کی آمدنی خزانہ شاہی میں داخل ہو اور زنانی درگاہ کے چڑھاوے مرزا فقیر بیگ کی اولاد کو ملیں نواب سعادت علی خاں کے وقت سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ جو بادشاہ تخت پر بیٹھتا وہ اس آستانہ مبارک پر جلوس کے ساتھ ضرور حاضر ہوتا بادشاہ کے درگاہ جانے کا منظر یورپین مصنفین نے بھی تذکرۃ قرطاس کیا ہے اور دولہا دولہن اور بڑی شادی کے بعد حصہ کا دولہا سلام کے لئے درگاہ آنا، تبدیل مذہب کرنے

والے، بیماروں سے صحت یاب ہو کر مریض، کسی جھگڑنے میں قسم کھانے اور درس کا آنا۔ ایک ہجوم تھا جو آج تک جاری ہے۔ انگریزی حکومت نے پچاس ہزار چاندی سونے کے علم سالانہ چڑھائے جانے کا اوسط دریافت کیا ہے۔ درگاہ میں شہ نشین کے علاوہ صرف ایک لانبا دالان اور بیچ میں علم کھڑے ہونے کی جگہ چوکور حجرہ اس پر گنبد حجرے کے محاذ میں محاذ در محاذ در خادم کے بیٹھنے کا فٹ پاتھ جس پر شمع دان اور اگر سلگانے کی جگہیں۔ پہلوؤں میں علم داہنے اور بائیں دیواروں میں قدم اور پنجہ شریف، سمت راست پر نماز پڑھنے کا [illegible] جہاں زیارت کی تقطیع اور بورڈ اور چند مرقع نصب ہیں۔ کسی زمانے میں شیشہ آلات زیادہ سے زیادہ تھے اب مختصر سامان روشنی کا ہے۔ درجہ اول کے آخر میں چبوترہ پر ایک بڑی چوبی فریم زیر سقف ہے جو جدید ہے۔ وسیع دالان میں بڑا منبر روضہ کے سامنے ہے۔ اور دوسرا منبر پشت سر کلاں پر تاکہ بیک وقت چند مجلسیں ہوتی رہیں صحن میں چہل چراغ کے بعد پانی کی نہر اور دیوار حصار میں ہر سہ طرف لانبے دالان جن میں اوقات بارش میں ماتمی دستے آزادی سے سینہ زنی کریں اور تکلیف موسم نہ ہو پھاٹک اور نقار خانہ کے عمارتی حصے پر جو علم نصب ہیں وہ حسین آباد کے امام باڑہ سے ملتے ہوئے غدر کے بعد نواب سعادت علی خاں کے پوتے امیر الدولہ نے چہل چراغ اور نہر بنوائی جس کی تاریخ سلیمان خان اسد ثانی کو ۱۲۸۵ھ قرار دی۔

سلطان عالم جب کلکتہ روانہ ہوئے تو ایک تاج اور تلوار درگاہ میں چڑھا گئے تھے۔ درگاہ میں مذہب امامیہ کے ہر شخص کا آٹھویں دن یا نوچندی کو اور اربعین کے لئے اور نعش کے لئے رو در راہ حاضر ہونا ضروری تھا۔ جنگجو طبقے میں جب کبھی تکرار یا کسی طرح جھگڑا ہو جاتا تھا تو آپس میں یہی کہتے تھے کہ درگاہ میں سمجھ لیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان خوف دشمن سے روپوش ہو مگر درگاہ میں ضرور مڈ بھیڑ ہو گی۔ [illegible] کی روشنی عہد شاہی میں دریا سے درگاہ تک ہوا کرتی تھی شاعر نے کہا ہے ؎

مخمس
روشن الدولہ کی تھی یہ روشنی — کب ہوئی تھی کہیں ایسی روشنی
وہ چراغاں گو کہ تھی درگاہ تک — تھے تماشائی گدا و شاہ تک[1]

غدر ۱۸۵۷ء میں توپوں کا مرکز ہوا اور احمد اللہ شاہ ڈنکا شاہ کا آخری مورچہ درگاہ تھی کشت و خون ہوا گوروں کے ہاتھوں سامان لٹا۔ علم خاص جس سے درگاہ کی بنا ہوئی تھی جس کا وزن تیرہ سیر کا تھا سب سے درگاہ سے نکلتے تو دیکھا۔ صحن میں ایک شہتوت کا درخت تھا یہاں تک آنے کے بعد پھر کسی کو اس علم کا نشان نہ ملا۔ شرف الدولہ نے ایک ہزار روپیہ انعام اور مصلح الدولہ نے بھی اس راہ میں روپیہ عزیز نہ کیا مگر علم کا پتہ نہ چلا۔ درگاہ میں عہد شاہی سے نوچندی کے علم اور نویں محرم کی شب کو زیارت کرنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے درگاہ کا پبلک کی نظر میں وہ وقار رہا کہ اس زمانے کے اطبا درگاہ سے متصل رہنے والے مریضوں سے فیس نہ لیتے تھے۔ احمد اللہ شاہ نے سرار آغا میر کے مورچے سے شکست اٹھا کر درگاہ حضرت عباس میں جنگ کی تیاری کی تھی[2] اور انھیں وجوہ سے درگاہ پر بھی فوج کا قبضہ تھا ذیل میں محافظ خانہ کے ایک خاص کاغذ کی نقل ملاحظہ ہو۔

۱ بموجب حکم محکمہ ازار رچ سنہ حال کے گذارش ہے کہ مقبرہ سعادت علی خاں و مقبرہ مرشد زادی و مقبرہ جناب عالیہ و مقبرہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بموجب حکم روبکار ۲ اپریل ۱۸۶۰ء کو واگذار ہوا اور دخل بھی سائل کا دلا دیا گیا مگر دخل نامہ سائل نے بوجہ اس کے کہ مقبرہ نصیر الدین حیدر ــــــ سرکار تھا نہیں بنا۔ اور درگاہ حضرت عباس نواب حسن علی خاں بموجب حکم ۲۰ ستمبر ۱۸۵۹ء

---

[1] کلیات منیر طبع چہارم مطبع نولکشور صفحہ ۱۰۱۵ء [2] احسن التواریخ صفحہ ۱۱

واگذار ہوئی ہے سو دفعتاً [illegible] کا ارسال سرکار سے چلتا ہے سوائے [illegible] کہ کل پھر دخل [illegible] دلایا جائے سو بدون حکم حضور کے نہیں ہو سکتا۔ کیفیت یہ تھی کہ گذارش کی   سید کرامت حسین داروغہ [illegible] مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۶۱ء

اس وقت درگاہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحت ہے درگاہ [illegible] کا کام [illegible] انجام دیتی ہے نواب ترک مرزا صاحب درگاہ کے آخری متولی تھے [illegible] ایک مرتبہ [illegible] میلوں کی جوڑی کھینچی تھی

درگاہ کے آخری [illegible] قامت میرا [illegible] داڑھی تھی جسم ورزشی تھا۔ آخر میں کربلا ابوتراب خاں میں رہتے تھے۔ [illegible] کے نزدیک [illegible] سے زیادہ [illegible] پڑھنے کی نوبت آتی تھی [illegible] کا تھا کہ جہاں سے چھوڑا وہیں سے [illegible] بہت دھوم ہوتی ہے عورتوں کے مقامات [illegible] کی طرف [illegible] ملتی ہے

عمارت میں [illegible] تعمیرات [illegible] قطعہ [illegible] مرزا کا [illegible] حسین محشر کا یہ ہے

[illegible] ھ

فاطمین۔ [illegible] اسلام کی [illegible] عمارت [illegible] ایک حجرہ وسط میں ضریح [illegible] میر [illegible] ان کے [illegible] قاسم علی نے یہ خدمت انجام [illegible] اسلاف کے نام [illegible] نے کربلائے معلی میں جا کر انتقال کیا۔

فاصل نگر

درگاہ حضرت عباس کی پشت پر [illegible] واقع ہے اس کو گھنڈ بیگ کی گڑھیا بھی کہتے ہیں پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ یہ ایک مجبور [illegible] تھے ان کے ہاتھ میں روپیہ ٹھہرتا نہیں [illegible] کھودتے [illegible] کسی بات میں [illegible] کاریگری کرتے تھے جب کچھ نہ رہا تو خوش قسمتی سے گھر کے سامنے کی مٹی [illegible] اس کو [illegible] یہاں تک کہ خندق ہو گیا اور برساتی پانی نے جمع ہو کر گھنڈ بیگ کی گڑھیا نام رکھا۔ ان کے نام کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے کسی بات پر خوش ہو کر ہاتھی دیا اور ان کو دوسرے دن سے ہاتھی پر سوار ہو کر اصولاً آنا چاہئے تھا۔ ہاتھی راستے [illegible] آتے آتے تک گیا اور [illegible] میں روپیہ اٹھ گیا دربار میں [illegible] حاضر ہوئے بادشاہ سے آنکھ چار ہوتی تھی [illegible] گیا تھا [illegible] ڈال کے حاضر دربار ہوئے حاضرین ہنس پڑے اور بادشاہ سمجھ گئے کہ ہاتھی بیچ ڈالا۔ اسی دن سے گھنڈ بیگ مشہور ہوئے

اس گڑھیا میں اس قدر پانی تھا کہ ایک ہاتھی کا ڈوبا تھا جس وقت محمد علی شاہ بادشاہ نے کربلا دیانت الدولہ کی زیارت کا ارادہ کیا اس وقت دیانت الدولہ کے [illegible] گھنٹے میں [illegible] کر کے [illegible] دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوا جو اس وقت بھی نمایاں ہے ورنہ شاہ کے کربلا جانے کی سبیل نہ تھی [illegible] شاہی گزر نہ سکتا۔

گھنڈ بیگ کا اصل نام مرزا [illegible] بیگ تھا ان کی [illegible] کے کارناموں [illegible] کی صورت میں ایک [illegible] کا

[illegible] ۱۹۳۶ء

"دفینہ" لکھا ہے جس کو خواجہ عشرت مرحوم نے بڑے دلچسپ انداز سے لکھا ہے۔ بارش میں عہد محمد علی شاہ کی سڑک پایاب ہو کر دونوں پتے مل جاتے ہیں۔ وہ عہد نصیر الدین حیدر میں افسر نوبت تھے تنومندی اور بلندی قامت سے اس قدر ممتاز تھے کہ گھوڑا ان کا بوجھ سنبھال نہ سکتا تھا۔ بادشاہ نے سواری کے لئے ہاتھی دیا تھا۔

محلہ کے رہنے والوں میں وزارت تخت و تاج نواب مصطفےٰ علی خاں بہادر تھے جو اس وقت کی تہذیب میں جب سر برہنہ رہنا صرف عزم میں بیٹھنے کے لئے جائز تھا ورنہ بعض امراء بستر پر بھی ٹوپی پہن کر آرام کرتے تھے۔ یہ شہزادہ سر برہنہ رہتے اس لئے کہ سر کے بال عیب ناک تھے۔ ان کی شاہانہ زندگی کے واقعات ابھی تک مشہور ہیں۔ کسی راہ کی گاڑی آگے بڑھ جانے سے امین آباد میں اس کو پٹوا ڈالتے تھے اور انگریزوں نے اس کی گستاخی کو جرم قرار دیا اور شاہزادہ سے اس کو معاف کرنے کی استدعا کی۔ ان کے دو بیٹے بڑے صاحب عالم اور چھوٹے صاحب عالم اپنے زمانہ میں بڑی آن بان کے رئیس تھے چھوٹے صاحب عالم کا نام مرزا محمد شمس الدین حیدر بہادر تھا۔ آخر عمر میں حسین آباد کے ٹرسٹی مدت تک رہے ان کی محل سرا اور ملاقاتی کمرہ اب تک ہے اور سڑک پر چھوٹے صاحب عالم روڈ لکھا ہے ان کے یہاں چہلم تک آٹھویں دن جمعرات کو مجلسیں ہوتی تھیں چائے اس وقت تقسیم ہوتی تھی جب چائے کا بالکل رواج نہ تھا بارہ بجے دن کو لوگ شرکت مجلس سے فراغت کر کے گھر آتے تھے۔

<u>مشاعرہ</u>:- شہزادہ مرزا قیصر بخت چھوٹے صاحب عالم کے فرزند ارجمند تھے جنھوں نے باپ کی زندگی ہی میں داغ فراق دیا ان کو شعر و سخن سے کافی ذوق تھا۔ آغا مظہر کے شاگرد تھے ہر مہینے میں مشاعرے ہوتے تھے۔ شعراء کے مکانوں پر خود دستہ لیے جاتے تھے ایک مشاعرے میں خواجہ عشرت نے غزل نہیں کہی صرف شرکت کے لئے آ گئے حاضرین نے پڑھنے پر مجبور کیا تو ایک مطلع پڑھا جو لوگوں کو یاد رہ گیا ؎

باغ جہاں میں ہم نہ کبھی شادماں رہے　　شبنم کی طرح عمر بھر آنسو رواں رہے[1]

<u>مرشد کی مسجد</u>:- فاضل نگر کا وہ حصہ جو زنانی درگاہ کی پشت پر ہے یہاں ایک صاحب کمال مرشد رہتے تھے اور دعا تعویذ ان کا ہندو مسلم عورت مرد ہر طبقہ میں نفع بخش اور فائدہ رساں تھا انھیں کے نام سے مرشد کی مسجد مشہور ہوئی ورنہ مسجد کے بانی میر ظہور علی کوئی بزرگ تھے مسجد چھوٹی ہے صحن میں حوض تھا جو بند ہے ایک پختہ قبر دروازۂ مسجد سے نکلتے ہی زمین دوز نظر آتی ہے اور مسجد کے پہلو میں میر ظہور علی کا تکیہ ہے ایک حصہ کے نشانات قبر محو ہو کر چھپروں میں کچھ لوگ بس گئے ہیں اور کچھ زمین دوز پختہ نشانات قبر باقی ہیں مرشد مسجد کے بائیں گوشہ میں بیٹھتے تھے ان کا خون مرغ کا تعویذ بہت زیادہ مقبول تھا۔ مرشد کا زمانہ پچاس برس پہلے تھا مرشد کے بعد ان کے بیٹے ارشد علی پبلک خدمات انجام دیتے رہے مگر وہ فروغ ان کو حاصل نہ تھا یہ مسجد اس وقت انجمن افتخار حسینیہ کی زیر نگرانی ہے اور مرمت طلب ہے آٹھویں دن نماز جماعت ہوتی ہے۔

<u>نواب گھسیٹا صاحب</u>:- پیکر خیر رئیس تھے چھ سو روپے ماہوار وثیقہ تھا جس سے مرد و عورت، عوام و خواص، ہندو مسلم بہرہ یاب ہوتے تھے انڈین نیشنل کانگریس کی جب بنیاد قائم ہوئی اور ہندوستان کی رعیت بیدار ہوئی تو فرقہ امامیہ میں بھی تنظیم شروع ہوئی اور حلقہ کمیٹی نے اپنا صدر نواب صاحب کو بنایا ان کی بزم کی حاشیہ نشینوں میں سید اکبر حسین مسرور، مرزا الطاف حسین عالم

---

[1] جزو خیال ص ۱۶۹

رادیں اور مچھن صاحب مشہور ہیں نہ رہ گئے تھے مسعود کا نام تو شہرا میں تھا اور لطف یہ کہ ادھر ادھر پہونچانے کا کام سپرد تھا عالم شعرو سخن بلند مرتبہ تھے مجموعے کو سلیس مذاق ادب کے قدردان سے ملے کہا رحمٰن صاحب اصل نگرے سے چوک تک ہاتھوں کے بل زمین پر چلتے ہوئے جاتے ہیں۔ ودھیراتی کی دوکان سے حلوہ سوہن لیتے ہیں صاحب خود ادب کے طبقے رئیس اور لوگوں میں عابد علی خاں بہادر انگریزی نے صف اول کے دکلاء میں گنے جاتے تھے انگریزی سے خرید مصنوعی دم لگی اور چلے راستے میں جو ملا اس سے یہی کہا کہ نواب گھسیٹا نے حلوہ سوہن منگایا ہے۔ حاصل نگرے سے چوک تک تمسخر کا ایک طوفان تھا جو حیراتی کی دوکان پر پہونچ کر ختم ہوا اس حلوہ سوہن کا کیا ذائقہ تھا۔ اس کو کھلاڑیوں کی زبان سے پوچھو حکیم صاحب کی مجلس جلسہ میں خطیب اعظم سلطان صاحب نے کسی موضوع مذاق پر مجلس پڑھی۔ نواب صاحب کی اس علامت پر ایک میدان کی آرائش رسم ہوئی جو مشہور نہیں ہے۔

نور باڑی

نور بیگم عرف نوابی جو خاتون تھیں ان کے مزار درگاہ حضرت عباس کے پھاٹک کی سمت پورا محلہ سا کچھ پختہ گھروں سے آباد خام مکانات اجڑی ہوئی بستی اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

قبرستان نیشاپوری۔

گزر ناگاہ ہوا جس پہ خموشاں میں — عجب نقشہ نظر آیا نظر تا اس عالم کا
کہیں آئینہ دہر شکستہ تھا سکندر کا — کہیں ٹوٹا پڑا تھا کاسہ سر جاکٹ کا

یہ وہ قبرستان ہے جس میں شہر کے چوٹی کے رئیس ستارہ دو سال آغوش لحد میں سوتے ہیں۔ مدتیں ہیں ان کا کروفر سطوت و جبروت ایک مثال آپ تھا۔ اور اس وقت ان کی بے چراغ قبروں پر سایہ بھی نہیں ہے عظمت شعار اداؤ دفن کرنے کے بعد پھر کبھی بھولے سے بھی ادھر آ کر شمع مزار اور تربت پر پھول کیسے۔ مشرقی کمالات کے مجسمے علوم قدیم کے پیکر، خلق و مروت کے مجسمے وجود کے خاتم اس جگہ پر محو خواب ہیں اور کچھ علم و فضل کے سوتے بھی موت کے ہاتھوں قطع ہو کر بحر کمال سے سیراب ہونے والوں سے سورۂ فاتحہ کے محتاج ہیں۔ اس مقبرہ میں پھاٹک کی دیوار سے قریب ایک خوبصورت حوض اور چھوٹی مسجد بھی ہے جو اینٹوں کا ایک مضبوط ڈھانچہ ہے اور مسجد کے سامنے نہایت مستحکم اور مضبوط کنواں ہے جس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی ہے۔ اس قدر چھوٹا کنواں لکھنؤ کی مسلم آبادی میں کہیں نہیں ہے۔ اگر ان لوگوں کے حالات ضبط تحریر میں لائے جائیں جو مدفون ہیں تو بھی طول کلام کا ڈر ہے تاہم چند قبور پر تبصرہ ضروری ہے۔

(۱) نور بیگم کی قبر مسجد مذکور سے دست چپ کی طرف اب تک موجود ہے اور اہل محلہ واقف ہیں

(۲) کور صاحب کی قبر یہ نواب شجاع الدولہ کے ماموں تھے ایسی طاقت اور قوت میں اس قدر مشہور تھے کہ بادشاہ کے سر پر دھوپ بھی تو درخت کو اکھیڑ کر چھتری کی سایہ کی بادشاہ کو ان کی غیر معمولی طاقت سے اپنی سلطنت میں اندیشہ محسوس ہوا پہلے اقرار دلالیا۔ پھر آنکھیں طلب کیں اور ان کو نابینا کرا دیا مگر بیٹھے روٹی دی خزانہ شاہی سے تنخواہ کر دی وظیفہ اولاد تک پہونچا اور خود کور صاحب کے نام سے مشہور ہوئے قبر تمام قبروں میں لمبی چوڑی ہے۔ عماد السعادت میں کور صاحب کے بیٹے کا نام مرزا شاہ میرخاں لکھا ہے مگر

مرقومہ بالا واقعہ مجھے تاریخ میں نظر نہیں آیا زبان زد ہے ۔

(۳) اسماعیل کی لحد ۔ آپ نوابی کے رئیس تھے ۲۴ شعبان صبح سہ شنبہ ۱۲۲۲ھ مرنے کا دن ہے سنگ مزار بہت خوشنما ہے اور جید رشاعر کا قطعہ تاریخ حسن خط کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔

مقبرہ علی قلی خاں :۔ قبرستان مذکور سے فاصلے پر علی قلی خاں جونپور کے حاکم عہد اکبری میں بڑے علم دوست اور دانشور گزرے کی ادب نوازی میں یہ واقعہ صفحہ تاریخ پر موجود ہے کہ مولانا غزالی مشہدی کو ہزار دینار سرخ اور چند عربی گھوڑے دے کر دکن سے طلب کیا اور یہ رباعی تحریر کی ؎

اے غزالی بحق شاہ نجف — کہ سوئے بندگان بیچون آئی
چونکہ بے قدر گشتہ آنجا — سر خود گیر و زود بیرون آئی

غزالی کا مصرع ہزار کی طرف اشارہ ہے وہ طلیدہ آئے اور جونپور میں درس و تدریس شروع ہوا جب اکبر نے خان زمان کو قتل کیا تو غزالی کو اپنے پاس بلایا اور وہ جونپور سے واپس ہوئے شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیا ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لکھنؤ میں کیوں دفن ہوئے یہاں موت آئی یا لاش آئی ان کے مہمان غزالی کی وفات ۹۸۰ھ ہے لہذا علی قلی خاں کی موت جن کا مقبرہ ہے اس سے پہلے ہوئی (دیکھو اخبار سرحد کراچی ص ۲۹ بابت مئی ۱۹۷۰ء)

سونا آج جس قیمت پر بازار میں ہے اس حساب سے اندازہ کر علی قلی نے جو ہزار اشرفیاں بھیجیں وہ گراں قدر تحفہ اور بڑی پیش کش تھی ۔

یہ بہت بڑی سربلند عمارت ہے جس کو بھراؤ دے کر بلند کیا گیا ہے اور اس سے ملتی جلتی دو عمارتیں رائے بریلی میں مقبروں کی بھی ہیں جس سے اصول تعمیر کے لحاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر مقبرہ ایک زمانہ اور ایک قسم کے نقشے اور ڈیزائن کے تحت میں ہے ۔ مرنے والے کی مٹی یہاں کی تھی ۔ قبر سرداب میں عام ہے اس قسم کے مقبروں میں ایسا نہیں ہے کہ سنگ مزار تھا اور تلف ہو گیا بلکہ پتھری رنگ نہ تھی اور کندہ کرنے والے مقامی نہ ہونے سے نام محفوظ نہیں کئے جا سکے ۔ جب تک متولی کے دور کے لوگ زندہ رہے اس وقت تک نام باقی رہا پھر لاعلمی کا حجاب آیا جو اخبار سرحد سے رفع ہوا یہ مقبرہ دسویں صدی کی عمارت ہے۔

مسجد راحت السلطان :۔ محلہ کے بعض بوڑھے کہتے ہیں کہ یہ چوڑی والی تھی جس نے ایک خوشنما اوسط درجہ کی مسجد بنائی یہ عورت شاہ عالم کے چشم و چراغ سلیمان شکوہ کے ہمراہ دہلی سے آئی تھی اور مجھے اس لقب کی ایک خاتون کی طرف تاریخ اس طرح رہنمائی کرتی ہے کہ سلطان عالم کی خاصہ بردار کا لقب تھا اور وہ کلکتہ بھی ہمراہ گئی تھیں خود شاہ مرحوم فرماتے ہیں ؎

مقدم ہو سلطان پہ راحت اگر — تو ہو نام اک زن کا اے خوش سیر
وہ کھانا پکانے کو ہمراہ ہوئی — مرے ساتھ زنداں میں بھی وہ رہی

مسجد کی کرسی بلند ہے پہلو میں حوض اور مؤذن کا حجرہ ہے اور بانی مسجد کی قبر بھی ہے انتہائی عقلمندی اور قدیم اصول کی نئی تدبیر سے باقی ہے یہ قبر اس انداز سے بنائی گئی ہے کہ تربت قبر اور بلندی مزار زمانہ گذرنے سے گرتے پڑتے حتہ [illegible]

...ت نمایاں ہوتی ہے پہلی قبر کی صرف ایک اینٹ ۔ رہ گئی ہے اس کے نیچے سے یا تعویذ قبر نکل رہا ہے نشان کے باقی رکھے ...گیا ہے اور کچھ دن میں اوپر کا اثر مٹ جانے پر نیچے کی قبر ظاہر ہوئی سے معلوم ہوگا کہ یہ کس کی قبر ہے یہ قبر بھی اتنے ہی دنوں تک باقی ...رہتے دنوں میں پہلا نقش مٹتا ہے میں نے ایسی قبر اسلامی ملک کے کسی گوشہ میں نہیں دیکھی۔

محبوب گنج

یہ محلہ عہد آصف الدولہ میں آباد ہو چکا تھا اور شہر کے امراء و شرفاء عزت دار لوگ آباد رہتے تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ آقا زین العابدین کا باغ اسی محلہ میں تھا جو اب بابو ہیرا سنگھ کے قبضے میں ہے اس محلہ کے مشہور لوگوں میں حکیم میر حیدر حسین، حکیم مرزا تقی حسین، حکیم میر جعفر اور مولوی مہدی حیدر صاحب کے نام خاص طور سے واضح ہوتے ہیں۔ اس محلہ کا دوسرا حصہ

گلشن کی بقیہ :۔ محبوب گنج کا وہ حصہ جس میں باغیچہ تھا معنوی لحاظ سے بھی گلشن تھا اور ایسے ایسے صاحب کمال رہتے تھے جو اپنی آپ نظیر تھے ان رہنے والوں میں مولوی اکبر علی ولد مفضل علی عہد غفرانمآب سید دلدار علی ۔ مجتہد کے اہل قلم میں تھے ۱۲۳۲ھ میں مجتہد صاحب نے فرمائش کی کہ وہ ذاکری کریں سید صاحب ہے کتاب ... واقعہ کربلا پر اردو کی پہلی کتاب ضیاء الابصار لکھ کر ... اور علمی حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی مسٹر بلومہارٹ یورپین لائبریرین نے انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کتاب کی موجودگی کو تحریر کیا ہے ... لائبریری میں بھی یہ کتاب موجود ہے۔ دو سو برس کی اردو کا نمونہ اور طرز ذاکری کی مثال حاصل مولف کی نسل میں سید محمد ... اور دیگر افراد بھی موجود ہیں۔

منشی عبدالخالق :۔ قوم کے ... تھے ان کا شمار اچھے لکھنے والوں میں تھا عمدہ ... کے ہاتھ کی وصلیاں اور کتبے رئیسوں کے کمروں میں آویزاں کئے جاتے تھے۔ شاہ نصیر کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

ہائے ہائے پیرہ کردیتے مرتکز اعتبار   غور کرنے ہم حقیقت سے کہ ... پایا ہے

مجو کاتب :۔ نام سید علی حسن تھا نسخ و نستعلیق کے استاد تھے غالب کا منظومہ ترجمہ رسالہ صحاح الفرس کا شاہکار ہے منشی شمس الدین احمد رقم سے بیٹر تھے عہد شاہی کے کاتبوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے قدیم طرز کے انسان تھے۔ آخر عمر میں کتابت چھوڑ دی تھی۔ صرف ایک ٹائٹل روزانہ لکھتے تھے جس کی اجرت اس وقت کے رواج سے دو روپیہ ہوتی تھی تو ان کے اور ان کے کبوتروں کے صرف کرنے کو کافی تھی کبوتروں کا شوق اس حد پر تھا کہ اگر صفوۃ المصادر نام لکھنے بیٹھے اور ص کی گردن ملا پائے تھے کہ کبوتر چھتری پر آگرے بیٹھا قلم رکھ کر کوٹھے پر چڑھ گئے اور گھنٹوں کے لئے اترے مزاج میں قناعت تھی ضرورت سے زیادہ پیسہ نہیں کماتے تھے شاگردوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے کوئی اولاد نہ تھی شاگردوں کا حال آئندہ آئے گا۔

وزیر باغ

نواب معتمد الدولہ سید آغا میر اس علاقے کے مالک تھے ان کی وزارت ختم ہوئے پر جب جائداد ضبط ہوئی تو وزیر موصوف کا باغ بادشاہ نے ملکہ جہاں کو بخش دیا۔ لکھنؤ میں وزیر باغ کی ککڑی بہت مشہور ہے پھولوں کے درخت بھی اس باغ میں زیادہ تر ہیں اور ... گل و گلزار کی خوشبو اب بھی باقی ہے۔

امامباڑہ مغل صاحب :- اس امام باڑہ کو حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی صاحبزادی نے تعمیر کیا پھاٹک عالیشان دالان عریض و وسیع صحرا میں شہ نشینیں کی کرسی بلند اینٹوں کی چنائی اور پلستر میں جو مسالحہ صرف ہوا تھا اس کا جز غالب سنگ جراحت ہے اور اسٹرکچر میں وہ چمک ہے جو کسی عمارت میں نہیں۔ صحن امامباڑہ وسیع اور پہلو میں مسجد بھی عالیشان ہے جس میں خانہ خدا کے گرد سرتاسر کوٹھے اور حجرے ہیں۔ شاہزادی صاحبہ کا ارادہ تھا کہ امامباڑہ حسین آباد کی طرح اس کو بھی شیشہ آلات سے آراستہ کر کے وقف کر دیں اور وہ ایسا کر بھی سکتی تھیں بہت سلیقہ شعار بھی تھیں لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ مرنے کے بعد زر و مال، دولت و جواہر کے علاوہ ایک کوٹھری میں مٹی کے وہ استعمال شدہ برتن جو مجلس کے حصوں میں آتے تھے یعنی مٹکے، ڈولے، اثاث البیت میں معمولی چیزوں کا بھی اسٹاک کپڑوں کے تھان، تھالیاں، کھانے، بادیں تک کی گٹھریاں، یہ کچھ تھا جو امانت کس قدر چھوڑے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس خاتون کا نام امۃ الصغریٰ فخر النساء بیگم تھا اور شوہر مجاہد الدولہ فخر الدین سیف الملک زین العابدین خاں خلافت جنگ تھے۔ جو ایسی خوبصورتی اور شہ زوری میں یکتا تھے۔ شاہی گاڑی پر جب سواری نکلتی تھی تو راستے روک دیے جاتے تھے اور تماشائیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے غصب حکومت کے وقت ان کا ارادہ جنگ و جدل کا تھا چنانچہ خود شاہ مرحوم اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

کہو کیا میرے نواب والا حشم — نہایت ہیں محسن بڑے ذی کرم

یہ کہتے تھے وہ ہاتھ میں لے کے تیغ — نہیں تم سے جاں اپنی مجھ کو دریغ

اگر حکم ہو لا رہ کوں جنگ ہو — کہا میں نے موقوف یہ ڈھنگ ہو

میں ہوں بے گناہ مری سرکار ہے — مصیبت پڑے پر بھی طاعت رہے

لڑنے کی اجازت نہ ملنے پر بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہاں کچھ دن اسی ناگوار میں زندگی بسر کی اور مجاہد الدولہ کی نسل کے لوگ کالمیں اور لکھنؤ میں موجود ہیں کربلائی نواب کہے جاتے ہیں۔ امامباڑہ کا پھاٹک منہدم ہو گیا۔ اصل عمارت اور مسجد خراب اور خستہ حالت میں موجود ہے ورنہ باغ میں بیلا، چنبیلی، موتیا، موگرا، چمپا، جوہی، کیتکی، کیوڑہ، گلاب، سدا بہار، گیندا، گل اودی، گل عباس، گل مہندی، نافرمان، گل زنبق، چمپا، گل رعنا، گل فرنگ، گل چاندنی، گل ستو، کلغہ سیوتی، گل دوپہری، سورج مکھی، لالہ سوسن، سرو، مور پنکھی، عشق پیچاں کیا کچھ نہ تھا۔

ٹکلیاں :- یہ محلہ جس کو ٹکڑی اور ٹکلیاں کہتے ہیں عہد آصفی کا آباد شدہ ہے پرانے آثار باقی نہیں جھپر سادہ دادی طبقے کا روباری لوگ بسے ہوئے ہیں بیتا پوری قبرستان اور پرانے چبوترہ کے اسپتال کے بیچ میں واقع ہے۔

عنبر گنج

عہد آصفی کا آباد شدہ محلہ ہے اور ایک زمانے میں مشرقی تہذیب کا گہوارہ تھا اعلیٰ تہذیب و تمدن کے لوگ بستے تھے اور خصوصیت سے اطبا کا مرکز تھا۔ محلہ کے نام میں کوئی توجیہہ مجھے تاریخ میں نہیں ملی ممکن ہے معجون میں مشک و عنبر لکھنے والے اطبا کی تجویز پر عنبر گنج ہوا ہو یا کسی خواجہ سرا کے نام زد ہوا اور عنبر علی خاں خیدیوں کے نام ہوتے تھے۔ عنبر گنج سب سے پہلے طب کا مرکز تھا اس کے بعد جھوائی ٹولہ نے یہ جگہ لی اس محلہ کے حکیم سید علی بڑے نامور طبیب تھے ان کے تحریر کردہ نسخے میری لائبریری کی قلمی بیاض میں موجود ہیں اور دواؤں کی ترکیب عام نسخوں سے جداگانہ ہے۔ مزاج ادویہ میں اسلوب خصوصی کا اخراج پایا جاتا ہے جس کو ایک سمجھدار حکیم ہی سمجھ سکتا ہے۔ جیسے

موصوف کے بیٹے ایک مرتبہ حکیم محمد عبدہ عرف منجھلے صاحب طبیب ماموں جھوائی ٹولہ کے مطب میں آگئے حکیم صاحب نووارد کے ساتھ جو عمل کرتے تھے اس کو معمول کر صرف انھیں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور سارے مطب کو چھوڑ دیا۔ میں بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ تشخیص کروانے گیا تھا میرا چشم دید واقعہ ہے منجھلے صاحب نے حکیم سید علی صاحب کے بیٹے کی آمد اپنے مطب میں فخر محسوس کیا اور والد صاحب سے موصوف کا تعارف کرایا وہ پیرانہ سالی کے دم میں تھے سر پر چوگوشیہ ٹوپی' سفید داڑھی' جسم میں دبلا پن پورا چھتیس سال سے کم نہ ہوگی۔ افسوس ان کا سنہ یہ واقعہ [illegible] کے قبل و بعد کا ہے مجھے یہ معلوم کہ یہ بزرگ بھی حکیم تھے یا نہیں اور ان کی اولاد [illegible] اس ایران کے حکیم سید علی اور ان کے بھائیوں اور معاصر اطباء کے حالات الامراء [illegible] میں تذکرہ ہیں۔

اگلے حکیموں کے نسخے تین یا چار پیسے کے ہوتے تھے [illegible] اور تعلقہ دار [illegible] کی خواہش پر قیمتی مرکبات تحریر ہوتے تھے ہر نسخہ اذار کی عام [illegible] کے مطابق تھا حکیم کے لئے ذاتی دوا [illegible] کا خلاف سمجھا جاتا تھا۔ بعض ایسے ضدی مزاج تھے جو کسی امیر کے گھر پر بڑی فیس ملنے پر بھی نہیں جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس کو علاج منظور ہو وہ خود مطب میں آئے اوقات کے اس قدر پابند اور پبلک معاملہ کا اتنا خیال تھا کہ اگر گلی میں موت ہوتی تو مطب کا ناغہ نہ ہوگا [illegible] بعد مطب اٹھ کر میت [illegible] کے پابند اور مریضوں کے لئے بالحاح [illegible] دعائے صحت کرتے تھے غریبوں سے فیس لینا حرام تھا' درحقیقت بعض نسخوں کے ساتھ نادار مریضوں کو چھپا کر روپیہ پیسہ بانٹتے تھے بعض ریل [illegible] گاڑی [illegible] لکھنؤ کے باہر جانا اپنی عزت اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ مجھے [illegible] ایک بڑے [illegible] حکیم صاحب سے ان کی طول عمر اور صحت جسم کا معیار [illegible] معلوم ہوا کہ موصوف نے کبھی وطن نہیں چھوڑا عمر بھر کسی شادی میں شریک نہیں ہوئے کبھی کسی کی دعوت قبول نہیں کی اور یہ وجہ بتائی کہ سفر روزمرہ کے پروگرام میں فرق لا کر صحت پر برا اثر ڈالتا ہے۔ شادی بیاہ میں شرکت اور دوسرے لوگوں کے یہاں کھانا کھانا اللہ میں [illegible] مریض کردے گا [illegible] اس کے علاوہ [illegible] تمام مضر صحت ہے سفر اور مہمانداری میں غذا کے اوقات بگڑنے کے ساتھ سونے کے اوقات [illegible] ہیں اس سے [illegible] صحت ہے۔

حکیموں کی ایمانداری اور مخلص خدمت خلق [illegible] کے ساتھ ساتھ عطار بھی ایماندار تھے دوائیں اصلی فروخت کرتے تھے زہر مہرہ خطائی کے عوض میں چھالیہ [illegible] پتھر کا ٹکڑا نسخے میں شامل نہیں کرتے تھے۔ عرق بادیان کی بجائے نل کا پانی کبھی نہیں دیتے حکیم اور عطار کسی میں بھی مذہبی تعصب نہ تھا سنی حکیم شیعہ مریض کے علاج میں جان لڑا دیتا اور شیعہ ڈاکٹر سنی مریض کو اچھا کرکے چھوڑتا عہد شاہی ختم ہونے پر ڈاکٹر بھی پیدا ہو چکے تھے ڈاکٹر [illegible] سنی ہونے کے باوجود ہر شیعہ طبقہ میں پیش پیش تھے۔

اس وقت اشتہاری دوافروش نہ تھے عطائی بھی کم تھے علاوہ زیادہ تر جان کی ذمہ داری کا احساس کرکے قابل حکیم سے رجوع کرتے تھے نوجوانوں میں تندرستی کو اپنے ہاتھ سے برباد کرنے کی عادتیں نہ تھیں اور امراض مخصوصہ پھیلے نہ تھے ایسے مریضوں کو دیکھ کر طبیب اپنی روزی کا شکار ہرگز نہ سمجھتا تھا اور دیانت کی روشنی میں فیصلہ کرتا تھا کہ کمزوری کے کیا اسباب ہیں ایک خوبصورت اور تندرست خوش رو توانا نوجوان کو شادی کے بعد محروم مسرت ہوتے پر دیار طب کی آخری شمع حکیم محمد نواب صاحب نے تین دن مکمل فاقہ دے کر غذا میں مرغ اور [illegible] تجویز کرکے بلا دوا صحت یاب کیا اور شہر میں ڈنکا بجا اسی طرح دور آخر کے دوسرے لاجی

یے سے مئی جون میں علاج شروع کردیا اور موسم سرما کا انتظار نہ کیا یہی بیچ چڑھانے پر مریض کو اتنا تیز بخار چڑھا اس کے خاندانی
حکیم طبیب تپ اتار نہ سکے اور وہ جاں بحق تسلیم ہوا اس قسم کے واقعات اور معالجات کو اگر تفصیل وار لکھتا ہوں تو کتاب
ضخیم بڑھ جائے گا اس عنوان کے خاتمے میں مجھے وہ رقعہ نقل کرنا ہے جو ایک طالب العلم نے اپنے دوست کی کمزوری کا اظہار کرتے
ہوئے حکیم صاحب کو لکھا اور دوائی مطلب پر تمہید اور شائستگی میں چار چاند لگا دیئے۔

"مردے ناقص العقد صحیح دختر عدیم، متمنی خواستہ و لعدم حرکت ناقل اتقا، ساکنین لازم آید امر کو فعلی برانگیزد کہ عامل
جامع گردد و حرام است این ہمہ مہ مے خواہد بود"

چھاؤنی حسین الدین خاں

اسی علاقے میں یہ قدیم بستی تھی جو اس وقت شہر کا ناکہ سمجھی جاتی تھی مگر اب گرے ہوئے مکانات شکستہ کھپریلیں کہیں کہیں چھپر اور کچھ خام مکان، یہ محلہ کا نقشہ ہے یہ تاریخی مقام تھا۔ ناصر الدین حیدر بہادر شہزادگی کے زمانہ میں یہاں نظربند تھے۔ اس محلے کے آثار قدیمہ میں نواب سعیدۃ النسا کی مسجد اور خود حسین الدین خاں کی مسجد ابھی موجود ہے اور یہ مسجد صاحب عالم بہادر کے مکان سے قریب واقع ہے درمیان میں کھیت اور راستہ ناقابل مرور ہونے سے میں اندر نہیں جا سکا۔ حسین الدین خاں کی بیٹی کا نام مہرالنسا بیگم تھا۔ آپ نے ایک قرآن شریف ۱۴ رشعبان ۱۲۵۵ھ کو مطبع محمدی میں حاجی محمد حسین کے اہتمام سے ۲۶ × ۲ تقطیع (بلا) پر نہایت صحت اور خوبیوں کے ساتھ دو حصوں میں سفید کاغذ پر چھپوایا پہلی جلد سورۂ کہف ۵۵۵ صفحات پر ختم ہے اور جلد دوئم سورۂ مریم سے شروع ہوکر ۴۴۴ صفحوں پر ختم ہے اگرچہ آخر میں غلط نامہ شامل ہے مگر حسن خط اور پختگی قلم کے لحاظ سے خط عرب کا نمونہ ہے۔
محمد علی شاہ بہادر کے عہد نامے سے واضح ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ موصوفہ کی تنخواہ [illegible][1] ماہوار تھی۔

امام باڑہ شہزادہ بیگم۔ اس محلے میں یہ امام باڑہ کھنڈر کی صورت میں موجود ہے شہزادہ بیگم کے شوہر کا نام میر نواب تھا اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکے۔

شیخ بیر علی شہسوار:۔ عہد واجدی کے باکمال شخص تھے ہاتھ میں پانی کا کٹورا رکھ کر گھوڑے کو کاوا دیتے تھے اور پانی نہیں گرتا تھا ان کا ہمعصر شیدی علی پہلوان بڑا طاقتور شخص تھا۔ ایک دن شیخ نے کہا کہ جب جانوں میری ران زین سے کھسکا دو پانچ سیر مردل بھی کھلاتا ہوں گھوڑے پر بیٹھے شیدی نے زور کیا مگر اپنی جگہ سے نہ ہلے ان کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ گھوڑے پر سوار ہوتے بائیں ہاتھ میں لگام لی اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی ایک آدمی کے سر پر رکھی[2] اور گھوڑے کو پھیرنا شروع کیا ایسی ہی مختصر جگہ میں گھوڑا پھیرتے رہے اور کیا مجال تھی کہ ہتھیلی آدمی کے سر پر سے ہٹ جائے۔

---

[1] عہدنامہ ص ۴۹ [2] قدیم شہر ص ۱۸۱

تیسرا باب

چاول والی گلی سے عالم نگر تک

گزشتہ باب میں اکبری دروازے سے نکل کر محمود نگر ہوتے ہوئے چپا دلی حسین الدین خاں تک کی سیر کی تھی اب چاول والی گلی سے عالم نگر تک جانا ہے قلم میں طاقت میرے بس کی بات نہیں کسی دوسری قوت کا کام ہے۔

چاول والی گلی:- اکبری دروازے سے سیدھے چلے جاؤ تو پہلے خیمہ دوزوں کے یہاں دری یا دری نگیرہ جیسے ذی عزت تمو کرائے پر ملتے ہیں اور شادی کے متعلق ہونے کام کے روشنی کا سامان اور سہرے وغیرہ وغیرہ۔ عہد شاہی کے خیمہ دوزوں میں مہر مداحسین خیمہ دوز جو بڑھاپے میں دوکان کا کل سامان گوالٹولی کا پورا اپنی لڑکی کے یہاں منتقل کر کے چلے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے دراز قامت، بات کے دھنی شاندار شخص تھے۔ ان کے بعد صادق حسین اور پھر رضا علی وغیرہ کے ہاتھ میں یہ کاروبار آیا ان دوکانات کے ساتھ چاول کی دوکانیں شروع ہو جاتی تھیں عورتیں موسل لئے ہوئے وہاں سے چاول نکالتی ملتی تھیں اور اسی بنا پر گلی چاول والی گلی قرار پائی۔ یہیں کا حال تھا اور رسالائے نام چوک کا تاریخی منظر جیسے ایک دریا بہتے گزرتے ہوئے تم نے دیکھا ہو گا بیچ بیچ کہیں نالہ آ کر ملا کہیں ندی کی شاخ پھوٹی اس طرح چوک کے گرد و پیش اور درمیانی تمام راہوں میں چوک کے خصوصیات پھیل پھیل کر شام اودھ کو وسعت دیتے رہے چاول والی گلی میں یہ بات چوک سے مسلسل تھی اسی گلی میں داہنے ہاتھ کی طرف بستی خان کا امام باڑہ اور سمت چپ نواب مسعود علی خاں عرف نواب مچھو صاحب زمان جو دعا تعویذ میں کافی مشہور رہتے پانچ سو روپے ماہوار وثیقہ مرد حلیم سلیم وجیہ جاڑوں میں روئی کا لبادہ اوڑھے ہوئے خوش مذاق خوش فکر خدمت خلق میں ملا اجرت فیض فائدہ پہنچانا بستی کا امام باڑہ، اساس کر رہ ہوئے ویران اور در و دیوار گرے پڑے مچھو صاحب بھی نہ رہے یہی علاقہ۔

نخاس قدیم:- عہد آصف الدولہ میں نخاس آباد ہو چکا تھا اور نخاس کی حدیں چاول والی گلی سے شروع ہوتی تھیں۔ لغت میں نخاس بازار بردہ فروشاں کے معانی میں آیا ہے لکھنؤ کا نخاس ابتدائی لحاظ سے تو لونڈی غلام خریدنے کی جگہ کا نام تھا۔ لیکن اس بازار میں نوابی اور شاہی کے زمانے پرانی ہر چیز ملتی تھی اور ضرورت مند اپنا مال بیچ کر پیٹ پالتے تھے۔ جمعہ کا دن سلطنت میں روز تعطیل تھا اور آٹھویں دن اکبری دروازہ کے سامنے بازار شروع ہوتا تھا دہلی میں بھی یہ بازار تھا

مادہ کوتا سنگ برہنگامہ رزم   تعہ بانازش آدینہ ما برہم زنم

<u>امام باڑہ نواب اکرام اللہ خاں</u> :۔ اکرام اللہ عہد آصفی کے سرمایہ دار تھے نواب حسن رضا خاں وزیر آصف الدولہ کی رفاقت میں دولت و حشمت کے مالک ہوئے۔ اکرام اللہ خاں اور تفضل حسین خاں چچا زاد بھائی تھے یہ امام باڑہ بائیں ہاتھ کی طرف سے ایک بلند زینے کے بعد پھاٹک سے گذر کر وسیع مگر محدود صحن بلند شہ نشین صرف ایک لمبا دالان جو طول میں امام باڑہ جھاؤ لال کے بعد سب امام باڑوں سے بڑا ہے پہلی منزل میں سڑک کے کنارے نانبائی وغیرہ کی کچھ دوکانیں ہیں اور امام باڑہ میں داخل ہونے کا دوسرا پرائیویٹ راستہ اس طرف سے بھی تھا صدر درجہ کے محاذ دائیں صحن میں کمرے تھے بعض مجلسوں میں امام باڑہ شروع سے آخر تک بھر جاتا تھا اور کمروں کی چھت پر پردہ سا، امرا اونچے طبقے کے لوگ بیٹھتے تھے۔ میر انیس کے چشم و چراغ سید خورشید حسن عروج[1] کے پڑھنے کی عید کے تیسرے اتوار کی مجلس میں سارا امام باڑہ کھچا کھچ بھرتا اور پھاٹک میں دیر کر کے آنے والوں کا ہجوم اور دولہا صاحب مرحوم کا ... نامہ میں یہ مصرعہ تھا ' گھنٹوں لگے ہیں سرے دو دو سے یہ میوہ اردن کے " مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ دیلائے تغزل کے آفتاب نابندہ حضرت رشید کے پڑھنے کی مجلس بھی ہم ہر رجب کو اسی امام باڑہ کا کثیر اسوہ تھا رد سا۔ امرا کی گاڑیوں اور سواریوں سے تنگ سڑک پر جگہ نہ ملتی تھی۔

<u>حکایت</u> :۔ بانی مجلس نے آنجہانی رشید کے مرثیہ کی مجلس میں جدت کی اور ترلوز تقسیم کئے ہزاروں کے مجمع میں ترلوز ما شاء کا رسے وارد۔ رشید کے معاصر نادید کو ترلوز جو علاوہ سڈول اور گول نہ تھا دیسے ترلوز کی شان تھی آپ اپنے دوستوں کے ساتھ ترلوز لئے ہوئے نکلے اور جو پھبتی کہی اس کو ۔ پوچھا ایک حکیم یادگار حسن کا مسجد میں قیام تھا بعض حصہ جسم کی بزرگی سے پجامہ بہت چوڑے در جبلا دکا پہنتے تھے۔

مادلاں محل روڈ جب امین آباد سے ملتی ہوئی وکٹوریہ اسٹریٹ سے ملی تو اس امام باڑہ کے غربی گوشے میں ایک جدید مسجد کا اضافہ ہوا اس امام باڑہ اور مسجد ہر حصہ عمارت کا ۱۹۳۲ء کی بارش کے بعد سے منہدم ہے۔ اکرام اللہ بانی امام باڑہ کی قبر اس امام باڑہ میں ہے۔ ان کے مرنے پر بی بی ان کی قابض ہوئیں اور ورثہ زوجہ اکرام اللہ سے شہنشاہ حسین وکیل نے اپنے پسر نابالغ بادشاہ حسین وکیل کے نام سے بیعنامہ کرا لیا۔ اس امام باڑہ کا ذکر اردوئے معلیٰ میں بھی ہے گزشتہ علم و ادب کا ایک مرکز تھا جو اب اجاڑ ہے امام باڑہ کے رقعات محسن اور پتہ میں "واقع نخاس قدیم" کی لفظ ہے۔

<u>علی حسین کی نہاری</u> :۔ نوابی سے اس محلہ میں علی حسین کی نہاری مشہور ہے نہار عربی میں دن کو کہتے ہیں اور اس رعایت سے نہاری دوپہر سے پہلے بک جاتی ہے جس طرح شامی کباب کی لفظ سے پہر کی پخت کی طرف اشارہ تھا علی حسین نخاس کے پرانے نانبائیوں میں جس کی دوکان خوب چلتی تھی اور علی حسین محمود کا شاگرد تھا جس نے شیرمال ایجاد کی آج بھی نخاس کے اس سائڈ میں نانبائی کی دکان اور شیرمال کی پخت ہوتی ہے شیرمال اور باقرخانی پر اپنے محل پر آئندہ بحث ہوگی۔ آتش کہتے ہیں سہ

رزق ہر صبح پہونچتا ہے مجھے بے منت   خون دل لخت جگر کی ہے نہاری تیار

(نوٹ) رقعات مرزا قتیل میں نخاس کا بار بار ذکر ہے اور اس محلہ سے مراد یہی قدیم آبادی ہے۔

---

[1] [illegible] میں انتقال کیا۔ [2] رقعات ۱۳۳۶ھ

حویلی اور باغ :- رقعات مرزا قتیل سے واضح ہوتا ہے کہ نخاس میں ایک حویلی تھی جس کے پہلے دروازہ سے دوسرے دروازہ تک ایک قطعہ زمین تھا جو حصہ سیر حویلی کا طول و عرض میں دوگنا تھا اس زمین پر دس بیس مکان تعمیر ہو سکتا تھا میر عبداللہ اور خواجہ جان وغیرہ کے یہاں مکانات تھے اور حویلی مذکور کے دوسرے دروازہ سے کنوئیں تک سو گز لمبی اور ۔ گز چوڑی زمین تھی ۔ دوسری سمت کنوئیں کی جگت سے سو گز لمبا اور پچاس گز چوڑا دوسرا قطعہ زمین ہے جو تمام کا تمام باغ ہے اور پانچ سو درخت گلاب کے اور چھ سو درخت بیلا موتیا اور کیلے اور زرد انگور وں سے ۔۔ درخت علاوہ اس کے درخت مولسری آڑو پپیتا اور میوہ دار دوسرے درخت باغ میں تھے۔ محلہ کی موجودہ حالت دیکھ کر تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ چاول والی گلی میں اتنا بڑا ٹکڑا کوئی زمین کا تھا ست اگر یہی مصاحب گنج سمجھ کر معلوم ہوتا کہ وزیر اودھ میر لعل علی ۔۔ تعمیر کی سات دیر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے برادر حقیقی کا نام میر نور علی تھا اور ان کے ۔۔ میں اتیس ۔۔ دوں ۔۔ ہوئے میر تیس سے کمیں ۔۔ فارسی پڑھی تھی یہ ۱۹۱۲ء میں اللہ کو پیارے ہوئے

امامباڑہ اکرام اللہ خاں کی مجلس کا ایک منظر حامد اللہ خاں شکوہ آبادی کے قلم سے

سید محمد عسکری صاحب نقوی دسنی پوری اپنی ڈائری میں جس کا اصل ۔۔ میرے پاس موجود ہے لکھتے ہیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق ۔ رمضان ۱۳۲۷ھ بعد شب آج شام ۔ میر ارشاد علی صاحب تمام مرحوم کے یہاں سے مجلس کا حصہ آیا کل حاجت مرحوم کے چہلم کی مجلس ۔۔ ۔۔ دوست ۔۔ حال میں سمجھتے ہیں ۹ کے دن لوا امامباڑہ اکرام اللہ خاں مرحوم واقع نخاس میں جا کر شرکت کی ۔۔ مولوی محمد صاحب ملک الصدق مولوی سید علی صاحب مرحوم نے ذکر مصائب فرمایا مجلس میں ہی رقت نہیں ہوئی

معرز واقعہ نگار ۔۔ کی ۔۔ ۔۔ رقص ۔۔ رائے اور معینہ سنگال کے کمالات پر گردیدہ ہونے کا ذکر کیا ہے اس خوشنوائی کے ۔۔ مولوی ۔۔ کیونکر سمجھتے مولوی محمد صاحب کا نام مولوی سید محمد عباس تھا اور وہ نورانی صورت ایسے ۔۔ ملست ہیں خوش گلو ۔ تھے مگر ان کی مجلسیں ہمیشہ قابل ذکر ہوتی تھیں ۔ جن شخصوں نے مولوی صاحب کا زمانہ دیکھا ہے وہ میری رائے کا ۔۔ کر سکتے ہیں۔

امامباڑہ شمشیر بہادر :- اس محلہ میں امامباڑہ اکرام اللہ خاں کے نزدیک امامباڑہ کا تذکرہ ملتا ہے جس کا نشان بھی باقی نہیں ہے

مرزا رینہ کی مسجد

اکبری دروازہ سے غلام حسین سکول کو جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر انگریزوں کے زمانہ حکومت کا ایک پارک اور دست چپ کی طرف مرزا رینہ کی مسجد ہے یہ مقام چوراہے سے اور وسط درجہ کی ہے ، کوئی خاص بات ہے نہ کوئی خصوصیت ہے مسجد میں حوض اور مؤذن کا حجرہ بھی ہے بانی مسجد کا نام زین الدین احمد خاں تھا لوگ مرزا رینہ کہتے تھے ۔ ان کو علامہ تفضل حسین خاں کی ہمشیر ابتہاج النساء کے شوہر ہونے کا فخر حاصل تھا ۔ مولانا احمد علی صاحب محمد آباد ضلع اعظم گڑھ سے جب تحصیل علم کے لئے لکھنؤ آئے تو اسی مسجد پر ٹھہرے ۔ چیر تنگ ضیق دعسرت کا مقابلہ کیا کچھ دنوں مسجد پر اذان دی اور مختصر مشاہرہ میں گذر اوقات کی کچھ دن اہل محلہ

سے طالب علم بحر کرامات ہو نچائی اور غفراں مآب کی مجلس درس میں شرکت کرکے علامہ بن کر نکلے اور ان کی اولاد میں علی میاں کامل ایسے اوتار پیدا ہوئے۔

مسجد کے رد برد مشعلچی شام کو برے باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اس انتظار میں کہ کوئی شادی بیاہ کے موقع پر روشنی کا سامان لیے ادھر آئے بحشاہ اور اس وقت کی روشنی کا سارا سامان یہاں آدمی بھیجکر حاصل کیا جاتا تھا۔

کسی وقت میں مرزا زیبہ کی مسجد کے نیچے شامی کباب عمدہ ملتے تھے اور پھر عرق بید مشک، کیوڑہ گلاب کی بوتلیں وغیرہ معشہ سید صاحب کی دوکان پر قابل تعریف ملتا تھا۔

سنگی بیگ کا احاطہ

عہد اکبر بادشاہ میں صو بیدار اودھ جواہر جاں کے نائب قاضی محمود نے محمود نگر اور یہ احاطہ آباد کیا سنگی بیگ اس زمانہ کا نیک بخت مزاج آدمی تھا یہاں کے رہنے والوں میں میر بادشاہ علی بقا بہت بڑے ادیب اور شاعر گذرے ہیں جو میر وزیر علی صبا کے چشم و چراغ تھے صبا کی ۱۲۷۱ھ تاریخ وفات ہے۔ سید حامد حسین رسا بھی ادیب کامل تھے اس خاندان کی ایک مسجد بھی محلہ میں موجود ہے ہر گوشہ میں اس محلہ کے کوئی صاحب کمال رہتا تھا بقیر کا تعزیہ ابھی سنگی بیگ کے احاطے سے پہلی ربیع الاول کو اٹھتا تھا۔ اور بادشاہ علی صاحب بقا محلہ کی آخری شمع تھے ان کے اوصاف حمیدہ میں جاوید کا یہ قطعہ تاریخ آئینہ زندگی ہے ؎

آں بقا، پاک طینت خوش نہاد — از جہاں بے بقا رحلت نمود

ذاکر والا نسب عالی حسب — قلب او از رنج و غم مجروح بود

بود نمک پاش جراحت ہر نفس — نظم دلکش از پئے قلب حسود

روشنی بخش جہاں ہماں چراغ — از ہوائے دور گشتہ آہ رود

عالم فن بود و بقا دستی — مثل او شاعر نہ آمد در وجود

او نشستہ چو بہ منبر آہ آہ — ہر طرف بر خواست آواز درود

چو بگویم دامن او را سحاب — بود یکتا در سخا و بذل وجود

خم سر محراب مسجد ہم شدہ — مثل چوں او ساکی و ساجد نبود

سال فوتش میوی جاوید گفت — ہست ممکن شرح اخلاص ودود

خود مرض آخر علاج زخم شد — چوں اجل آید ز کوششہا چہ سود

از سر افسوس گفتم ایں چنیں — داغ شاہ کربلا بر سینہ بود

۱۹۰۲ء

بقا کی قبر صحن مسجد کے سامنے ہے ان کو مرزا دبیر کے داماد ہونے کا فخر حاصل تھا مرزا صاحب نے لڑکی کو اتنا جہیز دیا تھا کہ گھر میں سمائی نہ تھی عاقبت بیں داماد نے اس اثاثہ سے مکانات خریدے اور وہ محلہ میں کئی مکانوں کے مالک قرار پائے۔

مسجد والا امام باڑہ :۔ احاطہ سنگی بیگ میں ایک امام باڑہ کا بھی پتہ چلتا ہے جو شاہ ہر بقا کے مورثان والی کا تھا ممکن ہے کہ ان کے [illegible] بانی ہوں مگر عمارت کا نشان باقی نہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ مسجد سے ملا ہوا امام باڑہ [illegible]

شاہ گنج :- خاص اس محلہ سنگی بیگ سے ملا ہوا واقع ہے اس محلہ میں مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ رہتے تھے جو مایہ ناز ادیب مشہور صاحب لغات تھے ان کا مرتب کردہ اردو کا لغت سارہ جہد حصہ اول میں نے دیکھا ہے لغات اب تک پہلا حصہ چھپا ہے اور باقی تمام نہیں چھپ سکا ——— اس لغت میں مرزا سلیمان قدر بہادر کی تقریظ ہے جس سے لٹریچر کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے وہ تنہا زادہ صاحب کی صحبت کے خاص آدمی تھے اس لغت کی طباعت شایان شان نہیں ہے لکھی لی چھپائی رکھی ہے نہیں کہا جا سکتا کہ اس محلہ کو کس نے آباد کیا حیدر گنج سے آنے والوں کے لئے علاوہ چوک کا مقدمہ یا تمہید اور چوک سے ندرے والوں کے لئے چوک کا تتمہ کہنا صحیح ہے دوسرے لفظوں کی زبان ماراری ماندوں یہاں پیچ حیدر دو مسامیان اور شادی بیاہ کے تقاریب میں کرایہ پر دی جانے والی چیزیں ۱۳۵۱ھ میں رضا علی میر لداحسین کی دکانیں اور آگے ڈھٹی تکیہ سراجی ہے جو جدید عمارت ہے اور نواب سلیمان بہادر اس کے متولی ہیں

حسین باندی طوائف :- مرزا رجب علی بیگ کے قدر دان شاہ دریں پر فضل حسین ثابت مرحوم نے ایک شادی میں ناچ محفل کے متعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دو محفلیں مرتب دیں ایک لو طبقہ میت دو سرا عام دو ستوں کیلئے خاص بزم میں مرزا دبیر اور شہر کے معروف ہوئے لوگ مدعو تھے دعوتی اطلاع یہاں بھی تھا تاں بھی مرزا دبیر کو معلوم ہوا کہ حسین باندی نے ان کی غزل گا کر محفل کو زیر و زبر کر دیا دل پر اثر ہوا وہ ہرگز گوارا نہ کرتے تھے کہ ان کی غزلیں ناچ مجرے کی زبان سے محفل رقص و سرود میں گائی جائیں۔ بڑی افسردگی سے آپ وہاں سے اٹھے گھر پہونچ کر سوار رہے ہیں مدعا اف ہوئے دل سے رنج رہا اس مقام پر ان کے نانا صاحب کا بیان ہے کہ دوسرے دن میں جو شاہ گنج میں ہو کر چلا تو حسین باندی کا لڑکا ملا اور کہا کہ آپ بیوی اجازت دیں تو میں کسی وقت حاضر ہوں میں نے کہا اچھا ایک پہر شام کو آنا۔ جب وہ آئی تو مجھ سے کہا کہ آپ نے مرزا صاحب سے یہ ذکر کر دیا کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی میں بولا ہاں باتوں باتوں میں میں نے کہا تھا تو پھر کیا ہوا۔ مرزا صاحب نے پہلے تو مجھ سے پوچھا تم کو میری کئی غزلیں یاد ہیں میں نے جواب دیا بس ایک غزل، انہوں نے مطلع پوچھا میں نے مطلع پڑھ دیا۔ پوچھا کے شعر یاد ہیں میں بولی نو دس شعر۔ پوچھا رات کو یہ غزل گائی تھی کہا جی ہاں، یہ سنکر وہ گھر میں اٹھے ہوئے چلے گئے اور ایک توڑہ پانچ سو روپے کا ایک رومال میں باندھ کر لائے مجھ سے فرمایا یہ روپیہ تم اپنی ڈولی میں رکھ لو آج سے اس غزل کو نہ گانا میں نے بہتیرا کہا کہ میں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤں گی آپ روپیہ رہنے دیجئے اس کی ضرورت نہیں فرمایا نہیں میں اب یہ روپیہ نکال چکا تم اس کو کسی کار خیر عزاداری وغیرہ میں صرف کرنا۔ جب مجھے قسم دے کر مجبور کر دیا تو میں وہ توڑہ ڈولی میں رکھ کر آئی۔ اس حکایت کے لکھنے سے غرض یہ ہے کہ خود مرزا صاحب نے کوشش کی کہ ان کا عاشقانہ کلام مشہور نہ ہو اور ارباب نشاط نہ گائیں (حیات دبیر ۱۳۵۵)

غلام حسین کا پُل

چوک ختم ہوتے ہی زمین کا طبقہ پست ہونا شروع ہوتا ہے اور سارا پانی برساتی اور روزانہ لوگوں کی ضرورتوں کا بہہ کے نالے میں گرتا ہے اور بارش کے زمانے میں آمد و رفت بند ہو جاتی ہے منصور نگر جانے کے لئے راہ میں ایک پختہ پل کی ضرورت تھی جس کو غلام حسین نے انجام دیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ غلام حسین کس عہد کے آدمی تھے۔ اس نام کے حسب ذیل لوگ اودھ میں شہرت یافتہ ہوئے ہیں۔

(۱) عہد سعادت علی خاں میں غلام حسین چکلہ دار تھے اور سلطان پور میں ان کا قیام تھا (۲) غلام حسین اصفہانی یہ دولتمند شخص

معصر تھے موخر الذکر کے والد کا نام مرزا محمد اسمٰعیل اصفہانی تھا ان کی مہر میں یہ عبارت تحریر تھی غلام حسین خاں بہادر ثابت جنگ ۱۲۱۲ھ
میں حسب تسییف تھے اور ماہ صفر ۱۲۳۳ھ کے مخطوطات میں ان کی تحریریں میرے سامنے ہیں۔ مرزا محمد اسمٰعیل سعودی گروہ کے ہاتھ سے عید
کے دن شہید ہوئے تھے ———————— ———————— (۳)

غلام حسین سائیں جن کے امام باڑہ کا قیصر باغ میں پتہ ملتا ہے (۴)، داروغہ غلام حسین (۵) غلام حسین جو عہد غازی الدین حیدر
تھے کوکب تخلص تھا محامد حیدریہ پر اس کی تقریظ ہے اور قصبہ جائس میں ان کی بنوائی ہوئی جامع مسجد اور پختہ حویلی ابھی تک
موجود ہے پل عالمگیر ابھیں کا بنوایا ہوا ہے (۶) منشی غلام حسین (۷) میر غلام حسین مانکے۔

کتاب ہذا کے اشاعت تالیف میں محادر درگاہ حضرت عباس نے کوشش کرکے اپنا بیان قلمبند کرایا اس کو علم سینہ اور خاندانی
معلومات سے پتہ ہے کہ غلام حسین کامل جن کاٹنے والے سیدا ور ہانکوں میں تھے ان کے زمانے کے اکثر بانکے ان کے نام لیوا یا شاگرد تھے اور سب
ان کا کلمہ پڑھتے تھے ان کو کسی موقع پر روپیہ کی ضرورت ہوئی اور مہاجن کے یہاں گئے وہ دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ فرمایا مجھے
پانچ ہزار روپیے کی ضرورت ہے فلاں دن اور تاریخ دیدوں گا اس نے بہت ادب سے کہا کہ آپ کے خود تشریف لانے کی ضرورت
نہ تھی کسی کو بھیج دیتے انہوں نے ایک ڈبیہ بھی دی اور کہا کہ اس کو رکھ لو۔ میر صاحب روپیہ لے کر گھر آئے اور جب ادائیگی کا
وقت آیا تو مہاجن کے یہاں حسب وعدہ پہونچ گئے ڈبیہ طلب کی روپیہ سامنے رکھا مہاجن نے روپیہ لیا اور ڈبیہ جو کھولی تو اس میں
کچھ نہ تھا اس کی روح پرواز ہو گئی کہ جو کہیں گے تاوان دینا پڑے گا میر صاحب نے مضطرب دیکھ کر تشفی دی اور کہا ڈرو نہیں۔ اس میں
میری مونچھ کا ایک بال ہے وہ موجود ہے روپیہ اسی کی قیمت تھا

(نوٹ، منشی غلام حسین جائسی تین بھائی تھے۔ غلام حسن، غلام حسین اور غلام رضا۔ ہر ایک کو سلطنت اودھ سے تعلق تھا غلام حسن
اتالیقوں میں کسی ڈیوڑھی پر مقرر تھے منشی غلام حسین کی قبر پکے تالاب کے قریب جائس میں موجود ہے اور ان کے دونوں غلاموں عبداللہ
اور عبدالحسین کی قبریں بھی ان کے ساتھ ہیں۔

اس پل پر قدسیہ بیگم زوجہ نصیرالدین حیدر بہادر کی ماں کا عالیشان مکان تھا جہاں وہ قدسیہ بیگم کے زہر کھانے کے بعد اپنے
پوتے میرن کو لیکر جو قدسیہ بیگم کے شوہر اول سے تھا چلی آئی تھیں داروغہ غلام حسین معتمدالدولہ کے جیرخواہوں میں تھے جب معتمدالدولہ
کی رہائی ہوئی تو غلام حسین ہی بادشاہ کی طرف سے استفسار حال کو آئے تھے کہا جاتا ہے کہ غلام حسین کا امام باڑہ بھی یہاں تھا چنانچہ
نہ رکاباک جس مقام پر چلتا ہے اور رکھا ہے مال کے جس گوشے میں رہتے ہیں یہ وہی آثار قدیمہ امام باڑہ کے ہیں غلام حسین
کی مسجد کا ذکر آگے آئے گا

اچھوتی گلی

تاریخ اودھ کا اہم باب اچھوتیوں کی سرگزشت ہے جس کو واقعہ نگاروں نے افسانوی رنگ دیکر وہ وہ طبع آزمائی
کی ہے کہ ورق کے ورق سیاہ ہیں۔ حالانکہ کئی معزز اہل قلم نے اس افسانہ کی حقیقت کا پول کھولا ہے اور میں آزادی کے ساتھ اس
نتیجے تک پہونچتا ہوں کہ اگلے زمانے میں کتنی لڑکیاں ایسی تھیں جو ہمسر نہ ملنے سے ن بیاہی رہ گئیں اور سن گذرنے پر اگر امکان بھی
تھی تو ان کو شادی کی طرف رغبت نہ ہوئی۔ خاندان کے لوگ اور دوسرے غیر متعلق لوگ ان کی عفت اور پاکدامنی کو نگاہ عزت

[illegible] ۔ ایسے واقعات لوائی سے قبل ہی تک برابر ہوتے رہتے ۔ بادشاہ تک کچھ عورتیں کی خبر تجرد پہونچی ادباہوں نے تنخواہیں [illegible] مقرر کردیں تو اس امداد کو اچھوتیوں کا محکمہ قائم کرنا ہرگز نہ کہا جائے تاریخ اودھ کو نگاہ تنقید نظر سے دیکھنے والے یورپ کی داد دینے والے پر غور نہیں کرتے ۔

ایران کے سیاسی افراد کی جریدہ دنیا موسوم بہ شہر نو ۔ ماہ ستمبر کے صفحہ ۳ پر ایک فوٹو شائع کیا ہے جس میں چند لڑکیاں [illegible] عریاں لباس کے برخلاف مردوں پر منقبض اور تمام جسم کو تا قدم چھپائے ہوئے نگرکشادہ رو چہل قدمی کر رہی ہیں ۔ ان تصویروں کو دیکھ کر عورت کا وفادار یاد آجاتا ہے ۔ معاملہ مذکور کا ان نوجوان عورتوں کے بارے میں یہ بیان ہے کہ "دختران تارک دنیا کر بخواہران عذرا در پیارس دموسوم بہ شہر زندگی بسر نی کنند" عیسائیوں کے نزدیک خدا کے بیٹے پر ایمان تو ان کی قدیم روایت تھی مگر خدا کی بہن اب پیرس میں پیدا ہوئیں اگر اچھوتیوں کا وجود سلطنت اودھ میں صحیح روایت سمجھا جائے تو وہ بہرحال چند مقدس ائمہ کی طرف نسبت تھی جو رستگاری حیثیت کی صلاحیت رکھتے تھے اس پر داعیہ نگار حقیقت کو افسانہ قرار دے رہے ہیں اور پیرس کے متمدن شہر میں مقدس لڑکیاں اس منزل پر ہیں جو مسلم اکثریت کے نزدیک انتہائی قبیح ہے اور اچھوتیوں سے کہیں بدتر یہ لڑکیاں جو انگریز خدا کی بہن سمجھ رہی ہیں ۔ اچھوتیوں کا وجود پڑھ سو برس کا واقعہ ہے اور پیرس کا منظر حاضر کی عیش پسند حکومت کا ذوق قبیح ہے ۔ اس خبر کے وجود پر کل گواہی دیتی ہے

بھارت کے مندروں میں دیو داسیاں جو ساری عمر دوشیزگی کی زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کے لئے یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ ان کے اعصاب اور ان کی جلد میں قاتل زہر ملا ہوا ہے جو مس کرے گا فی الفور ہلاک ہو جائے گا اس ماحول کو سامنے رکھ کر اچھوتیوں کا افسانہ تراشا گیا ہے ۔

نجم الغنی نے سلطنت اودھ کے حریف طبقے کو خوش کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور بعد میں کام کرنے والے دوسرے طبقے رنگ آمیزی کی اور یہ دیکھا کر نجم الغنی نے اس شاخسانہ کی سب سے پہلے اپنے قلم سے تردید کی ہے اور ان کا یہ لکھنا واقعے کے اضطراب میں کافی ہے ۔

آخر سید محمد صاحب مجتہد خلف مولوی دلدار علی صاحب نے فتوی لکھ کر بھیجا کہ اگر اس سے ثواب مقصود ہے تو بہرکیف حاصل ہوا ۔ اب مناسب ہے کہ ان لڑکیوں کا نکاح مومنین کے ساتھ کر دیا جائے تو یہ ثواب عظیم میں داخل کردے گا ۔

(تاریخ نجم الغنی ص ۲۹۷ جلد چہارم)

نجم الغنی کی کاوش قلم کے بعد بیگمات اودھ میں دوسری مرتبہ تحقیقات ہوئی یہاں تک کہ فرنگی محل کے مرکز علم اور ذمہ دار طبقہ سے اس جانبدارانہ اسلوب نگارش کا جائزہ لیا گیا اور سیر حاصل بحث ہوئی ۔

انوار رزاقیہ کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں بلکہ اصل مسودہ میں اچھوتیوں کے سلسلے میں مولانا عبدالرزاق صاحب (متوفی ۲۵ صفر ۱۳۰۷ھ) کا جو بیان ہے وہ نہ صرف تاریخ اودھ کے ایک راز کو کھولتا ہے بلکہ انگریزوں کی زبردستیوں کا ایک ہولناک تصور بھی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اچھوتیوں کے سلسلے میں یہ بالکل نیا پہلو ہے جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا اصل راوی [illegible] کی بنا پر بیان دے رہے ہیں ۔ مولانا کے مرید مولوی فخر الحسن موہانی کہتے ہیں کہ مولانا عبدالرزاق صاحب فرماتے تھے کہ ۔۔۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ نے ایک مکان حقیہ گومتی کے اندر پانی کے نیچے بنایا تھا اور مشہور کیا تھا کہ اس میں بارہ امام کی اچھوتیاں بنتی ہیں وہ مکان ایک مکان خلوت تھا کہ اعلیٰ درجے کے ارباب دانش اور ہر فن کے کامل ارباب حل و عقد وہاں جمع ہو کر امور سلطنت پر رائے زنی کرتے تھے مولانا عبدالباری صاحب نے اپنے دادا کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے اس مخلیہ کا پتہ دیا تھا اور مولانا عبدالوالی اور مفتی ظہور اللہ کا تہ خانہ میں آنا نقل کیا ہے۔ اچھوتی گلی کا غلام حسین کے پل پر ہونا بھی واقعہ کے افسانہ ہونے کا مددگار ہے۔ شاہی عمارت میں دریا کے اس پار یا ادھر کہیں کسی عمارت کا اچھوتیوں کی طرف منسوب ہونا نہیں ہے۔

منصور نگر

منصور نگر شہر کے امراء و رؤساء و شرفاء کے رہنے کی جگہ اور بعض ملنے جن کی شرافت مزاج روز روز ہونے کے واقعات کو دوبارہ لکھنے سے معاد عامہ نہیں اس لئے بتیک کرتا ہوں یہاں کے رہنے والوں میں مرزا محمد تقی امیر الدولہ ولد حیدر بیگ کے پوتے قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے جوزف جارث عیسائی کو عدالت پیاہ دی تھی۔

سلطان بہادر رانی سے ٹلیے والی گلی جاتے ہوئے سمت غرب میاں باغ کے کھنڈر ایک دیوار کی صورت میں موجود ہیں۔ اور مشہور ہے کہ سعادت گنج سے اٹھ کر نواب سعادت علی خاں نے سادہ باغ ہی میں قیام کیا تھا اور غازی الدین حیدر بہادر کا محل اسی باغ میں قرار پایا اور بنیاد سلطنت اودھ قائم ہوئی۔

ٹلیے والی گلی میں میر حامد علی مختار پیشہ ایک سید رہتے تھے جن کو خدا نے وہ بلند اقبال اور مدبر فرزند عطا فرمایا۔ جس کا نام شیعی دنیا میں باقی رہے گا خان بہادر نواب مہدی حسن انھیں کے چشم و چراغ تھے۔ انگریزی داں نہ ہونے کے باوجود بڑے بڑے تعلیم یافتہ ان سے قانونی مشورہ لیتے تھے۔ شیعہ اوقاف اور قومیات میں ان کا نام بار بار آتا ہے خوش نصیب ایسے تھے کہ ان کی ایک بہن شمس العلماء سید ناصر حسین صاحب کو منسوب ہوئیں اور دوسری سید محمد باقر صاحب مجتہد کو۔ لکھنؤ کے زندہ دل طبقے نے ان کو پہلا خطاب ہی النورین کا دیا ہمیں کے ورثہ پانے سے اپنے آبائی محلہ سے کٹرہ ابو تراب خاں میں آئے ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ کو انتقال کیا اور امامباڑہ غفرانمآب میں سپرد خاک ہوئے۔

کاظمین اس روضہ کے بانی کا نام جگن ناتھ تھا اور وہ قوم کے اگروال تھے مرزا منڈی سے قریب مال دروازہ میں رہتے تھے حضرت امجد علی شاہ کے زمانہ ۱۸۴۷ء میں اسلام لائے اور نام غلام رضا خاں رکھا گیا۔ حسن خدمات سے شرف الدولہ خطاب ہوا۔ درگا پرشاد مورخ ان کے حال میں لکھتے ہیں " رفتہ رفتہ در سرکار مرجع انام و سرمایہ حل و عقد خواص و عوام شد مرد با جرأت و همت بود " جلوس سلطان عالم کے چھٹے برس ۱۲۶۹ھ میں ان کے حساس دماغ کو خیال ہوا کہ لکھنؤ میں تمام روضوں کی نقلیں موجود ہیں شبیہ کاظمین نہیں ہے منصور نگر کے آگے ایک بڑا ٹکڑا زمین کا خرید کر روضہ بنوایا جس کی گل کاری اور رنگ آمیزی نہایت دلکش نظر فریب اور قابل دید ہے روضہ میں داخلہ ایک شاندار پھاٹک کے ذریعے ہوتا ہے جس کے بعد وسیع صحن ہے اور دو گنبد پہلو بہ پہلو ہیں۔ ان گنبدوں کا انداز ساخت اس طرح ہے کہ دو بڑے مدوّر مونڈھے بنا کر دونوں پر شلجم نما قبے بنائے ہیں اور خوشنما کلسیاں نصب کی ہیں دونوں مونڈھوں یا قبّوں پر سونا چڑھا ہوا ہے اور طلائی گمٹوں کی ایسی جڑائی دکھائی ہے کہ جب

لہ دیکھو سیادور ماہ اگست ۱۹۵۵ء ص ۲۴ مقالہ مولانا محمد رضا فرنگی محلی

سورج کی کرن ان قبروں پر پڑتی ہے تو چمک دمک اور جگمگاہٹ سے آنکھوں میں چکاچوند ہوتی ہے۔
قبے کے نیچے چوبی ضریح میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ کی قبریں ہیں۔ پوشش پڑی ہوئی ہے اور دو تابوت
رکھے ہیں۔ ضریح کے سامنے انگیٹھی، اگردان، رحل پر قرآن شریف در معصومہ کا قدم رسولؐ کا ایک پتھر رکھا ہے چھت آئینہ بندی
کی ہے جس سے یہاں آرائش کے منظر سامنے آجاتے ہیں۔ دیواروں پر ہاتھی دانت کے جوکھٹے رکھے ہیں اور قد آدم آئینے نصب ہیں۔
بالائے عمارت چار مینار دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ رواق میں دونوں طرف مجالس اور نماز جماعت کی جگہ ہے۔ سلام
گردش میں ایک طولانی سنگ تعزیہ بھی نصب ہے جس کو سید صادق حسین صاحب نے اپنے مقالے میں روضہ کا ہر کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے
کاظمین کے ہر دو معصوموں کی نقل قبور روضے کے نیچے برابر برابر موجود ہیں۔ یا تو کسی رئیس کی قبر کا سنگ حسینیہ ہے یا تعزیہ ہے جس کے
بارے میں نہ تو تاریخ میں صراحت ہے نہ کوئی بوڑھا آدمی ہی جو کچھ بتا سکے۔
غلام رضا خاں ہمیشہ خوش نصیب مقدر رہے۔ آخر میں تھے اور زندگی کے ہر دور میں کامیاب رہے اور پکے راسخ العقیدہ مسلمان
تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں شرف الدولہ کی تلاش میں روضے پر بھی گوروں کا حملہ ہوا اور یہ مقدس روضہ بھی انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔
جب شرف الدولہ کے قتل کے بعد یہ روضہ گوروں کے قبضے سے واپس ملا تو پھر سے آراستہ کیا اور لٹے ہوئے سامان کی فراہمی میں
شرف الدولہ نے جان لڑادی۔ روضہ کا سن تعمیر اس قطعے سے درج ہے ؎

در زمان ظل حق سلطان عالم بادشاہ ... ناصر دیں، محمد دو دستدار کاظمین
افضل و اشرف علامہ حضرت موسیٰ رضا ... ہست شرف الدولہ نامدار کاظمین
روضہ اش شرف النسا را ... کبیر فاطمہ ... محض بتوفیق خدا خدمت گذار کاظمین
از سکوں را شرف دار دشرف دو سردوہم ... یا رب تسکین از عطائے بے شمار کاظمین
ہر دو عالی منزلت باحسن بیت خاص شد ... خوشنما نقل رواق نور کاظمین
شد نصیب بندگان الحال سے رکھ سر ... خاک بوس روضہ گردوں وقار کاظمین
لکھنؤ شد غیرت فردوس بریں رنگیں بہار ... رونق سلام از دوار بہار کاظمین
گشت نقل مدفن سلطین ایں بیت باشرف ... گفت رقم سال تاریخش مزار کاظمین ۱۲۶۹ھ

روضہ کے تحفظ میں کوئی جائداد وقف نہیں ہے صرف دو ہزار روپے کے نوٹ ہیں اور دو دکانات کا کرایہ ماہوار آمدنی ہے
۱۹۱۰ء سے یہ روضہ آثار قدیمہ میں شمار کیا گیا ہے اور وقف حسین آباد کے زیر انتظام ہے۔ غلام رضا خاں نے ۲۶ جمادی الاول
۱۲۷۳ھ کو انتقال کیا۔ مرتے وقت تک ان کی زبان پر سورہ توحید کی آیتیں تھیں اور اسی روضہ میں دفن ہوئے۔ یہ قطعہ تاریخ
ان کی قبر پر موجود ہے ؎

چوں دریں حق غلام رضا خاں قبول ساخت ... زیں دولت راہ شرف الدولہ نام شد
با صدق دل نمود بنا نقل کاظمین ... زیں خانوادہ ساخت کرماں مقام شد
تا زیست جرم ماند با خیر گشت دفن ... خیرش بسے ایزد خیر الامام شد

تاریخ داشت سورۂ اخلاص در دو لب | اخلاص میان ہمہ خاص و عام شد
در کاظمین گشت چو آسودہ زیر خاک | رحمت مجاور لحدش تا قیام شد
ناگاہ عقل طالب تاریخ سال فوت | از پیشگاہ نعت شیریں کلام شد
محرمت حرف معجم و گفتا بقلب صاف | از کاظمین راہی دار السلام شد ۱۲۷۸ھ

قبر شرف الدولہ کے پہلو میں شرف النساء شیریں کی قبر ہے شرف النساء خانم اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتی تھیں ان کے ابتدائی استاد میر محمد حسین تشنہ تھے پھر امداد علی بحر سے اصلاح لی اور اس قدر مشق بہم پہونچائی کہ صاحب دیوان ہوئیں۔

مسجد کوفہ ۔ احاطہ روضہ سے ملحق مسجد کوفہ کی نقل ہے اس کے چاروں طرف محراب دار دالان ہیں بیچ کا درجہ محراب و منبر سے قبلہ رخ ہے اور وسیع صحن میں اسی کے مسلوں کی جگہ طوفان نوح کا نشیب، دھوپ گھڑی کا ستون غرض مکمل نقل ہے اور عمارت سرخ رنگ کی ہے۔ صحن کاظمین اور مسجد کوفہ میں کھجور کے درخت ہیں اور دیوار مسجد کے پاس وضو کا رہین دور حوض ہے اور آخری حصے میں تعزیہ رکھے ہونے کی جگہ ہے نقل روضہ حضرت مسلم دہانی بھی مسجد کوفہ میں موجود ہے یہ عمارت نواب رفیق الدولہ کی بنوائی ہوئی ہے۔

شرف الدولہ اپنی سیاست سے انگریزی عملداری میں بھی مقرب بارگاہ رہے چنانچہ رام سہائے ان کے حال میں لکھتے ہیں۔ شرف الدولہ غلام رضا خاں جیلہ امجد علی شاہ بعد انقلاب سلطنت اپنی حسن کارگزاری سے پیشگاہ حکام انگریزیہ میں خدمت گمیات خدمات سے سرفراز ہوئے حاضری دربار رئیس قدر سے غدر کیا چند سپاہی ان کے مکان پر گئے وہ انکار کرتے رہے بعد وقت عمل آمد فوج سے اطمینان حاصل کر کے حاضر دربار ہوئے اور انتظام رسد رسانی اور بانات عطا ہوا۔[1]

نواب آغا علی خاں :۔ محلہ کے رہنے والوں میں نواب صاحب کا حال بیان کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے آپ محلہ کے رئیس تھے ۔ مدع عنص تھا حسن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر اس لفظ کے اختیار کرنے میں ناظرین کو کوئی اعتراض ہو تو میں پوچھوں گا کہ آفتاب الدولہ ربیب النساء یہ نام اور لقب کب صحیح ہیں اگر اس کو درست صحیح سمجھا تو مداع بھی صحیح ہے۔ نواب اصغر حسین فاخر کی صحبت میں یکتائے تمنا تھے حسن کا نام نقی تھا نام کو مقطع میں اس لئے نہیں آنے دیا کہ میر تقی کا احترام مطلوب تھا ۔ ع ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر است
پانچ سو ساٹھ روپے کے تنخواہ دار تھے۔ صحبت کے لوگ حوصلے کے مطابق داد دیتے تھے۔ ہاں خوب آیا اڑتیس روپے پیش کئے تھے ۱۰ لاکھ روپے کا اندوختہ تھا جو خیر و خیرات میں صرف کر چکے تھے یہ دولت نجم الدولہ کی تھی جو عمر بھر بلند حوصلگی سے صرف ہوئی۔ ان کی سرکار سے مصاحبین کو بجائے ماہوار کے روپیہ مرحمت ہوتا تھا اور خزانچی کو صحبت کے اشاروں پر عبور حاصل تھا کسی کا نام قسم ہوا تو قاف کے چار آنے محسن کے لئے میم کے دس آنے اور اگر دو رفیقوں کے نام میں ایک ہی حرف ہوا تو جو بس میں زیادہ تھا اس کے لحاظ سے بڑی میم کو اس قدر چھوٹی میم کو اتنا یہ دینے کے انداز تھے تاکہ کسی خوددار کی ہتک نہ ہو۔

نواب اقبال الدولہ کا سکونتی مکان بھی کاظمین میں تھا اور مکان کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا منصور نگر روڈ پر ٹوٹی ہوئی ایک مسجد خانہ جو اکبری دروازہ سے گزرتے ہوئے دست چپ کی طرف پڑتی ہے اس عمارت کو کتب خانہ اب تک کہتے ہیں یہاں نواب الحاج سید سلطان علی خاں عرف باسو صاحب کے آباؤ اجداد کی کتابیں تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ وہی کتب خانہ ہو۔

---

[1] احسن التواریخ صفحہ ۵

...ال المدور مذکور کی لائبریری کا ایک خطی نسخہ میں نے ماہ رمضان [illegible] کو شبلی [illegible] اعظم گڑھ میں دیکھا۔

ترمنی کیج

محمد آصف کا آباد شدہ محلہ ہے، وہاں مقام [illegible] عالی جاہ [illegible] دہلی کے شاہزادگان رہتے تھے جو اپنی آن بان شان شوکت اور شعور میں بے مثال تھے۔ ایک کہانی کو واقعہ ہے کہ شہر کے شکار میں [illegible] حسرت کرکے ہاتھی تک آ گیا [illegible] ہو دے میں بیٹھے ہوئے کا ذ[illegible] اس کے مرتبہ [illegible] آزادی [illegible] اور شکار میں جواس باقی رہا [illegible] اگر جواس باقی [illegible] تربیت کی تو بڑا آپ کچھ ہیں [illegible] معقولات و منقولات فقہ و اصول میں بے مثال تھے اور عمامہ در [illegible] کی پرستش تھی [illegible] اپنے [illegible] ملاحظہ ہو سے

متبع [illegible] حضرت [illegible] ہے [illegible] متل [illegible] ہے آ د
عالی [illegible] و ریاض [illegible] [illegible] کامل ہے آ د
علم میں بے مثال [illegible] صدق [illegible] کا [illegible] عادل ہے آ د
منقی [illegible] [illegible] علامہ فاضل ہے آ د
مصرع تاریخ [illegible] [illegible] ۱۲۸۹ھ

واقعہ نگار [illegible] ان کو [illegible] علما کے [illegible] شاگرد [illegible] بھی [illegible] عاشق تھا اور کلیات آپ کے دیوان [illegible] چھپ چکے ہیں [illegible] مطبوعہ [illegible] محمدی میں ان کا یہ شعر لکھا ہے ؎

جو نامہ [illegible] پیام کی [illegible] رکھتے [illegible] نہیں رکھتے
ترے دیوانے کلب [illegible] کیا جلسے میں [illegible] [illegible] کا [illegible]

میر خلیق ان کی صحبت کے شاعروں میں سے تھے اور نواب [illegible] کی [illegible] کو [illegible] سمجھتے تھے۔ ایک دن کسی بات پر خلیق اٹھ گئے دربار کا آنا چھوڑ دیا آپ کو صدمہ محسوس ہوا۔ اتفاقات راہ میں کسی دن [illegible] کوئی ہاتھی روک کر [illegible] سلام کیا ؎

مستحق خلیق ہمارا سلام لو [illegible] سلام لو

خلیق چاہتے تھے کہ آنکھ بچا کر کسی گلی میں چلے جائیں شعر سنتے ہی ٹھہر گئے اور [illegible] ہاتھی بٹھا کر ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا عالیجاہ بہادر بھی [illegible] کی طرح بے مثال رئیس تھے ؎

[illegible] صاحب حضرت عالی جاہ تھے [illegible] سب امیروں میں بہت صاحب جود
مرزا حیدر بہادر کے تھے فرزند [illegible] خلق کا ان کے [illegible] شمیم مشک و عود
شاعر و شاعر نواز و فاضل و علامہ عصر صالح و محتاط و محو طاعت رب ودود
لکھنؤ سے پھر [illegible] ارادوں [illegible] [illegible] حسرت میں کیا جاکے [illegible]

وصف ان کے لکھنؤ میں تاریخ جلتے میر   حاجی دنیا ئیں میر متقی دریائے عود   ۱۲۸۱ھ

یہ دو بزرگ کے عکس میرے البم میں مع ان کی اولاد کے تصویروں کے موجود ہیں ان کے والد ماجد کا نام مرزا حیدر صاحب[1] تھا ان کے عروج و فروغ کی یہ تاریخ بتائی جاتی ہے کہ نواب امۃ الزہرا دختر اسحاق خاں مرحوم ملقب بہ بہو بیگم صاحبہ نے ایک دن سلطنت لکھنؤ کو نور جہاں کی طرح رہیں پر پڑا ہوا پایا شاید کسی قزاق کے دست تعدی سے یہ لڑکی ماں باپ سے جدا ہوئی اور یتیمانہ کوئی حادثہ عظمی تھا جو ماں کی گود سے محروم ہوئی ۔ اس قسم کے مظالم پبلک پر ظالموں کے ہاتھ سے ہوا کرتے تھے رحم دل بیگم نے شفقت سے اٹھا کر پالا پوسا اس سہرے ماحول میں بڑی عقل و شعور کی مالک ہوئی اور بیگم کی سرکار میں وہ تقرب حاصل ہوا کہ نصف الدولہ بیٹے ہو کر اپنی مالی ضرورتیں اس کے ذریعے ماں سے پوری کرتے تھے اور نواب کی لکھنؤ میں مہاجرت کی لطفا سی کا وقار دیکھ سکتے تھے بیگم نے اپنی لڑکی کر لیا تھا کہ بھائیوں سے کہوں گی وہ چھوکری کو اپنے لڑکوں سے بیاہ دیں گے تینوں بھائیوں نے انکار کیا کہ ہم سوتیلی یتیمی یا ایک کے ساتھ اپنی اولاد کا نکاح نہیں کریں گے بیٹا پوری خاندان کے ایک بزرگ کے پسر و چشم تیار ہو گئے ۔ بہو بیگم صاحبہ نے لڑکی ان کے سپرد کی یعنی لے پالک کا نکاح مرزا محمد تقی صاحب کے ساتھ ہو گیا بیگم نے انگریزوں سے جو عہد نامہ کیا اس میں لڑکی کے دولہا محمد تقی خاں کو ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار مقرر کئے اور ان کے پسر مرزا حیدر کو ایک ہزار روپے ماہوار دیا جا تحریر کیا اور یہ وثیقہ آج تک ان کی نسل میں موجود ہے مرزا حیدر صاحب اس دولت کے بڑے کروفر سے مالک ہوئے اور شہر میں اس اولوالعزمی کی زندگی بسر کی مرزا حیدر صاحب سے علما اور شعرا میں صاحبان کمال کی جو ہمت افزائی کی اس کی نقشہ کشی بہت طولانی بات ہے اور قلم میں طاقت نہیں ہو ان کی صحبت کے دانشوروں کی سیرت پیش ہو شیخ محمد بخش شہید ناسخ کے شاگردوں میں اور مرزا صاحب کے وظیفہ خوار تھے ان کی کئی غزلوں کی تضمین کر چکے تھے ۔

طینت پاک سے میں رشک کروں کیا ممکن   کہ طبیعت میں ازل سے یہ نہیں ہے مزمن

قول آتا ہے شہید اپنے لبوں پر ہر دن   گو مجھے رشک کی عادت نہیں حیدر لیکن

ہاں کبھی رشک بھی آتا ہے تو رواروں پر

عربی قواعد کے لحاظ سے زائر کی جمع زوار ہوتی ہے مگر اردو محاورات میں زواروں بالعموم کہا جاتا ہے شعر میں لطف زبان ہے عربی قواعد کے تحت میں نہ دیکھئے ۔

اعلیٰ جاہ و والا جاہ انھیں کے چشم و چراغ تھے جو جود و عطا اور کمالات ان میں باپ سے بڑھ گئے مرزا حیدر صاحب بخلاف رؤسا کے ۹ بجے رات تک دربار کرتے تھے ۔ ان کی بزم سب رؤسا سے پہلے درہم برہم ہوتی تھی ورنہ امراء لکھنؤ ساری رات جاگتے تھے دن ان کی محلسرا میں رات کو دن رہتا تھا کئی پشت تک یہ عادت باقی رہی ۔ میں نے خاندان نظام الدولہ کے ایک علم پرور ہوشمند سے رمزسے رات جگے کا راز پوچھا تو مرحوم نے بتایا کہ ہم کو رات کو خوف دشمن اور اندیشہ قتل میں سونے کا موقع نہیں ۔ دولت کے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں دن کی بہ نسبت رات کو زیادہ جان کا خطرہ رہتا ہے ۔ مرزا حیدر صاحب ۹ بجے محل میں چلے جاتے تھے بڑے بڑے شرفاء ذی عزت دربار میں حاضر ہوتے تھے ۔ ایک دن نواب نے انگڑائی لے کر کسی ندیم مصاحب کی طرف پاؤں پھیلا دیا ......

---

[1] وقائع سلطنت لکھنؤ صاحب

[illegible] انہوں نے ، مگر بی بی نے کر نواب کی طرف پاؤں پھیلایا اور دوسرے وقت سے آنا چھوڑ دیا نواب کو
[illegible] میری غیر معمولی روش سے میر صاحب خفا ہو گئے کئی روز کے بعد معذرت کے لئے گھر تشریف لے گئے اور یہاں میر صاحب کے گھر
[illegible] دم توڑ رہے تھے بی بی نے پوچھا کون ہے ۔ نواب نے کہا آپ کا بھائی ۔ میر صاحب نے برجستہ کہا کہ بھائی
ہوتا تو اندر کیوں نہیں آتے ۔ نواب پہونچے گھر کا حال اپنی آنکھ سے دیکھا بی بی کو بس کہہ کر پانچ سو روپے ان کے پاس رکھ دئے اور میر
صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دولت ... کی طرف سے آتے ... مرزا صاحب کے دسترخوان کے واقعات بھی مشہور ہیں اس گھرانے کے دو
ملکی آغا مہدی حسن خاں اور آغا مہدی حسین خاں تھے جو باپ دادا علی جاہ والا جاہ کے ہم تھے اور دونوں رسی میں مشہور آفاق تھے عدد کے
بعد سے پبلک ڈرکر انگریزوں کو صاحب کو ... ان سے ماں باپ سے بیٹے کی کیفیت ابوالحسن صاحب قرار دی تھی اور عوام آغا ابو صاحب کہتے
تھے مومن گنج ان کی ڈیوڑھی سے آباد اور تاحیات دردراہ پر تھی مدنی رہی گور رکھ پر آتا تھا اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ اسلاف نے
انگریزوں کو ... عام میں پیادہ دی تھی ... ٹرسٹ ... آغا ... اعلیٰ ٹرسٹی تھے عہدہ ٹرسٹی کی تنخواہ کبھی نہیں لی ۔
اور رقم مذکور جمع کر کے سلطان المدارس کی عمارت ... آغا صاحب کی ... بڑے بھائی آغا مہدی حسن بھی اپنا سارا روپیہ
عربی تعلیم گاہ کے لئے ۔ ... انہوں نے ایسا نہ کیا ... تمام حشمت و ثروت ... ہو گئی لیکن آغا ابو صاحب کی دولت جامعہ سلطانیہ
کی صورت میں باقی ہے آغا صاحب بھی عربی داں تھے اور ... سے عربی میں بات چیت کرتے تھے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے آخر
عمر میں روزہ رکھنے کی طاقت ... ہر ماہ رمضان ... کا پورا ... کرتا تھا سختی سے پابند ... تھے ان کا امام باڑہ اور وقف
حسین آباد ٹرسٹ کی ایک ... کی حیثیت سے ... گنج میں موجود ہے جس میں مجلسیں ... ہوتی ہیں پچاس برس پہلے دونوں بھائی
میزبان بن کر امام باڑہ میں علیحدہ علیحدہ بیٹھتے تھے ہر بھائی کے ... اس سے قریب بیٹھتے تھے اور وہ نورانی مجلس ہوتی
تھی جو عزاداری اودھ کی آخری یادگار تھی آغا صاحب کے کئی فوٹو میرے پاس ہیں ان کی وفات ۱۹۱۸ء میں ہوئی ... محلہ منصور نگر
اور ... گنج کے بڑے بڑے لوگوں کے نام حسب ذیل الفاظ میں ہیں

نواب محسن علی خاں صاحب ، مرزا محمد عسکری صاحب ، مرزا محمد کاظم خاں صاحب ، ... صاحب ، مرزا والا جاہ صاحب بہادر ، آغا ابو
صاحب ، آغا مہدی حسن خاں صاحب ، آغا محمد تقی خاں صاحب ، مہدی علی خاں صاحب ، وکیل آغا محمد صاحب احتشام الدولہ بہادر مع صاحبزادہ
یوسف مرزا صاحب ، مولوی ... حسن صاحب ، حکیم مرزا ... حسین صاحب ، ملا احمد علی صاحب ۔

آغا صاحب کو شکار کا شوق بڑے پیمانے پر تھا اور شکار کو ہمیشہ ... انگریز کے ساتھ جاتے تھے سارا خرچ خود برداشت کرتے
تھے شیر کے شکار میں ... ہاتھیوں ... جانے کی نوبت آتی تھی اسی ساز و سامان سے ایک مرتبہ شیر کو اپنی گولی سے گرایا ۔ یورپین نے کہا
یہ میری گولی سے گرا ۔ آپس میں اختلاف ہوا اور فیصلہ اس بات پر ٹھہرا کہ اس شکار میں جو شیر مارا جائے اس کے اسی جگہ گولی پڑے جہاں پہلا شیر زخمی
ہوا ... کئی شیر ... اسی نشانہ پر گرائے اور وہ انگریز بہت شرمندہ ہوا ۔

شہسواری میں بھی آپ یکتا تھے عراق میں عربی گھوڑوں کا ایک تاجر تھا اس کے سودا کرنے کا قاعدہ یہ تھا کہ گاہک قیمت ادا کر کے
گھوڑے پر بیٹھ کر واپس ہو اور اپنی قیام گاہ پر گھوڑے کو پہونچا دے تو گھوڑا اس کی ملکیت ہو گیا ۔ اصطبل میں جو یکتا راہوار تھا اس کی قیمت لے
... کر خریدار کو کبھی اس کے گھر پہونچنے نہیں دیتا کچھ دیر میں آجاتا تھا ۔ آغا صاحب سوار ہوئے اور تیسرے دن اپنی قیام گاہ ...

…نے ہوئے پہونچے عرب کے صحراؤں میں گھوڑے نے پھرایا ناہموار راستوں میں لئے ہوئے گھوما تین دن کے بعد تھک کر قابو میں آیا تو حقیقت پر…
…پڑا اور عرض کیا کہ میرا قصور معاف کیا جائے گھوڑا واپس کر دیجئے۔ آپ نے گھوڑا بھی اس کو دیدیا اور دام بھی نہ لئے اس فیاضی اور شہسواری کے
…عرب بھی قائل ہو گئے۔

آپ کی سواری جب صبح کو نکلتی تھی تو چار گھوڑے زین و لگام سے آراستہ تیار رہتے تھے ایک گھوڑے پر خود اور دو گھوڑوں پر
دونوں صاحبزادے اور چوتھے گھوڑے پر چابک سوار ہوتا۔ ممکن نہ تھا کہ باپ کے گھوڑے کے آگے صاحبزادوں کا گھوڑا پہنچ جائے یا چابک سوار کی
… مرشدزادوں کی سواری سے بڑھ جائے جب تک شہر میں گھوڑے بہت آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھتے اور بستی سے نکل جانے کے
… ایک گھوڑا دوڑایا جاتا اس وقت ان کی سواری کے لئے سڑک خالی ہو جاتی۔ کبھی آپ کے ساتھ گھوڑوں پر دوستوں میں راجہ دین دیال اور
… بہادر ڈاکٹر عبدالرحیم بھی ہوتے۔ بعض اوقات گھوڑے پر سوار سلطان المدارس کی نئی عمارت میں آجاتے اور مدرسہ کا معائنہ سواری ہی پر سے
… ملاحظہ کرتے آغا صاحب کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

گر بہ میر و سگ و وزیر و موش و دیوانی کنند ۔۔۔ این ہمہ ارکان دولت جانہ ویرانی کنند

آغا صاحب کے چابک سواروں میں عہد واجدی کا پوربی صاحب کمال تھا شیخ سر علی کا شاگرد تھا آخر عمر انگریزی دور میں ترقی کی
… اس کے لئے سہارا تھا۔

بھوانی گنج

یہ محلہ عہد آصفی میں آباد ہوا۔ اس وقت بھی غریب طبقہ رہتا تھا اور اب بھی سستے کرایہ پر مکان مل جاتے ہیں زیادہ تر غیر مسلم بستی
… شہریت کا طمینہ سے گذرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

کٹرہ خدا یار خاں

خدا یار خاں عہد برہان الملک کے سرداروں میں تھے اپنے زمانے میں اس جگہ کو آباد کیا یہاں نواب ابراہیم حسین خاں ایک چھک رو
… قامت شخص رہتے تھے جو زیادہ تر ریاست الور میں رہتے تھے خط شکستہ اور شفیعہ کے بہترین ماہر تھے نستعلیق بھی ان کا بہترین خط تھا لکھنؤ
کی تہذیب قدیم اور ادبی صحبتوں کے یادگار تھے

عالی شان کی مسجد :- کٹرہ خدا یار خاں سے مہدی گنج جانے کے لئے راہ میں ایک قدیم مسجد پڑتی ہے جس کے بارے میں کوئی بتلانے والا
نہیں کہ بانی مسجد کا کیا نام تھا۔ دست راست ہی کی طرف ایک دوسری مسجد ہے جس کے درجہ میں کربلائے معلیٰ کی خاک کی زیر سقف ایک مسجد
ہے جو خاندان مرزا حیدر صاحب کے کسی شخص کی یادگار اور نسبتاً جدید ہے اس خصوصیت خاص کے ساتھ بھی شہرت سے خالی ہے اور بہت
کم لوگ اس راز کو جانتے ہیں اور نمازیوں کے استعمال میں بھی نہیں ہے اچھی حالت میں ہے فرش زمین خراب ہو چکا ہے۔

مہدی گنج

اس محلہ کو حکیم مہدی نے اپنے زمانۂ وزارت میں آباد کیا یہ منصور نگر سے بائیں ہاتھ کی طرف واقع ہے پہلے راجہ دین دیال کی کوٹھی
… سالہ کا پختہ پل لکھوری اینٹوں کا ملے گا جہاں ہفتہ میں پانوں کا بازار لگتا ہے جس کو دریبہ کہتے ہیں راجہ بڑے علم دوست شریف اور
مسلمانوں سے میل جول رکھنے والے آدمی تھے اپنے زمانہ میں سڑکوں پر مویشی اور گھوڑوں کے پانی پینے کے حوض آپ ہی نے بنوائے اور بگھی …

اور دوسری سواریاں چھراہوں پر پہنچ کر جاتی [illegible] رستے [illegible] کوئی راہ کوروک تھا کوکلی میں آیات قرآن اور پنجتن پاک کے ناموں کے طغرے [illegible] کہیں [illegible] ہوتے تھے حکیم یعقوب کے شاگرد تھے ان سے [illegible] مدرسہ امامیہ کی فقہی کتاب کی عوامت [illegible] دریائے گذرے

حکیم شمر تا صاحب [illegible] آپ کا [illegible] ہوتے تھے [illegible] پہچانا تھا اور خدمت خلق میں [illegible] معمولی قیمت [illegible] کرکے پہلے روٹی سالن بھیجتے [illegible] حکیم [illegible] نام ہو [illegible] رکھا۔

کربلا عظمت الدولہ اس [illegible] محکمہ تھا اس کے ہاتھ میں تھا آخر میں بخاری کا محکمہ [illegible]

[illegible]

ایسے ہی [illegible] فرمایا میری خواہش ہے کہ یہ آپ کے پاس رہے [illegible] ان کو دیدیا دوستالہ یہ کرغریبا موشادی ہوگئی [illegible] موجود ہے جس کی عکاسی مشکور الدولہ [illegible] اس تصویر میں آپ گاؤتکیہ سے لگے بیٹھے ہیں [illegible] یاک اور سامنے رحل پر قرآن شریف ہے رنگت گوری [illegible] داڑھی مونچھیں بالکل [illegible] چہرہ چوڑا چکلا کھرا ستاندار آنکھیں بڑی بڑی، پیشانی چوڑی [illegible] سر پر چوگوشیہ ٹوپی گلے میں انگرکھا [illegible] آج دوستالہ کا کیتی نہیں رہا نہ کوئی [illegible] اس وقت [illegible]

کمل کا [illegible] کی قدر شامل کیا

کربلا [illegible] آدمی مقدار کی [illegible] ہو جاتی تھی کسی صحبت میں عظمت الدولہ کے سامنے اس قرصدری کا ذکر ہوا [illegible] فرمایا مجھے اس شرط سے منظور ہے کہ کربلا پھر آپ ہی کی کہی جائے اس وقت سے کربلائے عظمت الدولہ مشہور ہوئی پھر بھی مدتوں لوگ مولوی صاحب کی کربلا کہتے رہے کربلا میں صرف ایک عالیشان امامباڑہ بنا ہوا ہے جس میں [illegible] سیٹس ہے دالان کے علاوہ [illegible] ہے وسیع صحن میں تعزیے دفن ہوتے ہیں انگنائی کی دیواروں سے محدود ہے [illegible] ہے جو اودھ الیکٹرک کمپنی لکھنؤ نے امام مظلوم کے روضہ کی مسدلی تصویر ہو کر حال میں تیار کی ہے [illegible] محرم ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا ہے کربلا کے باہر بھی تعزیے دفن ہوتے ہیں اور ایک درخت صحن میں ہے جو [illegible] کی نقل ہے جو اصل روضہ امام مظلوم میں گنبد

روز قتل سے پہلے رکھا جاتا تھا۔ بخشو اور فقیر کا تعزیہ اور حبیب تعزیہ پیچھے اسی کربلا میں آتا تھا خود معتمد الدولہ کے تعزیہ کے ساتھ معافیخان کی سرا سے مہدی گنج تک سونے چاندی کے پھول لٹتے تھے اور خلق خدا کو فیض جاری تھا۔ امامباڑہ کے آمنے سامنے ایک مسجد بھی کسی خانم صاحبہ کی ہے جو تاریخ سنہ ۱۲۸۲ھ کی تعمیر ہے۔ پتھر مدت دراز سے پڑھا نہیں جاتا کیونکہ بظاہر مسجد کا درجہ ہے۔ ممکن ہے پہلے کی تعمیر ہو۔ منشی رام سہائے تمنا نے تاریخ میں لکھا ہے کہ عشرہ اور چہلم گذرنے پر ہر سال تعزیہ اس کربلا میں دفن ہوتے تھے اور آراستگی کربلا کی عصمت الدولہ کے ہاتھ سے ہوئی اور روشنی کا خوب انتظام کیا۔ سقہ ہائے آتش ہر سو واسطے چھڑکاؤ اور تسکین تشنہ کامان ماتم سراء گشت کرتے تھے۔ پارچہ دال وغیرہ حصے بٹتے تھے۔ بانی کربلا کا قطعہ تاریخ اس طرح ہے ؎

بانی سبب دولا حسب اشرف لقب　　رفت و شد در ماتمش ماہ تماشی شدہ

کربلا کرد آن بیگم جون می چکد　　تو ان گفتش کر ریگ ترع دیں کا ہی شدہ

مستند در درد طبع تمنا ساب پ　　گرچہ در رم لیک دل در ہیں عمر آگاہی شدہ

بود کم گو تا غم ان سور علیہ مکان　　کرمبر تو ان مہ و ساماں جاں کاہی شدہ

سال تاریخ وفات اہل ادار و　　معصمت الدولہ سوئے دار البقا راہی شدہ

۱۲۷۶ھ

میر فدا علی نثار۔ محلہ کے مشہور صاحبان کمال میں تھے صنف ذاکری میں اس عہد میں عروج حاصل کیا جب میر محمد شاہ اور میر انیس زندہ مالک منبر سمجھے جاتے تھے۔ سوز خوانی مرثیہ اور حدیث کا یک وقت موجد ہونے سے نام ارتقا تک پہونچی۔ میر صاحب اپنے کمال کی ابتدائی منزلوں میں ناستی مزاج سیاحت پسند آزاد طبیعت انسان تھے۔ ذاکری کی بدولت ہر شیعہ آبادی میں ان کا تعارف ہوا۔ تبیح بازن دیکھ کر ان کی طبیعت میں انقلاب ہوا اور یاد خدا کی فکر ہوئی۔ مآثر حسن دل کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی جو ان کی مختصر سوانح ہے یہ منظوم ہوا اکیس ستمبر تک تھا مطبع نظامی پریس مقام آگرہ ایک جزو یہ دہلی میں چھپی اس مثنوی میں موصوف نے ہی تمیں زیدی لکھا ہے والد کا نام سید احمد علی اور دادا سید شیخ علی تھے۔ دیباچہ میں یہ بھی ہے کہ وہ مرزا محمد رضا کے شاگرد تھے۔ اس ضمن ذکر میں یہ بات رہ جاتی ہے کہ تلمذ شعر و سخن میں تھا۔ محمد رضا سوز خوانی میں تھے

مثنوی کی تاریخ اشاعت میں یہ شعر ہے ؎

مثنوی جس سنہ میں یہ چھپائی گئی جب لے خدا　　تیرہ سو بارہ تھے سال ہجرت خیرالوری

مثنوی کا مآل یہ ہے کہ عشق حقیقی کی منزل صرف محمدؐ و آل محمدؐ ہیں جن کی مودت اللہ نے واجب کی ہے کتابچہ اس مدحیہ شعر پر ختم ہوتا ہے جس سے ان کی قوت تغزل کا تعارف ہوتا ہے ؎

اہل دل دل سے ان پہ مرتے ہیں　　دل جو لے کر نہیں مکرتے ہیں

مہدی گنج میں میر فدا علی نثار کا مکان اور ان کی نسل اب بھی موجود ہے۔

مہدی گنج کے رہنے والوں میں اعجاز حسین سوز خواں بھی قابل ذکر ہیں اندر کربلا سے قریب حیدر حسین خاں کی بارہ دری کا کھنڈر بھی ہے یہی حیدر حسین جن کا چوک میں پھاٹک ہے۔

کربلائے دیانت الدولہ

آغا مرزا نامی ایک مرد علم دوست دیانت الدولہ کے احباب میں تھے ان کے شوق دلانے پر وہ سفر حج و زیارت پر آمادہ ہوئے اور ۱۲ برس میں ان کا یہ سفر ختم ہوا اور مدینہ منورہ کی صعوبت سفر کی زحمت اٹھا کر گھر آئے۔ کربلا کی پاک سرزمین پر پہونچے تو یہ جذبہ بھی پیدا ہوا تھا کہ وطن پہونچ کر کربلا بنواؤں گا۔ حرم امام کا نقشہ اور ریختہ لیتے آئے اور تحصیل سعادت گنج میں جو ایک وسیع علاقہ عرفی شہر کا ہے کربلا بنوائی اور مصارف کثیر صرف کیا۔ عمارت دیانت الدولہ کی کربلا کے نام سے مشہور ہوئی۔ آغا مرزا نے اپنا وطن ایران چھوڑ کر لکھنؤ میں قیام کیا اور ایک فرزند آغا محمد علی مرزا چھوڑ کر انتقال کیا۔ جن کو لکھنؤ کے علمی و ادبی گرد و پیش میں شاعری کا شوق ہوا اور فنی ریاضت سے کمال شہرت حاصل کی [illegible] اساتذہ فن کی صف میں جگہ ملی۔ اردو فارسی میں ان کا کلام بلند ہوتا تھا اور عمر بھی لمبی نہیں پڑھتے آشفتہ تخلص تھا۔ [illegible] کے گلدستوں کی ترتیب [illegible] کے مرثیات میں [illegible] متصل کربلائے مذکور میں موجود ہیں آصف کو وقت آخر مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے سے میں نے تکلیف میں دیکھا۔ متبرکات [illegible] عموماً مسجدوں میں دن گزار [illegible] پیری کے زمانے میں وہ ایک بار مسجد تحسین سے [illegible] کی تکلیف پر مشکل گھر لائے گئے ان کے نواسے [illegible] متعدد برس میں [illegible] کی خدمت کرتے ہیں اور وظیفہ کی کوشش میں ہیں [illegible] کربلا سے اٹھتا ہے کربلا اس وقت وقف داراب علی خاں خواجہ سرا میں شامل اور مشہور ہے۔ بہترین حفاظ سید شوکت حسین موسوی کے زیر نگرانی ہے آغا میر کی ڈیوڑھی اس علاقے کا مشہور مقام ہے جو معتمد الدولہ کی طرف منسوب کر دی [illegible] یہاں کی مجلسوں اور [illegible] کا ذکر ہے۔

تالمیں سے تھوڑے فاصلے پر یہ کربلا عالیشان عمارت کی صورت میں واقع ہے اور [illegible] اصل روضہ امام مظلوم سے زیادہ مشابہ ہے عالیشان پھاٹک کے اندر محدود میدان اور درمیان میں عمارت روضہ پکی کی طرف ایوان طلا اور درمیانی صحن کی نقل بر آمدہ میں موجود ہے روضہ کی ایک وسیع دالان جس پر زیارت کندہ ہے دیوار پر لکھی ہے گنبد درمیان مثل دیگر کربلاؤں کے بلند ہیں پہلو میں باغ اور تعزیہ دفن ہونے کی جگہ ایک احاطے کی صورت میں ہے جو پہلو سے قبرستان [illegible] کی طرف ملحق ہو جاتی ہے بانی

کربلا کا پورا نام دیانت الدولہ [illegible] الملک محمد معتمد علی خاں بہادر امانت جنگ تھا [illegible] کا عہدہ کمپنی سے سپرد تھا۔ واجد علی شاہ نے خود ان کی مدح میں کہا ہے ؎

دیانت میں اس طرح سے تھا سپر — کہ جس طرح پروانہ ہو شمع پر

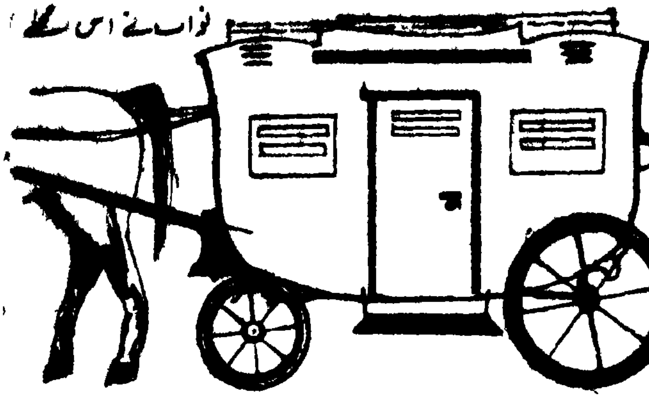
دیانت الدولہ کی وفات پردیس میں ہوئی اور لاش لکھنؤ پہونچا کر اسی کربلا میں سپرد خاک ہوئی ممتاز العلماء مرزا محمد حسین نے نماز جنازہ پڑھائی۔ دیانت الدولہ کے کارندہ کا نام ذوالفقار علی حسین تھا۔ صفدر مرزا پوری ناقل ہیں کہ ایک حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میر نفیس مرحوم ایک دفعہ دیانت الدولہ کی کربلا میں مرثیہ پڑھنے تشریف لائے سامعین کا ہجوم کثرت سے تھا بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی گرمی کا زمانہ تھا میر صاحب نے ایک سلام پڑھا جس کا مقطع اسی وقت موزوں کرکے یہ پڑھا ؎

نفیس اس سے ہم تو سمجھے ہیں دوست جا بیٹھے — خراساں میں کعبہ میں روضۂ سبط پیمبر میں

؎ زمانہ کانپور [illegible]   ؎ بزم خیال ص ۱۳۱

سعادت گنج

مغربی لکھنؤ کا آباد محلہ پہلے مبارک گنج نام تھا۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم نے قیام کیا اور بنارس چلے گئے۔ اسی وقت سے سعادت گنج نام ہوا اور دورِ حکومت میں نواب نے اس محلے کے لئے خاص قوانین وضع کئے تھے اور تاجروں دوکانداروں کو زیادہ سے زیادہ سہولت[1] بہم پہونچائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت گنج غلہ، ردی، یونانی ادویہ کی اب تک منڈی ہے اگرچہ یہاں سے بازار میں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہوتی ہے مگر مرقومہ بالا اشیاء سعادت گنج کے خاص اسٹاک میں ملتی ہیں محلہ اس قدر وسیع ہے کہ قدم قدم پر رؤساکی ڈیوڑھیاں اور امیروں کی سرکاریں تھیں بعض کے آثار باقی اور بعض کا صرف نام صفحۂ تاریخ پر ہے



دلی دروازہ۔ گاڑی اڈہ میں ایک پھاٹک تھا جس سے دہلی کے مسافر داخل ہوتے تھے اور اسی مقام پر ٹھاکر دوارہ بھیم سنگھ حلقہ سعادت گنج میں سرحد بہاری پور پر واقع ہے اور خسرہ میں نمبر ۱۷۲۵ ہے ایک پختہ شوالہ بھی ہے جو ۲۹۹ نمبر خسرہ میں درج ہے سن ۱۸۶۲ء میں مگن ماتھ اور رگھولا جوہری کا قبضہ تھا یہ حلقہ آباد ترین محلات لکھنؤ میں تھا ۱۸۶۲ء کے پہلے بندوبست میں جو انگریزوں کے ابتدائی دور میں ہوا ایک نقشہ و خسرہ دیکھنے کا محافظ خانہ لکھنؤ واقع کوٹھی روشن الدولہ میں موقع مل گیا تو دو بڑی بڑی کتابوں میں صرف اس علاقہ کے رہنے والوں کی فہرست ہے ان کتابوں کے مطالعہ کے لئے ہمنوں درکار ہیں حسبِ چند نمبر دیکھے اور میرے رفیق نے ان کنوؤں کو شمار کرنا شروع کیا جو مسلمانوں کے بنائے ہوئے تھے ۱۹ کنوئیں شمار کرنے پائے تھے کہ بیس معاوضت تجاوز ہوگیا اور کام بند کرنا پڑا خسرہ کے مختلف نمبروں میں جو مقامات برآمد ہوئے ان کا کوئی پتہ اب بھی نہیں ہے مثلاً تکیہ حاتم شاہ تکیہ مدن شاہ، تکیہ شمس شاہ ولد سوسے شاہ مؤحرالذکر قبرستان موضع بہاری پور کی سرحد پر واقع ہے مقبرہ توکل ولد آقا محمد کا نمبر ۲۰۰۳ ہے مسجدیں بھی کثرت سے ہیں جن کے بنانے والے کا نام واضح نہیں ہوتا نمبر ۱۷۰۴ پر جو مسجد ہے اس پر محمد علی ولد ہیکا کا قبضہ ہے اور ۲۰۳۱ نمبر کے احاطے کی مسجد پر امام بخش ولد مصاحب علی کا قبضہ ہے اور احاطہ نمبر ۸۰۵ میں میر سید محمد ولد سید محمد تقی قوم سید کا قبضہ اور مسجد واقع ہے۔

<u>مغلسرائے</u> بھی اسی علاقہ میں تھی جہاں پردیسی ٹھہرتے تھے نہ دلی دروازہ کی عمارت ہے نہ مزار، اور مغلسرائے کا تو نام بھی باقی نہیں۔ گاڑی اڈہ اب تک مشہور ہے۔

<u>گاڑی اڈہ :۔</u> میں حضرت امجد علی شاہ کے ماموں معین الدولہ عنایت علی بہادر کی محلسرا تھی اس قصر کی ایک دیوار اب بھی باقی ہے آخری وارث اس محلسرا کے نواب سید رسالت علی عرف ممے صاحب تھے جو وضع قطع تہذیب میں بزرگوں کا نمونہ تھے ۱۰ محرم چاہئے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ

دن کو اس مکان میں مجلس کرتے تھے اور ... رصد کو تعزیہ اٹھتا تھا۔ اس محلہ کو گاڑی اڈہ اس لئے کہتے ہیں کہ کرایہ پر چلنے والی گاڑیاں یہاں سواری کے انتظار میں کھڑی رہتی ہیں۔ گاڑی اور یکہ لکھنؤ کی قدیم سواریاں ہیں۔ فٹن اور لنڈو اور ٹمٹم، لینڈو انگریزی دور میں رؤسا اور صاحبان حیثیت کے یہاں سواری میں چلتی تھیں۔ تانگے کا رواج بھی ۱۹۱۰ء کے بعد رفتہ رفتہ ہوا ہے۔ گاڑی جس میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے اس کو بگھی۔ پالکی گاڑی بھی کہتے تھے اور قریبی دیہاتوں میں لے جانے والی گاڑیوں کو شکرم کے نام سے پکارتے تھے۔ شکرم اور بگھی میں ... شکرم پر حضرت قیوم کے بارے میں کہتے ہو گی بگھی میں بھی ... آدمی آمنے سامنے دونوں سیٹوں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھتے تھے اور ... پالکی پر کوچوان کے پہلو میں بیٹھتا اور خدمت گار گاڑی کی پشت پر بیٹھ جاتا یا کھڑا ہو جاتا۔ پرانے لوگوں میں جو بگھی پر بیٹھے ... تھے تا حیات ... نہیں بیٹھے وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے حکیم عبدالعزیز صاحب طبیب جھوائی ٹولہ تانگہ پر نہیں بیٹھے ... کرتے تھے۔ مریضوں کو ... پیدل ہی پر جاتے تھے اور زمانے والے تنقید کرتے تھے کہ تانگہ پر نہیں بیٹھتے۔

میرن صاحب بنوٹ کی بیٹھی۔ ... شاہی میں ... تھے ... بیٹھتے اور ... تک ... سلطنت محل سے وابستہ رہے صدق گالے میں ... رہتے تھے ... ایک انگریز ... نکل گئی۔ ایک انگریز نے کمال کی تھا ایک ... میرن صاحب ... میں تیار ہوں انگریز نے شیشے کے گولوں میں موم کی شمع ... انگریز کی ... تھا میرن صاحب نے گولی لگائی شمع کو بھی ...

آپ نے ایک مرتبہ ... بیٹھی ... کٹی تھی ... کھڑے ... انکھی نکل گئی اور کلائی قائم رہی۔ ... کوئی ... نکل گئی۔

ایک مرتبہ آپ نے اور یہ کمال دکھایا ... ایک سکے پر چیکا دی ... کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور سکے کو ضرر نہیں پہونچا میرن صاحب کے شاگرد ... میں

نواب بوٹا صاحب ۔ اس محلہ میں ایک خوش وضع خوش خلاق ... والے نواب صاحب رہتے تھے جن کی ڈیوڑھی کا ساز و سامان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمیندار کا گھر ہے نوکر چاکر مصاحب اور دوست احباب سے دیوان خانہ میں خاصی رونق تھی۔ دوستوں کو پہونچانے کے لئے ان کے ساتھ اپنی ڈیوڑھی سے چوک تک پیدل آتے تھے اور اندھیری رات میں خدا حافظ کہہ کر پھر واپس ہوتے تھے آپ فالج کے مریضوں کا یوں علاج کرتے تھے کہ لوہا گرم کر کے دہکتی ہوئی آگ میں جب اچھی طرح لال ہو جائے تو بیدھڑک پہلے اپنی زبان پر پھیرتے تھے پھر مریض کے جسم کو داغ دیتے تھے فالج زدہ عضو میں دوران خون ہو جاتا تھا اور مریض اچھا ہو جاتا تھا صحت کے لوگوں نے بہت پوچھا کہ یہ بار بتا دیں مگر ہمیشہ یہی فرمایا کہ اس عمل کا عقیدہ سے تعلق ہے۔ میرے سوا کوئی بغیر عقیدہ سے یہ جرأت نہیں کر سکتا اور مرض کا جانا عقیدے پر موقوف ہے قرآن شریف کی کوئی آیت پڑھتے تھے اور کتنے مریض ان کے عمل سے اچھے ہوتے تھے۔

نواب بقان دریا بادی:۔ عہد امجدی کا بڑا طاقتور آدمی[1] تھا دو من پختہ بوجھ سعادت گنج سے دریا باد ساٹھ کوس آسانی سے لے جاتا تھا۔

وکٹوریہ اسٹریٹ نزازہ میں بھی سعادت گنج کی طرح گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں اور کرایہ پر چلتی تھیں مگر گاڑی والے تمام سعادت گنج ہی کے حصہ شہر کا تھا۔

لڈو خانم کا امام باڑہ:۔ لکھنؤ میں ایک عورت تولا ڈوساقن تھی جس کا تعزیہ عہد شاہی میں بڑی دھوم سے نکلتا تھا۔ اس کے دلدادہ رند مشرب چوک میں تھے۔ لاڈو خانم شریف عورت اس کے علاوہ تھیں اس عمارت کے کچھ کچھ نشانات اب تک ہیں۔ اسی امام باڑہ میں نواب جعفر حسین خاں کی تحریک سے ۱۳۰۳ھ میں مفتی میر عباس صاحب قبلہ کے بعد انتقال مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ نے سالہ وعظ شروع کی مولانا ممدوح اپنی نوشتہ حالات میں خود لکھتے ہیں ــــــ ماہ رمضان[2] میں نواب جعفر حسن خاں صاحب نہایت مصر ہوئے اور دیگر حضرات بھی کوشاں ہوئے اور لاڈو خانم کے امام باڑہ میں سالانہ وعظ کی بنا رہوئی اچھا مجمع ہوتا تھا کبھی کبھی مولانا سید علی نقی صاحب بھی تشریف لاتے تھے۔ نجم العلماء کو جناب اتو صاحب قبلہ مرحوم خویش جناب ممتاز العلماء سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ وہ مفتی میر عباس کے ہمعصر تھے پہلے مفتی صاحب پھر اتو صاحب قبلہ نے رحلت کی (تاریخ العلماء[3])

باگڑ بلا:۔ محلہ سعادت گنج کی ایک خاص تقریب مسرت تھی جو محرم چہلم کے بعد کسی فرصت کے زمانے میں بڑے پیمانے پر ہوتی تھی اور شہر کی بدہ دلی ختم ہونے پر بند ہوگئی بڈھن صاحب، بتن صاحب، چھٹن صاحب پسران مرتضیٰ حسین اس کے بانی تھے۔ عدالت عالیہ سے جماع کا حق تھا حسن اتفاق سے بڈھن صاحب کی نماز جنازہ اس موقع پر ہوئی جب ۸ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کو سید علی ظہیر کی کامیابی کا الیکشن کا جلوس چوک سے نکلنے والا تھا میں امین آباد کلاں پھاٹک کی مسجد سے مغربین پڑھا کر واپس آرہا تھا راہ میں مہر الحسن نیس آبادی نوجوان نے نماز جنازہ پڑھانے کی تحریک کی اور نماز میت ہوئی اور وکٹوریہ اسٹریٹ کا راستہ اژدہام میں رکا۔ ... لوگوں نے سات ہزار نفوس کا تخمینہ کیا ہے تو لا مسلم زندگی کے دو پہلو ہیں جو خوشی و دی رب کا مرکز ہے۔ موضع پیتی ضلع بجنور میں جہاں صرف مذہب امامیہ کی بستی ہے۔ اب بھی لکھنؤ کی تقلید میں یہ رسم منائی جاتی ہے اور جوائنٹ مجسٹریٹ ضلع نے خلاف قانون قرار دیا معتصم باللہ منتصر باللہ مستعین باللہ معتز باللہ تو اسلامی حکمراں تھے باگڑ بلا عوامی حکمراں کا نام ہے مجھے یہ بدعت پسند نہیں۔

مکارم نگر:۔ حلقہ سعادت گنج کا ایک محلہ ہے نہیں کہا جا سکتا کہ یاریں جو مکارم نگر ہے وہ قدیم ہے یا یہ مکارم نگر زنانوں کی بستی ہے اور اس مکارم نگر میں زنانوں کا میلہ بھی ہوتا تھا۔

نوٹ۔ کبھی زنانے کی لاش اٹھتے ہوئے تم نے نہ دیکھا ہوگا یہ لوگ اپنا جنازہ رات کو چھپا کر سناٹے میں اٹھاتے ہیں۔

کوڑے والی بیگم:۔ نواب امیر جہاں بیگم سعادت گنج کی معزز ترین خاتون خاندان شاہی کی رکن ان کی ڈیوڑھی اب تک باقی ہے۔ ان کے جلال کے قصے زبان زد ہیں۔ پردہ دار گاڑی پر نکلتی تھیں اور طیش آنے پر بے ادب کو کوڑے سے سزا دینا معمولی بات تھی۔ ان کے داروغہ بھی بڑے کرّ و فر کے آدمی تھے جواہرات اور آرائی ساز و سامان ان کی ... بڑے پیمانے پر تھا۔

---

[1] قدیم ہنر ص۱۲۳ [2] تجلیات حصہ دوم ص۲۰۳ [3] پروفیسر کیلنگ کا بیان[ہے؟]۔

دھنیا مہری کا پُل

سعادت گنج سے عالم نگر جانے میں یہ پل پڑتا ہے جو دھنو مہری کا بنوایا ہوا ہے دھنیا یا دھنو مہری ڈنو مہری دو بہنیں نصیر الدین حیدر بادشاہ کی کہاریوں میں تھیں دھنیا ۔ دسو کہاریوں کی افسر تھی ڈیوڑھی کی دیکھ بھال (نظارت) اور جو اصول کو انعام و اکرام یا کوئی خطا کریں تو سزا دیا یا دلوایا ۔ جانے والوں کو مناسب ہدایات اس کے فرائض تھے بادشاہ کی طرف سے افضل النساء خانم خطاب اور چودہ پارچوں کا خلعت ملا اور [illegible] عطا ہوئی تھی روشن الدولہ کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ان سے محبت کرتے تھے دھنو نے اپنے زمانہ [illegible] میں اونچے اونچے محل، مسجدیں امام باڑے بنوائے اور نادار طبقے کو امور خیر میں مدد دی اور خود بھی عالیشان مسجد اور امام باڑہ بنوایا

ہر علی عہد نصیری میں گھٹیلے [illegible] کا [illegible] ان کا بنایا ہوا جوتا بہت قیمتی ہوتا تھا ۔ دھنو مہری نے پندرہ روپے دیکر ان سے جوتا اپنے لئے بنوایا ۔

بادشاہ مذکور کو زہر دینے کا الزام بھی دھنو کے دامن پر ہے اور [illegible] لکھنو اس کی تصدیق کرتے ہیں اور بنائے مخاصمت میں یہ واقعہ بتایا جاتا ہے کہ [illegible] بیگم [illegible] اور [illegible] اور انتظار کی زحمت میں دھنیا غصہ کا شکار ہو گئی اور بادشاہ نے مہری کے سینے پر چڑھ کر اتنے گھونسے مارے کہ جسم سوج گیا اور بیگم نے شرم دھنیا کو بالک [illegible] رکھ کر [illegible] اور بعد مدت بادشاہ کو کمزور پاکر بیماری [illegible] اٹھنے کے موقع پر [illegible] ۔

امام باڑہ ۔ دھنو کو عزاداری کا غیر معمولی شوق تھا اور خود [illegible] امام باڑہ [illegible] اور یہ عزاخانہ اس قدر رونق تھا کہ امام باڑہ کی مرمت کے لئے کی [illegible] مکان [illegible] پبلک معاد کے لئے تھے [illegible] زمین کی ضرورت ہوئی ۔ دھنو نے چاہا کہ فقیر محمد خاں [illegible] دیدیں فقیر محمد نے انکار کیا ۔ مہری نے بادشاہ سے تعصب مذہبی کی شکایت کی اور بادشاہ نے [illegible] اختیارات شاہی سے لے کر امام باڑہ کی تکمیل کی ۔ فقیر محمد خاں کھات میں رہے اور [illegible] اور بڑی چالاکی کے ساتھ دھنو کو شاہی ڈیوڑھی سے علیحدہ کر دیا ۔ دھنو [illegible] کے بعد اپنے گھر کو بیگم کا [illegible] چلی گئی جائداد ضبط ہوئی مگر دھنو کو یہ [illegible] کہ امام باڑہ کی شان بگڑے ۔ فقیر محمد خاں نے اپنی زمین پر قبضہ کیا ۔ دھنو نے سمجھایا کہ یہ اقدام آپ کے شایان شان نہیں ہے جس زمین کو دیدیا ہو پھر واپس لینا چاہئے ۔ فقیر محمد خاں نے شنوائی نہ کی یہاں تک کہ بقر عید کے مہینہ ۱۲۵۰ھ میں افضل النساء کی خطا معاف ہوئی اور [illegible] پھر ہاتھ آئی اور اس نے ارادہ کیا کہ اب کی محرم اتنی دھوم سے ہو جیسا کبھی نہیں ہوا تھا چونکہ امام باڑہ کی زمین دوسرے کے قبضے میں پہونچ گئی تھی اور رکاوٹ لازمی تھی ۔ اس مرتبہ دھنو نے بادشاہ سے زور دے کر کہہ دیا اور روشن الدولہ کو بھیج کر [illegible] فقیر محمد خاں کو معزول کر دیا اور حکم دیا کہ لکھنو چھوڑ دیں فقیر محمد خاں اپنے وطن مرزا گنج چلے گئے ۔ عالم نگر میں دھنیا مہری کی مسجد موجود ہے ۔ امام باڑہ بھی اسی علاقے میں ہونا چاہئے ۔ اور یہ توجیہ اس وقت صحیح ہے جب عالم نگر میں فقیر محمد خاں کا سکونتی مکان مانا جائے ورنہ امامباڑہ کو فقیر محمد خاں کے احاطے میں ہو ۔

چاہیے دھنیا مہری کا پل لکھوری اینٹوں کا موجود ہے۔

شاہدرہ

شاہدرہ کب آباد ہوا اور اس کے نام کی کیا وجہ تھی اس سلسلے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوتی ہیں پہلا بیان یہ ہے کہ شیخ کاکوری نے جب اکبر کو ادھر آنے کی دعوت دی اور تاجدار ہند وارد ہوا تو یہی راہ تھی جس سے اکبر وارد ہوئے اور دروازہ بطور یادگار بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے دور میں قیام سعادت گنج میں اس دروازے کی تعمیر ہوئی اور نواب نے ۱۲۲۲ھ میں دیلئے مالی کو چھوڑا۔ اس وقت دروازہ موجود تھا۔ تیسری خبر ہے کہ جب نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی ماں ملکہ قدسیہ بیگم میں کالے کپڑے نہ پہننے کے سلسلے میں خفا ہو کر شہر سے باہر چلی گئیں شاہدرہ اس وقت آباد ہوا اور مسجد بنائی گئی۔ پہلے دو قول عقل اور واقعات سے مطابق ہیں اور تیسری رائے اگرچہ تاریخی واقعہ ہے مگر بادشاہ کا قیام الماس باغ میں تھا (دیکھو نقشہ لکھنؤ) منارین مسجد شاہدرہ والدہ سلطان کی تاسیس نہیں ہے موجودہ طبقہ بزرگان شہر میں سید اصغر علی صاحب سیتاپوری صوفی کہتے ہیں کہ ۱۹۱۰ء تک اسی جگہ دروازے موجود تھے اور دوسرے معمر اور سن رسیدہ بزرگ مرزا محمد صادق صاحب رئیس اشرف آباد لکھنؤ کا مشاہدہ ہے کہ آج سے بہت پہلے موصوف نے شاہدرہ میں ایک دروازہ شکار کے سفر میں دیکھا تھا سو سیدار اودھ اسی دروازے سے داخل ہوتا تھا

مسجد شاہدرہ: ۔ مسجد "مدے سر" مقام سے ایک میل کے فاصلے پر ہے اور عالم نگر اسٹیشن راستے میں رہ جاتا ہے۔ مسجد بڑی شاندار اور پرانی انجینئری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لکھنؤ میں کسی مسجد میں یہ خصوصیات تعمیر نظر نہیں آتے۔ چھت پر کئی گنبد ہیں جو اس قدر خوبصورت اور سلیقے سے بنائے گئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا سقف میں اس کے تحمل کا مارکیونکر پیدا ہوا۔ گولکنڈہ، لاہور، عراق و ایران وغیرہ کے آثار قدیمہ دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کا کلس بھی سنگی ہے اور یہ فتحپور سیکری کی کلس کے نمونے پر بنا ہے۔ اور خاص وضع کا ہے مسجد شکستہ حالت میں ہے گرد و پیش کے حصے گر چکے ہیں اور طول زمانہ نے خوبصورتی پر جو ضرب لگائی ہے اس کے باوجود شاندار عمارت باقی ہے ایک وسیع احاطہ اور دور کے سواریوں کے ٹھہرنے کی جگہ بھی ہے۔ نوچندی جمعرات کو مرد و عورت، عوام و خواص مسجد میں آکر دعائیں مانگتے ہیں اور جنوں کی مسجد سمجھتے ہوئے مراد پوری ہونے پر میٹھی کھچڑی دسایں پکا کر نذر دیتے ہیں۔

مقبرہ عالم نگر: ۔ پرنس داراقدر تیموری[1] شہزادہ سکندر قدر کے چھوٹے بھائی تھے شطرنج میں اس قدر مہارت تھی کہ یورپین انگریز ان کے کمال کے معترف ہوئے اور شکست کھائی۔ عہد واجدی کے پیدا شدہ صاحب فن تھے اپنے آبائی تکیہ میں دفن ہوئے مرزا فدی ہوش قدر ۱۹۳۲ء تک زندہ رہے جوان کے بیٹے تھے۔

---

[1] قیصر بہر ص۲۱۵

چوتھا باب

جوہری محلہ سے ٹالکٹورہ تک

جوہریوں کی آبادی جو یاقوت، زمرد، ہیرا، پنا، پکھراج، نیلم، فیروزہ، موتی، لہسنیا، عقیق، مونگا، سیپ، زبرجد کی تجارت کرتے تھے اور ہر جواہر کو پہچانتے تھے۔ پہلی نظر میں قیمت معلوم کر لیتے تھے کہ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری کے معنی اسی محلہ میں نظر آتے تھے۔ اس محلہ کے مشہور مکانات ہیں

کچہری:- محکمہ قضا جوہری محلہ میں تھا اور دیوانی و فوجداری کے مقدمات فیصل کیے جاتے تھے اور مدعی و مدعا علیہ مستغیث و مجرم کی شرع محمدی کی رو سے دادرسی ہوتی تھی۔ مؤلف کے ننھیال کی ایک کنیز السن خانوں سکینہ بیگم صاحبہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ ہم نے مقتولین کے سر ڈھیروں میں آتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھے اس عمارت کی پہلی صورت بگڑ گئی ہے۔ اس وقت اس اراضی پر سید آغا صاحب مرکز اجتہادی کا مکان نیم منہدم صورت میں ہے۔

بارہ دری:- جوہری محلہ میں بارہ دری کے نام کو خاص شہرت حاصل ہے۔ یہاں محکمہ صدر الشریعت تھا اور علامۃ العلماء سید مرتضیٰ پسر مجتہد العصر و الزمان سلطان العلماء اپیلیں فیصل کرتے تھے اس اراضی پر عہد شاہی کا ایک غیر مرتفع کمرہ ہے جس کے بانی عمدۃ العلماء سید محمد ہادی تھے اور ہمارے زمانے کے شیعہ مجتہد میر آغا صاحب قبلہ فقیہہ کا بیٹھکا تھا۔ ان کی پشت سے اس کمرے میں جماعت کی نماز ہوتی ہے کتنی مسجدیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنے والے نہیں پہونچ سکتے اور ویرانی ہے مگر یہ کمرہ مسجد نہ ہوتے ہوئے زمانۂ دربار سے اتصال نمازیوں سے ہے فوجداری کے مقدمات میں قتل کا حکم اسی جگہ سے صادر ہوتا تھا اور قبلہ و کعبہ مجتہد العصر والزمان کے رہنے کا مکان بھی اسی سے متصل تھا۔ گنگا بخش نامی ایک ڈاکو کو سزائے موت تجویز ہوئی۔ اس کا سگا بھائی محبت برادرانہ سے مجبور ہو کر غصہ میں بھرا ہوا مجتہد صاحب کے پاس اس وقت پہونچا جب آپ صحبت برخواست کر کے اٹھ رہے تھے اطلاع ہونے پر آپ ٹھہر گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔

مجرم کا بھائی:- گنگا بخش کے قتل کا آپ نے حکم دیا ہے۔

مجتہد العصر :- (اطمینان بخش لہجے میں) ہاں میں نے حکم دیا ہے

برادر مجرم :- میں اس کا بھائی ہوں اگر آپ نے یہ حکم واپس نہ لیا تو اچھا نہ ہوگا۔

مجتہد العصر :- حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ان لفظوں کو سنکر اس کے تیور بدل گئے اور آگ بگولہ ہو کر پیش قبض ہاتھ میں لئے ہوئے جھپٹا اور چاہا کہ حملہ کرے مجتہد بوڑھے ہو چکے تھے مگر پوری طاقت سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ نوکروں کو آواز دی صدا بلند ہوتے ہی آنے والا پکڑا گیا اور یہ CASE خود بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور اقدام قتل کے جرم میں شاہ نے بھائی سے پہلے اس کی سزائے موت کا حکم دیا اور دونوں کے سر قلم ہوئے

نوٹ، تاریخ اودھ اور مکاتیب غالب میں جہاں جہاں مجتہد العصر والزماں کا لفظ ہے اس سے مراد سلطان العلماء سید محمد صاحب رضواں مآب ہیں جنہوں نے ۱۲۸۴ھ میں عہد ملکہ وکٹوریہ میں انتقال فرمایا اور اپنے امامباڑے میں سپرد خاک ہوئے۔

امامباڑہ سوداگر :- حضرت غازی الدین حیدر کی شہریاری تھی میر باقر نامی جواہرات اور شیشہ آلات کی تجارت کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک شادی کے موقع پر انہوں نے دربار اودھ میں دو دشالے رومال بہم پہونچائے تھے جوہری محلہ میں رہتے تھے اور مکان سے قریب ہی امامباڑہ کے لئے ایک وسیع ٹکڑا زمین کا پا گئے اور یہ امامباڑہ دوسرے امامباڑوں کے برعکس جو اتر رکھ ہیں مغرب رخ تعمیر ہوا ہے بلند پھاٹک میں ترکی وضع کی نوکدار محراب بنا کر اسی کے موافق جوڑی لگائی گئی ہے۔ داخلے کا صدر دروازہ اس ڈھنگ سے ہوا ہے کہ بازار چوک کے محاذ میں ہے امامباڑہ میں شہ نشین صدر کرسی کے دالان در دالان کے بعد چبوترہ اور دو منزلہ صحنچیاں پہلو میں تھیں چبوترہ کے نیچے انگنائی شروع ہوتی ہے اور صحن کی دیواروں میں حجرے اور اوپر کی منزل پر کمرے ہیں شیشہ آلات سے ہر درجہ مکمل طور پر آراستہ ہے۔

میر باقر کے مورث اعلیٰ میر زین العابدین تھے جو نیشاپور کے باشندہ تھے۔ میر باقر بڑے دیانت دار تھے اور منور الدولہ سے بہت رسم و راہ تھی۔ ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو امامباڑہ مذکور میر باقر نے اپنے بیٹے اور جناب ممتاز العلماء محمد کے نام وقف کر دیا اور گورنمنٹ پرامیسری نوٹ مالیتی ۲۱۸۲۶ روپیہ سکۂ انگریزی اخراجات کے لئے وقف کئے اور جو جائداد تجویز کی اس کی آمدنی میں جناب ممتاز العلماء کو اختیار دیا کہ

"در وقتیکہ سادات و مومنین را احتیاج رائد شود جناب ممتاز العلماء یا قائم مقامان او شان را اختیار است کہ زمین دکاکین و مکان بیرونی بہ اجارت قیام و سکونت بہ سادات مومنین و محتاجین بدہند" اس امامباڑہ میں عشرہ کی روشنی قابل دید ہوتی تھی اور پوری عمارت جگمگا اٹھتی تھی اور صدر دروازہ میں ایک عجوبہ روزگار پتھر کی ہانڈی روشن ہوتی تھی جو دودھیا شیشے کی طرح ضو دیتی تھی اور ایسی ہانڈی کہیں نہیں ہے میر باقر شیشہ آلات کے تاجر تھے اس لئے اپنے امامباڑہ کو بہترین قسم کے جھاڑ جو ڈال ہانڈی چھاپے سے سجایا تھا یہاں تک کہ چھت سے باتیں کرنے والے اور خوشنما بیٹھک کی دھوم تھی۔ وقف نامہ کے صرف ایک سال بعد میر باقر ۱۸۶۳ء میں رحلت کر گئے اور پھاٹک کے سامنے ایسے مقام پر دفن ہوئے کہ امامباڑہ میں زائرین اور شرکاء مجلس کی آمد و رفت ان کی قبر پر سے ہو میر باقر کی ایک بیگم رنگ محل کے نام سے مشہور تھیں۔ میر باقر کے تجارتی فرم کا خاندان

پاتی تھی ان کی مدح میں مثنوی بہیت الحزن کا ایک شعر شاہد عدل ہے ؎

چو نیسان نقل آں داز پر باذ ——— رہرو راست گفتار سست تا در

۱۲۸۱ء یا ۱۲۸۲ء میں میر وزیر حسین صاحب مولف تہذیب مجلس ستمبر لکھنؤ میں اکثر اسسٹنٹ سنہر تھے اس زمانے میں ایک مجلس میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں ہوئی دبیر صاحب مرحوم نے یا مرثیہ پڑھا جس کا مطلع یہ تھا سہ متقل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد رجلد دوم تلازم مانز کلام کی یہ کیفیت تھی کہ چھتوں پر لوگ لدے ہوئے تھے اور منڈیروں پر مثل گھوڑوں کے سوار تھے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے تھے جب مجلس ختم ہوئی تو میر وزیر حسین نے جو مجلس میں موجود تھے مرزا صاحب سے درخواست کی مرثیہ جو ابھی پڑھا ہے مجھ کو عنایت ہو مرزا صاحب نے وعدہ فرمایا جب اچھا (حیات دبیر ص ۱۵)

حمام وسیع :۔ امام باڑہ کے پہلو میں ایک وسیع حمام تھا جو اس زمانے میں ایک ہی حمام ملتا ہے جو اس میں صرف ایک چوڑا درجہ ہے گنبد اور منارے سیدھے ہیں دوسری طرف پھاٹک کے قریب حمام ہے جو مدت دراز سے بند ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ محلہ وار حمام ہے اور جاڑوں میں پبلک و ہمانے کی بڑی سہولت تھی

امام باڑہ حکیم شیخ علی محمد

محمد باقر شمس لکھتے ہیں فرنگی محل و نوری نور یہ دونوں محلے لکھنؤ میں قریب علوہ مار شاہی واقع ہے جہاں ایک وقت میں علما کا معدن اور صلحا و فضلا کا مخزن تھا اور ایسے کامل الفن یکانہ روزگار اس بستی میں بستے تھے جو کا طرۂ آسمان ڈھونڈھتا ہے گاہ ساں کا ہر ہر ذرہ عبرت سے زبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

ہر کجا شست و دست در دیدار ——— ہست قرد دفتر احوال صاحب دار

مکان ویران مکیں پیوند زمین۔ دیکھتے دیکھتے وہ مجمع پریشاں ہو گیا ؎

تھی جو کل تک جلوہ افروزی ہر شمع انجمن ——— آج وہ شکلیں چراغ زیر داماں ہو گئیں

اس سے قریب امام باڑہ میر باقر سوداگر مسافر خانہ سا ہی تھا جس میں حاجی وغیرہ اور دیں تیرہ مہمان ہوتے تھے۔ ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ تک مسافر خانہ تھا حکیم محمد جی برادرزادہ و قائم مقام حکیم صاحب اور آخر میں حکیم شیخ عابد علی اس محلہ کے بڑے اطبا میں تھے شیخ صاحب نے جمادی الاول ۱۳۲۲ھ میں اس دنیا کو چھوڑ کر گوشۂ قبر آباد کیا امام باڑہ حکیم شیخ علی محمد وہ مکان ہے جس میں حکیم علی نقی اور پھر ان کے بیٹے حکیم امیر حسین اور پوتے حکیم محسن رہتے تھے اب یہ مکان حادثات سے نامرد ہے امام باڑہ میں مجلسیں ہوتی تھیں آٹھویں دن نماز جماعت ہوتی تھی اور بعد غدر ۱۲۹۶ھ میں اس کی بنیاد پڑی تھی مادہ تاریخ[2] جس سے سنہ تعمیر واضح ہوتا ہے یہ ہے ؎

نکلا مثال اشک بعصمت یہ مادہ ——— در دعزا کو داہ یہ بیت التعامید ۱۲۹۶ھ

حکیم نبا :۔ عربی میں نبض دیکھنے والے کو نباض کہتے ہیں ورنہ اس کا محصہ ہے اطبائے لکھنؤ میں حکیم نبا کا پایہ بہت بلند تھا یہ کبھی

---

[1] تجلیات ص ۵۱ [2] دیوان رئی میں یہ قطعہ تاریخ ہے

مطلب سے اپنے کسی مریض کو گھر پر دیکھنے نہیں گئے چہ جائیکہ لکھنؤ کے ماہر سفراں کے زمانے میں دوا جانے کا چلن نہ تھا جو مریض اپنی خوشی سے اپنی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرتے تھے اس میں ۸۰ روپیہ روز کی آمدنی گھر بیٹھے تھی۔ یو پی کے تمام اطبا کا سلسلہ شاگردی حکیم ... تک پہونچتا ہے وہ غدر ۱۸۵۷ء میں بھی لکھنؤ سے باہر گئے شہر کی پرآشوب حالت دیکھ کر احباب نے بہت چاہا کہ کسی طرف نکل چلیں مگر حکیم صاحب راضی نہ ہوئے قدرت نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اس طرح ان کی جان بچائی کہ حکیم صاحب نے کئی بوتلیں شربت انار اس موقع پر تیار کر لیا تھا جو گورا گھر لوٹنے آیا اس کو ایک جام اک شربت انار دیا اور وہ تعریف کرتا ہوا دوسروں سے سفارش کرتا ہوا پلٹ گیا چار پانچ بوتلوں میں سلامتی گئی اور توکل کی صحت کام آئی

جوہری محلہ اطبا کا مرکز تھا انھیں کے شاگردوں میں اور جوہری محلہ کے طبیب کا ذکر ہے کہ وہ ایک مریضہ کے لئے استخارہ دیکھ کر لکھ رہے تھے لاتعداد استخارے منع آئے اور حیرت تھی کہ کسی دوا کے گھٹانے بڑھانے سے مصلحت الٰہی شامل حال ہو یہ مکر دیکھ کر باپ دادا کے وقت کا نوکر اصلیت سمجھ گیا اور اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے حکیم صاحب کو توجہ دلائی کہ یہ حاملہ ہے حمل کی رعایت کی اور چھوٹتے ہی استخارہ آ گیا۔

منڈی

جوہری محلہ کے ختم ہوتے پر منڈی کا میدان تھا جہاں بغیر کسی عمارت کے زیر آسمان ترکاری اور میوہ، آم، خربوزے، تربوز اور دیگر پھل تھوک مال فروخت ہوتا تھا صبح سے دوپہر تک ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ انگریزوں کے آخری دور میں حیدر جان کے احاطے میں ترکاری منڈی کے لئے آہنی سائبان اور چبوترے بنے پر یہاں کے تمام کنجڑے اور کنجڑے وہاں پہونچا دئے گئے۔ اور مدت تک یہ زمین اجاڑ رہی یہاں تک کہ گول دروازہ رفیوجی مارکیٹ اور نئی فلک نما بلڈنگوں نے اس خلا کو پورا کر دیا خود منڈی کی جدید عمارت سے ادھر محسوس ہو رہا تھا

نیاز فتحپوری اپنے مقالہ "لکھنؤ کی پھبتیاں" میں لکھتے ہیں۔

پھبتی کی ایک عجیب و غریب مثال جسے بڑی معنوی اور لطیف پھبتی کہنا چاہئے لکھنؤ کے ایک کنجڑے سے پیش کی وہ ٹوکرے میں سنترے لئے بیٹھا تھا کہ ایک بڑا دراز قامت انسان آیا اور کھڑے کھڑے سنتروں کا سودا کرنے لگا اس نے دام پوچھے تو کنجڑے نے بتائے وہ بولے تم دام زیادہ بتاتے ہو حالانکہ سنترے بہت چھوٹے ہیں اس نے سر اٹھا کر سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا "سنترے چھوٹے نہیں ہیں حضور بیٹھ کر ملاحظہ فرمائیں"۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ لطیف طنز کسی شخص کی غیر معمولی درازی قد پر اور کیا ہو سکتا ہے"

اس بیان میں نیاز نے کنجڑے کی لفظ استعمال کی ہے۔ پھل ترکاری بیچنے والے ہندو مسلم دونوں ہوتے ہیں مسلمان کو کنجڑا اور ہندو کو کبجڑا کہتے ہیں۔ کھٹیک بھی غیر مسلم سبزی فروش کے لئے ہے ایک عذر

دوسرے لکھنؤ کی زبان میں — وہ بولا میں بولا نہیں کہتے' اس نے کہا' میں نے کہا یا عرض کیا۔ بتایا اس قسم کی لفظیں تہذیب ... زبان رد ہیں اور "بولا" غیر ذوی العقول کے لئے ہے۔ چڑیا بولی، گائے بولی، علیٰ ہذا

قدیم منڈی بزازہ سے جانے والے کو بائیں ہاتھ کی طرف اور جدید منڈی حیدر جان طوائف کے احاطے میں دست راست کی موڑ پر جہاں ۱۳۲۲ھ کے قبل و بعد میر مہدی حسین ماہر کی مجلس نہم محرم پنڈال میں ہو چکی ہے۔ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔ حیدر جان ...

[illegible] مشہور طوائف تھی جس کے ہاں ایک ہاتھی پلا تھا۔ ایک نواب (محمد حسن خاں) صاحب پستہ قد گردن ڈیل اس کے مشتاق ہو گئے تھے
کسی نے ان پر حیدرجان کا ہاتھی پھبتی کہی اور وہ اس نام سے مشہور ہو گئے۔

امامباڑہ آغا باقر

لکھنؤ کا سب سے پہلا اور بڑا امامباڑہ محلہ چوک کی موجودہ سبزی منڈی کے پہلو میں جانب شرق واقع ہے جس سے امامباڑہ غفرانمآب تھوڑے فاصلہ پر رہ جاتا ہے۔ اس کو آغا اسمعیل ملا ورجنگ کی خواہش پر ان کے چچا اور کارپرداز آغا باقر خاں نے بعہد شجاع الدولہ مسافر خانہ کے قریب بنوایا تھا یہ لکھنؤ کا دوسرا امامباڑہ ہے یہاں چوڑی والیاں آباد تھیں۔ ان کے مکانات کھدوا کر وسیع امامباڑہ بنا امامباڑہ حسین آباد اسی امامباڑہ کے نقشے پر محمد علی شاہ نے بنوایا۔ آغا باقر پانچ ہزار سواروں کے رسالدار تھے آغا اسمٰعیل کالپی کے حاکم ہو کر جب روانہ ہوئے اور مرہٹوں سے مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ موت کی نیند سو گئے پھر آغا باقر اس منصب کے حامل ہو کر روانہ ہوئے۔ انہوں نے وہاں بھی امامباڑہ بنایا دشمن ان کی بھی گھات میں تھا۔ ٹھنڈائی میں زہر دے کر ان کا بھی کام تمام کر دیا اور قبر پر ایک مقبرہ بھی بنوا دیا۔ اس امامباڑہ میں ایرانی طریقے پر مجلس ہوتی تھی۔ امامباڑہ ۱۸۵۷ء کی شورش تک باقی تھا ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کا جب دوبارہ تسلط ہوا اور بڑے امامباڑہ کو قلعہ قرار دیا تو چاروں طرف پانچ سو گز تک سب عمارتیں کھود کر میدان کر دیا تھا اور امامباڑہ بھی حصار قلعہ میں آ کر مسمار ہو گیا مرزا کام بخش خلف مرزا سلیمان شکوہ پسر دوم شاہ عالم شاہ دہلی اس امامباڑہ میں دفن ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے بیٹے حیدر شکوہ شاہ دہلی نے انگریز حکومت سے آراضی امامباڑہ حاصل کر کے نیو ڈلوایا جس میں اس وقت ایک خوشنما سوریہ بھی بنا تھا جب مرزا حیدر شکوہ کی بیوی طیبہ بیگم نے انتقال کیا تو صحن قبروں سے بھر چکا تھا اس لئے وہ حرم کے مقام پر دفن کی گئیں۔

چہل ممبری:۔ ہندوستان میں محرم کے موقع پر بچوں کی منت مراد یا واقعۂ کربلا کی تاریخی حیثیت سے یادگار رہیں جو آئین و رسوم پہلے ان میں چہل ممبری ایک قدیم رواج تھا جو امامباڑہ آغا باقر ہی سے شروع ہوتا تھا چہل ممبری کی شان یہ تھی کہ حاجت مند منت مانتے کہ میرا فلاں جائز مقصد پورا ہو گا تو چہل ممبری کروں گا عشرہ کی رات کو صاحبان حاجت اپنے گھروں سے چل کر ہر امامباڑہ میں منبر رسولؐ پر دو شمعیں روشن کر کے خاموشی کے عالم میں آتیں اور دعا مانگ کر واپس ہوں راستے میں کسی سے بات نہ کریں چالیس منبروں کی قرار داد ختم ہونے پر گھر واپس ہوں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ امامباڑہ آغا باقر سے چودھرائن کے امامباڑہ تک چہل ممبری ختم ہو جاتی تھی — چودھرائن کا امامباڑہ روشنی کی کثرت سے بقعۂ نور بنتا تھا وہ خود زائروں کے خیر مقدم میں بڑے پائچوں کا پاجامہ پہن کر سلام علیکم کہتے ہوئے ماتمداروں کو علم تعزیہ ضریح تابوت کی زیارت کراتے۔

حکیم سید یوسف حسین نے "جنت کی کھڑکی" کے نام سے امامباڑہ غفرانمآب کے روبرو نیا امامباڑہ بنوایا تو بڑے منبر چھوٹے چھوٹے چالیس منبر رکھ دئے اور زیارت کرنے والوں کو اس حسن تدبیر سے روکا اور آگے بڑھنے نہ دیا اس عرصہ میں اگلے رسم لوگ بھولتے جا رہے تھے اور عقیدت مندوں کے فقدان سے پرانی روایات دفن ہونے لگے اور چہل ممبری بھی موقوف ہو گئی۔

یہ آراضی پھر بھی اس قدر چوڑی تھی کہ [illegible] میں ایک بڑا حصہ حیدرجان نامی عورت کے ہاتھ بیچ دیا۔ جس کا نام [illegible] احاطہ حیدرجان قرار پایا اس احاطہ میں میر مہدی حسین ماہر کی بنا کردہ نویں محرم کی مجلس ایک مرتبہ پنڈال میں [illegible]۔ جس میں

آدمیوں کا جنگل تھا اب یہ زمین حلقہ چوک میں ترکاری کی مارکیٹ ہے جس میں پھل، ترکاری، مچھلی اور شام کو بھیڑ بکری، دنبہ، مینڈھا، قربانی کے جانوروں کا بازار لگتا ہے۔ اس امام باڑہ کی سب سے پہلے راجہ شعبان علی خاں مرحوم نے اپنے روپے سے مرمت کی۔ پھر ۱۳۰۱ھ میں راجہ امیر حسن خاں المتوفی ۱۳۲۱ھ والی محمود آباد ضلع سیتاپور نے تعمیر میں امداد کی اور تیسری مرتبہ بمبئی کے کسی رئیس کے سرمائے سے درستی ہوئی۔ امام باڑہ کی موجودہ شکل کمرے کی وضع کی ہے مربع کمرے ہیں برآمدہ میں آہنی سائبان ہے اور روکار میں دیکھا صحن اور پہلو میں کچھ زمین ہے گرد پختہ چار دیواری ہے اور زیارت گاہ کے دو حصے ہیں زنانہ و مردانہ۔ عورتوں کا درجہ جانب شمال اور مردوں کا جنوب سمت جنوب ہے۔ امام باڑہ بہت معقول اور عہد شاہی سے زیارت گاہ خلق ہے و عیدین کو اجتماع اور ہر جمعرات کو لوگ منت مراد کے لئے آتے ہیں اور حاضری چڑھاتے ہیں مصحفی مشہور شاعر کا قول ہے کہ مرزا رفیع سودا کی قبر اسی امام باڑہ میں ہے وہ تذکرۃ الشعراء میں لکھتے ہیں کہ محرم میں ایک دوست کے ساتھ آنا ہوا کہ امام باڑہ جانے کا اتفاق ہوا سودا کا خیال آیا اور فاتحہ پڑھنے قبر پر بیٹھے تو دیکھا کہ لوح مزار پر حسب ذیل قطعہ کندہ ہے ؎

خلد میں جب حضرت سودا گئے　　　فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا
بولے مصحف دور ہو پائے عناد　　　شاعراں ہمہ آں سرور گیا

مصحفی کو یہ ہمعصر کا قطعہ تاریخ پسند نہ آیا پھر پھوپک کر دوسری تاریخ خود کہی جس کا مادہ یہ ہے ع

گردید مدفنش رقعہ خاک لکھنو ۱۲۹۰ھ

سودا کا کلام دیوان کی صورت میں کلکتہ سے ٹائپ حرفوں میں چھپا ہے۔ ثاقب نے انتخاب سودا انوار بکڈپو لکھنؤ میں چھپایا۔ اس کے بعد شیخ چاند ایم اے ایل ایل بی عثمانیہ یونیورسٹی نے کلام سودا پر سیر حاصل بحث کی۔ سودا کا کلام انتہائی بلیغ ہوتا تھا بعض قصائد تو زبان اور ذہن و فکر رسا پر اس قدر بار ہیں کہ جو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ سودا زبان نہیں کہہ سکتے تھے اور ان کا کلام مغلق ہوتا تھا غزل کا ایک شعر اس سے زیادہ کیا عام فہم ہوگا ؎

ساقی سیمیں کو تری دیکھ دیکھ کے گوری گوری　　　شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

ان کے مرثیہ اشعار بھی دلدوز ہیں ؎

نہیں ہلال فلک پر مہ محرم کا　　　چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا

سودا نے ۱۱۹۵ھ میں قضا کی سودا کے نواسے ۱۸۵۸ء میں جب محمد حسین آزاد لکھنؤ آئے زندہ تھے آشفتہ حال نظر آئے۔ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔

مرزا دبیر کی ایک مجلس:۔ سید افضل حسین ثابت لکھنوی حیات دبیر میں لکھتے ہیں کہ تیرھویں اور ماہ صفر کی اٹھارھویں کو احمد علی خاں مرحوم کے یہاں مرزا صاحب بہت بڑی مجلس پڑھا کرتے تھے ادھر حیدر خاں نامی ایک مومن کے یہاں انہیں تاریخوں میں میر صاحب پڑھتے تھے چنانچہ مجتہد العصر مولانا السید علی حسن صاحب قبلہ جائسی مدظلہ العالی ایک سال کی اٹھارھویں ماہ صفر کی نسبت یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ احمد علی خاں مرحوم زمانہ شاہی میں قریباً پچاس مجلسیں کیا کرتے تھے۔ امام باڑہ آغا باقر مرحوم کے قریب ان کا مکان تھا جو مکانات اب بالکل کھد گئے ہیں ہر روز ان کے یہاں ایک ذاکر کامل پڑھتا اٹھارہ صفر کو ایسی مجلس ہوتی [illegible]

مجلسیں بالمقابل ایک دوسرے پر ہوتی تھیں اور میرے استاد جناب سید العلماء عرف میرن صاحب قبلہ علیین مکان طاب ثراہ بھی احمد علی خاں کے یہاں شریک ہوتے۔ ایک روز میر صاحب مرحوم حیدر خاں کے یہاں کچھ پہلے پڑھ چکے تو وہاں کے اکثر سامعین بھی یہاں آئے۔ یہاں آدمیوں کی کثرت سے داخل ہونا دشوار تھا اور پھر بھی کے تمام مکانات سامعین سے بھر گئے ایک کنواں جو صحن مکان میں تھا۔ اس پر تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر بھی آدمی تھے جب آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ رہی تو صاحب خانہ نے مکان کا دروازہ بند کرکے اندر سے زنجیر لگا دی۔ اب جو دوسری مجلس کے آدمی آئے انہوں نے باہر سے زور لگایا بڑا ق سے زنجیر ٹوٹ گئی اکثر آدمی اندر گھس گئے آدمیوں کے جزر و مد سے ایسا تلاطم ہوا کہ میرزا صاحب منبر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اس مجمع کو مجلس میں لے لیا مجلس تو برہم ہو چکی تھی مگر واہ رے مرزا صاحب کا کمال بس ایک دو رباعیاں پڑھی تھیں کہ مجلس پھر درست ہو گئی۔

رباعی

یاں مجھ کو بچھانا تھا ورق آنکھوں کا — اس پردہ میں تھا میں سرد آنکھوں کا
پر آپ تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ — آنکھوں کے عوض بچھا دیا لو آنکھوں کا

دوسری رباعی

ہر عضو سے جلسہ کو آنکھیں ہیں — پردہ کشش کی ہو گئی تو لو آنکھیں ہیں
کس کس کے زیر پا بچھاؤں میں دبیر — ہم چشم بہت ہیں اور دو آنکھیں ہیں

وہ مجلس قتل گاہ کے نام سے مشہور ہوئی اور مہینوں لوگوں میں اس کے چرچے ہوئے۔ دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں جو رباعیاں اس ردیف و قافیہ میں ہیں وہ اسی مجلس کی ہیں (حیات دبیر ۱۵۱)

مسافر خانہ :- تاریخ اودھ سے ایک مسافر خانہ کا پتہ چلتا ہے عزیز لکھنوی اس کو جوہری محلہ میں بتاتے ہیں جیسا کہ گذرا جوہری محلہ میں مسافر خانہ کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ عزیز کو میر باقر سوداگر کے امام باڑہ واقع جوہری محلہ نے رائے قائم کرنے میں مغالطہ دیا ہے مسافر خانہ آغا باقر کے امام باڑہ سے قریب تھا اور ایک قول یہ ہے کہ عہد شجاع الدولہ میں مسافر خانہ آغا باقر ہی نے بنوایا تھا۔ یہ عمارت بھی امام باڑہ آصفی کے قلعہ قرار پانے پر منہدم ہو گئی مسافر خانہ میں نووارد معززین اترتے تھے اور سرکاری و نیم سرکاری مہمان ٹھہرتے تھے

امام باڑہ غفران مآب

یہ امام باڑہ لکھنؤ کی دو بڑی سڑکوں وکٹوریہ اسٹریٹ اور کیننگ اسٹریٹ کے بیچ میں ہے بانی امام باڑہ ہندوستان میں مذہب امامیہ کے پہلے مجتہد ہیں جنہوں نے نماز جمعہ و جماعت اس فرقے کی جانب سے پڑھانا شروع کیا اس امام باڑہ کا موجودہ راستہ ترکاری منڈی اور امام باڑہ آغا باقر سے گزر کر ہے اور سید دلدار علی صاحب نے ۱۲۲۰ھ میں ایک لمبی چوڑی زمین لے کر امام باڑہ بنوایا۔ اس سے پہلے لکھنؤ میں علاوہ امام باڑہ آصفی کے دو امام باڑہ بننے پائے تھے امام باڑہ آغا ابو طالب خاں اور امام باڑہ آغا باقر، اس امام باڑہ میں دو دالان اور شہ نشین، گنجائش اور وسعت کے لحاظ سے لکھنؤ کے امام باڑوں میں اوسط درجہ پر شمار کیا جاتا ہے تینوں چھتیں لکڑی کی دھنیوں سے پٹی ہیں اور شہ نشین میں اسی زمانے کی منبر بھی رکھی ہیں عمارت [illegible] بالکل سپاٹ ہیں قبلہ کی طرف غفران مآب اور ان کے چھوٹے بیٹے سید العلماء علیین مکان کی قبریں ہیں ان پر کٹہرے لگے ہیں

سید العلما کی قبر کا سنگ مرمر اتنا لمبا چوڑا ہے کہ کسی بادشاہ کی قبر پر بھی ایسا پتھر نہیں ہے۔ صحن بہت لمبا چوڑا تھا۔ جو ایک طرف ٹیبگ اسٹریٹ سے جا کر ملتا ہے اور شمالی سمت میڈیکل کالج کی زمین سے ملحق ہے ان زمینوں پر وارثان کی غفلت سے کچھ مکان بن گئے ہیں اور حدود صحن کم ہو گئے۔

صحن میں پورب اور پچھم کی طرف حجرے تھے جو بانی نے طالبان علم اور اہل فضل کے لئے قرار دیے تھے چنانچہ مولوی سید علی نقی زائی پوری پروفیسر کیننگ کالج (وفات ۱۳۵۰ھ) مدتوں انھیں حجروں میں سکونت پذیر تھے مزار غفرانمآب کی جنوبی سمت برآمدے میں دیوار پر غفرانمآب کا پشت نامہ اور سلسلہ روایت کا شجرہ رنگین ـــــــ ثبت تھا۔ یہ رنگین گلدستہ اس استرکاری با قاعدہ رہنے سے باقی رہا اس سمت پہلا تعداد اہل علم اور کمال اطبا و اکرا واعظ زیر زمین محو خواب ہیں۔ بعض علمائے عراق کی قبریں بھی ہیں۔ چنانچہ مولوی مرزا امین خراسانی نے لعد عذر لکھنو میں جب رحلت فرمائی تو وہ اسی سرزمین پر سپرد خاک ہوئے۔ مفتی، عزیز، محشر اور مہدی نیز ناصری ایم اے وغیرہ مشاہیر قوم نے اپنی نظموں میں اس امامباڑہ کا تعارف کیا ہے اور تاریخی اور ادبی دنیا میں بھی امامباڑہ مشہور ہے۔

عزیز لکھنوی

بیا دریں حسینیہ کہ صبح کبریاستی — کشادہ ہر طرف باب رعلم مرتضی بینی

مرزا کاظم حسین محشر

وہ حسینیہ کہ جو ہے قصر فردوس بریں — مدفن غفرانمآب و مرکز ارباب دیں

منہدم ہوئے کو ہے اے قوم شیعہ ہوشیار — تجھ سے فریادی ہے ایک ایک ذرہ خاک مزار

ناصری المتوفی ۱۳۴۹ھ

جب تک اس دہر میں نام ستم ناشاد رہے — یا الٰہی یہ عزا خانہ بھی آباد رہے

مفتی صاحب

این خوابگاہ مجتہد العصر والزماں — سید محمد است و حسین است و ہم حسن

این جا ہزار مرتبہ مجلس بپا شدہ — از قطرہ ہائے اشک فتادہ در عدن

ہر صحن و رواق وے ز ہر حیدرہ اش — پاکیزہ منزل برکات است بے سخن

در ہر مقام وے کہ ستون ستارہ ہست — سرو یکیست از حدیقہ تشیع در لگن

<u>ایک پردیسی کے اہم خدمات</u>:- ملا محمد مہدی ابن محمد شفیع استرآبادی مازندرانی سلاطین اودھ کی داد و دہش سنکر لکھنؤ آئے۔ ۱۲۴۲ھ سے جہاد قلم شروع کیا ہدیۃ السلطان رسالہ لکھ کر نصیر الدین حیدر بادشاہ کے نام پر معنون کیا پھر طرۃ الجبین دوسری کتاب نواب معتمد الدولہ مہدی علی خاں کے نام سپرد قلم کی۔ اس کے بعد بحار الانوار مشہور حدیث شیعہ کی آٹھویں جلد کا ۱۲۴۶ھ میں فارسی ترجمہ کیا۔ مالدہ شاہ کی فرمائش سے ترجمہ کر رہے تھے کہ دو باب لکھنے کے بعد ۱۲۵۹ھ میں پیام موت آگیا اور امامباڑہ میں دفن ہوئے۔

لہ تذکرۂ بے بہا ص ۱۵۲ ؎ ص ۱۳۳ ؎ الواعظ دسمبر ۱۹۳۱ء میں اس عزاخانہ پر ایک مبسوط مقالہ مؤلف نے تحریر کیا ہے۔ [illegible]

استر آباد اد [illegible] [illegible]　　اے دلئے ذیقعدہ برفت از عالم

شد دفن قریب قبر [illegible]　　ملا مہدی یافتہ قعر ارم

۱۲۵۹ھ

یہ وہ قبر ہے جس پر علماء فاتحہ پڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور [illegible] صاف کرتے ہوئے کہتے تھے ایسا ملد مرتب عالم اب تک عراق سے ہند میں نہیں آیا[1]

ایک مدراسی کی زیادتی ۔ امامباڑہ [illegible] [illegible] علام [illegible] مولانا احمد علی صاحب سے ایک مناظرہ میں ایسی بات چیت کی کہ مولانا نے ان کو کافر [illegible] ۔ امامباڑہ میں مجلس تھی ملک العلماء اور دوسرے عالم شریک مجلس تھے علام [illegible] کے سامنے جب مجلس کا شربت آیا تو مولوی احمد علی صاحب [illegible] کو پاک کر لیا اس واقعہ کے بعد وہ حد سے نکلتے تھے انکساں اخلاق تحسین حق کر حید [illegible] ۔ امامباڑہ سے جنوری ۱۸۸۰ء میں محمد علی عیش نے آثار ال [illegible] اخبار [illegible] جاری کیا ہر جمعرات کو نکلتا تھا اور جولائی ۱۸۸۱ء میں [illegible] اخبار [illegible] یہاں سے جاری ہوا۔

پریس ۔ شاہی پریس جب تک علمی خدمات میں [illegible] بہتر مطبوعات ہندوستان آج تک ۔ چھاپہ کا انگریزوں کا دور شروع ہوئے پر امامباڑہ [illegible] قائم ہوا اور ۱۲۹۰ھ میں اس پریس سے مثنوی معراج مضامین چھپی جس کے ناظم منشی سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی مشہور شاعر ہیں اس مثنوی میں ۲۲۵ شعر بارہ اماموں کی مدح میں نظم ہوئے ہیں اور حضرت امیر لکھنوی کی [illegible] ۔ اس مطبع کے پریس میں شیخ حسان علی گورکھپوری تھے ۔ جن کی [illegible] فارسی لیاقت بہت اچھی تھی اور [illegible] محمد [illegible] باتیں کرتے تھے [illegible] قوی تھا کہ بعد حمد ہندی اور مناقب مدح اہل بیت میں [illegible] ان کا مقابلہ ایسی طاقت لسانی سے سڑک پر کھڑے ہو کر کرتے تھے اور شعر پڑھتے پڑھتے [illegible] ان کی اولاد گورکھپور میں موجود ہے۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور [illegible] امامباڑہ سے شروع ہوئی یہ ہے امامباڑہ کی تاریخ

مسجد ۔ امامباڑہ کے ساتھ جو مسجد ہے [illegible] اعلم مجتہد العصر [illegible] کی تعمیر کردہ ہے قالب دار چھت کشادہ درجہ مختصر صحن ، گنبد و مینار ندارد صحن میں بہشت نہیں [illegible] کسی اعلیٰ [illegible] کا نتیجہ اور اندر سے ہوادار ہے سنگ تعمیر کلئے [illegible] کے پشت مسجد [illegible] دیوار [illegible] اور [illegible] اوپر لکھا ہے لشھد ان مولانا امیر المومنین علیا ولی اللہ سلطان العلماء نے ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ میں رحلت کی اور امامباڑہ کے ضریح والے دالان میں دفن ہوئے دیوان ناسخ میں جو قطعہ تاریخ مسجد غفران مآب کا درج ہے [illegible] [illegible] مسجد ہے [illegible] یہ مسجد۔

امامباڑہ سید نقی صاحب زبدۃ العلماء ۔ موجودہ ترکاری منڈی کی سڑک پر ڈور والی گلی سے قریب داہنے ہاتھ پر یہ اوسط درجہ کا امرا عہد شاہی کی عمارت ہے زبدۃ العلماء معین المومنین سید علی نقی آخری تاجدار اودھ کے خاص عالم اور ہمہ وقت صحبت سلطان میں رہتے [illegible] بزرگ تھے مرزا غالب مرحوم نے آپ ہی کے ذریعے بادشاہ سے ملنا چاہا تھا تاریخ اودھ میں آپ کا نام نامی چھپا ہوا نہیں ہے ۔ امامباڑہ کا پھاٹک کیسا تھا ؟ دروازہ سے متصل ستان عمارت کیسی تھی ؟ کوئی

---

[1] تذکرۂ بے بہا ص ۳۲۷　[2] تذکرہ ص ۲۱　[3] یادگار دسمبر ۱۹۵۹ء لکھنؤ

سکنے والا نہیں۔ گر پڑ کر امد حانے کا ایک تنگ راستہ رہ گیا ہے جس کے بعد کتادہ صحن اور اما مباڑہ کے رہ ہے سبے در جے بلند شہ نشین نیچے تہہ خانہ زبدۃ العلماء کی قبر بہ داب ہی میں ہے اس امامباڑہ کی چھت رنگین پھولدار دری کے ڈیزائن کی تھی اور دوشیشہ کے کانے موٹے بڑے خوبصورتی سے جڑے تھے سر یہ کو مجلسیں ہوتی تھیں آخری ذاکر مرزا محمد صاحب حدیث خواں جو مفتی گنج میں رہتے تھے اور مشہور ذاکر تھے اس امامباڑہ کی ابتدائی تاریخ ہائے عشرہ میں بادشاہ مرحوم شرکت فرماتے تھے اور جو تاریخ مقرر تھی وہ کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی زبدۃ العلماء کے خاص محل سے صرف ایک صاحبزادی تھیں جو شمس العلماء سید محمد ابراہیم فردوس مکان و منسوب تھیں جو آپ کے حقیقی بھیجے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر بیبیوں سے جو اولاد تھی ان میں نجم العلماء سید ہدایت حسین امامباڑہ پر حیثیت متولی درقائم مقام قابض رہتے زوجہ اولی کی اولاد نے اپنے استعمار میں کبھی توجہ نہیں کی نجم العلماء کے بعد سید سعادت حسین عرف پیارے جان اور اب ان کی اولاد متصرف ہے زبدۃ العلماء کی شان میں شاعر کہتا ہے ؎

دلق مہ دمحراب فقیہہ دوراں اعمل و معی صدر وارشاد

اودھ کی جرائد اور رسالوں میں آپ کے حالات شائع ہو چکے ہیں۔ امامباڑہ کا موجودہ راستہ پھاٹک نہیں ہے بلکہ اصل رگلی کی طرف ہے جس کو ورثا نے مکان قرار دیدیا ہے اس دروازے پر فضائل گریہ کی حدیثیں اب تک بخط نسخ کندہ ہیں۔ سید اسمعیل حسین صاحب ثاقب لکھنوی مرحوم حیات دبیر میں رقمطراز ہیں مرزا صاحب مرحوم کا جو اعزاز ان کے کمال کے سبب سے خاندان عالی شان اجتہاد میں تھا اسی نظریہ سے وہ جناب حضرت زبدۃ العلماء معین الموسنین سید تقی صاحب مرحوم خلف الصدق سید العلماء طاب ثراہ کی مجلس میں پڑھا کرتے تھے اس مجلس میں خاندان اجتہاد کے تمام مجتہدین اور لکھنو کے قریبا تمام اہل کمال شریک ہوتے تھے۔ یہ عزت تمام ذاکروں پر فوقیت رکھتی ہے ص۳۸۵

<u>مسجد زبدۃ العلماء</u>۔ محلہ مذکور میں یہ شاندار اور خوبصورت مسجد بھی اس دور رفتہ کی یادگار باقی ہے جو بہترین نقشہ کے تحت تیار ہوئی ہے بالائے محراب سنگ مرمر پر قطعہ تاریخ لکھا ہے جو ترد سے متصل ہے اور مختصر صحن ہے

<u>حمام زبدۃ العلماء</u>۔ مسجد سے قریب امامباڑہ کے پہلو میں واقع ہے اس حمام میں جامہ خانہ کے بعد آداب طہارت احکام دینے کی میعد جگہ تھی اندر بڑا حوض غوطہ کے لئے سنگ مرمر کی زمین پورے حمام کی، ٹھنڈے پانی کا حوض گرم پانی کے حوض میں نیچے بھٹی اور آگ متصل عہد شاہی کے بعد جو حمام باقی رہ گئے تھے ان میں سب سے ممتاز حمام تھا اللہ رکھوا اور اس کے بعد علی حسین حمامی تھا جو بڑی روانی سے ساتھ فارسی لب ولہجے میں باتیں کرتا تھا سقف حمام پر مناسب عمارت اور مشت مال جہانواں کیسہ کرنے والوں کے رہنے کا ٹھکانا تھا عہد شاہی میں زبدۃ العلماء کا حکم تھا کہ بازار لوگ بغیر اجرت کے غسل کریں اس حمام کی تاریخ ملاحظہ ہو ؎

دہ چہ حمام کہ بانیش علی نقی است آنکہ جد دید رشش کرد بنائے اسلام
بسکہ از عترت اطہار بود طینت او کار و بارش ہمہ پاکیزہ دیاکست انجام
آب و تاب سخن از رحمت و صورت یافت شستہ و رفتہ ازیں مادہ گر دید کلام
سرد مہری جہان گرچہ زحد بگذشتہ بہر خاصان خدا ساختہ گرما بہ عام
بر زبانم شدہ تاریخ بنائیش جاری یادم از آیہ تطہیر دہد ایں حمام ۱۲۶۱ھ

بلوچ، پشت مسجد پر زبدۃ العلماء کا کتب خانہ اور لائبریری کے عقب میں فیل خانہ تھا ۵۰ برس پہلے ڈولی کے کہاروں کو میل جاتے کہہ کر پتہ بتلاتے تھے اصطبل اور پشت امام باڑہ پر وسیع باغ تھا جو بڑی پرفضا جگہ تھی۔

دفتر تقسیم زکوٰۃ:۔ جناب مجد علی شاہ مرحوم سے زبدۃ العلماء زکوٰۃ لیتے تھے ان کے حساب میں معین المومنین کی امداد بھی شامل تھی۔ دفتر زکوٰۃ امام باڑہ اور مسجد ہی کے گرد و پیش تھا اور کچھ مکانات اب بھی باقی ہیں جن کے دروازوں پر گلکاری اور رنگین پھول بیل اگلی دیدہ زیبی کا اب بھی پتہ دے رہے ہیں تقسیم زکوٰۃ میں خیال رہتا تھا کہ کوئی مستحق محروم نہ رہے اور مساوات باقی رہے روپیہ بڑی جانچ پڑتال سے تقسیم ہوتا تھا بارہ مستدی حساب لکھے جاتے تھے ہر ایک کے پاس رجسٹر تھا اور زکوٰۃ لینے والوں کو بارہ جگہ نام لکھوانے پڑتے تھے اور جانچ کے وقت تمام رجسٹروں کا معائنہ ہوتا تھا [..] چھان بین سے کوئی محروم رہتا تھا اور نہ دو دو بار حاصل ہو سکتا تھا عام لوگ اس طرز عمل اور قاعدہ کی دشواری سے پیچ اٹھتے تھے کسی ظریف کا مشہور شعر یہی مجھے یاد ہے ؎

سید تقی کا قلم دعا دامنیا　　　بارہ مستدی ایک گل دامنیا

آپ کو سرمقصد کے مسائل حل کرنے میں بڑی مہارت تھی اور تقسیم زکوٰۃ بھی کمال دیانت سے ہوتی تھی میر وحید صاحب مشہور شاعر مدح میں فرماتے ہیں ؎

حاسداں گفت ہر دم بحر بے لغزش باشد　　　ناقصاں را ہر دم دائم دربے نقصان علم

اجلاس:۔ زبدۃ العلماء کے احکام جن فضیلت صادر ہوتے تھے وہاں آپ کی حاکمانہ شستہ بھی تھی اور پیچیدہ معاملات میں تشفی بخش حل آپ کے ناخن تدبیر سے ہوا کرتا تھا اور ملک اس قدر راضی تھی کہ آپ کو کسی پہرہ کی ضرورت بھی نہ تھی حفاظت کی کبھی فکر کی [..] معتی صاحب ان کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

رونق محراب و منبر و فقیہہ دوراں　　　نامحل و مفتی صدر درست اد

زبدۃ العلماء کی تمام جائداد باستثنائے موجودہ مسجد و امام باڑہ کے اعظم علی سوداگر چرم مرحوم حضرت گنج نے خرید کر کوٹھی بنوائی جس پر ان کے بعد ڈاکٹر سوداگران کے بیٹے مدت العمر قابض رہے

فیلخانہ:۔ وہ جگہ تھی جہاں زبدۃ العلماء کا ہاتھی بندھا رہتا تھا۔ مجتہد العصر کے لئے ہر عید بقر عید کو ہاتھی خلعت کے ساتھ آتا تھا چنانچہ تاریخ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

بروز ہائے اعیاد کہ خلعت کتاب اجتہاد مآب عنایت می شد بہ ہزار خلعت وزارت مع فیل و اسپ و شمشیر و پالکی وغیر آنہا می بود و بمقتضائے حسن عقیدہ ابھداری بادشاہ گاہ گاہ بکار می آید' مجتہد کا خلعت وزارت کے خلعت سے بہتر ہوتا تھا علاوہ اس کے شاہزادگان نواب زادگان کے عاشق جوڑے کے ساتھ چالیسویں کے دن سواری کا ہاتھی بھی ہوا کرتی تھا خادم عرض کرتے تھے قبلہ وکعبہ ہاتھی بھی آیا ہے۔ آپ فرماتے تھے کسی حلقے میں باندھو" امرا کھات بندگی رہتے تھے مردہ کا مال سمجھ کر سستے داموں میں خرید لیتے تھے اس وقت ہاتھی کی سواری وہ حیثیت رکھتی تھی جو آج موٹر کار کی ہے۔ ہاتھی سے بھی قدم قدم پر نقصان ہوتے تھے آج فلاں نواب کا ہاتھی بگڑ گیا کل فلاں ہاتھی چھوٹ گیا غریب آدمی کی جان ہمیشہ خطرہ میں رہی۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ فیلبان ہمیشہ سادات ہوتا تھا چونکہ یہ بدست و کی ورمت پشت ایک بیٹھنے پر مجبور تھا اس لئے صرف سادات اس کے مستحق تھے کہ وہ اولاد رسولؐ ہونے کی حیثیت سے بادشاہ کی طرف

بشت کر سکیں۔ زبدۃ العلما کے خاندان میں سے مفتی صاحب اور ان صاحب میں مدرکے دو استاد تھے جو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

پاٹا نالہ

امام باڑہ آغا باقر اور امام باڑہ جعفر انساب کی شہرت نے دونوں امام باڑوں کو اس کا محتاج نہیں رکھا کہ امام باڑہ کا نام آ[illegible]
محلہ دریافت کیا جائے اس وقت پتہ مکمل ہو۔ دونوں امام باڑوں کی گرد و نواح کی عمارتیں محلہ پاٹا نالہ میں شمار کی جاتی ہیں اور پاٹا نالہ
نام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کئی مقامات پر نالہ پاٹ کر راستہ نکالا ہے

<u>غسل خانہ</u> ۔ سید العلماء کا بنوایا ہوا پختہ اور وسیع مکان ہے جس میں مردوں کے غسل کے واسطے حوض پانی کی گزرگاہ غسل کے تختے حوض ترہ صحن میں بیری کا درخت تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے والوں کے لئے دو رویہ عمارت عالیشان پھاٹک اور پشت پر دوسرا دروازہ ہے۔ لاتعداد اموات کو یہاں سے غسل دے کر مختلف امام باڑوں اور قبرستانوں میں دفن کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ عمارت کے کئی حصے گر چکے ہیں صرف غسل کی جگہ باقی ہے اور صفائی اور مرمت کی بڑی ضرورت ہے ظریف نے غسل خانہ کو بھی اپنے مزاحیہ کلام میں یاد کیا ہے

غسل خانہ میں یہ غسال سے مردہ بولا　　　جیل ہے قبر تو یہ گھر ہے حوالات مجھے

اس محلہ کے مشہور رہنے والوں میں مرزا محمد عسکری کتاب خواں تھے جو ۱۳۲۳ھ تک زندہ تھے کتاب خوانی عموماً فارسی زبان میں ہوتی تھی اور پیش خواں جب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اترتا تو کتاب دیکھ کر یہ حضرات پڑھتے اور جب سلسلۂ بیان ختم ہوتا تو منبر سے اترتے وقت ان پر یہ شعر ہونا ضروری تھا ؎

مجروح لب لعل امام مدنی بود　　　از خون دردندان چو عقیق یمنی بود
اے دوست بگو راست بحق شہ مرداں　　　زینب بجہان لائق درّہ زدنی بود

کتاب خواں سب سے آخر میں پڑھتا تھا اس کے بعد ماتم حسین اور زیارت اور فاتحہ ہونا قدیم مجلس کا آغاز و انجام تھا اس محلے کے مشہور رہنے والوں میں ـــــ مرزا محمد اخباری، شیخ محمد خان شاد، میر مہدی حسین ماہر، حکیم میر باقر حسین، چھوٹی شاہزادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور

<u>میر احسان کا امام باڑہ</u> :۔ محلہ کی پرانی عمارت تھی جس کو اس عہد کے محدث اور ذاکر اعظم مرزا محمد اخباری ابن مرزا میر علی نے خرید کر سکونت اختیار کی فن خطابت میں ان کا نظیر نہ تھا ہر تقریر حدیث "من بکیٰ علی الحسین او ابکیٰ او تباکیٰ" سے شروع کرتے تھے، دو گھنٹوں پڑھتے تھے اس عنوان کلام سے اس قدر شہرت حاصل کی کہ احباب خطوط پر پتہ لکھنے میں ان کے نام کے بجائے "من بکیٰ" لکھتے تھے اور چٹھی رساں ڈاک پہونچاتا تھا دور شاہی میں آپ کسی خفیہ ریشہ دوانی سے جلا وطن کر دئے گئے حسین بخش حبشی ملازم عیش آباد ساتھ گیا بادشاہ کو بھی اس صاحب کمال کے ترک وطن کا صدمہ تھا مگر ملکہ کی ناراضگی ناگزیر تھی اپنی صفائی میں محمد شاہ سے ملنے کا بھی ارادہ کیا تھا غدر کے بعد تبدیلی سلطنت ہوئی اور آپ پھر لکھنؤ آ گئے اور ایک عرصہ کے بعد رحلت ہوئی۔ آخر ماہ رمضان یا شروع ماہ شوال میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ منیر شکوہ آبادی تاریخ وفات میں کہتے ہیں ؎

فاضل اخباری وہم زینت بزم عزا　　　حضرت مرزا محمد ایک بد شیوہ زبان
زجہاں شد لیک جانب جنات عدن　　　عالم اخباری و ذوالفقار [illegible] بیان　　۱۲۸۵ھ

امام باڑہ مذکور میں آپ سپرد خاک ہوئے۔ افسوس ہے کہ عہد شاہی کے امام باڑوں پر جو مقالہ قومی جرائد میں چھپا اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ حکیم سید احمد حسن صاحب مرحوم کے مطب کے [illegible] واقع ہے اور اس وقت ایسی ابتر حالت کو پہنچ گیا ہے کہ دو حصے [illegible] سید علی عباس ابن حکیم صاحب مرحوم کا [illegible] ہے اور مطب مذکور کے محاذ میں مکان [illegible] کی صورت میں تبدیل ہوا ہے۔ مدت ملازمت اس کے انتقالات ہوتے [illegible] ۱۳۰۹ھ [illegible] صاحب نے [illegible] علی [illegible] یا گاؤں لکھنؤ سے خریدا۔ یہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو دوسرا [illegible] ہوا [illegible] کاغذات میں حدود امام باڑہ کا ذکر ہے موجودہ مکان کے دروازہ سے نکلتے ہی ایک چھوٹی مسجد ہے جو قدیم عمارت [illegible] اس عمارت کا نامکمل صورت ہے اور [illegible] کارن سے پہلے مالک مکان کو لوگوں تردد میں کام روک چکے ہیں۔ شرقی سمت کے [illegible] امام [illegible] کی اصل دیوار باقی ہے اور علامہ کی قبر سی دیوار سے ملحق ہے لیکن نشان قبر باقی نہیں ہے۔ [illegible] ۱۹۳۵ء کو میں نے [illegible] پر فاتحہ پڑھا دوسری مرتبہ مولوی سید جواد صاحب اخباری معلم دینیات حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کے ساتھ [illegible] احباب [illegible] کو یہاں آکر پہلے علامہ کی قبر پر پھر اپنے والد کے مزار پر فاتحہ پڑھتے رہے۔

<u>شیخ محمد جان شاد</u>: [illegible] شاعر تھے میر [illegible] آپ سے اصلاح لیتے تھے وہ بھی بڑے خوش پسند شخص تھے ان کا ایک شعر زبانوں پر آج تک ہے۔

گھر [illegible] کے [illegible] — اس [illegible] کے واسطے کھڑکی بھی آئی ہے

شاد [illegible] سنا ہے [illegible] میں [illegible] بھی کرتے تھے چنانچہ مصرعہ ذیل دوسرے مصرعہ میں ملک کی لفظ ناصح لکھی ہے

مثل مشہور ہے سے شاد [illegible] زبانوں کی — زبان تیری ملک گیری زبان ٹیڑھی ملک [illegible]

فارسی میں بھی کلام ملتا ہے مدح ممتاز العلما میں کہتے ہیں سے

پیرے کرمثل موسیٰ [illegible] عصا دست — مال [illegible] کہ چو عیسیٰ ملک مقام

ان کے مرنے پر ممتاز مرحوم کی تاریخیں قابل ذکر ہیں اور عنوان کلام [illegible] کے [illegible] ان کے اقتباس میں ہے [illegible] تک زندہ تھے سو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

<u>میر محمد حسین واقعہ خوان</u>:۔ آپ بھی اسی محلہ کے رہنے والے تھے اور اپنے فن میں ممتاز تھے واقعہ خوان مجالس مظلوم کربلا کا پہلا ذاکر ہوا کرتا تھا جو منبر پر کھڑے ہو کر [illegible] رہتے ہیں اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان اللعین الرجیم کہہ کر فارسی میں شہادت عظمیٰ پڑھتا تھا اور بیچ بیچ میں اشعار چاشنی کلام میں زبان پر آتے رہتے تھے خاتمہ بیان میں ان کا یہ شعر مقطع سحر ہوتا ہے

عرض بیان غم اہلبیت آسان نیست — [illegible] کہ آن را شرح پایان نیست

اس کے بعد آہستہ آہستہ ماتم کرتا اور جملہ حاضرین بھی ماتم کرتے اور ختم نوحہ کے بعد منبر سے اترتا اور بانی مجلس تحت اللفظ پڑھنے والے مرثیہ خوان کو اشارہ کرتا اور میاں دلگیر یا ضمیر اور انیس و دبیر کا کلام پڑھا جاتا۔

<u>نواب میر مہدی حسین ماہر</u>:۔ لکھنؤ کے امیروں میں ماہر مشہور شاعر گذرے ہیں جو دولت مندی میں اور اردو ادب میں ممتاز ہستی تھے ان کی کوٹھی پانانالہ پر انگریزی دور کی بنی ہوئی آہنی پھاٹک کے نام سے اب بھی باقی ہے آپ کو خاندان شاہی کی مشہور خاتون

تاج محل کی دولت سے ۲۲ لاکھ روپیہ علاوہ جواہرات ورثہ میں ملے تھے جس میں سے ۸ لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ کسی سیاسی مصلحت سے پیرس ملک فرانس کے بینک میں جمع کر دیا تھا جو ماہر کے دنیا سے گزرنے اور غیر ملکی قوانین کی زد میں آنے سے ان کی اولاد برآمد نہ کر سکی روپیہ کار خیر میں بھی لٹا۔ شرر نے گزشتہ لکھنؤ میں ماہر کی منعقد کردہ مجلسوں اور سامان عزا میں جدت طرازیوں کا ذکر کیا ہے ان مجلسوں کا دو ہزار اخبار، تذکرہ بے بہا وغیرہ میں بھی ذکر آیا ہے ماہر رشید کے ہمعصر تھے "خزینۂ خیال" ان کے مطبوعہ دیوان کا نام ہے وہ بہت بڑے مفکر، مدبر، قانون داں اور بہادر رئیس تھے کربلائے معلیٰ کے مقدمات میں ان سے اور ایک جن سے بڑی دیر تک بھیگی تنکیوں سے مار ہوئی ماہر گراں گوش بھی تھے ان کے کئی فوٹو مختلف سن و سال کے میرے پاس موجود ہیں ان کی اولاد میں دو بیٹے شہرت یافتہ تھے ۔ نظیر حسین و عابد حسین جو چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کہہ کر پکارے جاتے تھے ۔ نظیر حسین لکڑی سوٹ کشتی کے استاد تھے اور عمدہ شہسوار تھے فوجی لباس میں ان کا گھوڑے پر سوار فوٹو میرے پاس موجود ہے بڑے صاحب شعر بھی کہتے تھے رشید تخلص تھا مرثیہ پڑھنے خوب تھے باپ کے مرثیے وہی پڑھتے تھے ۔ چھوٹے صاحب مجلسوں کے مجدد تھے تصویریں بھی خوب بناتے تھے انہوں نے گھر میں ٹیلیفون کے رواج سے پہلے ہی ٹیلیفون لگا رکھا تھا اپنے کمرے میں پٹری بچھا کر ایک ریل بنائی تھی کوٹھی آہنی پھاٹک کا نام قصر نگار رکھا تھا یہ چار گھوڑے اور آٹھ گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتے تھے عربی نسل کے مشکی ان کے اصطبل میں تھے جارج پنجم جب لکھنؤ آئے تو موصوف ہی کی گاڑی پر میڈیکل کالج کا سنگ بنیاد رکھنے لائے گئے اور چھوٹے صاحب نے حسن انتظام سے واپسی کے وقت گھوڑے کی جوڑیاں بدل دیں حکام ضلع کو حیرت ہوگئی کہ ان کے اصطبل میں کتنے گھوڑے ہیں دونوں بھائی لاولد تھے ۔ ماہر نے ۱۳۲۵ھ میں ملک و ادب کو داغ فراق دیا وہ مضمون آفرینی میں یکتا تھے غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

شب وصال وہ سر رکھ کے جس پہ سوئے تھے   تڑپ رہا ہوں وہ تکیہ گلے لگائے ہوئے

آثار موت جب شروع ہوگئے اور ہچکی آنے لگی اس وقت کی آخری رباعی یہ تھی جو نظم کی ؎

کیا خوش نہ ہوں دل شاد کیا ہے تو نے   سو فکروں سے آزاد کیا ہے تو نے
آواز سے ہچکی کی یہ دیتا ہوں صدا   حاضر ہوں اگر یاد کیا ہے تو نے

ماہر کے داماد سید اصطفیٰ عرف للّن صاحب خورشید بھی بڑے بلند پایہ شاعر تھے ان کی کتاب افادات جو مدت ہوئی چھپی اس کے مطالعے سے کتنے لوگ شاعر بن گئے نمونہ بھی ملاحظہ ہو ؎

کب حال دل اپنا کہنے والے ہم ہیں   غم شمع کی طرح سہنے والے ہم ہیں
روشن ہے سبھوں پہ صبر اپنا خورشید   جل جل کے خموش رہنے والے ہم ہیں

خورشید نے عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی ان کے مراثی میں معلوم کربلا کے حال میں جو مرثیہ ہے اس کا مطلع یہ ہے ع "رخصت ہے حرم سے سبط مشرقین کی" اور حضرت عباس علمدار کے حال میں ان کے مرثیہ کا مطلع یہ ہے ع "پھر آج کلک رواں بہر نظم اٹھاتا ہوں" اور عون و محمد کے حال میں مرثیہ کا سرنامہ یہ ہے ع "تا ظہر نثار ہیں در بار حسینی" اور حضرت حر کی عبرت افزا حالت اس مسدس میں نظم کی ہے ع "ہاں بیاں خوبیٔ الفاظ و معانی دکھلا" خورشید پٹنہ عظیم آباد مجلس پڑھنے گئے تھے وہیں انتقال کیا اور وطن سے دور پردیس میں سپرد خاک ہوئے ۔ خورشید کے تین صاحبزادے مولوی سید محمد عابد، اخن قمر نوجوانی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

صاحبزادہ وقار آغا عرف بنے آغا کم عمری میں لاولد فوت ہوئے شاعری گھر کا مشغلہ تھا ایک قصیدہ نواب باقر مرزا صاحب متولی حسین آباد مبارک کی مدح میں میرے علم میں ہے اور مطلع کا یہ شعر ہے ؎

آگ بھڑکی عشق کی لب پر بولے کوئے دوست — دل جگر میں ہڈیاں اور آ رہی ہے بوئے دوست

پاٹانالہ کے بسنے والوں میں حکیم میر باقر حسین صاحب مرحوم بہت بڑے طبیب تھے جنھوں نے ۲ جمادی الاول ۱۳۲۲ھ کو انتقال کیا فن طب میں علاوہ درجۂ کمال کے علاوہ سپہ گری میں بھی باکمال تھے دوسرے شخص محمد کاظم عرف مہے صاحب گراں گوش تھے جو رستم عوالی میں استاد تھے سید محمد کاظم عرف آغا بہ محلہ کی ... مشہور تھے ان کے شوق کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ ملک کا کوئی گوشہ باقی نہیں جہاں شہرہ نہ ہوا ان کے ادبی خدمات پر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حکیم سید محمد نواب نے طب میں عروج حاصل کرنے کے ساتھ علم نک کے جاننے والے تھے اور لکڑی کے جلدسوں میں کامل تھے میر بادی علی سے تلمذ تھا ایسا ہی جانتے تھے بعض شاگرد دوست اپنی نگرانی میں سونا بنوا دیا باپ نے منع کیا تھا۔ اس لئے خود فیضیاب نہیں ہوئے۔ اب بھی اس محلہ میں ... کیمیا ... صاحب رہتے ہیں جو اس دو ساری میں یکتا ہیں اطریفل معروف شربت کشتہ عرقیات میں ... کامل ہیں اور کیمیاگر بھی ہیں ان کے مصنوعات آم کی ... نظیر ہے۔

معمالی ماد جی کی دوکان پاٹانالہ پہ بہت مشہور تھی جس میں دو پیسے میں لوگ کھانا کھاتے تھے ایک پیسے کا آٹا دھیلے کا اصلی گھی دمڑی پر سنے کیوا سے کی دمڑی کا سالن اس دوکان کے کھانے والوں میں ... شائقین موجود ہیں اور اپنی عمر کی آخری گھڑیاں ختم کر رہے ہیں سیاہ روشنائی اور شنگرف کی دوکان پاٹانالہ کا خاص حصہ تھا اور تمام اہل علم اور طلبا اسی روشنائی سے لکھتے تھے یہ عہد شاہی کا کاسہ بارتھا جو ۲ سال سے ختم ہوگیا یہ روشنائی کسی درخت کے پتوں پر سکھائی جاتی تھی اور پڑیوں میں فروخت ہوتی تھی سنگرف بنانا موقوف ہو چکا تھا نہ ... مشکل سے تیار ہوتا تھا۔ آتش کہتے ہیں ؎

تو بیرو صف جل سکا ریں یاد ہیں — سحرف سے سوا ہے سیاہی کا رنگ ...

اس نسل کا آخری کاریگر ... اور دونوں بیرون کا ... گھوما ہوا تعلق سے راستہ جیسا تھا یہ محلہ مطلب حکیم باقر حسین کے سامنے جو گلی گئی ہے اور ... پھرا دیتے ہیں طرف جانا چاہتا ہے یہاں سے سیاں تھہدے کی سبیل تک سنی شیعہ سادات کا مرکز اور کئی بار کی فرقہ وارانہ لڑائی کا ... مرتب کہتے ہیں ؎

سب دشمن آل محمدؐ میں ست ہو گئی — پاٹانالہ بن گیا ایک بہر دال لکھنؤ

نواب اصغر حسین فاخر کا مکان ان کی اولوالعزمی اور فیاضی کو یاد دلاتا ہے ان کی ساکردہ مجلسوں میں پبلک چائے کی تعریف میں یہ کہتی تھی کہ کپ میں اس قدر دودھ اور بالائی گاڑھی کہ تنکا کھڑا ہو جائے اور شربت اس کثرت سے کہ پاٹانالہ کے دھوبی لیے بیل تک کو پلائیں اب اس مکان کی ایک کوٹھری عبرت مسقف تصویر عبرت نظر آ رہی ہے اصغر حسین فاخر مرثیہ پڑھ رہے تھے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی تھی کسی مصرعہ کو بتانے کے سلسلے میں ہاتھ اٹھایا انگوٹھی منہ سے دور مجلس میں گری ایک مرد شریف نے ان کی آنکھوں کے سامنے اٹھائی مگر فاخر نے مجلس کے بعد چشم پوشی کی فاخر کے مراثی سے چند مطلع مجھے یاد ہیں۔

(۱) یارب بہار میں کوئی گلشن خراں نہ ہو — مستقل بر حال شہزادہ علی اکبر علیہ السلام

(۲) اے ناعبان طبع رسا معنی سخن دکھا
(۳) آثار صبح قتل جو رن میں عیاں ہوئے — امام حسین علیہ السلام
(۴) حسرت میں قتل ست علی کے پسر ہوئے — حضرت قاسم
(۵) گردوں پہ جب ہلال محرم عیاں ہوا — شہربانو

نواب بہادر حسین خاں آثم پاٹہ نالہ کے رہنے والے شاعر اور فوٹوگرافر تھے جنھوں نے درگاہ حضرت عباس میں اولاد ہونے کی دعا کی اور بیٹا ہونے پر درگاہ رسید دنظم کرکے، بڑھائی یہ نظم دیکھنے کے لائق تھی ۔ آثم ایک باتصویر مثنوی اہل لکھنؤ پر نظم کر رہے تھے ۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور دامِ حیات لبریز ہوا ۔

بدلے شاہ کی مسجد :- پاٹہ نالہ پر لکڑمنڈی کی ایک چھوٹی مسجد ہے جس کے بانی کا اصلی نام بدر علی شاہ تھا ۔ دار المبلغین لکھنؤ سے گزر کر بائیں ہاتھ کی گلی میں ہے اس گوشہ کا نام چڑیمار ٹولہ ہے ممکن ہے کہ کبھی یہ لوگ یہاں بستے ہوں مسجد کی امامت مولوی احمد علی صاحب حنفی رہتے ہیں ۔

فرنگی محل

عہد اکبر سے لکھنؤ کی آبادی کا آغاز ہوتا ہے اور فرانسیسی تاجر نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا قیام کرکے دربار شہنشاہی سے سال بھر کے لئے یہاں حق سکونت حاصل کیا برس دن گذرنے پر توسیع نہ ہوئی اور یہ مکانات ضبط ہوگئے ۔ اصطبل کے علاوہ چار عالیشان مکان تھے جو بعد میں ملا نظام الدین سہالوی کو ملے ۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں محلہ آباد ہوا اور گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں جو عیسائی ٹھہر گئے تھے ان کی وجہ سے فرنگی محل ہوا ہماری اردو میں عیسائی مرد کو فرنگی اور عورت کو فرنگن کہتے ہیں آگر کہتے ہیں سے

لسکر ساری کی تھی نہ کنگن کی — اب تو دھن ہے اسی فرنگن کی

مجھے اس میں عذر نہیں ہے کہ عہد سعادت علی خاں میں فرنگی محل نام ہوا مگر یہ یقینی ہے کہ عہد اورنگ زیب میں ملا قطب الدین شہید سہالوی کی اولاد کو رہائش کے لئے یہ جگہ دی گئی اور احتمال ہوتا ہے کہ ملا محمد اسعد فتاوی عالمگیری کے سلسلے میں صحبت شاہ سے بار یاب ہوئے ہوں اور اس تقریب سے فائدہ اٹھا کر فرمان شاہی ۱۱۰۵ھ مطابق ۱۶۹۳ء سے اس گھرانے کا قبضہ ہوا ۔ آتش نے ایک مقطع میں کہا ہے سے

ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام — پھلنے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام

بعض اہل قلم نے اس محلہ کی قدیم حدود کو مکانات جوہری محلہ سے ملحق قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ سلطان العلماء اور سید العلماء کا مکان بھی فرنگی محل میں تھا ۔ یہ رائے صحیح نہیں ہے زیادہ سے زیادہ مفتی میر عباس صاحب کا مکان جس کے سامنے ایک بہت چھوٹی سی مسجد زمین دوز لیٹر نیچے کی اب بھی ہے اس کو تذکرہ فرنگی محل کا کہا جا سکتا ہے ۔

علماء فرنگی محل :- علماء کے طبقے میں مولوی ولی اللہ حنفی مولوی تراب علی حنفی[1] جناب سید العلماء کے ہمعصر تھے اور شیعہ طبقہ کو خوبی سمجھی

---

[1] تذکرہ بے بہا

مشاہرہ مقرر تھے مولوی نعمت اللہ مدرس درس و تدریس بھی بہت کامیاب تھا ان کی مجلس درس کا یہ واقعہ ہے کہ جب مولوی تفضل حسین صاحب تعلقہ دار نعیم ربھان ممدوح سے معقول پڑھتے تھے اور دو سو روپیہ ماہوار شاگرد کی حیثیت سے پیشکش کرتے تھا ایک دن مولوی صاحب کی نظر پڑ گئی کہ تفضل حسین کی کتاب ملازم کی بغل میں ہے یہ فعل سخت ناگوار ہوا اور فرمایا کہ تم بھی ہم سے پڑھو ہم طالب علم اس کو جانتے ہیں جس کے پاس کتاب ہو۔ آپ ایک ماہ تک جاتے رہے اور مولوی صاحب نے نہ پڑھایا آخر میں سید العلماء نے سفارش کی اور تفضل حسین خاں نے ہاتھ میں کتاب لے کر پہونچے اس وقت سے سبق[1] ہوا۔ علماء فرنگی محل میں مولوی فیض اللہ صاحب بڑے صاحب کمال تھے اور حکیم مسعود حسین کو آپ سے شرف تلمذ تھا۔ مولوی محمد نعیم، مولوی ولی اللہ صاحب مولوی علاء الدین احمد وہ اہل فضل تھے جن میں کسی فرقہ وارانہ جھگڑے کا نظر نہیں آتا۔ یہ حضرات ملا نظام الدین کے مورث اعلیٰ ملا قطب الدین سہالوی جو شاہ صفی الملک سے پہلے[2] اس شہر میں بر آباد تھے اور فرنگی محل کی آبادی تو بہت پہلے کی آبادی ہے۔ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی اور ابو الحسنات مولوی عبد الحئی وہاں کے آخری علماء ہیں یہ سب مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ فرنگی محل میں وہ آبادی بھی تھی جس سے شاعر کو شکوہ ہے کہ لیلیٰ نامی کسی کی بھاگ گئی اور کہا ہے

جھلکی دکھلاکے نہ کو معیلت جو نکل گئی   اٹھی تھی مولوی سے فرنگی محل گئی

محمدو نانبائی :- عہد نصیر الدین حیدر بہادر میں محمدو نامی ایک پردیسی نے فرنگی محل میں نانبائی کی دوکان کھولی اور اس کی نہاری کی وہ شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شہزادے تک کوشش سے لوگوں کو بھیج کر نہاری خرید منگاتے اور ایسا حوصلہ بڑھا کہ اس نے شیرمال ایجاد کی جو لکھنؤ کی سرمایہ نازش[3] ہے۔ محمدو کی دوکان فرنگی محل کی راہ والی مسجد کے پیچھے تھی۔ رات کو دوکان بڑھاتے وقت جو کچھ سامان فروخت ہونے سے بچ جاتا تھا وہ سب کا سب طالب علموں اور محتاجوں کو بانٹ دیتا تھا واجد علی شاہ جب کلکتہ گئے تو محمدو بھی اپنی دوکان لے کر کانپور تک پہونچا۔ نواب معتمد الدولہ نے حامی کی بعد اس کے سپرد کی۔[4]

عبد الحلیم شرر کا بیان ہے کہ شیرمال کی ایجاد نے محمدو کی اس قدر ترقی کی کہ مجالس اور تعریفوں کے لئے بعض بعض دن ایک لاکھ شیرمالوں کے آرڈر آتے تھے اور اس دوکان سے ضرورتیں ملک کی پوری ہوتی تھیں۔ شیرمال اور باقرخانی میں کیا فرق ہے۔ اس کو اہل لکھنؤ تو جانتے ہیں ذائقہ اور صورت دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں شیرمال موٹی اور باقرخانی پتلی ہوتی ہے۔ شیرمال پر جو کچھ دیے جاتے ہیں وہ صرف گھی یا دودھ کا چھینٹا جذب کرنے کے لئے اور باقرخانی کے کوچے اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ دوسری طرف سے نظر آتے ہیں میں نے ایک بوڑھے نواب زادہ سے فرق پوچھا تو مجھے یہ جواب ملا کہ شیرمال نرم اور باقرخانی بھربھری اور خشکی کے ساتھ لوچ نہ ہونا۔ یہ باقرخانی ماں بیٹی کی یادگار ہے جو شاید ایرانی تھا۔

امامباڑہ نواب محمد ذکی یا بندہ علی کا حمام

فرنگی محل کے پل پر ایک امامباڑہ اور حمام تیرہویں صدی کا موجود ہے جو عوام کی زبانوں پر بندہ علی کا حمام کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس علاقہ میں یہ بہترین حمام ہے اس لئے اس کو شہرت ہوئی اور حمام کا مہتمم بندہ علی جراح اپنی خدمات کے لحاظ سے خود مشہور شخص

---

[1] تذکرہ بے بہا ص۱۱۳   [2] قومی آواز ۳ فروری ۱۹۸۱ء ص۳   [3] گزشتہ لکھنؤ ص۲۱۳

[4] آجکل ماہ فروری ۱۹۵۸ء   [5] گزشتہ لکھنؤ ص۲۱۳

تھا اس لئے عمارت اس کے نام پر مشہور ہے حمام میں جامہ خانہ، اندر سنگ مرمر کا فرش، گرم اور ٹھنڈے پانی کے کشادہ اور علیحدہ علیحدہ حوض، کیسہ اور مشت مال کرنے کے لئے آدمی ہمہ وقت موجود، عموماً نہلوائی ۲ / ۳ نفر تھی جس میں بہت تھوڑا بیسن چکنائی چھڑانے کے لئے ملتا تھا۔ نہلوائی نہلانے والے کے حسب حیثیت دو روپیہ، چار روپیہ، پانچ روپیہ ریٹ تھا حمام میں کہیں ہوا کا گذر نہ تھا۔ اور لوگ گرم پانی میں آرام سے نہلاتے تھے حمام پھاٹک سے متصل اور ڈیوڑھی امام باڑہ میں ہے ۲۰، ۲۵ سال سے بند ہے اور اب حمام میں نہانے کا چلن بھی نہ رہا۔ اگلے لوگ نہ رہے اور پہلے کی ایسی سردی بھی نہیں پڑتی حمام کی تاریخ۔ حمام قدیم اندر حوض ظاہر ۱۲۶۲ پھاٹک کے بعد صحن ہے اور تینوں طرف عمارت ہے امام باڑہ کا حصہ دو دالانوں پر مشتمل ہے قریب اندر سے باہر تک ہیں۔ امام باڑہ سے پہلے یہاں میر جعفر وزیر آصف الدولہ کا مکان تھا چنانچہ ان کی قبر مسجد کے سامنے اب تک باقی ہے۔ یہ مکانات وکٹوریہ اسٹریٹ نکلنے پر غدر میں کھود دیے گئے یہاں سے مشرقی حصہ تک جوتے والے رہتے تھے اور یہ مقام اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

امام باڑہ مرزا محمد دلی خاں صاحب نے غدر کے بعد ۱۲۸۱ھ میں بنوایا جس کی تاریخ یہ ہے۔

ساکرد مرزا محمد دلی خاں — عزا خانہ سرور انس وجاں

صدائے ملائک آمد زغیب — پے تاریخ فرح لتاں ۱۲۸۱ھ

حمام امام باڑہ سے پہلے کی تعمیر اور عہد شاہی کی تاسیس ہے امام باڑہ کی موجودہ تعمیر سے قبل یہاں رجسٹری کا محکمہ پہلے پہل ۱۸۶۲ء میں قائم ہوا تھا۔

فرنگی محل سے اخبار الاخیار یکم نومبر ۱۸۷۸ء کو مولوی سید محمد علی صاحب نے جو مذہب امامیہ کے روشن خیال فرد تھے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

اس ہفتہ وار آرگن کے پہلے مولوی محمد یعقوب صاحب نے اسی محلہ سے اخبار طلسم جاری کیا تھا اور وہ ۱۸۵۶ء سے ملکی مذہبی خدمات انجام دے رہا تھا۔

نوٹ، فرنگی محل میں آغا محمد شریف کی ۲۲ حویلیاں تھیں یہ بزرگ امام باڑہ آغا باقر کے ورثہ میں تھے۔

فقیر کی دعا:۔ شیخ کرامت علی شاہ ایک بزرگ عہد سعادت علی خاں میں فرنگی محل میں رہتے تھے ایک بار یہ اتفاق ہوا کہ نواب نے اپنے آبدار و صوکو بلا طلب پانچ سو روپے دیدیئے اور اس سے پوچھا کہ بتاؤ کہ بیٹے تم کو اس قدر روپیہ کیوں دیا۔ کیا تم نے کوئی عمل پڑھوایا ہے۔ ملازم نے عرض کیا فرنگی محل میں فلاں بزرگ سے میں نے لڑکی کی شادی کے لئے کہا تھا کہ کوئی سامان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ غلام نے کچھ نہیں کیا شب کو ایسی مہر اور قلمدان شیخ کے پاس بھجوایا کہ یہ چیزیں موجود ہیں جس کو چاہیئے بادشاہ بنائیے۔

بھانڈوں کا تماشہ:۔ فرنگی محل کے کسی عالم کے یہاں جو رقص و سرود معمول بر رسم سے پرہیز کرتے تھے شادی تھی انہوں نے اپنے بعض ہم مشرب دوستوں کو بھی مدعو کیا انہوں نے جواب دیا کہ آپ کے یہاں تقریب شادی میں آنا کسی تیجہ اور فاتحہ خوانی کی ایسی شرکت ہے ہم کو کیا لطف آئے گا اصرار پر ایک طائفہ بھانڈوں کا ان شرطوں کے ساتھ بلایا گیا جو صرف نقل کریں اور ناچ نہ ہو گانے کی فرصت نہیں ہے بھانڈوں نے حسب عادت کے موافق پہلے صاحب خانہ ہی کی نقل شروع کی اپنے جتھے کے معمولی آدمیوں کو عمامہ جبہ تسبیح، داڑھیاں لگوا کر ایک صحبت اہل علم

۱؎ قدیم شہر لکھنؤ صفحہ ۱۲ — ۲؎ نیا دور بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء لکھنؤ

کارڈ کی بہ غرض سے دست بوسی اور نئے آنے والوں کی آمد و رفت، حاضرین میں تعارف شروع ہوا، درجید مقدس گئے جو روحیں خصوصیت گزشتہ علما، اور صاحبان کمال کی جب وہ صحبت پراگندہ ہوں تو نقالوں نے ہمیں دل گراں پر نکتہ چینی کی اور کہا وہ جو اس شان و شوکت کے تھے علامہ سبکی تھے دوسرے قاموس کے مؤلف فیروز آبادی تیسرے امام فخرالدین رازی اور حضرت جلال الدین سیوطی اس انتظار پر نوجوان طلبہ میں (ہنسے ہیں) اور وہ جو بھی یہ ان پہ پالی پر سجدہ کا نشان میرا قرداماد تھے

مہذب بیٹھنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اس سے میر باقر جیسی تہ ہیں کی بڑے فلسفی تھے حکمت کا سِلا معلوم ہوتے تھے بات کم کرتے تھے ان کی کتابیں معمولی علم والے کم سمجھ سکتے تھے جب ان کی وفات ہوئی اور قبر میں اتارے گئے۔ منکر نکیر نے سوال پوچھا تو جواب دیا "استقس نوق استقاس"، فرشتے اس جواب سے حیران ہوگئے نہ سوال و جواب ختم کئے واپس جا سکتے تھے اور نہ دوسرا سوال کر سکتے تھے مجبور ہو کر حق تعالیٰ سے عرض کیا ہمارے معبود یہ بندہ کیا کہتا ہے مجھے نہیں معلوم۔ حکم ہوا فرشتوں کو کہ واپس آؤ یہ اتنا قابل ہے کہ کبھی اس کی بات میری بھی سمجھ میں نہیں آتی اس کہ یہ گفتگو بے فصل در ہم برہم ہوگئی طرح دونوں کے تذکرہ صفحۂ تاریخ پر تصویر بنے کہ قوموں کا ایک طوفان تھا جو اٹھا اور چلا گیا۔ وہ سیما اور پیچ خود طرح کو گرد و تسلی و مات فریب سکھاتا ہے یہ اس سے ایجاد ہے۔

<u>شاہ پیجڑہ کی گلی</u>:۔ عہد شاہی میں ایک شخص تھے جنہوں نے اس کو ایسی رقیقہ نیات سے اس کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا انہوں نے عذر کیا اور دوسری مرتبہ پھر کہا اور آپ محروم رہے اور آپ نے غصہ میں خاص اعضاء جسم کو کاٹ دیا اور دیر میں پیجڑا بن کر باہر آگئے لوگوں سے کچھ تو ہمدردی میں کچھ کی کچھ سادہ لوح اس فعل کو ولایت کا درجہ سمجھے اور زندگی میں ان کے گرد ہجوم رہنے لگا اور بعد موت قبر پر قوالی شروع ہوگئی جو آج تک سال بھر کے بعد ہوتی ہے ان کی قربانی سے وہ ہمہ گیر شہرت حاصل کی کہ گلی انھیں کے نام پر نامزد ہوئی

<u>شاہ پیجڑہ کی قبر</u>:۔ شاہ پیجڑا نام دو لفظوں سے مشتق ہے پیجڑا جو وہ زیور ہو جو عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں خواہ بانس کی پیجڑے لفظ نے بلندی حاصل کرکے صورت اختیار کی ہو۔ اس کے سوا تاریخ میں کہیں محلہ کا ذکر نہیں ہے شاہ پیجڑہ کی قبر نمایاں طور پر اب تک موجود ہے بارہ رجب کو عرس ہوتا ہے معلوم نہیں کس سن کے آدمی تھے۔

چاد کنکر اور شاہ پیجڑا کی گلی پر بہار ہند میں جو اشعار ہیں وہ ابتذال کے دائرے میں ہیں اس لئے تہذیب تحریر اجازت نہیں دیتی کہ نقل ہو۔

<u>ڈیوڑھی نواب عظمت الدولہ</u>:۔ درگاہ محل کے پل کے سامنے وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع ہے عظمت الدولہ معظم الملک سید محمد رضا خاں انتظام جنگ اور معز الدولہ احتشام الملک سید محمد تقی خاں بہادر اسد جنگ، دونوں سگے بھائی معز الدولہ مرزا ابوالقاسم خاں جنرل فوج کے بیٹے تھے جن کو شاہ غازی الدین حیدر کی بیٹی نواب رہبرہ بیگم منسوب تھیں اس سرکار کے مختار اور داروغہ رضا حسین صاحب کشمیری مقبرہ جناب عالیہ کے متانا ور نمودار شخص تھے دروازہ پر گھنٹہ والا سکندر آباد آمد بیگم کے وقت تک رہا۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے مقبرہ گولہ گنج میں بقرعید کے دن اونٹ نحر ہوتا تھا، ہر رجب کو ہزاری روزہ کے دن شام کو نذر ہوتی تھی جس میں بلا مبالغہ ایک امرتی پلیٹ کے برابر طعق اور ہر قاب ایک بڑی امرتی سے بھری رہتی تھی۔

دلالی محلہ

گاہک اور دوکاندار کے درمیان میں ایسی گفتگو کرنا جس سے تاجر کی ایمانداری جیز کی عمدگی ثابت ہونے کے ساتھ گاہک کے ملک پر ایسا قبضہ کیا جائے کہ وہ دوسری دوکان پر نہ جائے اس کا نام ہے دلالی اور یہ پیشہ عہد جاہلیت سے ہے۔ یہ میں قائم تھا دلالی کی اصطلاحیں فن کے کرتب دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ چوک ہر تجارت کا مرکز اور اس سے قریب دلالوں کی بستی موجود تھا۔ جمع ہوئی اور یہ بازار میں گئے بعض بعض اوقات گاہک سے بھی کشش لی ایسی رعایت دکھا کر وہ دوکاندار سے تو کمیشن لیا اس کا وہ حق تھا جس میں دوکاندار بھی مدد ہی کرتا۔ دلالی محلہ میں یہ لوگ آباد تھے اس محلہ میں وکٹوریہ اسٹریٹ سے جانے کے دو راستے پہلا راستہ ابتدائے محلہ میں فرنگی محل کے پیں کاظم ہوٹل سے دوسرا عبدالکریم کے پاس سے جاتے ہیں ہو کر یہاں مرزا محمد عسکری صاحب کا امام باڑہ ہے جو قدیم عمارت نہ ہونے سے قابل ذکر نہیں ہے۔

دفتر اودھ پنچ ۔ یہ مزاحیہ اخبار ۱۸۷۷ء میں ملک اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے کے لئے جاری ہوا ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر تھے۔ آخری دور میں عنان ادارت محمد ممتاز حسین عثمانی کے ہاتھ میں آئی جو عربی، فارسی، انگریزی، عبرانی میں قابل شخص تھے اور قومیات پر ان کا آزاد قلم معرکہ آرا بحث کرتا تھا لکھنؤ کا کوئی شخص ایسا نہ چھوٹا جس پر نکتہ چینی نہ کی ہو نظم و نثر دونوں حیثیتیں ملحوظ رہتیں لئے زنی میں علمی آثار کو زندہ رکھا اس جریدہ کا کام تھا پہلے ادارت میں عبدالحلیم شرر پر ایک شعر نظم کر ڈالا ہے

شرؔر بھی ستر برس کی تو کیا کی   گھٹا کی عمر اور داڑھی بڑھا کی

لکھنؤ کے مذہب امامیہ کے مجتہد سید علی صاحب گھوڑے سے گرے اودھ پنچ نے نوٹ لکھا جس کی سرخی تھی "السلام علی صاحب
سلام مو رحسار کر دآلود ہیر " اس میں اشارہ واقعہ کربلا کے ایک پہلو پر تھا چونکہ جناب ممدوح ذاکری میں بھی بلند درجہ پر فائز تھے ذاکری کو علمی لباس سب سے پہلے آپ ہی نے پہنایا اس لئے یہ ہیڈنگ برمحل تھی۔ اودھ پنچ کے آخری ایڈیٹر عثمانی صاحب نے ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا ان کی صحبت کے لوگوں میں نواب روشن علی خاں مؤلف معارف النعمات حکیم مسیح آغا فاضل آغا مرتضیٰ بہبہانی، ڈاکٹر باقر سید علی عصر صاحب سکریٹری اول آل انڈیا سیعہ کانفرنس

مولوی سید ہادی حسن صاحب حفار ۔ عہد شاہی میں نجوم، رمل، جفر کے جاننے والے کثرت سے تھے جن کے اسما بھی محفوظ نہیں لیکن ان سلف کی یادگار اور علوم رفتہ کے حامل مولوی صاحب تھے جو مدرسہ ناظمیہ میں مدرس تھے بڑے عقیدت دار آدمی تھے ان کے کمالات کی یہ حد تھی کہ شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ اور خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ ایسے مجسمۂ کمالات ور دعایت رجوع کرتے تھے اول الذکر بزرگ کے فرزند ارجمند کی سفر مشہد مقدس پوری سرگزشت تاریخ وار لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے لکھوا دی۔ جب وہ واپس ہوئے تو حالات حرف بحرف صحیح تھے ہ ۔ دو بزرگان دین نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ ظہور امام زماں کب ہوگا۔ جواب برآمد ہوا "ارلیس سیرس" یاسین سے پوچھو اس کے دو معنی ہیں یا پیغمبر اسلام سے دریافت کرو اس لئے ان کا نام نامی لیس تھا یا سورۃ یٰسین میں یہ جواب استفسار موجود ہے خود تلاش کرو مولوی صاحب نے آخر عمر میں امام باڑہ دلالی محلہ میں قیام کر کے داعی اجل کو لبیک کہا وہ جفر کی آخری شمع تھے سال وفات ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء ہے۔

وکٹوریہ اسٹریٹ

ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے نام پر یہ سڑک ترکاری منڈی سے شروع ہو کر تالکٹورہ روڈ پر ختم ہوتی ہے اس سڑک کے بعض محلوں ۱
سمت ہوئی تھا اور جن اب ملک تحریر میں آتے ہیں یہ پہلی سڑک ہے جو علاقہ چوک میں انگریزوں نے نکالی ملکہ کا سن جلوس اس
قطعہ سے واضح ہوتا ہے ؎

چو ملکہ انگلستاں بتخت و تاج رسید — بر آمد از پئے تاریخ این ندائے فصیح

ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ ہجرت — ہزار و ہشت صد و سی و ہفت سال مسیح

۱۲۵۳ — ۱۸۳۷

۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء میں ملکہ کی موت کے حساب سے مدت سلطنت ۶۴ سال ہوتی ہے۔ ۲

منکل کا بازار: لکھنؤ سے شغف رکھنے والے سارے اہل قلم کا بیان ہے کہ اودھ میں ایسی مصنوعات کی وہ کثرت تھی کہ کاریگروں
کو بیک وقت دیکھا ایسی دستکاری کی نمائش کا موقع نہ تھا اور ہر ایک صنعت کا بازار آٹھویں دن لگتا تھا ہفتہ گزرے
پر بھی اس کی باری آتی تھی جو آٹھویں دن سے دوکان بڑھا چکا تھا بازار کا مقام وکٹوریہ اسٹریٹ جو اس وقت کی سڑکوں میں
سب سے چوڑی سڑک ہے۔ ورنہ یہ زمین پردہ کا بڑا پامال لے بیٹھے تھے اس سے زیادہ تفصیل اس بازار کی معلوم نہیں
منکل کا بازار انگریزوں کے دور اور ۱۹۱۰ء تک باقی تھا کاکوری۔ ملیح آباد کے جلاہے گاڑھا اور نائچی اور سوتی کپڑے کے ۱
تھان لاکر بیٹھتے تھے لنگیاں اور جانمازیں، دسترخوان، دوسوتیاں ملتی تھیں تعداد میں بھی ایک بازار عہد عباسیہ میں تھا جس کو
سوق الثلثا کہتے تھے منکل کو اس بازار میں چہل پہل ہوتی تھی۔ ۲۰

وکٹوریہ اسٹریٹ سے جیسا ذرا سے جو کہ لکھنؤ کے بیشتر صاحبان کمال کے گھروں کی راہیں اور خود اس سڑک پر صاحبان
کمال کے گھر ہیں اس لیے جوش ملیح آبادی نے اس سڑک کو لکھنؤ کی مانگ" کہا ہے۔

منکل کے بازار میں کاکوری کے جلاہے لنگیاں، گاڑھے کے تھان، دوسوتیاں، دسترخوان اور جانمازیں لے کر آتے اور
یہ تمام صنعت مقامی ہوتی ہوشیار بزاز ایسی پسند کی چیزیں خرید کر رکھتے اور اپنے گاہکوں کے ہاتھ تعریفیں کرکے بیچتے یہ کاروبار
بہت پرانا ہے ستارہ نعیم کہتے ہیں ؎

تانے بانے پر نہ کر دیک ہرگز اعتبار — غور کر چشم حقیقت سے کہ سر پر کوچ ہے

بزازہ: آغا میر صاحب کی ڈیوڑھی سے شروع ہو کر فرنگی محل کے پل تک مسلسل ہندو مسلم بزازوں کی چھوٹی بڑی دوکانیں تھیں۔
تنزیب، منکل بازی، ہیو، مدرسیل کمخواب، مشرو، مخمل، اطلس، گرنٹ، گاڑھا دھوتر، ارکمیں، ڈوریا، کشمیرا، تنابافت، گلبدن،
مشروع، چوپڑا شرتی، جامدانی، چکن، زربفت، بانسا دل، سوسا، آب رواں، زری بوٹی، مال لوٹ، دھیالوٹ، نین سکھ، ادھی
لاہی، کریپ زیادہ سے زیادہ فروخت ہوتا تھا فرنگی محل سے قریب میں چند مسلمانوں کی دوکانیں تھیں جہاں بغدادی چھینٹ اور نقل ۱
جامہ و رند کی چھینٹیں فروخت ہوتی تھیں۔ آتش

خوش ہوتے ہیں ناداں پہن کر کمخواب کا جوڑا — کفن ہے عاقبت اس عالم اسباب کا جوڑا

۱۹۱۶ء میں گوندھیارہ سے پہلے بیا بزازہ تعمیر ہوئے پر زیادہ تر دوکانیں اٹھ گئیں بزازہ کے محاذ اور دوسرے سائڈ میں پالکی

گاڑی والے آباد تھے اور بگھی کرایہ پر چلتی تھی۔

آغائی صاحب کی ڈیوڑھی:۔ سرائے کے سامنے لکھنؤ کے رئیس اعظم ناظم آغا علی صاحب کی ڈیوڑھی اب تک ہے جس میں مشہور امامباڑہ ہے اور عربی علوم کی درسگاہ مشارع الشرائع تعمیر کی ناظم صاحب کا نام تاریخ اودھ میں مخفی نہیں ہے ۲۹ رجمادی الاول [illegible] ان کی تاریخ وفات ہے اس وقت ان کا امامباڑہ سب امامباڑوں سے زیادہ مجالس کے استعمال میں ہے ناظم صاحب کے بعد مرزا محمد عباس علی خاں مرحوم نے ان کے نام کو اور زیادہ روشن کیا۔ آپ بھی ان روساء میں تھے جن کے گھر پہ ہاتھی مندھا رہتا تھا کارِ خیر میں [illegible] شہرۂ آفاق تھے۔

ادیا کبڑن:۔ ناظم صاحب کی ڈیوڑھی کے سامنے کبڑن کی دوکان تھی جو اس قدر مشہور ہوئی کہ اطراف لکھنؤ سے آنے والے مسافر یا تفریح کرنے والے سیاح دور دور سے یکہ اور بگھی والوں کو پتہ بتاتے تھے کہ ادیا کبڑن کے سامنے اتریں گے اس کی دوکان اس سڑک پر بڑے اونچے برگد اور پیپل کے درختوں کے سایے میں جو دوکانیں تھیں اس میں زیبا سامان تھی معاملات کی صفائی اور دیانت نے کبڑن کو شہرت دی۔

ٹھوئی ٹولہ:۔ یہاں معمار رہتے تھے اس لئے ٹھوئی ٹولہ نام ہوا عہد شاہی ختم ہوئے پر اس محلہ میں قادر بخش نے طباعت کا کام شروع کیا اور مجمع المطابع جاری کیا جس کے کام کا نمونہ عہد شاہی کے اعلیٰ کام سے ملتا ہوا تھا الشاہ ولی صفر [illegible] کی چھپی ہوئی میرے پاس ہے وہی کاغذ، وہی لوح، وہی دیدہ ریزی۔ اس محلہ میں جلاد کا مکان تھا جو نوابی میں گردن زدنی کرتا تھا۔ ایک مسجد اور پانی کے نل کے روبرو حصہ ہے یہ جلاد کی جگہ تھی۔

نخاس جدید چڑیا بازار:۔ موجودہ نخاس کا وہ حصہ جہاں مرغ، بٹیر، لال، چرکوے، تیتر، لعل، مینا، چیل، کوا، چڑے، ہریل، مرغاب، چکور، لوا، ہریاں، ٹکوریاں، بگلا، حواصل اور راکو اور دوسرے پرند فروخت ہوتے ہیں چڑیمار زیادہ تر باہر سے جانور لاتے ہیں اور یہاں دن بھر رہتے ہیں پنجرے بٹیروں کی کابک اور جانور پالنے کا دوسرا سامان بھی یہاں فروخت ہوتا ہے۔

عہد شاہی کا نخاس چاول والی گلی سے شروع ہوتا تھا انگریزوں کے زمانے میں وکٹوریہ اسٹریٹ نکلنے پر یہ بازار ادھر منتقل ہو گیا چڑیا بازار، گدڑی بازار، گھوڑے والی گلی یہ ٹکڑے نخاس کے اسی وقت کی یادگار ہیں اور انگریزوں کے آخری زمانہ تک نخاس سینٹری روڈ سے شروع ہوتا وکٹوریہ گنج کے پل تک پہونچکر ختم ہو جاتا اب نخاس نے وہ ترقی کی ہے کہ قدیم دروازہ یعنی فرنگی محل کے پل سے آغاز اور داہنی طرف سینٹری روڈ پر پھیلتا ہوا پھر بائیں جانب ما دان محل روڈ پہ دوسری شاخ ہو کر وکٹوریہ گنج پر ختم ہوتا اتوار کے دن لکھنؤ اور کانپور کے تمام تاجر یکجا ہوتے۔ چوک کے حال میں گذرا کہ عبدالحلیم شرر کے زمانہ ۱۹۲۶ء تک بازار میں چائے کا رواج نہ ہو سکا اس وقت اگر کوئی چائے پیتا تو لوگ طنزیہ کہتے تھے کہ کشمیری ہو گئے یا افیونی ہو۔ امین کے تکیے پر جہاں چند افیونی جمع ہوں وہاں چائے کا دور روزانہ چلتا رہتا ہندوستان میں چائے ۱۹۱۶ء سے پھیلی لکھنؤ میں پہلا چائے خانہ ۱۹۲۶ء کے بعد چڑیا بازار میں کھلا یہ ایرانی کی دوکان تھی جہاں استکان بے دودھ کی چائے ملتی تھی۔

نخاس میں پرانا اور نیا ہر قسم کا مال بکتا ہے ظریف کہتے ہیں ؎

ہو گئیں بیچ نخاس میں دیکھا اس کو — کس جگہ جا کے ملا پیر خرابات مجھے

لکھنؤ میں حکیم مرزا محمد تقی کا مطب ایک یادگار جگہ تھی جہاں مفردات سے علاج اور چار چھ پیسے کے نسخہ میں مریض صحتیاب ہوتا تھا

[illegible] سے ہفتہ وار اخبار "تبیان الاخبار" جاری کیا۔

مرزا دلگیر: [illegible] سے مکبر ہادی (صبیح الملک) کی طرف کرزہ جاؤ توکل کے تکیہ پر زیر درخت جو ٹیڑھی قبر ہے [illegible] مرثیہ خوان مرزا دلگیر کی قبر ہے جو میر تقی و میر حسن کے ہمعصر تھے اور ناسخ کے شاگردوں میں ممتاز تھے بظاہر اسی جگہ ان کا مکان [illegible] اور قبر گھر کے سامنے ہوگی سڑک نکلنے پر مکان منہدم ہو کر قبر باقی رہی دلگیر کا نام چھنولال تھا اور وہ راجہ ٹاؤ لال کے بیٹے تھے [illegible] اسلام لاکر مرثیہ گوئی کی داغ بیل ڈالی اور سیکڑوں سلام اور مرثیے نظم کئے۔ میر علی سوز خوان اور سلطان علی خاں انھیں کے مراثی سوز میں پڑھتے تھے اور آج تک پڑھے جاتے ہیں ان کی مراثی سے منبر اور مجلسیں دلگیر کے استعارے خالی نہیں ہیں میر سید اور آل رسول ہونے کے لحاظ سے اپنے ہمعصر تھے اور رتبے تھے مگر تبدیل مذہب کے عوض ان کو نام ارتقا سے بھی ملنے نہ دیا جب دلگیر کا انتقال ہوا تو لکھنؤ میں عام شہرت تھی کہ وہ مرزا دبیر کے استاد ہیں۔ [illegible] صاحب نے جب سنا تو فرمایا کہ میں ان کا شاگرد ہوتا تو میرے لئے فخر تھا۔ اس قبر پر مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی مرزا نادر حسین خنوں نے فاتحہ پڑھا۔ اہل محلہ ہندو مسلم ان کو شہید مرد سمجھتے ہوئے قبر پر شمعیں روشن کرتے ہیں اور تربت چونا کاری سے نمایاں ہے۔

دلگیر کا کوئی شعر غزل میں کسی کو یاد نہیں نہ ان کا کوئی دیوان، داسوخت، مثنوی ہندوستان سے یورپ تک موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تبدیل مذہب کیا تو معشوق جانی کی مدح چھوڑ دی، اور اپنے تمام دیوان غزلیات دریا برد کر دئے ان کے مرثیے مطبوعہ جلدوں میں کثرت سے موجود ہیں۔

بھانڈوں کی مسجد۔ کشمیر کے رہنے والوں کا وہ گروہ جو رنگارنگ لباس میں موکرتب کرتے گاتے اور مزاحیہ کرتب دکھانے میں شہرۂ آفاق تھا اور شادیوں میں ان کا گروہ بھی دلچسپ والے جانور کے ساتھ بڑے بڑے رقوم اور نذرانے لینے پر مدعو ہوتا اگر ان کی ذہانت کی حکایتیں، پھبتیاں، چٹکلے بیان کئے جائیں تو ایک کتاب بن جائے۔ یہ رنڈیوں، ہیجڑوں کے علاوہ وہ گروہ ہے جو نقلیں کر کے فروغ حاصل کرتا رہا اور جائز نکتہ چینی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ یہ لوگ ان کو مسلح سمجھتی تھیں پرانا دو شالہ ملنے پر ان کا یہ لطیفہ کہ اس پر لا الٰہ الا اللہ لکھا ہے اور دوسرے کا ترپ کر اعتراض کہ آدھا کلمہ کیسا محمد رسول اللہ بھی ہوگا اس کلمے ساختہ کہا کہ یہ حضور سرور اکرم کی بعثت سے پہلے کا ہے۔ کسی دعوت میں آلو کے سالن میں شوربا زیادہ ہو جانا اور ان کا اعتراض کہ غسل اتار کی کرو۔ اس قسم کے ہزاروں واقعات ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلی کے واقعات میں کچھ حکایتیں درج فرما س کی ہیں مثلاً کے والد کا حج سے آنا۔

میں بھی دو واقعہ پیش کرتا ہوں (۱) میاں الماس کا لکھنؤ میں طوطی بول رہا ہے رسم صاحبان کمال سے آراستہ ہے زر و جواہرات [illegible] بھانڈوں نے بیٹھک اور قرآن شریف میں نام داخل کرنے کا ارادہ کیا تمام ارباب ادب اور علم پرور ہستیاں موجود ہیں۔ اور ایک نے بڑی خوش الحانی سے قل اعوذ برب الناس شروع کیا اور ہر آیت کے بعد "میاں الماس" کا اضافہ، حاضرین ہنس پڑے اور [illegible] جنگ بھی شروع ہوگئی کہ قرآن میں زیادتی کرتے ہیں یہ حق ہے کو کس نے دیا ہنگامہ آرائی میں انسانی دست درازی کا بھی جائزہ تھا۔ (۲) ایک عالم دین کے یہاں شادی تھی کشمیری بھی پہنچے باضابطہ شرع جلسے میں رہبر اپنے کی پہلی دھکی [illegible] قرآن کی طرف [illegible] کہا۔ اس کے بعد نکتہ چینی میں ممکن کا ذر وہ شہر کے حالات پر ناظر ہوتے ہیں جب [illegible] میں دیر ہوئی تو

دلی زبان میں عرض کیا ہم تو ـــ وہی القرنی میں ہیں زیادہ حقدار ہیں۔ مجتہد صاحب کشمیری تھے اس لئے نکتہ بر محل تھا کشمیریوں کے علاوہ ایک گروہ ساودیکہ کا تھا جو سبتاً ان سے زیادہ شریف اور متین خوددار تھا بھانڈ تو ہر جگہ تماشا کریں مگر ساودیکہ صرف اہل و تالق شہزادوں اور امیروں کی ڈیوڑھی پر جا کر بلند آواز سے کوئی قطعہ دعائیہ یا مدحیہ نظم پڑھ دیں اور مل سے روپیہ آدھ آنہ آجائیں عہد شاہی میں ان کے فرائض زیادہ سخت تھے قصر حکومت پر جا کر روز ریا قصیدہ پڑھنا اور انعام لینا یہ دستور تھا شعرا کی کثرت میں آسانی سے مل رہی تھی جس کے پاس پہونچ گئے کچھ نئے شعر کہلوالئے اور کام چلتا رہا آخری ساودیکہ پر یہ کام ختم ہو گیا مدرہ برس جس کی موت کو ہوئے ہیں۔

نخاس کے پل سے چاول والی گلی جانے والوں کو اتار میں داہنے ہاتھ پر جو بلند مسجد واقع ہے اس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ کس کی تعمیر کردہ ہے بھانڈوں کی اس مسجد میں نماز پڑھنے سے شہر میں بھانڈوں کی مسجد مشہور ہے اور اس مسجد میں مرزا دلگیر مرحوم کا قطعہ تاریخ کندہ ہے ماہ رمضان میں حسن مرزا کا تابوت جب ادھر سے گزرتا ہے تو سواریوں کے اژدہام میں ا؁رکی صبح کو رونق ہو جاتی ہے مرزا دبیر کی گلی ۔ نخاس کے پل سے گذر کر بائیں ہاتھ پر کوچہ مرزا دبیر ہے جہاں آپ رہتے تھے۔ اب نہ آپ کی اولاد میں کوئی ہے صرف نشان قبر ہے مرزا دبیر نے ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا۔ یہاں میر اعظم علی ایک سید رہتے تھے جن کے پاس ایک یادگار قرآن مجید تھا۔ جس میں دحواشی، سورہ رحمٰن پر ائمہ طاہرین کے نام خط ولایت تحریر تھے۔ قرآن مذکور کی زیارت کرنے والے اس مصحف کو عجائبات میں سمجھتے تھے۔

کنگھی ٹولہ ۔ نخاس کے پل پر دست چپ کی طرف سینگ کی کنگھی بنانے والے رہیں دو دو دکانوں میں کام کرتے ہیں ان کی دو کان سے پہلے ایک مسجد ہے جو نہیں کہا جاسکتا کہ کس کی تعمیر کردہ ہے اس محلہ میں محمود خاں فن سپہ گری کے استاد رہتے تھے۔ ان میں خاص بات یہ تھی کہ شاگردوں کو مثل اولاد کے سمجھتے تھے سید حسن خاں ان کے ایک شاگرد نواب مرزا علی خاں کے رہنے والے تھے ان سے نواب علی نقی خاں کے بھائی سے گولی چل گئی واقعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ سید حسن نے تپنچہ سے حملہ کر کے نواب کو ختم کر دیا تو شہر میں خبر پھیل گئی کہ نواب دہشت کے کسمہ میں قتل ہو گیا۔ اس قاتلانہ حملے کے بعد وہ استاد کے گھر آئے اور اپنی بہادری اور آنے والے خطرہ کا ذکر کیا محمود خاں نے وعدہ کیا کہ گھراؤ نہیں بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ شاہی رسالہ اور دوڑ آگئی سید حسن کو فوجیوں نے تلاش کرنا شروع کیا۔ محمود خاں اپنے گھر کی توہین سمجھ کر دو سو شاگردوں کو لے کر مقابلے پر تیار ہو گئے اور چند بہادروں نے بڑے رسالہ کو شکست[1] دی اور سید حسن کو بچالیا محمود خاں کی شجاعت اور بہادری کے اور بھی واقعات ہیں۔

اشرف آباد

اشرف آباد کو کس نے بسایا اس سوال کے جواب میں میرے سامنے دو رائیں مورخین کی ہیں پہلی رائے یہ ہے کہ یہ محلہ القوتاسش خاں کے بیٹے میر اشرف کا آباد کردہ ہے۔ میر اشرف اور میر مشرف عہد عالمگیر ثانی میں دو بھائی تھے جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے تاریخ شیعہ بین میں سے اسی قول کو اختیار کیا ہے مزید انکشافات یہ ہیں کہ اس محلہ کو میر اشرف ناظم شاہی ابن میر کاظم ابن میر عبدالصمد نے آباد

سہ معری دائی اس مسجد کی بانی تھی جو عہد شاہی کی عورت تھی پتھر پر حسب ذیل قطعہ کندہ نستعلیق درج ہے سہ

دایہ معری چوں ساخت بیت خدا + شد میاراں ملک درسا گردسال بنا شہید رقم + کہ بنا ساخت مسجد والا ۱۲۶۶ھ

[1] دمصاران لکھنؤ ص۱۲ سہ شمس العلماء سید محمد ابراہیم صاحب قبلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

گیا جو کلید بردار شاہ خراسان کی نسل تھے اور ان کی قبر بھی وہیں ہے قول، قول کی بنیاد دستاویزات شاہی تھے جو ہیں نے بچشم خود دیکھے اور القوا سنٹر خاں کے خاندان کے بعض لوگوں نے رقعات تلئے دوسرا قول جو تاریخ میں موجود ہے ممکن ہے کہ اس کا راز یہ ہو کہ میر اشرف نے اس محلہ میں سکونت اختیار کی ہو اور یہاں دفن ہوئے ہوں بعد کی نسل اشتراک اسم سے یہ سمجھی ہو کہ محلہ انھیں کا آباد کردہ ہے۔ اشرف آباد کا رقعات مرزا قتیل میں بھی ذکر ہے اور اس محلہ کی عہد آصف الدولہ میں "کھڑکی" کوئی مشہور جگہ تھی ملاحظہ ہو ترجمہ رقعہ

" خیرات علی خدمتگار نواب آصف الدولہ کو صاحب راقم بھی اچھی طرح پہچانتے ہیں ان دو لفافوں میں سے دہ لفافہ جس کی عربی تحریر ہے مکتوب الیہ کو ہرکارہ پہونچا دے اور کہہ دو کہ اشرف آباد کی کھڑکی میں پہونچکر حکیم میر صادق کا مکان تلاش کرے ان کے گھر سے مولوی غلام ضامن کا مکان ملا ہوا ہے لفافہ مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیا جائے "

اشرف آباد میں متمول ہندوؤں کی آبادی اور رستوگی ٹولہ کی طرح محلہ کے شروع اور آخر میں آہنی دروازے ہیں جو رات کو بند ہو کر اہالیان محلہ قلعہ کی طرح سے اطمینان شب بسر کرتے ہیں۔

علم محاورات کی مشہور کتاب دلیوار قہقہہ کے لطائف میں بھی اشرف آباد کا ذکر ہے اور حکایت ۴۷۲ میں سائیس کے ہاتھ اشرف علی خاں کا اشرف آباد سے شریفہ بھیجنا دیکھو یہ کتاب ۱۹۲۹ء تک لکھنؤ میں شمارہ مارچھپی

میر اشرف کی قبر خیرات خانہ شاہی میں داخل ہوتے وقت بائیں ہاتھ پر تا تی دیوار کے گوشہ کہہ میں بنائی گئی ہے اور یہ قطعہ زمین نمایاں طور پر اب بھی موجود ہے۔

اشرف آباد میں بڑے بڑے صاحبان کمال ارباب ہنر اور مشہور ہستیاں رہتی تھیں جن کے نام بھی ہمارے پاس نہیں کچھ ذرائع ضبط و تدوین کے اب بھی ہیں مگر موجودہ نسل کی توجہ نہیں ہے اس محلہ میں ایک چھوٹی سی مسجد خانہ عہد شاہی کی یادگار ہے جو اندرون احاطہ واقع ہے اور بڑی کسمپرسی میں ہے آگے بڑھ کر امام کا چبوترہ ہے جو ایک قدیم یادگار ہے۔

<u>مولوی محمد مہدی صاحب ادیب</u> :- حیدر گنج کا مرکز علم و ادب آپ کا گھر تھا جہاں علوم مشرقیہ کے ماہر عربی اور فارسی کے ادبا جمع ہو کر جلسے آرائی کرتے تھے صاحب خانہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے لکھنؤ کی تعلیم و تربیت نے ان کو صاحب کمال بنا دیا تھا اس مجلس علمیہ میں جس کا نام بہجۃ الادب تھا زیادہ تر مفتی میر عباس صاحب کے شاگرد جمع ہوتے تھے۔ تذکرہ بے بہا میں کہیں کہیں ان علمی صحبتوں کا ذکر ہے جناب نجم الملۃ مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ کا شباب خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب اور ان کے ہمعصر طلبا مولانا سید محمد داؤد صاحب قبلہ مولانا سید محمد ہارون صاحب حافظ فرمان علی صاحب کی طالب علمی اور وہ آغاز جو عصر حاضر کے حد انجام کو پہونچنے والوں کو نصیب نہیں ان پھولوں کا چمن اور مظاہرۂ کمالات کا منظر یہی تھا صاحبان ثروت بھی جمع ہوتے تھے اور طالب علموں میں بہت ہی مخلص ہوتے ہیں وہ ایسی نظر انتخاب سے جانچ کر کسی سے کہتے تھے کہ فلاں کتاب میں فلاں بحث آپ گھر جا کر دیکھ ڈالیے میں کتاب ساتھ کئے دیتا ہوں اس بحث کے کھوتے پر روپیہ کے نوٹ نکلے گیارہ گیارہ بجے رات تک یہ صحبت گرم رہتی تھی علمی اور ادبی مسئلے حل ہوتے تھے "کواکب دریہ" اس زمانہ کی عربی حد و کتابت پر ایک مخصوص کتاب ہے مولانا ادیب کا انتقال مصطفےٰ آباد

[illegible]

اپنے وطن میں ۔ صفر ۱۲۱۳ھ میں ہوا شعرائے جاہلیت کے کئی ہزار شعر ان کو یاد تھے ۔

اشرف آباد میں کاظمی بیگم ایک علم دوست خاتون رہتی تھیں جن کے ہاتھ کا خوشخط نسخہ معیار الرمل دیکھا گیا حسنِ خط کے لحاظ سے بہترین شاہکار ہے ۔

نوبستہ

بارہویں صدی ختم ہو رہی تھی کہ عالمگیر ثانی کے وقت میں میر مشرف نے اس زمین پر قدم رکھے اور یہ جگہ نوبستہ مشہور ہوئی لفظ میں نئی آبادی کا اشارہ ہے اور بعض اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ نو محلے آباد ہوئے تھے جو لکھنؤ کی شہری آبادی سے پہلے کا ذکر ہے ۔
منشی رام سہائے کہتے ہیں ؎

خطۂ نوبستہ جان لکھنؤ است　　لکھنؤ در ہندوستاں دیگر است
ہند تعالیٰ رونق افزائے ایں زمیں　　ایں زمیں را آسماں دیگر است

<u>قدم رسول</u> ۔ ۱۱۶۸ھ میں الفت خان نے زیارت گاہ بنائی اور مجاورت کے لئے اپنے بیٹوں میر اشرف اور میر مشرف کو چھوڑا جو دہلی چلے گئے اور وہیں رحلت کی وہ سید تھے اور خان خطابی تھا ان کی قبر مزار نظام الدین اولیاء دہلی کے پچھواڑے جو نسخہ کمبہ میں ہے نوبستہ کا بل اس زیارت گاہ کے بعد تعمیر ہوا ہے اس کا مادہ تاریخ اس مصرعہ سے واضح ہے ؎ پل نوبستہ بر رہِ قدم پاک رسول ۱۲۱۷ھ
ایک زمانے میں زیارت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور عقیدت کیش جوق جوق آتے تھے کسی شاعر کا شعر ہے ؎

پس گئے رنڈیوں کے کولوں سے　　باز آئے قدم رسولوں سے

یہ لکھنؤ کی پہلی مسلم زیارت گاہ ہے قدم رسول دہلی میں بھی تھا اور جن تجدد پسند اصحاب نے اس کا مضحکہ اڑایا ہے اس کی رد میں مولوی شاہ محمد عمر احمد دہلوی نے عالمانہ رسالہ لکھا جس کا نام سیف المسلول علیٰ من انکر اثر قدم الرسول رکھا وہ شاہ عبد العزیز کے شاگرد تھے ۱۲۳۶ھ میں فوت ہوئے ۔

<u>تمنائی پریس</u> ۔ منشی رام سہائے تمنا نوبستہ میں رہتے تھے صوبہ اودھ کے حالات پر دو جلد میں احسن التواریخ تالیف کی خود کہتے ہیں ؎

بہ رنگیں عبارت بہ عمدہ کلام　　یہ تاریخ دو ماہ میں کی تمام

ماتا پرشاد نکہت اور دوارکا پرشاد منشی صاحب کے دو اور بھائی تھے اور نظم و نثر میں وہ بھی قابل تھے ۔
مطبع تمنائی اپنے نام پر جاری کیا اور تاریخ مذکور اسی پریس میں طبع ہوئی اور اخبار بھی اس مطبع سے جاری کیا ۔ اخبار[۱] کا نام مہر درخشاں تھا جو ۱۰ ستمبر ۱۸۵۲ء سے ہفتہ وار شائع ہوا ۔

<u>منشی جی سکھ رائے</u> ۔ نوبستہ کے بڑے رہنے والوں میں سکھ رائے عہد نصیر الدین حیدر میں خیر آباد سے آکر رہے آپ قوم کایستھ سری باستب تھے اور فرمان نویسی کا عہدہ آپ کو تفویض تھا ۔ تمنا نے حسب ذیل الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے ۔

عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ سے تا زمانہ ختم سلطنت واجد علی شاہ بلا فصل عہدہ فرمان نویسی پر ممتاز رہ کر تاریخ انیسویں ماہ اپریل ۱۸۶۱ء انتقال فرمایا ۔ صدہا خوشنویس شاگرد ان کے محکمہ جات سرکاری اور چھاپہ خانوں میں ملازم ہیں اور منشی دھنپت رائے

---

[۱] ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ تجارتی سید سخاوت حسین ولد دلدار حسین پیارے لال ماتھ پانگ کے لکھنؤ۔　　[۲] یاد دہ دسمبر ۱۹۵۹ء

اولاد اکبر منشی صاحب علم و فضل میں مشہور۔ ونزدیک وودور سرکار میں آثار۔ و حید الدولہ عمدۃ الملک مرزا مہدی حسین خاں بہادر ناصر جنگ رئیس اعظم شہر لکھنؤ میں ممتاز باعزاز و وقار ہیں ۔ صلاا احسن التواریخ

کھالہ کا بازار

کسی زمانہ میں یہاں کھالیں فروخت ہوتی تھیں اب کھالوں کا کاروبار چک منڈی میں ہے قدم رسولؐ سے آگے بڑھ کر ایک وسیع میدان ہے جو گردھاری سنگھ ہائی اسکول کا پچھواڑہ ہے اس زمین پر دو مقبرے آمنے سامنے نظر آتے ہیں دونوں عمارتیں مقبرہ نورباڑی سے ملتی جلتی ہیں ۔ چھوٹے اور بڑے کا فرق ہے غربی مقبرہ کسی قدر بڑا ہے اور ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا کہ عمارت کس صدی کی ہے اور کس کی قبر ہے بعض اہل محلہ قاضی صاحب کا مقبرہ کہتے ہیں اور دوسرا مزار ان کی رفیقہ حیات کا ہے فتاوی عالمگیری کی تالیف میں جو قضاۃ جمع ہوئے تھے ان میں ایک قاضی ہیں جن کی دکھن میں موت ہوئی اور لکھنؤ میں رہن بوت ان کے عزیز مارس میں ہیں ۔

یہ میاں بالکل عیر مردانہ ہے اور اس سے زیادہ سے وقعت اور محتاج توت وہ قول ہے جس میں کہنے والا کہتا ہے کہ یہ مقبرہ لال جی گلال جی کا ہے ۔ للنلہ کے معانی اور روایت کے تعاقب میں پہلے یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

من گل کے قصہ میں ہے گلال رلال کی　　　امسال کس طرف کو ہے کھٹی گلال کی

ہماری صاحب قبر کا تعلق محکمہ آسانی سے معلوم ہوتا ہے اور تاریخ اودھ میں بھی راجہ لال جی گلال جی کا تذکرہ ہے جو راجہ جھگوا مداس اتالیق نواب آصف الدولہ کی بڑی ریڑکی کے نسل سے تھے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکر تھے لکھنؤ پہونچ کر عہدہ بخشی گری پر فائز ہوئے ان کے بعد ان کے ورثہ مدراج الفت رائے پھر ان کے بیٹے راجہ دھیت رائے انقلاب سلطنت تک کام کرتے رہے ان کے بھائی کا نام کنور رحمت رائے تھا اس خاندان کی شاہ خرچی تاریخ میں مشہور ہے ۔

کنور محبت رائے کے نام پر سڑک اس وقت تک موجود ہے اور مہدی گنج کو وکٹوریہ اسٹریٹ سے یہی راستہ جاتا ہے ۔

مقبرہ :۔ جو کور کوٹھری اور چھت پر خوبصورت گنبد جس کی استرکاری باقی نہیں ہے لداؤ ہر گنبد کے چاروں طرف مینار رکھے اب گوشہ شمال میں دو مینار باقی ہیں ۔ چھت قالب دار ہے اور گنبد کے پہلو میں روشن دان اس خوبصورتی سے بنائے گئے ہیں کہ حجرہ میں روشنی پہونچتی ہے ۔ درمیان میں نشان قبر ہے پتھر باقی نہیں رہا ۔ دوسرے مقبرے میں کوئی مینارہ نہیں ہے اور اسی وضع قطع کا ہے اور دونوں گنبدوں میں چھت پر سے قبہ کے بیچ پہونچنے کی جگہ ہے جیسا کہ مسجد تحسین اور مسجد آتو جی میں چھت پر سے مشی کرتے ہوئے گنبد کے اندر انسان جا سکتا ہے اور چھتیں دوہری ہیں دوسرے مقبرہ کی بیرونی دیواروں پر نقش ونگار قابل دید ہیں اور صدیاں گذر جانے پر دیدہ زیبی باقی ہے میری رائے میں یہ عمارتیں شاہان مغلیہ کے دور سے بھی کچھ پہلے کی ہیں ۔ جلد اول فتاوی عالمگیری کے مترجم احتشام الدین مراد آبادی ہیں اور دوسری جلد کے ترجمہ کرنے والے مولوی امیر علی ہیں جنھوں نے ۱۹۱۰ء میں ترجمہ کیا عامل کشور نے فتاوی قاضی خاں کا جامع قاضی حسن بن صدر الدین منصور بن شمس الدین ابو القاسم بن عبد العزیز اوزجندی عرف قاضی فخر الدین چھاپا دیا ہے اور اس کے ساتھ ایک رسالہ مراحیہ طبع ہوا ہے جو مولوی سراج الدین ہندی کی تالیف ہے ممکن ہے کہ ان کی قبر ہو مگر اس وقت جب مولف کو اس دور کا مانا جا سکے ۔

سے احسن التواریخ صلاا　　　سے دیکھو فہرست کتب خانہ تجارتی منشی نولکشور لکھنؤ ص۳۵

شکستہ مسجد یا خزانہ والی مسجد

مقبروں سے تھوڑے فاصلے پر پچھم کی طرف ایک مسجد ہے چھوٹا سا صحن طے کرکے تین پکے زینے چڑھنے پر محراب اور دروازہ شروع ہوتا ہے گنبد منہدم ہو چکے ہیں کچھ حصہ قبہ کا باقی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ دونوں مقبرے اور مسجد قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ دروازہ پر آیات قرآن بخط عرب تحریر ہیں اور عمارتی مصالحہ سے کاشتے نکالے ہوئے۔ رکوع سورۂ آل عمران کا لکھا تھا بجائے پتھر کے مصالحہ سے بنے ہوئے حروف کہیں کہیں باقی ہیں۔ ایک سطر داہنی طرف حصہ زیریں در سے شروع ہو کر دو سطریں دروازہ کا زیر اور تیسری سطر بائیں طرف ہے بیشتر حروف گر چکے ہیں کہیں کہیں قرآنی لفظ سطروں کو اپنی طرف موڑتی ہے اور چونکہ قل ان الامر کلہ للہ قرآن شریف میں ایک بار ہے اس لئے بڑے غور اور خوض سے یہ صحیح فیصلہ ہوتا ہے کہ آل عمران کا پورا رکوع محراب پر لکھ دیا گیا ہے۔ سقف باقی نہیں پشت مسجد پر کچھ قبریں پرانی آسمان کے سایہ میں ہیں جن میں ایک قبر پر سفیدی ہوتی رہتی ہے دو پیچھے نالہ بہتا ہے۔ اور بیشوں کا کنگارہ ہے اس قبر کے بارے میں ہندو مسلم اہل محلہ میں شہرت ہے کہ جس عورت کے دودھ کم ہو وہ یہاں لاکر نمک رکھ دے نمک کے کھانے سے دودھ پلانے والی عورت کا دودھ زیادہ ہو جائے گا۔

مسجد پر کتبہ میں جو خط ثلث میں بخط عرب لکھا ہے صرف بسم اللہ تو باقی ہے حرف حاکا گر گئے ہیں اور اسلوب نگارش یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاسا
یغشیٰ طائفۃ منکم وطائفۃ قد اھمتھم انفسھم یظنون باللہ غیر الحق
ظن الجاھلیۃ یقولون ھل لنا من الامر من شیء قل ان الامر کلہ للہ
یخفون فی انفسھم ما لا یبدون لک یقولون لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ھھنا

آیت مذکور کا اردو میں ترجمہ یہ ہے۔

پھر بعد اس رنج و غم کے خدا نے تم پر سکینہ اتاری جو تم میں سے ایک جتھے پر طاری ہوئی اور ایک جتھے کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور خدا کی نسبت ناحق جاہلیت سے بدگمانی کرتے رہے کہتے تھے کہ اس معاملے میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے تم کہہ دو کہ یہ معاملہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ اپنے دلوں میں وہ جو کچھ چھپا رہے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے یہاں رکوع ختم (ساتواں رکوع) یہ آیت نقرہ ذات اعداد ہے اس کے عمل مقرر کئے ہیں۔ اس آیت میں یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ سارے حروف تہجی الف سے یا تک یکجا موجود ہیں جو قرآن مجید میں کسی جگہ نہیں ہے عوام کو تو اتنی قابلیت نہیں کہ آیت مخصوص اور میرے خیال میں جس وقت کچھ دن اور گذر گئے اس وقت اس آیت کا دریافت کرنا بھی مشکل ہے ماہر ہوگا عام نگاہوں نے برخلاف دیگر مساجد کے دوسرے کتبوں کے نئے اسلوب اور نئے پیرائے والی آیت دیکھی اور پرانے اقوال کی روشنی میں جو مسجد کی تعمیر کے وقت سے مسجد کے دیکھنے والوں نے اس کو دوسرے لوگوں تک پہونچایا یہ کہا کہ مسجد پر یہ لکھا ہے کہ منارہ کے سمت الراس پر جہاں یہ ختم ہو زمین میں دفینہ ہے جو شخص اس کو تلاش کر کے حاصل کرے وہ اس میں محنت خود لے اور خیرات کر دے اور اس میں مسجد بنوا دے اور مرمت میں صرف کرے۔ آیت کا ظاہر تو نہیں بتاتا کہ دفینہ ہے اور ایسی آیت والی مسجد کی طرف سے انتخاب بھی افعال کے راز کا باعث تھا ورنہ ممکن تھا کہ سورۂ کہف کی آیت وکان تحتہ کنز لھما

الدی جاتی تحریر کردہ آیت چونکہ ان آیات سے جدا گانہ ہے جن کا مسجد کے پتھر پر اظہار ہو سکتا تھا اور جو مسجد یا شعائر اللہ کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں اس لئے اس آیت سے دفینہ کی طرف اشارہ بے محل بھی نہیں ہے اگر مسجد اور مزار ایک شخص کا ہے تو ممکن ہے کہ صاحب قبر کے علم افروز دماغ سے اس آیت کا اختراع ہوا ہو یا بانی مسجد اس قدر علم نواز تھا کہ اس نے قرآن مجید کے چھ ہزار سے زیادہ آیات میں اس آیہ کو پسند کیا دفینہ کے تلاش کرنے والے خلعت کی فکر میں ہیں اور اگر پا جائیں تو مفلسی تو نگری سے تبدیل ہو کر آیت کا پہلا وعدہ سامنے آجائے خزانہ کی جستجو میں انسان ناکام و رعلم الٰہی میں اس کا ہونا لازم ہے قل ان الامر کلہ الی اللہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ڈھونڈنے کے بعد پانا یخفون فی انفسھم ما لایبدون لک سے بین گوئی کا نتیجہ ہے ھٰھنا کی لفظ بانی مسجد کے ضمیر کا اعلان عام ہے مگر راز قدرت کا افشا نہیں کر سکتا یہ رہن رہن و بیع کے ذریعے ماڑکان کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کے قبضہ میں ہے اور مقدمہ بازی سے اس مالک سے ہاتھ سے جاتی رہی اور تلاش دفینہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر "ان الامر کلہ الی اللہ" اب تک دم رہا۔

خوشنویسی کے ماہر بھی ورطۂ حیرت میں ہیں کہ ایسا کتبہ خط اور زور قلم لکھنؤ کی کسی عمارت کے کتبہ میں نہیں ہے ۔ شکستہ عمارت ٹوٹے ہوئے پلستر کا پڑھنا اگر تسلسل متعصب کی لعد پر ٹوٹی اور ماتی رہتی تو ناممکن تھا۔ یہ قرآنی اعجاز ہے کہ ٹوٹی ہوئی عمارت میں ایک لفظ نے پورے کتبے پر راہنمائی کی۔

وکٹوریہ گنج میں مصر ٹوپی والے عمدہ کاریگر تھے ایک قدیم روزنامچہ میں ذکر ہے کہ ۵ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو کاریگر مذکور کو ۳ عدد کلاہ چوگوشیہ شال کی تیار کرنے کو دی گئیں اور کہا کہ دو ٹوپیوں کی شال بھی بدلی جائے گی ۔ سفید شال لگائی جاوے اور دو ٹوپی جالی کی دوہری یعنی بیچ جامدانی اوپر باریک جامدانی کی تیار کر دیں

وکٹوریہ گنج

حیدر گنج سے پہلے وکٹوریہ اسٹریٹ کی آخری حدوں میں وکٹوریہ گنج ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے نام پر شروع انگریزی میں آباد ہوا اور عوام نوریا گنج کہتے رہے یہ غلہ اور ترکاری کی منڈی نمبر ۲ پر ہے گیہوں، جو، چنے کے آڑھتیے، دال، چاول اور اناج کا ذخیرہ ہے اور کہیں کہیں مسلمان کنجڑے ترکاری لے کر بیٹھتے ہیں۔

<u>خیرات خانہ شاہی</u> :۔ یہ وہ پبلک ادارہ ہے جسے حضرت نصیرالدین حیدر بہادر نے ۱۸۳۲ء میں ساڑھے تین لاکھ روپیہ سے خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کے لئے جاری کیا۔ یہاں لولے لنگڑے اپاہج اور بے وارث مرد و عورت جن کا کوئی ذریعہ ہو تنخواہیں اور دونوں وقت کھانا دے کر رکھے جاتے ہیں اور قدیم منشی کے پھاٹک کے بعد مفلسوں کی رہائش کے کمرے ہیں پھاٹک پر بادشاہ کا نام اور سنہ تاسیس کھدا ہے خیرات خانہ کے اندر داخل ہو کر پشت ادارہ پر محلہ بھدیاں کے بڑے بڑے میدان اور کشادہ زمینیں ہیں یہ ادارہ ایک ملک کش خیال اور باضابطہ کمیٹی کے زیر نگرانی غریبوں کی مدد کر رہا ہے۔

<u>مہرکن کا احاطہ</u> :۔ یہ بھی حیدر گنج سے قریب بائیں ہاتھ پر واقع ہے یہاں عقیق اور فیروزہ در نجف پر آیات قرآن دعائیں کندہ کرنے والے اور جامدانی چیکن تانا بانا مہریں کھودنے والے آباد تھے ان سب کی دکانیں کہنہ کے کنوئیں پر چوک میں تھیں ان کے ہاتھ کے طغرے نسخ و نستعلیق کے نمونے اب بھی کبھی کبھی بازار میں نظر آتے ہیں ۔

عہد قدیم میں مہر کی وہ بلند حیثیت تھی کہ جب تک خاتمہ دستاویز پر مہر نہ ہو وہ کاغذ جعلی سمجھا جاتا تھا ہر اقرار نامہ اور وثیقہ پر مہر ہونا ضروری۔ کوئی تحریر ایسی نہ تھی جو مہر سے خالی ہو سرکاری کاغذات پر اور زیادہ مہر ہونا ضروری تھا یہ فن بھی اب ختم ہو گیا اور مہر کی حیثیت دستخط نے لی اور مہر کن نے کمال کو قبروں میں لے گئے۔

اس محلہ میں ایک پرانا قبرستان اور بعض مسجدیں ہیں جن کے بارے میں کوئی تاریخی ثبوت میرے سامنے نہیں ہے۔

بارہ دری حکیم حیدر حسین :- وکٹوریہ گنج میں یہ عمارت پلیس ہاؤس کے نام سے اب تک ہے عہد شاہی میں میر باقر رسالدار بڑے مشہور شخص تھے ان کے علاوہ حکیم حیدر حسین و حکیم صفدر حسین فن طب کے چاند سورج سے کسی طرح کم مشہور نہ تھے حکیم حیدر حسین دار الشفاء شاہی جو کہ شفاخانہ کے طبیب اول تھے ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم جعفر حسین اس عہدے پر آئے اور فن طب کی شاندار خدمت انجام دی۔ حکیم حیدر حسین دراز قد جسم کے تومند قد آور شخص تھے۔ غیر معمولی غذائیں اور قسم بادام و حریرہ و یخنی اور گھی دودھ ان کی روزمرہ کی غذا تھی یہ ان اطباء میں تھے جو اپنے مریضوں کے لئے نماز شب میں دعائے صحت و شفا کیا کرتے تھے حکیم صفدر حسین نے جمادی الاول ۱۳۲۲ھ میں انتقال کیا۔

کربلا سعید الدولہ

نواب سعید الدولہ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی نسل سے تھے اور مرزا خرم بخت کے داماد تھے آپ نے عنفوان شباب میں رملہ کی اور ایسی مالی ملکہ رملہ یہ کے امام باڑہ میں دفن ہوئے کربلا کا پچھلا حصہ نا تمام ہے۔ روضہ کے اندر در و دیوار میں نسخ اور خط ثلث کے اصل موٹے رنگ آمیزی سے زیور اور اسمائے الٰہی سورہائے قرآن کی صورت میں موجود ہیں اور وسیع احاطہ کربلا کی آرامگاہ میں شمار کیا جاتا ہے پہلو میں گڑھوں کی جگہ ہے سعید الدولہ بصرورت کلکتہ جا رہے تھے ہاتھ سے چابک گر گیا دو سرے چابک کی ضرورت ہوئی۔ گاڑی رد کی دوکان پر آئے مالک دوکان سامان بڑھا رہا تھا چابک دینے سے اس نے انکار کیا آپ نے حکم دیا کہ سوداگر سے پوری دوکان خرید لو ۳ لاکھ کی بولی سوداگر نے لگائی اور سوداگر نے کہا کہ ہیں نے کاغذ تیر قلم دوات کاغذ فرش ۳ لاکھ میں دیدوں گا آپ نے تین لاکھ کے نوٹ اس کے حوالے کئے بیچک مالک دوکان کاغذات کا بستہ لے آیا بستہ گاڑی میں رکھوایا اور کہا کہ کل تیا مگاہ پر آ کر بیعنامہ کی تکمیل کرا لینا اس کے بعد حکم دیا کہ دوکان کا سارا مال غریب لوٹ لیں سوداگر سے کہا کہ دیکھو ہم فقط یہ ردی خرید کر لے جا رہے ہیں سوداگر ... دیا بستہ میں سے کچھ کاغذ بھی تھے منتی نے جا کر دیا تو چند کوٹھیوں کے قبالے ہوٹل کا ٹھیکہ کھاتہ کئی تمسک بھی نکلے منشی جی سمجھے کہ ... صاحب غلطی میں رہے اور کاغذات بہت ضروری ہیں مگر آپ نے دوسرے دن کاغذات اس کے حوالے کر دئے۔

کربلا منشی فضل حسین

خان بہادر منشی فضل حسین عہد سلطان عالم میں دفتر کشتی گری میں نوکر تھے انقلاب سلطنت کے بعد سر محسن الدولہ کے یہاں ملازم ہوئے ان کی ایک کوٹھی وکٹوریہ گنج میں تھی جس کے سامنے بازار لگتا تھا آخر عمر میں حسین آباد ٹرسٹ میں ایک اعلیٰ منصب پر پہونچے اور انگریزی حکومت میں فرزندان مسلم کا روضہ تو آیا عہد شاہی ختم ہو چکا تھا اس درگاہ کربلا ہوائے کاکسی میں جذبہ تھا صرف فضل حسین خان محسوس کر رہے تھے کہ لکھنؤ میں سب ہے فرزندان مسلم کا روضہ نہیں ہے تعمیر کچھ چکی تھی اور درستی باقی تھی اس کار خیر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ روضہ ہوا جس میں دو حجرے پہلو بہ پہلو اور دو وقتی پاس پاس نکاس کے پھاٹک کے سامنے چار دیواری میں مسجد اور حوض

۱؎ دمع لسان لکھنو ص ۵

کھیوں خلّاں نہ ہے۔ روضہ کی اراضی بہت لمبی چوڑی ہے اور واقف کے گھرانے کی قبریں بھی اس زمین پر ہیں ان روضوں کی تاریخ میں مفتی میر عباس صاحب فرماتے ہیں ؎

روانش صفا و مرغوب و موزوں — جو مینی را بیات رنگیں نگارے
کنم بر شمارِ عرش تاریخ روضہ — یقیناں مسلم ساختہ مزارے — ۱۲۹۶ھ

۲۶ رجب کو منشی فضل حسین خاں نے ۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا اور اسی زیارت گاہ میں دفن ہوئے چہلم اور عشرہ کے دن تال کٹورہ جانے والے ماتمی دستے اور عام زائر زیارت کرتے ہیں۔

انگریزی علاج کا اسپتال

یہ اسپتال ۱۸۳۲ء میں عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ کے سرمایہ سے کھلا روکار کی دیوار پر جلی قلم سے ۱۸۳۲ء لکھا تھا جسے سڑک کے گزرنے والے پڑھتے تھے جمہوری حکومت کے زیر انتظام آنے پر یہ لکھا مٹا دیا گیا اس اسپتال کی بنیاد حضرت گنج میں قائم ہوئی تھی اسپتال کے پہلے ڈاکٹر STEVENSON تھے اس سال حضرت گنج سے حیدر گنج اسپتال منتقل ہوا اور مشہور معالجوں میں خان بہادر ڈاکٹر عبدالرحیم تھے جنھوں نے ۱۸۸۰ء میں وفات پائی اس اسپتال میں عمل جراحی آنکھوں میں قدح اور ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے مریضوں کے ٹھہرنے کے وارڈ بھی ہیں جمہوری حکومت نے اسپتال کو ترقی دے کر سرکاری اسپتال قرار دیدیا اور مشائے واقعہ پر عزب ہے۔

حیدر گنج

لکھنؤ کے رہنے والوں کی زبان پر پرانا حیدر گنج بار بار آتا ہے ۔ محلہ وکٹوریہ گنج سے دست چپ کی طرف ـــــ شروع ہو کر بیشتر آبادی پر حاوی ہے اور نام میں اسلامی ہیبت موجود ہے مشرقی تہذیب کے بہت سے رئیس اس سر زمین پر رہے جن کا اب صرف ذکر باقی ہے اور بعض آثار قدیمہ فنا ہو گئے بعض ہنوز باقی ہیں۔

<u>عظیم الشان مندر</u> :- لکھنؤ کی پہلی آبادی ہندو ہیں ان کی اکثریت کے شایاں شان مندر نہ ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طبقہ پست تھا چھوٹے چھوٹے مندر تو ہر سمت تھے مگر سلطان عالم کے دور حکومت میں زبدۃ العلماء کی زمین پر حیدر گنج میں عالیشان مندر تعمیر ہوا جس کی بلندی کا یہ حال تھا۔ قبہ مرتفع چو سبع شداد۔ مفتی میر عباس صاحب مرحوم نے ۴۶ شعروں میں مندر پر کشش کی ہے اور سرگزشت شائع ہو چکی ہے۔ علی پرور شاہ نے مالک آراضی کے احتجاج پر مندر کو باقی نہیں رکھا۔

<u>مسجد راجہ ٹکیت رائے</u> :- حیدر گنج میں راجہ ٹکیت رائے کی سربلند مسجد موجود ہے جو ہندو مسلم اتحاد پر گواہ ہے عمارت کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ٹکیت رائے کی دو مسجدیں نجم الغنی نے بتائی ہیں اور دونوں حیدر گنج میں ہیں بلند مسجد کے پہلو میں امام باڑہ بھی تھا جو باقی نہیں رہا۔

<u>نواب صاحب کا دربار</u> :- ۱۹۳۸ء میں مجھے منجھن پور ضلع الہ آباد سفر کی نوبت آئی اور وہاں کچھ تہذیب لکھنؤ کے دلدادہ مل گئے اور ایک صاحب نے بیان کیا کہ پرانے حیدر گنج میں ایک شاہزادہ رہتے تھے جو صورت شکل میں آخری شاہ اودھ کی تصویر تھے پیروں

[illegible] ۱۹۱۸ء [illegible] مرتبہ کتب خانہ ریاض التجارت چوک لکھنؤ میں اس مسجد کے حکومت کی طرف سے جائز طور پر لکھا ہوا [illegible]
[illegible]

تھی ایک گلی کا ٹوپی کرتہ کا پائجامہ پرانی وضع قطع صبح سویرے ان کی صحبت گرم ہوتی تھی نام مرزا مغل تھا اور پندرہ بیس مصاحب ڈیوڑھی پر حاضر رہتے تھے ساٹھ برس پہلے شہر میں چلنے کا کوئی ذکر نہ تھا صرف شہزادہ صاحب کے یہاں جلسے کا دور چلتا تھا ۔

راوی ناقل ہے کہ میں نوجوان تھا اور تہذیب لکھنؤ دیکھنے کے لالچ میں ان کی صحبت میں پہونچ گیا صورت دیکھتے ہی اپنے طریقے سے جھک کر سلام کیا تھا مگر نواب صاحب کی جبیں پر شکن آگئی اور فرمایا صاحبزادہ "تم کو ابھی تک سلام کرنا بھی نہیں" آ جھک کر سلام کرو اور مجھ کو میں نے تعمیل حکم کی اور نواب صاحب نے کورنش کہہ کر جواب سلام دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا میں دوسری مرتبہ سلام کرکے اپنی جگہ بیٹھا اور کچھ دیر میں سب مصاحب جمع ہوگئے ۔ اور چار آنا شروع ہوئی اس طرح کہ ہر کپ پر ایک کا ذرتار رکھی ہوئی حاضرین فراشی سلام کرکے چار کی پیالی ہاتھ میں لیتے تھے اور بڑے لطف سے پہ نشست برخاست ہوتی تھی ۔ کا ذرتار یک ناہی سیر مال تھی جو چوک کے نانبائی خلیفہ تھے وہ ایک پیسے کو دیتے تھے گھی میں خستہ میدے کی ہر پرت میں زعفران کی رنگینی چلنے میں پھوکتی ہے ملائم ہو جانا اور ذائقہ میں کچھ سے بہتر ۔

تمام مصاحب تنخواہ دار تھے ہر مہینے کی پہلی تاریخ مشاہرہ کے ساتھ چاندی کی مختلف وضع قطع کی ڈبیاں کسی پر بڑیا کسی پر موور کسی پر مچھلی تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی تھیں اور ڈبیاں ایک دوسرے سے مشابہ نہ ہوتیں یہ غریبوں کی امداد کے طریقے تھے اور ریاضی کی نئی سی صورتیں تھیں ۔

<u>پرنس سکندر قدر</u> :۔ یہ بزرگ شہزادے تھے اور اما باڑہ ممتاز العلماء میں سال بھر کے بعد ایک مجلس کرتے تھے جس میں تبرک کے بجائے دوائی چوبی تقسیم ہوتی تھی علماء کے پاس ٹکٹ حاضر کردئے جاتے تھے اور وہ مستحقین کو تقسیم کر دیتے تھے یہ ٹکٹ دکھا کر دروازہ اما باڑہ باغ کے پھاٹک پر حصہ بٹتا تھا ۔ یہ کی دیواریں بھیڑ میں ہر سال گرتی تھیں اور نواب صاحب ہر سال ان کو اٹھواتے تھے ۔ پولیس انتظام کرتی تھی ۔ کسی نے پوچھا حضور علماء کے یہاں چٹھیاں بھیجدیتے ہیں اس کا کیا سبب ہے ریزکاری اس کے بغیر بھی بٹ سکتی ہے فرمایا بھائی یہ مجلس کا تبرک ہے اس کو کسی دشمن امام تک نہ پہونچنا چاہئے اور آپ مسجد تحسین کی سار طرح میں بھی ریزکاری نمازیوں کے افطار کے لے بانٹتے تھے ۔

دوسرا قول یہ ہے کہ موصوف کا نام من صاحب تھا ۔ یہ ذکر پچھتر برس پہلے کا ہے ۔

<u>ڈاکٹر مرزا اعجاز حسین صاحب مرحوم</u> :۔ وکٹوریہ گنج میں مطب تھا آپ کے والد مرزا جعفر علی بیگ صاحب سبریمنڈی چوبداری محلہ کے رہنے والے تھے اس محلہ میں انہوں نے کافی فروغ حاصل کیا ڈاکٹر عبدالرحیم اور حکیم صفدر حسین کے معاصر تھے ۱۹۱۰ء کے روزنامچہ میں راجہ توکل حسین صاحب کے والد جب بیمار ہوئے تو آپ کے زیر علاج رہنے کا ذکر ہے ۔

<u>حامد ڈاکو کی مسجد</u> :۔ منشی فضل حسین خاں کی کربلا سے گزر کر وہ قدیم اور شکستہ حال مگر خوبصورت اما باڑہ و مسجد ہے جو عہد شاہی کی یادگار اور بانی عمارت کا نام لاعلمی کی نذر ہو چکا ویرانہ ہے عہد مؤلف میں لکھنؤ کا مشہور ڈاکو حامد یہاں حصہ بانٹ کرتا تھا اس کو حامد ڈاکو کی مسجد کہنا شروع کیا حامد کی ڈاکہ زنی اور بہادری اور عیاری عمر حاضر کے لوگ جانتے ہیں ۔

لہ تقریباً ایک بالشت کا لانبا اور چار انگل کا چوڑا کلچہ اسم باسمیٰ جہانگیری دروازہ کے نانبائی بناتے تھے اگلے صفحہ پر حسن کیفیت دیکھو

بھدیواں

حیدر گنج کے مقابل اور وکٹوریہ اسٹریٹ کے دوسرے سائڈ میں یہ قدیم محلہ ہے جو مدتوں ویران رہنے کے بعد اب آباد ہو رہا ہے یہاں کچھ شاہی عمارات کے آثار اور ایک قدیم امام باڑہ کے کھنڈر اب بھی دوسرے لوگوں کے قبضے میں ہیں جن کو دیکھنا ممکن نہیں ہوا تاریخ میں اس محلہ کا اس سلسلے میں ذکر ہے کہ سلطان عالم نے اپنے قدیم مصاحب میراں نامی کو میر مہدی [illegible] کا خطاب دیا اور وزارت کے عہدے [illegible] رہے تھے خلعت وزارت عطا نہیں ہوا تھا کہ تقرر کے تیسرے دن موصوف نے تعزیوں کا [illegible] کے [illegible] نے قریب تھا کہ [illegible] اور شہر کی [illegible] شامل کیا [illegible] داؤد علی شاہ نے ملک کے خدمات کا احترام کر کے صاحب مذکور کو وزارت کے منصب تک نہ آنے دیا اور معزول کر کے اپنی عدل گستری کا ثبوت دیا

جنت البقیع

فرزندان مسلم کے دوسرے گور غریبان شہر جنت البقیع بھی [illegible] ہے [illegible] قریب ہے [illegible] کے بیچ میں جو محل ہے اس بارگاہ کو تھوکو خاں ٹھیکہ دار نے عہد نصیر الدین حیدر بہادر ۱۲۳۳ھ میں تعمیر کیا مولوی [illegible] صاحب مسلمی کی یہاں قبر ہے اور بہت سی قبور عہد قدیم کے ہیں

یہاں زیادہ تر [illegible] کی بستی تھی [illegible] ۱۲۶۲ھ کی تعمیر ہے تاریخ ۱۲۳۳ھ کے صفحات سے واضح ہوتا ہے کہ داخلے کے دروازے پر چند سطریں جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس میں صرف تین شعر باقی رہ گئے ہیں

قبر [illegible] سجاد   تا [illegible] جو مستحق

[illegible] تاریخ جوں [illegible]   این ندا آمد گوش او

اے شبیر حزیں [illegible]   ثانی جنت البقیع گو

دوسری جانب مسجد تھی اور دونوں کے بیچ میں نہایت شاندار امام باڑہ تھا جس میں [illegible] رنگ کے بہت بیش قیمت اور مرقع دیواروں پر آویزاں تھے حضرت محمد واجد علی شاہ اس عزاخانہ میں تو [illegible] مرثیہ پڑھتے تھے مسجد اور امام باڑہ کی تعمیر ۱۲۲۹ھ میں ہوئی تھوکو کی وفات پر ان کے غیر شیعہ نواسے نے سامان عزا اور تبرکات بیچ دے اور متعلقہ آراضی ماتا دین [illegible] کو [illegible] روپیے سالانہ لگان پر کاشت کے لئے دی اور خود کہیں چلا گیا ماتا دین نے عمارت میں مویشی کا چارا رکھنا شروع کیا ربیع الاول ۱۳۱۵ھ میں آراضی امام باڑہ پر پاس ڈالی گئی اور قبور مومنین گندگی سے آلودہ ہوئے مسٹر کی الدولہ سید [illegible] حسین خاں بہادر نے روکا اور وہ آمادہ فساد ہوا اور بقدرت ایزدی سے ۲ روز کے اندر تحریب سے باز آیا اور ۹ اگست ۱۸۹۷ء کو اسٹامپ پر اقرارنامہ لکھ کر یہ جگہ نواب کے قبضے میں دیا روشنی فرش اور جمعرات کی مجلس شروع ہوئی اور نواب کے فرزند سید احمد حسین بھی کرتے رہے اب [illegible] شیعہ انجمن کی زیر نگرانی ہے اس عمارت کا گنبد موافق تحریر حسن [illegible] مذکور [illegible] سے لکھنؤ کے اپنی عظمت اور بزرگی میں سبقت لے گیا ہے اندرون عمارت آیات قرآن اور اسماء پنجتن نہایت خوشخط لکھے ہیں اور بیرونی دیوار و در پر بھی طغرے ہیں عمارت [illegible] قابل مرمت اور گنبد شق ہے خوف انہدام ہے۔

باغ:- نشاط باغ وہ مقام ہے جہاں نواب سعادت علی خاں جنوری ۱۷۹۸ء میں مسند نشین ہونے کے بعد کئی برس تک حکومت کرتے

سے اس باغ کو ٹکیت رائے نے بنوایا تھا۔

ٹکیت رائے کا تالاب

عہد آصف الدولہ میں دیوانی راجہ ٹکیت رائے کا بستہ کے سیر دستی جس کی یاد گار راجہ کا بازار ڈیوڑھی آغا میر سے متصل الدو
۔ سے اور ۔ اس وقت باغ تھے تالاب تاریخی حیثیت رکھتا ہے جو اس وقت تو د ۔ نہ ہے مگر عہد آصفی میں یہاں کی چہل پہل صفحہ تاریخ پر آج
تک باقی ہے آٹھوں کے میلے نے تالاب کو زیادہ سے زیادہ شہرت دی اور یہ تماد چیت کے شروع میں اب تک ہوتا ہے رتن ناتھ
۔ سے صحبت کو اس وقت میلہ میں یہ تماشہ ہوتا تھا کہ جو بالپور الکسو امڈ آیا ہے راجہ کی اتحاد پروری دیکھو تو تالاب پر
۔ ۔ سے تیر ۔ ہندی کا مندر اور مسلمانوں کے لئے مسجد بھی تیار کی ٹکیت رائے نے ۱۲۱۱ھ آصف الدولہ کی وفات کے دو تین
۔ یہ ۔ کی اب بھی عمارتیں باقی ہیں اور راجہ کا بازار اسی طرح آباد ہے جس طرح ان کی حیات میں آباد تھا آٹھوں کے میلے میں
۔ لکھنؤ ۔ کے ساتھ لکھنؤ کے مصنوعات کی بھی نمائش ہوتی تھی اور وہ چیزیں بکتی تھیں جو کسی بازار میں نہ تھیں اس کے علاوہ
۔ ۔ سے ۔ ہے بھی اس میلہ کا امتیازی مقصد تھا بلند طبقے کے شعرا اور اساتذہ تو شرکت نہ کرتے تھے مگر شاگردوں کے ذریعہ
۔ کلام ۔ پڑھا جاتا تھا اور آٹھوں کے میلے کے موقع پر غزلیں بکتی تھیں اس حسن مزاح کے تھے وہ ادبی دنیا پر چھپا ہوا نہیں ہے
۔ ۔ لت ہوتی تھی مگر نواب سعادت علی خاں نے میلہ میں نہیں گئے ایک دن کا ذکر ہے کہ اتفاقاً نواب کی صحبت سے اٹھنا چاہتے تھے۔
۔ تاریخی حسین پیشکش آجاتی تھی ۔ ۔ کی گفتگو شمس العلماء محمد حسین آزاد کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

ت ۔ علامہ کو ۔ ۔ ہے

س ۔ کہاں ؟

س ۔ حضور آج آٹھوں کا میلہ ہے ۔

ت ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

س ۔ مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے ۔

ت ۔ البتہ ایسے بازاری معاموں میں جانا تم کو کس نے بتایا ۔

س ۔ وہاں جانا تو ایک اعتبار سے فرض ہیں اور ایک نظر سے واجب کفائی ہے ایک لحاظ سے سنت ہے۔

آپ ایسے سب صورتوں پر ایسے مزاحیہ انداز سے روشنی ڈالی اور مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا ۔ کون ہے آج سوا سید انشاء کے
حیثیت سے عقل سے نقل تک آیت سے اور روایت سے ثابت کردے نواب نے عاجز آ کر کہا قصہ مختصر کرو اور جلدی سدھارو
ے کا شعور انشاء کے کلام میں بھی ذکر ہے نہ یہ کہتے ہیں ۔

عمرہ دماز و انداز و کرد مہرد لطف و حسن ۔۔۔ سات پہ اور ایک تم آٹھوں کا میلہ ہو گیا

تالاب میں پانی فراوانی کے ساتھ موجود ہے اور سفید پتھر کے کئی کتبے ہیں جن پہ عربی فارسی ، اردو ، ہندی میں علیحدہ علیحدہ
۔ عبارتیں ہیں حرف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے ۔

سہ آب حیات ص ۲۹۳

زینبیہ

یہ روضہ حضرت زینب کے باغ شاہ دانہ کے سامنے واقع ہے اس کو میر مہدی علی عرف اچھے صاحب تعیش نے اپنے پیسے سے بنوایا تھا مرزا سلیمان قدر بہادر کے مقابر اور مسجد میں خرچ تھے اور عمارت بغداد کی ہے داخلے کے دو پھاٹک ہیں مرد و عورت کے لئے روضہ کے سامنے چوڑا صحن ہے اور ایک مسجد موصوف کی بنوائی ہوئی ہے اصل عمارت سادی مگر شاندار ہے دالان در دالان سے متصل شہ نشین ہے جس میں دروازوں کی جوڑیاں بڑے سلیقے سے لگی ہیں اور عمارت کے دونوں پہلوؤں میں کمرے ہیں شہ نشین میں حضرت زینب کے شبیہہ مظلوم کربلا کی نقل ضریح ہے جو سیاہ پشمینہ سے ڈھکی ہے پشت پر مزار رقیہ کی شبیہ اور برابر والے دوسرے صحن میں جناب سکینہ دختر امام کا روضہ ہے اس کے کٹہرے پر بھی دونوں طرف غلاف چڑھا ہے اوپر ایک بڑا اکہری گنبد ہے اور یہ روضہ ۱۲۹۸ھ میں تعمیر ہوا ہے اور مادہ تاریخ " روضہ زینب محبوس ملال " ہے

مہر دسمبر ۱۸۸۲ء کو بانی عمارت نے عمارت کے پچھواڑے مصارف روضہ کے لئے کچھ زمین بھی وقف کی اور بی بی کی بھابی مہدی بیگم کو متولی قرار دیا میر مہدی علی ۱۲۹۲ھ کے لگ بھگ رحلت کر گئے اور روضہ میں دفن ہوئے ۔ مہدی بیگم کو اس زیارت گاہ سے عشق تھا اور وہ شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کی ربیبہ حیات تھیں چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو اپنی جائداد یادلی باغ وقف کیا پھر ۱۳ نومبر ۱۹۰۲ء کو اپنی تمام جائداد مالیتی لاکھ اس مزار کو روضہ وقف کر دی اور دو ماہ کے بعد انتقال کر کے اس روضہ میں دفن ہوئیں ورثہ نے آخری وصیت نامہ کو قانوناً ناجائز قرار دے کر توڑ دیا اور پریوی کونسل تک یہ فیصلہ بحال رہا

اس سفاکانہ اقدام سے عمارت کے شکست و ریخت کا کوئی ذریعہ نہ رکھا اور روضہ کی حالت مرمت طلب ہو گئی اور اگر کچھ دن یہی حال رہا تو فنا اور بقا کا سوال ہوگا روضہ کے صحن اور درجوں میں قبریں ہیں ۔

سب سے چھوٹی مسجد ۔ روضہ کے باہر ایک بہت چھوٹی مسجد ہے جس کو ڈیڑھ گز کے چبوترے پر بنایا ہے چھوٹے چھوٹے محراب دار در تھے اس کی بنیاد کا سبب یہ تھا کہ ۸ جمادی الآخر کو روضہ میں دیہ صاحب زینب اور ۱۰ صفر کو دیہ حضرت سکینہ کا سب دن آتا تھا ۔ تو میر مہدی علی روضہ کی مسجد میں نماز پڑھنے عورتوں کے ہجوم میں نہیں جا سکتے تھے اور عادت مسجد میں نماز پڑھنے کی تھی شوق ثواب میں یہ مسجد صرف دو مرتبہ سال بھر میں اپنی نماز پڑھنے کے لئے بنوائی یہ تیرہویں صدی کی آخری عمارت ہے اس کے بعد کوئی عمارت چہاردہ معصومین کے روضوں کے نام سے اس عہد میں نہیں بنائی گئی قدم رسول نواستہ سے پہل ہوئی اور مزار سکینہ پر ختم ہوا ۔

کربلائے حاجی میتا

یہ کربلا الماس علی خاں کی کربلا تعمیر ہونے کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کے اشارے پر بنائی گئی اور کربلائے تالکٹورہ کے جانب جنوب واقع ہے ولایتی محل (۳)، نواب محمد روشن علی کے بھائی نواب امیر مرزا خاں نے اسی کربلا میں اپنا امام باڑہ تعمیر کرایا تھا اور بعد انتقال وہ اور ان کے بیٹے نواب مہدی علی خاں عرف نواب منجھو صاحب آنریری مجسٹریٹ ساکن گھسیاری منڈی اس کربلا میں دفن ہوئے سلاطین اودھ کے سیرت نگار شیخ تصدق حسین صاحب کربلا مذکور کے حال میں لکھتے ہیں : راقم السطور نے اس کربلا کو ۱۹۳۱ء میں دیکھا تھا ۔ عمارت چاروں طرف سے کھلی ہوئی بارہ دری کی شکل کی تھی اور بالکل بے مرمت پڑی تھی بلکہ جا بجا سے مع چھت کی ڈاٹ کے شق بھی ہو گئی تھی گوشوں اور جدولوں میں آیات قرآنی مسالہ سے نہایت نستعلیق تحریر میں اور رنگ آمیزی بھی نہایت دلکش تھی اس کربلا کا خاص

صورت قابل تذکرہ ایک پورے قد کا بیٹھا ہوا ہوائی اونٹ تھا جس کو کسی ہوشیار کاریگر نے اصل سے مشابہ بنایا تھا اونٹ کے دونوں جانب کجاوے تھے اور پشت پر نہایت خوبصورت چوبی مرصع رکھی تھی اب یہ عمارت بالکل منہدم ہو گئی ہے حاجی میتا ایک سنی المذہب پنجابی مسلمان تھے ان کا سہ منزلہ مکان میر باقر سوداگر کے امام باڑے کے سامنے جوہری محلہ میں تھا اور اسی سے متصل موجودہ چھتہ کے مقابل ایک چھتہ بھی تھا جو حاجی میتا کا چھتہ کہلاتا تھا اب نہ وہ مکان باقی ہے نہ وہ چھتہ۔ حاجی میتا کے ایک بیٹے میاں جعفر تھے جن کے دو بیٹے محسن علی، اکرم علی تھے ان دونوں نے لاولد انتقال کیا اور حاجی میتا کی نسل منقطع ہو کر ان کا گھر بے چراغ ہو گیا۔

کربلا الماس علی خاں

نواب سعادت علی خاں بہادر جوری ۱۷۹۸ء میں تخت نشین ہوئے ایک روز آموں کے باغ سے سواری گذر رہی تھی اور اس مقام پر ہو کی جہاں متصل میں میر خدا بخش کی کربلا بننے والی تھی صبح کا سہانا وقت اور نواب اودھ کے دینداری میں ڈوبے ہوئے خیالات۔ جناب عالی نے نواب قاسم علی خاں پسر نواب سالار جنگ برادر زادہ نواب بہو بیگم صاحبہ سے فرمایا کہ اگر اہل شہر کمائے سینہ پر تعزیہ دفن کرنے کے یہاں دفن کریں تو یہاں صحرائیت زیادہ ہے پس بموجب ارشاد نواب پہلے قاسم علی خاں نے چوبی جنگلے کا ایک چھوٹا سا حصار بنا کر وسط چبوترہ میں بہت سے تبرکات مشاہد مقدسہ دفن کئے اور ایک مجلس بھی وہیں کرنے لگے جو مرثیہ پڑھتے تھے بلاؤ تقسیم ہوتا تھا شہر کے قریبی مواضعات الماس علی خاں کی عملداری میں تھے چنانچہ بحکم سعادت علی خاں پچاس بیگہ آراضی جس کا حصار کر کے کربلا کے لئے ایک خاص رقبہ علیحدہ کیا جس میں دو درجوں کا انتظام تھا اور دالان کی لمبائی کمیسا سو گز قرار دی۔ پہلے درجے کے بیچ میں تعزیہ اور منبر تھا اور دوسرے درجے میں فرش عزا تھا جس پر سے سامعین گذرتے اور مجلس و ماتم میں یہ جگہ استعمال ہوتی اس عمارت کا نقشہ حاجی میتا دار وغہ تعمیرات نے تیار کیا تھا اور مٹی جو ایک مقام سے کھود کر دیواریں بنائی گئیں تو وہ گڑھا مثل تالاب کے ہو گیا اس لئے یہی کربلا تالکٹورہ کی کربلا مشہور ہوئی اور یہی کربلا بھی تھی اس کے بعد حاجی میتا نے اور پھر میر خدا بخش نے کربلائیں بنوائیں اور تالکٹورہ کا نام میر خدا بخش کی کربلا سے مخصوص ہو گیا۔

کربلا الماس علی خاں میں میاں خدا بخش کا تالاب کے کنارے تعمیر کردہ ایک بڑا کمرہ بھی تھا اور اس کربلا کی بنیاد کے بعد شہر کے ہزاروں مرد و زن جمع ہونے لگے اور مرکزیت قائم ہو گئی۔

نہر غازی الدین حیدر بہادر

نجم الغنی مورخ اودھ ناقل ہے کہ راجہ بختاور سنگھ کی تحریک پر نصیر الدین حیدر بادشاہ نے نہر گنگ کھدوانا شروع کی اگر گنگا کا پانی لکھنؤ تک آجاتا تو یہاں کی تجارت اور زراعت کو بہت کچھ ترقی ہوتی۔ افسوس ہے کہ اس کام کے لئے کوئی ماہر فن انجینئر نہ ملا اور کام ناقص رہا۔

یہ بیان بھی نجم الغنی کا حقیقت سے بے خبری کی ایک دلیل ہے نہر غازی الدین حیدر بہادر کی رعایا پروری کا ایک نقش تھا مگر ۴۸ کوس سے پانی کاٹ کر لانا آسان کام نہ تھا لکھنؤ کی زمین گنگا سے ۲ فٹ بلند واقع ہوئی ہے پست مقام سے بلند مقام پر پانی لانے تک انجینئر کامیاب نہ ہوا اور چھ لاکھ روپیہ راجہ کا صرف ہوا معتمد الدولہ نے اس رقم کو امانت ہونے دیا اور راجہ نے کہا کہ یہ رقم [illegible]

شفاخانے کی نذر کردی اٹھائیس ہزار ہیگہ۔ بیج کی ضائع ہونا ناکامی ہوئی ٹھیکیداروں کو فائدہ ہوا جن کے سپرد یہ خدمت ہوئی تھی یہ نہر سارسی باغ کے مشرق اور ہیولاک روڈ سے متوازی ہوتی ہوئی شہر سے تالکٹورہ تک پہونچتی ہے سوائے موسم بارش کے اس میں ہمیشہ خشک رہتی ہے بہت ہی پانی۔ کی مرمت ہوتی رہتی ہے سابق حکومت میرٹھ حیدر میں میجر ڈیوڈسن کی کام کے حرب موجب کا ہوتی تھا اور اسٹیشن کی حدید تعمیر کے بعد سے مرکا و۔ حصہ جو پار ملح کے حدود میں ہے ریلوے کی طرف سے پختہ اور دونوں طرف سے بند [illegible] اور بارش کا پانی آسانی سے گر جاتا ہے۔

کربلائے میر خدا بخش

یہ کربلا شہر کی آبادی سے دور جانب مغربی وجنوبی گوشہ موضع گڑھی کٹورہ میں واقع ہے جس کو بہر چند یہ کٹورہ بھی کہتے ہیں گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ لکھنؤ میں جو کربلائیں ہیں ان میں پہلا نمبر کربلا الماس علی خاں اور دوسرا کربلائے حاجی مینا کا ہے کربلائے میر خدا بخش تیسری کربلا ہے جو عہد غازی الدین حیدر ۱۲۳۲ھ میں بنی پہلے کے بیان میں یہ بھی گذرا کہ حاجی مستا کی کربلا کربلائے تالکٹورہ بھی جاتی تھی اور اسی کی شہرت نے حکہ وہ باقی بھی نہ رہی میر خدا بخش کی کربلا کو کربلائے تالکٹورہ مشہور کر دیا اگر یہ وہ تالکٹورہ نام تہ پانی کی ہیبت کہ عمارتی ضرورت میں مٹی کا صرف کیا جانا ایک تالاب بن جانے کا سبب تھا تو یہ وجہ بھی ہوسکتی ہو کہ دراصل درحقیقت تھا ال کٹورہ جیسا کہ میر تقی کی عہد میں بہار کھیری کی گوجر عورتیں جو گیت گاتی تھیں ان میں ایک شعر یہ ہے ؎

لوگوں نے لوٹے ہمال کٹورے   میرے پیارے نے لوٹے گلاس   (عوامی گیت ص۹۹)

میر خدا بخش کو میاں آفریں علی خاں خواجہ سرائے آصف الدولہ کی سرکار میں فروغ حاصل تھا اور وہ میر صاحب کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے وہ اہل علم اور فضلائے روزگار سے تھے غفرانمآب شیعہ مجتہدؒ ان کے استاد تھے اس کربلا کی تعمیر کا سبب یہ ہے کہ میر خدا بخش کی ایک چھوٹی لڑکی قضا کر گئی اور کربلائے الماس علی خاں میں دفن ہوئی اس سلسلے میں موصوف سے ایک تنازع مسمی ہوا اور عشرہ کے دن وہیں اعمال کرنے لگے اتنا عمل عاشور میں کربلا ہونے کا خیال ہوا اور تیس بیگہ پختہ آراضی کپتان حسن علی سے لے کر ۱۳ رجب ۱۲۳۲ھ کو معرفت میر صادق علی سائر تعمیر شروع کر دی اور چھ مہینے میں محرم تک کربلا سرتاسر تیار ہوگئی۔ روضہ کے مغربی دروازے پر قطعہ تاریخ کندہ ہے ؎

مقتل اطہر حسین شہید	شد تاریخ این خجستہ مزار	۱۲۳۲ھ
در زمان وزیر ابن وزیر	غازی الدین حیدر آصف جاہ	
رفعت الدولہ کو جود و سخا	زور افسرون جلال ادبادا	
زیر ظلہ حمایتش ماشد	شد خدا بخش سید ثانی	
عز وجاہ آفریں علی خاں را	جان نثار جناب آل عبا	

کربلا میں فاصلے کے تین پھاٹک ہیں مشرقی پھاٹک کے جانب مشرق تمر ہیں بیرونی حصہ پر مصالحہ سے کچھ لفظیں بھی لکھی ہوئی تھیں جو کہ سفیدی کی پوت جانے سے اب پڑھی نہیں جاتیں صدر پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن ہے جس کے آخر میں جانب مغرب روضہ کی غلام گردش ہے یہ [illegible]

خانہ کا احاطہ اور بے چھت کی مسجد جو عید گاہ کی نقل معلوم ہوتی ہے علیحدہ عنوان میں بحث ہوگی روضہ میں زائرین عموماً جنوبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں اسی راستے کی جانب جنوب دوسری تحتانی مسجد جس کے آگے جانب غرب ایک کمرہ مع سبیل ہے جس کی بغل میں پھر تیسری تحتانی مسجد ہے مشہور ہے کہ یہ کمرہ میر فضل علی اعتماد الدولہ وزیر اعظم شاہ نصیر الدین حیدر نے بخیال ادب و احترام کربلا خود نوش کرنے کے لیے بنوایا تھا۔ اس کے آگے چبوترہ پر سبیل رکھی جاتی ہے روضہ کے پختہ احاطے میں داخل ہونے کے لئے چند دروازہ ہیں پہلا اور دوسرا جنوبی رخ پر در حسینیہ یعنی زنجیری دروازہ پھر اس کے جانب غرب ۵۰ قدم پر در حاجت تیسرے مغرب کی طرف کا پھاٹک در علمہ چوتھا جانب شمال در عباسیہ پانچواں دروازہ در زینبیہ ہے روضہ کے چاروں طرف نہایت عمدہ صحن ہے جس کی ہر طرف غلام گردش اور داخلہ کے دروازہ میں غلام گردش کی صحنچیوں کی روکار پر مصالحہ سے آیات قرآن و زیارت تحریر ہے روضہ میں صرف ایک حرم ہے جس میں ضریح اقدس ہے اور پہلو میں گنج شہیداں کا ایک رخ حجرہ مالیس سر مجلس کے لئے ایک مختصر جگہ اور چھوٹا سا منبر، چھت گول گنبد دار ہے اندرونی در و دیوار پر آیات قرآن اسمار الٰہی بخط طغرا لکھے ہیں رواق کے شمال و مشرقی گوشے میں بانی کربلا کی قبر ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں ہے بالائی حصہ میں ایک سنہرا گنبد ہے جس کے آگے عراقی وضع کے دو گلدستے ہیں ان کی چوٹیوں پر سنہری گمریاں اور کلسیاں ہیں روضہ کے جانب جنوب بھی عراقی وضع کا ایک بلند گلدستہ برائے اذان تعمیر ہے روضہ کے مغربی دروازے سے جانب چپ ایوان اعتماد الدولہ ہے انہوں نے فتح گڈھ میں انتقال کیا تھا اور لاش لکھنؤ لا کر دفن کی گئی اور ان کی وصیت کے موجب ان کے زر مملوکہ سے قبر بنا کر ایک ایوان تعمیر ہو گیا۔

چہلم اور عشرہ کے دن ہر ماتمی انجمن اسی جگہ ماتم کرکے علم بڑھاتی ہے اور سارے دنوں میں اس ایوان میں مجلسیں ہوتی ہیں۔

نثار فتحپوری لکھتے ہیں رجب کی نوچندی ہے تالکٹورہ کی کربلا میں ماتم داران حسین جمع ہیں لوگ چھت پر کھڑے ہوئے آنے والوں کو دیکھ رہے ہیں اسی وقت اتفاق سے ایک فربہ پوست طویل القامت عورت آتی ہوئی دکھائی دی جس کے برقعہ میں ہوا بھری ہوئی تھی اس ہیئت کو دیکھ کر ایک صاحب نے پھبتی کسی کہ "ارے بھائی دیکھنا یہ حسین آباد کا غلاف پوش جھاڑ کون لے آیا" خود میری موجودگی میں رجب کی ایک نوچندی کو صحن کربلا میں علموں کی زیارت کے لئے لوگ جمع ہیں مولوی عابد علی عرف ننھے مرزا صاحب نے ایک نئی مربع سطح کی جو مختلف رنگ کے پتھروں سے ٹکڑے کی شکل میں بنی تھی بے ساختہ کہا۔ کیا چتکبری قبر ہے۔

یہ واقعات ذہن کے ہر وقت حاضر رہنے کی دلیل ہیں اور ضعف عمر میں بھی جودت طبع ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مولوی صاحب عتبات عالیات کی زیارت سے واپس ہو کر کراچی میں رحلت کر گئے اور علی باغ قبرستان میں دفن ہوئے

تکیہ گاہ :- یہ عمارت احاطہ کربلا کے باہر ایک بلندی پر واقع ہے اور پچھم کی طرف ہشت پہل درجہ ہے جس پر بڑا سا گنبد ہے زیر قبہ کچھ تعزیہ اور چوبی ضریح ہے۔

عہد شاہی میں سب کربلائیں آباد اور شیعہ پبلک کے اژدہام سے بروز عاشورہ چھلکتی تھیں بانیان کربلا یا ان کے ورثہ جن کو کربلا کے فروغ میں کاوش تھی موجود تھے اور ہر شخص کا حلقہ اقربائی کربلا کی سمت روانہ ہوتا تھا غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اعلان کیا کہ تعزیہ کربلا میر خدا بخش جائیں اور سب کربلاؤں میں بیک وقت پولیس کا انتظام نہیں ہو سکتا یہ حکم اس کربلا کی مرکزیت اور دوسری کربلاؤں کی بے رونقی کا سبب ہوا شیعہ سنی مسلم و ہندو سب اپنے تعزیے دسویں محرم اور ۸ صفر کو اسی جگہ لاتے تھے۔ [illegible] سے

سنی شیعہ فسادات کے موقع پر سنیوں نے اپنی دوسری کربلا پھول کٹورہ میں قرار دی۔ بانی کربلا کی اولاد حرول کستور وغیرہ میں موجود ہے میر خدا بخش نے بڑی سلامت روی کی چال اختیار کی ساری عمر قدیم وضع کا جامہ پہنا۔ سفید پوس رہتے میانہ میں سوار ہوتے سواری میں صرف ایک یا دو میواتی رذیل پٹھان ساتھ رہتے ان کی صحت کا درل دربار کے دربار کی طرح تھا۔

دارو غہ ظل حسین زیدپوری اور ان کے شاگرد میر تہذیب اللہ خوش نویس میر خدا بخش کے طرز بندگی کی تحسین علی خاں خوردخواہ مرزا نے اپنے بیانات میں بڑی شکایت کی ہے

سلطنت اودھ کے ضبط ہونے پر دور معزول شاہ انگریزوں سے عالم باغ سے تا لکٹورہ تک توپیں آراستہ کردی تھیں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہاں بڑا معرکہ ہوگا۔

<u>امامباڑہ کیواں جاہ</u>:۔ تالکٹورہ کی کربلا سے پہلے سیدھا ہاتھ سے گزر کر امامباڑہ داہنے ہاتھ پر واقع ہے اس کے بانی مرزا محمد علی کیواں جاہ تھے جو ملکہ زمانی کے پہلے شوہر کی اولاد تھے۔ عمارت اوسط درجے کی بہت خوبصورت اور نقش دیدہ زیب ہے مگر مکان سے مکین ہونے سے شان و شوکت ختم ہو رہی ہے کیواں جاہ کی قبر بھی اسی امامباڑہ میں ہے انہوں نے ہیضہ میں انتقال کیا تھا۔

<u>سلطان دولہن صاحبہ</u> خاندان شاہی کا ایک جوہر رکن رقمطراز ہے۔ نواب افضل الدولہ سید احمد حسین خاں بہادر کی صاحبزادی اور میری حقیقی دادی جان تھیں عبد احمدی کی تھیں ۱۳۰۱ھ میں انتقال فرمایا کربلائے تالکٹورہ میں دفن ہوئیں میں نے آج تک ایسی نفیس اور پاکیزہ اردو زبان کسی کو بولتے نہیں سنا جیسی دادی اماں مرحومہ کی زبان تھی اور اس نفاست اور پاکیزگی سے کسی کو کھانا کھلاتے دیکھا مجھے حسرت رہ گئی کہ کبھی تو نوالہ بنا لے ہیں انگلیوں کی دو پوروں سے زیادہ جناب مرحومہ کی بھری ہوں ایک مرتبہ مرحومہ نے کیتھے کے کباب ایجاد کئے اور جناب بڑے چچا صاحب قبلہ کی معرفت نواب باقر علی خاں صاحب رئیس شیش محل کو بھجوائے وہ بہت کوشش کئے مگر مطلق نہ پہچان سکے کہ کباب کاہے کے تھے وہ یہی سمجھے کہ ماہی تولے کے گوشت کے کباب ہیں بڑے چچا صاحب سے اصل کیفیت معلوم ہوئی تو فرمائش کرکے دوبارہ پکوائے اور کھائے ان کبابوں کے بنانے میں پندرہ سولہ گھنٹے صرف ہوتے ہیں لیکن گھی نہایت عمدہ ہونا چاہئے۔ اور زیادہ گھی صرف ہوتا ہے۔

کربلائے عظیم اللہ خاں

اعظم الدولہ عظیم اللہ خاں محمد علی شاہ بادشاہ کے جد پرست تھے۔ دولتمندی اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ سواری کے وقت سیکڑوں روپیہ محتاجوں کو بانٹ دیتے تھے ان کی اولوالعزمی برکت مزاج لطافت طبع کی سیکڑوں حکایتیں زبانوں پر ہیں۔ بادشاہ کی بارگاہ میں انتہائی تقرب تھا تحسین علی خاں خورد کی صحبت سے فائدہ آپ ہی نے حضرت فردوس منزل سے ابوتراب خاں کو دلوادی تھی شیخ تصدق حسین صاحب وکیل لکھتے ہیں کہ ایک قلمی تصویر عظیم اللہ خاں کی نظر سے گذری جس میں چہرہ گول بھرا ہوا رنگت سانولی مائل بہ تیرگی، خط بنا ہوا مونچھیں کتری ہوئی، آنکھیں کسی قدر بڑی، جسم گدرا گٹھا ہوا سر پر لٹو دار پگڑی گلے میں جامہ دار کی کلی دار اچکن کاندھے پر شالی رومال، پیروں میں غرارہ دار پائجامہ اور گھیتلا جوتا۔ یہ کربلا دراصل امام کے آٹھویں امام رضا کے مزار واقع خراسان ملک ایران کی نقل ہے عمارت سربلند اور دوسری کربلاؤں سے کسی طرح کم نہیں ہے روضے کے چاروں طرف غلام گردش صحن میں کھیسی

کی طرح نہر ہے جو ان کے جراح ہونے کی طرف اشارہ ہے جراح کے پاس مرہم کی ڈبیا ایسی ہی ہوتی ہے جس میں بر بار خانہ کسی میں لال مرہم کسی میں زنگاری کہیں سفید یا زرد عمارت عجب مسجد ہے جس میں پتھر کا خوشنما حوض ہے اور مسجد گوہرشاد کی نقل ہے دوسری مسجد بھی باہر واقع ہے عظیم اللہ خاں نے ۲ رجادی الآخر ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۴۹ء میں انتقال کیا اسی کربلا میں سپرد خاک ہوئے۔ مرزا قتیل نے اپنی مشہور نظم "مشتر غمزہ" میں ایک صاحب پر بڑی لطیف نکتہ چینی کی تھی جو زبان زد بھی ہے اور مرثیہ کے کلام میں بھی موجود ہے ؎

بہت حقیقہ عظیم اللہ خاں کی اس کا تتمہ ہے وصیت نامہ کی رو سے یہی حقدار بیٹھے ہیں

پٹہ باز کی مسجد

لکھنؤ پٹے بازوں کا مرکز تھا علی مدرسہ جوانی سوٹ مالک جاسے بنانے کل گئی تھے عہد غازی الدین حیدر میں پٹہ باز نہال خطاب کے ایک شخص تھے اور کہا جاتا ہے کہ علی مدد کے موجد تھے یہ مشہور ہے کہ نو مسلم تھے۔ شریفوں کے سوا پست طبقے کو نہیں تلسے تھے ان کے تمام شاگرد معزز خاندان سے تھے۔ عبدالحلیم شرر کہتے ہیں کہ ان کی مسجد دھیامہری کے پل کی طرف ہے عالم نگر سے متصل لیکن ان کا بیان صحیح نہیں ہے اور بظاہر بغیر دیکھے ہوئے قلم اٹھایا ہے میں نے اس مسجد کو بچشم خود دیکھا ہے اور تالکٹورہ سے چار باغ کے راستے میں عظیم اللہ خاں کی کربلا سے ہٹ کر سلسلہ ہی پر موجود ہے اور ریشت مدار مسجد پر گتکا سا ہوا ہے مسجد بڑی نہیں ہے گتکا اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے شمشیر زنی کے بجائے فن حرب کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی ضرب روکنے کے لئے بجائے سپر کے پھری لڑنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو سرکنڈوں سے تیلے اوپر مڈھ کر بنائی جاتی ہے اور بیچ میں دستہ کی جگہ روئی کی گدی پر ہاتھ کی گرفت کی جگہ اور دور میں چرمی گوٹ ہوتی ہے۔ منشی امیر کہتے ہیں ؎

کہیں پٹے کی کسی جا ہے مالک کی کثرت وہ جست و خیز وہ چوٹیں کہ عقل ہے حیران

کربلائے امین الدولہ

اس جگہ کا نام دریا گنج تھا نواب امین الدولہ امداد حسین خاں عمدۃ الملک وزیر اعظم محمد علی شاہ نے عہد اختری ۱۲۶۶ھ میں بڑی اولوالعزمی سے یہ روضہ بنوایا اس کا سنگ بنیاد سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر والزمان نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا اس کے سامنے سو بیگہ اراضی قبروں کے لئے بھی وقف کی ہے۔ واجد علی شاہ بادشاہ عشرہ اور چہلم کے دن دو مرتبہ یہاں آتے تھے امین الدولہ کو طبقہ شیعہ میں "امین الملۃ والدین" کہا جاتا تھا اور بادشاہ کی طرف سے ذوالفقار جنگ کا خطاب تھا جو اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اے شان حیدری زجبین تو آشکار نام تو در نبرد کسد کار ذوالفقار

امین الدولہ راتیں عبادت خدا میں جاگ کر بسر کرتے تھے۔ اس کربلا کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

ان وزیر امین دولہ قیصر لسی شبیہ مزار خیر الناس

قد خوطب الکیوان فی تاریخہ قل انّ ھذا مرقد العباس

اس عمارت کی دیواروں پر آیات قرآن نہایت پختہ خط میں لکھے ہیں رنگ آمیزی اور نقش و نگار بڑے دیدہ زیب ہیں

روضہ کے چاروں طرف صحنچیاں ہیں جن میں معززین کی قبریں ہیں چاروں طرف چار پھاٹک ہیں علاوہ اسی دیوار سے متصل ہے گنبد کی چھت میں چوبی ضریح اور تبرکات ہیں جن میں قدم رسولؐ بھی ایک یادگار ہے قدیم زمانے کی روش رہین رنگیں چوکوں سے آراستہ ہے اور اس کی تاریخ پتھر پر نمایاں جگہ روکار میں نصب ہے اور ... یہ کربلا کی جو واقعہ نگار نقل کرتے ہیں یہ ہے ؎

امین الدولہ نواب ملک جاہ — کرد و دو الفت آل پیمبر
بنا فرمود چوں درگاہ عباس — سلام حق بر و تا روز محشر
چنیں تاریخ سالش گفت ہاتف — مانند جواب کاہ اں عید ۱۲۶۶ھ

مولانا احمد علی صاحب محمد آبادیؒ جو بڑے ذی علم اور پیکر کمال تھے امین الدولہ کے بیٹوں کو پڑھاتے تھے اس توسل کی وجہ سے ممدوح نے جب اس دنیا کو خیرباد کہا تو کربلا میں دفن ہوئے قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

امسال بحکم قضا رفتہ سوئے دار بقا — حاجی و سید صالح الاعمال میر متقی
جعفر گفتم مصرعہ تاریخ بہر رحلتش — علامہ رفت حلہ سکن مولوی احمد علی ۱۲۹۵ھ

دیوپور جلال پور

یہ موضع بھی تالکٹورہ کے گرد و نواح میں ہوتے ہیں سلسلے کی ایک تحریر کی رو سے دیوپور کو شاہ غازی الدین حیدر نے حکیم مرزا علی خاں کے نام معاف کیا تھا وہ طبیب شاہی کے منصب پر مامور اور حکیم الملک کے خطاب سے ممتاز تھے ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم مرزا علی حسن خاں اس منصب پر سرفراز ہوئے اور شاہ اودھ نے ان کو سلطان الحکما حیوۃ الملک مسیح الدولہ بہادر جاوید جنگ خطاب دیا اور آپ ۱۸۵۸ء میں سفارت شاہی کے عہدہ پر بھی ممتاز تھے ان کے صاحبزادے کا نام تھا حکیم مظفر حسین خاں ان کو کتابوں کا شوق تھا اور کتب خانہ ان کا شہرۂ آفاق تھا۔

عالم باغ

کانپور روڈ پر واقع ہے اور مدتوں ویران رہنے کے بعد اب آباد ہوا ہے اس باغ کو آخری تاجدار اودھ نے اپنی ملکہ عالم آرا خاص محل کے لئے بنوایا تھا اس کے نقوش اجڑی ہوئی صورت میں اب بھی موجود ہیں باغ کے گرد چار دیواری تھی اور قصر ملکہ دو منزلہ عمارت کی صورت میں تھا بعد انقلاب سلطنت یہ باغ ضبطی میں آگیا خاص محل نے اس کی واگذاری کے لئے درخواست دی۔ اور عذرداری کی جو مسموع نہ ہوئی غدر میں عالم باغ کی لڑائی بہت نمایاں درجہ رکھتی ہے راجہ مان سنگھ باغیوں کا نمائندہ بن کر پہلے کلکتہ آئے تاکہ بادشاہ کو راضی کر کے چپکے سے لکھنؤ لائیں بادشاہ نے ملنا منظور نہ کیا اور سرکار برطانیہ کی حمایت کی ادھر مبارک پور کے سپاہی بھی جو کلکتہ میں تھے چاہتے تھے کہ شاہ کلکتہ میں ان کی قیادت کریں لیکن وہ اپنی استقامت رائے پر باقی رہے مان سنگھ وہی بد کیش ہے جس کی بیٹی بمقام راج کنور کی شادی حسب بابو ... سنگھ رائس کے ساتھ ہوئی تو ایک پورا موضع جہیز میں دربار اودھ سے عنایت ہوا تھا اور اس لڑکی کو اپنی بیٹی تصور کیا تھا۔

۵ نومبر ۱۸۵۷ء وہ دن تھا کہ افواج باغیہ اور دیگر اہل شہر و بیرون جات سبھی تو اس بعد آمادۂ پیکار تھے اور عالم باغ کا رخ

تھا راہوں میں کثرت انبوہ سے جگہ نہ تھی امین الدولہ کے مکان میں صاحبزادہ نواب علی خاں محمود آبادی جو نبی بخش خاں کے ماموں ہوتے تھے فروکش تھے راجہ صاحب نے ان تینوں بھائیوں کا لزوم جنگ عالم باغ کی طرف جانا سن کر غایت سے بیتاب ہو کر پیادہ بیگ میں جو سرراہ تھا آ گئے ان لوگوں کو بہت اصرار اور تدبیر سے روکا اور سمجھایا کہ یہی فارد کی مورچہ بندی اور بات تھی اب کھلے میدان کی لڑائی ایسی بے قاعدہ فوج سے آسان نہیں ہے الغرض کچھ نہ ہوا یہ لوگ ... ... کے ناکے کے قریب پہنچ کر یہ ارادہ تھا کہ بڑھ کے پل سے آگے نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے مگر ہجوم بسیار ... سے تمام ... راہ میں مرور دشوار تھا اس مقام پر ایک پختہ باغ تھا سر دیوار لڑتے ہوئے ہمراہیوں کو داہنی طرف جو گلی تھی اُدھر اس غرض سے بھیجا کہ دیکھیں اگر راہ صاف ہو تو اس طرف سے نکل چلیں ان لوگوں کا ادھر جانا ادھر کیا دیکھتے ہیں کہ وہی انبوہ کثیر و جم غفیر جوش سرد میں نعرہ کناں و رجز خواں ناکہ پر ... تھا نہایت بیتابی اور بدحواسی سے بھاگا آتا ہے اور اس کے ریلے میں انسان کیا پہاڑ ہو تو رک نہ سکے آخر کچھ چارہ نہ ... سیلداران ہمراہی سے دیوار کھدوا کر ایک جانب سے باغ میں داخل ہوئے دوسری جانب سے اس سڑک پر نکلے جو زیر دیوار باغ بہہ کے پل پر گئی تھی۔ گھوڑے تو باغ کے باہر ہی چھوڑ دینا پڑے ... سامنے سے دیکھا کہ اسی سڑک پر مفرورین تنگی راہ سے بالکل مرے کچلے پڑتے اور صف بر صف پڑے ہیں ان کی پشت پر گورے ایسی سنگینیں اس طرح مارتے ہیں جیسے کہ ... چلتا ہے ایک کی لاش کو توڑ کر دوسرے کی پشت تک پہونچتی ہے نیچے کی صف والے سینے کے بل رینگ رینگ کر ... نکل کر بھاگتے جاتے ہیں۔

عالم آرا بیگم بہت بڑی ادیب اور شاعرہ تھیں ان کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہیں ایک وضع پر جہاں کا رنگ　　　عارضی ہے فقط یہاں کا رنگ
خود غرض ہوتے ہیں جہاں کے دوست　　　جب غرض نکلی پھر کہاں کے دوست

عام بات ہے خصوصیات تاریخی میں یہ بھی ہے کہ بعد فتح دہلی جب ہڈسن شریک معرکہ عالم باغ ہوئے اور دلکشا سے ... کے ... حضرت گنج جانا چاہتے تھے کہ مارے گئے عالم باغ میں ان کی قبر ہے۔

... میں **شاہ کا تکیہ**۔ نالکشور روڈ سے کالیوں کی راہ پر پڑتا ہے شہر کے طول و عرض اور قدیم حدود آبادی کی تحت میں اس مقام کا نام نظر آتا ہے۔

پانچواں باب

مرزا منڈی سے موہنی کے پُروہ تک

ناظرین! یاد کیجیے کیسی باغ سے ہم نے قلم اٹھانے میں ابتدا کی تھی اور اب جو پھیرے میں پیم لکھنؤ کے عمارات پر بحث مسدود ہے یہ خطہ روح لکھنؤ اور شہر کی جان تھا اس جان کمال کا یہیں مسکن تھا۔

سلہ آثار یادگار صفحہ ۱۲۳

مرزا منڈی

مرزا منڈی کی بنیاد مرزا سلیم کے ہاتھ سے ہوئی جو تخت نشین ہو کر نور الدین جہانگیر کے لقب سے شہرت پذیر ہوا۔ باپ کی زندگی اور اپنی ولیعہدی میں یہ محلہ آباد کیا۔ یہ محلہ مچھی بھون سے جانب[1] غرب واقع ہے گول دروازہ سے حسین آباد مبارک و ڈیوڑھی آغا باقر کی طرف یہ محلہ ہے نام کی شان بتاتی ہے کہ کبھی ترکاری بکتی تھی اب سبزی فروش ایک بھی نہیں ہے کچھ پرانی عمارتیں اور آثار قدیمہ پر توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

نال دروازہ

میں سمجھتا ہوں کہ نعل دروازہ صحیح ہے اور ملیہدی تور نی وت۔ تمام تر لفظوں کے ملنے درست ہے اس نام سے موسوم ہوا یہاں شرف الدولہ کا مکان تھا ... میں ... بیٹھ رہے تھے اور خان علی خان فوج باغی کے ایک سردار کو ملا کر پانچ سو روپیہ دیے ... بیٹھے تھے ... گھر ... اور تلنگوں سے یہ الزام لگا کر محمود خان کوتوال اور ... کے ... علام رضا کے سپاہی بھی بندوق سے گولیاں چلانے لگے ہتھے موت کے گھاٹ اترے ... کے ساتھ گھر کھودے آگئے ادھر علام رضا خان نے ہزار روپیہ اپنی وکیل کی معرفت ... احمد ... کو بھیج دیے اور کہلا بھیجا کہ میری جان اور آبرو بچائیے اور احمد اللہ شاہ کے پاس ... ایک ... بھیجی ... روپیہ ... تلنگوں کو منع کر دیا اور رفع شر ہوا ایک مہینہ کے بعد شرف الدولہ کسی صورت ... دیوان عام ... قید ... میر احمد علی تک پہونچے۔

شاہ جی کی ڈیوڑھی

شاہ جی فرح آباد کے رہنے والے تھے سیٹھ ساہو کاری تھا۔ تاریخ اودھ میں ان کے نام کا تذکرہ ہے ایسا مخیر شخص ہندو دھرم میں کم گذرا ہوگا خیر و خیرات میں پیسہ صرف کرنا شغل زندگی تھا۔ حضرت محل نے جب قیصر باغ چھوڑا تو نال دروازہ میں رہیں۔ شرف الدولہ عاقبت اندیش تھے انجام پر نظر کرکے عرض کیا کہ یہاں سے گورے قریب ہیں اگر کوئی بری صورت پیش آئی تو غلام کی روسیاہی کا سبب ہوگا۔ وہاں سے آپ شرف الدولہ نواب ابراہیم خاں کے گھر گئیں وہاں بھی وسوسہ ہوا کہ مبادا نواب بیارسوح جا کر گرفتار کرا دیں پھر حسین آباد کی محلسرا میں گئیں وہاں سے پھر شرف الدولہ کے گھر آئیں اور رات شاہ جی کی ڈیوڑھی پر بسر کرتی رہیں یہی وہ مکان ہے جہاں سے ان کی آخری سواری نیپال روانہ ہوئی۔ میں نے اس محلسرا کو دیکھا اس میں آج کل امرت لال ناگر رہتے ہیں یہ عظیم بلڈنگ ہے تین قطعہ مکان ایسے ہی اس سے متصل ہیں۔ قدیم وضع کی ڈیوڑھی کشادہ صحن پردہ در و دیوار ہیں۔ اونچی چھت کھلے ہوئے ہوادار دالان اس مکان کی خصوصیت ہے۔

رکوٹ، پان دریبہ، والی گلی میں ایک امامباڑہ لوگ بتاتے ہیں جس کے بانی کا نام معلوم نہیں اور نہ عمارت باقی ہے۔

کالکا داس گوٹے والے عہد غازی الدین حیدر میں جس جگہ رہتے تھے اس محلہ کا نام کالکے مشہور ہوا تمام محلات شاہی میں چک پھتا، کرن ستارے آنچل پلو، گوٹہ، گوکھرو، ست جھلکی، لپتوں، بیل مقیش، بانکڑی، کلابتو ان ہی کے دکان سے جاتا اور

---

[1] گذشتہ لکھنؤ

نزاکت پسند خواتین لکھنؤ زیادہ بھاری جوڑے پہننے پر تیار نہیں ہوتیں انشاؔ کہتے ہیں ؎

گو کہ دست نازک تر ہے کہ چیز — اس سے ہو جاتی ہے کمبخت گنواری انگیا

کاہکا دس ۔ کان ۔ پیڑھی سے کھسکتی ہو گئے[۱]

کالی جی کا مندر — یہ ہندوؤں کی مشہور تیرتھ گاہ ہے جہاں سب سے پرانی مورتیاں ملا تیمرا بھی تک رکھی ہیں اور یہاں کے پجاری نے کسی دوسرے مذہب والوں کا عکس لینے کی اجازت نہیں دی عہد آصفی سے قبل مندر ایک صورت پر ہے اس مندر کی یہ خصوصیت بھی بیان کی جاتی ہے کہ تہ خانے میں پانی کے نیچے ۔ زمانہ ایسا تھا کہ یہاں دریا بہتا تھا اور مندر ساحل پر تھا اب دریا اور مندر میں کئی محلے اور سڑک حائل ہیں گومتی ہٹ کر تین دور پہونچی اس وقت مندر بازار ہے ایک راستہ چوک اور دوسرا سرائے معالی خاں اور تیسرا کاکوری روڈ پر ختم ہوتا ہے ۔ ۱۹۰۶ء کے بعد یہ محلہ ایسا ویران ہوا کہ چند دوں کے گھروں کے سوا یہاں اونچے طبقے کی بستی نہ رہی اور دن کو بھی اس کا ایسا سناٹا نظر آتا ہے بازار میں بھی کچھوے نظر آتے ہیں ۔

پیر بخارا

شہر کا پرانا محلہ اور گنجان بستی تھی امیر غریب سب ہی رہتے تھے کچھ گھر شہدوں کے بھی تھے جن کے شہدپن نے اس محلہ کو خاص شہرت دے رکھی تھی حسین آباد کی راہ میں اس محلہ کے آثار قدیمہ کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں شہدوں کو غنڈا کہنا صحیح نہیں ہے وہ شادی بیاہ کے موقع پر امیروں کی ڈیوڑھی پر جا کر دعائیں دے کر انعام لیتے تھے ۔ چلا تو بڑا بھلا کہہ کر روپیہ اینٹھتے تھے چوری یا فریب جو لیتے ہیں یہ ان کا کام نہ تھا ۔ یہ گروہ شجاع الدولہ کے ساتھ بھی رہ چکا تھا ۔ چنانچہ تاریخ میں ہے " ارشاد قاں مردیست کہ نواب شجاع الدولہ بہادر ان روز صدہا شہدہ را ہمراہ گرفتہ مردوراں کوں برہنہ کہ دربہر موسوم بشہدہ ہستند فرمان داد" [۲] اسی طرح لوگوں کا بیان ہے کہ ایک موقع پر شجاع الدولہ کے ساتھ کئی سو ہتھی پانی بھرنے والے تھے اور وہ ننگے مردور جو ملک میں شہدہ کی حیثیت سے مشہور ہیں ان کو بھی حکم ہوا ۔ اگر کسی شریف کا لڑکا آوارہ ہو جاتا ہے تو آج بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تو پیر بخارا کا شہدہ ہے اس محلہ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ یہاں ملک بخارا کے کسی پیر کی قبر تھی ۔ اور قبر پرستوں میں وہ اتنے مشہور تھے کہ لکھنؤ سے دہلی تک ان کی دھوم تھی کاکوری جانے والی سڑک جس کا نام پینیرا سٹریٹ تھا اسی راستہ میں ہو کر اس محلہ کو پست کر دیا اس وقت پیر بخارا دو سڑکوں کے بیچ میں ہے کاکوری روڈ اور حسین آباد جانے کا راستہ دو طرف سے اس محلہ کو گھیرے ہوئے ہے ۔ مزار اور اس کی تلاش بے معنی ہے جب جا کر شہر میں کھدائی ہوئی تو پیر بخارا کا وہ حصہ زمین بھی کھدا جو ناکہ حسین آباد جاتے وقت بائیں ہاتھ پر واقع ہے قد آدم زمین کے نیچے ایک تربت برآمد ہوئی جس سے اس بات کا فیصلہ ہو سکا کہ سڑک نکلنے سے پہلے ایک مرد کے قد و قامت کے برابر زمین نیچی تھی تعویذ قبر پر چراغ کا طاق اور گلکاری بھی ہے لوگ کہتے ہیں کہ یہ بخارا کی یہی قبر ہے اگرچہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ابوالحسن ملا دنیا جو مشہور عالم گذرے ہیں ان سے ایک شاگرد نے عرض کیا استاد سرال کے کوچہ جانا ہے کوئی مصرع طرح عنایت ہو تو طبع آزمائی کروں ملا نے یہ مصرعہ پڑھا " جب گھر ہو ار بدگدار " شوخ مزاج شاگرد نے استاد کے رنگ کو سامنے رکھتے ہوئے عرض کیا ؎

استاد کو شہیدان میں آج ہم نے پچھاڑا — بھاتی یہ چڑھے کود کے داڑھی کو اکھاڑا[۳]

۱؎ تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۲ ص ۱۵۶ ۲؎ عماد السعادت ص ۲۰۲ ۳؎ بزم خیال

استاد کے مصرعہ پہ لگاتے ہیں گرہ ہم — مشاعرہ میں کر دیجئے یا پیر بخارا
یہ طرفہ غزل ہم نے کہی مولوی صاحب — صدق سے دل کیجئے ور سند ہمارا
پہلی ہی غزل پڑھیں ہوا درکا ہوا ناں — ت ما یہ عجب گر ہوا ہمدگرا را

غزل دیکھ کر یہ شعر پڑھا دیا ؎

یہ طرفہ غزل لائے ہو استاد کے آگے — صد حیف دیکھا رحیں دہن رسارا

میر حسن علیق اکثر فیض آباد میں رہتے تھے لکھواتے تھے تو میر کو ... ان کی بے رنگی کا یہ عالم تھا کہ ایک لڑکا آیا اس نے کہا میر صاحب آتشوں کا میلہ ہے ہم جائیں گے ایک غزل کہہ دیجئے اسی وقت غزل ... اس زمانے میں غزل ... کرتی تھیں۔ ایک دن ایک اور خریدار آیا اور علیق سے اپنا تخلص ڈلوا کر ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح دیدیجئے ناسخ مرحوم نے غزل پڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا اپ تیرا ... ہے جو یہ غزل کہے گا ہم پہچانتے ہیں ... آتش کو بھی تسلیم کر چکے تھے چنانچہ علیق نے فیض آباد میں ... آتش کے سامنے یہ مطلع مشاعرہ میں پڑھا ؎

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو — صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے علیق کمالات ... میں بھی میر کے باپ تھے چنانچہ انیس نے جب وہ روایت سنی ... سوئی ... کے ساتھ ... عید سواری کی ... اور آ گئے وہاں سے فرمایا ... یہ مانا یہ اشتر ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا اچھا سوار ہو جے ہم اونٹ بیٹھتے ہیں اس طرح ترین مصرعہ پر مصرعہ لگتا تھا انیس بڑی دیر سے سوچ رہے تھے آپ نے پوچھا کیا سوچ رہے ہو۔ عرض کیا مصرعہ چاہتا تھا پہلا مصرعہ سنکر فرمایا یہ کہہ دو ؎

جب آپ ... تو نکل ... ہیں — اچھا سوار ہو جئے ہم اونٹ ... ہیں

بیٹے نے باپ کو جھک کر تسلیم دی اور مصرعہ ... یا

کالا امامباڑہ

پیر بخارا کا مشہور ... کالا امامباڑہ ہے جس کو عہد آصفی میں ... قاسم علی خاں خلف سالار جنگ نے تعمیر کیا یہ امامباڑہ اور بڑا امامباڑہ دونوں ... ایک سال کی تعمیر ہیں اس امامباڑے میں بڑی دھوم سے مجلسیں ہو چکی ہیں سربلند پھاٹک کے بعد صحن کی چار دیواری اور تین درجے پہلا دالان ... اور ... دالان ... پہلوؤں میں صحنچیاں اور تمام عمارت پر سیاہ رنگ آمیزی سفید حروف میں بخط نسخ طغرے اور آیات قرآن لکھے ہوئے۔ کہتے ہیں اونٹ کی پشت پر کجاوہ دار تصویر ... اہل حرم کی یادگار ہیں اس امامباڑہ کی خصوصیت ہے ... میں دفتر ہے بانی امامباڑہ نے عہد غازی الدین حیدر میں بعمر ... سال انتقال کیا اور اسی امامباڑہ میں دفن ہوئے عمارت کے سامنے جو مسجد ہے وہ اس سے پہلے کی پرانی تعمیر ہے اور مسجد کو جہاں الماس کی تعمیر کہنا درست نہیں ہے ... اور بانی مسجد کا نام پتھر پر درج ہے مادہ کا شعر یہ ہے ؎

سروش از آسمان در باب تاریخ — گفت ارباب رحمت در کشادہ ۱۱۹۵ھ

امامباڑہ اچھی حالت میں ایک کمیٹی کے زیر انتظام ہے۔

مقبرہ مرزا علی خاں

خانہ خدا سے تھوڑی دور ایک نہایت بوسیدہ عمارت ہے یہاں آصف الدولہ بہادر کے ماموں مرزا علی خاں دفن ہیں ان کی تاریخ رحلت ۱۲۰۹ھ ہے مقبرہ دو منزلہ ہے اور قبر گو گنبد کے مقبروں کی طرح بنا میں ہے مرزا علی خاں وہی مشہور شخص ہیں جن کا آگے بڑھ کر احاطہ آج تک آباد ہے

امامباڑہ حاجی بیگم صاحبہ

محلہ پیر بخارا کا دوسرا عزا خانہ بڑی شاندار حیثیت میں تھا جو حسین آباد کی پشت پر واقع ہے اور پہلو میں نالہ بہہ رہا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین کے کہیں عمارت کی گنجائش نہ تھی بانی امامباڑہ نواب محسن الدولہ کی بیٹی تھیں عمارت پر تیس ہزار روپیہ صرف ہوئے اور اتنی ہی رقم میں شیشہ آلات خریدا گیا اور ایک کثیر رقم شکست و ریخت اور ماہوار مصارف کے لئے خرچ کی جو افسوس ہے کہ وہ تیرے تین دن کی نذر کردی اور امامباڑہ بغیر کسی سرمایہ کے منہدم ہوگیا کچھ دیواریں باقی ہیں جس سے اس کی خوبصورتی اور زیب و زینت کا پتہ چلتا ہے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ امامباڑہ کی تعمیر میں ایک دیگ برآمد ہوئی جو روپیوں اور [illegible] ممی تک پہونچتی تھی تاریخ میں اس خصوصیت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

بانی امامباڑہ کے پوتے کا نام باقر علی خاں تھا جو بہت کم سن تھے اس لئے بجائے ان کے نواب صادق علی خاں متولی قرار پائے جب بیگم صاحبہ کے مرنے پر باقر علی خاں نے وقف کو تلف کرنا شروع کیا اور کچھ باقی نہ رکھا۔ نواب صادق علی خاں ـــــ بڑی دھوم سے مجلسیں کرتے تھے اور محرم کا صرف ان کی حیثیت پر تھا۔ اس سرکار کا جمعدار یکو نامی اپنے محلہ ڈیوڑھی آغا میر اور بازار کے نانبائی کے یہاں سے روٹی سالن پکوا کر روزانہ تبرک تقسیم کرتا تھا۔ پیارے ملازم دو وقت حصہ بانٹتا تھا مجلسیں سہ پہر کو ہوتی تھیں اور ایک واقعہ خواں جو ایک آنکھ سے معذور تھے ذاکری کرتے تھے۔

لکھنؤ میں جب مولوی مقبول احمد صاحب کی ذاکری کو فروغ ہوا تو ان کے پڑھنے کی ایک مجلس امامباڑہ سے قریب حدود ۱۹۱۰ء ہوتی اس وقت تک امامباڑہ آباد تھا۔

محمد حسین عامل - آپ امامباڑہ مذکورہ کے ساتھ پیر بخارا میں رہتے تھے صورت سے کوئی عامل نہیں کہہ سکتا تھا دراز قامت، لاغر اندام [illegible] ۳۰ سال پہلے ۸۰ برس [illegible] ہو چکے تھے اور کہتے تھے کہ میرے استاد موجود ہیں جو اپنا نام ظاہر نہیں کرتے ان کے کمالات سے [illegible] میں نے خود دیکھا کہ تازہ انڈے پر کچھ پڑھ دیتے تھے اور اس پر پاؤں رکھ کر جو کھڑا ہو جائے تو بجز چھلکے کے کچھ نہ نکلتا۔ بیسیوں بار لوگوں نے آزمایا اور لطف یہ ہے کہ پڑھتے دل ہی میں تھے۔

سید الو صاحب - لوگ ان کو شاہ جی والے الو صاحب کہتے تھے۔ نواب سجاد علی خاں مرحوم کے ہمعصر اور ہنوٹ کے آخری [illegible] تھے تقریباً پندرہ برس ہوئے کہ اس دنیا کو چھوڑ دیا۔

مطبع مظہر العلوم :- پیر بخارا کا یہ پریس مظہر حسین نامی کا قائم کردہ تھا جس کی لکھائی چھپائی بہترین تھی اس پریس سے ماہ شعبان

سنہ ۱۳۳۰ھ میں انتقال کیا۔

۱۳۱۲ھ میں دعائے صباح کلام حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ کا وہ اڈیشن طبع ہوا جو اسداللہ خاں غالب کے منظوم ترجمہ کا شاہکار اور لکھنؤ کے مشہور خوشنویس مجو کاتب کی یادگار ہے نسخ و نستعلیق میں مجو کا جواب نہ تھا اس مطبع سے کم کردہ ...، دیوان محوی، زبدۃ النجوم اور بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں پریس کے مطبوعات میں مثنوی باغ ایمان و چراغ ایمان سوال و جواب کی صورت میں جناب غفران مآب سید دلدار علی مجتہد لکھنؤ کا عیسائی عالم سے مناظرہ درج ہے یہ مطبوعہ مجھے آج تک کسی لائبریری میں نظر نہیں آیا مظہرالعلوم پریس کی فہرست اس علمی و ادبی شاہکار پر متوجہ کرتی ہے۔

قدیم صحبت سرود

امامباڑہ کے خصوصیات میں وہ قدیم صحبت بھی کا ذکر ہے جو عہد شاہی سے ربیع الاول کے آخری اتوار کو ہوتی تھی شیخ تصدق حسین وکیل کی رائے ہے کہ یہ صحبت کالے امامباڑہ میں ہر سال ہوتی تھی یہ رائے ٹھیک نہیں ہے محل ہمیشہ محلہ کے مشہور شخص مرزا علی حسین کے مکان میں ہوئی اور جب مکان گر گیا تو اس زمین پر مدت تک جلسہ ہوا اس محفل کا پروگرام امامباڑہ کے شایان شان نہ تھا اس لئے امامباڑہ میں ہونا غلط ہے۔ میاں مشیر کا مراثیہ کلام اسی محلہ اور محفل سے دنیا میں مشہور ہوا۔ یہ جشن غدر ۱۸۵۷ء سے چھ سال تک مسلسل بے فکری کے ساتھ کو کہاں ... رکھ سکتا تھا ۱۸۶۳ء یا اس کے دوسرے سال اس جشن کو کچھ منچلے اہل شہر نے پھر زندہ کیا۔ اس ملتوی شدہ جشن کے موقع پر میاں مشیر نے کہا تھا ؎

چھ سال سے درمیان مدت ... موقوف دور بادہ ہے پیمانہ مست ہے

اشعار مشیر کی داد دینے والوں میں مرزا حیدر صاحب میر کیہ لکھنؤ سے جن کا تعارف گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ وہ ہر سال دوشالہ اوڑھاتے تھے۔ اس عطا کو خود مشیر نے بڑی خوش گزارش الفاظ میں ادا کیا ہے ناقابل تحریر بعض چھوڑ کر میں ان کے دو شعر نذر قرطاس کرتا ہوں ؎

هوتی ہے سرم سبتے میں ... کیہ ... ستھ میں ہے آغا حیدر کوئی امیر
ہر سال ایک جلا کیں اعلیٰ دہ دیتے ہیں ... کی ... کے دو شالہ دہ دیتے ہیں

مشیر نے پشمینہ کی تعداد سے دوشالہ کا ربط قائم کیا ہے اور ... کا ... مرحافظت رماں کرنے والے پر برستا تھا اور یہ بکار زبان کا ایک ٹکسال تھا جہاں ... عام ... ڈھلتے تھے۔ مشیر کی ... ... کشمیری کی رحمی ہو چکے تھے اور یہ دلیل ہے کہ ان کا کلام گورگنج میں نہیں پڑھا گیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

لکی تو کہہ کے دل کی چلے راہ گھر کی لی ... مجمع میں تھے کھڑے ہوئے ایک کاشو بھائی بھی
کشمیری بیچ بھی نہ چلے سیے اس مرے ... اک بکلے یار دیکھ رہے تھے کھڑے کھڑے

پیر بکار ابی کی یہ علمی پیدا وار تھے جواب تک قلمی بیاضوں میں ادھار کی زبانوں پر کبھی کبھی آ جاتی ہے مرزا حیدر صاحب کا دستر خوان شہر میں مشہور تھا ان کے خصوصیات سے تھا کہ وہ جس محفل میں آ جاتے تھے ان کا آبدار خانہ اور گلوریوں کا ساز و سامان خاصدان ہمراہ لایا جاتا تھا اور ڈیڑھ سو حقے ان کے ساتھ چلتے تھے اور سلطنت کے لوگوں کو ان کے مدعو کرنے سے حیران کی خبر ہوا

ملہ گوشتہ لکھنؤ ...

ساعت پہونچ گئی تھی۔ لکھنؤ میں فحش مشاعرے بھی مکان کے دروازے بند کرکے ہوتے تھے اور اساتذہ سب وشتم کے برمحل استعمال پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ [illegible] مد استعمال کرتے۔ عاصی نے اس لفظ کو قابل اعتراض قرار دیا تھا جس نے اودھ کے مرد کو ماں کی گالی دی تھی یہ امر تحقیق طلب ہے کہ مشیر کا کلام بابائے اردو کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ شہیدوں کے کارنامہ جات میں یہ واقعہ بھی نظر آتا ہے کہ جب بیلی گارد انگریزوں سے خالی نہ ہو سکی تو آزادی کے حامیوں نے رائے یہ کی کہ کوئی تدبیر ایسی کرنا چاہیئے کہ سب انگریز بے مارے مر جائیں اور کوئی شخص ایسا ملے جو وہاں جا کر سب کنوؤں میں زہر ملا دے کسی نے جانے کا اقرار نہ کیا مگر شہیدوں کے افسر نے کہا یہ کام ہمارا ہے۔ سنکھیا ہمیں عنایت ہو۔ ممو خاں داروغہ نے پانچ سیر سنکھیا فراہم کرکے غلام رضا خاں سے بحر منگوائی اور اس نے کہا کہ ہمارے شہیدے جاکر اپنا کام کر آئے۔ ممو خاں دمبدم خبر منگواتے تھے کہ انگریز زندہ ہیں یا مر گئے مگر ہر مرتبہ یہی خبر آتی تھی کہ سب زندہ ہیں۔ بظاہر ایسا ہوا کہ ماتحت شہیدے نے بد دیانتی کی اور انگریز دوستی میں پانی زہر آلود کرنے سے باز رہا اگر تمام باشندگان شہر حب وطن میں ثابت قدم رہتے تو غیر ملکی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی۔

گھنٹہ گھر

صوبہ میں انگریزوں کے جو آثار قدیمہ رہ گئے ان میں کلاک ٹاور قابل ذکر ہے جو تالاب حسین آباد کے کنارے اپنی بے زبانی کی ساری باتیں کر رہا ہے یہ سر جارج کوپر کی یادگار ہے جو صوبہ اودھ اضلاع مغربی وشمالی کے پہلے لفٹیننٹ گورنر اور حسین آباد ٹرسٹ کے بہی خواہ تھے ۱۸۸۱ء میں یہ بننا شروع ہوا۔ سید ہدایت علی بن موسیٰ رضا رامپوری نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم لڑکپن میں ادھر سے گذرے اور معمار سے کہا کہ یہ اتنی اونچی عمارت بھلا کہاں ٹھہر سکتی ہے آندھیاں زلزلے موسلا دھار پانی گرا دے گا کاریگر (معمار) نے کہا صاحبزادے لو یہ اینٹیں مسالے سے جوڑے دیتا ہوں اس کو دھوپ میں رکھ دو صبح میں کھول اٹھا کر دونوں کو علیحدہ کر دو۔ واقعی کچھ دیر کے بعد اینٹ پتھر ہو گئی اور بڑی کوشش کی جوان ہاتھ سے علیحدہ نہ ہوئی۔

اس عمارت کو بہت دور تک زمین میں آثار قائم کرکے ۱۲ زینے کے چبوترے پر ستّے پر پانچ زینے قائم کرکے مینارہ بنانا شروع کیا ہے قد آدم دروازہ اور اندر زینہ ہے نیچے سے اوپر تک مینارہ چوکور ہے دروازے کی تھوڑی اونچان طے کرکے پھر چوگرد حاشیہ سا رپایہ دئے گئے ہیں اور اوپر کے حصے میں چاروں طرف چار گھڑیاں اور چوٹی پر گلدستہ نما صورت ختم کرکے ایک پیتل کا بگلہ کلس پر نصب کیا ہے جو ہوا کا رخ بتاتا ہے اور جدھر کی ہوا ہوگی ادھر گھوم جائے گا بجنے والی مشین نہایت پائدار ہے اس کی صدا بڑی پاٹ دار ہے اور سناٹے میں اگر ہوا مخالف نہ ہو تو وہاں سے چوبداری محلہ تک آواز آتی ہے۔ اس گھنٹہ گھر میں گھنٹہ پورا ہونے سے پہلے سننے والوں کو متوجہ کرنے کے لئے اولاً کچھ آوازیں پے در پے آتی تھیں اس کے بعد ٹھہر ٹھہر کر بجتا تھا لیکن یہ جز عہد نواب باقر مرزا صاحب مرحوم متولی کے وقت سے نہیں رہا۔ اور اب دس بجتے ہیں تو دس کی صدا اور گیارہ بجتے ہیں تو گیارہ کی آواز آتی ہے۔

۱۹۰۹ء میں لکھنؤ کے رئیس نواب احمد علی خاں قیصر نے اے ایل سانڈرس ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کو اس جگہ پارٹی دی تھی جس میں تعلقہ داران اودھ اور دربالسٹ کے جملہ معززین شریک تھے اس اجتماع کا عکس میرے پاس موجود ہے جو پرانی تہذیب کا ایک آئینہ ہے۔

گھنٹہ گھر دور دور سے دکھائی دیتا ہے اور ۱۸۸۷ء میں بن کر تیار ہوا بہتّر سال پرانی عمارت ہے۔

جمنیا باغ میں حسین آباد مبارک

امام باڑہ کی تعمیر سے پہلے یہاں شاہی کا جمنیا باغ تھا گنگا جمنا ملک کی دو بڑی نہریں ہیں جو اپنے پاٹ کے لحاظ سے یو پی کے دریا کہی جاتی ہیں اور کانپور و الہ آباد و آگرہ پانی کی گزرگاہ ہے جمنیا کی لعد دیلے جمنا کی طرف اشارہ کرتی ہے امام باڑہ حسین آباد کی عمارت اسی باغ کی آراضی پر بنا شروع ہوئی۔ اس امام باڑہ کا پھاٹک رومی دروازہ کے محاذ میں پچھم کی طرف واقع ہے اور یہ مقدس عمارت شروع ہوتی ہے دو برجیاں نظر آتی ہیں جو عموماً پہرہ دار کے بیٹھنے اور نگہبانی کی جگہ ہوتی ہے حسین آباد میں مسجد امام باڑہ تالاب اندازہ کوٹھیاں نوبت خانہ نا طرقہ کے بیٹھنے کی جگہ ۔ بیس منزل ترلیف منزل ۔ مقدرہ ۔ ت کھنڈ ۔ مختلف مقامات ہیں جس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

تالاب:۔ لکھنؤ میں گلیت رائے کا تالاب، بختی کا تالاب، اشرف علی کا تالاب ایسی نوعیت کے ممتاز مقامات ہیں وسط شہر میں کوئی ۔ ۔ ۔ نہ تھا اس کمی کو حسین آباد کے تالاب سے پورا کیا گیا ہے ۔ ۔ حسین آباد کی مسجد ۔ ۔ سے گزرتے ہوئے ۔ ۔ ۔ تاریخ ۔ ۔ کھودی ۔ ۔ کا بہت گہرا ۔ ۔ ۔ مربع ۔ ۔ ۔ آب ہے ۔ ۔ ۔ والوں کے لیے ۔ ۔ ۔ کا اور دستکاریوں سے یہ تالاب ۔ ۔ ۔ طرف سیڑھیاں اور شرقاً وغرباً پانی بھرنے والوں یا نہانے والے ۔ ۔ کے لیے تالاب کے پہلوؤں ۔ ۔ ۔ رہتے ہیں جس سے مویشی بھی سیراب ہو سکیں بارش میں عموماً پانی بڑھتا ہے اور ۔ ۔ پانی کے ۔ ۔ میں چھلک کر حسین آباد کا راستہ بند کر دیتا ہے مچھلیوں کی کثرت ہے ۔ ۔ شکاری کے بیٹھنے کے ۔ ۔ ۔ مختلف ۔ ۔ ۔ ہیں ۔ ۔ ۔ تاریخ ہے ۔

اے لوگو ہر ا حسین آباد کے تالاب ۔ ۔ ۔ دولت یا ۔ ۔ ۔ کل ۔ ۔ ۔ کو

شیخ مدلو کے کمالات تالاب پر:۔ مدلو ۔ ۔ ۔ تھا ۔ ۔ ۔ سے ترقی کی اور سب پیراکوں کا استاد مانا گیا یا تھی کی پیرائی جو سب پیرتا تھا صرف پیر کے دونوں گھٹنوں سے پانی کو حرکت دیا جاتا تھا کبھی ایک ہاتھ میں گڑگڑی ہے اور پیتا چلا جاتا ہے اور کبھی بچے کو گود میں اٹھا لیا اور چار آب پر رواں ہے ڈولت کی پیرائی بہت اچھی پیرتا تھا یعنی سر سے کمر تک جسم کا حصہ پانی کے اندر ہے اور باقی پانی کے اوپر ہے اور پیرتا چلا جاتا ہے ۔ مدلو پانی میں ریل گاڑی بناتا تھا اس طرح کہ پچیس تیس آدمی ایک کے پیچھے دوسرا لگا ہوا اور سب کے خود ۔ ۔ ۔ ملتی ہے سب کو کھینچے جاتا ہے کبھی کھڑی سے کبھی کسی اور پیرائی سے ۔ غدر کے بعد حسین آباد کے تالاب میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں یہ کرتب دکھلائے گئے مدلو کھڑی بھی اچھی لگاتا تھا ایسی مشق بہم پہونچائی تھی کہ موضع کا نکرآباد سے چلا اور چار ۔ ۔ پل آگیا۔ (ندیم ۔ ۔ ۱۲۵۰)

بارہ دری:۔ اسی سمت تالاب کے دوسرے کنارے پر یہ عالیشان قصر ہے جو اپنی رفعت، پختگی، خوبصورتی، کشادگی میں اپنی آپ نظیر ہے اس کو تصویر والی بارہ دری کہتے ہیں اور سلاطین اودھ کی یہاں تصویریں اور بعض نوادر میوزیم کے طور پر ہیں ۔ حسین آباد ٹرسٹ کا آفس اور وثیقہ کی تقسیم اسی بارہ دری سے ہے یہ دو منزلہ عمارت ہے اور نیچے کے حصے میں تالاب کے قریب اور رمانہ طعیانی میں گومتی بڑھ آنے کے تصور میں صرف ستون دے کر پہلی منزل کو خالی چھوڑ دیا ہے تالاب کے رخ پر بارہ دری کی پشت اور دوسری رخ پر داخلہ کا عالیشان انگریزی وضع کا راستہ اور کشادہ زینہ ہے ۔ وثیقہ کے مقامات اور ایک ڈپٹی کلکٹر کے پوزیشن کا سکریٹری، سپرنٹنڈنٹ آفس اور ہر شعبہ کے علیحدہ کلرک اپنی اپنی جگہ پر بیٹھتے ہیں دیوان جی اور خزانچی ہمیشہ ہمدد

دھرم کاریا دوسری کوٹھی وہ ہے جس میں بیرسٹر سید مرزا باقر مرزا عرکار ہے۔

... حصے میں ایک چھت دار کنواں بھی ہے جو ٹھنڈے پانی کا بہترین چشمہ ہے نجم الغنی کے قلم سے تاریخ اودھ میں ان عمارات پر ... ی تعریف میں ہے۔ تصویر ... داری کو راجہ امام علی خاں نے اس کوٹھی کی لعل سے یاد کیا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ ان کی ... ی عبارت ... میں لکھ دوں۔ حضرت بیگم کے حلف کرنے۔ ہند ذی مسلم ریاستیں ایسی ہو میں کہ لکھنؤ پہونچیں اور انگریزوں سے مقدمہ ... اس موقع پر کچھ ... و طرح حسین آباد تک گئے

... ایک واقعہ اسی اثنائے قیام لکھنؤ میں تحمل حسین خاں کی دلیری سے متعلق یہ ہے ... کے قریب خود حضرت حشمت علی چکلہ دار و تعلقہ دار ... سرکش تھے ... اور تحمل حسین خاں وغیرہ سے نہایت ... کا سلسلہ ... دونوں خاندانوں میں جاری ہے ... تحمل حسین خاں چودھری صاحب سے ملنے گئے امجد علی ... بھی وہاں بیٹھے تھے ان کے علاوہ اور لوگ بھی صحبت میں تھے ہر شخص ادھر ادھر کی ... تھا اور یہ وہ زمانہ تلنگوں کی شورش کا ... اتفاقاً ایک صوبیدار تلنگوں کا مست خلائی زیور مثل کنٹھا و مالا وغیرہ پہنے نہایت عمدہ ... سجے آراستہ بہت نفیس گھوڑے پر سوار یو ہی کمپنی تلنگوں کی اور قریب سو سوار ہمراہ لئے ہوئے چودھری صاحب کی ملاقات کو آیا انہوں نے بہت تواضع اور مدارات سے پہلو میں جگہ دی صوبیدار نے چودھری صاحب سے حاضرین محفل ... ایک کا نام پوچھا وہ بتانے لگے تحمل حسین خاں کا نام سن کر ان کی جرأت و دلاوری کی ثنا و صفت کی پھر امجد علی ... کا نام سن کر ان سے مخاطب ہوا اور کہا آپ تو اس وقت خوب مل گئے آپ کے والد نے ... زمانہ چکلہ داری میں ہمارے ... ہمارے بیٹوں کو ... اور لاکھوں روپے کا ہمارا مال لوٹ لیا تھا پس آپ وہ کل مال اسی جگہ پر دیکر ... حکایت بیان کرتے ... تمام مجلس کا رنگ متغیر ہو گیا کہ اگر اس صحبت میں اس کی حمایت سے امجد علی خاں ... کیا تو خلاف ... اور اگر اس صوبیدار سرشور کو روکتے ہیں تو بیکار کشت و خون ہوتا ہے ادھر صوبیدار وہی کلام امجد علی خاں سے ... آخر تحمل حسین خاں برافروختہ ہوئے تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور امجد علی خاں کا ہاتھ پکڑ کے ... چلیں پھر صوبیدار کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اب اگر ان کی نسبت کچھ بھی زبان سے نکالا تو مارے تلواروں کے اسی جگہ ... اقبال مندی اس کا نام ہے کہ یہ کلام سن کر ایسا رعب صوبیدار اور اس کے ہمراہیوں پر چھا گیا کہ پھر کسی ... بات نہ نکلی تحمل حسین خاں اسے ہاتھی پر امجد علی خاں کو بٹھا کر اپنی ... درگاہ پر لے آئے۔

حسین آباد کا پھاٹک

حسین آباد کی لفظ مرزا دبیر کے ایک شعر سے ماخوذ ہے وہ لکھنؤ کی عزاداری کے جوش کو دیکھ کر ایک سلام میں کہتے ہیں ؎

تعزیہ داری کے باعث لکھنؤ آباد ہے   اس پہ اطلاق ہو سکتا حسین آباد کا

۱؎ ... جب قیصر باغ ... تعلقہ داران اودھ کو قیصر باغ کے حصے ... کر کے چند شرائط ادب ... شکست ... کی ذمہ داری پر سلامت بعد ... آپ کو مغربی پھاٹک سے قریب جانب جنوب مکان ملا صلہ ۱۴۔ آثار یادگار

۲؎ آثار یادگار تاریخ بخشوا مؤلف ۱۹۲۳   ۳؎ مراثی دبیر مطبع نولکشور ۱۹۱۲ء جلد ...

مرثیہ وگیرہ کا آخری دور حیات محمد علی شاہ بادشاہ کے عہد میں تھا جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا۔

پہلا پھاٹک تین دروازوں کی صورت میں انتہائی شاندار نقش و نگار سے آراستہ اور پہلوؤں میں عمارت کمروں کی صورت میں ہے۔ ۴۰ سال پہلے اسپتال تھا۔ امام باڑہ چونکہ عظیم اللہ خاں کی نگرانی میں تعمیر ہوا اس لئے پھاٹک پر سنگ مرمر سے ان کے نام کا اعلان ہوتا ہے اور بہترین نستعلیق میں یہ اشعار بھی موجود ہیں ؎

نہج خاص امامی و سرفرازش دستور — جانثار بادشاہ کشور ہندوستاں
صاحب فہم و خلیق و عاقل و دانائے خلق — عاشق و شیدائے حضرت ہست بیشک بیگماں
روز و شب مصروف حکم شاہ می باشد بدل — در پی کار ... ہیچ کار ...
بیست این تاریخ ما در مثل تاریخ دگر — در کمی صحت سطر ... قمر ...
گر کر اول یکہزار و دو صد و پنجاہ و چار — تا ... آخری ... اول ہمیشہ ...
از ترقی شد دو صد سال این تاریخ مد — مہتمم با لطف حق بودہ عظیم اللہ خاں
ہر سال عیسوی در گوش ہوش سامعین — از فلک آمد ندا ما ی عظیم اللہ خاں

پھاٹک میں ایک سمت عہد برٹش کے پہلے سیلاب ۱۸۹۴ء کا نشان اور دوسری طرف ۱۹۲۳ء کی طغیانی کی یادگار پتھر کی صورت میں موجود ہے آغاز اکتوبر ۱۹۵۸ء میں بھی اس کتاب کے دوران تالیف میں گومتی بڑھ جانے سے پھاٹک میں ناؤ چلتی تھی۔

لنگر خانہ:۔ پھاٹک کے بعد لنگر خانہ ہے یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں خمس کے حصوں کی بچت ہوتی ہے۔ مرحوم کے نام غریب اور محتاج کو جو کھانا بٹتا ہے اس کو لنگر کہتے ہیں محرم چہلم میں تو رہ سدی میں اسی لنگر سے حصے تقسیم ہوتے ہیں ماہ رمضان المبارک میں افطار کے وقت روزہ داروں کو خمیری روٹی سالن بھی یہاں سے مدت تک بٹتا رہا۔

باولی اور حمام:۔ تاریخ میں اس حمام کا ذکر موجود ہے جو بہار رس سے مدیر آب اس سے متصل جو بڑا کنواں زیر سقف ہے وہ گرمیوں میں ہر وقت پیاسوں کو سیراب کرتا ہے حمام کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

سلطان جہاں حیدر بادل — کسرائے زمانہ شاہ عادل
حمام لطیف کرد تعمیر — تا گشت نمود بہر تطہیر
تاریخ سعید ہست طاہر — حمام لطیف حوض طاہر
۱۲۵۴ھ

اور کنوئیں کی تاریخ ملاحظہ ہو ؎

آب این چاہ و شیریں چون — شربت قند و نبات پاکست
راست تر معرعہ تاریخ رسید — چشمۂ آب حیات پاکست ۱۲۵۴ھ

بیت منزل:۔ پھاٹک سے حسین آباد کے گذر کر بائیں ہاتھ پر دو راستہ ہے جو عظیم اللہ خاں کے امام باڑہ کو جاتا ہے اور کچھ مکانات ملے اور بائیں ہیں جن میں لوگ بلا کرایہ رہتے ہیں حسین آباد کا حمام اور بڑا کنواں جو ہر وقت گرمی میں کھلا رہتا ہے اسی سائڈ میں

ہے افسوس ہے کہ عام منزل پہ رہتے ہیں کیا کوئی اس کو دیکھ نہیں سکا کنواں چھت کے نیچے ٹھنڈے پانی کا سرچشمہ ہے اس والے سے چند قدم جانے کے بعد حویلی آؤ تو پھر حسین آباد کے پھاٹک سے پہلے رئیس منزل کا پھاٹک ملتا ہے اس کے بعد وسیع آراضی میں او غربا کے لئے بہت سے مکانات ہیں جن کو عزت دینے کے لئے رئیس منزل نام رکھا گیا ہے اور اس احاطہ میں باشندگان محلہ کو مجلس ماتم تابوت کی مکمل آزادی ہے۔ رئیس منزل میں داخل ہونے سے پہلے سرپا اسٹائل کی ایک برجی نظر آتی ہے جو ہندوستانی کاریگری کا بہترین نمونہ ہے آج امریکہ کی عمارتیں شہر میں بن رہی ہیں اور لطف نہیں ہے۔ اخبارات میں فوٹو یا خبر کے ذریعے نقشے آتے رہتے ہیں اور آ سکتے ہیں مگر عہد محمد علی شاہ میں برمائی عمارت کا نقشہ کیونکر بنا بادشاہ کی قدر افزائی کا ایک کرشمہ ہے اس ستان کی دوسری برجی تہ لیف منزل کے سائیڈ پر ہے۔

نوبت خانہ۔ اصل امامباڑہ کے پھاٹک کے جواب میں جو عمارت اسی وضع قطع کی ہے اس کو نوبت خانہ کہتے ہیں نوبت کا آئین شاہانہ دور میں یہ تھا کہ ہر پہر کے جاتے ہر گھڑی بھر تک نوبت بجے اس طرح دن رات میں آٹھ مرتبہ نوبت بجنا چاہئے مگر معمول یہ تھا کہ سات دفعہ نوبت بجتی تھی یعنی نوبت بجتی۔ روز صبح سے پہلے یہ صبح کی نوبت کہلائی۔ دوسری جب ایک پہر دن چڑھتا تیسرے زوال کے وقت یہ دوپہر کی نوبت کہلاتی۔ پھر تیسرے پہر کو اس کے بعد سورج ڈوبتے وقت پھر تین دفعہ باری باری رات کو اور ساتویں نوبت کے بعد لوگوں کے آرام میں خلل پڑنے کے واسطے آٹھویں بند کر کے ڈیوٹی ختم کر دی جاتی ہے لکھنؤ میں اب صرف حسین آباد کی صبح و شام نوبت باقی ہے۔ درسلسلہ میں کبھی کبھی چوک تک آواز آتی ہے جو ترھی (نرسنگا بگل) پر ختم ہوتی ہے اس کو باجہ والا کھڑے ہو کر بجاتا ہے نوبت کو صبح کی وردی بھی کہتے ہیں رشید مرحوم فرماتے ہیں ع غنچے چٹکے کہ کی صبح کی گویا وردی" حیدرآباد دکن کے رؤسا کی ڈیوڑھیوں پر بھی نوبت بجتی تھی۔ مشہد مقدس مزار امام رضا پر بھی نوبت خانہ ہے۔

پھاٹک۔ حسین آباد کا امامباڑہ نوبت خانہ کے روبرو والے پھاٹک سے شروع ہوتا ہے یہ دروازہ درگاہ حضرت عباس کے پھاٹک سے بالائی حصے میں مشابہ ہے۔ دروازہ کے پہلوؤں میں تاکہ دو چبوتروں پر پتلیاں تھیں جن کا چہرہ عورت کا اور جسم چوپایہ کا بیٹھے ہیں سینہ ابھرا ہوا یہ مجسمہ ۵۰ سال پہلے تک تھا اس سائڈ میں حکیم اور کامدانی اور ظروف نقرہ کی دوکانیں تھیں جن کے لوگ سے مہاجن تجارت کرتے تھے اور آنے والے سیاح ان کو بڑی بڑی قیمتوں پر خریدتے تھے۔

گھنٹہ۔ دروازہ تین پھاٹکوں پر مشتمل جن میں لوہے کے خوشنما دروازے اور درمیانی باب سے آمد و رفت پھاٹک میں تمنادار اور چہرہ سیوں کی جگہ اور داہنے ہاتھ پر جو حجرہ ہے اس میں گھنٹہ نصب تھا جو گھڑیوں کے رواج سے پہلے پرانے طریقے پر بجتا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے الفاظ میں اس کی حقیقت پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ایک پہر میں تین گھنٹے ہوتے تھے اور دن رات کے آٹھ پہر قرار دئے تھے۔ ہر پہر کی آٹھ گھڑیاں تھیں گھنٹہ کی صورت یہ تھی کہ ناندے میں پانی بھرا رہتا تھا اور ایک خالی کٹورہ جس کے پیندے میں باریک سوراخ ہو اس میں ڈال دیا جاتا جو پانی پر تیرتا رہتا اور دھیرے دھیرے اس میں پانی بھرتا تھا یہاں تک کہ پانی سے بھر کر ڈوب جاتا اس وقت گھنٹہ پورا ہو کر نوکر موگری سے پیتل کی آویزاں ٹکیہ پر ضرب لگاتا۔ سننے والے شمار کرتے کہ کیا بجا ہے۔ ۸ کے صبح و شام اور ۱۲ کے گجر بجتا یعنی ۸ کے بعد پھر آٹھ دفعہ اور ۱۲ پر ۲۴ آتش کہتے ہیں ۔

شب جو تم نے صبح وعدہ باغ چلنے کا کیا — ہر گھڑی دل کو زیادہ تھا گجر کا انتظار

گھر دم کی لفظ ۲ بجے صبح کے معنی میں استعمال ہوتی تھی۔ یہ طریقہ ذرا بھی دشوار نہیں ہے آج بھی اس کا تجربہ ہو سکتا ہے گھڑی دیکھ کر ہمنے کے طور پر چھید دار کٹورہ پانی میں ڈالو ایک گھنٹہ میں مقا پال چڑھے اتنا بڑا کٹورہ ہو لیکن سوراخ بھی اتنا ہی بڑا ہونا چاہیئے اس کٹورے سے وقت کی جانچ ہو سکتی ہے اور اگر ایک وضع قطع اور مقدار کے ۱۲ کٹورے ہوں اور ان پر نمبر دیئے جائیں اور نمبر دار کٹورے ڈالے جائیں تو ہر دیکھنے والا نمبر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ کیا بجا ہے اور اگر کٹورہ پر نمبر اور نمبر بھی ہوں تو ہر پندرہ منٹ کا بھی علم ممکن ہے لیکن ایک شخص کا متعین ہونا ضروری ہے۔ دروازے کے قریب سے درہ اور ہے جس پر سنہری مچھلی نصب ہے جو ہوا کی طرف رکھتی ہے دروازے سے گذر کر بیرونی صحن اور باغیچہ ہے اور چبوترہ دو پیتل کے مجسمے انسان صورت نصب ہیں جو ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں اور زنجیر کا آخری حصہ پھاٹک چھت میں کڑوں سے وابستہ ہے عوام سمجھتے ہیں کہ دونوں آدمی لنگر اٹھا رہے ہیں مسجد کے محاذ میں دو مجسمے ایک چبوترہ پر ... بچے کو دودھ پلا رہی تھی یہ بھی ۴۰ سال سے نہیں ہے کاٹ سالوں اس سکریٹری کے ہیں اور کے وقت نصب کی گئی ... وقت تھے میں چاندکا پرشاد، سکندر لال وغیرہ کہتا دھر لکھتے امکا۔ سادہ یہ خدمت اس کے سکریٹری ... جلوس میں چلتے تھے۔

مسجد:- پھاٹک سے نکل کر پہلے مسجد نظر آتی ہے جس کا دو گنبد اور دو طرف ... ہے اور ... کا ایک ستون تانبہ زالو نصب ہے جس کے سامنے گھنٹے اور بڑھنے کے لحاظ سے گرد اس قسم کے ... پتھر ... جڑے ہیں یہ دھوپ گھڑی ہے اور پتھر کی برچھائیں اس گوٹ پر پڑنے سے وقت معلوم ہوتا ہے۔ دھوپ گھڑی سے کلاک یا تاریخ کے تعلق کا نقشہ نواب عطا حسین خاں ابن حیدر حسین خاں ہے جو نواب افضل حسین خاں سے ... کے زمانے میں ... صورت میں ۱۲۸۰ھ میں چھاپا ہے۔ صحن مسجد میں دو خوشنما گلدستے ہیں جس پر موذن چڑھ کر اذان دیتے ... میں حوض اور سنگی خوشنما کنواں ہے اور سنگ مرمر پر جو تاریخ نصب ہے اس کا ایک مصرعہ یہ ہے ... کی تعریف میں دو ... کسی شاعر کا قول ہے "مسجد پر نور ... اگر گویم ..." ... وسعت مسجد کے لحاظ سے مینار اور گنبد دلپسند ... دوسری مسجد جامع مسجد ... اس مسجد کے موذن شیخ محمد ... کے پاس میں نے ایک قلمی کتاب میزان التکیہ دیکھی مولف کا نام سید محمد عباس ابن مرزا بہادر علی خلف نواب ... کتاب اصل کا پلی تھی۔ بخط مؤلف اس کی کتابت ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ ... سائز ... بڑی تقطیع ہوتے کا ... میں خمس اور مسبع اور مثمن اور اس سے بالاتر درجات کے نقوش تھے اور کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ مؤلف کی اس ... ایک اور کتاب مقالید کمات ہے شیخ صاحب کے ... کے پاس یہ کتاب کراچی میں موجود ہے۔

مقبرہ مجلسی بیگم:- صحن امامباڑہ میں عمارت مسجد کے بعد حضرت ... کا مقبرہ ہے جن کا اصل نام نواب ... حمیدہ سلطان تھا اور ملکہ ... کے بطن سے تھیں حیات پدر اور ... طوالت ... رحلت کی ۱۲۵۲ھ میں تاج محل آگرہ کے نقشے سے کسی قدر مشابہ مقبرہ ... امامباڑہ حسین آباد کی بنیاد قائم ہوئی تو اس عمارت کو ... امامباڑہ میں شامل کیا گیا اس مقبرہ کے جواب پر دوسری طرف ... ہے جو شہزادیوں کے چارپائی اور دوسرے استعمال میں ہے۔

صحن میں وسیع نہر اور نہر پر خوشنما پل پہلوؤں میں برجیاں اور چبوترہ سے متصل آخری حصہ پر سطح آب میں ایک سنگی چبوترہ پر شبیہ دلدل اور علم مکلف قسم کی تصویر

عمارت امامباڑہ:- کئی سیڑھی بلند تین درجوں کی خوبصورت عمارت اور دونوں طرف شرقاً و غرباً صحنچیاں ہیں روکار پر نسخ و نستعلیق کے بہترین خط اور یہ تاریخ نظر آتی ہے ؎

ست زمانہ محمد علی بادشاہ　　امامباڑہ پئے ذکر مجلس حسین

زروئے آہ دلم خواند بود تاریخ　　ساد تعزیت ماتم امام حسینؑ　　۱۲۵۴ھ

امامباڑہ شیشہ آلات اور تبرکات سے آراستہ ہے اور دیواروں اور کھمبوں پر جا بجا سنہری ورق چسپاں کرکے ڈھالے گئے ہیں پہلے دالان میں چاندی کا منبر چاندی کے تخت پر زرتاری شامیانہ بالائے منبر چاندی کی چوبوں پر نصب ہے اور چوکھٹوں میں دیوار پر نسخ و نستعلیق کے طغرے قطعات مقامات متبرکہ کے عکس میر علی تبریزی کے قلم کا اصل کتبہ محفوظ رکھنے کا فخر اس ٹرسٹ کو حاصل ہے بیچ کے دالان میں بانی امامباڑہ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی قبر نقرئی حجرہ جس کے سامنے رحل پر قرآن شریف، شاہی تاج، چاندی کی انگیٹھی اور کشتی چوبداروں کا مخصوص پہرہ بہترین ایرانی قالینوں کا سنگ مرمر کی زمین پر فرش طرح طرح کے نقرئی اور طلائی علم حضرت عباس کے بڑے علم موم کی مرصع بھاری تعزیئے کارچوبی پٹکے سونے اور چاندی کے پنجے فولادی تلواریں حدیدتیں یہ بارہ اماموں کے نام شیشے کے تنگ دہن قرابہ میں ایک چھوٹی ضریح مبارک شہ نشین میں قدیم طرز کے ورق اسمائے معصومین لکھے ہوئے پردے زربفت کے اونچے اگردان، گلاب پاش روشنی کا سامان رکھنے کی خوبصورت چوکیاں اور ہر گوشہ میں وہ کثیر سازو سامان کہ نہ اس کی تفصیل کی جاسکتی ہے اور نہ سرسری نظر میں چیزوں کی حقیقت کا فیصلہ ہو سکتا ہے سوزخواں، مرثیہ خواں، نثرخواں، کتاب خواں بالنحواہ ذاکری کے لئے مقرر رفتہ رفتہ فنون مشرقیہ ختم ہوتے گئے اور اسم تخفیف میں آتے گئے۔ کتاب خواں واقعہ خواں نہ رہا تو سوزخواں اور نثرخواں رہ گئے اب ان کی ذاکری بھی آخر ہے مرثیہ تحت اللفظ پڑھنے والے اور حدیث خواں رہی دنیا تک رہیں گے اس لئے کہ یہ ایک حد تک مطابق فطرت ذاکری ہے ورنہ آداب و آئین سے بے پرواہ ہے۔

کمال پرور بادشاہ نے چوٹی پر کے ذاکریں کو تنخواہیں دیں کلیات دلگیر سے واضح ہوتا ہے کہ موصوف نے جو مرثیہ امامباڑہ کے دور اولیں میں پڑھا اس کا قطعہ یہ ہے ؎

غیب سے آئی صدا دلگیر کر جلدی دعا　　ہوگئی مقبول یہ مجلس حسین آباد کی
کی دعا میں نے رہے دائم سلامت بادشاہ　　دیکھے یہ شادی یہ ساری آل اور اولاد کی
حسرت دعا ہی ہم کو تندرستی کر عطا　　یا خدا تجھ کو قسم ہے حضرت سجاد کی

ایک دوسرے مرثیے میں اپنی پر خلوص زبان سے فرماتے ہیں ؎

دعا دلگیر کی سن لے خدایا　　یہ مطلب کردے پورا میرے جی کا
ابوالفتح معین الدین کے سر پر　　رہے سایہ محمدؐ اور علیؑ کا

خدایا منفع درد ہائے سب ہو ۔۔۔ تصدق فاطمہ کی غم کشی کا
پرستہ ہو بادشاہ ہفت کشور ۔۔۔ تصدق فاطمہ کی غم کشتی کا

امامباڑہ کے مرثیہ خوانوں میں میرزا کی کا نام تاریخ اودھ میں موجود ہے آپ نے شاہ مرحوم کے ہاتھ ایک پنجہ علم مبارک کا ہدیہ کرکے قیمت کے علاوہ کثیر انعام پایا تھا۔ مؤلف کے ابتدائی دور میں پچاس برس پہلے سلطان الداکرین میر محمد شاہ صاحب مرحوم کے بیٹے سید صاحب اور مرزا مس صاحب ذاکری ملتے تھے ۱۸۵۳ء میں تاجدار اودھ نے ۲۰ لاکھ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے کر امامباڑہ کے بقا کا پورا سامان کردیا۔ اور ۱۰ مئی ۱۸۵۸ء کو کوس رحلت بجایا اور اس متبرک مقام پر سپرد خاک ہوئے امامباڑہ کا سنہرا گنبد اس قدر خوشنما ہے کہ سورج نکلنے پر آفتاب کی کرن سے شعلہ طور معلوم ہوتا ہے

<u>مفتی گنج کا پھاٹک</u> :۔ حسین آباد کے غربی پھاٹک سے گزر کر امامباڑہ کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور محلہ مفتی گنج شروع ہوتا ہے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ پر ایک مسجد اور ٹوٹی ہوئی کچھ قبریں ہیں اس قبرستان میں سید اسمٰعیل مرزا میتا بیگ اس سید عزیز اللہ کوتوال شہر کی قبر ہے اور قبر پر تاریخ بھی کندہ ہے ۔ گوئے سبقت از جہاں مرزا میتا بیگ بود یہ مادہ تاریخ ہے مرزا علی رضا کوتوال انھیں کے فرزند تھے جن کی انتظامی صلاحیت لکھنؤ میں ضرب المثل ہے ان کی دادودہش غربا پروری سچائی کون ہے جو نہیں جانتا وہ بڑے خوش خوراک اور حیاس شخص تھے اردو میں کہاوت ہے "مزا تو گیا علی رضا کے ساتھ" اس کا مطلب یہ ہے کہ علی رضا کے بعد اچھا اور خوش ذائقہ کھانا کھانے والا کوئی نہ رہا۔ میاں مکیر کا ایک مصرعہ ہے ع مرزا علی رضا کی دہائی ہے چھوڑ دے ؟ قبروں کے محاذ میں ایک پرانی مسجد ہے جس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ کس کی بنا کردہ ہے۔

<u>شریف منزل</u> :۔ بادشاہ مرحوم نے رئیس منزل اور شریف منزل خاندان کے ان لوگوں کے لئے بنوائی تھی جو چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پاتے تھے اور نوازندگان عالی میں قابل ہمدردی تھے اور دل چاہتا تھا کہ سب یکجا رہیں مگر ان حضرت کی آن بان کے خلاف تھا اور یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہم خیرات خانہ میں نہ رہیں گے اس انکار پر عام لوگوں کو یہاں رہنے کا حق حاصل ہوا چنانچہ شریف منزل کی عمارت حسین آباد کے دوسرے غربی پہلو میں آج بھی موجود ہے اور لوگ رہتے ہیں جملہ مکانات آباد ہیں ۔ شریف منزل سے واپس ہوکر حسین آباد کا غربی پھاٹک اور مفتی گنج کا راستہ ہے جس کے بعد یہ خاص حصہ ختم ہو جاتا ہے مگر تاریخ میں بعض مقامات کا اور ذکر ہے جواب باقی نہیں ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں تھے لہذا اس کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔

<u>سبیل</u> :۔ پانی پلانے کی جگہ جہاں امام حسین کے نام پر بلا استثنا مذہب و ملت ہر پیاسے کو ٹھنڈا پانی دیا جاتا ہے ساتویں محرم سے خصوصی حیثیت سے سبیل کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے شاہی سبیل کا تاریخ اودھ میں ذکر ہے اور یہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں ؎

نوشیروان جعفر ابوالفتح شاہ ہند ۔۔۔ مقبول بارگاہ تہ مسترقین ہے
رکھوائی ہے سبیل تو تاریخ یہ ہوئی ۔۔۔ آب سبیل مدرجات حسین ہے ۱۲۵۴ھ

<u>سرائے</u> :۔ امامباڑہ کے ساتھ کہیں سرا بھی تھی حسین آباد سے مفتی گنج تک سرا کا نام زبان زد نہیں ہے مگر تاریخ میں اس کا بھی ذکر ہے ؎

ابوالفتح منصور شاہ زمانہ　　محمد علی سایہ حق تعالیٰ

رضا گفت تاریخ از حکم سلطان　　سرار ابوالفتح شاہ علی　　۱۲۵۵ھ

یہ تاسیس امامباڑہ کے بعد کی ہے۔

سڑک ۔ تاریخ سے مدد نہیں ملتی کہ محمد علی شاہ بہادر کی سڑک کہاں ہے، ممکن ہے کہ بڑے امامباڑہ سے امامباڑہ حسین آباد تک کی راہ تعمیر کردہ مرحوم ہو اس کا وجود اس شعر سے واضح ہے ؎

بر روش خط سڑک گشتہ صراط المستقیم　　بر زمیں پیدا شدہ گویا جواب کہکشاں

خسرو عہد ابوالفتح معین الدین است　　رشک شاہان جہان بادشہ ہندوستاں

چوں سڑک ساخت مصرع تاریخ گفت　　ہست ایں نوع سڑک جادۂ راہ ایماں　　۱۲۵۳ھ

ست کھنڈہ ۔ تاریخ اودھ میں شاہی رصدخانہ کا ذکر ہے اور نجم الغنی نے محمد علی شاہ بادشاہ کے بناکردہ عمارات میں ذکر کیا ہے اور ست کھنڈہ کو اس کے علاوہ دوسری عمارت شمار کیا ہے یہ رائے ان کی صحیح نہیں ہے تارہ والی کوٹھی کو عہد محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ رصدخانہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے وہ اس سے پہلے کی عمارت ہے رصدخانہ کی تاریخ حسب ذیل ہے ؎

چوں محمد علی شہ دوراں　　ساخت در لکھنؤ رصد تیار

کرد سالش رقم مہندس فکر　　ایں رصد شد بحکم شہ تیار　　۱۲۵۴ھ

نجم الغنی ست کھنڈہ کو ناتمام عمارت بتاتے ہیں اور اس کے سوائے کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس پر سے بادشاہ تمام شہر کی عمارتوں کو دیکھنا چاہتے تھے صرف چار منزلیں بن کر رہ گئیں۔ اگر مرقومہ بالا تاریخ اسی عمارت کی ہے تو اشعار سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ عمارت بن چکی تھی اور یہ شہرت صحیح ہے کہ اوپر کے کھنڈ مخدوش ہو جانے سے اتروا دئے گئے۔ حسن التواریخ کے فاضل مؤلف نے اس عمارت کے نو کھنڈ قرار دئے ہیں اور ہر طبقے کی شادصنعت میں ایک شعر نظم کیا ہے جس میں آسمان کے تاروں کا تلمیحاً ذکر ہے قمر، زہرہ، مشتری، بہرام، خورشید مناسب الفاظ صرف کئے ہیں اور مادہ تاریخ وہی ۱۲۵۴ھ ہے ملاحظہ ہوں چند شعر ؎

محمد علی قبلۂ خسرواں　　چو افراخت ایں قصر آشیاں

تاریخ اول رقم کرد ماہ　　قمر گشت والا ز اول مکاں[1] الخ

غدر ۱۸۵۷ء میں جو لوگ کاکوری کی طرف بھاگ گئے تھے ان کی واپسی پر بے گھروں نے ست کھنڈہ میں قیام کیا تھا اور تاریخی واقعہ ہے کہ کہیں جگہ نہ تھی ست کھنڈہ کو رصدخانہ قرار دینے پر ہم مجبور ہوتے ہیں اور اتنی بڑی عمارت کا نیست و نابود ہونا تاریخ میں نہیں ہے۔

اس حلقہ کے مشہور لوگ :۔ طومار میں محلہ حسین آباد اور دولت خانہ کا عنوان قائم کرکے حسب ذیل لوگوں کے نام ہیں۔ نواب اشرف الدولہ، نواب منجھو صاحب، آغا مرزا صاحب، سلطان صاحب، میر سید علی صاحب، حاجی جعفر علی صاحب۔

---

[1] احسن التواریخ ص۱۱

امامباڑہ عظیم اللہ خاں

شریف منزل اور احاطہ مرزا علی خاں سے متصل عقب حسین آباد تھا اور مجھے حالت اس قدر شکستہ ملی کہ اس کے آثار قدیم پر کوئی بحث نہیں ہو سکی بظاہر عمارت وسیع طویل و عریض تھی۔ انہدام سے پہلے دیکھنے کے قابل ہوتی۔ تاریخ میں ذکر ہے۔ اس امامباڑہ میں لکھنؤ کے مشہور پیراک خلیفہ رضا حسین رہتے تھے یہی عمارت کے آخری منتظم اور قابض تھے ورثہ میں تقسیم ہو کر اس کی حیثیت بگڑی خلیفہ صاحب اور ان کی اہلیہ اسی امامباڑہ میں دفن ہیں خلیفہ صاحب دریا میں پیرنے کے بہت بڑے مشاق تھے دراز قامت تنومند اور مضبوط اعضا رکھتے تھے۔ مختلف قسم کی پیراکی میں استاد مانے جاتے تھے نام کے ساتھ خلیفہ کا لقب اسی سے موجود ہے کہ والد ماجد میر صفدر علی نے اپنے تمام کمالات فن ان کو حاصل کیا تھا جب مجلس میں آجاتے تھے تو ان کے ہم سن مزاح میں کہتے تھے کہ "تیرا کی ڈھونڈتا ہے" پیراکی میں ان سے بہتر کوئی نہ تھا اور حساب کے بہت بڑے ماہر تھے ملاقی ایسی لگاتے تھے کہ پانی پر کھڑے ہو جاتے تھے ایک مرتبہ پتھری والے تالاب میں کودے ہو کر مگر ملا تے اور نواب باقر علی خاں رئیس ستی محل نے ان کے کمالات بچشم خود دیکھے آخر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔

طوطے اڑانا:- میر محمد علی عہد محمد علی شاہ میں تھے انہوں نے طوطوں سے سونے کا کام لیا اور بڑا کمال حاصل کیا طوطا پھرتیلے دماغ کا جانور ہوتا ہے وہ پنجرے سے نکلتے ہی اڑ جاتا ہے لیکن صاحب میر صاحب نے کون سا افسون دم کر دیا تھا کہ طوطے کی فطرت بدل دی تھی یہ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے اور کیا مجال تھی کہ میر صاحب سیٹی بجا کر آواز کریں اور وہ آسمان سے اتر کر سیدھے پنجرے میں نہ جائیں میر صاحب روز حسین آباد میں آکر طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے اردو میں طوطا چشم بے وفا آدمی کو کہتے ہیں۔ طوطے کی موت پر شعرا نے تاریخیں بھی نظم کیں ؎

یہاں طوطو ذاکر حق تھے — رات دن نام حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آدبا — مضطرب ہو کے اور گھبرا کے
چونچ میں دانۂ تسبیح لیا — کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے ۱۲۸ ھ

حسین آباد کے شہدے:- میر کلو کے شہدوں کے علاوہ حسین آباد میں بھی شہدوں کی ایک پارٹی تھی اور وہ نسبتاً شرافت پسند اور عزادار تھے عہد شاہی سے ان کے یہاں مجلسیں ہوتی چلی آرہی تھیں وہ شہر کے ہر حصے سے واقف تھے ایک سال نوین مجلس میں میر محمد شاہ محدث سے پڑھنے کا وعدہ ہوا اور وہ وقت پر نہ پہونچے اس وعدہ کی کوئی اہمیت محسوس نہ ہوئی مجلس تیار اور ذاکر ندارد بعض تیز طبع سامعین طعنہ زن ہوئے کہ ذاکر کہاں ہے مجمع پراگندہ ہو جاتا ہے پورا گروہ اس غیر حاضری پر ناک بھوں چڑھائے تھا اور شہدوں کی عزت خاک میں مل رہی تھی یکایک ان میں کا ایک تنومند اور چالاک شہدا وعدہ کر کے روانہ ہوا میں ابھی لاتا ہوں محمد شاہ گھر پر احباب میں بے تکلف بیٹھے تھے شہدے نے مجلس میں نہ پہونچنے کی سخت شکایت کرتے ہوئے جھنجھلا کر اٹھا لیا اور گردن پر سوار کر کے دوڑتا ہوا حسین آباد روانہ ہوا کاس سے حسین آباد تک ہر راہگیر نے یہ منظر دیکھا میر محمد شاہ خود دوہرے بدن کے ہوتے تھے شہدے پر سوار چلے جا رہے ہیں شہدے کی طاقت کی ہر سمت تعریف اور مہذب طبقہ گستاخی پر انگشت بدنداں تھے

بقیہ جاری

شائقین مجلس راستے ساتھ ہوگئے اور وہ مجلس میں اس ہیئت کذائی سے پہونچے۔ شہوا مجمع کو چیرتا ہوا صدر مجلس تک آیا اور منبر پر بٹھا دیا۔ اہل مجلس میں جو جوش پیدا ہوا وہ صرف حاضرین سمجھ سکے ناممکن ہے کہ ان کا ایسا قادر الکلام اس طرح کی آمد رکھ کر ذکر مصائب فی البدیہہ کہا ہو گا مگر ترجمان کون ہے میر محمد شاہ ایسا پڑھتے جیسا کسی سرمایہ دار کے یہاں بھی نہ پڑھتے تھے۔ حسین آباد کے شہدوں کی سالانہ مجلس میرے زمانے میں ۱۶ ربیع الاول صفر کے دن کو ہوا کرتی تھی بدنصیبی سے مجھے کبھی شرکت کا اتفاق نہیں ہوا۔

میر محمد شاہ کے تالیفات میں غایۃ الشعور فی اثبات الحق المرور ہے جو ۱۲۳۸ھ میں کلکتہ میں طبع ہوئی پھر منشی نولکشور نے ۱۲۹۰ھ میں لکھنؤ سے ۳۴۴ صفحات میں شائع کی۔

ستو بوری

مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا عہد شاہی کے ناکوں میں محلہ ستو بوری میں رہتے تھے ایک دوسرے تلوریئے اور ان سے تلوار چلی انہوں نے تلوار ماری اس نے سینے پر روکی اور تعریف کی کہ تمہاں استادیہ مثل ہاتھ پڑا اس نے بھرپور ہاتھ مارا انہوں نے بھی سینے پر روکا اور اس کے بھی ہاتھ کی تعریف کی کہ نہایت کاری ہاتھ پڑا ہے۔ اسی طرح دیر تک تلوار چلتی رہی مرزا نے اتنے ہاتھ روکے کہ تلواروں کے نشان کی ہیکل بن گئی لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا اس دن سے مرزا صاحب کٹیا کٹیا کے نام سے مشہور ہوگئے۔

ممتن خاں۔ وہ عہد واحدی میں اس محلہ میں رہتے تھے اور گھوڑا نکالنے میں مشتاق تھے شیخ امیر علی مشہور کامل الفن کے شاگرد تھے غدر کے بعد برسوں زندہ رہے پھر مر گئے۔[۱]

شیش محل

لکھنؤ کی پہلی بنیاد اور شہر کی داغ بیل کا نقش اول اور وہ جگہ جہاں نواب آصف الدولہ بہادر کے خیمے ڈیرے نصب ہوتے تھے اور بیڈا ڈیں مدتوں قیام فرمایا اور سجدہ ملا بین کی تحریک سے مارکاہ خاقانی نے عمارتی صورت اختیار کی تو اس کا نام شیث محل قرار پایا جو کثرت استعمال اور تبدیل ہیئت سے شیش محل ہوگیا نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ مخزن ماتی علم پرور تھے اور مذہبی جادہ سے قدم نہیں ہٹاتے تھے ہر کام پر مذہبی کا تئوس دیتے تھے اور نام رکھنے میں بنا یہ تھا کہ حب دنیا کی پہلی بستی قابیل کے ہاتھ سے قتل ہوئی یعنی ہابیل کو بھائی نے مار ڈالا تو نسل انسانی قابیل کے معدوم ہونے کے بعد شیث سے قائم ہوئی اور ان کو شاہد شیش کہا گیا۔ واقعات سے باخبر طبقے کے لئے اس سے بہتر فال نیک نہ تھی کہ وہ پہلی بنیاد کا نام شیث محل رکھیں فتح پور سیکری کی بھی پہلی بستی کا نام اکبر کے دور میں آدم پور اور شیث پور رکھا گیا تھا[۲] حقیقت سے بے خبر لوگوں نے اس نام کی عمارت کو اپنی دہنیت سے مطابق ہر سمت شیشے جڑ کے دیواروں کو اپنے نزدیک شیش محل بنایا حالانکہ وہ شیشوں سے آراستہ ہونے کے پہلے ہی شیث محل تھا۔

فلک بنا ہے طبعی میں آبلہ دل کا — حباب شیش محل ہے دو مرلہ دل کا

شیش محل میں کیا تھا؟ اس کی صحیح نقشہ کشی اب ممکن نہیں ہے اور دور اول کا نقش کہیں کہیں مٹا ہوا باقی ہے۔

شیش محل کا پھاٹک عظیم الشان اور دور رفتہ کی مکمل تصویر ہے وسعت، بلندی، قدامت در و دیوار سے واضح ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کی پہلی بنیاد اسی کو ہونا چاہئے۔ دروازہ کے بعد محلسرائے آصف الدولہ شروع ہوتی ہے جس کا پہلا حصہ یعنی

---

[۱] قدیم ہنر ص۱۳ [۲] قدیم ہنر ص۱۸۱ [۳] آثار اکبری ص۵

[illegible]کان کرہ دروازے کے محاذ میں تھا محراب کھنڈر کی صورت میں ہے بائیں ہاتھ پر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں نواب نمازیں پڑھتے تھے سنگی عمارت ہونے سے اس پر شکستگی کے آثار طاری نہیں ہوئے۔ اہل محلہ نماز پڑھتے ہیں اور خانۂ خدا آباد ہے۔ بائیں ہاتھ پر [illegible] قصر ہے جس کے لمبے دالان، اونچی کرسی، بلند چھتیں موٹے موٹے کھمبے پانے کے گھیر یہ حصہ سلیقہ شعار رہنے والوں کی توجہ اور شکست و ریخت کا انتظام وقتاً فوقتاً ہوتے رہنے سے ٹھیک حالت میں ہے محراب اور شہ نشین دربار کی جگہ، زنانہ حصہ سب مکیں اسی وقت کی بنیادیں اور رقبہ بہت بڑا ہے۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں نواب مداحسن جو پہلے بہت مشہور تھے نواب شیش محل کا ایک معمر ملازم تھا سانولا رنگ گول چہرہ چیچک رو، دانت گر گئے تھے اس لئے ہونٹ اندر کو دھنسے رہتے تھے اس پر نواب مدا کی لمبی ڈاڑھی جو بٹ دے الو کی بھتی کبھی اور ایسی کبھی کہ دھوئے دھوئے نہ چھوٹی۔

__چاندی والی بارہ دری__ ۔ رقبہ شیش محل کا وہ حصہ ہے جو اب اجاڑ ہے۔ یہ عمارت بھی کھنڈر ہونے والی ہے جونی سربلند دیوار دو رہے نظر آتی ہے اور عربی در رہ باقی ہے کہا جاتا ہے کہ اس پوری عمارت پر چاندی منڈھی ہوئی تھی درمیان بھرا اور چھت اور دیواروں پر استہ کاری کا نام کو بھی باقی نہیں ہے جونی وسطانی چھجیوں میں چھت اصلی حال پر باقی ہے۔ رنگین گل بوٹے خوشنما بیلیں شوخ رنگ مٹتے گلکاری اور جڑے ہوئے شیشوں کی چمک گزشتہ آرائش پر اب تک گواہ ہے۔ یہاں سے تالاب تک کبھی چمن پرستا ہوگا اب کھیت ہیں اور بیلوں کا گوبر۔

__تالاب__ ۔ بہت چوڑا چکلا ہے اور پانی زیادہ سے زیادہ اب بھی موجود ہے گرد کی عمارت تو اب باقی نہیں دست چپ کی طرف کچھ حصہ اس کا دروں کی صورت میں دھنسا ہوا موجود ہے

__مہتاب باغ__ ۔ قدیم شیش محل کا خوشنما باغ جو مرقومہ عمارات کے عقب میں واقع ہے اور جہاں تک اس باغ کے بڑی خراب حالت میں اب بھی باقی ہیں پچاس برس پہلے باغ اچھی حالت میں تھا ابتدا انگریزی میں جب کلاں کوٹھی کے سامنے قواعد ہوتی تھی مردودوں کے جمعدار اور گول اندازوں سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا پتھر اور ڈھیلے ڈھیلوں سے چلتے رہے سو گول انداز بھاگ کھڑے ہوئے اس واقعہ کے بعد سارجنٹ نے مہتاب باغ میں قواعد شروع کی باغ اب ویران ہے۔

شیش محل میں ایک شخص رہتے تھے جو جانوروں کی بولیاں بولتے تھے تیتر، تیتر، مور، مرغ، کتا، بلی کی صدائیں ان کی مشق کردہ آوازیں تھیں ابھی چند سال پہلے تک تھے۔

__گیند خانہ__ ۔ شمالی رخ پر ایک فلک نما دیوار ہے جس کے پہلوؤں میں بجائے برابر کی دیوار کے ڈھال دیوار ہے وسطی جدار کے اعلیٰ حصے سے بلند اور آخر میں دونوں طرف سے زمین دوز ہے۔ استر کاری کی سیاہی پرانے کام کی پختگی اور مضبوطی اور سیکڑوں برس کی بارشوں کے بعد بھی باقی ہے یہاں نواب گیند کھیلتے تھے بعض لوگ اس عمارت کو گیند خانہ کے بجائے چاندماری کہتے ہیں۔

__سبحان خاں کا اکھاڑہ__ : شیش محل میں یہ اکھاڑہ بھی قدیم ورزش کی جگہ تھا مشہور پہلوان استاد سکندر اسی اکھاڑے کے جمعدار جوان تھے رشیدی فضل علی ان کے شاگرد تھے۔

[illegible] اخبار علم و اکتوبر [illegible]

موتی مسجد:۔ شیش محل کے تالاب سے کچھ دور جاکر سامنے بلندی پر یہ عظیم الشان مسجد واقع ہے اور صرف ایک بلند چھت کا دالان ہے۔ اس کی سقف سے شہر کا دیہاتی حصہ اور دور دور نگاہ پہونچتی ہے۔ اس مسجد کے روکار کی صورت یہ ہے سنگ مرمر تھا۔ مگر کسی دست درازی نے نکال لیا اس مسجد میں دو بغلی محرابیں خاص طور سے دیدہ زیب ہیں مسجد میں جانیوالے در تو تین ہی ہیں مگر بیچ میں چھوٹے دو در فراردے کر پانچ دروازے بنائے ہیں گنبد اور میناروں کے کلس غائب ہیں مسجد سے قریب باغ ہے جس میں کچھ پرانی قبریں ہیں ایک کمرہ قیامگاہ کا بڑی خوبصورتی سے نکالا ہے جوکہ سقف مسجد سے آکر ملتا ہے اس مسجد کے مینار پچے پل سے دکھائی دیتے ہیں محراب اس نمونے کی ہے۔



(نوٹ) شیش محل غدر کے بعد سے نواب جعفر علی خاں اور نواب باقر علی خاں صاحبان کے مورث اعلیٰ کے قبضے میں آیا۔ یہ حضرات پہلے چار باغ میں سکونت پذیر تھے جب چار باغ اسٹیشن کی پہلی تعمیر انگریزی دور میں شروع ہوئی تو وہاں سے ہٹاکر شیش محل پر قبضہ ملا اور اس وقت نواب صاحب شیش محل انھیں دو مقتدر رئیسوں کی اولاد اور کنبہ کے لوگ کہلاتے ہیں نوری باغ والے نواب باقر علی خاں صاحب مرحوم کے وقت تک تھی یہ شہر کے امیر کبیر تھے۔

(اطلاع) اب ہم آگے بڑھنے کے بجائے پہلو کے محلوں پر موجود ہوئے ہیں ان پر انشاء اللہ کامل بحث کے بعد پھر اس طرف گذریں گے اور موہن کے پور وا پر اس بات کو ختم کریں گے۔

شیخ حیدر بخش:۔ عہد سلطان عالم کا باورچی تھا جو ۱۳۰۹ھ[۱] میں مرگیا۔ بیانوے سال کے قریب اس کی عمر تھی نواب محمد باقر علی خاں بہادر رئیس شیش محل کا ملازم تھا۔ ایک بار نواب مرحوم نے نواب سید میاں حسین خاں صاحب عاہ کو دو خوان کھانے کے بھیجے تھے جس میں سارا کھانا مونگ کی دال کا تھا رو. یاروی کا سالن پراٹھے کباب پلاؤ وغیرہ یہ سب حیدر بخش نے مونگ کا پکایا تھا حیدر بخش انار پلاؤ اور شرلیہ پلاؤ پکاتا تھا اگر اصلی انار دانوں اور شہتوتوں میں ملاکر اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا شرلیہ اور انار رکھ دیجئے تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا کئی بار اس کا امتحان ہو چکا ہے حیدر بخش تین سو ساٹھ[۲] قسم کی روٹی پکانا جانتا تھا۔ ہاتھی کان روٹی ایسی پکاتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کا کان کتر رکھا ہے۔ رہا یہ تو کسی قسم کی گرانی نہیں۔ حیدر بخش تنکی بے مثل پکاتا تھا ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ جاتی تھی بیسے جو ذاس کے ہاتھ کی مکی مس کے ساتھ کھائی ہے۔

شیخ محمد علی:۔ عہد نصیر الدین حیدر کا خیاط تھا اور اپنے کمالات[۳] میں ممتاز تھا سعادت گنج کا رہنے والا تھا شیخ الٰہی بخش اس کے سگے بھائی تھے۔ محمد علی کا یہ کمال تھا کہ پورا انگرکھا ایک تاگے سے سیتا تھا اگر تاگے کو پکڑ کر کھینچ لو تو پورا انگرکھا کھل جائے۔ محمد علی ایسا بھی سیتا تھا کہ کاندھوں یا بغلوں میں جوڑ نہیں ہوتا تھا۔ آغا سید مجتبیٰ حسین خاں صاحب رئیس نے جو شیش محل کے رہنے والے ہیں اس کے ہاتھ کے انگرکھے پہنے تھے۔ محمد علی کے مقابلے کے لئے ایک درزی فیض آباد سے آیا اور چار طرح سے بکا پیجامہ سی کر دکھایا محمد علی نے (چوڑی مہری کا) سات طرح سے تیار کیا وہ استادی کو مان گیا محمد علی سرداری بھی بے مثل سیتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی سی ہوئی سرداریاں سید مجتبیٰ حسین خاں پہنا کرتے تھے۔ اس کے ہاتھ کی سرداری نواب سید محمد حسین خاں عرف چھاجو صاحب کے پاس ہونا چاہئے۔ محمد علی کا نواب جعفر علی خاں صاحب رئیس شیش محل اور آغا سید مجتبیٰ حسین

---

[۱] قدیم بہر ص۱۳۵ [۲] قدیم بہر ص۱۶۱

خاں شیش محل سے مرتے دم تک توسل رہا۔ ۱۳۲۹ھ میں لاولد کچھ کم سو برس کا فوت ہوا۔

سرائے معالی خاں

اس محلہ کو عہد برہان الملک کے سردار نے آباد کیا اور اس قدر معزز لوگ یہاں آکر بسے کہ ان کے ذاتی کمالات اوصاف زندگی کے کارنامے اب تک تاریخوں میں موجود ہیں اور وہ عمارتیں جو انقلاب زمانہ نے باقی نہیں رکھیں اور جو سوز گرتی ہوئی حالت میں باقی ہیں تاریخی یادگار ہیں اس محلہ کے حدود میس والی گلی سے شروع ہو کر کاکوری روڈ سے مل کر ختم ہوتے تھے۔ اس سڑک کا نام انگریزوں کے زمانے میں — ... اسٹریٹ تھا۔ سڑک کے لاتعداد امرا و رؤسا کی ڈیوڑھیاں ریتی کے ... برکردیں

<u>مکان منصف الدولہ بہادر</u>: ... نام نامی سید محمد با خطاب منصف الدولہ شریف الملک تھا۔ آپ سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر والزماں کے بڑے بیٹے بیاہتا بیوی سے تھے۔ مہدی گنج کی کربلا آپ ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ سلطنت اودھ میں خاص خصوصیات کے حامل تھے اور آخر عمر تک پختہ مکان نہیں بنوایا کھپریل میں زندگی بسر کرتے تھے امرا و رؤسا اور اعیان شہر کی عورتیں وابستہ رہتی تھیں اور کوئی دولہا اور ملک ... تھا جو یہاں حاضر نہ ہو سکا ہو مگر منصف الدولہ کی قیامگاہ ہر شخص نے ایک رنگ پر دیکھی ان کی رحلت کے بعد ان کے بیٹے سید محمد جعفر امید آخر تک باپ کی قیامگاہ میں رہے یہاں تک کہ ... کے بعد یہ مکان سڑک میں شامل ہو کر منہدم ہو گیا۔ منصف الدولہ مؤلف کی دادی صاحبہ مرحومہ کے نانا تھے اس لیے ... ان کی زبان پر یہ جملہ آتا تھا کہ ہم سرائے معالی خاں کے رہنے والے ہیں اور سڑک نکلنے پر یہ جا قیام شاہراہ عام ہو گئی سید محمد کاظم جاوید خلف امید کے بعد انتقال اس مکان کی نشان دہی کرنے والا کوئی نہ رہا۔

منصف الدولہ نے ساٹھ برس کی عمر میں فقیرانہ زندگی بسر کرکے اس دنیائے فانی کو چھوڑا۔ ان کی داد و دہش و ... کی حکایتیں اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ معالی خاں کی سرائے سے مہدی گنج تک ضریح کے ساتھ سونے چاندی کے پھول لٹے ہوئے چلتے تھے اس مکان کے ایک مشاعرے کا ذکر تاریخ سے واضح ہوتا ہے جس میں بانی مشاعرہ کی شخصیت سے مفتی میر ... صاحب ایسے محتسب کمال نے شرکت کی ... وہ بیت محراب و منبر تھے نہ کہ مشاعروں میں زندگی بسر کرنے والے امید آئے ... اجتہاد کا رکن ہونے سے مفتی علام نے تعظیم کی عرض کیا۔ آج میرے یہاں مشاعرہ ہے آپ کو بھی زحمت دوں کا مفتی صاحب ... ہنس کر فرمایا کہ مشاعرے میں میرا کیا کام، انہوں نے اصرار کیا راضی ہو گئے اور تشریف لے گئے شیخ ناسخ کی مشہور طرح تھی "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا" کنول گردش کرتا ہوا مفتی صاحب کے سامنے آیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ حضور بھی کچھ پڑھیں چند شعر جو وہیں بیٹھے بیٹھے نظم کر لئے تھے پڑھ دئے مشاعرہ الٹ گیا۔ عزیز لکھنوی فرماتے ہیں کہ ایک شعر اب تک لوگوں کو یاد ہے ؎

مریں گے صبح تک امیدوار وصل اے گردوں ابھی سے ابتی کیوں پیر بن ہے شام ہجراں کا

امید نے مرثیے بھی کہے اور ان کے ایک مشہور مرثیے کا یہ مطلع تھا ع "ذکر ثنائے مشہد ذی احترام ہے"۔ امید صاحب دیوان تھے ان کا ایک شعر یہ ہے ؎

سلہ ... سلہ تجلیات ص۲۹۵

طالب اوج نہ ہو مثل فلک او مسعود   کہیں تجھ میں بھی نہ بیداد گری آجائے

آپ نے ۲۴ ربیع الآخر ۱۲۹۳ھ میں سفر آخرت کیا اور امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے قبر پر سنگ مزار ہے قطعہ تاریخ آشکار ہے جو آپ مہدی گنج کی کربلا کے ذیل میں پڑھ چکے۔

منتظم الدولہ کے کتب خانہ کا ذکر تشییدالمطاعن[1] مشہور مناظرہ کی کتاب میں ہے۔ مخفی نماند کہ از نسخہ کنزالعمال کہ نیمہ آن در کتب خانہ فضائل مآب فواضل ایاب سید محمد باقر کحل سلطان العلماء ادام اللہ ایامہا ست و نیمہ ثانی آن از خزانہ کتب سلطان الحکماء مرزا علی حسن دام مجدہ کہ ص ماکت بہ ار نسخہ مصحف مقابلہ شدہ پیش نظر حقیر حاضر بود۔

امام باڑہ زین العابدین خاں۔ آپ میاں الماس کے معتمد اور کوٹھی والے کے نام سے لکھنؤ میں مشہور رہتے اور عہد آصفی کے دونوں سرمایہ دار تھے حق کی یاد کا جو جو دست برد کسے عدو دا اماماڑہ میں تعمیر پیدا کیا اور امتداد زمانہ کے چھتوں کو باقی نہ رکھا کہ لق و دق دیوار در امام باڑہ میں کچھ نہیں ہے۔ امام باڑہ سطح پر کھنڈر کی صورت میں واقع ہے درمیان میں سڑک ہے دوسرے جنوب کی طرف کنواں ہے سن رسیدہ لوگوں نے بیان دیا ہے کہ امام باڑہ کی عمارت اور صحن کنویں تک تھا اور چاہ جزو امام باڑہ ہے۔

اس عمارت پر خط نسخ کے کتبے باقی ہیں جو لکھنؤ کی دوسری کربلاؤں کی طرح آیات قرآن یا فقرات زیارت کی صورت میں اس زمانے کی خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

میر صاحب موصوف کا ایک امام باڑہ و مسجد دریا کنارے مقام نیپور میں بھی ہے جو ۱۲۰۷ھ کی تعمیر ہے اور جعفر گنج کی مسجد کا سن تعمیر ۱۲۰۰ھ ہے۔ رفیقہ حیات کا نام مہدی بیگم تھا جو شوہر کی جائداد سے تیرہ لاکھ روپے کی مالک تھیں خدا نے ان کے بطن سے تین بیٹے اور بیٹیاں بھی مرحمت کی تھیں سید کاظم میر ہادی علی باقر علی ان کی اولاد کے نام ہیں شعبان ۱۲۱۹ھ میں آپ نے رحلت کی جیسا کہ اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے سے

چون وفات میر زین العابدین	خلق را از درد و صدمہ شد قلق
ماہ شعبان نودہم یوم الخمیس	کرد غمش گردید خاکم سینہ شق
سال تاریخش نوشتن خواستم	از سواد خامہ غم بر ورق
گفت ہاتف با دو حرف حزن دل	گشت زین العابدین واصل بحق

اور دو حروف شامل کرکے ۱۲۱۹ھ ہوتے ہیں۔

ایک نامعلوم حقیقت :۔ پتا در محلہ گل باد شاہ میں ایک امام باڑہ ہے جس کی تولیت سید واجد علی شاہ کربلائی کی ذات سے وابستہ ہے موصوف بیان کرتے ہیں کہ ہمارا آبائی وطن سرائے معالی خاں لکھنؤ تھا ہمارے والد سید مظفر علی شاہ ابن سید علی خاں ابن سید احمد خاں خاندان آغا میر جعفر کمانڈر سے تھے جو عہد برٹش میں اعلیٰ فوجی خدمات انجام دیتے تھے اور پشاور ان کا ہیڈ کوارٹر تھا پشاور میں انھوں نے امام باڑہ حسین آباد تعمیر کیا جو وہاں کے مشہور عزا خانوں میں ہے۔ موصوف لکھنؤ سے ہجرت کے وقت

---

[1] تشییدالمطاعن مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۸۱ھ

وہاں کے امام باڑہ سے شامیانہ، علم، اور سنگی حوض بطور یادگار لیتے آئے اور یہ چیزیں اب بھی پشاور کے امام باڑہ میں [illegible] بھی موجود ہیں۔

امتداد زمانہ سے ناقل کو لکھنؤ کی امام باڑہ کا نام محفوظ نہیں رہا محلہ یاد ہے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ امام باڑہ ریاض خان کے آثار قدیمہ میں آگیا۔ مؤلف کے قیام پشاور کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی میں اس عمارت کو دیکھ نہیں سکا۔

رانی کا کٹرہ:۔ معالی خاں کی سرائے کا وہ حصہ جو چوپٹیوں سے گذر کر دست چپ کی طرف واقع ہے عہد شاہی میں یہاں مطبع محمدی تھا جس کی خصوصیات لیے ہم صدر مطابع کے ایسے تھے وصیت نامہ نقاش کرسی پریس کا چھپا ہوا میرے دیکھنے میں آیا ہے جس کا سنہ طبع [illegible] بہترین کتابت کا نمونہ ہے۔

کالی چرن مختار:۔ آپ نواب [illegible] نواب علی نقی خاں کے مختار تھے اور اس سرکار سے کئی لاکھ روپے کی حیثیت حاصل تھی اور [illegible] علم نواز [illegible] کا شوق تھا اور [illegible] تمام سرمایہ صرف کر کے انگریزی اسکول بنا دیا جو اس وقت کالی چرن ہائی اسکول کے نام سے باقی ہے یہ [illegible] اسٹریٹ کے شمالی طرف حقیقت اسکول کا [illegible] جہاں کچھ گرے ہوئے مندر اور ٹوٹی ہوئی عمارتیں [illegible] معلوم ہوتی ہیں جو عہد قدیم کا ایک ساخت میں [illegible] ہوا کرتا ہے اس اسکول کی بنیاد [illegible] سیکڑوں [illegible] شامل ہو گئے۔

قبر خواجہ حیدر علی آتش:۔ [illegible] کا مکان تھا جو میرے جمعہ اور لکھنؤ کی پرانی تہذیب کے نمونہ تھے ان کے مکان سے [illegible] آتش کی قبر [illegible] کالی چرن اسکول کا نام [illegible] رسیدہ لوگوں کی زبان پر آتا ہے اور بعض بوڑھے یہاں [illegible] کے مکان کا پتہ [illegible] کے ساتھ [illegible] کے صحن کا بھی ذکر کرتے ہیں اور جو بڑھی قبر ہے وہ آتش کی ہے۔

خواجہ اپنے رنگ میں یکتا تھے ان کے کمالات [illegible] میں کہتے ہیں ؎

یار را روہیں مرے حیراں ہیں سا کر وتسواں | کس قلم کا قطعہ ہے یہ کاتب تقدیر کا

رنگ تغزل ملاحظہ ہو ؎

رنگ کی دھانی ہے جو مسی کی دھڑی | شام تو دیکھی شفق کو بھی دکھانا چاہئے

یہ مشہور شعر بھی آتش کا ہے ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب | زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ملے ہو [illegible] آتش | [illegible] کام نہیں

سامنا اپنا کسی جنگل میں ہو گا موت سے | یاں کفن کے چور کا حصہ [illegible] میں

کلیات آتش نول کشور پریس کانپور میں تقطیع ۲۲ × ۲۹ سنہ ۱۸۷۳ء میں طبع ہوا دونوں حصہ ۲۵۵ صفحات پر ختم ہوئے ہیں۔ میر انیس کے پڑھنے کی عشق گنج میں مجلس اور مکان بانی مجلس کا کھچا کھچ بھرا ہوا شروع کا وقت گذر گیا مگر انیس زینت منبر نہیں [illegible] حاضرین دم بخود ہیں سامعین پر ایک سکوت چھایا ہوا ہے [illegible] رات کیا ہے، عہد شاہی کی مجلسیں تو عموماً وقت پر شروع

جو تقی تھیں انہیں موجود تھی ہیں بڑے انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ آتش آنے والے ہیں ان کی ہیئت کذائی دیکھتے ہی نظریں اٹھ گئیں دو رضا خان بکمال نے ہاتھوں ہاتھ اس آزاد شاعر کو قریب منبر پہونچایا سارے مجمع کی نگاہیں آتش کی طرف ہیں کہ وہ کس مقام پر ... بیٹھتے ہیں انہیں ایسا خود دار انسان بھی ان کا احترام کرتا تھا۔

آتش گورے چٹے وجیہ چھریرا بدن بدانہ وضع کے آدمی تھے آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے پر پٹے جو اس زمانے کے بانکوں کی وضع تھی ہمیشہ سیدھی دورخی تلوار باندھتے تھے۔ ایک دوسرا بیان ہے کہ آتش گیروی تہمد باندھے ہوئے نظر آئے۔ ڈنڈا کبھی ہاتھ میں رہتا تھا جس میں سونے کا چھلا پڑا رہتا تھا جب دوسرا تیسرا فاقہ ہوتا تھا وہ چھلا رہن کر کے فاقہ کشی ہوتی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے دو اپنے مکان میں دفن ہیں اور ۱۲۶۳ھ میں آتش نے قوم کو داغ فراق دیا کچھ تعجب نہیں کہ کالی جی اسکول کے قدم آسامنے ان کا مکان ہوا اور انقلابات دنیا کے بعد قبر مسجد کے قریب معلوم ہوتی ہو۔ واقعہ نگاروں نے جب آتش کے مکان پر بحث کی ہے تو دو سال بھی مقام قبر کو علیحدہ ثابت نہیں کرتا آتش کا مکان کہاں تھا؟ لوار گنج سے قریب چوپٹیوں سے آگے بازار جھاؤ لال کی چڑھائی ہے وہاں سے آثار میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا آتش اس کے قریب کچے مکان میں رہتے تھے یہ مکان آتش نے خرید لیا تھا منشی امیر اللہ تسلیم نے جب آتش کو دیکھا تو ان کی عمر ستر کی تھی ایک بالشت سے زیادہ لانبی داڑھی تھی اور مہندی کا خضاب کرتے تھے لنگوٹ باندھے ہوئے ایک ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے کھٹولے کے قریب دو تین کرنل کی بنائیاں کبھی رہتی تھیں صد افسوس کہ یہ مکان رہا اور نہ کہیں سے

سرگرم عریاں کچھ نہ پوچھو حال دل آتش ۔۔۔ زمانہ جن کو بھولا ہے ہم ان کو یاد کرتے ہیں

امام باڑہ الماس: نواب الماس علی خاں تحسین علی خاں ناظر کے ہمعصر اور نوابی کے زمانہ کے خواجہ سراؤں میں تھے معالی خاں کی سرائے میں ان کا امام باڑہ زیادہ سے زیادہ زمین گھیرے ہوئے ہے۔ عہد شاہی کی اینٹ نہیں کہیں اس تنگ گلیوں میں فرش زمین دو صورت میں ہے جس کو لکھوری یا ککیا کی اینٹ کہتے تھے الماس علی خاں نے عمارت کے عمدہ تیار ہونے کے لئے بڑی اینٹ کا ان کے دماغ میں کچھ تصور تھا اگرچہ یہ اینٹ لکھوری کے مقابل میں پائدار ثابت نہیں ہوئی مگر مکانات جلدی تیار ہوئے تھے امام باڑہ الماس میں یہی اینٹ استعمال ہوئی۔ اس عمارت کے عرض عرصے آصف الدولہ کے امام باڑہ کی ڈیوڑھی سے ممتاز عظیم الشان پھاٹک اور وسیع صحن جس کے پہلوؤں میں جو عمارت تھی اس کا موجودہ حالت میں تصور نہیں ہو سکتا بلند دروازے سے سمت راست پر وسیع اور عالیشان مسجد ہے جس کے در و دیوار کی خوبصورتی محرابوں کی گنبدوں میں کاریگری میناروں کی استقامت دیکھنے کے قابل ہے کاکوری روڈ نے سڑک اور قدیم راہ کو غیر معمولی بلند کردیا اور پہلو سے مسجد پر نظر کرنے میں خانہ خدا کے تمام محاسن سڑک سے گذرنے والا دیکھ سکتا ہے زیر مسجد دوکانات یا کوٹھڑیوں کا سلسلہ ہے جو غریب طبقے کے بسانے میں بانی مسجد کے زیر نظر بانی مسجد بھی دور دور سے دکھائی دیتی ہے اور غربی سمت کے ہر گوشے سے اس کا نظارہ ممکن ہے صحن مسجد میں حوض اور گرد عمارت ابھی باقی ہے افسوس ہے کہ امام باڑہ اس قدر کھنڈر ہو چکا ہے کہ اس میں بجز دیوار و در کچھ نہیں رہا پہلے پھاٹک کے بعد جو زینہ بطور دیوان خانہ ہے اس کو قطع کر کے دوسرا پھاٹک در صحن امام باڑہ شروع ہوتا ہے پہلو میں مکانات ہیں ان کی چھتیں بھی شق ہو چکیں مصالحہ نے ساتھ چھوڑ دیا ہے مگر مٹانے والے

موسیقی کے بجانے میں اب بھی ساتھ نہیں چھوڑتے اگرچہ ذاتی استعمال میں الماس علی خاں کے حصے رہتے اور تصرف سے محفوظ رہتے اپنے
آرام کے لئے مرمت کرتے رہتے تو ایک قلعہ تھا جو سیکڑوں آدمیوں کو پناہ دیتا۔

الماس علی خاں نے بڑے آرام کی زندگی بسر کی اور دوسرے صاحبان حاجت کو مالی مدد میں کبھی مدد نہیں کیا چنانچہ امرا و شہر
پٹھان کا لاکھوں روپیہ قرض چڑھا ہوا تھا جب مرنے کا وقت آیا تو تمام دستاویزات مسجد کے حوض میں ڈال دئے اور کہلا بھیجا
کہ میں نے سب کو بخش دیا۔ تو تم معاف کر دیئے۔ الماس کے امام باڑہ میں اس وقت دھول رہتی ہیں اور ٹوٹے ہوئے
دیوار و در تصویر انقلاب ہیں یادداشت لکھنؤ کی امیرزادیاں اور عام لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ دھوبن
حاجت کو کپڑے لے کر جائے اس کوشش کو بد سمجھتے ہیں اور دھوبن کو تمسان۔ ان میں اصلی کہتے ہیں

دھوبن ہے دیکھو ہم سے نا اصلی نے
کاٹے میری سی دیکھے مروڑ دی گیا

ثابت مرحوم نے میر مشرف کی مجلس کا اس محلہ میں ذکر کیا ہے جس سے رجحان ہوتا ہے کہ میر اس علاقے میں رہے ہوں گے

نواب کاظم حسین خاں:- آپ اولاد شجاع الدولہ سے تھے اور مرزا معالی خاں نے رہتے تھے۔ ذکر ہے عہد واجدی کا۔ تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ جانوروں کی تصویریں بہت عمدہ بناتے تھے اور کبوتر کی تصویر تو ایسی بناتے کہ کوئی نہ بنا سکتا تھا۔ مورخ کا بیان ہے کہ ۱۹۳۶ء تک ان کے ہاتھ کی تصویریں کاس میں رکھی تھیں تخمیناً ۱۹۲۶ء میں انہوں نے رحلت کی۔

قاری صاحب:- محلہ کے رہنے والوں میں وہ باکمال قاری ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ عہد شاہی میں ایک عرب لکھنؤ آئے اور ان کو تمام قاریوں کا امتحان منظور ہوا اور ہر ایک کی قرات سن کر کسی کی وقعت نظروں میں نہ ہوئی ان کے کمال کی بہت تعریفیں تھیں مشہور ہو چکے تھے ذات گرچہ بے قوت باقی۔ تھی پھر بھی مقابلے پر قرآن پڑھا اور وہ مقام جہاں حرمت میں کو ع سے ملایا گیا تھا ادا کیا عرب وجد میں آگیا قاری صاحب نے تینوں طریقوں سے پھر اس فقرے کو ادا کیا عرب مبہوت ہو گیا۔

لطیفہ:- عہد نصیر الدین حیدر میں ایک قاری آئے اور اپنے کمال پر اس قدر ناز تھا کہ ہر قاری کو طفل مکتب سمجھتے تھے۔ صرف منفعت میں انہوں نے یہ گنجائش نکالی کہ حرکات میں پڑھوں کا وہ صحیح ہے۔ متقدمین کے مخرج سے ادا ہوئے ہیں غلط ہے اور نکاح صحیح نہ ہونے کے بعد دلالت یہ ہے کہ صحیح نہ ہوگی جو کہ متھرا درسل تھیں کی مہمل حد سے اس قدر مالی فوائد ہوتے تھے جس کا آج تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قاری صاحب کا یہ عمل تھا جو دق سیم کہنے والوں کو انگشت بدنداں کئے تھا کسی بزم میں نصیر الدین حیدر کے ساتھ قاری صاحب گئے اور حاجت نے ان سے صرف اس قدر پوچھا کہ قاری صاحب آپ کی والدہ کا نکاح کس نے پڑھا تھا اس مطالبے کے ساتھ سارا لستہ ہرن ہو گیا اور یہ ان کی تعلی ختم ہو گئی۔

نواب آغا علی خاں:- آپ اسی محلہ میں رہتے تھے باوقار رئیس تھے جو سو روپے ماہوار وثیقہ تھا شعر و سخن میں... سکاہ کا ل

---

[1] تاریخ اودھ نجم الغنی ۵ ص ۴۶ [2] قدیم سر ۹

تھی مہرؔ تخلص تھا دیوان طبع ہو چکا ہے ان کی وضعداری تھی ... رمضان میں ہمیشہ مسجد تحسین پر روزہ افطار کرتے تھے دونوں وقت سے پہلے مسجد پہونچ جاتے تھے اور معاصرین بھی ساتھ ہوتے۔

امامباڑہ و مسجد منصف الدولہ بہادر۔ امامباڑہ امانی سے جوہریوں کی طرف جانے میں داہنی طرف واقع ہے امامباڑہ کے یہ آثار رہ گئے ہیں ان کے بارے میں مزید کوئی روایت نہیں ہے پچاس سال پہلے اس کے حدود تھے اب صرف مسجد بلندی پر واقع ہے جو اوسط درجہ کی اور مختصر ہے جس میں کچھ پرانی قبریں اس کی پائداری کا ثبوت دے رہی ہیں یہ مسجد امامباڑہ امانی کے سامنے اور امامباڑہ سے قریب واقع ہے عام لوگ نہیں جانتے ہیں۔ مسجد کس کی ہے سو برس سے پہلے کی تعمیر ہے مانی ... کی درویش کوئی نہیں ... ان ... رقبہ کے ... کا ... ہے۔

ختنو کا امامباڑہ اور مسجد۔ محمد ختنو کا عہد سعادت علی خاں میں پھول بتی ... آتش، کا کام ... تھا بڑے امامباڑہ ... امامباڑہ ... سے ... تھا ... سنہ ۱۲۵۰ھ تک ... ختنو کے تعزیہ میں روشن چوکی کا ذکر گرستہ لکھنؤ میں موجود ہے یہ تعزیہ ۲۲ صفر کو بڑی دھوم سے ... تھا ... ختنو کے ... کے بعد معتی گنج کے شیعہ مدت تک تعزیہ اٹھاتے رہے ... مسجد ... معالی خاں ... سنہ ۱۲۵۹ھ میں ختنو کا تعزیہ جس ... اٹھا اس کو لوگ ... تھے ...

... سنہ ۱۲۵۹ھ میں مکان ... کے قریب ایک مطبع تھا جس کو محمد حسین ... چلاتے تھے ... میں ... صورت ... محمد تقی صحیح تصحیح کیسر اور عبد الرحمن کا تب ... نستعلیق لکھنے والے کام ... تھے۔

ٹکسال کا چھتہ۔ ... عہد سعادت علی خاں میں ... اور روپیہ پیسہ اشرفی تمام سکے انھیں کی نگرانی میں ... تھے ... روپیہ اور ... سونے کی قیمت کے لحاظ سے اگر تیس روپیہ کو روپیہ کے برابر ... ہوا تو ... روپیہ ...

... اچھے صاحب ... میر ... نواب باقر علی خاں عرف ... صاحب مشتاق ... شاعر ... تھے جن کے ... شاگرد تھے ... میر ... علی ... شاگردوں میں اور سید صاحب مشق ... خوشنویسی اور ... کے ... تھے۔

سنہ ۱۸۵۶ء میں ... ایک اخبار سحر سامری آزادی کا حامی نکلتا تھا جس کے فائل علی گڑھ یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ ... کا نام ... سے واضح ہوتا ہے۔

... ریختہ قلم ... دوران سخن شناس زبان داں شاعر ... عالم باعمل منشی امیر احمد ... " آخر میں ... ... معالی خاں کے پاس ما لکش کے چھتے ... متصل ... کے اہتمام میں چھپا۔

... شیش محل ... کے پردہ کے راستے ... واقع ... محلہ ہے مسجدیں جا بجا ہیں جن میں سے ایک مسجد کی مرمت

... ... یادگار ... سنہ ۱۸۶۶ء ...

دوسرا مشہور محل یعنی نواب فخر جہاں بیگم نے کہ جو ایک دو منزلہ مکان ہے جس میں بڑے بڑے دالان مسجد کے پہلوؤں میں مینار ہو گئے حویلی اور مسجد ہو چکی ہے۔ دونوں میں صحن مسجد کے سامنے ہیں، دروازوں تک سے دو ، میں کر یہ مسجد اس کی خدمت ۔ ری کا کام ۔۔۔ اس عہد میں پیدا ہوا اس حلقہ ۔ سید العلماء یعنی الموسین سید علی نقی رہتے تھے جو علما کے استاد تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انگریزی دور میں جو ۔۔۔ میں ان کی ایک دکان ٹکسال مرچنٹ کی حیثیت سے تھی ان کے آخری امام شاگرد سید محمد رضی تھا۔ ۔ ان دنوں لکھنؤ ۔۔۔ ت رکھے مقیم ہیں اور موجودہ ادارہ ۔ ان ۔۔۔ موصوف نے اس سال گدی ۔۔۔ میں انتقال کیا۔

منشی گنج

یہ شہر کا وہ محلہ ہے جو صاحبان کمال کا مرکز اور متداول ۔ ۔ آبادی میں ۔۔ اور دنیا حاصل کرنا تھا ۔۔۔ حکیم مسیحی ، اکبر قال ، وکیل رئیس ، امیر غرض لکھنؤ کی ساری آبادی کا کھیل ہوا عطر اور مجموعہ یہاں تھا۔ اس محلہ کو ۔۔ نے آباد کیا جو بیانات تاریخ سے ثابت ہوتے ہیں وہ عقل کی کسوٹی پر ٹھیک نہیں اترتے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں سیٹھوں کو کھیں جوں اور دریا کا رستہ ہٹا۔ منشی گنج ۔۔۔ ان کی اولاد کی ۔۔۔ سرکاری عمارتیں بنائیں ۔۔۔ انھیں سیٹھوں نے مفتی علام حضرت تھے جن کے نام سے مفتی گنج موسوم ہوا اور مفتی کی ۔۔۔ محلہ میں اب تک موجود ہے ۔۔۔ کہتے ہیں۔ ۔۔۔ کی حکومت میں مفتی علام حضرت کو عدالتی ۔۔۔ دستخط کرنے کا عہدہ عطا ہوا[٭] یہ دونوں بیان اسی وقت صحیح ہو سکتے ہیں جب مفتی صاحب کو تسلیم کیا جائے کہ وہ عہد آصفی ۔۔۔ اول سے ۔۔۔ تک زندہ رہے اور زوالی وشاہی دونوں زمانے صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ برسر عمل رہے محلہ کا نام مفتی صاحب کے نام پر ہونا تو قابل انکار ہے ہم کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ ۔۔۔ تک زندہ تھے نام ۔۔۔ یہ روایت آصف الدولہ کا وہ عہد ہے جو موصوف نے اپنی تخت نشینی کے آٹھویں سال مفتی علام حضرت کو دی

مفتی علام حضرت کو حکومت کی طرف سے فتویٰ دینے کا حق تھا اور وہ مسلمان جو یہاں عہد اول سے آباد تھے ان کے مقدمات اختلافات مفتی صاحب شرع محمدی کی رو سے طے کرتے تھے مفتی گنج کے آثار قدیمہ میں

علی رضا کو قوال کا گھر۔ امام باڑہ حسین آباد کے عربی پھاٹک سے نکل کر ایک راستہ تو رام گنج جاتا ہے اور ۔۔۔ کی طرف درمیانی خط مفتی گنج کی راہ ہے اور پل نواب قاسم علی خاں کے قریب پہنچ کر علی رضا بیگ کو قوال کا گھر تھا وہ ۔ منتظم ہستی ، انسانی ہمدردی والا دل سینے میں رکھنے والے آدمی تھے اور یہی ان کی ہر دلعزیزی اور نام باقی رہنے کا سبب تھا حلیم اور بردبار اس حد پر تھے کہ جو غصہ آ جانے کے اوقات تھے اس وقت بھی تحمل سے کام لیتے تھے ان کی ۔۔۔ سلسلے میں یہ واقعہ قلمبند ہے کہ ایک مرد ۔۔۔ سید جو سپاہی منش تھے حاجت لے کر آئے ہتھیار لگائے ہوئے تھے پہلو میں ۔۔۔ شرم سے سوال نہ کر سکے کچھ دیر کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا نام کیا ہے ؟ نام بتایا کو قوال ۔۔۔ معلوم نہیں کس ۔۔۔ تھے پوچھا آپ کی بی بی کا نام کیا ہے کہا ان کا نام تو یاد نہیں سالے کا نام رضا علی بیگ ہے اس سخت جواب پر مطلق تو ۔۔۔

٭ ۔۔۔ ۱۰ ۔۔۔ احسن التواریخ ص۹

کرتے ہوئے ان کی [illegible] دیکھو صاحب [illegible] تھے تو [illegible] سے مرعوب ہوکر مانتا دیتے تو مردانگی کے خلاف تھا اور بے حیائی تھی [illegible] سے انھوں نے اور رضا علی بیگ [illegible] کرگھر پہونچ گئے آواز دی پلا بچا [illegible] آیا کھانا ہیں تو پردہ کیا چلے گئے۔ ان کی بی بی کے سامنے وہ نقد رکھ [illegible] کی [illegible] سے بہت [illegible] اپنے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ اور [illegible] کرتے۔

[illegible] خوان دیکھ [illegible] بہت [illegible] تکلف سے [illegible] مہمونت [illegible] ساتھ [illegible] خوش [illegible] ان کے سوا کھانا پکوانا کسی کو [illegible] اگر میں [illegible] دلا سکوں تو ایسی [illegible] قیمت [illegible] سلطان عالم نے ان کو محمد علی [illegible] خان بہادر منتظم سلطنت کا خطاب دیا تھا۔

[illegible] علی خاں کا [illegible] بیگماتکمتے آگے بڑھوا [illegible] اس قدر بڑھتا تھا کہ [illegible] علی خاں [illegible] کے [illegible] پل ہوانا چاہا اور ارادہ کے ساتھ [illegible] پل کی تعمیر میں ایک بڑھیا کا چھپر اجاڑ دیا پڑا نا قدیہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے جھونپڑے [illegible] قاسم علی خاں [illegible] کہ چاہا کہ وہ مکان کی مناسب قیمت لے کر کہیں اور زمین خرید کر چھپر ڈال لے بڑھیا [illegible] زمین [illegible] بزرگوں کی ہے [illegible] بچوں کی [illegible] چھپر اس کا ہٹا دیا گیا وہ [illegible] چھپر میں تھوڑیاں لگا کر بیٹھتی رہی تھی۔ اس کی [illegible] کہ ڈلی کتر کر بیچا کرتی تھی پل بہت [illegible] ہوگیا تو اس نے آصف الدولہ سے عرض کیا کہ حضور ملاحظہ فرمائیں [illegible] سواری کا جلوس قریب آیا [illegible] خبر ہوگئی وہ پل کے بیچوں بیچ آکر بیٹھ گئی اور ایک ٹوکری [illegible] جلوس کے سواروں نے روکا لیکن [illegible] سواروں نے لیے گھوڑے [illegible] آصف الدولہ کی سواری قریب آئی تو اس نے پکار کر کہا نواب بھائی کچھ خدا [illegible] قاسم علی خاں نے پل ہوا لیا اور ہمیں [illegible] برباد کردیا ہمارا چھپر [illegible] پھنکوا دیا اور گھر کھدوا دیا۔ نواب نے اپنے [illegible] میں [illegible] اور حکم دیا کہ اسی [illegible] پل کھود کر پھینک دو [illegible] بڑھیا کا چھپر اسی طرح ڈال دو جس طرح پہلے تھا۔ اور [illegible] سے ملنا چھوڑ دیا۔ آخر قاسم علی خاں نے بہت زیادہ روپیہ دے کر اس کو رضامند کیا اور اس کا مکان ایک [illegible] اہتمام سے ہوا یا اور پل دوبارہ تیار کرا کر اس ضعیفہ کو اپنی طرف سے سفارش کو بھیجا۔ نواب نے خوش ہوکر نواب [illegible] علی [illegible] کا قصور معاف کردیا اور پل دیکھنے تشریف لائے۔

[illegible] کاظم حسین خاں [illegible] مفتی گنج

راجہ صاحب کے اخلاق اور سیرت میں یہ واقعہ دیکھ کر مجھے مسرّت ہوئی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے[3] گرمی کے دن تھے شب کو بعد مغرب جھوائی ٹولہ سے بارہ نکی چلے ایک بزرگ شیوخ مفتی گنج سے جو اہل

[illegible] تھوٹ [illegible] تاریخ [illegible] ١٨٦ آثار یادگار [illegible] ١٦٢ طبع تصویر عام پریس

[3] ان کے والد کی قبر مفتی گنج کی راہ میں سب سے پہلی سمت کے [illegible] ہوئے ٤ [illegible] مرزا [illegible]

...ں میں داخل تھے مگر عسرت اور تنگدستی نے [illegible] تھا [illegible] مرزا [illegible] حیدر روز سے لکھنؤ میں مقیم تھے یہ بھی اس سفر میں ساتھ ہوئے۔ ان کو تو [illegible] پالکی میں سوار کیا [illegible] ہاتھی پر بیٹھے بیچ راستے [illegible] لکھنؤ سے ڈیڑھ میل پہ شیخ صاحب کو نیند آگئی۔ [illegible] دیکھ کر ہاتھی کی [illegible] آپ کو بہت تکلیف پہونچ رہی ہے [illegible] عرض کر کہ اب شیخ صاحب کو یہاں بلائیں اور آپ پالکی میں تشریف رکھیں تو [illegible] یہ شعر پڑھا

آپ کو [illegible]

اور فرمایا [illegible]

تبادلہ [illegible]

مولوی جرات ۔ [illegible] شاہ [illegible] میں رہتا تھا۔ امراؤ مرزا صاحب کی داہنی آنکھ میں ناسور ہوگیا ڈاکٹروں [illegible] ایک دن مولوی نے ان کے والد سے کہا کہ [illegible] میں نے ایک قبر کی [illegible] کا وعدہ کیجیے تو کچھ دن میں آپ کے لڑکے کو اچھا کردوں انہوں نے وعدہ کیا تیرہ ہوئیں دن زخم بھر گیا اور تا حیات پھر کوئی شکایت نہ ہوئی۔

شہزادگان دہلی۔۔ [illegible] کی معزز آبادی میں شاہزادگان دہلی بھی ہیں جن میں تاریخ ثابت ہے کہ مرزا حیدر شکوہ پسر مرزا کام بخت ابن مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم کی محلہ ارمنی گنج میں کئی عمارات بنائیں ان کی [illegible] ہوئی۔ اور صاحبزادہ احمد علی شاہ کا معتی گنج کے [illegible] مکان اور قیام تھا [illegible] بزرگ ولیعہد کہلاتے تھے آخر میں معتی گنج سے ہٹ کر اپنے خسر سراج الدولہ کے گھر چلے گئے۔ مؤلف کے عصر میں اس محلہ کے سربرآوردہ رئیس مرزا محمد فریدوں عالم صاحب تھے ان کے اخلاق، عادات، طرز معاشرت ملوکانہ تھے خوش طبع لوگ ان کو ظل سبحانی کہتے تھے ان کے قدیم مکان کا ایک کمرہ اب بھی باقی ہے موصوف کی حیات ہی میں لائق اولاد نے گھر کی حالت نئی تعمیر میں تبدیل کردی۔ آپ کے پاس ایک اصطرلاب تھا جو ان کے مورث اعلیٰ دہلی سے اپنے ساتھ لائے تھے ایسا اصطرلاب میں نے کسی یونیورسٹی، لائبریری اور میوزیم میں آج تک نہیں دیکھا وہ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ۱۴ جون ۱۹۲۹ء مطابق ۵ محرم ۱۳۴۸ھ کو نواب صاحب نے انتقال فرمایا اور کربلائے امین الدولہ میں دفن ہوئے ان کے صاحبزادہ شہزادہ مرزا سلطان محمد شاہ صاحب کی منا کردہ مجلس ۱۰ صفر کو اور لکھنؤ کے تمام رؤسا و امراء کا بیک وقت اجتماع یادگار تقریب ہے جس میں چالیس سال پہلے امراء و رؤسا کی گاڑیوں کا سلسلہ نواب قاسم علی خاں کے پل تک پہونچتا تھا۔

حمام کی مسجد:۔ یہ وہ مسجد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۲۱۱ھ کی تعمیر تھی اور مرزا علی خان نے اس کی بنیاد قائم کی تھی زمانہ دراز کے بعد عمارت کی پہلی صورت نہ رہی اور دوبارہ معمولی طریقہ پر تعمیر ہوئی ستون مسجد وہی ہیں اور گردو پیش باقی نہیں ہے اس مسجد میں حمام بھی تھا اور یہی وجہ حمام کی مسجد شہرت پانے کی ہوئی ساٹھ برس پہلے حمام باقی تھا یہ بھی شہرت ہے کہ اس مسجد میں نماز جمعہ کبھی ہوتی تھی بانی مسجد کے خاندان کے مشہور افراد میں مولوی مرزا ہادی صاحب مؤلف خلاصۃ المصائب

قدیم نمبر ۹۵

اور مولانا مرزا رضا علی مرحوم مشہور و معروف مناظر جو علم کلام و مباحثہ میں یگانہ تھے ۱۳۳۳ھ تک زندہ تھے ان کی تصانیف فصل الخطاب، سہل ممتنع، قول فیصل، عین الیقین، معید مستعد وغیرہ ہیں مسجد میں اس وقت چھت نہیں ہے اگر یہ بیان صحیح ہے تو جھوؤ کی پہلی مسجد یہی ہوسکتی ہے محلے کے قدیم رہنے والے بتلاتے ہیں کہ سنہ مذکور پتھر کی مدد سے دریافت ہوا ہے اور وہ تختی سوئیا ان لے مسجد میں نصب نہیں ہے۔

مسجد میر ضمیر:۔ نام بانی مسجد کا سید مظفر حسین تھا اور یہ چھوٹی سی مسجد ان کی یادگار ہے مرزا مرزا صاحب مفتی گنج کے رہنے والے تھے یہ مسجد ان کے مکان کے سامنے ہے میر ضمیر عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی کے شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ کی صادق پوچھو تو انہیں نے قائم کی مرزا دبیر السا باکمال ان کا شاگرد رشید اور تلمذ پر فخر محسوس کرتا تھا۔ ضمیر نے بادشاہ کی مدح میں فرمایا ہے ؎

رہے بادشاہ رعیت نواز	زہے عادل و داد ل و کارساز
سعیداں کے طالع اور بیدار بخت	رہیں وہ افسر و چتر و تخت
سخن اس طرح کا کہیں ہے سنا	کہ شاعر کو بیش از سخن دے صلا
رعایا ہی رعیت کا خواہاں ہے وہ	کہ اس عہد میں محو بتاہاں ہے وہ
رہے دبدبہ و رہے رعب نام	کہ تھرا رہے ہیں پڑے روم و شام
جو تیغ اس کی پڑتی سر کوہ قاف	تو کانٹ رہیں کی دریدہ ہو ناف

ضمیر کے کلام میں مراثی، سلام، رباعیات ان اعلیٰ حدود میں پائے جاتے ہیں جس کے تحت میں مرثیے کی بنیاد قائم ہوئی اور ضمیر استاد مانے گئے ۱۲۷۲ھ میں غدر کے پہلے ضمیر نے اس دنیائے فانی سے عالم بقا کا سفر کیا مثنوی ریحان معراج ضمیر کا عدیم المثال منظومہ ہے جو ۱۳۰۱ھ مطبع حسینی باہتمام میر عابد علی مرحوم لکھنؤ میں طبع ہوا۔

قبر ضمیر:۔ مسجد مذکور کے سمت شمال جو مکان ہے اس میں میر ضمیر محو خواب راحت ہیں اور موت کی نیند سو رہے ہیں مذہب شیعہ کی قابل تعریف روش ہے کہ اسے بیسے صاحبان کمال کی قبروں کی پرستش نہیں کی اور چادریں چڑھانے کا اقدام نہیں کیا۔

مشاہرہ سید محمد فارسی:۔ مفتی گنج میں عہد سلطان عالم کی عمارت تھی جس میں میر انیس مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھا تاریخ سے ثابت ہے لیکن اب نشان بھی عمارت کا نہیں ہے۔

مشاہرہ نیرن صاحب:۔ عہد سلطان عالم میں محلہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا اور بصورت خانہ اب بھی موجود ہے۔ سود وقت کی رہنی یادگار ہے۔

احمد صاحب پیراک:۔ بہت بڑے پیراک تھے ان کے بھائی کا نام آغا محمود تھا آپ ذاکری بھی کرتے تھے اور کسی سے کوئی نذرانہ نہیں لیتے تھے پیرنے میں اس قدر کامل تھے کہ ان کو چادر میں باندھ کر دریا میں پھینک دیتے تھے وہ تہہ آب تک پہنچتے پہنچتے اسے کھول کر ابھر آتے تھے طرح طرح کے کمالات دریا میں پیر کر دکھاتے تھے۔

دیگر صاحبان کمال :۔ یہاں ایک بزرگ حافظ خیرات علی[۱] تھے جن کو قرآن مجید حفظ تھا ۱۲۵۹ھ تک حیات تھے (۱) مولانا مرزا ذاکر علی صاحب مناظرہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے ان سے گفتگو میں فریق مخالف چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا سنہ وفات گوشۂ صفحہ میں گذرا (۲) مرزا محسن صاحب مرحوم ایک ٹیپ دار اور حدیث خواں تھے جو لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں کافی شہرت رکھتے تھے پاٹ دار آواز تھی حمد حیدری کے اشعار بڑی خوش لحنی کے ساتھ پڑھتے تھے دستار قامت، وجیہہ، تنومند، رنگت اس قدر گوری کہ دودھ میں نہائے ہوں اس پر پھبتی ہوتی تھی طاقتور ایسے تھے کہ ایک بار مجلس پڑھنے جا رہے تھے ایک سائیکل سوار سے سامنا ہو گیا۔ جب آپ بائیں پر آ جائیں تو وہ بھی دست چپ کی طرف ہو جائے اور جب آپ داہنے ہاتھ کی طرف ہوں تو وہ بھی سمت راست آ جائے آپ نے اسے مع سائیکل اٹھا کر راہ پر لگا دیا دیکھنے والوں کو حیرت ہو گئی (۳) قاری سید حسن صاحب[۲] ایک شخص تھے جو بہترین لہجے میں قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے ان کے سورۂ رحمٰن پڑھنے کا سماں بندھ جاتا رہتا تھا اور خاص کمال یہ تھا کہ تلاوت قرآن کے وقت ہکلاتے نہ تھے ورنہ معاشرتی زندگی اور روزمرہ بات چیت میں زیادہ ہکلے تھے، ۲ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ کو رحلت ہوئی مدرسی کی لفیہ میں دفن ہوئے۔

(۱) مفتی گنج کے لوگ عالموں کا بڑا احترام کرتے تھے ایک مرتبہ چند روز بازار میں میدان بنا گیا اور کنکوے بازی ہم طریقوں سے اڑتے رہے تضییع اوقات روپیہ کی بربادی، دلوں میں کامیابی کی توقع پر بعض پیدا ہو کر فتنہ و فساد بڑھ رہا تھا اور ہر بار کی ایک شکست پر تیار رہتی قبلہ و کعبہ کو خبر ہوئی دونوں گروہ ان کے مخلص تھے سمجھانے میں کام نہ چلا تو خود مفتی گنج تشریف لے گئے۔ پالکی کی آمد ہی میں طرفین کے جذبات افسردہ ہونے لگے اور ایک عالم دین کی عظمت کا تصور تھا آپ نے بیچ مجمع میں نیس سے اتر کر اپنے ہاتھ سے ایک فریق کی ڈور توڑ دی اور قصہ پر امن طور پر ختم ہو گیا۔

(۲) خاندان مرزا رضا علی مرحوم میں کسی دیوار کی تعمیر پر باہمی جھگڑا ہوا ایک چاہتا تھا کہ ہم موافق دوسرے کی خواہش تھی کہ اس کے پیسے سے مرمت ہو۔ بات بڑھتے بڑھتے تکرار کھینچنے کی نوبت آ رہی تھی قبلہ و کعبہ کو خبر ہوئی اور خود مفتی گنج پہنچ کر لیے صرف سے دیوار اٹھوا دی یہ دیوار ابھی تک موجود ہے۔

(۳) سید طاہر حسین نامی مفتی گنج میں ایک شخص تھے جو چار برس کے مرحلے سے لیے زمانہ سے خوار گی میں قریب ہلاکت پہونچ گئے تھے سفر دریا میں نہ تو یہ ممکن تھا کہ انا تلاش کی جائے نہ اوپر کے دودھ کی کوئی صورت تھی زائروں کے قافلے میں ایک عورت کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی جو نہ صاحب اولاد تھی اور نہ کوئی اس کا شوہر تھا بچے کو بہلانے کے لئے گود میں لیا فطرت نے دودھ پیدا کیا اور وہ بن ماں کا بچہ اس طرح پرورش پا گیا سن تمیز کو پہونچا جوان ہوا شادی ہوئی خدا نے صاحب اولاد کیا ان کے بیٹے احمد حسین نے مجھ سے اپنے باپ کی طفولیت کا واقعہ بیان کیا اب احمد حسین زندہ نہیں ہیں ان کی اولاد موجود ہے۔

مفتی گنج کے آخری دور میں لسان الرمن مرزا الطاف حسینؒ عالم رہتے تھے ان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کے ہر ہر شہر میں مفتی گنج کا ایک باشندہ ملے گا یہ ذکر ہے چالیس سال پہلے کا۔ اور میں اپنے ہر سفر میں تجربہ کرتا جاتا تھا مفتی گنج کا ایک رہنے والا ہر شہر میں ملا یہ دلیل تھی اس محلہ کے آباد ترین حصۂ شہر ہونے کی۔

---

[۱] ذاکر اہل بیت مولانا احمد رضا صاحب کی علیہ نامی گوشہ میں ۔ [۲] یہ صاحب مشتاق مسلم الثبوت شاعر کے شاگرد تھے (دیکھو ص۳۲ آثار یادگار)

لطف تیلی :- عہد واجدی میں اس محلہ کا مسلمان تیلی رہتا تھا کولھا کمر یا جو کسی کا ٹوٹ گیا فوراً بٹھا دیتا تھا انگریزی ہوتے تک زندہ رہا اور کسی حاکم کے کتے کا کولھا اکھڑ گیا ۔ شہرت عام کی بنا پر وہ انگریز کتے کو لطفی کے پاس لایا اور کہا کہ اس کا کولھا بٹھا دو لطفی جانور کو اپنے گھر کے اندر لے گیا اور اس کے پیٹ کے نیچے ایک لکڑی ڈالی اور اس طرح شکاری کو اچھالا کر کولھا بیٹھ گیا۔ اور انگریز سے کہا کہ کتے کو بلایئے ۔ صاحب نے آواز دی کتا دوڑتا ہوا سامنے آیا لطفی کو انعام دیا یہ واقعہ چشم دید راوی مرزا صاحب ساکن معتی گنج کا ہے جن کی پیدائش ۱۸۶۸ء میں ہوئی اور بفضلہ زندہ موجود ہیں امراؤ مرزا صاحب کو میں نے بھی دیکھا تھا راست گو انسان تھے ان کی وفات کو عرصہ گزر گیا ہے ۔

شیخ عابد حسین عرف محمود جراح :- عہد واجدی کا جراحوں میں مستحق تھا معتی گنج میں رہتا تھا جراحی اور خط تراشی دونوں فنون میں کمال حاصل تھا ایک مرتبہ ایک ہندو تعلقہ دار کو ناسور کے ران میں زخم تھا ڈاکٹروں نے ران کاٹنے کی رائے دی تھی۔ جس پر مریض تیار نہ ہوا محمود سے رجوع کیا ڈاکٹروں کے سامنے محمود نے اچھا کر دینے کا وعدہ کیا ڈاکٹر اس کے عزائم پر مضحکہ کرتے رہے اس نے شریفہ کی سوکھی پتیاں جلا کر پہلے زخم کے اندر دھواں پہونچایا اور کیڑے بجھا کر نکلنا شروع ہوئے ڈھیروں کیڑے نکلے اس کے بعد شریفہ کی ہری پتیاں ہتھیلی پر ملکر ان کا تازہ عرق زخم پر ٹپکایا سب کیڑے نکل گئے مرہم لگا کر کچھ دن میں زخم بھر دیا ران اچھی ہو گئی زمیندار نے بہت انعام دیا اور ڈاکٹر حیرت کر گئے۔

مرزا امداد حسین :- عہد واجدی میں کپتان پلٹن تھے ان کی بہادری آج تک معتی گنج میں مشہور رہی ہے یہ امراؤ مرزا صاحب کے دادا تھے ایک دن ایک مرکھنا بیل چھوٹ گیا یہ اس طرف سے آ رہے تھے لوگوں نے منع کیا ادھر سے نہ جایئے انھوں نے سماعت نہ کی بیل ان کی طرف جھپٹ کے چلا انھوں نے بائیں ہاتھ سے سپر لے کے اس کے سینگوں کو سپر پر روکا لاکھ لاکھ بیل نے زور کیا مگر ان کے ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی داہنے ہاتھ سے تلوار کھینچی اور گھٹنے زمین پر ٹیک کر ایک ہاتھ بیل کی گردن پر مارا سر الگ ہو گیا اور دھڑ الگ۔ آپ غدر کے کئی برس بعد مرے۔ موٹے بھی جاتے تھے۔

مرزا قدرت اللہ بیگ :- عہد واجدی کے شہ زور معتی گنج کے رہنے والے تھے قوت کا یہ حال تھا کہ بانس کی پوروں کو دونوں مٹھیوں سے پکڑا اور زور کر کے اس کے اندر کے ریشے کھینچ لئے ۔ ایک موٹی دہلیز کے لوہے کے کنڈے کو اس زور سے مروڑتا تھا کہ دہلیز چر جاتی۔

رشیدہ خانم :- عہد واجدی کی نڈر عورت تھیں ان کے بیٹے کا نام نواب ہادی علی خاں تھا برسات کا زمانہ تھا سب اپنے اپنے پلنگوں پر انگنائی میں سو رہے تھے چور گھر میں آیا کھٹ پٹ سے آنکھ کھل گئی وہ بھاگا اور چاہا کہ جست کر کے دیوار پر چلا جائے خانم صاحبہ نے پاؤں پکڑ کے ایسا جھٹکا دیا کہ گٹا اکھڑ گیا لوگ دوڑ پڑے مگر ٹانگ خانم صاحبہ کے ہاتھ میں رہی چور نے بڑی توبہ تلا کے بعد ہاتھ سے چھڑایا اور اپنے گھر لنگڑاتا ہوا پہونچا۔

میر مچھلی :- نام آپ کا میر احمد علی تھا پیراکی میں صاحب کمال تھے اس لئے لقب میر مچھلی قرار پایا نصیرالدین حیدر بہادر شاگرد تھے ان کے ہمعصر میرک خاں یا میرن جان دوسرے صاحب کمال تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ والئ بلرام پور کے استاد تھے ۔ دونوں مشاہیر شہر تھے نصیرالدین حیدر بہادر نے ایک مرتبہ میرک جان کو استاد سے مقابلہ کا حکم دیا حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر میر مچھلی سے مقابلہ

سہ قدیم ہنر ص۱۹۲ سلہ قدیم ہنر ص۸۶ سلہ قدیم ہنر ص۱۵۸ سہ قدیم ہنر ص۱۵۸ سہ سہ ص۱۵۸ سہ قدیم ہنر ص۱۵۸ سہ ص۱۵۸

کھا ہی چکا۔ دیر تک پانی کے اندر دونوں استادوں کے درمیان حل بانک ہوتی رہی آخر میں میر خان سے میر قیصل کو زیر کر کے انھیں اپنے پیروں میں باندھ لیا بادشاہ نے جو اپنے دلکش بجرے پر سوار تھے اور دریا کے کنارے دونوں استادان فن کے ساتھ گرد دل کا ہجوم تھا بادشاہ نے بجرے کے اندر سے جو بڑی تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا روپیہ کا ایک توڑا۔ سونے میں بلند کیا اور دونوں طرف اشارہ کر کے کہا کہ جو ہمارے بجرے کو پیر کر پکڑے اس کو یہ توڑا دے دیا جائے گا میر خان نے پھرتی سے کر اپکڑ لیا۔ میر قیصل کی سمد منی گنج میں ایک موجود ہے۔

مولوی مرزا مہدی ۔ آپ بھی مجتہد صاحب کے ہم عصر تھے اور پیراکی میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے ان کا کمال یہ تھا کہ دریا میں اترے اور ایک تیز دوڑنے والے آدمی کو دریا کے کنارے اپنے برابر کھڑا کیا اور اس سے کہا کہ جہاں تک تیز دوڑ سکتے ہو دوڑو وہ مرزا پیر کہہ کے بھاگا اور انہوں نے ملاحی کاٹنا شروع کی تیز ملاحی کاٹتے تھے کہ وہ بالشوں پیچھے رہ جاتا تھا اور یہ آگے نکل جاتے تھے۔ سنہ غدر ۱۸۵۷ء میں بمقام منی گنج گولی سے مارے گئے آپ بانک اور لکڑی سے بھی واقف تھے ان کے بیٹے حسین مرزا صاحب جوست بگی کے پیدا شدہ تھے وہ بھی پیراکی اور بانک میں استاد مانے جاتے تھے پرنس مرزا اسلیمان قدر اور نواب سیف الدولہ کے استاد تھے۔ حسین مرزا کے بیٹے سلطان مرزا مٹیا برج میں سلطان عالم سے وابستہ رہے دریا میں اس طرح غوطہ لگاتے تھے کہ کوئی انھیں چھو نہیں سکتا تھا ۱۹۱۳ء میں ستر برس کی عمر ہے بصارت جواب دے گئی ہے۔

میاں مشیر

مرزا دبیر کے شاگردوں میں مشہور اور باکمال ہوئے گوشت، جس کی ظرافت طبع کا تتبع تمام مداحیہ نگار ہستیاں آج تک کرتی ہیں اور ایسا نہ تھا کہ وہ صرف مداحیہ اشعار کہنے پر قدرت رکھتے ہوں بلکہ ان کی وہ زندگی جو مدح اہل بیت میں گذری وہ بھی شاندار ہے مرثیہ گوئی میں بھی وہ منفرد تھے اور کئی مرثیے ایسے ہیں جو مدحیہ اور المیہ پہلو سے یادگار ہیں چند مراثی جن کا مجھے علم ہوا ہے ان کے مطلع یہ ہیں (۱) سر وحیں جو تیغ ستم سے قلم ہوا (۲) دریائے فیض فاطمہ کا نور عین ہے (۳) قصہ تیغ تیغ ہیں جو ہر بھی چاہیے (۴) قدمار ہیں درود ہے اب اہل بیت کا۔ پہلا مرثیہ شہدائے کربلا میں حضرت قاسم کے حال میں ہے اس کے علاوہ ان کے لاتعداد ہزلیات میں جو صلع اور جگت کی رعایتوں سے اس قدر آراستہ ہوتے تھے کہ جس وادی میں قدم رکھا تمام اصطلاحات، ہر پہلو، سارے گوشے تیز روی سے طے کر گئے۔ ان کی تصانیف میں مناظرہ کی مشہور کتاب کنشاپ ہے جو قبقاب کا جواب ترکی بترکی ہے اس کتاب میں صد ربحث میں جس جگہ پیغمبر اسلام کی صاحبزادی حضرت خاتون جنت کی مدح کی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متانت کو ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتا اور گفتگو اس قدر مہذب ہے کہ رکاکت کا کوسوں پتہ نہیں علمائے فرنگی محل ان کے ادبی صداقت کی قدر کرتے تھے اور عبد الحلیم شرر نے جا بجا ان کے فنی جہاد کی تصویر کشی کی ہے۔ کنشاپ ۱۲۹۳ھ مطبع اثنا عشری لکھنؤ میں طبع ہوئی اور مؤلف اور ناشر پر مقدمہ چلا اور بقول عبد الحلیم شرر وہ مٹیا برج چلے گئے ان کے تذکرہ کرنے کا حال صدر کتاب میں گذرا مخطوطات کتب خانہ ممتاز العلماء میں ان کا ایک مرثیہ قلمی بیاض میں ہے جو مجتہد العصر علامہ زماں کے بھائی سید العلماء سید حسین کے دنیا چھوڑنے پر اپنے تاثرات کو ظاہر کیا تھا جس قوم نے ان ادبی جواہر پاروں کو کبھی

۱۔ تقریم ہنر ص ۳۳

۔ سمیٹا جو جہاں تھا وہیں فنا ہو گیا۔

مرثیے کے جو اشعار زبان زد ہیں ان میں یہ تو اپنے ایک جام پہ نازاں ہے ساقیا الخ مشہور مدحیہ نظم ہے اور جو شخص روضۂ حضرت امام حسین کی زیارت کے بعد بھی اپنے کردار سے توبہ نہ کرے اور پہلے رنگ پر باقی رہے اس وقت مشیر ہی کا شعر ہے جو مدت دراز تک لوگوں کی زبان پر رہا ع آسماں لپٹ کے رہ گیا قبر حسین سے۔

مرزا قیس :- عہد و عدی کے صاحب کمال مرزا قیس کی ہستی سے مشہور تھے یہ زیادہ تر کبوتربازاں پالا کرتے تھے اور مفتی گنج میں رہتے تھے۔ ایک دن گنگی نو کل کے تالاب سے ایک کبوتر باز ان کے پاس آئے اور کہا کہ حب حالوں کہ آپ کے کبوتر میرے کبوتروں سے تالاب پر ٹیپ ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا آج کے تیسرے دن لڑاؤں گا آپ سے ٹھاٹھر سے دو کبوتر نکالے ان کو دیدئے کہ ان کو لے جا کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھاٹھر میں چھوڑ دیجئے اور اس کے بعد اڑا دیجئے گا وہ کبوتروں کو لے گئے اور حسب ہدایت عمل کیا۔ دونوں کبوتر اڑ کے مفتی گنج پہنچ آئے مرزا نے تیسرے دن ان دونوں کبوتروں کو اپنے دوسرے کبوتروں کے ساتھ اڑایا اور تالاب کی طرف بڑھایا پہلے والے دونوں کبوتر آگے آگے باقی کبوتر پیچھے پیچھے اڑتے ہوئے گنگی نو کل کے تالاب پر پہونچے اور ان کے کبوتروں سے بڑھے اور ان کے دو کبوتر لئے ہوئے مفتی گنج آئے مرزا قیس نے ان کے دونوں کبوتروں کو مار لیا دوسرے دن وہ اپنے دونوں کبوتر لے گئے اور ان کی استادی کے قائل ہو گئے۔

سو تیس اصحاب کبوتروں کو سونے چاندی کی پیجھاں پہناتے آتش کہتے ہیں ؎

ماعیان الصاف پر بلبل سے آیا چاہئے ۔۔۔ تیتری اس کو رنگل کی پہنا چاہئے

مفتی گنج کی مجلسیں :- یہ محلہ عزاداری کے لحاظ سے بھی شہرۂ آفاق تھا اور عشرہ میں پچھلے پہر کچھ رات رہے سے جو مجلس شروع ہوتی تھیں تو آدھی رات تک سلسلہ جاری رہتا تھا اور اس محلے کے لوگ دوسرے محلے میں جانے کا وقت نہیں پاتے تھے مجلس سے بیٹھے ان کو کہتے ہیں ۱۲ بجے رات کے بعد سونا اور سحر کے وقت پھر مجلس کے لئے اٹھ کھڑے ہونا یہی حسین دوستی ہے انھیں مجلسوں کی کا شعر ہے ؎

۔ جاگے ہیں سب راحت رستے کے سوئے ہیں ۔۔۔ مرا حویا یا تو پچھلے پہر کے روئے ہیں

میر عشق کہتے ہیں ؎

ہے عشق بہت خوب یہ وقت مجلس ۔۔۔ منہ ڈھانپ کے روتی ہیں سحر کو سہرا

کیونکر نہ ہو مقبول سحر کی مجلس

مرزا محمد اختر مرحوم جو اس حلقے کی آخری شمع تھے اور کربلائے معلیٰ میں ان کی وفات ہوئی کثرت مجالس کے ثبوت میں کہتے تھے کہ میں نے دن بھر کی مجلسوں میں اپنے ہاتھ سے دو من کھیلیاں تقسیم کی ہیں ظاہر ہے کہ کچھ مجلسیں تقسیم شدہ ت کی بھی ہونگی۔

احاطہ مرزا علی خاں

نواب آصف الدولہ کی مسند نشینی کے وقت ان کے ماموں نواب مرزا علی خاں فیض آباد سے لکھنؤ آباد کرنے پر وہ

سے بحر رہسند لعت ص ۳۲۲

پہلے اُمراء کے رہنے کی جگہ احاطہ مرزا علی خان کے نام سے مشہور ہوئی۔ جب محلہ کی بنیاد قائم ہوئی اس وقت احاطہ مذکور کی
سرحد کاسا سے شروع ہوتی تھی اور موجودہ کمپنی باغ کے اندر بھی کچھ حصہ شامل تھا۔

اس محلہ میں دیوان خانہ، محلسرا، فیل خانہ، شتر خانہ، اصطبل سب ہی کچھ تھا اور ان بنیادوں کے آثار کمپنی باغ کی زمین
شامل ہو کر مٹ گئے جو حصہ اس وقت احاطہ مرزا علی خان سے مشہور ہے وہ مرزا علی خان کے بھائی نواب سالار جنگ کے
بیٹے مرزا علی خان کا آباد کردہ ہے۔ دیمنتی گنج سے ملا ہوا یہ مکان کبھی اس وقت منتخب اہل شہر کی بستی تھی اور احاطہ مرزا علی خان کے
لوگ شہر بھر میں مشہور تھے نواب یوسف مرزا صاحب اس بستی کی آخری یادگار تھے۔ درازقامت، سینہ چوڑا، اعضاء و جوارح موزوں
ریشمی داڑھی [illegible]۔ واقعہ ہے ایک مجلس میں آدمی [illegible] پہنچنے کے قریب تھا آپ نے چوب تکیہ دیوار سے ٹکا دیا اور مجلس کو
ہم سمجھ ہو گئے [illegible] دنیا میں سے [illegible] اس مجسمۂ تہذیب و اخلاق کا لوٹ ہے۔ آپ کے پاس ایک جیبی گھڑی تھی جو بڑی سریلی آواز
بجتی تھی جس محفل میں آپ بیٹھے ہوتے لوگ حیرت سے دیکھتے کہ آواز کدھر سے آ رہی ہے محلہ کے تاریخی مآثر قدیم روایات حسب ذیل ہیں

__پرن کا تعزیہ__ ۔ عہد شاہی کی ایک خاتون تھیں جو اس محلہ سے تعزیہ اٹھاتی تھیں اور عورتیں شریک ہوتی تھیں جلوس میں کوئی
مرد شریک نہیں ہو سکتا تھا جب تک زنانی عزاداری رہی تو سیدی صفدر حسین کی ماں نے یہ تعزیہ اسی طرح دھوم سے اٹھایا اور
[illegible] لایا گیا۔

__وخاں کا امام باڑہ__ ۔ آثار قدیمہ اور عہد شاہی کی عمارتوں میں یہ امام باڑہ تھا جہاں تک میری یاد کام کرتی تھی سید محمد کاظم
قبلہ کو میں نے اس امام باڑہ میں مرثیہ پڑھتے سنا تھا تھوڑا عرصہ ہوا کہ امام باڑہ بارش میں گر گیا اور کوئی دوبارہ تعمیر نہ کر سکا۔

__میر میر حسن صاحب مثنوی__ ۔ میر حسن جب دہلی سے آئے تو لطانہ اسی محلہ میں قیام تھا نواب قاسم علی خان صاحب کے باغ کے پچھواڑے
ان کی قبر ہے خاندان انیس کے مورث اعلیٰ یہی بزرگ تھے جو آسمان ادب کے ماہ و آفتاب تھے اور اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ان کی نظم
میں نثر کی سی روانی ہوتی تھی ؎

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا — کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا
ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ — وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
گیا دل اور جان بخشی بھی — حسن اُس نے احسان دوبارا کیا

مثنوی صرف عاشق مزاج طبقے میں مقبول نہیں ہوئی بلکہ عابدوں اور زاہدوں کی زبان پر بھی یہ شعر ہے ؎

تجھے فعل کرتے نہیں لگتی بار — نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

مثنوی کا بھاشا میں ترجمہ پنڈت پیارے لال نے کیا اور میر حسن کا دیوان بھی چھپ چکا ہے اور تذکرہ شعرائے اردو مولوی
حبیب الرحمن خاں شیروانی نے اپنے اہتمام سے صحت کر کے چھپوایا ہے مصحفی نے مصرعہ تاریخ وفات یہ نکالا ہے ع شاعر شیریں بیاں وفات یافت

__میر صفدر علی پیراک__ :- آپ احاطہ مرزا علی خان میں رہتے تھے اور بہت بڑے پیراک مانے جاتے تھے مشکل پیرائیاں معلوم تھیں کھڑی
ایسی لگاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی میں میخ گڑی ہے کیا مجال کہ ذرا تو جسم کو لرزش ہو جائے ایک وقت میں چھ سات آدمی ان کو ڈبوتے
تھے مگر یہ نامت تک پانی میں کھڑے ہی رہتے تھے پانی سے بھرا ہوا گھڑا ہاتھ میں لیا اور اپنے سر پر ڈالنا شروع کیا پورا گھڑا خالی ہو گیا مگر یہ

۔ وہ جتنے کھلتے تھے اتنے ہی کھلے رہتے جبکہ ان کے بڑے استاد تھے سات آٹھ آدمی دریا میں ایک طرف اور یہ اکیلے ایک طرف، مگر وہ ان کا کچھ نہ کر سکتے تھے ۔ آپ واجد علی شاہ کے استاد تھے میر صفدر علی اپنے شاگردوں کو لے کر کلیا گھاٹ پر ٹہلتے تھے غدر کے کئی برس بعد لکھنؤ میں انتقال کیا ان کے بڑے بیٹے میر فضل حسین تھے جھوں نے ۔ بائیس نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور کو پیرنا سکھایا تھا مدت تک اچھی مشاہرہ پاتے رہے ۔ اور لکھنؤ میں وفات ہوئی ان کے چھوٹے بیٹے خلیفہ سید صاحب تھے جن کا حال آپ پڑھ چکے ۔

نواب مرزا آتش ہوس : ۔ مصحفی کے شاگرد اور مرزا علی خاں کے چشم و چراغ تھے ان کے اشعار میں زیادہ تر لیلیٰ مجنوں کا ذکر آتا ہے نمونہ سخن ملاحظہ ہو :

ہم جا نہیں سکتے ہیں ہوس شرم کے مارے ۔۔۔ ہر چند کہ گھر اس کا ہے یہ یک فاصلہ سا

یہ ماکمال مثال سید علی حسین خاں عرف ۔ دولہا ۔ نواب دتیقہ دار کے عقب میں نرکلوں میں دفن ہے

تاریخ لکھنؤ تحریر کرتے ہیں کہ وزیر خان دارو غہ دیوان خانہ ست و ادو ھ کے یہاں احاطہ مرزا علی خاں میں ہر مہینے کی ۔ بیسویں تو عہد واجدی میں مرزا دبیر صاحب اور ان کے مقابلے پر محمد خاں دارو غہ سلطان شاہی کے یہاں اسی وقت پر میر انیس مرثیہ پڑھتے تھے (حیات دبیر ص۹۰)

مصاحب گنج

دہلی کے رہنے والے ایک شخص گھسیٹے خاں نے جھوں نے اپنی عقل اور حسن خدمات سے سلطان عالم کی سرکار سے مصاحب الدولہ کا خطاب پایا اور لکھنؤ کی آبادی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ان کو مفتی گنج کے اس پار رہنے کو جگہ ملی اور اپنے نام پر مصاحب گنج بسایا دو طرف تین خوانین محلہ کے چار طرف پھاٹک لگوائے ۔ آبادی پچھم ہی کی طرف بڑھ رہی تھی جگہ کو محفوظ سمجھ کر دوسرے لوگ بھی آکر بس گئے مصاحب الدولہ کو موقعہ نہیں دے رہے سارکا یا سدطاہر کیا ہے کارخیر کی طرف خاص توجہ تھی

مصاحب گنج کا پھاٹک ایک بھی موجود نہیں ہے محلہ بازار کے کچھ کھنڈر بتائے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ مصاحب الدولہ نے حسب ذیل یادگار چھوڑی ۔

مصاحب باغ : ۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ بہت خوبصورت باغ تھا گوری بیٹ اور نیس اللہ گنج جہاں کے بو مڈے مشہور ہیں ہر دو تا مصاحب الدولہ کی ملکیت تھے ۔

مسجد ۔ مصاحب الدولہ نے جو مسجد بنوائی وہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں تیار ہوئی ۔ زیادہ وسیع نہیں ہے اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے ۔

مقبرہ ۔ مصاحب الدولہ نے ۱۲۹۲ھ میں لاولد انتقال کیا مسجد کے سامنے دفن ہوئے قبر پر مقبرہ بنایا گیا جا بجا آیات قرآن در و دیوار پر خوش خط لکھے ہوئے تھے اب یہ عمارت بھی باقی نہیں ہے ۔

پرتھوی ۔ مصاحب گنج میں رہتے تھے بڑے قوی پہلوان تھے اپنے سر سے کیتھا توڑ لیتے تھے دیواریں اس زور سے ٹکر مارتے تھے کہ تمام عمارت ہل جاتا تھا ۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے معزز اور ہر طبقے کے امرا داخل تھے نواب سید فدا حسین خاں بہادر

---

۵ قدیم لکھنؤ ص۱۴۳

مؤلف قدیم ہنر کے دادا کے بڑے بھائی ان کے شاگردوں میں تھے جس کا تاریخ میں ذکر ہے۔

<u>نواب مرزا مہدی</u> :- آپ سالار جنگ کے خاندان سے تھے اور عہد واجدی میں آپ کے کمالات کا یہ معاملہ تھا کہ کنوئیں کی جگت پر بیٹھ کر پیر چھلنا شروع کرتے اور اس قدر نہیں چھلکا تا رہتے تھے کہ کنوئیں کے اندر چھلکا اترتا جاتا تھا ۱۹۰۵ء کے حدود میں انتقال ہوا

<u>کربلائے مصاحب الدولہ</u> :- یہ روضہ مزار حضرت عباس کی شبیہ اور مصاحب الدولہ کی یادگار تھا پھاٹک داخلہ اور شاندار دونوں پہلوؤں میں غلام گردش سامنے لمبا چوڑا صحن آگے بڑھ کر اصل روضہ کی عمارت جو درگاہ حضرت عباس واقع رستم نگر سے زیادہ مشابہ شہ نشین پر بہت پرانی مگر خوبصورت سنگ مرمر کی ضریح اور بڑا حصہ گنبد جس کے بالائی حصے میں سنہری کلس ہے غلام گردش اور روضہ پر اگلی وضع کی منڈیر جس میں محرب اور روشن کنگروں پر کمہاروں کے ہاتھ کی بنی مٹی کی گملیاں جاذب نظر اور نگاہ افروز تھیں۔

<u>چوپڑہ کنواں</u> :- مصاحب الدولہ نے ایک بڑا کنواں پیاسوں کو سیراب کرنے کے لئے بنوایا جس کا پانی زیادہ سے زیادہ کھینچا گیا اور واٹر ورکس کی انگریزوں کے ہاتھوں بنیاد قائم ہونے تک چشمۂ فیض جاری رہا۔

<u>بلندار مسجد</u> اس محلہ میں عہد شاہی کی ایک خوبصورت اور بلند درجے کی مسجد ہے جس کے مینار عورت کی چوٹی کی طرح گئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ جامع مسجد بلندار مسجد کے نام سے مشہور ہے تاریخ میں صراحت نہیں ہے کہ اس کا بانی کون شخص تھا صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ مسجد کے سامنے امام باڑہ بھی تھا اور امام باڑہ آصف الدولہ کا معمار کفایت اللہ اسی جگہ خواب راحت میں گوشہ نشین ہے مسجد آباد اور مسلمانان محلہ کی وجہ سے اچھی حالت میں ہے۔

<u>مرتضیٰ خاں</u> :- ایک طاقتور شخص مصاحب گنج میں رہتے تھے اس قدر قوت تھی کہ ہاتھی کی دم پکڑ کے اندازہ میں لٹکا دیا اور پھر کھینچ لیا ایک بار جس کو دو بیل کھینچتے تھے انہوں نے تنہا کنوئیں سے کھینچ لیا وہ قدیم ہنر تھا۔

جھانکڑ باغ

یہ باغ چھوٹے خاں کا لگوایا ہوا ہے جو امین الدولہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے شاہ اودھ کے خصوصی توجہات سے ان کے حد میں اضافہ کیا اور مونس الملک خانہ زاد خاں بہادر مصاحب خاص اس کی ترقی کا طرۂ امتیاز تھا امین الدولہ اور مصاحب الدولہ بھائی تھے جھانکڑ باغ ایک طرف معتمد گنج سے قریب دوسری طرف مصاحب گنج سے نزدیک واقع ہے انقلاب سلطنت کے بعد دونوں بھائی کلکتہ گئے امین الدولہ نے شاہ مرحوم کی رفاقت میں وہیں انتقال کیا اور مصاحب الدولہ رحلت خان عالم کے بعد لکھنؤ چلے آئے جھانکڑ باغ سلطان عالم کی حکومت میں بنا اور اس باغ کے بیچ میں ایک عالیشان کوٹھی تھی امین الدولہ کو تنخواہ کے دارو غہ کہے رہ چکے تھے ان کے متروکہ میں ورثے ۲ لاکھ روپیہ نقد پایا

اس محلہ میں ایک پرانا تکیہ تھا جس میں ممتاز محل ملکہ غازی الدین حیدر کی قبر تھی اس لحد پر نصیر الدین بہادر نے عالیشان مقبرہ بنوا دیا تھا اب نہ کوٹھی باقی ہے نہ مقبرہ نہ تکیہ کا نشان صرف جھانکڑ باغ ویران جگہ ہے۔

نگریاں

یہ محلہ مصاحب گنج سے ملا ہوا آباد ہے اور تاریخ یہ ہے کہ اس محلہ کی بنیاد حسن اتفاق سے اس دن قائم ہوئی جس روز نواب سعادت الدولہ نے علی گنج بسایا۔ اس محلہ میں مشہور عمارت۔

مسجد میر فضل علی ۔ عہد نصیر الدین حیدر بہادر میں معتمد الدولہ کی معزولی کے بعد میر فضل علی ۹ شوال ۱۲۴۳ھ کو وزیر اعظم ہوئے لقب ان کا اعتماد الدولہ فضار الملک سہراب جنگ اور والد کا نام میر غلام حسین تھا پرست ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔ والدہ سیدانی تھیں اور سیادت کی بدولت آغاز زندگی میں فیلبان کے عہدے پر فائز ہوئے بادشاہ کی طرف پشت کرکے سید کے سوا کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا قصر شاہی میں ماں کی بڑی عظمت تھی ان کی روحانیت کے تمام خورد و کلاں معترف تھے وزارت کے کسی امیدوار نے ان کو ۲ ہزار اشرفیاں اس لئے دینا چاہیں کہ وہ جناب عالیہ سے سفارش کرکے وزیر بنوا دیں۔ سیدانی نے سادگی طبع سے والدہ شاہ سے عرض کیا کہ مجھے ۲ ہزار اشرفیاں مل سکتی ہیں جناب عالیہ نے جواب دیا اشرفیاں لینے کے بدلے میں تمہارے بیٹے کو وزیر مقرر کرتی ہوں چنانچہ وہ وزیر ہو گئے۔

زندہ دلان لکھنؤ نے اس کی تاریخ دعا ت کہی۔ دولت و دہت بری بری ' ہاتھی چلاتے میں فیلبان یہی کہتا رہتا ہے۔ میر غلام حسین کا خاندان وطن میں حویلی والے بانکوں کا مشہور گھرانا تھا جو شمشیر زنی میں ممتاز تھا اور ان کے اسلاف کو اسم اعظم علوم تھا جس کی وجہ سے بڑے بڑے عہدوں تک پہونچے۔[۱۱۴۲]

ممدوح صرف ۹ ماہ ۲۲ دن وزارت پر سرفراز رہے بعض مصالح ذاتی سے خود اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے اس تھوڑے عرصے میں انہوں نے ایک کروڑ روپیہ جمع کر لیا وزیر اعظم کی تنخواہ اس وقت پچیس[۲۵] ہزار روپے ماہوار ہوتی تھی آپ میر خدا بخش کو اپنا نائب بنانا چاہتے تھے مگر جس دن خلعت نیابت جانے والا تھا اسی دن میر صاحب دنیا سے گذر گئے نگریوں میں جو عظیم الشان مسجد اور سربلند عمارت واقع ہے اس کے بانی میر فضل علی تھے۔

نگریوں سے پچھم کی طرف جو کوچہ واقع ہے اس میں داہنے ہاتھ کی طرف یہ مسجد ہے جس کے نیچے دوکانات اور کہیں کہیں کمرے ہیں۔ بعد صحن مسجد اور حوض، گرد و پیش مکانات، حجرے اور دوہرے دالان صحن مسجد کے بعد مسجد کی خوبصورت اور وسیع عمارت کو دیکھنے والے یہ فیصلہ کر سکیں مسجد تحسین کے بعد اس شان کی یہ دوسری شاندار مسجد ہے چبوترہ مسجد سے اس مسجد کے دروں میں روشندان ہیں اور یہ صنعت قرار دی گئی ہے کہ اگر اندر چراغ روشن ہو تو صحن مسجد اور درجہ مسجد میں روشنی پہونچے اور معمولی ہوا اس چراغ کو بجھا نہ سکے۔

برف خانہ

اگلے زمانے میں شوقین مزاج افراد شورہ قلمی اور دوسری دواؤں اور ترکیب سے حوض کی صراحیوں میں برف تیار کرتے تھے ہر جگہ برف نہیں ملتی تھی۔ ہیضے کے مریضوں کو اطبا اکثر دوا اور برف دیتے تھے اس وقت نواب صاحب اپنے آب خانہ سے برف دئے جانے کا حکم دیتے تھے یہ محلہ مصاحب گنج اور ٹھاکر گنج سے قریب ہے۔

۔ گزشتہ لکھنؤ

کربلائی مصری :۔ بیرون خانہ کی عورت ہے مصری عہد آصفی کی ایک خاتون تھیں جو سفر و حضر میں نواب کے ساتھ رہتی تھیں اور بارہ بیگھہ زمین ان کو عطیۂ شاہی سے ملی تھی اس اراضی کے ایک جز کو اس وقت مصری کی تکیہ کہا جاتا ہے۔ مصاحب الدولہ کی کربلا عہد جان عالم میں مصری کی زمین پر بنائی گئی مصری نے اسی جگہ اپنی منزل قرار دی اور مکان کے ساتھ مسجد بنوائی گھر اور خانۂ خدا کے درمیان ان کا امام باڑہ بھی تھا مسجد نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے مگر استرکاری کی نوبت نہیں آئی زمانہ گذرنے سے دالان کا پھاٹک اور باہر کے درجے جو پھاٹک کے پہلو میں تھے گر گئے صحن اور دالان باقی ہیں امام باڑہ کمرے کی وضع کا تھا جس میں ایک خوبصورت لکڑی کی پرانی ضریح رکھی تھی مصری کے سکونتی مکان کے کھنڈر ۱۹۲۶ء تک باقی تھے امام باڑہ کے باہر درخت کے نیچے ۱۱ تربتیں چھوٹی چھوٹی سی تھیں آج سے پہلے اس لیے یہاں کثرت سے تعزیے دفن ہوتے تھے اور مخلوق کا بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ عشرہ کے دن بازار لگتا تھا۔ معشوق گنج کی رفتہ رفتہ ویرانی سے یہ کربلا بھی غیر آباد ہو گئی۔ ہمعصر سید جالب دہلوی نے اپنی حیات میں ایک مقالہ[1] لکھ کر پبلک کو بتایا تھا کہ مصری کی تکیہ جو آصف الدولہ کی معشوقہ کے نام سے ہے میں پرانا قبرستان ہے سحر البیان کے جادو ۔ مصنف میر حسن (انیس کے جد امجد) اسی گورستان میں دفن ہیں۔ ہمارے احاطہ مرزا علی خاں کے ذیل میں میر حسن کی قبر کو باغ قاسم علی خاں کے پچھواڑے شمس العلماء آزاد کی تحقیق کے مطابق لکھا ہے۔ جالب کے سامنے آب حیات ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ باغ قاسم علی خاں کے حدود مصری کی تکیہ سے ملتے ہوئے ہوں۔

اسمٰعیل گنج

عہد برہان الملک میں جن لوگوں نے پڑاؤ ڈالے تھے وہ یہی جگہ تھی شررؔ نے اس محلہ کو مجی ٹولوں کے شرق میں قرار دیا ہے جو غلط ہے اسمٰعیل گنج کاکوری روڈ پر ہے اور کربلائے رفیق الدولہ اسی محلہ میں بنائی گئی ہے یہاں خاندان شاہی کی بڑی فرد ملکۂ دوران اشرف النساء حسینی بیگم مخاطب ناصر بہو بیگم نواب افسر الدولہ پسر میر الدولہ غدر ۱۸۵۷ء میں رہتی تھیں۔ ان کا باغ اور عالیشان محلسرا تھی یہ خاتون چھوٹی شہزادی کے نام سے مشہور رہیں آپ نے بعض حکام کو جو خط لکھا ہے۔ اس کی نقل ملاحظہ ہو[2] باعث تحریر ایں سطور آنکہ بیچ زمانہ غدر کے بدمعاشان میرے مکان واقع اسمٰعیل گنج میں گھس آئے اور تمام اسباب لوٹ کر لے گئے اور میں اس مکان سے بھاگ کر بمقام سعادت گنج اپنی نانی کے مکان میں آئی وہاں پر بھی بدمعاشان نے ستایا پھر ممو خاں کے مکان کے اندر گھس آئے اور مجھ کو لوٹا کہ دوپٹہ تک سر سے اتار لے گئے۔ وہاں سے بھاگ کر اپنی ماں جناب عالیہ (جو لندن گئی ہیں) کے مکان گئی۔ وہاں جان بچا کر رہی جب وہاں بھی مفر نہ پایا تب جا بجا شہر میں متفرق چھپتی رہی بعد اس کے جب ـــ میں اور میری بیٹی تن تنہا پا برہنہ بیرون شہر چلی گئی جج صاحب اس حال سے واقف ہوں مہربانی اس قاعدہ پر عمل دلاتے چو الشہادت کریں فقط المرقوم بست و دوم ماہ اکتوبر ۱۸۵۸ء" قاعدہ سے اس عرضداشت پر دستخط اکبر شہر کی ہوں گی مگر میرے سامنے جو مثل ہے اس میں نقل نویس نے اسی قدر لکھا ہے اور ایک دوسری تحریر بھی آپ کی مثل میں موجود ہے جس میں اپنی مصیبتوں کی زیادہ سے زیادہ دکھائی ہے۔

---

[1] روزنامہ ہمت لکھنؤ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء سنہ گزشتہ لکھنؤ

[2] عدالتی اشتہار مطبوعہ نور المطابع وثیقہ نواب محمد جعفر علی خلف نواب رفیق الدولہ۔

حکام عالیشان کو بمقام یہی گذارش معلوم ہوا ہوگا کہ ہم خیر خواہ سرکاری بدمعاش بیٹے میرے کو واسطے بنانے سرغنہ بدمعاشوں کے مانگتے تھے میں نے نہ دیا اور چھپایا اور اس سبب سے میرے اوپر یہ مصیبت گذری کہ تین دفعہ لوٹی گئی اور رہا بجا شہر میں اپنی جان بچانے کو چھپتی رہی اور اس درجہ کو ہو پہنچ گئی چنانچہ واسطے بجوت لوٹنے بدمعاشوں کے تین دفعہ مجھ کو عدم سازش وآمیزش ساتھ بدمعاشوں کے محضر مہری دارو غہ میر واحد علی کے پیش کرتا ہوا روبرو آپ کے۔ اب متوقع آپ کی مہربانی سے ہوں کہ جیسا حکام عالیشان سابق سے عزت اور توقیر اس خاندان کی کرتے رہے ہیں آپ بھی براہ ترحم میری تباہی اور بربادی اور افلاس پر خیال کرکے قطعہ سرٹیفکٹ معافی مرحمت فرمائیں اور روپیہ سود نوٹ میرے کا مجھے ملے کہ صورت گذارا میری کے ہووے ورنہ نوبت فاقہ کشی کی پہونچے گی۔ زیادہ کثرِ شوق کے کیا لکھا جائے۔[1] ملکہ دوراں نواب افسر محل معرفت محمد فخرالدین مختار عام ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء

اسمٰعیل گنج کا ذکر مرزا قتیل نے بھی اپنے رقعات میں کیا ہے۔ ان کا ایک رقعہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو "اکبر علی خاں نے مذکورہ بالا خط برخوردار میر محمد تقی خاں کے حوالے کر دیا ہے اگر وہ بھیج چکے ہوں تو خیر ورنہ خدا بخش کو اسمٰعیل گنج بھیج کر منگا لو۔"

تحسین گنج

تحسین علی خاں نواب ناظر نے اس محلہ کو بسایا خود ان کی عالیشان محلسرا اسی محلہ میں تھی جہاں صبح سے شام تک کتنے سیاسی مسئلے حل ہوتے تھے۔ ملک کی فلاح و بہبود پر غور کیا جاتا تھا۔ پبلک مفاد پر بحث ہوتی تھی ادبی چہل پہل اس محلسرا کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کا ذکر صفحہ تاریخ پر باقی ہے۔ بڑے بڑے مشاعرے یہاں ہوتے تھے دعوت نامہ بھیجکر نامور شعرا اور اہل سخن طلب کئے جاتے تھے اور وہ قابل ذکر اجتماع ہوتا تھا کہ جو کسی بزم میں نہ تھا وہ تاریخی مشاعرہ جس میں[2] دہن بگڑا، چلن بگڑا، کفن بگڑا، اس طرح میں غزلیں کہی گئیں اور بقول پالا آتش کے ہاتھ رہا اس پر نور صحبت کی دو غزلیں ناسخ اور آتش کی ملاحظہ ہوں شیخ امام بخش فرماتے ہیں ؎

جو بوسہ لینے میں کل مجھ سے وہ تیری دہن بگڑا	لگا کہنے بہت تیرا ہے ان روزوں چلن بگڑا
میں کہتا تھا نہ بیٹھا کر رقیبوں کی تو صحبت میں	مزاج آخر نہ تیرا مجھ سے اے پیماں شکن بگڑا
مزا ملا آگیا ہے کس لب شیریں کے بوسے کا	تمہارا بالقہ جو آج اے کام و دہن بگڑا
بتوں پر مر گیا ہوں میں بتوں کے نام لکھنا ہے	کفن دو اور مجھ کو موسو یہ کفن بگڑا

آتش :-

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا	خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا
عنادِ ِکیف ِگلی سے نکل گئی اس شوخ کی آتش	لگا کرنے سے بیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا
لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب	زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک	نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

اس عمارت کا اب کہیں بھی نشان باقی نہیں ہے مگر تحسین کی مسجد اور امام باڑہ چوک میں موجود ہے۔

میر علی سوز خواں :- اس محلہ کو میر علی صاحب کی قیامگاہ ہونے کا بھی فخر حاصل ہے اور میر علی صاحب کی حیثیت تاریخ اودھ اور

---

[1] رقعات مرزا قتیل ص۴ طبع قدیم [2] یادگار ص ۱۹۵۸ء ص۱۳

شہلائے عزاداری میں محتاج تعریف نہیں ہے۔ آپ عہد نواب سعادت علی خاں کے باکمال تھے موسیقی میں عمر صرف کی لحن داودی خدائے قسمت میں لکھ دیا تھا اور اس وقت کی دنیا نے طے کیا تھا کہ ایسا گلا ہے نہ ایسی آواز، قدرت کے ان دو عطایا پر تحصیل فن کے جوہروں نے اور سونے پر سہاگہ پیدا کیا اور میر علی اپنے وقت کے بیجو باورے اور تان سین سمجھے جاتے تھے اور عام طور پر کہا جاتا تھا کہ گوالیار کھنچ کر لکھنؤ آگیا ہے۔[1]

یہاں کے مذہبی ماحول میں دفعتاً چونکے اور نام و نسب کی لاج رکھی فوراً یہاں کا جلوہ ہوا طے کر لیا کہ اب غزل نہ پڑھوں گا اس وقت کے پاسدار انسان کا قول و قرار بات کے دھنی اور مرد کا عہد و پیمان اتنا مستحکم تھا کہ مرتے مرتے کسی طاقت سے نہ توڑتے۔ اور طبیعت کا بہاؤ مرثیت کی طرف ہوا مرزا فصیح میاں سکندر، دلگیر اور ضمیر کے سلام اور مرثیے ملک میں فروغ حاصل کر رہے تھے سوز خوانی کی بنیاد قائم کی۔ اور فن کو اتنا باوقار بنایا کہ کسی کے در پر جا کر کبھی سوز نہ پڑھوں گا جس کو غرض ہو میرے گھر پر آئے حسن و بے میر علی صاحب نے تو۔ کی ان کی ڈیوڑھی بیت شیفتگان کا ہجوم ہونے لگا کمال میں وہ حد تھی کہ راہ دو۔ جاتی بھی ادھر آتے تھے نازک مزاج بھی تھے ایک مرتبہ لکھنؤ چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا اور نواب سعادت علی خاں تک خیال ہوا اس نے قدر و منزلت کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ الغرض ہوتی اسی وقت سعادت علی خاں کے پاس پہونچے۔ نواب نے متحیر ہو کر پوچھا خیر ہے کیوں آئے انھوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دولت تن ہے اور سعادت علی خاں یا رب سدا یہیں ہمیشہ ہی رہے

پھر کہا حضور غلام جواب وقت رخصت ہو کر چلا تو دل سے کہا کہ اپنے دولہا کی دولہن عروس سلطنت کو ذرا دیکھوں حضور واقعی بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی سر پر جھومر وہ کون مولوی دلدار علی صاحب کانوں میں جھمکے وہ کون دونوں صاحبزادے گلے میں نولکھا ہار وہ کون خواں علامہ غرض اسی طرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں سہ نہیں دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا نواب نے پوچھا پھر وہ کون کہا حضور تھے میر علی صاحب لعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا ان کی دور اندیشاں کا ہیں میں ایسے صاحبان کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرت بے اصل کے دفعیہ کے لئے ترقی کا پروانہ اور پانچ سو روپے کا خلعت لے کر وہاں[2] سے پھرے۔

میر سید علی کی خودداری کا دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو۔ مرزا قتیل کا بیان ہے۔ ترجمہ زبان اردو سے[3] آج میراجی کی سترھویں شب ۱۲۲۲ھ پیر کے دن دو گھڑی دن رہے مرزا بزرگ پسر مختار الدولہ دھرینہ میں بڑے ماہر ہیں، کے ساتھ میں اور مرزا حاجی۔ میر علی صاحب کے سننے کے لئے جانا چاہتے ہیں اطلاعاً لکھا گیا" یہ تمام لوگ خود صاحبان کمال ہیں۔

تیسرا[3] واقعہ شاہ عبدالرحمن جن کا حال عنقریب آیا ہے اپنے عہد کے صوفی اور درون کامل کہے جاتے تھے حضرت مولانا ایک روز خود بخود فرمانے لگے ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ مرثیہ میر علی صاحب کا کہ مرثیہ خوانی میں مشہور آفاق ہیں سنیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاؤں میں طاقت نہیں ہے کہ ان کے مکان جا کر مرثیہ سنیں۔ وہ سوائے اپنے مکان کے دوسری جگہ مرثیہ نہیں پڑھتے خادموں نے عرض کیا کہ بسواری فینس میں ان کے مکان پر تشریف لے جائیں اور مرثیہ ان کا سنیں در جواب اس کے آپ نے فرمایا کہ مرثیہ سننے

---

[1] آب حیات [2] رقعات مرزا قتیل نمبر ۲ صفحہ ۲۴ طبع شاہی [3] علامہ ارشاد الرحمن صفحہ ۱

چاہیے اور سوار ہو کر جاہیے یہ ہے ... ی م سے ... ہو گی، صاحبان ثروت کا جو خوش الحانی کے دلدادہ ہوں آنا تعجب نہیں۔ تھا
اس کی سبب حیثیت ہے جو خو ... ریچ ... ئی ا... ریفر کا ماں جو وہ مرثیہ کا دلدادہ ہے۔

ہندوستان میں جتنے سوز خواں تھے سب کا سلسلہ میر علی صاحب تک پہونچتا ہے اس سلسلے کے ایک مرد پیر جو مرض ضیق النفس سے لمحات زندگی پوری کر رہے تھے اور کامل فن سوز خواں تھے حامد حسین فتحپوری ان کا نام نامی تھا موصوف نے بتایا کہ میں اپنے طاقت و توانائی کے زمانے میں شعار گنج جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی طرف مڑ کر مکان نواب علی نقی خاں میں پہونچا اور وہاں میر علی صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھا ... سال پہلے تک ان قبر تکنے والے باقی تھے

امامباڑہ نمبر عباس خواص والے :- عہد شاہی کے پرانے امامباڑوں میں اس عزاخانہ کا نام لیا جاتا ہے جو تحسین گنج اور مکان حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کے پچھواڑے تھا اب کچھ پتہ نہیں ہے اس زمین پر ایک پرانی مسجد ہے جو ممکن ہے کہ امامباڑے کے ساتھ کی ہو۔

جمعہ مسجد :- مذہب امامیہ کی سب سے بڑی مسجد ہے لمبان چوڑان میں یوپی کی ہر مسجد سے بڑی ہے تحسین گنج میں واقع ہے یہ عمارت حضرت محمد علی شاہ بادشاہ نے عہد دولت کے آخری زمانے میں شروع کیا عمر نے وفا نہ کی تکمیل سے پہلے بادشاہ نے رحلت فرمائی ان کے بعد نواب ملکہ جہاں نے توجہ کی یادگار کو تمام کیا اگلا نام اس محلہ کا ... ہے کہ میر نعیم خاں کی گڑھی تھا اس وقت یہ مسجد سبزہ زار میں ہے اور چار دیواری اور پھاٹک عہد قدیم کے انگریزوں کے زمانہ حکومت میں باقی ہیں یہ مسجد بلند ہے درگئی زینہ کے بعد لق و دق صحن شروع ہو گیا ہے اور پہلو میں ... رومی دروازہ آصفی کے رومی دروازہ کا نقش ثانی ہے باب درمیانی کے دونوں طرف پانچ پانچ در قائم کئے ہیں جن کے اوپر دوسری منزل میں بھی منزل زیریں کے موافق در بنا کر اس کی منڈیر پر طاق گمرہان اور کلسیاں بنا دی گئی ہیں اندرون مسجد کی گلکاری رنگ آمیزی سقف کے نقش و نگار آیات قرآن اور دعائیں اس قدر شوخ رنگ کے قلم سے لکھے گئے ہیں کہ لعوروں میں کھیے جاتے ہیں پہلے درجے دوسرا درجہ وسیع تر اور دیوار و در ... عرب کا اعلیٰ نمونہ گنبد دیگر مسجدوں کے برخلاف مسجد کی طویل و عریض حدود کے مطابق برکت سے دور سنگی نمونہ پر اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اونچے پتھر تراش کر بصورت قبہ نصب کئے گئے ہیں ہر سر گنبدوں میں سنہری کلساں اور چاند تارے بنے ہیں کہا جاتا ہے کہ مسجد کے منارے سات کھنڈوں سے بھی اونچے تھے اور آسمان سے باتیں کرتے تھے زلزلہ میں شمالی منارہ کو نقصان پہونچ گیا اس لئے دونوں گلدستوں کے ناقابل تحمل حصہ بالا کو اتار دیا گیا

HISXCELLENCY THE EARL OF DUFFERIN, VICEROY AND GOWERNOR GENERAL OF INDIA MESSERS BAURUE

کا اسم میرے کتب خانہ میں ہے جو SHEPHERED PHOTOGRAPHIC ARTISTS کا شاہکار ہے اور مسجد جامع کا اس وقت کا عکس ہے جب دست راست کے منارہ میں تین کھنڈ اور دست چپ میں ڈھائی کھنڈ باقی تھا اور ہر دو طرف پاٹ بندی ہوئی تھی پشت مسجد کو اساس عمارت سے مضبوط اور مستحکم بندے کر وہاں تک کمربستہ بنایا گیا ہے جہاں سے زمین مسجد شروع ہوتی ہے مسجد پر بالغ نظر کرنے والا یہ رجحان بھی کر سکتا ہے کہ مسجد میں چار منارہ تھے ہم دیکھتے ہیں کہ مسجد کے پچھواڑے ردکار کے مناروں کے ... باب میں نیچے سقف مسجد تک سر تا سر منارے بنے ہیں اور بام مسجد تک پہونچ کر اس کو قطع کر دیا گیا ہے اگرچہ حصہ اصل بانی کے وقت

کا ہونا تو اس پر بھی اور گنجری کا ہونا ضروری تھا اس کی حیثیت اس وقت نا تمام یا منہدم سجدہ کو روک دینے کی ہے۔

اس مسجد میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیش امام کے سجادہ کی جگہ تقریباً ۶ انچ پست ہے اور یہ اس لئے ہے کہ مسلک ا ما کے مطابق امام کو ماموم سے بلند نہ ہونا چاہئے۔ ہونے میں پیش امام کی جا نماز ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ صحن میں جو ساری سترہ یک ہزار جماعت ہوں ان کی نماز آئین کے خلاف نہ ہو مسجد کی گلکاری پر ہمعصر شیخ تصدق حسین بی اے ایل ایل بی وکیل نے اپنے مقالے میں حسب ذیل بیان دیا ہے۔

چھتوں میں ایسی حسین اور دلآویز گلکاری ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے الفاظ اس کی خوبصورتی بیان کرنے سے قاصر ہیں کہیں کی بیلیں بنی ہیں کوئی چھت پھانکوں دار خربوزے کی مثل بنائی گئی ہے کسی چھت میں پلیٹیں بنی ہیں جن کے بیچ میں نفیس کام کیا ہے اگلی دالان کی چھت میں ایک تالاب ہے اس کے کنارے کنارے لیمو، نارنگی، شریفہ، آم، خربوزے، انناس، انگور کے خوشے اور شاخوں کے گلدستے اصل سے بالکل مشابہ کرکے بنائے گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ مسجد ایسی صناعی اور خوش نمائی کے لحاظ سے یہ عمارت ہے رنگوں کے تال میل گل بوٹوں قلم کار جالیوں کی دلفریبی اور سحرکاری کے آگے دوسری مسجد نہیں جچتی" مسجد کا نقشہ جو تحت میں یہ سر بفلک عمارت تیار ہوئی ایسٹ کے یہاں رہن شدہ اشیاء میں ابھی تک موجود ہے

نجم الغنی نے اس مسجد پر توجہ مبذول کرکے پھر غلط بیانی کی ہے اور وہ اس کو اب تک نا تمام عمارت تسلیم کرتے ہیں اس عہد شاہی کے بعد ملا دالعلما، سید ابو الحسن عرف کچھو صاحب مجتہد موروثی حیثیت سے نماز پڑھاتے تھے جن کی تاریخ وفات، اصرف

<u>نا تمام اماما باڑہ</u> ۔ مسجد جامع کے قریب ایک نامکمل عمارت ہے جس کی پختگی استحکام در و دیوار سے واضح ہے یہ مسجد کے ساتھ امام باڑہ تھا جس کے پایے بلند ہو گئے تھے محرابیں اور چھتیں باقی تھیں بعد انتقال محمد علی شاہ بادشاہ سرمایہ کی کمی سے ادھورا رہ گیا عمارت کی اٹھان بتاتی ہے کہ اگر مکمل ہو جاتا تو مسجد کی طرح یادگار عمارت ہوتی اس نا تمام عمارت کے پشت کا رخ جو کاکوری روڈ جانے والوں کو نظر آتا ہے عمارت کے محرابوں کی دو رویہ قریب تکمیل صورت میں ہے اور غربا اس میں رہتے ہیں اس میں ۵ اور محرابیں مکمل ہیں اگر پوری عمارت بن جاتی تو یہ حصہ زیر امام باڑہ کے دو مکانات میں شمار ہوتا

<u>محلسرا، نواب علی نقی خاں</u>:۔ آخری دربار اودھ کا قصر بھی اسی محلہ میں تھا اور نواب علی نقی خاں انقلاب سلطنت سے پہلے ہی بہر دلعزیز تھے جیسا کہ ایک وزیر کو ہونا چاہئے چنانچہ میر تکمیر صاحب مرحوم ان کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

نواب ہے محسن مرا آباد رہے یہ ہمنام علی اور نقی شاد رہے یہ

اس محلسرا کے کچھ کھنڈر اب بھی باقی ہیں نواب سید محمد نواب صاحب رئیس لکھنؤ اس عمارت میں بھائیوں کے ساتھ تھے ان کی حیات تک یہ مکان آباد رہا وہ سہ پہر کو فٹن پر ہوا خوری کے لئے نکلتے تھے موٹے تال کی عینک لگائے ہوئے نظر زیادہ کمزور کا رنگ اور بال سیاہ گچھے سر پر بہت پتلی اور خاص طرح کی ناؤ دار ٹوپی جو صرف انھیں کے سر پر نظر آتی تھی ۔ پیچھے دامن کی اور چوڑی دار گھٹنہ زیب جسم پہلو کے جیب میں گھڑی اور یہیں نواب سلطان علی خاں عرف باسو صاحب مرحوم نواب سید شیخ خاں آف گھسیاری منڈی جانی منے نواب صاحب جن کا خود ایک خوبصورت امام باڑہ شیشہ آلات سے آراستہ اسی تحسین

[illegible]

موجود ہے۔ ان کے ہمسر، دوست، احباب اور رفقا لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تصویریں تھیں۔

نواب تقی خاں نے ۱۲ رمضان ۱۳۲۱ھ کو محسن الدولہ کے مکان میں مبتلائے ہیضہ ہو کر انتقال کیا۔

علی نقی خاں کی وفاداری بادشاہ اودھ کے ساتھ آفتاب سے زیادہ چمکتی ہے۔ میں نے عہد شاہی کے بوڑھوں سے سنا تھا کہ جب ان کا جنازہ اٹھا تو قوم کا ایسے وقت میں بھی ان کے بارے میں جو خیال قائم ہو چکا تھا وہ دلوں میں دبا نہ رہا اس مخالفت عام کا تاریخی ثبوت بھی مل گیا ہے۔ علی نقی خاں کا ارادہ تھا کہ کلکتہ میں شاہ سے ملیں اس ارادہ میں سفر کیا اس وقت کے حالات یہ ہیں۔

جب شوروغل سڑک پر گذری مردم بازاری نے سواری کا اہتمام کیا دم رخصت مسافر کو خدا و رسول کو سونپتے ہیں۔ ان لوگوں نے یہ دستور کیا جو منہ میں آیا بے تکلف سنایا نواب صاحب نے بار وقار سے دب کر سر کو نہ اٹھایا۔

امامباڑہ اختر محل: نواب تقی خاں اپنی صاحبزادی رونق آرا عرف اختر محل کے لئے اودھ کے دور آخر میں ایک امامباڑہ بنوا رہے تھے کہ غدر ہو گیا اور جو عمارتیں بڑی تھیں وہ مٹ گئیں۔

<u>نواب اختر محل</u>۔ اختر محل والی اودھ کی محلی بیگم تھیں اور شاہ مرحوم کے ساتھ کلکتہ بھی گئیں اور شاہ مرحوم کی رحلت کے بعد ۱۸۸۷ء میں اپنے میکہ تحسین گنج آ گئیں اور ۱۹۰۸ء میں بعمر ۵۹ سال درد سینہ میں مبتلا ہو کر دنیا سے عقبیٰ کو سدھاریں اور تحسین گنج میں دفن ہوئیں۔

اختر محل شعر و سخن میں یکتا تھیں شاہزادہ مرزا سلیمان جاہ انجم ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ملکہ کی فرمائش سے اپنا کلام سنانے لگے اور یہ شعر پڑھا ؎

دم مرا نکلا ہے دردوں کے ساتھ — بڑی گھبرائی ہوئی ہوں ہاں کی طرح

ملکہ نے فرمایا دوسرا مصرعہ بدل دو ع تری شرمائی ہوئی ہوں ہاں کی طرح

<u>ایک دعوت</u>:۔ حامد علی خاں بیرسٹر تہذیب لکھنؤ کی آخری شمع تھے ان کے دور تک لکھنؤ کے کانوں میں زوال کا رونا سنائی نہیں دیا گیا مگر انگریزیت رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ دعوت میں حیدرآبادی طرز پر سب مہمانوں کے سامنے خالی پلیٹیں اور کاسے میں سالن اور رقاب میں ... آ چکا مگر نکالنے میں کسی نے پہل نہ کی اس لئے کہ بارق صاحب خودداری کے ساتھ ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے تھے وہی سب سے بوڑھے تھے جب تک ابتدا کرنے کون سبقت نہیں کر سکتا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے بارق صاحب کی طرف رجوع کیا انہوں نے عرض کیا بسم اللہ، بیرسٹر صاحب نے کہا کہ یہ بھی تو دیکھئے کہ کتنا کھاؤں بس یہ سنا تھا کہ نوکروں کو ... ہوا اور پلیٹیں اٹھا دی گئیں پیالوں میں قورمہ سالن قدیم دستور کے مطابق نکل آیا اور تمام حاضرین بارق صاحب کی ... وضع کے قائل ہو گئے

بارق میاں عشق کے ہمعصر اور پرانے روایات کے حامل تھے ان کا فوٹو میرے پاس ہے۔

<u>بندے خاں</u>:۔ عہد نصیر الدین حیدر میں پیدا ہوئے۔ عہد سلطان عالم میں فن موسیقی کی تکمیل ہو رہی اور دو مرتبہ استاد ملنے سے ... العمر ... نے کر آخرت کی راہ لی بڑے بیٹے کا نام محمد حسن خاں تھا جو موسیقی سکھانے میں کامل مانا گیا اور چھوٹے کا نام

---

[1] ماہنامہ دسمبر ۱۹۵۹ء ... لکھنؤ

احمد خاں سے ان کے معلومات تو بہت ہیں مگر خوش قسمتی سے کچھ نہیں ہیں۔ واقف کار لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا مکان وہاں تھا جہاں کہ حامد علی خاں بیرسٹر کی کوٹھی ہے۔ تہذیب مہدی کا موقف عرض کرتے ہیں۔ یہ بیرسٹر صاحب کی کوٹھی تھی اب نہ رہی عقب مسجد جامع جو مخلہ ہے اور سامنے ایک مسجد ہے۔ اس مسجد کے سامنے حامد علی خاں کا مکان تھا۔ ڈوولے خاں تالکٹورہ کی مقدس کربلا میں سپرد خاک ہیں۔

<u>مہدی حسن خاں :</u> آپ تحسین گنج میں رہتے تھے اندر میں کھانے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ واجد علی شاہ کو ان کی شخصیت پر ناز تھا۔ بعد غدر ریاست دتیا چلے گئے اور کوئی سنگھ پکھاوجی سے مقابلہ ہوا اور اس کو شکست دی ایسی میں بجائی کہ وہ ساتھ نہیں دے سکا راجہ نے انعام سے سرفراز کیا۔ مہدی حسن[1] ڈوولے خاں کے بیٹے تھے بعد موت سکندرا ہی ملک بقا ہوئے اور عظیم اللہ خاں کی کربلا میں دفن ہوئے۔

<u>حکیم پیارے علی :</u> عہد واجدی کے مشہور طبیب تھے باغ نواب علی نقی خاں کی پشت پر ان کا مکان تھا نبض دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کیا مرض ہے قیافہ شناسی میں ایسا کمال تھا کہ ایک دن اپنے گھر کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک نوجوان[2] لڑکا ادھر سے جا رہا تھا اس کو بلایا اور کہا کہ تم کبوتر بہت اڑاتے ہو، اس نے کہا جی ہاں حکیم صاحب نے کہا جاؤ اب قوّ زور سے نہ کرنا۔ جاؤ گے لڑکے نے حسب معمول کوٹھے پر چڑھ کے کبوتر اڑائے اور زور سے قوّ کی فوراً دم نکل گیا۔

<u>کوٹھی نواب علی نقی خاں میں طاقت کا مظاہرہ</u> مرزا احمد حسین عہد واجدی میں دوسرے درجے کے رسالدار تھے مرزا علی بیگ کوتوال کے بھائی تھے۔ جب نواب علی نقی خاں تحسین گنج میں کوٹھی بنوا رہے تھے تو تعمیر کے سب لیکھے تھیں کہ چوکھٹ والے عمارت میں لگے ان کا بوجھ گھوڑا نہ اٹھا سکتا تھا کہتے ہیں پرپہنچتے تھے اور ہاتھی کی دم پکڑ لیتے تو وہ آگے نہ بڑھتا ہاتھی کی پیٹ پر گھونسہ[3] مارتے تو وہ چیخ اٹھتا اس قدر طاقت[4] کے د۔ نواب علی نقی خاں نے ان کو نوکر کیا ان کے لگدر کی جوڑی تین من کی تھی۔ ان میں سیسہ بھرا تھا غدر کے کئی سال بعد انتقال کیا

<u>دھومی خاں :</u> آپ شہنائی بجانے میں[5] تھے تحسین گنج میں قیام سکونت تھی۔

<u>ٹھاکر گنج :</u> عہد نوابی کے بہت حصہ میں دل لگا کر یہ محلہ بسایا اور حکومت کی رواداری تھی کہ ہر بستی کو نگاہ امتیاز سے دیکھی اور بسنے والوں کی ہمت افزائی کی ٹھاکر توم اس وقت سے عہد میں بھی جاتی ہے جب اچھوت افراد پر نظر التفات پڑتی تھی کا کوری ست آنے والوں کو پہلے ٹھاکر گنج پڑتا تھا اس لئے یہ محلہ اس وقت بھی غلہ اور ترکاری کی منڈی تھا اور آج بھی، ختم عہد شاہی اور غدر کے بعد کافی آباد ہے گیہوں، جو، چنا، مٹر دالیں فراوانی کے ساتھ آڑھتیوں کے یہاں فراہم رہتی ہیں اور آم خربوزے، تو ریا ترکاریاں سے براہ راست آتی ہیں اس محلہ میں۔

<u>راجہ مہرا کا مکان :</u> نواب آصف الدولہ کی پالکی اٹھانے والا چہیتا کہار راجہ مہرا اس کی ایک پختہ حویلی ٹھاکر گنج میں بھی تھی عہد آصفی کی یہ عمارت اب باقی نہیں صرف تاریخ میں تذکرہ ہے راجہ مہرا کے حالات زندگی اور شخصیت کا کچھ تذکرہ محلہ پیر خاں کی گڑھی میں ہو چکا ہے اور آئندہ اپنے محل پر انشاء اللہ بسط کے ساتھ حالات آئیں گے ناظرین منتظر رہیں

---

[1] قیصر ص۶۹ [2] ایضاً ص [3] قیصر ص۹۵ [4] قیصر ص۱۱۱ [5] قیصر ص۱۱۱ [6] ایضاً ص۹۱

امام باڑہ جھاؤلال:۔ آپ نواب آصف الدولہ کے دربار سے لکھنؤ میں بڑی شاندار زندگی بسر کی۔ آپ کے سگے بھائی میاں دلگیر نے اسی دور میں مذہب تبدیل کر کے شعر و سخن اور مرثیہ گوئی میں وہ نام پیدا کیا جو آج تک باقی ہے جھاؤلال کے سفر عظیم آباد اور اسلام کا ذکر مدرگا پرشاد نے بیخ میں کیا ہے ایک پل این آباد کے قدیم راستہ پر اور ٹھاکر گنج کا امام باڑہ ان کی یادگار ہے۔

امام باڑہ:۔ گول دروازہ سے جاتے وقت ٹھاکر گنج پہونچ کر داہنے ہاتھ پر ایک بلند اور شاندار مسجد ہے جس میں گنبد نہیں ہیں اور بائیں ہاتھ پر اور آگے بڑھ کر یہ امام باڑہ ہے جس کے حصار کی دیواریں باقی نہیں ہیں ایک ، بالو دروں کا دالان اور اس کے بعد پچھ شکستہ رہ گئی ہے جس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پھاٹک اور پہلو کی صحنچیاں کس قدر شاندار اور رفیع ہوں گی چھتیں بھی باقی نہیں ہیں عہد جھاؤلال میں اس عزاخانہ میں بڑی دھوم سے مجلسیں ہوتی تھیں جن میں نواب امین الدولہ امداد حسین خاں کی شرکت کا تاریخ میں تذکرہ ہے۔ قدوۃ العلما سید آقا حسن المتوفی ۱۳۴۸ھ نے شیعہ کالج سے بددل ہونے کے بعد اس امام باڑہ میں شیعہ بیت المال کھولا تھا اور طلبہ کو ... علوم متفرقہ کے سبق پڑھاتے تھے ۱۳۴۴ھ سے ابن سعود کے خلاف جنت البقیع کی بربادی پر اس امام باڑہ میں یوم غم منایا جاتا ہے

مولوی ہادی علی میلاد خواں:۔ آپ آخر عہد شاہی میں پیدا ہوئے تھے سیتاپور وطن تھا مرض وفات کے موقع پر مسجد ٹھاکر گنج میں آکر ٹھیرتے تھے مسلمان ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے میلاد خوب پڑھتے تھے عربی کے بہترین خوشنویس تھے قاسمی پریس سہارنپور نے ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف چھاپا ہے اور ان کی مرتب کردہ فہرست کتب میں اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے مولوی اشرف علی دوسرے خطاط ان کے ہمعصر تھے لکھنؤ میں سنی شیعہ مصالحت کے سلسلے میں مقام امام باڑہ آصف الدولہ اہلسنت کی طرف سے مجلس اور مولانا سید سبط حسن صاحب کی خواندگی کا اعلان اور دوسرے دن شیعوں کی جانب سے مولود اور مولوی ہادی علی صاحب سے پڑھنے کا وعدہ ایک تاریخی وعدہ ہے جو اخبارات میں موجود ہے اس موقع پر آپ کسی وجہ سے شریک صحبت نہ ہو سکے اور علماء کرام لکھنؤ میں مولانا سید نجم الحسن صاحب کی تحریک سے اس عظیم الشان اجتماع میں عین وقت پر مولانا سید محمد حسین صاحب مرحوم مشہور عالم شیعہ اور محدث پڑھے اور یادگار تحریک اتحاد کمیٹی نے موصوف کے اس بر محل لعون کو آخر تک یاد رکھا

نواز گنج

نواب آصف الدولہ کا بسایا ہوا محلہ جس میں خاندان شاہی کے معزز طبقے اور امراء اودھ کی عمدہ ڈیوڑھیاں تھیں جن پر مدت تک دولت عزت حشمت اقتدار کا مرکز تھا اور چند ناموں کے سوا تمام ہستیاں گمنام رہ گئیں اور محلہ اس وقت سے ... ہونے کے بعد ابھی تک آباد نہیں ہوا کہیں کہیں آثار قدیمہ کسی مکان کی دیوار کسی قصر کی بنیاد اور کسی باغ کا دروازہ نظر آتا ہے۔

راجہ بیدار بخت بہادر:۔ اس محلہ کے پرانے رئیسوں میں آپ تھے اور وقف حسین آباد کی تولیت بڑے شاندار طریقے پر آپ سے متعلق تھی ... تک کہ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ میں گوشہ قبر بسایا۔ اخبارات نے تعزیتی نوٹ لکھے کئی بیٹے چھوڑے مگر وجاہت ذاتی اپنے ساتھ لے گئے صرف چالیس روپیہ ماہوار تھا اور دروازہ پر ہاتھی مختلف گاڑیاں صاحبزادوں کی سواری اس کے علاوہ اندر سے باہر تک ... سو نوکر چاکر، ضرورت کے موقع پر وار دین نے آکر عرض کیا فلاں کام کے لئے پانچ سو روپے کی ضرورت ہے تو بر مطالبہ پر یہی ... ملتا تھا کہ فرش کے نیچے سے نکال لو اور جتنا روپیہ مانگنے والا مانگتا اتنا ہی چاندی کا گوشہ الٹ کر نکل آتا لوگ یہی سمجھتے تھے

• بوستان اودھ ص ۱۹۲۳ء

بست نصیب ہے اور قلیل آمدنی پر یہ اولوالعزمی قدرت خدا ہے۔

مرزا شوق :۔ اردو ادب کا مشہور انسان جس کا نام حکیم تصدق حسین تھا ان کی مثنوی زہر عشق سے زیادہ مقبول آج تک کوئی نہیں ہوئی یہ مثنوی انگریزی دور میں خلاف قانون قرار دی گئی تھی مدتوں چھپ نہیں سکی۔ لوگوں نے زبانی یاد کرلی تھی۔ عشاق میں شوق کا ایک شعر ہے

صبح کو طایران خوش الحان　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موصوف ہے کچھ معلوم نہیں کہ شوق کی اولاد ہے یا کوئی باقی نہیں۔ پچاس برس پہلے ان کے بیٹے مرزا ... رنگ کا رومال گلے میں دوپلی ٹوپی سر پر رکھ کر چوک میں نکلے تھے ... تھے ان کے ... کی مستی اب تک ان کو یاد ہے۔

مرزا علی عباس :۔ نوارگنج کے مشہور لوگوں میں تھے ... کبوتروں میں سے کوئی ... کسی سے کہہ دیا کہ جب یہ کبوتر کوٹھے پر آکے بیٹھے تو ... رئیس کے یہاں آئے اور ان کے کوٹھے پر ... کبوتروں کے ... میں ... کر تماشہ پر بیٹھا انہوں نے لت اڑا دیا وہ اپنے گھر پر آکر ... کے گھر میں کسی نے ان کے ... کی ... دی سب کبوتر نکل کر بیٹھے وہ پہلے ... کبوتر ... آگے ... سب کبوتر وہاں پہونچے جہاں سے ... کو اڑایا تھا انہوں نے دانہ ڈال دیا سب کبوتروں نے ... آئے ... سب ... تے ہوئے صاف اپنے گھر پہونچے

دوسرا کمال یہ تھا کہ اپنے سب کبوتر شہر بھر میں جہاں چاہتے ... یا رئیس کے کوٹھے پر ... اڑاتے۔ جب ... تماشہ دیکھ چکتے تو وہی دانہ جو یہ لیتے گھر پر کبوتروں کو دیتے تھے نواب کے کوٹھے پر ڈال دیتے اور اپنے گھر چلے آتے جب کبوتر دانہ کھا چکتے پھر کسی کے اڑائے نہ اڑتے اور سیدھے اپنے گھر لوٹ آتے۔

تیسرا کمال ان کا یہ تھا کہ لکھنؤ سے ... گئے اور وہاں کبوتر ... سب کو پنجرے میں بند کیا اور جہاز پر کربلائے معلی روانہ ہوئے جہاز چھوٹا انہوں نے پنجرا کبوتروں کا کھول دیا کبوتر اڑاتے ہی جہاز چلا جاتا ہے ... دی اور آ کہا کبوتر اپنے پنجرے پہ آکر بیٹھ گئے۔ سارے سفر میں یہی تماشہ کرتے رہے معلوم نہیں کون سی گولی کبوتر کو کھلا دیتے تھے اور دانے میں کون سی دوا ملا دیتے تھے۔ کسی کو بتایا نہیں اپنا کمال اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔

سانپ پکڑنے والے

عہد واجدی میں رمضان علی نامی ایک باکمال نوار گنج میں رہتے تھے تعویذ کا کام کرتے تھے اور سانپ پکڑنے میں ان کا جواب نہ تھا ہزاروں سانپ پکڑ ڈالے ہمیشہ بائیں ہاتھ سے سانپ پکڑتے تھے اور ان کی کہاوت تھی کہ جو لوگ داہنے ہاتھ سے سانپ پکڑیں گے نقصان اٹھائیں گے کیونکہ سانپ داہنی طرف آسانی سے مار سکتا ہے ان کے بہت سے شاگرد اس وقت لکھنؤ میں موجود تھے اور کتنے

لہ قدیم لکھنؤ ص۲۱　لہ قدیم لکھنؤ ص۲۱

سانپ کے کاٹے ہوئے لوگوں کو انہوں نے اچھا کیا ان کے جھاڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ جس کو سانپ نے کاٹا ہو اس کا کوئی عزیز پکارتا ہوا چلا آئے تو ڈنک جاگو حب رمضان یہ سنتے اس آدمی کو اپنے پاس بلاتا اور کچھ پڑھ کر ایک طمانچہ اس کو مارتا وہ غش کھا کے گر پڑتا اور جس کو سانپ نے کاٹا وہ جہاں ہوتا اٹھ بیٹھتا تھا جس کو جتنے غش آگیا تھا وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا تھا۔ میرے سامنے کتنی بار ایسا اتفاق ہوا۔ ایک بار اخبار ہمدم لکھنؤ میں سید جالب صاحب مرحوم ایڈیٹر کے زمانہ میں میں نے اس کے کمال کو چھپوا دیا تھا۔

ایک بار رمضان علی پکڑ گیا۔ وہ ایک سانپ اچاری میں بند کر کے رکھا لایا ڈیڑھ بالشت کا سانپ تھا جو نہایت زہریلا تھا اس سانپ کے جسم کو تھوڑا کرائی سارا اس پر عباسی رنگ کا رنگ دیا اور افریقہ سے ایک انگریز سانپ خریدنے لکھنؤ آیا تھا اس نے اس سانپ کو سو روپے کو مول لیا وہ انگریز یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ رنگا ہوا سانپ ہے پانچ سال کا عرصہ تقریباً ہوا رمضان علی نواز گنج میں سانپ کے کاٹے سے مر گیا۔

میر اب پاپا :- کوتاہ قامت ہونے سے ان پر پھبتی تھی وہ اعلیٰ درجے کے تیار کرتے گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح لڑاتے تھے ان کا کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس گھر میں جیسے جیسے کہتے اشارے سے بلا کر ٹکی بٹھا دیتے

میر مسلی :- آپ بھی نواز گنج کے رہنے والے تھے اولاد نہ تھی مسجد میں امام باڑہ ہوا اور منتظم الدولہ حکیم مہدی مرحوم نے حضرت امیر دین میر محمد علی شاہ کو زائرین عراق کے ٹھہرنے کے لیے توجہ دلائی عمارت تیار ہوئی میر علی متولی ہوئے افسوس ہے کہ لوگوں نے اس وقت ذاتی ملکیت بنا رکھا ہے جھنڈی بازار میں یہ عمارت موجود ہے۔

کوکا پیر کا میلہ :- نواز گنج کا تاریخی مأخذ تھا جو ملک کے ہجوم کا دن تھا اور بازاری لوگوں کے فرحت و انبساط کا واحد ذریعہ تھا رنگین کے کلام میں اس کی ایک ملتی ہوئی تصویر موجود ہے

یہ دعا ہے روز و شب رنگین کی کوکا پیر سے
میں بھی ساتھ ہوں جا کر الہ آباد کا

میلہ ہے کوکا پیر کا چھڑیوں کی سیر ہے
چلئے نواز گنج کے بازار کی طرف

روضہ نجف :- یہ امجد علی شاہ بادشاہ مرحوم کی عمارت ہے جس کے بانی قاری محمد علی تھے گرد روضہ کے تواتے اور پرانے مدرسہ نجف کی تیاری پر بادشاہ کی طرف سے بہت بڑی پیش کش دی جا رہی تھی مگر پر خلوص بانی نے قبول نہ کیا اور جس قدر اپنی گاڑھی کمائی سے اٹھ چکے تھے یہ پراکتفا کی پھاٹک کے بعد چوڑی چکلی زمین درمیاں میں نقل روضہ کا ایک کمرہ مع رواق آگے بڑھ کر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد، عمارت نے مقبولیت حاصل کی اور رونق دی۔ ہر جمعرات کو زائرین کا ہجوم ہونے لگا مجالس علم تعزیہ ایام عزا میں یہاں رکھے گئے قاری صاحب صاحب تصنیف بھی تھے تحفہ محمدی ان کی ایک کتاب علم تجوید میں ۱۲۶۲ھ مطبع احمدی کی چھپی ہوئی $\frac{۲۰}{۲۲}$ سائز صفحات پر میں نے دیکھی ہے جو ان کے علم و عمل پر گواہ ہے

امام باڑہ جعفری بیگم :- آپ نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں دار و غہ تھیں اور نواز گنج میں امام باڑہ بنوایا تھا جو زمانہ گذرنے پر اب نہیں رہا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ امام باڑہ کس سائڈ میں تھا نواز گنج میں کوئی امام باڑہ موجود نہیں ہے۔

نواز گنج کی بالائی :- لکھنؤ میں جو محلے خصوصیت سے مشہور تھے ان میں ایک یہ بھی تھا نواز گنج کی بالائی بہت عمدہ ہوتی تھی بالائی کو اہل عراق "سرشیر"

ا۔ ہدیہ پر صفحہ ۲۱۹ ۲۔ تذکرہ لکھنؤ ص ۲ ۳۔ زاد رہ بزرگ سفر نامہ آخوند مرزا قاسم علی مرحوم لکھنوی ص ۱۲

اور عوام طاؤ کہتے ہیں۔ میر سید حسن نامی ایک وضعدار اپنے دوست کی فرمائش پر روزانہ عمر بھر پاؤ بھر بالائی پہونچاتے رہے اور بیماری دکھ سردی گرمی برسات کوئی دن ناغہ نہیں کیا۔

خاندان نوبت رائے نظر :- اہل شہر میں دو بھائی نوبت رائے نظر اور لکھپت رائے تھے جو مصوری میں طاق تھے اول الذکر نے انگریزی دور حکومت میں خدنگ نظر رسالہ نکالنا شروع کیا تھا یہ دونوں صاحب کمال وزیر علی آخر مصور کے ہمعصر تھے لکھپت رائے نوازگنج میں رہتے تھے اور کتاب کی لوح، سرورق ٹائٹل ان سے بہتر بنانے والا لکھنؤ میں نہ تھا کتاب کے صفحہ اول اور ٹائٹل کی یہ شان تھی کہ صفحے کے چہار طرف بیلیں، زر کی کئی جدول (بارڈر) درمیان میں جلی قلم سے نام بیتابی اور آخری سطر میں ایسی عبارت جس میں دائرے تحریر میں خوشنما معلوم ہوں۔

پہلی سطر:- بیمن و لفضل خالق کون و مکاں حی و سبحان صانع زمین و زماں۔

آخری سطر:- در مطبع علوی بخش خاں بسعی حاجی محمد روشن خاں بحلیہ طبع رسید

صفحہ ۲ پر ½ حصہ میں اس سے زیادہ گلکاری کرتے ہوئے تین کامل گنبد یا درمیانی پورا اور پہلوؤں کے آدھے اور کبھی ہر سہ قبہ پر دوسرا کنارہ و سائر مسجدی شکل کا عکس دیکھی جس کا نمونہ قدیم کتابوں کے صفحہ اول پر دیکھا جا سکتا ہے۔

نوبت رائے کا قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

سخن سنج و سخن فہم و سخن دان | ادیب و شاعر و نثار اعلیٰ
قدیم الوضع نوبت رائے منشی | نظر پنہاں گشت از چشم دنیا ۱۹۸۰ سمت

لکھنؤ کے آخری دور نوازگنج کے رہنے والوں میں منشی احسن مرحوم جو صرف دو کو کے اچھے جاننے ماہر تھے مگر ان سے برتر لاتعداد اہل علم میں ان کو کون پوچھتا۔ ڈرامہ لکھتے تھے اور یہی ذریعہ معاش تھا ان کا بیٹا صادق فٹ بال کا کھلاڑی اور بھائی حکیم حسن صاحب کے پاس ایک قرآن مجید تھا بخط غزالی جو امام حسن اور امام رضا کی نظر مبارک سے گزر چکا تھا اور سورۂ اقراء سے اس کی ابتدا اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم الخ پر ختم تھا اور ایک وصیت نامہ بھی قرآن کے ساتھ تھا جو اسناد اور خصوصیات مصحف پر روشنی ڈالتا تھا۔ غزالی کے آخری ہلنے والے عثمانی صاحب اڈیٹر اودھ پنچ تھے جن کا نام اس کتاب میں آچکا ہے۔

عباس باغ

گزشتہ بیانات سے واضح ہوا کہ سید امام علی کو محمد علی شاہ بہادر نے رفیق الدولہ کا خطاب دیا تھا حکومت اودھ کے وہ معزز ترین آدمی تھے اور حسین آباد کے امامباڑہ میں ان کو وصیت کے حقوق حاصل تھے مزاج میں دینداری اور ہمدردی خلق تھا جو ان کے آثار رفتہ سے واضح ہے۔

کربلائے رفیق الدولہ :- یہ کربلا ٹھاکر گنج سے آگے اور امامباڑہ جھاؤلال کو راستے میں چھوڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف پڑتی ہے۔ اور ہاکوری روڈ کے کنارے واقع ہے اور حضرت عباس علمدار کے روضہ کی نقل ہے دور سے ایک عالیشان گنبد اور دو بلند منارے نظر آتے ہیں پھاٹک سے گزر کر اندرونی آراضی اور عمارت کربلا میں رواق اور درمیانی حصوں میں دیواروں پر خوشنما گلدستے اور قمقمے

متاز مختلف رنگوں کی بیلیں تال میل سے بنائی ہیں زیر گنبد ضریح مبارک اور تبرکات ہیں۔

رفیق الدولہ نے ۱۱ ربیع الآخر [illegible] کو اسہال کی بیماری میں انتقال کیا اور اسی روضہ میں دفن ہوئے قبر پر یہ قطعہ تاریخ ہے

چو یار ہم شد در ربیع الثانی — رفتہ ز جہاں وائے رفیق الدولہ
تاریخ رحلت او کیواں گفت — شد قصر جناں جائے رفیق الدولہ

رفیق الدولہ کی اولاد میں نواب محمد حیدر علی خاں حکام رس اور معمر شخص گذرے ہیں ان میں خدمت خلق کا جذبہ بڑے پیمانے پر تھا بڑھاپے میں تین پہیوں کی سائیکل پر نکلتے تھے گولہ رفتار ہو چکی سو روپے کا نوٹ صراف سے خوردہ کیا اور کھڑے کھڑے محتاجوں کو بانٹ دیا کہا جاتا ہے کہ وہ فرامیشن لاج کے ممبر بھی تھے۔ قدیم وضع سر پر سہرے بیتے کی جریلی ٹوپی جسم میں سیاہ کوٹ پہنتے تھے اور دندان سازی میں یکتا تھے معمولی دست کاری کا جو کام آتا تو سر دندان ساز کا کام یہ کہ وہ پلیٹ کے لیے خود دانت بناتے تھے اور ان کے پاس ایک مشین تھی جو دانت تیار کرتی تھی یہ کام کسی امریکن ماہر سے حاصل کیا تھا۔ انگریز ان کی بڑی عزت کرتے تھے گورنروں کی دعوت میں انہوں نے بہت روپیہ صرف کیا اور یہ دندان سازی ایک صدقہ کا صدقہ تھی طلبا اور اہل علم کی بڑی عزت کرتے تھے میر مومن علی صاحب جرولی ان کی صحبت کے خاص آدمی تھے مولانا سید نجم الحسن صاحب امام جمعہ و جماعت ملتان زمانہ تحصیل علم میں انہیں کے گھر رہتے تھے اور عباس باغ سے مدرسہ سلطان المدارس پڑھنے جاتے تھے نواب موصوف نے ۲ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا اور اسی کربلا میں دفن ہوئے۔ جب تک وہ زندہ رہے کربلا کی حالت درست رہی نوچندی کو خود کربلا میں مجلس کرتے تھے اور پیسے تقسیم کرتے تھے بہت سی حویلیاں تھیں مرنے والے ہیں

جنوں کی مسجد

اسی گرد و نواح میں جو بڑی مسجد ہے وہ جنوں کی مسجد مشہور ہو گئی ہے اور اس شہرت کے دو سبب بتلائے جاتے ہیں ایک یہ کہ جن تاجدار اودھ پچھلے پہر سے نوبت کو بند کر دیتے تھے ایک دن تاخیر ہوئی اور نماز صبح کے لیے مسجد میں جانا چاہا۔ ارکان سلطنت سے پوچھا یہاں مسجد کہاں جنگل ہے سنا ہے صحرا میں نماز پڑھی اور بعض خاص دستیوں کو اسی وقت خیال پیدا ہوا کہ مسجد بن جائے ایسی کارگری اور حسن خدمات دکھانے کے لیے تعمیر میں اس قدر پھرتی ہوئی کہ دیواریں اٹھتی جاتی تھیں [illegible] روش کر کے استر کاری سکھانے جاتے تھے غیر معمولی مدت میں مسجد بن کر تیار ہوئی اور بریڈ کے دن جان بوجھ کر سپاہیوں نے اسی [illegible] کی نماز کا وقت آیا اور عرض کیا کہ چل کر مسجد میں چلیں حیرت سے پوچھا کہ مسجد یہاں کہاں؟ عرض کیا کہ حضور کے اقبال سے تیار ہو گئی [illegible] سے مسجد کیونکر بن گئی [illegible] فرمایا کبھی یہ آدمی کا کام نہ تھا تم نے جنوں کا کام کیا اس دن سے جنوں کی مسجد مشہور ہوئی

دوسرا قول یہ ہے کہ کسی رئیس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس جگہ ایک جم غفیر وضو [illegible] میں مصروف ہے تعبیر خواب میں اس جگہ مسجد بنائے جانے کا ارادہ ہو گیا اور جانماز [illegible] کرتا رہا۔

لکھنؤ کی چکنی مٹی جو مشہور ہے وہ اسی محلہ کی مٹی ہے جو لطافت صفائی میں ملتانی مٹی سے اچھی ہے۔

الماس باغ

یہ وہ باغ ہے جہاں نصیر الدین حیدر بہادر اور ان کی ماں بادشاہ بیگم میں جب کچھ رنجش ہو گئی اور وہ خاتون مناجات پڑھتے

ہوئے کہ بیرونِ شہر مقیم ہوئیں تو اسی باغ میں قیام کیا۔ تاریخ میں اس باغ کا نام آتا ہے اور اس سلسلے میں کچھ وقت بھی ہوئے جو قشنۂ تحقیق ہیں۔ سلیمان کا اصل نام فریدون بخت تھا اور اس کا سلطنت سے محروم ہونا تاریکی واقعہ ہے جس شخص کا تذکرہ وقتی بڑھ گیا ہو اس کو لکھنؤ کے محاورے میں مدتوں سلیمان کی سلطنت سے یہ دکھایا گیا۔

موسیٰ باغ

یہ باغ نواب آصف الدولہ نے تیار کرایا اور نواب سعادت علی خاں کی سرکار خاص قرار پایا یہاں جانور لڑائے جاتے تھے موسیٰ باغ اس چمن کو کیوں کہتے ہیں اس کی وجہ میں دو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں پہلی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نواب آصف الدولہ کی سواری میں ایک دفعہ گھوڑے کی ٹاپ سے چوہا (موش) کچل گیا آپ نے شگون بد سمجھتے ہوئے اس کے دفن کا حکم دیا۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ موسیو بھیرز فرانسیسی نے باغ کا نقشہ بنایا تھا اس لیے یہ نام ہوا۔ اس وقت یہ جگہ ویران ہے ۱۸۵۷ء کے شعلے اسی جگہ سے بھڑکے حکومت اودھ ضبط کرنے کے بعد انگریزوں نے یہاں چھاؤنی بنائی تھی اور نواب سعادت علی خاں کا تعمیر کردہ محل ٹریننگ سینٹر تھا، مئی کو معمولہ روزانہ کی جماعت سے ہندوستانی سپاہیوں کو بتایا گیا کہ ان کو نئے کارتوس کے استعمال کی ترکیب بتائی جائے گی جس میں سور اور گائے کی چربی سے سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسران فوج کے ایک بڑے تکار کرنے سے مترود تھا پھر انہوں نے معاملہ کو دوسرے دن پر ٹال دیا اور ہندوستانی افسروں کو حکم دیا کہ وہ سپاہیوں کو دوسرے کارتوسوں کے استعمال پر آمادہ کریں لیکن سپاہیوں میں جو غم و غصے کی لہر پھیل چکی تھی وہ ہندوستانی افسروں کی کوشش سے نہیں روکی جا سکتی دوسرے دن جب سپاہی پریڈ پر دوبارہ جمع ہوئے تو پھر انہوں نے کارتوسوں کو چھونے سے انکار کر دیا جب سپاہیوں کو صفیں توڑ کر بارک میں جانے کا حکم ہوا تو سپاہیوں نے اس حکم کے ماننے سے بھی انکار کر دیا اور پریڈ گراؤنڈ میں ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے اگلے دن کے بارے میں مشورہ کرنے لگے پورا دن اس طرح گذر گیا شام کو ان باغی سپاہیوں کا خط پکڑا گیا جو انہوں نے لکھنؤ میں انگریزی فوج کی رجمنٹ منڈیاؤں میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کو لکھا تھا۔ ساتویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے دوسرے ہندوستانی سپاہیوں سے مدد طلب کی تھی اور کہا تھا کہ وہ دین اور دھرم کے واسطے انگریزوں کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کو امید ہے کہ دوسرے ہندوستانی بھائی بھی اس لڑائی میں ان کی مدد کریں گے۔ خط کے پکڑے جانے کے بعد انگریزوں کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ آگ پھیل نہ جائے انگریزوں کی خوش نصیبی سے ساتویں رجمنٹ کا یہ خط کنٹونمنٹ پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ انگریزی افواج کے کمانڈر اور چیف کمشنر ہنری لارنس کو جب واقعات کا علم ہوا تو وہ فوراً انگریزی توپ خانے کو لے کر موسیٰ باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ رات ہو چکی تھی قمری مہینے کی ابتدائی راتیں تھیں اور موسیٰ باغ کا محل چاند کی روشنی میں نہایا کھڑا تھا یہ چاندنی رات انگریزوں کے لیے رحمت ہو گئی۔ انگریزی فوج نے ساتویں رجمنٹ کے پریڈ گراؤنڈ کو تین طرف سے گھیر لیا اور ان کے سامنے اور بازوؤں پر توپیں لگا دیں سپاہیوں کو میدان میں حاضر ہونے کا حکم ہوا اور جب سپاہی جمع ہو گئے تو انگریزی توپچی ہاتھوں میں مشعلیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ انگریز مورخین کے بیان کے مطابق سر ہنری لارنس باغی سپاہیوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے اور وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک انگریز توپچی نے توپ کو مہتابی دکھا دی گولہ چلا اور کئی سپاہی زخمی ہو کر میدان میں تڑپنے لگے۔ توپ چلتے ہی ہندوستانی سپاہیوں نے بھاگنا شروع کیا۔ انگریزی فوج کے گھوڑے سوار دستوں نے ان کا تعاقب کیا اور بھاگنے والے سپاہیوں کو گھیر کر

[illegible]

لاما شروع کیا مات کمر پر سلسلہ قائم رہا مگر موسم سے پیشتر تمام باغی سپاہی گرفتار ہو گئے دوسرے دن کورٹ مارشل کی کارروائی شروع ہوئی

موسیٰ باغ کی کوٹھی :- اس عمارت پر عماد السعادت کا ترجمہ یہ ہے۔

کوٹھی دیکھنے کے لائق ہے خوب لطیف جو اس عمارت میں پہنچکر دیوار و در کو دیکھ سکے اس کے دل کا کنول مثل موسم بہار کے کھل جائے

[illegible] طرز دلفریب   [illegible] مرقع مانی است نام [illegible]

مشہور آدمی اس حلقہ کے :- موسیٰ باغ میں محلہ سرائے معالی خاں، چھتی سرائے، [illegible] کے تحت میں حسب ذیل مشہور لوگوں کے نام ہیں۔ نواب عضد الدولہ بہادر، نواب نظام الدولہ، نواب [illegible] حسن صاحب، نواب [illegible] صاحب، مرزا محمد خان، سید محمد جعفر، [illegible] علی خاں [illegible] صاحب، حکیم [illegible] صاحب [illegible]، حکیم [illegible] محمد تقی، میر [illegible] صاحب، نواب شمس [illegible]، نواب [illegible] بہادر، نواب [illegible] محمد عباس، قاری محمد علی خاں، [illegible] صاحب، آقا امراؤ صاحب، آغا بادی صاحب، آقا علی خان صاحب، مرزا اکبر الدین عرف مرزا محمد عسکری صاحب، مولوی مرزا [illegible] صاحب، مرزا محسن صاحب، نواب حمید الدولہ بہادر، مرزا [illegible]، [illegible] میر فضل حسین صاحب، سید عسکری صاحب۔

موسیٰ کا بڑوا

یہ بحث بستی کا آخری مقام ہے جس کا دولت گنج اور [illegible] گنج سے راستہ ہے اور اس وقت ایک دیہات کی حیثیت ہے۔ الیکٹرک [illegible] اور پانی کا پمپ مصاحب گنج کے بعد ختم ہو جاتا ہے یہاں کے [illegible] کیتیاں فتح علی کا مقبرہ وغیرہ ہے۔ یہ وہی شخص ہیں جو [illegible] کے مالک تھے اور جن کا چوک میں کنواں موجود ہے ان کی دولت و تاریخ اودھ میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ بغیر ملک حکومت اور انگریزوں کو خزانہ اودھ بتانا تھا۔ بتایا تو بیگم کے [illegible] دینے کے مگر بات پر جمے رہے ان کی اولاد اور خاندان کا اس [illegible] حال معلوم ہو سکتا ہے۔

---

[1] یادگار لکھنؤ بابت اگست ۱۹۵۶ء   [2] عماد ص۳۲

[3] [illegible] شاہی کے چند افراد سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ نظام الدولہ آغا میر کے فرزند ہیں ہوکا ہے [illegible] گال لولی میں [illegible] کے لئے مشہور تھے ایک دوسرے بزرگ تھے جن کا نام اکبر علی خاں تھا۔

[4] جن کا چپہ تقریباً آج تک انکے معاہدوں کی سرائے میں رہتے تھے اور چپہ لکھ۔ جہاں سے انحاشہ حکیم بزرگ صاحب [illegible] [illegible] ان کے [illegible] خان علی [illegible] عرف [illegible] صاحب تھے، [illegible] دن کو سودا [illegible] کے مانند [illegible] محسیر کرتے تھے شہر کے نامور امراء اور [illegible] ہوتے تھے [5] جن کا [illegible] ہے۔ [illegible] کمال درجے [6] مرزا محسن صاحب حدیث خواں جن کا ذکر معتبر کتابوں کے [illegible] فہرست میں [illegible] [7] [illegible] ہے وہ مقصد شخص جو حسین آباد مبارک کے ترسٹی اور مشہور شخص تھے۔

اقبال الدولہ — ظفر جنگ — میر سمیع علی

محمد الدولہ میر عابد علی خاں ہیبت جنگ

کمر الدولہ میر رمضان علی خاں المتوفی ۱۳۱۰ھ
محمن الدولہ کو میں نے دیکھا تھا سرخ و سفید رنگ
نورانی صورت بڑھاپے میں بھی خوبرو اور حسین
بڑی بڑی مونچھیں۔

میر محمود علی خاں ممتاز الدولہ
محسن الدولہ
سلیمان مرزا

او سلاطین کے گھر پر یہ قیام تھا اور لوگ کہتے تھے کہ وہ سب کچھ کرکے بھی اودھ کے جو ہر فرد صرف کرتے ہیں ذریعہ معاش تھا

کپتان کا مقبرہ :۔ اول الذکر کا مدفن ایک خوبصورت عمارت کی صورت میں اب تک موجود ہے نقشہ عمارت خوشنما اور گول حجرے کی صورت میں ہے پھاٹک پر دو پایہ باقی ہیں جن پر روغنی مٹی کی گھڑیاں ابھر دیکھی نظر آتی ہیں جن کا رنگ اس قدر شوخ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کنگرے بنائے گئے ہیں عمارت دو منزلہ ہے اور دور میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت دروازے برابر برابر بنے ہیں دیوار کا خاکہ بھی موجود ہے جو مقبرے کی عمدہ گردش کی جا سکتی ہے حصہ زیریں میں قبر جس پر پتھر ہے کوئی کتبہ نہیں ہے پہلی اور دوسری منزل میں مسلسل دروازوں کے عمدہ بالائی حصے میں کوئی گنبد ہے۔ سیڑھیاں تنگ اور سیدھی چڑھی ہیں جو دو فٹ سے زیادہ نہیں ہیں اور ماتھے کی نقش با تصویر ہے۔

مسجد کپتان :۔ مقبرے سے ملی ہوئی بلندی پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کا زینہ ہے اور صحن مسجد سے مقبرے کی دو منزلہ چھت ملی ہوتی ہے مسجد کے گنبد بڑے خوبصورت اور خوبصورت ہیں اس مسجد کے نمونے پر لکھنؤ میں کوئی مسجد نہیں ہے

کپتان صاحب کے مقبرے کے سامنے ایک دوسرا مقبرہ اسی نمونے پر گول دیوار دونوں کا جس کی چھت اب باقی نہیں ہے مگر گو تمام عمارت میں قبر کا سامان نشان موجود ہے مگر جس کا مقبرہ تھا یہ اس کا نشان قبر معلوم نہیں ہوتا قبر کے سامنے کنواں ہے۔

امام باڑہ معشوق محل :۔ نواب معشوق محل آخری سلطان اودھ کی بیگم تھیں جن کا خطاب تھا ملکہ تاج النساء بیگم دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی اور لیکر پسند عمارت سا کردہ روشن الدولہ کی مرمت کرا کے رہنے کے لئے دی تھی موصوفہ نے موسیٰ کے پردہ میں امام باڑہ بنوایا مگر اب وہ منہدم ہو کر بے نشان ہے لیکن نور تصدق حسین ایک شاندار مسجد ان کی یادگار میں بمقام مذکور خستہ حالت میں اب تک موجود ہے۔

معشوق محل کے داروغہ کا نام محمد مہدی تھا جو سونٹے کے استاد تھے سونٹے کے ماہروں کا ادنیٰ کرشمہ کمال یہ ہے کہ جنگلی کبوتر کو جھوکی کے نیچے چھوڑ دو اور وہ نیچے سے باہر آنے نہ پائے۔

گئو گھاٹ

دریائے گومتی کے کنارے جو بستی شروع ہوتی ہے اس میں گئو گھاٹ کو پہلا درجہ حاصل ہے فقیروں کی قیام گاہ بھی دریا کا

کنارہ ہوتا تھا اور دیہاتی اہیر، پاسی، چمار، ٹھاکر، برہمن سب پانی کی نزدیکی ڈھونڈتے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اس گھاٹ سے مویشی کثرت سے پانی پیتے تھے اور مویشیوں کی زیادتی ان کے مالک اور پالنے والوں کی تعداد پر روشنی ڈالتی ہے آج یہ مقام جنگل ہو گیا کسی وقت میں یہ حصہ گلزار اور عہد شاہی کے آثار کا مظہر تھا۔

ہم نے ابھی نوابی اور شاہی کی مخصوص عمارتوں پر روشنی ڈالنا شروع نہیں کی ہے وہ آخری باب کا قلمی کارنامہ ہوگا۔ لیکن جغرافیائی نقطۂ نظر سے موسیٰ کے پیرو انک پہونچنے کے بعد گئو گھاٹ کی باری ہے اور یہ بستی بھی کسی صاحب کرامت پیر کے قدم رکھنے سے آباد ہوئی اور جو مزار اس مقام پر ہے وہ شاہ عبدالجلیل کا کہا جاتا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ پیر جلیل اور یہ ایک شخص ہیں یہ جنگ کشتی کا مقام تھا اور گولہ گنج میں مزار ہے یا اس کا عکس ہے۔

گئو گھاٹ کی تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ سعادت علی خاں برہان الملک سے لے زمانہ صوبہ داری میں لکھنؤ اسی راستے سے آئے۔ اور یہ راہ عام نہ تھی تاریخ میں ان کی دلیری اور آمد کا ذکر ہے اور سیاست میں کمال ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیخوں کے مقابلے میں صرف اسی راستے سے داخل ہونے میں کامیاب ہوئے۔

شیخ امام بخش ناسخ کے والدین کی قبریں بھی گئو گھاٹ کے قبرستان میں ہیں اور قمر الدولہ اور ان کے پیر مرشد حافظ شاہ سلیمان بھی اسی زمین پر دفن ہیں۔

جب فریدوں قدر جرنیل کی شادی علی نقی خاں کی بیٹی سے ہوئی اور ۲۲ ذی الحجہ کو ساچق اور ۲۳ کو رات کی تاریخ تھی تو گئو گھاٹ میں جو شاہی باغ تھا اس کے دروازے سے براتی واپس ہوئے اور مرزا ولی عہد اور بادشاہ نوشہ کے ساتھ باغ میں تشریف لے گئے اور شام کو چھتر منزل واپس آئے اس موقع پر دوستی کا انتظام شرف الدولہ کے ہاتھ میں تھا۔[۱]

۱۲۹۰ھ تک نواب شمس الدولہ کی کوٹھی اسی شان و شوکت کے ساتھ آباد تھی[۲] اور اس سال لکھنؤ پانی نہ برسنے کے سلسلے میں جب نماز طلب باراں ہوئی تو یہ جگہ دعا کے لیے قرار پائی۔

واجد علی شاہ بہادر کی کئی کوٹھیاں یہاں تھیں جو اب باقی نہیں ہیں

تاراں کوٹھی:۔ اس عمارت میں سلطانی پریس تھا جس کے مطبوعات کی نظیر آج تک کوئی مطبع پیش نہیں کر سکا خوبصورتی، صحت، حسن خط اعلیٰ درجے جو تاراں کوٹھی کے مطبوعات میں نظر آتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں ۱۲۶۶ھ و ۱۲۷۰ھ کے ایڈیشن[۳] میرے کتب خانے میں موجود ہیں ان کے دلفریب اور نظر افروز ہونے کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ پریس کا نام سلطان المطابع تھا۔ یہ پریس کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول کے زیر اہتمام تھا حاجی ابو محمد ابن حاجی ملا محمد ابراہیم سرداری بہترین نسخ و نستعلیق لکھنے والے کاتب اور معتمد تھے ان کے ہاتھ کی لوح بڑی نمایاں ہوتی تھی احمد اور اولاد علی اور امام الدین پریس میں تھے مینجر داروغہ مدد علی تھے[۴] پرنٹر پبلشر قائم علی تھے ٹریڈ مارک پر تاج و چھتر تھا۔ اس مطبع میں حاجی ولی محمد[۵] اور علوی بخش[۶] اور شیخ نثار علی[۷] کے مطبوعات بھی چھپتے تھے۔ اس پریس کے

۱۔ تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۵ ص ۹۹ ۲۔ تاریخ عباس ا ب ۲ ص ۱۰ ۳۔ لسان العاشقین حاشیہ عبداللہ رتہذیب رسالہ رفعت مجلس کلاں کوٹھی کا تذکرہ ہے ۴۔ دعاؤں کی فارسی کتاب سفینۃ النجات پہلے ایڈیشن میں اکبر احمد ولی اور دوسرے ایڈیشن میں تیسرے مطبوعہ ہیں اور ۱۲۷۰ھ کا شاہنامہ بھی دو سے ہم جوش کبیر کی فصلوں کے بارے میں مدد علی نے لکھا ہے کہ ایک رحاشی مقابل ہر فصل مرقوم است سر شی در کتب معتبرہ بنظر نرسیدہ ۵۔ لسان العاشقین

۶۔ رسالہ رفعت مجلد [illegible]

آخری چھاپنے والے کہ یا اُستادِ علیم و شمیم پالکی پر بیٹھ کر جاتے تھے۔ مالک رحمانی پریس کے والد منشی قادر بخش نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مطبع امینی کے مہتمم محمد عباس نے بھی اپنے مطبوعات اس پریس میں چھپوائے۔ کلاں کوٹھی کی عمارت کا کچھ حصہ اب تک موجود تھا وہاں کھن کھن جی مہاجن گول دروازہ نے ایک عالیشان کوٹھی بنوائی ہے کلاں کوٹھی کے سامنے جو میدان ہے وہاں زمانہ سابق میں انگریزوں نے تختہ دار لگا رکھا تھا اور انگریز گورہ امداز وں کی قواعد بھی ہوتی تھی صبح دوپہر تک نئی بھرتی ہونے والوں کو تعلیم جنگ دی جاتی تھی پھر مہتاب باغ میں قواعد ہونے لگی (ماہ نو اگست ۱۹۵۰ء ص...)

حکایت :- ایک مرتبہ مولوی سجاد حسین صاحب نے شیخ حامد علی سے کہا کہ آج کل دریا میں پانی ہے [illegible] جی چاہتا ہے کہ سیر کریں شیخ نے کہا گئو گھاٹ چلئے چنانچہ مولوی صاحب گئو گھاٹ آئے شیخ حامد علی نے [illegible] گھوڑے [illegible] ایک گھوڑے کی پیٹھ پر مولوی صاحب کو بٹھایا اور دوسرے پر مولوی رشید حسین کو اور تیسرے پر [illegible] کو [illegible] تینوں شخص [illegible] سے ناواقف ہیں اور چوتھے پر اپنے بیٹے شیخ اسمٰعیل کو اور خود گھوڑے کو کھینچتے ہوئے چلے، تو جب گھاٹ پر [illegible] گھوڑی [illegible] میں غرق ہو گئے حامد علی نے ایک ہاتھ سے مولوی صاحب کو اور دوسرے [illegible] ایک ٹانگ سے [illegible] اور ایک ٹانگ سے پیرتے ہوئے کنارے پر آ گئے۔ شیخ محمد اسمٰعیل پیرا جاتے تھے [illegible]

مولانا مرزا ہادی صاحب صالح مفتی گنج کے صاحب کمال قبلہ و کعبہ کے شاگرد تھے اور ان کا گھرانہ اولاد عمران آپ کا دیرینہ عقیدت کیش تھا جناب نے علم ہیئت کی ایک کتاب [illegible] اور مرزا صاحب [illegible] مقرر کیا جو گئو گھاٹ پر شاگردوں کو شناوری کی تعلیم دینے کے لئے تھا

موصوف جب دریا میں اتر چکتے اس وقت طالب علم مذکور کو حکم ہوا کہ عبارت پڑھے پھر مطالب بیان کرنا شروع کئے علمی لحاظ سے تو تشفی ہوئی مگر یہ طریقہ پسند نہ تھا چند دن کے بعد قبلہ و کعبہ کو [illegible] اس امر کی اطلاع کی اور آپ نے جب مرزا صاحب سے طریق تدریس پر بات کی تو موصوف نے کہا کہ میں عالم [illegible] ہوں

بخشی کا تال

راجہ لال جی بخشی حکومت اودھ کے مشہور اور دل چلے مدت تک [illegible] آدمی تھے معاد حلق کے لئے تالاب بنوایا عوام کی زبانوں پر اس کی معاد کا واقعہ یہ ہے کہ نواب نے ہاتھی خریدنے بھیجا، کہا یہ ایسا کہ گدھے کے سر سے سینگ بعد مدت پلٹے۔ کہیں دور نہ تھے لکھنؤ سے ۸ میل کے فاصلے پر تالاب بنوا رہے تھے جب سرکار میں باریاب ہوئے بے ساختہ کہا ہاتھی لے آیا ہوں حضور چل کر خود دیکھیں نواب نے جا کر دیکھا تو تالاب بنا ہوا پر جا کہا اور [illegible] مرید العوام والکرام لے کر سرفراز ہوئے۔ ان کے بیٹے راجہ الفت رائے ان سے بھی علم دوست، غریب پرور اور ادب نواز تھے ان کا مخمس ہفت بند کاشی فارسی میں ۲۸ صفحہ پر نولکشور نے چھاپا تھا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سٹی اسٹیشن سے جو چلو ڈالی گنج اسٹیشن پہونچو گے اس کے بعد کٹ [illegible] لو رکے گا۔ یہاں سے گذر کر بخشی کا تال اسٹیشن ہے بہترین نقشہ اور اعلیٰ ترین انجینیری کا نمونہ ہے۔ راجہ ٹکیت رائے کا تالاب، حسین آباد کا شاہی تالاب، راستہ بریلی میں ریوتی رام کا تالاب اس سے بہت پست قسم کی تعمیر ہے بڑی لمبی چوڑی۔ جس سے جو کئی حصوں میں تقسیم ہوتی ہے [illegible]

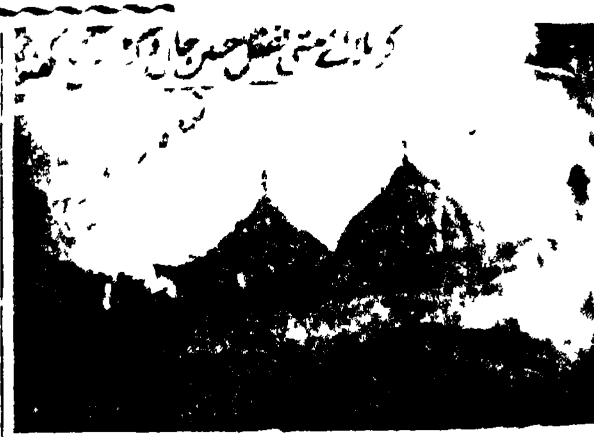
نام نہیں معلوم اس لقب سے مشہور تھے   [illegible] کے تک۔

مردانہ گھاٹ، مویشیوں کے پانی پینے کی جگہ علیحدہ ہے لکھوری اینٹیں اور پتھر کثرت سے لگائے گئے ہیں اور بلند برجیاں ہیں جو ریل سے گذرنے والے مسافروں کو نظر آتی ہیں برجیوں کی چھت میں رنگین پھول بوٹے اور دیدہ زیب بیلیں بھی ہیں ۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء کو میں نے دوبارہ یہ تالاب دیکھا بارہ زینے چھوڑ کر پانی تھا یہ بہت گہری اور اندرونی عمارت تہ خانہ کی صورت میں زیادہ پختہ اور خوشنما ہے جو پانی کے گھٹنے یا بڑھنے پر کبھی اور دکھائی دیتی ہے۔ سات کمرے اب سانپ کے مسکن کی صورت میں بند ہیں۔ نہانے والے دو مستند لوگوں سے یوں تالاب کا معائنہ کرتے ہیں عورتیں اس طرح ہیں کہ عورتیں سامنے سے تالاب کی سرکرن اور عورتوں کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ وہ مسجد ... اور پچھم کی طرف گھاٹ کے سامنے ایک عام ... سرائے ... کی مجلس ... چاروں طرف راستے ہیں۔ اور ایک اسکول ہے جس کی دیوار دوہری ہے ... یہاں ... اسکول میں رہتے تھے تعلیم گاہ کھنڈر کی صورت میں ہے۔ اس کے متعلق ... ۱۹۱۰ء تک ... یہاں وہ مسجد محلہ کو ... جس کی بنیاد شاہ ... کے تحت میں تمام ... پہلی خشت ... اس جگہ ہمائی ... والا ہے۔

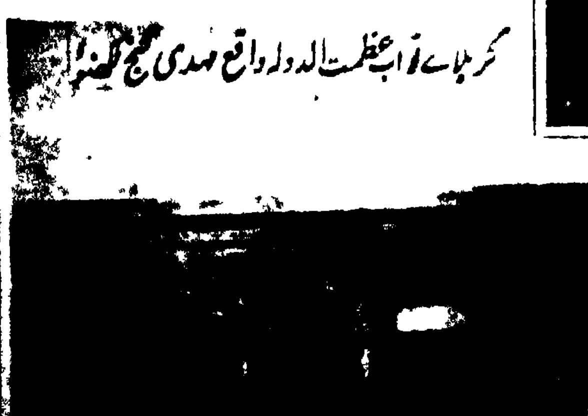
مرگھٹا

اس جگہ ہمیشہ سے مردے جلائے جاتے ہیں ... لکھنؤ اور گرد و نواح کے غیر مسلم اموات مدر آتش ہوتے ہیں ... ایک ...

... کی صدا آتی ہے



کربلائے ... چاکر ... لکھنؤ



کربلائے نواب عظمت الدولہ واقع مہدی گنج لکھنؤ

چھٹا باب

بنجاری ٹولہ سے چارباغ تک

جو لوگ گھوم پھر کر مال تجارت فروخت کرتے ہیں ان کو بنجارہ کہتے ہیں کسی کا شعر ہے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا   جب کوچ کرے گا بنجارہ

تحقیق لفظ میں مشہور اہل قلم خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک مقالہ میں بنجارن کی ہمدردی سے وہ اپنے مخصوص طرز نگارش میں واقعہ کربلا کے ہیرو حضرت امام حسین کی چھوٹی بہن کی قبر کے عین پیوستہ میں لکھتے ہیں۔

اس لئے ہوئی بنجارن کی قبر پر درود و سلام بھیجو جس نے ماما کی امت کی خاطر سب کچھ نثار کر دیا اور رہرو دیکھنے والے کو سمجھا دیا کہ حق و صداقت کی پاسداری میں مسلمان عورتیں ایسی ہمت دکھایا کرتی ہیں۔

بنجاری ٹولہ:۔ اسی گروہ کی سکونت کا مقام ہے یہ محلہ عہد اکبر سے آباد تھا اس کے حدود چاہ کنکر اور کٹرہ ابو تراب خاں کے مابین واقع ہیں باب شہر ہونے سے اس جگہ چھوٹے بڑے مختلف لوگ آباد تھے جن میں

منشی علی حامد خوشنویس:۔ آپ نسخ و نستعلیق کے بہترین لکھنے والے تھے معدنیات اور عقیق پر بھی آپ کے قلم کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں مرصع رقم خطاب تھا منشی نولکشور کی فہرست کتب سنہ ۹۱ء میں آپ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کا نسخہ اشتہار موجود ہے جنوری سنہ ۹۲ء میں آپ نے بعمر ۶۰ سال رحلت کی انا اماہر عمر اکات میں سردھاک ہوئے شیشے کے پیٹ میں لکھنے کے طریقے بھی آپ کو معلوم تھے اس طرح کہ رسطح رول سے خط ظاہر ہو نہ رو پشت بلکہ اندر تحریر پائی جائے۔

بجو ہرکارہ:۔ چٹھی رساں اور پوسٹ مین کو عہد شاہی میں ہرکارہ کہتے تھے ایک جگہ سے دوسری جگہ محکمہ اطلاعات کا کام بھی اسی کے سپرد ہوتا تھا لکھنؤ کے ابتدائی تاریخی حالات میں ہے 'گرم احتیاط بودیم کہ ہرکارہ ڈاک این خط را آورد' منی آرڈر بھی جس کو اس وقت ہنڈوی کہتے تھے یہی پہونچاتا تھا بنجاری ٹولہ میں جو ہرکارہ کی گلی جہاں تک میری یاد کام دیتی ہے، ارحم سے پہر کو ہوتی تھی یہ شاہ نجف میں اس عہدے پر مامور تھا۔ آتش کے دو شعروں میں ہرکارہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے ؎

لہ گلدستہ نکتہ   سلہ رقعات مرزا قتیل ص۵

روز و شب کے حال کا یوں لکھتا تھا مصدوقِ شب — کاتبِ اعمال مری ڈیوڑھی کا ہرکارہ تھا

کب حواس آئے حظِ شوق کا دیاں سے دیکھوں — روز ہو آتا ہوں ہرکارہ اخبار کے پاس

رقص و سرود ۔ ایک قدیم روزنامچہ میں ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۱ء کی شب کو سجاری ٹولہ میں محفل رقص و سرود کا پتہ ملتا ہے جس میں شریک ہونے والے حکیم سید واحد حسین خاں اور حکیم دلدار حسین کے ساتھ شرکت کی لکھا ہے نہ ہر مزی تھوا اور گوہر طوائف کا مجرا تھا ایک بجے شب کے بعد گوہر کا مجرا شروع ہوا سچ یہ ہے کہ خدا و ند عالم نے سادہ حسن و خوبصورتی کے جامع کمالات کیا ہے فارسی، انگریزی اور ہندی غزلیں، مالوں میں گوہر کلکتہ سے یہی بی غزلیں گائیں اور چار کے سہ پہر جاتے ہو۔ بہتر گانا میں نے نہیں دیکھا (جیلیس ڈائری)۔

شیخ علی عباس وکیل ۔ تہذیب لکھنؤ کے آخری دور میں وہ اس محلہ کے مشہور رئیس تھے اور بڑا دل کے انسان تھے ان کے والد کا نام دارو غہ شیخ محمد عباس تھا ان کے یہاں ۸ محرم کو میر انیس پڑھتے تھے (حیات انیس صفحہ ۹۲)۔ معاملات کی حرج میں ان کا جواب نہ تھا۔ شہر بھر سے پوست کندہ حالات ان کے جرائد ان تک پہونچا کرتے اور گواہوں کا سمجھوں میں دم کر دیتے تھے پالکی میں کچہری جاتے تھے۔ ۸ محرم کو ان کی بنا کردہ مجلس امامباڑہ ممتاز العلما میں ہوتی تھی سامعین کا ایک ہجوم ہوتا تھا اور یہ مجلس امامباڑے تک ساٹھ برس ہوتا تھا۔ اس مجلس کی اطلاع میں پہلے سے اہل شہر کے گھروں پر کھیر کی بڑی قلعیاں تقسیم ہوتی تھیں اور شیخ صاحب کے دوستوں کو اکثر چھپی پوری وغیرہ تک پہنچتی اس اہتمام سے ہو جاتی تھی کہ ماتمی ہونے سے پہلے تقسیم ہو جائے بیرون لکھنؤ کے روزنامچہ جات میں اس کا ذکر ہے ۔ اس مجلس میں جو ... مرحوم رئیس اکبر پور ... نمایاں ... شوکت ... مجلس ... دیتے میں تمام سامعین ... تھے شیخ صاحب کی

کرشتی ۔ جدید عمارت ہے اس کو آثار قدیمہ سے تعلق نہیں ہے صرف اس لئے اس مقام پر اس کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اعظم مولانا سبط حسن صاحب نے اس جگہ اردو ادب اور واقعہ کربلا پر وہ تقریریں کی جو یادگار ہے مولانائے ممدوح کی کوٹھی و مکانات بھی آگے بڑھ کر ہیں جو قبل از وقت اپنے معزز مکیں کے غم میں منہدم ہو رہے ہیں۔

میر علی نقی داستاں گو ۔ آپ سجاری ٹولہ میں رہتے تھے اور شہر کے آخری داستان گو تھے ان کے بعد زبانی قصہ کہنے والا کوئی نہ رہا آدمی قابل تھے ذاکری بھی کرتے تھے۔

الطاف حسن خاں کمبوہ ۔ اس محلہ میں خان بہادر شیخ الطاف حسن خاں کمبوہ کا مکان تھا جن کے یہاں ۸ محرم کو مرزا دبیر صاحب حاضر رہتے تھے لفظ کمبوہ کی تحقیق میں لوگوں نے مختلف معنی بتلائے ہیں مولوی سید حسن صاحب نقوی امروہوی مرحوم نے ... کی زبانی ظاہر کیا ہے کہ ایران سے جو لوگ ابوہ کی صورت میں پیدا ہوئے ان کو کثرت استعمال نے کمبوہ کر دیا۔ شیخ صاحب کی بیٹی مشہور ادیب اور بیرسٹر حامد علی خاں امروہوی کو منسوب ہوئیں اور ان کے بیٹے اشتیاق حسن خاں مرحوم میرے ہم جماعت تھے۔

کٹڑہ ابوتراب خاں

تاریخ میں دو شخص اس نام و کنیت کے پائے جاتے ہیں پہلے سعادت خاں برہان الملک کے افسران فوج میں ایک سردار تھے

ـه جیلیس ڈائری

بعض کے ہمعصر میر خدا یار خاں، سید حسین خاں، آغا باقر میمونی اور میر جعفر علی خاں تھے۔ دوسرے ابو تراب خاں عہد فرزند مرزا محمد علی شاہ میں تھے جنہوں نے حکیم اللہ خاں کی سازش سے چھوٹے تحسین کو قتل کیا تھا۔ لیکن حقیقت میں آخر عامل کی قتل کے نام میں "تورانی" نام شامل ہی ہے۔ واقعات سے اس بات کو قوت پہنچتی ہے کہ ممکن ہے محلہ کے بانی وہی ابو تراب خاں تھے جو عہد اول میں برسر اقتدار ہوئے اور جس طرح لکھنؤ کے بعض محلے عہد اکبری میں آباد ہو چکے تھے اسی طرح اس بستی کی بنیاد عہد برہان الملک میں قرار دی جائے۔

عبدالحلیم شرر نے بتایا ہے کہ کنکوا کی موجودہ صورت آغا ابو تراب[1] خاں کی ایجاد ہے درست یہ ہے کنکوا ہوں سے پہلے ابو تراب خاں روہیلوں کی لڑائی میں قتل ہوئے اور وہ بچے وجیہ تو مسند قدر اور اس[2] نے کپڑے پہنے ہوئے لڑتے تھے حکومت کو ان پر برہان الملک کا دھوکا ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر سینے پر برچھا مارا جو حماقت کے باعث ہو گیا۔ اور ابو تراب خاں ہلاک ہو گئے۔ دوسرے ذرائع تحقیق[3] سے واضح ہوتا ہے کہ شہر کے واقعہ نگاروں نے ان کو صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کی فہرست میں ابو تراب لکھنوی کی لعنت سے یاد کیا ہے اور ۲۸ رجب کو ان کا عرس ہوتا ہے

سرپوش کو دوسرے اہل قلم کا سید کہا گیا ہے تعجب کی بات ہے محلہ سنگر گنج کے بازار و رکشہ جہانگیر کے بیچ میں ہے اور یہاں بھی شہر کی آبادی اعلیٰ طبقے پیشہ ور صاحبان ثروت، علما، امرا، اطبا رہتے تھے جن کی اونچی اونچی محلسرائیں وسیع صحن کشادہ مکانات کچھ تو اب تک موجود ہیں۔ دیوان خانہ یا انگنائی میں حوض کا ہونا، درمیت اکثر میں اونچے اونچے تدمچے رہتے دالوں کے تنگی مزاج اور غرور عمارت کی نشانی ہیں، دلکشی عمارتیں اور عالیشان نقش کھدکر میں ہوگئے جن سے محلہ کی اگلی حالت کا پتہ چلتا ہے یہاں کے مشہور لوگوں میں

<u>نواب تفضل حسین خاں</u> - نائب الریاست جنہیں علامہ لقب تھا نواب حسن رضا خاں کی سبکدوشی پر شوال ۱۲۱۲ھ میں منصب ملا اور بڑے مہینے کی وابستگی دامن دولت میں نو لاکھ روپیہ نقد علاوہ جاگیر اور دیگر ساز و سامان کے بارگاہ آصفی سے وصل کے حسب الوا‌ب وزیر علی خاں کو تحسین علی خاں ناظر پر بے اعتمادی کا شبہ ہوا اور بعض شریر مصاحبین کے بھڑکانے سے دشمن آگئی ہوئے اور ان کی گرفتاری کا حکم دیا اور غصے میں کہا کہ آج اس نافرمان کی ناک اڑا دوں گا اس وقت تحسین علی خاں اپنی آبرو بچانے کے لئے حقیقی دوپہر میں کٹرہ ابو تراب خاں پہنچے اور علامہ کے پیروں پر گر پڑے موصوف نے ان کو ماڑہ درنی کے بالا خانے پر بھیج کر میر مظہر کمیدان اور دوسرے لوگوں کو حفاظت کے لئے مقرر کر دیا۔ وزیر علی خاں نے جب یہ خبر سنی تو غصے میں بھرے ہوئے ہاتھی کے پائے پر بیٹھ کر سیدھے نائب کے گھر پہنچے اور فرمایا کہ اس نمک حرام کو حاضر کر دو انہوں نے عرض کیا آپ کے سر کی قسم تحسین علی خاں یہاں نہیں ہے۔ ہرکارہ کی خبر رسانی پر نواب نے خود سراغ لگانا چاہا۔ علامہ نے ہرکارہ سے بھی سخت گفتگو کی اور کہا کہ حضور کو غلام کی قسم کا اعتبار نہیں اور اس پاجی کے کہے کا یقین ہے۔ نواب واپس گئے اور علامہ نے نماز مغرب کے بعد پردہ دار چہرے میں میاں تحسین کو سوار کر کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ آر صاحب اور ان کے محرر محمد اسحاق خاں کے ہمراہ مسٹر میڈنٹ ریزیڈنٹ کے پاس بھیج دیا اور صاحب نے حالات معلوم کر کے مرزا املیل کے بنگلہ میں ان کو حفاظت کے ساتھ ٹھہرا دیا۔

---

[1] ذات یقین [2] گزشتہ لکھنؤ ص ۱ [3] تاریخ اودھ بجم الغنی [4] دیات الاخیار

علامہ کی بارہ دری کھنڈر اور ٹیلے کی صورت میں برسوں پڑی رہی اس بارہ دری میں تخت طلائی تھا جس کے چاروں طرف پوست کے خوشنما درخت تھے اور چوبی حصہ پر چاندی منڈھی ہوئی تھی بیچ میں بیٹھنے کی جگہ تھی اور یہ لکھنؤ کا تخت طاؤس تھا۔

بہت دن تک زمین ویران رہنے کے بعد اب یہاں پارک ملتا ہے اور دور رفتہ کو یاد دلا رہا ہے علامہ کے باورچی خانہ کا صرف کئی سو روپیہ روز کا تھا اور کئے آدمی دو وقت ان کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

فراشخانہ:۔ بارہ دری کے پاس فراشخانہ تھا جس کی زمین شیخ مصطفیٰ احمد تحصیلدار نے خرید کر مصطفیٰ منزل تعمیر کی فراشخانہ میں دریا، چاندنیاں، شامیانے، سوزنی، مسند کا تکیہ، حاضر اور کیا کچھ نہ تھا علامہ علی مورخ اودھ نے حال علامہ کی دولت ۸۰ لاکھ اور مرتبہ آبادی درست تحریر کی ہے۔

داروغہ عاشق علی:۔ سمت دکھائے سے تھے شیعہ سلاطین کے دور میں گھر پیدا کرنے کے لئے عیش باغ میں کربلا بنوائی اور ملکہ جہاں کے ہاتھ فروخت کر دی محرم میں اپنے گھر میں بھی تعزیہ رکھتے تھے اور مجلسیں کرتے تھے شرف الدولہ کے زمانہ وزارت میں آپ ... منصف الدولہ شریف الملک سے ایک باغیچے کے بارے میں اختلاف ہو گیا اور عدالتی چارہ جوئی کی نوبت بھی آئی شرف الدولہ ... کھا کر ان برسوں کی پیشیوں کے بعد صلحنامہ کرا دیا[1] موصوف نے ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا اور کٹرہ ابوتراب خاں کی مرداری میں دفن ہوئے ان کی یادگار ایک عالیشان مسجد کٹرہ میں اچھی حالت میں موجود ہے، ان کی اولاد بھی محلہ کے قدیم باشندوں میں ہے۔

حکومت برطانیہ کے زمانہ میں داروغہ صاحب کو نظر بندی کی مصیبت کا سامنا ہوا تھا سنی شیعہ فرقہ وارانہ فسادات میں بھی داروغہ عاشق علی کا ذکر آتا ہے قمر الدولہ ان کے سگے بھائی تھے اور کسنگ اسٹریٹ پر رہتے تھے۔

امامباڑہ تحمل حسین خاں:۔ محلہ کا یہ ایک قدیم امامباڑہ ہے جس میں عمارتی لحاظ سے کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں تحمل حسین خاں بانی امامباڑہ تفضل حسین خاں کے چشم و چراغ تھے حکومت کی طرف سے سفارت اور دیگر عہدوں پر برقرار رہے اور دو بیٹے احمد حسن خاں اور حیدر حسین خاں چھوڑ کر انتقال کیا۔ ان کی جائداد میں ۲۷ مکانات اور چھ لاکھ روپیہ ورثہ کو ملا[2] بانی امامباڑہ اعلیٰ درجے کے خوشنویس تھے یہ امامباڑہ انہیں کی یادگار ہے امامباڑہ میں اتر دکھن دو دالان اوسط درجے کے اور ... ہے اور پورب کی طرف خود ... ہے وہیں بانی امامباڑہ کی قبر ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے "مرقد مور رحمت نواب تحمل حسین خاں فردوس مکان ... ماہ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ وفات یافت۔ محمد تقی حسین خاں ..."

مجلسیں اس حصہ میں بھی ہوتی ہیں اور کچھ اور قبریں بھی دالانوں میں ہیں امامباڑہ کا منبر قابل ذکر ہے جس کے بارے میں ... تصدق حسین لکھتے ہیں ... منبر ایک نادر اور عجوبہ روزگار چیز ہے جس میں جالی دار لکڑی کی تختیاں جڑی ہیں اور سنگ تاج محل ... کی ہو بہو نقل بنائی ہے دوست بھی نہ رہی مکانات گرے مگر امامباڑہ ہو رہا ہے۔

... مصری:۔ بی مصری جن کا مصاحب گنج کے عنوان میں ذکر آ چکا ہے اسی محلہ میں رہتی تھیں ان کی دو لڑکیاں بی مریم اور بی ... تھیں جو عنایت علی اور رحمت علی کو منسوب ہوئیں میر عنایت علی کے بیٹے ... حسن تھے جن کے بیٹے میر محمد تقی ۱۹۴۲ء تک مددگار ... تسلیم شدہ عہدے ...

مسجد عمارتی لحاظ سے معمولی تعمیر ہے اور کسی قدر بلندی پر ہے تین طرف گلیاں اور لوگ راہ چلتے ہیں شیعہ

---

[1] ... السعادت ص ۱۱۰ [2] ارشاد ... جواہرات کا بیوپار [3] تاریخ اودھ ج ۵ ص ...

آبادی ہونے سے ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ اس مسجد میں ایک معرکہ آرا علمی مباحثہ مولوی کمال الدین بن حکیم نظام الدین صاحب جہانی اور مفتی سید محمد عباس صاحب شوستری کے مابین ہوا کسی مسئلے میں اختلاف ہو گیا تھا دونوں بحر مواج تھے روانی طبع در کھتی تھی آخر الامر حضرت سید العلماء نے (جن کے دونوں شاگرد تھے) مصالحت کرادی۔ فاضل نوگانوی نے لکھا ہے کہ یہ بزرگ کسی بات میں علامہ [1] فصاحت سے کم نہ تھے الخ ان کے تصانیف ملک میں شائع نہیں ہوئے تھے۔

علی جان خاں:۔ آپ کا امام باڑہ کٹرہ ابوتراب خاں میں موجود ہے پرانی وضع کے آخری نواب اور علی نقی خاں کے ہمعصر تھے ہمیشہ حلوائی کا گرد اور ٹکڑا کھاتے تھے بڑے خوش خوراک اور دسترخوان کے آداب جاننے والوں میں تھے چائے میں نمک کی ایجاد انہیں کا طرۂ امتیاز تھا اور "عز والعظم" کی لعنت نمک کو دریافت کرتے تھے ان کے دسترخوان پر کھانا کھاتے وقت ہر پلیٹ سرپوش سے ڈھکی رہتی تھی اور جس قاب یا کاسہ سے جو کھانا کھایا گیا پھر اس کو سرپوش کے نیچے رکھ دیا

عبداللہ عطر ساز:۔ اس محلہ میں عبداللہ عطر ساز رہتے تھے جن کی دکان سید حسین خاں کے کٹرہ میں پھاٹک کے سامنے تھی عطر سازی میں اس کی مثال نہ تھی

مولوی سید جواد اخباری: کٹرہ ابوتراب کے رہنے والوں میں آپ ایرانی نسل میر صدر قمی کے چشم و چراغ تھے دراز قامت، شیریں گفتار، مقفع و مسجع، گفتگو میں بڑے زبان آور عمر بھر شادی نہیں کی خان بہادر حکیم بعقر حسن خاں کے مکان میں رہتے تھے اور حسین آباد ہائی اسکول میں برسہا برس ٹیچر تھے بے شمار انگریزی داں ان کے شاگردوں میں ہیں ان کے نتائج افکار میں سمنہ ہزار ایک مجموعہ ۱۳۳۲ھ میں چھپا ہے نعتیہ اشعار میں دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

صفا پر تو حسنت بہار گلشن جنت — سواد موئے مشکینت فروغ لیلۃ الاسرا
دو چشمانت دو کرد لی و دار ظلم رحمت — دو ابرویت دو محرابے لو دار مسجد اقصیٰ

عراق کی زیارت سے فارغ ہو کر خراساں جا رہے تھے سخت ترین موسم گرما میں صعوبت سفر برداشت نہ کر سکے اور گاڑی میں انتقال کیا اور وہیں ۱۹۱۲ء میں سپرد خاک ہوئے۔

مولوی نادر حسین صاحب:۔ بڑے مقدس قبول صورت خوش پوشاک عالمانہ لباس میں رہتے تھے اور بات چیت میں عربی فارسی الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے گھر میں چوری ہوئی تو آپ بولے۔ سلہ مارہ میں سارق آیا تھا تعلق مات معدوم ہو گا قریب مایہ کے نقصان ہوا یعنی چاندنی رات میں چور آیا دروازہ کھلا رہ گیا تھا سو روپیہ کے قریب نقصان ہوا بزاز کی دکان پر گئے۔ فرمایا ایسا کپڑا چاہتا ہوں جو تلا لو ظاہری کے ساتھ دارث باطنی بھی رکھتا ہو مقصود دریجہ دار کی بہ عربی تھی۔

مکہ کا باغ

اس محلہ کو کٹرہ ابوتراب خاں سے متصل نصیر الدین حیدر بہادر کے مکہ دری سے آ۔ دکیا کسی وقت باغ تھا اب کچھ اور کچھ مکانوں کے سوا باغ کا پتہ نہیں ہے مکہ سلطنت میں مارسونیو ٹیلر [2] تھے اور بڑی لیاقت سے زیادہ شہرت حاصل کی مکہ کا کاشانہ ندہ اپنے محل پر ندر قرطاس ہو گا سر معلوم ہوتا ہے کہ نسواں اس کی تحت میں گئے رہانے کی پوشاک پر کچھ بحث ہوتا۔

[1] تذکرہ بے بہا صفحہ ۹۹ [2] قدیم بنزرنٹ

قدیم پہناوے کم ازکم نام باقی رہ جائیں اور قدیم عریانی کے لیتن قرار پانے سے پہلے پرانے تمدن کی یاد دلوں سے محو نہ ہو۔

ٹوپی کی جگہ:- سلاطین کے سروں پر تاج اہل دربار کے لئے دستار شہزادگان اور مرشدزادوں کے لئے سیاہ مندیل اور گرمی میں مابل نوٹ کی گول ٹوپی خاندان وزارت اور اولاد معتمدالدولہ کے سروں پر عمامہ سار سیاہ گول ٹوپی جو ابھی تک نوابین ۔۔۔ پورے کے ریب سر ہے معلموں اور روحیوں کے لئے ماد میں کا چوگوشیہ ٹوپی اور بعض نوابوں کے سر پر ناؤ دار بیل ٹوپی دولہا کے لئے ستعمل علمائے سروں پر عمامہ شاعر اور حکیموں کے سر پر چوگوشیہ ٹوپی جو گرمی میں چکن کی اور جاڑے میں شالی بانکوں کے لئے دوپلی ٹوپی سی جاتی تھی اور ہر قسم کے کاریگر علیحدہ علیحدہ تھے جاڑوں میں دوپلی بیلدار ٹوپی کے کاریگر شہزادے تھے جو پانا مالیہ پر رہتے تھے یہ تمام ایجادات مکہ اور ان کے شاگردوں کی صنعت ہیں۔

قمیص کے عوض میں:- اس وقت کلیوں دار کرتے مقدسین کے کرتوں میں کچھ کلیاں زیادہ اور گریباں میں مٹن کے بجائے ملاں کنٹھا اور گھنڈی تکمہ جاڑے میں مرزائی شوقی عرق گیر کے نیچے یا اوپر حسب عادت پہنتے تھے رؤسا اور امراء کے گھر کا پہناوا ایک کوٹ تھا جس کا نام آصف خوانی تھا اس میں آستین آدھی اور پورا تمام پہلو میں بر لعل سے شروع ہوتے تھے۔ تا کمر یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا اس کو آصف الدولہ بہادر پہنتے تھے موسم سرما میں واسکوٹ کی جگہ صدری تھی جس کا گلا کھلا ہوا نہ تھا۔

شیروانی کی جگہ:- اچکن، چکن، انگرکھا پہنا جاتا تھا مسلمانوں کے انگرکھے میں داہنے ہاتھ کی طرف سینہ کھلا ہوا اور ہنود میں بائیں طرف کا۔ اس کا لحاظ دونوں کے لئے ضروری تھا بعض برائے نیش کی اچکنوں میں آستین پر کف لگے ہوئے اور کسی اچکن یا انگرکھے میں روپہلی بیل اور گرد مغزی یا سنجاف کی گوٹ دوہرے سیپ کے نقش، جاڑوں میں روئی کا دگلا اور بیر سردی ... سادہ بعض لطافت پسند اولی چھینٹوں میں صرف جھالر بھر روئی بھروا کے چکن سلواتے تھے اور دھیمی اسراف) اس قدر رہتی تھی کہ وہ اس قدر کم مقدار میں روئی آستینوں، مونڈھوں، پشت اور دامن ہر جگہ پہونچا دیتے تھے علما و عربی اور قبا پہنتے تھے چکن اور شیروانی کی درمیانی وضع تھی اچکن پر سے جاڑوں میں شالی جبہ اور عبا یا دوشالہ، فرد، چادر اور گرمی میں ہندو مسلم شرفا کا دوپٹہ گلے میں ڈالے ہوئے ایک صدری آخری دور میں اچکن پر پہنی جاتی تھی اور اس کا فائدہ یہ تھا کہ اچکن کی بوسیدگی چھپ جائے۔ مدتوں یہ وضع پردہ پوشی کرتی رہی۔ عباس حسن فصاحت اور جاوید کبھی کبھی اس وضع میں دکھائی دیتے تھے وہ اس کو ساتر العیوب کہتے تھے معتمدالدولہ کے خاندان میں ایک کوٹ سا تو نام کا پہنا جاتا تھا جو لمبان میں پنڈلی ... تک جبہ اور لبادہ میں فرق یہ تھا کہ جبہ میں پشت اور دامنوں پر ترنجے ہوتے اور لبادہ پھولدار یا سادہ کپڑے اسی کی طرح ہوتا جاڑوں میں شالی رومال اوڑھا فردتی تھا جو چھوٹا ہوا تو اس کو سربند کہا گیا جس سے کان اور گردن سردی سے بچایا اور بڑا ہو تو کمر کے نیچے تک دامنوں سے مل گیا شال میں ایک وضع کا نام چار باغ تھا جس میں برابر سے چار طرح کے کڑھے پھول بیل کے بنے ہوتے گرمی میں اس کی بجائے مابل نوٹ کا رومال کا ندھے پر پڑا رہتا تھا۔ ایک کپڑا مثل قبا کے الق تھا جو مرزا مچھو بیگ لنوی کے وقت تک ترک ہو چکا تھا میاں بحر کا ایک شعر اس کا پتہ دیتا ہے ؎

طرہ خورشید ہے جس کا وہ ہے تری کہکشاں پیل ہے جس کے ترے الحاق ہے

الحاق میں پردہ نہیں ہوتا تھا۔

پائجامہ:- نوابی کے شروع شاہی تک مرد ایک ایک کلی کا پائجامہ پہنتے تھے اور یہ عام فیشن تھا لیکن اس کا راز یہ بتلاتے ہیں کہ کلی دار پائجامہ پہن کر دشمن کے سامنے سے بھاگ نہیں سکتے تھے اور یہ تمنا ہر مرد کے دل میں ہوتی تھی پرانی تصویروں میں غور کرنے سے کلی دار پائجامہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد چوڑی دار گھٹنہ کا رواج ہوا۔ علما، درمقدس لوگ غرارہ دار پائجامہ پہنتے تھے اور کابلیوں کی شلوار وغیرہ کی ہوتی، انھیں کپڑوں کی اور زیادتی کرکے سات پارچہ اور اکیس پارچہ کا خلعت دیا جاتا تھا۔

ہندو مسلم پہناوے کا فرق:- ہندی اور اسلامی عادات پر کشش سے یہ امر ثابت ہے کہ قدیم زمانے میں گو کہ ہندو مسلمان دونوں پہنتے تھے فرق یہ تھا کہ مسلمان بائیں طرف سینہ کا حصہ کھلا چھوڑتے اور ہندو داہنی طرف سینہ کا حصہ کھلا رکھتے تھے۔ گاہک کے چلن کا لحاظ کرے اس کا راز حکیم محسن صاحب مرحوم نے ایک کتاب میں بتایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ نازک رہنے والے کوتاہ قامت دراز ریش مذہب سنی رکھتے تھے ادبیات میں مولوی سید محمد حسن صاحب مرحوم کے شاگرد اور طب میں حکیم عبداللہ سے تلمذ تھا موصوف نے انگرکھے میں داہنی طرف کھلا رہنے کا راز بتایا کہ طب یونانی کا مسئلہ ملاحظہ ہو۔ ہندو اور ویدک کا بالمثل ہے مسلمان اپنے اصول طب پر قلب کو حرارت سے بچاتے ہیں اور بائیں طرف چھپا رکھتے ہیں۔ یہ حصہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور ہندو ویدک کے اصول پر قلب کو ہوا سے بچاتے ہیں اور بجائے بائیں طرف داہنی طرف کا سینہ کھلا چھوڑتے ہیں۔ ایسے کیسے صاحبان کمال تھے جو رہن سہن پہناوے اور معالجے انگریزی ادویہ نے رفتہ رفتہ بتدریج تسلط حاصل کیا

زنانہ لباس:- عورتوں کی پوشاک بھی آج سے بالکل جداگانہ تھی محرم، انگیا کا نام اردو شاعری میں بار بار آتا ہے ؎

رات کو عطر کی شیشی یہ نچوڑی اس نے — کہ سحر تک ہوئی مہندی سے بھی چوڑی انگیا

انگیا کے ہر گوشے بلکہ ایک ایک انچ حصہ کے جدا جدا نام ہیں اور متوازی طبقے زمانے کے ساتھ ترک کیے ہیں جو بخوف ابتذال درج نہیں کیے جاتے بہار ہند ص۲۵۵ و ص۲۵۶ میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اسی مقصد کے لئے "چولی" ایک قسم کی کرتی پہنی جاتی تھی جو کرتے سے چھوٹی رہتی تھی اس کو محرم بھی کہتے تھے آتش ؎

کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی — حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

نالوں میں مواف ؎

نہیں یہ بے جہت مواف چولی ہی تمامی کا — تجھے اے رشک سے اے پری کمی گرانی ہے

اور پشلوکہ آستین دار یا آدھی آستین کا عورتیں پہنتی تھیں اور "ساڑی کرتی" بھی زنانہ لباس میں شامل ہوتی تھی سر کے لئے دوپٹہ، لڑکیوں کے لئے اوڑھنی، دولہن کے لئے مقنع اور بڑے پائچوں کا پائجامہ جس میں چوڑی گوٹ، براق کی گوٹ، لکڑی کی گوٹ، لوز دار گوٹ ہوتی۔ ماماؤں اور لونڈیوں کے لئے چوڑی مہری کا پائجامہ جیسے آج مرد پہنتے ہیں۔ مہریوں کے لئے لہنگا پھریا، گھی والیوں کے لئے نیلے رنگ کی چادر، کنبڑنوں کے لئے چندری کا دوپٹہ، جاڑے میں دوپٹہ پر سے رضائی یا کامدار دوشالہ یا اونی اور ریشمی چادر پشواز کی مدحت میں رنگین کا یہ شعر ہے ؎

کروں قربان میں پشواز کو جالی کی کرتی پر — دو گاڑ مجھ سے اٹھ سکتا نہیں ہے بوجھ دامن کا

اس محلہ میں سید محمد مجتبیٰ عرف میر بڈھن صاحب ولد سید محمد عباس ایک نامی داکر رہتے تھے جو مرثیہ خوانی میں شہرۂ آفاق

تھے شاید ۱۲۳۲ھ میں [illegible] دنیا سے [illegible] کے متاثرات بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔

شلوار ـ مرد و عورت دونوں پہنتے ہیں آتش کہتے ہیں ـــ

دیکھئے [illegible] ریں [illegible] تتش — [illegible] ایک ہی مدعا ہے تہ ہے شلوار سے

چھلے داروں کا تکیہ

[illegible] ہے اور [illegible] کی گئی ہے ہمیشہ پست طبقے کے لوگ یہاں [illegible] رہے پردیس بھی [illegible] چھلے دار ان لوگوں کے گروہ کو کہتے ہیں جو احمد کبیر کی گائے ماننے والوں کے یہاں ان کی [illegible] ہونے [illegible] میں [illegible] کھانا [illegible] اور [illegible] کا سینکا ہوا ڈھول بجا کر گاتے ہوئے انگاروں پر لوٹتے تھے [illegible] عام مسلمانوں میں یہ رسم جاری تھی [illegible] ایک [illegible] تھے انھوں نے ۱۲۴۲ھ میں ترت دمال حاصل کیا [illegible] کے نام کی گائے [illegible] کر کے اپنی عقیدت کا ثبوت دیتے تھے غدر کے بعد کی اصلاحی مثنویوں میں اس رسم کا ذکر ہے ـــ

[illegible] کی کہیں گائے — کرتی ہیں یہ کم عقل و ناقص والے

اس ڈھونگ کا نام [illegible] مسلمانوں کی [illegible] کمزوری کا اظہار اس طرح کیا ہے ـــ

[illegible] کا ہے چھلے داروں پر — کوئی شادی کرے یہ لوٹیں گے انگاروں پر

[illegible] کے [illegible] بھی چھلے داری کھاتے تھے کلام ظریف میں بھی اس کا ذکر ہے ـــ

کئے ہیں شمع نے [illegible] وہ دیکھو آگ [illegible] — چھلے داروں کی صورت کو دنیا پروانہ آتا ہے

چھلے داروں کے ہاتھ میں جو ڈھولکی ہوتی اس کی لمبان جوڑان ایک مدیل سے کسی طرح بڑی نہیں ہوتی شادی بیاہ [illegible] موقع پر یہ [illegible] داروں پر [illegible] بھی بخشش حاصل کرتے سید [illegible] علی صاحب مجتہد العصر والزماں کے عہد آصفی میں لکھنؤ پہونچے [illegible] تبلیغ دین میں اس قسم کی رسمیں بڑی حد تک موقوف ہوئیں [illegible] آخری کرتب چھلے داروں نے نواب [illegible] بیگم کے [illegible] میں دکھائے [illegible] رسم [illegible] ہے۔

صحبت باغ

[illegible] میں اس محلہ کا کہیں ذکر نہیں [illegible] یہاں [illegible] تھے اور [illegible] سولی [illegible] ہوئے کاس آگئے اور جس کو [illegible] کے لئے ضرورت ہوئی وہ مزدور اور [illegible] کو [illegible] مزدوری طے کر کے لے گیا اس محلہ میں حکیم حشمت علی رہتے [illegible] کی [illegible] کیمیا بر تھی۔

بیگم گنج

یہ محلہ عہد آصفی میں آباد ہوا بیگم گنج کا بازار حلقہ الوتراب جان میں مشہور ہے اور [illegible] کی بستی یہاں سے شروع [illegible] ہے ایک راہ یحییٰ گنج گئی ہے دوسری رستوگی ٹولہ کی طرف۔

[illegible]

مطبع اصغری :- اس محلہ کا قدیمی پریس تھا جو مولوی نور محمد کے زیر اہتمام معیاری مطبوعات پیش کرتا تھا اس چھاپہ خانہ کا دوسرا نام مطبع مسیحائی تھا قمرالدین نقاش عہد امجد علی شاہ کا کاتب تھا جس کے ہاتھ کا ایرانی مطبوعات میں نظر آتے ہیں قصہ ہشت چمن کی لوح دیکھنے کے لائق ہے اور اعلیٰ نمونہ ہے قدیم کتابت کا۔

قاضی کا باغ

مسلمانوں کی پرانی بستی ہے مگر تاریخ میں اس محلہ پر کوئی نوٹ مجھ کو دستیاب نہیں ہوا اس محلہ میں منشی شمس الدین نستعلیق کے بہترین خوشنویس رہتے تھے جن کو پبلک سے اعجاز رقم کا خطاب تھا اور میعادی دائرے سارے یہیں ان کا جواب نہ تھا نظم پروین اور پنجہ نگارین منشی دربی پرشاد کی کتابیں نولکشور پریس میں ان کا شاہکار رہیں۔ ان کی رحلت کا مادہ تاریخ یہ ہے ؎

اعجاز رقم منشی تھے کامل   آہ محمد شمس الدین ۱۹۲۱ء

اس محلہ میں ایک شخص شیخ محمد ہادی رہتے تھے جو لکھنؤ کے استاد تھے اور ان کی محو نہ کا پیمانہ عطر کے چراغ جلا کر دودری نے سیا تھا۔

مسجد دیوان ناصر علی کٹرہ ابوتراب خاں سے نکل کر یہ مسجد اور ایک چھوٹا امام باڑہ ہے جو عہد شاہی کی یادگار ہے۔ دیوان ناصر علی کجوہ ضلع سارن صوبہ بہار کے رہنے والے تھے ان کی پہلی بیاہتا بیوی سے دو بیٹے تھے

عطا حسین خلف اصغر	عباس علی خلف اکبر
جہور حسین	ذوالفقار حسن
محمد علی	نواب ناصر حسن
	عباس علی

لکھنؤ میں سرکار اودھ سے وابستہ ہونے کے بعد ایک شادی کی جس سے کوئی اولاد نہ تھی مگر بیگم میں غریب پروری بہت تھی اور آپ نے یادگار باقی رہنے کے خیال سے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے مسجد بنوائی اور امام باڑہ تعمیر کیا جس میں محرم کی ۱۴ دن مجلسیں اور رمضان شریف میں افطار صوم اور دینیہ کی مجلس ہوا کرتی تھی جماعت کی قرارداد مسطور کی دیوان ناصر علی نے وہیں جاکر آخرت کا سفر کیا اور وہیں ان کی قبر اور اولاد ہے جو مسجد امام باڑہ کی متولی ہے کانپور میں انھیں دیوان ناصر علی کا حصہ ایک محلہ ہے مسجد میں ایک درجہ اور مختصر صحن ہے جس کے بعد پہلو میں دو درجوں کا امام باڑہ بلند شہ نشین اور چوڑا دالان جس میں منبر ہے اور مجلس ہوتی ہے تعزیہ خانہ کا معمولی سامان اور کچھ ہانڈیاں روشنی کی اس وقت کا بچا ہوا نمونہ ہے دروازہ سے ملی ہوئی بھی کچھ عمارت تھی جو کھنڈر کی صورت میں ہے اور ایک آدھ قبر نظر آتی ہے۔

کٹرہ جہانگیر

قدیم کاغذات اور دستاویزات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کٹرہ جہانگیر کا سلسلہ قدیم سے شروع ہو کر راہ تا داں محل سے مل جاتا تھا جب انگریزوں کے ابتدائی دور میں وکٹوریہ اسٹریٹ نکلی تو اس محلہ کی قطع و برید ہوئی اور دوسرا تباہ کن موقع کٹرہ جہانگیر

کو نادان محل روڈ لکھے پر دستخط ہوا۔ اس کٹرہ جہانگیر کے جن مکانات کا دستاویزوں میں ذکر ہے وہ کچھ تو محاسب حویلی کے پشت پر رہ جاتے ہیں اور باقی شہنشاہ حسین وکیل کے برج مکان کی مشرقی سرحد سے شروع ہوتے ہیں جہانگیر خاں ابو تراب خاں کے ہمعصر اور برہان الملک کی فوج میں سردار تھے سید تھے خان بہادر خطاب تھا اس محلے کے سات مکانات اور ان میں رہنے والوں کا ایک وصیت نامہ میں ذکر ہے جو جائداد وقف ہے مگر وقف کرنے والے کے نام کو ظاہر نہیں کیا گیا ہے تعداد مکانات جس میں میر حسن شاہ، میر محمد شاہ، میر جواد شاہ، حامد حسین خاں، سید اعجاز حسین۔ والد اعجاز حسین اور میر حامد حسین رہتے تھے

جن اصحاب کے نام میں شاہ کا اضافہ ہے وہ حضرت کشمیری تھے اور ممتاز العلما محمد تقی کے شاگردوں یا صحبت کے لوگوں میں تھے جن کو ان کے استحقاق کی بنا پر مکانات وقف میں رکھا گیا تھا۔ گولہ گنج کا مقبرہ اپنی وسعت کے باوجود کافی نہ تھا اور یہ حضرات حالانکہ دوسرے محلوں میں بھی رہتے تھے۔ میر محمد شاہ اتر کر ... جانے والے کو میر محمد شاہ کی گلی تک بتانی کافی ہے یہ وہی صاحب کمال ذاکر تھے جو ... مجلسوں میں اپنے حسن بیان اور قابلیت ذاتی سے چار چاند لگاتے اور شہر کی چوٹی کی مجلس ہی پڑھتے تھے حسین آباد کے عہدوں کا ... لا کر میر محمد شاہ کو اچانک محسن ... اس کتاب کے صفحات میں گذر چکا۔ میر محمد شاہ کے حالات پر ایک مکمل مقالہ لکھا جا سکتا ہے ۱۳۰۵ھ میں موصوف نے انتقال کیا اور احاطہ شمس نام واقع ... کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ میر محمد شاہ اپنے زمانے کے نادر الکلام حدیث خواں تھے مفتی سید تائب حسین رضوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ آغا احمد علی خاں مرحوم کے مکان پر زمانہ چہلم کی ایک مجلس میں میر محمد شاہ مرحوم حدیث مشہورہ منقول حضرت امیر المومنین کا رکوع میں انگوٹھی دینا بیان فرما رہے تھے کہ اور دوسرے بھی انگوٹھیاں دیں مگر ... اور کسی کی مدح خدا نے قرآن میں نہ کی ایک کشمیری نقال بولا کہ بیشک وہ اور دوسروں کی انگوٹھیاں طمع کی ہوں گی ... مجلس ہنس پڑی طمع کی لطیف ... درس کی مفید تلمیح پر خیال فرمائیں۔ لکھنؤ کے معمولی آدمیوں کی یہ ذہانت تھی یہ سب علم کی ... تھی جو شاہی زمانے کا اثر چلا آتا تھا ریاکاری کی تصویر روش گویا بعد طمع دکھا رہا ہے کہ وہ دیکھنے میں اوپر سے کچھ اور ہوتا ہے ... درحقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے (حیات دبیر ص۵۱۸)

سید اعجاز حسین مشاہیر میں تھے آپ کے والد کی بڑی عالیشان کوٹھی جب غدر میں کھود کر مسمار ہوئی تو آپ نے اپنے بھائی ... حسین صاحب کو جر کھاری میں اطلاع[1] دی اور غالباً اسی تباہی میں آپ کو مکان وقف میں رہنے کی ضرورت ہوئی آپ ... میں تھے اور اس قدر طاقتور تھے کہ آدمی کو زمین سے اٹھا لیتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۷ ماہ شوال ۱۲۸۶ھ ہوا اور امام باڑہ ... میں دفن ہوئے مادہ تاریخ یہ ہے "قبر جنت شدہ آباد باعجاز حسین"

آخر میں علامہ سید حامد حسین صاحب جامع عبقات الانوار کا نام نامی آتا ہے جو شیعی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں آپ کی وفات ۱۸ صفر ۱۳۰۶ھ میں ہوئی اور دار السلام بمقام امام باڑہ غفرانمآب میں سپرد خاک ہوئے۔

مؤلف کے دور شباب میں مکانات وقف میں سید ... صاحب، حاجی یونس صاحب، حکیم مرزا محمد تقی صاحب وغیرہ رہتے

۱۔ وصیت نامہ جناب ممتاز العلما مورخہ ۰ اپریل ۱۸۹۶ء رجسٹری شدہ وصیت شمس العلما السید محمد ابراہیم مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۸۹ء رجسٹری شدہ

۲۔ تاریخ العلما معروف بہ تذکرہ بے بہا صفحہ ۱

اور اب بھی مرقوم بالا افراد کے ورثا حسب وصیت نامہ رہتے ہیں۔

امامباڑہ:- اس وقت میں ایک امامباڑہ بھی تھا جس کی صدر دیوار اب بھی باقی ہے اور دروازے کی سمت دو گھوڑے درخت میں ۱۹۳۲ء تک اس امامباڑہ کے آثار موجود تھے ان مکانات میں سے ایک مکان کی دخلیابی کے سلسلے میں شعبان ۱۹۶۰ء میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹانا پڑا تھا

حاجی یونس صاحب اس دور تحریک کے تاریخی آدمی تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ء تک ۲۰ حج کیے تھے کسی۔ ملے ہیں ورزش کا شوق تھا کشتی لڑتے تھے ۱۹۳۵ء ان کا سال وفات ہے

سرائے آغا میر

نواب معتمد الدولہ نے اپنی وزارت میں جو پبلک کی خدمت کی ان میں مسافروں کی یہ قیامگاہ بھی ہے جو بہت بڑی سرا تھی مختلف سڑکیں نکلے پر اس کے طول و عرض کا تو تصور نہیں ہو سکتا مگر یک ٹکڑا اب بھی باقی ہے جہاں تانگے والے اور کچھ پیشہ ور بستے ہیں غدر ۱۸۵۷ء کے ہلاکت آفریں دور میں یہ ایک مورچہ بندی بھی انگریزوں نے اس وقت کی تھی جب احمد اللہ شاہ عیش باغ سے شکست اٹھا کر واپس ہوا تو آغا میر کی سرائے میں قدم جمائے انگریزی فوج کا حملہ ہوا اور احمد اللہ شاہ نے راہ فر[illegible] کی اس سرا میں عربی گھوڑوں کے تاجر بھی ٹھہرتے تھے ۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے روزنامچے سے واضح ہوتا ہے کہ صحن سرا کے بعض روزنامہ نے اس تاریخ لکھنؤ سے عربی گھوڑا خرید لیا۔

اس محلہ کے قدیم باشندوں میں نواب قیصر جاہ خلف مرزا غلام علی بیگ تھے ان کی ڈبیا کی گلوری اس قدر مزیدار اور پرتکلف ہوتی تھی کہ کسی دوسرے رئیس نے ایسے عمدہ پان کم کھائے ہوں گے مجلس میں بلند آواز سے روتے تھے اور ان کی آواز گریہ سے در و دیوار ہل جاتے تھے ان کی موجودگی مجلس کو کامیاب بناتی تھی

۲ مارچ ۱۸۴۲ء کو عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک معزز مسافر برکات حسن خاں سرا میں آئے وہ لکھنؤ کا جلوہ دیکھنے آئے تھے انہوں نے بھٹیاری کی تمیز داری تہذیب پر اپنے روزنامچے میں جو تبصرہ کیا ہے وہ ملاحظہ ہو بھٹیاری کا نام بھولا تھا وہ شہر کی تمام سراؤں یعنی نیم کی سرا، گدھے کی سرا اور سرا حسین آباد وغیرہ کی بھٹیاریوں کی منہ بولی بڑی بہن تھی۔ بھولا کا حلیہ یہ تھا۔ چوڑا چہرہ چیچک کے داغ سانولا رنگ، شوخ چشم، میانہ قامت، گداز بدن، ۴۵ سال سے زیادہ سن، لیکن تمرن تمایل کے باوجود عشوہ گر بے باک اور عیارہ صفت وضع لباس اور تراش خراش پوشاک کے لحاظ سے دلکش اطلس کا لہنگا ہے، جس کے بیچ میں سیمیں گوٹ، بنت اور سنہری گوکھرو لگے ہوئے پورے لیگے پر گوٹے کی چھڑیاں کا دشیر، صندلی رنگ کے جالی نوٹ کا دوپٹہ جس کے حاشیے میں نقرئی پٹھا لگا ہوا طلائی بالی پتے، حلقو، چمپا کلی، کڑا چھڑا اور دوسرے زر زیورات سے آراستہ، پاؤں میں زردوزی کا بیش قیمت پاپوش۔ بھولا اپنی برادری میں ممتاز اور عوام و خواص میں مقبول تھی۔ امرا اور رؤسا کے دربار میں بھی رسائی رکھتی تھی شرفا و نجبا کی محبت و وابستگی کا بھی دم بھرتی تھی سلاطین و ارکان سلطنت نے اسے ہزاروں روپیہ گھوڑے اور رتھ انعام دیئے تھے لہذا خوش حال زندگی گذارتی تھی لیکن اس کے باوجود اپنے کام اور فرائض میں مستعد رہتی تھی مسافروں کی خاطر داری

وحید التاریخ ص

اور دوسری پخت طعام اور دوسرے اوصاف جو بھٹیاریوں کے لیے مخصوص ہیں رقص و سرود، نقل سوانگ، جنگ و جدال، ایجاد دشنام و فحش گوئی، طلاقت لسانی و چرب زبانی، شوخی و چالاکی، کرشمہ و ناز میں ماہر و ہوشیار تھی اس نے خاں صاحب کی مہمان نوازی کے لیے دو جوان بھٹیاریوں تمی اور عدیا کو مقرر کر دیا تھا۔ ایک دن تمی نے طلب کیا تھا اور سب کام عدیا کے سپرد تھے لیکن صغر سنی کی وجہ سے اس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی تھی اور خاں صاحب کا کمرہ صاف نہ کیا تھا۔ تھوڑی … کی طرف داشت پڑی تو عدیا وہاں … کیا سیسے پر چڑھ گئی اس کے دست اکھاڑنے کی کوشش کی۔ خاں صاحب نے زبر … مادہ مقدمہ میں عاشق ہو کہیں گے … سیدھے سچے بچاؤ کر دیا اور قسم دے کر عدیا کو چھڑایا۔ کھولا اپنے عاشق … گر … در رو … قیمتی کے باوجود ہاتھوں میں جھاڑو لے کر جاروب کشی کرنے لگی خاں صاحب نے اسے منع کیا لیکن وہ نہ مانی اور کہنے … کی خدمت … اور سرمایہ … ہے کہہ کر … دیتے کے بعد اس نے اپنا کھانا منگوا کر کمرے میں کھایا اور تھوڑی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے زیارت کرنے پر خاں صاحب نے شہر کی تعریف کی کھولا نے کہا غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شہر زیادہ رونق دار تھا آج کل تو بادشاہ کی دنائت اور خست طبع کے باعث شہر میں ویرانی کا عالم ہے جب خاں صاحب سرا چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں گئے تو کھولا ایک دن ان کی ملاقات اور مزاج پرسی کو آئی۔ ان دنوں خاں صاحب کی طبیعت علیل تھی چہرے کی زردی اور آنکھوں کی لالی دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ شاید کسی مہ رو کی بے مہری اور کسی خوبرو کی عدم التفاتی کے شکار ہیں آتش کا یہ شعر پڑھا ؎

رنگ زرد و چشم تر سے لیجئے دعوائے عشق　　دو گواہ حال اس قصے کے لایا چاہیے

اس نے پوچھا اے مسافر دل باختہ و بعید الوطن و اے چہرہ زرد ساختہ و عشق گلبدن ؎

دل آشفتہ و دیدہ ہوشیار داری　　مگر با محبت سروکار داری

آپ کا حال کیسا ہے اور خیال کہاں ہے شاید شاہد شہریاں لکھنؤ نے آپ کے دل کو اسیر اور جان کو دستگیر کر دیا ہے سارا حال جلد بیان کیجئے اور مجھے اس ہیجان سے خلاصی دیجئے خاں صاحب نے جواب دیا مجھے دیار غربت میں کون پوچھتا ہے اور ہمارے سے مسافروں کی کون خبر لیتا ہے جب سے میں اس شہر میں آیا ہوں طرح طرح کے رنج و ملالت میں گرفتار رہوں کوئی دن بھی راحت و صحت کے ساتھ نہیں گزرا شہر کی آب و ہوا کی ناموافقت سے مسلسل بیمار رہوں ایسی حالت میں ویران لکھنؤ کے سودا کا کہاں شبہ ہے اس گفتگو کے بعد بھٹیاری نے لیے ایک استاد نور ورعلی کا خط خاں صاحب سے پڑھوایا جو اس نے پردیس سے لکھا تھا۔ انہوں نے خط پڑھ کر مفہوم سے آشنا کیا اور موقع کے مناسب ناسخ کے چند اشعار بھی اپنی طرف سے سنائے ؎

دم مرا گھبرائے کرتا ہے سفر　　گر نہ دم بھر اور آتا نامہ بر

غور سے دیکھوں میں ہر مضموں کو　　کوئی ساعت دل نہ بہلاوے خط

دل باختہ بھٹیاری نے جب خط کا حسرت آگیں مضمون اور اشعار کے مطلب سنے تو بہت ملول و محزون ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے تھوڑی دیر بیٹھ کر کھولا واپس چلی گئی۔ جاتے وقت خاں صاحب نے ایک روپیہ پان کھانے کے لیے رخصتانہ دیا حالانکہ یہ رقم اس کے رتبہ اور لیاقت کے لحاظ سے کم تھی جب وہ جا چکی تو نواب مرزا صاحب خاں صاحب کے لکھنوی دوست نے

ایک چابک سوار جو عورت ہمیشہ شہزادہ نجما، کے عشق میں مبتلا رہتی ہے ہزاروں روپے جو اس نے سلطان نصیر الدین حیدر کے محل سے گلے بجانے کے صلے میں پائے تھے سب اسی محبت میں ضائع کیا چنانچہ کچھ دن پہلے نوروز علی بے جونے میں سات سو روپیہ مارا تھا اور بجو عدم ادائیگی رقم ساتھیوں سے لے گرفتار کر رکھا تھا آخر اسی کشاری نے سب روپیہ ادا کیا اور اپنے آشنا کو چھڑایا۔ (دبدبۂ احمدی مورخہ ۲۶ مئی ۱۸۴۱ء لکھنؤ صفحہ ۱۴۱)

یحییٰ گنج

نواب آصف الدولہ بہادر کا نام یحییٰ علی خاں عرف مرزا امانی تھا اس محلہ کو نواب ہی نے بسایا اور ان کے نام پر شہرت ہوئی شہر کے تمام بازاروں میں جو چیزیں خورد و فروشی میں دستیاب ہوں وہ یہاں تھوک بکتی ہیں مسلمانوں میں خاندان ہدایت رسول کے حافظ محمد عمر محمد حسن کی دو کان قدیم دوکانوں میں اور تکمیل لس بلائی دار برتن والے ہندو کاروباری مشہور ہیں۔ تانبے پیتل اور لوہے کا سامان بہت سے یحییٰ گنج میں بکتا ہے عوام اس محلہ کو "ھیاگنج" کہتے ہیں ۱۹۰۹ء تک یہاں کا بازار ایک حیثیت رکھتا تھا اور میر عبدالحسین تاجر کتب اپنے مکتبہ تجارتی کی فہرست میں عنقا ۱۹۰۵ کی سطر لکھتے تھے۔

اس محلہ میں پرانے مندر اور مسجدیں ہیں جن کے بانیاں کا نام بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

<u>کھجور کا درخت</u> :۔ یحییٰ گنج میں ایک بیگم صاحب کی ڈیوڑھی ۲۵ سال ادھر تک باقی تھی اور سید ثروت علی صاحب ان کے دارو غہ تھے کھجور کا درخت موصوف ہی کے مکان میں تھا جس کے بارے میں وہ راوی تھے کہ بیگم صاحبہ کی مورث اعلیٰ عرب عراق کی یادگار میں یہ درخت وہاں سے لائیں اور وہ دن میں مٹی بھی بھروا کر لائیں اور بار برداری میں سیادہ سے زیادہ صرف کیا یعنی مطلب میں وہ دراصل یہ اچھا جو کربلائے حرم میں ہوتا ہے۔

اس محلہ میں لکھنؤ لال تائب نے بزم تہذیب ایک سوسائٹی قائم کی تھی اور محلہ کے صاحبان کمال میں قاری مرزا محمد علی صاحب ذاکری کے ماہر فن اور استاد گذرے ہیں جنھوں نے ۱۳۲۵ھ کے پہلے یا بعد اس دنیا کو چھوڑا۔ یہ دلدور لہجے میں پڑھنے والے حدیث خواں تھے۔

<u>مسجد نواب جعفر علی خاں</u> :۔ یہ مسجد خاندان نواب تہور جنگ بہادر کے رئیس نواب جعفر علی خاں صاحب مرحوم کی بناکردہ اونچی کرسی نیچے دوکانات اور ایک بڑا مکان مسجد سے متعلق ہے کسی زمانہ میں ایک مؤذن مغل اس میں اذان دیتا تھا۔

یحییٰ گنج سے ۱۸۴۲ء میں متصل مسجد مولانا حسن علی محدث ایک اخبار جاری ہوا جس کا نام اخبار ہلالی تھا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ پریس کا نام تھا (دنیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء)

<u>انجمن ہند</u> :۔ یہاں سے ایک اخبار انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے ۱۸۶۲ء میں راجہ سر رانا کشن سنگھ تعلقہ دار کھجور گاؤں نے جاری کیا موصوف قائم مقام صدر تھے ایڈیٹر کا نام کنور ہرنام سنگھ تھا ہر ہفتہ۔ صبح کا شائع ہوتا۔

<u>بلوچ پورہ</u> :۔ اس علاقے میں قصابوں کی بستی کو بلوچ پورہ کہتے ہیں بلوچ کے معنی مارے مدوتی کے ہیں پاکستان میں بلوچستان کا ریگزار مشہد مقدس امام رضا کے مسافروں کا رستہ ہے۔ ہوا صحرا ہے یہاں کے اگلے زمانے میں موچیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ شام میں حبیب کے ... سے نقل وطن کر کے آئے تھے۔ رسول کریم کی پیدائش سے پہلے وہ لوح صحف کی پہاڑیوں میں رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ

جب یزید نے حضرت امام حسین پر فوج کشی کی تو بلوچیوں نے امام مظلوم کا ساتھ دیا تھا۔ یہ طبقہ بعد میں ہجرت کرکے کرمان سیستان (ایران) سے ہوتے ہوئے مکران پہنچے۔ بلوچستان میں کوئی غیر ملکی انسان آباد نہیں ہے کبھی بلوچی آباد ہوں گے جن کا وجود تا حال باقی ہے۔ بلوچ قوم کو پردہ کا بہت زیادہ احترام ہے کسی موقع پر ملکی سازش سے بلوچی عورتوں کا ایک جلوس نکل گیا تھا تو کوئٹہ ۳ اگست کی خبر ہے کہ مسٹر صیفر نے بلوچ قوم کی خواتین کے بے پردہ جلوس پر سخت ترین احتجاج کیا اس کا جزیہ ہے ان معزز خواتین کی عزت آبرو کے تمام بلوچ امین ہیں بلوچوں کی تاریخ میں کبھی خواتین نے سڑکوں پر گشت نہیں کیا ان کی آواز کبھی مردوں تک نہیں پہونچتی ہے بلوچوں کے رسم و رواج اور روایات کو کبھی پائمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جنگ یکم ستمبر ۱۹۶۳ء صلہ کالم ۱

سبحان نگر

تاریخ میں اس محلہ کا ذکر کہیں نہیں ہے صرف اس قدر پتہ ہے کہ راجہ علی خاں کا کچا مکان درگاہی لال کی بارہ دری کے قریب تھا اور عہد قدیم میں یہاں ایک پریس تھا شگوفہ گلزار اردو نام اس پریس کے مطبوعات عہد شاہی کے مطالع سے نسبتاً دوسرے درجہ پر تھے گلستان سعدی یہاں طبع ہوئی۔

<u>شیدیوں کی نسل</u>:۔ سلاطین اودھ نے اپنی حفاظت کے لئے جن حبشی مرد و عورت کو تجویز کیا تھا اس میں مرد کو سیدی تو آج تک کہا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنی سچائی، بہادری، وفا ہر لحاظ سے قابل تعریف رہے حبشی عورتوں کو ریستی، کہتے تھے چنانچہ عورتوں کے ماتمی گروہ میں ریستی حسینہ، و ریستی حمید نام عورتوں کے تھے اور دونوں کو ان الفاظ سے کیوں یاد کیا جاتا تھا اس کے بارے میں خان بہادر علی سجاد حسین خاں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر و سابق کمشنر نے تحقیق کی اور وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ سیدی۔ یعنی میرے سردار عربی جملے کا بگڑا ہوا لفظ سیدی اور "سیدتی" میری سردار عورت، عربی جملے کا تلفظ شدہ لفظ ریستی ہے اور اپنے قبیلوں میں یہ لوگ سردار تھے اس نسل میں میرے ہمعصر شیدی میاں عنبر بہت اچھے شخص اور کافی طاقتور اور دلیر تھے شیدیوں میں بہت ہر دلعزیز اور بہادر شخص سیدی غلام علی گذرے ہیں ان کے برابر نواب صادق علی خاں عرف شہنشہ دولہ صاحب رئیس گنگی شوکل تالاب تھے اور دونوں سے زیادہ طاقتور اور مرد میدان غالب علی تھے تینوں شخصوں میں اتحاد تھا اور ایک دوسرے کی قوت و طاقت کو تسلیم کرتا تھا۔ کسی دن ٹہلتے ہوئے کھیت کی طرف نکل گئے دیکھا کہ دو طاقتور بیل کنویں سے چرسا کھینچ رہے ہیں غالب علی نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا اس نے تلوار سے رسی کاٹ دی فطرتاً ڈول کو لوٹ کر تہ آب تک پہونچنا چاہئے تھا انہوں نے دوڑ کر رسی پر پاؤں رکھا اور ڈوبنے نہ دیا اس جھٹکے سے وہ گراں گوش (بہرے) ہو گئے اور وہ چرسے کا ڈول جس کو بیل نکالتے تھے خود تنہا نکالا۔

شیدی غلام علی کو معلوم ہوا کہ ایک شخص باہر کے آئے ہیں جو بگی چوکی ایک پایہ پکڑ کر اٹھا لیتے ہیں انہوں نے مقابلے کے لئے مشق کی اور ایک دن پہونچ گئے اور ناواقف بن کر ان سے تعارف حاصل کیا انہوں نے طعن کرتے ہوئے کہا کہ لکھنؤ والے پتلی دال کھانے والے کیا اٹھا سکتے ہیں یہ کہہ کر چوکی اٹھائی۔ غلام علی نے ایک پایہ اٹھا کر چوکی کو اٹھایا اور کہا اچھا ہوتا اس پر کسی لڑکے کو بٹھا دو ایک لڑکا بٹھایا گیا اور شیدی نے دوسرا پایہ جھکایا یہاں تک کہ ہر گوشے پر لڑکے کو بٹھا کر بلا تکلف اٹھایا اور پھر پوچھا کہ آپ دہلیز سے کتنا لوہے کا کیوڑ نکالتے ہیں انہوں نے گھما کر نکالا اور شیدی نے یونہی کھینچ لیا اور وہ پردیسی ان کی طاقت

کا ان گئے۔

مادان محل

نخاس سے امین آباد جانے والی سڑک نکلنے پر یہ محلہ کھد گیا مگر مقبرہ مادان محل کی عمارت اپنی قدیم شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے یہ شیخ عبدالرحیم صوبہ دار لکھنؤ کا مقبرہ ہے اور اس کی بنیاد اس وقت قائم ہوئی جب لکھنؤ میں شہریت نام کو بھی نہ تھی شیخ عبدالرحیم ضلع بجنور کے رہنے والے تھے تلاش معاش میں دہلی گئے وہاں مقدر کی یاوری سے منصب دار ہو گئے شیخ انھیں کی نسل سے ہیں[1] نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں مدن محل بحذف الف لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اور وجہ تسمیہ آج تک دریافت نہیں ہوئی لفظ کی ترکیب شیش محل، فرنگی محل کی طرح ہے اور عمارت انگریزوں کے زمانے سے آثار قدیمہ میں ہے ایک بلند سنگی چبوترے پر اونچی چھت پتھروں کے چار سنگی ستونوں پر اس کو روکا ہے اور چبوترے پر سلاطین آصفجاہ حیدرآباد دکن کی قبروں کی سی سنگی تربتیں ہیں اور شیخ ابراہیم کے کنبے میں جو لوگ قضا کر گئے تھے وہ اسی جگہ دفن کئے گئے اور شاید معمار کا نام افضل تھا ظریف کہتے ہیں ؎

کرسی کے لوگ ان کے آگے ہوشیار — گر ان کو گدھا کہوں گدھوں کو بھی ہو عار

الّو دانا ہیں ان سے بڑھ کو عاقل — مادان محل کے ہیں یہ افضل معمار

اس عمارت کے بعد شیخ ابراہیم چشتی کا علیحدہ مقبرہ ہے جو ایک حجرہ اور گنبد کی صورت میں ہے شاہ سکندر کے زمانے میں یہاں قیام رہا تھا یہ واقعہ عہد ... ملک کا ہے ... کو لوگ پاک باطن کہتے تھے ... کے حملہ خور کا ان پر بہت اثر ہوتا تھا چنانچہ انھوں نے پیشین گوئی کی کہ یہاں آگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں اور صدہا آدمی مر جائیں گے وہی ہوا کہ پٹھانوں کے بارود خانہ میں آگ لگی اور لوگوں کی جانیں گئیں[2]۔

شیخ ابراہیم کا وصال عہد ہمایوں میں ہوا اور اسی مقبرے میں دفن ہوئے قبر پر تاریخ وفات موجود ہے ؎ تھا یا شیخ ابراہیم چشتی کہ بود در زمان فرد یگانہ — شد آں قطب جہاں از ملک فانی — سوئے عالم باقی روانہ — رسال موت او کسی کہ پرسید گو رفت از جہاں قطب زمانہ ۹۶۱ھ

عہد شاہی کے بعد جو تعزیہ بڑی دھوم اور ازدحام سے اٹھتے ان میں حاجی میر نواب علی صاحب مرحوم کا تعزیہ ہے جو مادان محل سے اٹھتا تھا پبلک کی طرف سے ان کو رکن عزا کا خطاب تھا اور اپنے تعزیہ کا اعلان ان لفظوں میں کرتے تھے کہ میرا مکاں پامال ستم انگریزاں ہو گیا

اصطبل چار باغ

یحییٰ گنج اور رکاب گنج کے بیچ میں واقع ہے گردونواح میں مسلمان آبادی کہیں کہیں ہے نہیں معلوم یہاں کب اصطبل تھا شاہی گھوڑوں پر سائیس چابک بردار، چھاتہ بردار، تپائی بردار ہوتے تھے اور چابک میں چاندی کی شام۔ اس محلہ کے رئیس و رئیس حکیم کوچک عہد شاہی کے نامور طبیب تھے ان کا نام تاریخ میں محفوظ نہیں ہے قد و قامت کے لحاظ سے یہ لقب مشہور ہوا اشتہار تھا با اقتدار ہستیاں ایرانی نژاد تھیں اور وہ اپنے ذوق سلیم کے مطابق محلہ اور اشخاص کے نام رکھتے تھے شروع گیارہویں صدی

---

[1] گذشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر ص ... [2] تاریخ اودھ ج ا ص ۱۹۵ نجم الغنی

ہجری ۱۲۴۳ھ میں قریب بیس حکیم کوچک نامور شخص گزرے ہیں اسی تصویر میں ان حکیم صاحب کا نام بھی حکیم کوچک ہوا تھا او ہندو اہل محلہ اور نامہ دار بھی حکیم صاحب کا علاج کرتے تھے۔ عبدالحلیم شرر نے اس خاندان کے مورث اعلیٰ کے علمی کمالات کا نسب ذیل ملاحظہ ... سے پیشتر دور کے بعد زمان اور ستارہ کی طرح فن طب بھی خاص یہیں کا فن ہو کے رہ گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ، حکیم مرزا محمد علی، حکیم سید محمد مرتعش، حکیم مرزا کوچک، حکیم شفائی جیسے عالی پایہ اور گرانقدر طبیب پیدا کئے جو سچ یہ ہے کہ اپنے دور کے مجتہد تھے

سید مرزا علی کا اکھاڑہ – مرزا علی تیرھویں صدی کے پیدا شدہ لکھنؤ کے آخری پہلوان تھے ان کی کشتی مناجان کے ساتھ دلی تاریخ سے پہلے دونوں پارٹیوں میں وہ کشتی ہوئی دیکھنے ... رہتا اس ایک پٹیش کو فرقہ وارانہ لباس بھی پہنا گیا۔ مرزا علی کے باپ پینترا بدل کر بیٹھ گئے اس لئے بیٹے کے جیت ہونے کی خبر سنوں گا تو گومتی میں ڈوب جاؤں گا ... اچھا یہ تھا کہ مسجد میں جا کر خدا سے دعا کرتے ماں باپ کی دعا خدا جلد سنتا ہے۔ کرشمہ قدرت نظر آیا اور مرزا علی جیت گئے اس وقت شہر بھر میں ان کی استادی کا ڈنکہ بج رہا تھا موت نے ان کو کسی نہ چھوڑا اور بعد وفات محلے کے قبرستان میں حویلی سے والی گلی کے قریب ہے دفن کر دیئے گئے

عہد شمس العلما سید ناصر حسین صاحب مجتہد میں اس تکیہ کی قبروں پر سے گندا پانی بہانے کا راستہ نکالنے پر اہل محلہ نے ... کیا تھا اور قبروں کی بے حرمتی سے اظہار بیزاری کیا اور ذیل تاریخ کی جس پر مشہور لوگوں کی دستخطیں ہیں

احاطہ کمال جمال

تاریخ میں کمال جمال کا ذکر نہیں ہے اور صوفیائے کرام کے تذکرے بھی ان کے ... حالی میاں نگر نواں کے پہلے لکھنؤ میں ان ... تھا اور حالات ضبط و تدوین میں نہیں آئے۔ اس وقت اس محلہ میں جو لوگ لکھنؤ کی بنیاد قائم ہونے سے پہلے نسلاً بعد نسل آباد ہیں ان میں محقق ہندی مولوی سید محمد حسین صاحب محدث مرحوم کا خاندان ہے ان کے والد علامہ سید حسین بن ... علی پردادا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں رسالدار تھے[۱]۔ آصف الدولہ کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر اس طرف کا رخ کیا۔ ... شاہی لے کر لکھنؤ پہونچے اور اسی احاطے میں قیام کیا۔ ایک پختہ آرامی کا معافی نامہ آپ کے پاس تھا مجتہد العصر زمان کی خاندان سے لیے علمی کمالات بہت بلند درجے پر حاصل کئے۔ آپ پہلے شخص ہیں کہ ساڑھے تین برس میں سفر کربلائے معلیٰ ... مدت میں طے کیا اور پردیس کی سختیاں برداشت کیں ۳۳ سال بڑھاپے کی کمزوری میں آپ مبتلا رہے اور ۸۰ برس کی عمر میں دنیا کو چھوڑا تکیہ باغ سنتیر جنگ میں آپ کی قبر جونی مرتع کی تحت میں ... حجرہ موجود ہے آپ کی اولاد ہندوستان پاکستان میں موجود ہے فخر الحکما حکیم علی اطہر صاحب بانی رسالہ اصلاح لکھنؤ ... بہتر بلند پایہ عالم علامہ کے شاگرد ... ہے کہ ٹیڑھی قبر کے شہید سید محمود رضوی جمال لقب کے نام پر محلہ آباد ہو۔

... دان محل روڈ کمال جمال کے احاطے کی سمت ٹیڑھی قبر کے زار نو ... المحالس منشی نور الحسن دھولپوری کے مطالعے سے معلوم ہوتے ہیں کہ محمود رضوی مستجاب الدعوات تقیہ میں بسر کرتے تھے ایک مفسد نے مخالفین سے مناظرہ کرا دیا جس میں وہ کامیاب

---

[۱] مصالح العمر مولفہ سید محمد غلام حسن ابن میر محمد بخش پانی پتی ص ۱۵۳ [۲] گزشتہ لکھنؤ ص ۱ [۳] تذکرہ بے بہا ص ۱۴۱

ہوئے اور بانیٔ زندگی فاسق ہوا اس جرم میں وہ آگرہ میں شہید ہوئے اور صرف سر ان کا یہاں دفن ہے۔ باقی لاش ۔ رکاب گنج کا پھاٹک اسی مقام پر تھا اور سنگ سرخ سنگ مزار تھا جس پر طلائی کام تھا اور آیۃ الکرسی کندہ تھی وارث آل رسول ٣٣٠١ تاریخ ولادت اور جانشین حیدر کرار تاریخ وفات ١٠٥٠ اور کہا جاتا ہے کہ مشک گنج کے سادات اسی ٣٣ سالہ نوجوان مقتول کی نسل ہیں واللہ اعلم۔ سربراہ ہونے سے قبر پر چراغ اہل خلد جلاتے ہیں۔

رکاب گنج

عہد آصفی کا محلہ ہے۔ جو غلہ کی بہت بڑی منڈی ہے امین آباد اور چار باغ کا راستہ ہونے سے کبھی ویران نہیں ہوا یہ نام کیوں رکھا گیا تاریخ سے رہنمائی نہیں ہوتی۔ خیال ہوتا ہے کہ شاہی رکابدار یہاں رہتے ہوں جو مربہ اور حلوہ بناتے تھے احاطہ خانساماں یہاں سے نزدیک ہے جو اس نکتہ میں مدد دیتا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے اس احاطے کو ایک حاجی داروغہ کے رہنے کی جگہ بتایا ہے مجلسوں کی پرانی فہرستوں کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں جس عامل کی مسجد ہے جہاں ٤٠ سال پہلے ہر مہینے کی ٤ کو محمد آغا ماہوار مجلس کرتے تھے۔ اس محلہ میں ماداں محل روڈ کے کنارے شاہراہ پر مسجد مرتضوی ہے جو قدیم عمارت سے جدید عمارت میں منتقل ہوئی ہے اس کے بانی کا علم اب نہیں ہے

کھجوہ کا باغ

ناظم آغا علی خاں کے باغات میں یہ باغ اور ایک قدیم عمارت موجود ہے جس میں مولانا سید محمد حسین صاحب عبقات الانوار کا کتب خانہ ہے جو آٹھ آٹھ نو نو سو برس کی پرانی کتابوں کا یادگار ذخیرہ ہے ورکا جس اہتمام اور حفاظت سے کتابوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہے اس کتب خانہ کے بانی ١٨ صفر ١٣٠٦ھ ہوئے ہیں اور ماشاءاللہ عمر اسی آب کی مقدس سرزمین پر محو خواب راحت ہیں۔

<u>باغ میر عشق</u> :۔ یہ محلہ چند مشہور شاعروں کے ادبی آستانوں سے آراستہ تھا اور جو ارباب کمال یہاں رہتے تھے ان میں ہر فرد چمن ادب کا عندلیب خوش نوا تھا۔

<u>احمد مرزا صابر</u>:۔ آپ میر انیس کے منجھلے بیٹے اور انیس کے داماد تھے دربار واجدی کے مجرائیوں میں نام تھا نواب زہرہ محل نے اپنی ڈیوڑھی کا معتمد اور داروغہ بنا رکھا تھا لکھنؤ کے یکتا کمال شاعر پیارے صاحب رشید انہیں کے فرزند ارجمند تھے جو عہد مؤلف کے سب سے بڑے غزل گو اور مرثیہ خواں ہمعصر جاوید ماہر تھے ان کے واقعات زندگی لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا ہے اور مختصر لائف آغا شہر نے لکھی ہے۔

<u>سید محمد مرزا انس</u> :۔ یہ میر علی انس برادر میر انیس کے علاوہ ایک شاعر تھے جن کے مراثی لعشق کے مرثیوں کے ساتھ چھپے ہوئے موجود ہیں ان کو عہد واجدی میں سو روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے ملتا تھا مرثیہ خوب کہتے اور پڑھتے خط شفیعہ کے استاد تھے نواب ملکہ جہاں نے ایک بار ٢٠ ہزار روپے اور دوسری دفعہ ٢٥ ہزار روپے ان کو دئے جس خدمات میں چار سو روپے ماہوار پر ملکہ جہاں نے ان کو ڈیوڑھی کے انتظامات کا عہدہ دیا تھا اور آخر تک بھائی کہنے لگی تھیں۔ بیچا نوے برس کی عمر میں مر گئے

لہ قدیم ہنر مشہ

دور بقیہ میں دفن ہوئے۔

میر عشق: مشہور شاعر تھے ان کی ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں کلام زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے میری نوٹ بک پر ان کے کسی محل پر یہ اشعار قلمبند ہیں ؎

طاؤس وار رنگ جو آئینہ صد — طوطی شکر سماں شفق اہل دیں وفا

بلبل جو بنی پھول تو گھڑائی فاختہ — دل سیر لائے طوق لیے آئی فاختہ

لایا سمجھ کے مدر کو جو حسن کے پاس تھا — آنکھیں غزال اوج ہما ہوئے گل ہوا

ہر وقت قمریاں ہیں پاس مع الدعا — سنا ہے مچھلیوں کے نقش کی تو صدا

ممدوح کے سراپا میں یہ شعر ؎

زلفیں پڑھیں یہ پیچ اٹھائے واسطے — کھیلیں مسیں لبوں میں تمہارے کے واسطے

اتالیق ہند: ۱۳ جولائی ۱۸۸۲ء[۱] کو رکاب گنج سے محمد علی خاں عرشی نے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

دوگانواں

نواب منور جنگ بہادر نے[۲] دو میں سیخوں کو سات سو ایکڑ زمین دے کر یہاں بسایا اور بیچ محلے پر خود قبضہ کیا یہ جگہ شہر کی حدود کے باہر سمجھی جاتی تھی "دوگانواں" یہاں سے شروع ہوتے تھے مدت تک ویران رہنے کے بعد اسٹیشن روڈ نے اس رہ کو بھی آباد کیا۔

مولوی گنج

یہ محلہ عہد نواب سعادت علی خاں میں کسی مولوی کے ہاتھ سے آباد ہوا اور امراء و رؤسا مشرقی صنعت و حرفت میں سربلند آباد رہے محلے کے سردار مرزا سلیمان قدر بہادر خاندان شاہی کے اعلیٰ رکن اور معزز شاہزادے تھے ان کی عظمت اور قدر کے مطابق تو ان کی کوٹھی نہ تھی مگر

احاطہ سلیمان قدر: لکھنؤ کا مٹیا برج معلوم ہوتا ہے اور تنہا نہ دماغ سے نادار طبقے کو اپنے زیر سایہ رکھنے کے جذبے میں محلسرا کے گرد و نواح میں عام اجازت دے رکھی اور آسمان کے تاروں کی طرح بے ترتیب مکان بنا شروع ہو گئے چھپر کھپریل الکھوری رنگ کے چھوٹے بڑے مکانات غرباء کو بتلاتے ہیں کہ شہزادہ صاحب کے دماغ میں ملوکانہ غریب پروری تھی اور اپنی بلندی سے نیچے ذہ مفلس طبقے کو رعیت بنانا چاہتے تھے سلیمان قدر کا امام باڑہ بیشک تین درجوں کا اونچی کرسی دے کر نمایاں عزاخانہ ہے جو رقعہ کی صورت میں ہے اور لکڑی کے نیچے دیگر دھنیاں چھت میں خوبصورتی سے نصب کی گئی ہیں صحن میں گھنڈ ہے جو موگری سے کھلتا ہے۔ عہد واقعت میں اس ڈیوڑھی کی شان و شوکت نہ پوچھو۔ عظمت خاندانی میں ان کا کوئی ہمسر تھا نہ جواہرات اور سامان تھا ان کی نظیر تھی شام کو سواری کو نکلتے وقت نوکر چاکر مصاحبین وابستگان دامن دولت ایک ہجوم ہوتا تھا اور آپ روزانہ امام باڑہ سبطین آباد اسلاف کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جاتے تھے۔ ایک پان والا حضرت گنج میں اپنی دوکان سے

۱؎ یادگار ۱۹۰۹ء   ۲؎ بیگمات اودھ ص۱۵۱

شاہی گذشتہ وقت کی تصویر پیش کرتا تھا۔ اس دور میں ایک شریف متوسط ماسٹر کم کر دیتے تھے۔ ان کی داد و دہش، جود و سخا
خورد و نوش کے واقعات ہیں جو آب زر سے لکھے کے قابل تھے۔ افسوس ہے کہ جانشینوں نے طلب منفعت کے سوا کبھی سیرت نگاری
پر توجہ دی اور نہ اولاد میں کسی کو توفیق ہوئی کہ لائف مرتب کرتا ان کے ذوق سلیم اور ادب نوازی کے چٹکلے بیان کرنے والے بھی
زیر زمین پہنچ چکے۔ اگر شاہانہ عادات و اطوار کی نقشہ کشی ہوتی تو ایک دلچسپ کتاب تیار ہوتی اور نشست و برخاست کا
ہر دن ایک ادنیٰ کارنامہ ہوتا۔ ایک شخص کو ندرت سے پتیاں لگاتے۔ ب رس پہونچنے کے پہلے ہی آنا۔ ہاتھ میں لے کر جو کی پڑ گیا
آپ نے فرمایا یہ مرد مومن غایت درجہ بولایا ہوا ہے۔ شہزادہ صاحب کے زمانے میں بزم شعر و سخن کی یہ طرح لو دار ماتم غزل
ہزل میں ہر طرف مقبول ہو رہی تھی ؎

چھپے تھے جب شگوفوں تاب ہمارے نہ حال اپنے کہے سے تیر جدا رہیں گئے

سید محمود تقی ایک شاعر دبستان دہلی دوست سے مولوی گنج کے مکتب میں لڑکوں کو پڑھاتے تھے واقف کو شعر و
سخن میں یدِ طولیٰ حاصل تھا وہ ان کی اپنی شعر و سخن سے گزر ہوتی۔ ایک غزل کہی ؎

مدہ کا دہ ہے را ق رہتے ہیں کتنے گلس کا حوب رت ہم ق رہیں کتنے

حضور ... کو شعر سنے اور یہ دعویٰ کیا کوئی دنیا میں سے کچھ بڑا نہیں ہے طریف کی تو لی تھی ہاتھ جوڑ کر عرض کیا
مہ کا۔ بس ایک قافیہ چھوٹ گیا ہے۔ ؎

قسا رقہ ہوا جب کہ یک مرد کر پنشہ خوب ہٹ مدت کہیں رہیں گئے

میر علی پھکیت دہ صاحب حیثیت در علیحدہ تھے حیثیت مرد سیلمان قدر بہادر کو کڑوی سکھاتے تھے قدیم ہنر مشاق
تھا مرزا محمد امجد علی میں شہزادہ صاحب کو کرچھی سکھاتے تھے ۔۔۔
شہزادہ صاحب ۲۲ رجب ۱۳۲۳ھ کو آخری لال کو فردوس بریں کا سفر کیا ایک عرصے کے بعد لاش کربلائے
معلّیٰ روانہ ہوئی۔

مرزا ثریا قدر بہادر: آپ شہزادہ صاحب کے خلف اصغر تھے در آبائی شان و شوکت، شاہانہ کروفر ملوکانہ تہذیب و
معاشرت کے واحد حقدار تھے شعر و سخن میں آپ کا تخلص جوہر تھا خوشنویس بھی تھے اور تحریر ایسی دلکش ہوتی تھی جیسے موتی پروئے
ہوئے قدیم رفتار و گفتار میں ان کا کوئی نمونہ تھا سید عباس حسن صاحب میاں امامت کے چشم و چراغ مصاحبین میں تھے
امامت کو دربار لگتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں یہ شمع بھی صرصر فنا سے بجھ گئی

مولوی گنج میں گنگا سہائے معتمد ایسے فن میں کامل تھے اور پھول پتی ان سے بہتر بنانے والا کوئی نہ تھا گنگا سہائے کے
اکثر کہیں کہیں اب بھی نظر آتے ہیں۔

قاسم علی لبکٹ والا: محمد شاہی کے کمالات کا نمونہ تھا بڑھاپے میں آنکھوں کی بصارت نے جواب دیدیا تھا لڑکے کا بدھے
ہاتھ سے کبر دو سال کی ڈیوڑھیوں پر پہونچا۔ قاسم علی سکٹ والا مرے"! اس کی صدا ہوتی اس حالت زمانے میں اس سے
بہتر کار گر اب تک پیدا نہیں ہوا۔

گلزار اودھ مطبع:۔ یہ وہ پریس تھا جو صدا بخش خاں بنارسی کے زیر نگرانی حافظ محمد باقر چلا رہے تھے شوال ۱۲۸۳ھ تک اس پریس کے مطبوعات لائبریریوں میں ملتے ہیں اس پریس کے بعد مطبع تیغ بہادر قائم ہوا جو اب تک ہے۔

دھنیا مہری کی مسجد:۔ مولوی گنج میں موجود ہے اور اس مسجد کے بارے میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہو چکا ہے عدالت نے طے کیا تھا کہ یہاں ہر دو فرق سنی اور شیعہ نماز پڑھیں کچھ دنوں تک ایسا ہوا مگر اب صرف اہلسنت کا قبضہ ہے اور دھنو مہری کا امامباڑہ ہونے کے امکانات اسی محلہ میں ہیں۔

ہم محلہ سعادت گنج دھنو مہری کے بیان پر بحث کرتے ہوئے امامباڑہ کے جو حالات قلمبند کر چکے ہیں وہ اسی محلے کے معلوم ہوتے ہیں۔

مولوی گنج میں سکندر شکوہ کی ایک کوٹھی کا بھی پتہ صفحات تاریخ سے لگتا ہے جس میں مرزا محمد عباس شکوہ متولی امامباڑہ سکندر شکوہ رہنے لگے تھے اور مذہب اہل سنت ہونے سے وقت سے دلچسپی رکھتی۔

بوستان العاشقین:۔ دسمبر ۱۸۵۰ء کو منشی مادھو لال نے مولوی گنج سے یہ ہفتہ وار اخبار جاری کیا گیا دو دسمبر ۱۸۵۵ء)

نوٹ، امامباڑہ دارات علی خاں اس وقت مولوی گنج میں شمار ہوتا ہے مگر قدیم تاریخ نے اس کو احاطہ فقیر محمد خاں میں قرار دیا ہے اس لئے یہاں اس کا ذکر نہیں ہے

رسی بٹاں

یہ محلہ بھی مولوی گنج سے ملا ہوا پرانی بستی ہے یہاں رسیاں بٹی جاتی تھیں ظریف کا شعر ہے ؎

اس محلہ میں رسائی ہو تو جا کر دیکھو   شام کو رسی بٹوں زلف رسا آئی ہے

امامباڑہ امیر محل:۔ اوسط درجہ کی خوبصورت عمارت ہے امیر محل سلطان عالم واجد علی شاہ کی ملکہ تھیں موصوفہ نے یہ امامباڑہ کرامت حسین افسر سرول کے ذریعہ دیکر امامباڑہ بنوایا اور ۱۶ محرم ۱۲۶۹ھ کو جب سلطان عالم کلکتہ روانہ ہوئے تو مہر دار کے چھ محلات کو طلاق دیدیا تھا امیر محل انھیں بیبیوں میں تھیں امیر محل اپنے زمانے کی بہترین حافظ تھیں اور نسخ میں ان کا جواب نہ تھا میرے پاس ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے کچھ ورق ہیں جو حسن خط پختگی شان تحریر میں بہترین شاہکار ہیں امیر محل کی جائداد بارہ بنکی میں بھی موجود ہے لکھپیڑا سرائے امیر گنج ان کی اولوالعزمی اور غریب پروری کی یادگار ہیں بارہ بنکی میں بھی امیر محل نے امامباڑہ اور مسجد تعمیر کی جس کے نیچے دوکانات ہیں مسجد کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

گفت اختر سال تعمیرش چناں   ذکر این مسجد بنام آسماں ۱۲۸۵ھ

امامباڑہ بارہ بنکی کا مسجد کو دیکھتے ہوئے چھوٹا ہے مولوی گنج کا امامباڑہ عہد شاہی کی عمارت ہے۔ اس کی سقف دوست محمد علی خاں مرحوم فرزند امیر محل نے اپنے اہتمام سے تبدیل کی تھی۔ اس امامباڑہ میں امیر محل نے جس شان و شوکت سے مجلسیں کیں اور تبرک تقسیم کیا اس کی نظیر عہد شاہی میں بھی نہ تھی کھیر کی قلفیاں یا پلاؤ کا طباق مجلس کے شریک ہونے والے مرد دونوں کے گھر بھیجے جاتے تھے اور اتنا وزنی ہوتا تھا کہ خود اٹھا نہ سکتے تھے امیر محل نے ۲۴ رجب ۱۳۱۰ھ کو سفر آخرت کیا اور کربلائے تالکٹورہ میں زنجیری پھاٹک کے قریب صحنچی میں دفن ہوئیں۔ امامباڑہ کے متولی ۱۳۲۵ھ تک میر محمد عابد خاں و قاسم علی خاں تھے۔

حسان القوم ملا علی نقی متقی نے اس علاقے میں علم مذہب کے نکھرے ہوئے چراغ روشن کئے اور ۲۰ رجب ۱۲۹۵ھ بعمر ۹۰ سال دنیا سے پردہ کرلیا اور امامباڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔

ہاتھی خانہ :- رستی جتوں سے گذر کر یہ محلہ قدیم آبادی میں اب بھی شمار کیا جاتا ہے اس کے دو راستے ہیں پہلا مولوی گنج سے دوسرا امین آباد کے بجلی گھر کے پہلو سے یہاں کسی وقت میں راجہ صاحب محمودآباد کے ہاتھی باندھے جاتے تھے۔

عیش باغ

اس باغ کی بنیاد نواب آصف الدولہ کے ہاتھ سے ہوئی اور یہ موتی جھیل کے کنارے جانب شرق تھا اور چار طرف خوشنما اور بلند پھاٹک تھے۔ اس باغ کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ نواب کے زمانے میں ساون کا میلہ بڑی دھوم سے ہوتا تھا۔ دودھ کے کمالات اور فنون لطیفہ کے مظاہرے مشرقی صنعت و زینت کے نمونے جیسے خلائق کھینچ کھینچ کر آتی تھی۔ تاریخ میں ہے کہ موتی جھیل یا بلی کا چشمہ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا ہے پیاسوں کا دل ہرا ہے۔ اس چشمے تک کی گہرائی اور گہری تھی کہ بڑے بڑے پیرنے والے بھی پیراکی کے جوہر دکھلاتے تھے ؎

سنتے ہیں موتی جھیل میں بھی پانی آگیا　　تیرا کساں بھی موئے گئیں سہرا متاں

اس نہر کی تیاری کے بعد عیش باغ میں اور سیاہ چار چاند لگ گئے آصف الدولہ کے بے پایک وزیر علی خاں کی شادی کا جلسہ عیش باغ اور چارباغ میں ہوا۔ اس وقت تمام ورحبہ سہری اور ردیہی ادے ت پڑھے ہوئے تھے نوابی ختم ہونے پر شاہی آغاز ہوا اور بہادر شاہ نے عیش باغ کو کچھ ترقی دی۔ عہد تتری کے شاعر نے اس باغ کی مدح میں کہا ہے ؎

رہنا ہو لکھنؤ میں جیسے جائے عیش باغ　　تکلیف سیر ہم کو نہ دیں یار مہرباں
پھرتے ہیں عیش باغ میں دل باغ باغ ہے　　ہر ایک سرو قد کے بغل میں ہے بوستاں

ایک شخص لکھنؤ سے کلکتہ چلا گیا اس کے دوست نے جدائی کا صدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ لکھنؤ میری نظر میں بغیر تمہارے اجڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے جواب میں[1] لکھا۔ "اگر حیات باقی ہے تو پھر وہی صحبت اور وہی باتیں اور وہی دن رات کی ملاقاتیں اور وہی شکار اور وہی عیش باغ کی سیر ہے اور مر گئے تو والسلام خیر ہے"

آتش کہتے ہیں ؎

[2] کوچہ تیرا عیش باغ ہے اے یار بے تاویل ہے　　چشم اشک آلود عاشق اس میں موتی جھیل ہے

عیش باغ کے شروع حصے کو نواب گنج کہتے ہیں۔ نماز عید ۱۸۵۸ء سے عیدگاہ کے میدان میں ہوتی ہے۔ عیدگاہ میں مسلمانوں کی نماز اور [illegible] کا میلہ عیش باغ کے وہ منظر تھے جو صفحۂ تاریخ پر باقی رہیں گے۔

کربلائے ملکہ جہاں :- اس کربلا کو حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے داروغہ عاشق علی نے بنوایا تھا ملکہ جہاں نے پونے دو لاکھ روپیہ معاوضہ دے کر چھوٹے حضرت کا روضہ بنوایا ان روضوں کے چاروں طرف چار عظیم الشان خشتی پھاٹک تھے جس کی محراب کے پہلوؤں پر مصلے سے جگہ دار علم اور اوپر آیات قرآن لکھے تھے۔ ایک سمت دو کانوں کا پتہ بھی تاریخ سے ثابت ہے۔ خواجہ محمد وزیر نے اس

۱۔ انشاء کتاب مؤلفہ محب علی توحید　۲۔ انشائے بہار بے خزاں ص ۲

کربلا کا سن تعمیر باغ کربلا سے نکالا ہے اور عمارت کی تکمیل ۱۲۵۶ھ میں ہوئی۔ کربلا کے متعلق جو آراضی ملکہ جہاں نے لی تھی وہ چھ بیگھے پینتالیس بسوے سے کم نہ تھی اور اس کا نام چک کربلائے حیدری رکھا تھا۔ کربلا کی تعمیر کے بعد عیش باغ میں تعزیہ کے سامان کے ساتھ مذہبی آثار بھی نظر آنے لگے مسجد، حمام، روضہ حضرت عباس اور روضہ حر بھی اس کربلا کی واحد خصوصیت ہے۔

عذر ۱۸۵۷ء اور عیش باغ :- عیش باغ کی مرکزیت کا تقاضہ تھا کہ اس آباد ترین حصہ شہر کو تباہی کا بھی خطرہ ہو مندیاؤں کی لڑائی کے بعد دوسرے دن صبح کو جنگ آزادی کے حامی عیش باغ میں پچاس ہزار آدمیوں کی تعداد میں جمع ہوئے اور انگریزوں کے خلاف تقریریں ہوئیں مولوی احمد اللہ شاہ نے تارے والی کوٹھی سے اٹھ کر عیش باغ میں ڈیرہ ڈالا اور ۲۵ مارچ کو انتظام کی طرف سے پروانہ جاری ہوا کہ ان کو عیش باغ سے باہر کردیا جائے۔[1]

انگریزی لشکر جب بسواں اور باڑی کی سمت روانہ ہورہا تھا اور احمد اللہ شاہ اور فرازشاہ کو شکست دیکر پھر لکھنؤ واپس ہوا تو عیش باغ آٹھ مہینے فوجوں کی گذرگاہ بنا رہا اور احمد اللہ شاہ جنگ آزادی میں پوری بہادری کے ساتھ بمقام پوائیں کسی زمیندار کے ہاتھ سے مارے گئے۔ عیش باغ ہی وہ جگہ تھی جہاں احمد اللہ شاہ انگریزی گورکھا فوج سے لڑے اور دست بدست جنگ میں گھوڑے پر سوار ہوکر عیش باغ کو رزم گاہ بنایا اور جس گروہ سے انگریزوں کا ٹکرا ہوتا تھا ان کو مدد پہونچائی یہاں تک کہ جنگ آزادی کے حامی اپنی کمزوری اور اقلیت سے ٹھہر نہ سکے۔ ۲ جولائی کو حسب سرہری لارنس چیف کمشنر اودھ بیلی گارد کے قلعہ میں گولی سے مارا گیا تو دسویں ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ ۳ جولائی کو احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ میں نقارہ بجائے اور عامیان آزادی کی طرف سے امن و امان کا اشتہار[2] دیا اور باشندگان شہر کو بتایا کہ سلطنت سے ہندو مسلم امن و امان میں بسر کرتے رہے تھوڑی مدت سے قوم انگریز اس مملکت پر قابض ہوکر ان دونوں گروہوں کے ایمان کی خواہاں ہے بدیں وجہ ان کو مملکت ہند سے خارج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کشت و خون اور مورچہ بندی میں عیش باغ ایسا تباہ ہوا کہ تمام دلفریب مناظر مٹ گئے عمارتیں ڈھادی گئیں۔ کربلا کے کئی پھاٹک منہدم ہوگئے اور صرف روضہ باقی رہ گیا۔ انگریزوں نے عیش باغ میں قلعہ اسی وجہ سے بنایا کہ وہ ان کے فتوحات کی یادگار رہے۔ انگریزی راج میں عیش باغ میں ریتی پر سورا اور بڑے بڑے درختوں پر چمگادڑیں اور ہر طرف ویرانہ نظر آیا۔ اور بربادی کے موقع پر عیش باغ کی مثال دی جانے لگی۔ اس تباہی کے بعد شہر کے کچھ بے فکر لوگ عیش باغ میں میدان پاکر کنکوا لڑانے کے لئے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ ظریف کا یہ شعر بتاتا ہے[3]

ڈور کے گولے چرخیاں لے کر رہیں میدان قلعہ میں دن بھر

عیش باغ میں قلعہ اور واٹر ورکس انگریزوں نے بنایا اور قلعہ کی ضرورت نہ رہی پر اس کو ۱۳۳۳ھ میں منہدم کرکے دوسری عمارتوں میں جگہ استعمال کی "پانی گھر" اب بھی موجود ہے۔

حکایت :- نواب مرزا صادق علی خاں بہادر خاندان شجاع الدولہ کے معزز رئیس صاحب گنج میں رہتے تھے ان کا معمول تھا کہ ایک مکا فرنہ گرارد لیتے تھے اور کچھ سنکھیا رفیٰ میں ملاکر ڈنڈ کے بعد نوش کرتے تھے۔ ایک بار عیش باغ کے میلے کی سیر دیکھنے گئے چار پہیہ کی گاڑی جس میں کوچ بکس بھی لگا تھا کوچ میں گاڑی بان ہانک رہا تھا اس کے پہلو میں نواب کا بٹیر باز بیٹھا تھا اور رفقا ساتھ

---

[1] یادگار حضرت محل [2] ایضاً ص ۲۷ [3] احسن التواریخ ص ۱ [4] ص ۹۶

کی مدد پہنچنے سے پہلے خود سے گھوڑے نے بدحواسی کی اور گاڑی جھیل کے اندر چلی شہنشاہ دوراں بہادر جلدی سے گاڑی سے کود کے اور پہیئے کے اندر ہاتھ ڈال کر آرے کو پکڑ لیا کہ گھوڑا بھڑکا گاڑی ہل نہ سکی یہاں تک کہ سب آدمی نیچے اترے اور سائیس نے گاڑی سے گھوڑے کو کھول دیا۔ بشیر باز نے کہا کہ حضور میری کاپکڑی کو بچ نکس پر رہ گئی ہے۔ نواب نے فرمایا کا ایک ہی آدھ رکھ بشیر باز گاڑی پہنچا اور کا ایک آدی اس کے بعد نواب نے ہاتھ نکال لیا اور گاڑی جھیل کے اندر چلی گئی۔

ہنڈولے کا ناکہ

اردو میں ہنڈولا بچوں کے پالنے اور جھولے کو کہتے ہیں۔ پاؤں پاؤں چلنے کے لئے جو مثلث لکڑی کے تین پہیوں کی ننھی گاڑی بنائی جاتی ہے۔ عیش باغ سے گذر کر یہ ناکہ ہے جہاں سے ایک راہ بڑے اسٹیشن چار باغ کی سمت اور دوسری عیش باغ جاتی ہے۔ عیش باغ میں موتی نگر کی جدید آبادی جو کانگریس راج کی بستی ہے اس کی بنیاد کے ساتھ ہنڈولے کا ناکہ آباد ہونا شروع ہوا اور گذرگاہ عام ہونے سے ۲ برس پہلے جو ویرانہ تھا وہ دور ہو کر اس شہر آبادی سے تبدیل ہو کر بس کے ذریعے گاڑیوں اور سواریوں کی نقل و حرکت ہوتی ہے وہ بہ تقدم ہو چلے۔ اس چوراہے پر قدیم آثار میں اسٹیشن جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر

نقی میاں کی مسجد:۔ یہ عمارت اسٹیشن جانے والے ہر شخص کو نظر آتی ہے اور بخلاف دوسری مسجدوں کے کئی گنبد اور خوبصورتی اپنی طرف نگاہ کو دعوت دیتی ہے بڑی کاوش اور عرق ریزی کے بعد مجھے اس مسجد کے بانی کا نام اور تفصیل سے معلوم ہوا کہ نقی میاں عہد شاہی کے ایک شخص تھے ان کے پوتے پرپوتے کا دن میں رہتے تھے مسجد اوسط درجے کی ہے اور تنگ رہنے کے حد اچھی حالت میں ہے چبوترے پر صحن میں بیاسا سال پڑا ہوا ہے۔ محرابوں پر گلکاری اور چھت میں جو سماکل ہوتے دیکھنے کے قابل ہیں نمایاں گنبد تو تین ہی ہیں مگر ان کے گرد چھوٹے گنبد پوری سطح کو اس طرح گھیرے ہوئے ہیں کہ سقف پہ چلنے والے کو پاؤں رکھنے کی جگہ مشکل سے ملے گی۔ مسجد کے گرد اگرد پھر کر شمار کیا جائے تو ممکن ہے کہ گنبدوں کی تعداد بارہ ہو تہ گوشے میں مؤذن کا حجرہ اور اسی سمت ایک جدید در جو خارج مسجد بھی ہے جو قدیم عمارت کے کسی حصے کی جگہ ہے۔ پورب کی طرف بیت الخلا اور پانی کا نل اور ایک چھوٹا کنواں ہے جو عہد قدیم کی یادگار ہے مسجد کے تین طرف دو کانات ہیں جن کا دور حاضر کی آبادی بڑھنے سے پہلے آٹھ آنہ ماہوار کرایہ تھا اور محمد چکوا اس کرایہ پر تیس برس گوشت بیچتا رہا۔ اب اس کا بڑھایا اور آخری وقت ہے اور اس کی دوکان مسجد سے کچھ دور واقع ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مسجد کی موجودہ آمدنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے عہد شاہی ختم ہونے پر اس مسجد میں مولوی ہدایت رسول صاحب مشہور معترا سلام کے خسر امامت کرتے تھے پھر مولوی صاحب امام مسجد رہے۔

امین آباد

اس محلہ کو پرانے لکھنؤ کا آخری حصہ کہنا کچھ بیجا نہیں ہے اس کے بعد نیا گاؤں شہریت کے اختتام کا ثبوت ہے۔ یہ آصف الدولہ کے عہد میں .... شکوہ کی آباد کردہ ہے۔ اس وقت اس کا نام "مسرت نگر" تھا اور بعض "سکندر آباد" کہتے تھے۔ سکندر شکوہ شاہ

[illegible] مرزا لکھنؤ .... [illegible]

عالم کے چشم و چراغ تھے ان کی موت کے بعد ان کی بیگم جائداد پر قابض رہیں اور انہوں نے ۲۸ ہزار کو نواب امداد حسین خان امین الدولہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ ان کا پورا خطاب امین الدولہ ذوالفقار جنگ تھا امین الدولہ نے لاکھوں روپیہ صرف کرکے بازار اور مسجدیں [illegible] کوٹھیاں اور باغ بنوائے اور اپنے لقب پر نام "امین آباد" رکھا

سابق امین الدولہ نے امین آباد کا نقشہ یہ تھا کہ چاروں طرف چار پھاٹک اور ہر گیٹ پر ایک مسجد۔ پھاٹک نہ رہے مگر مسجدیں اب بھی غیر منظم صورتوں میں موجود ہیں بڑا دروازہ پچھم کی سمت تھا۔ اور اس طرف کی مسجد کو "کالا پھاٹک کی مسجد" اس وقت بھی کہتے ہیں۔ پچاس برس پہلے اس مسجد کی ایک شائع شدہ رپورٹ میں یہ تفصیلیں ہیں۔ نواب امین الدولہ کے مغربی پھاٹک کی مسجد، ہر مسجد کا تنخواہ دار پیش نماز مقرر تھا مولوی سید علی حسن حائری جو بڑے جید عالم تھے پیش نمازوں میں تھے آٹھویں دن جمعہ کو وعظ ہوتی تھی ہر مسجد کا امام دوسری مسجد کے امام کی اقتدا میں نماز پڑھتا تھا۔

امین الدولہ کے آغاز وزارت میں مرزا فصیح مرحوم مشہور شاعر کا آخری دور حیات تھا اور کلیات فصیح میں مدح امین الدولہ میں چند قطعات اور متفرق شعر نظر آتے ہیں وہ بڑے محترم اور مذہبی آدمی تھے ان کی مدح میں یہ مشہور شعر ہے ؎

اے شان حیدری ز جبیں تو آشکار نام تو در زمانہ ذوالفقار

عہد شاہی کے واقعہ نگار ان کو "عماد سلطنت مدار" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں مفتی میر عباس صاحب نے ان کی مدح میں اقرار کیا ہے ؎

برج حصن مملکت محکم از دست دین و دولت در پناہ ہم از دست

وزارت کے عہدے سے جب دست کش ہوئے تو رعیت کے دل میں پھر ان کی وزارت کی تمنا تھی ؎

الٰہی بحق جناب امیر بدیں رسول بشیر و نذیر
کہ بار دگر نادح وزارت رسان بعہدش دلہا بشارت رسان
بنقش تا بیوم التناد سر امارت ز رحمت باد

امین الدولہ نے جو علمی خدمات انجام دئے وہ اس لٹریچر سے واضح ہیں جو ان کے اشارے پر چھپا اور جو کتابیں مختلف اہل علم سے نام پر معنون کیں۔ امین الدولہ کے خاص خدمت گاروں میں احمد علی تھے جو سلطان العلماء کی سفارش سے چار سو روپیہ ماہوار پر نوکر تھے۔ امین الدولہ بعض اوقات ان سے امین آباد کی مسجدوں کی وعظ کو لکھ بھیجتے تھے

کلاب باڑی ۔ اس حلقہ کے ایک خوبصورت باغیچے کا نام تھا اس کا پھاٹک سعیر آباد کے چوراہے پر تھا گنگا گھر پارک اسی باغ کی باقی ہے۔

امین الدولہ کا باغ :- یہ وہ پارک ہے جس میں ۱۹۱۲ء سے قومی اور سیاسی جلسے ہوتے ہیں اور صوبہ کی سیاسی جماعتوں کے جلسے ہوتے ہیں امین الدولہ کی بارہ دری امام باڑہ سکندر شکوہ کی جانب غرب تھی اور یہ عمارت وزیر موصوف نے اپنی حیات ہی میں بی بی عباسی خانم کو ہبہ کردی تھی اور وزیر منزل نامی عمارت بھی اسی جگہ تھی اور یہ امین الدولہ کا ملاقاتی قصر تھا اس کے بعد

۱؎ مراۃ فصیح ج ۲ ص ۲۶۳ ۲؎ سعد المومنین فی تفضیل الرسول الامین

مختلف لوگ اس پر قابض ہوتے رہے اور آخر میں شیخ فرزند علی وکیل نے خرید لی۔ بعد ۱۹۴۰ء میں افسر جہاں زوجہ ممتاز حسین نے مبلغ دس ہزار روپے کو خرید لیا۔

شاہی کوٹھی: ۔ امین الدولہ کے قبضے سے پہلے یہ دو منزلہ کوٹھی عہد امجد علی شاہ کی بنی ہوئی موجود تھی جس میں بقول تیج تصدق حسین ایڈوکیٹ لکھنؤ پہلے ہی ۱۸۶۴ء میں کیننگ کالج کھلا اور جب کالج کی عمارت قیصر باغ میں تیار ہو گئی تو ۱۸۷۸ء میں کالج اپنی ذاتی عمارت میں پہونچا دیا گیا اور اسکول ۱۸۹۰ء میں جوبلی میں شامل کر دیا گیا اور یونیورسٹی ہونے پر درسگاہ کو بادشاہ باغ میں لایا گیا یہ کوٹھی امین الدولہ کے بعد ان کے بیٹے شرف الدولہ حکیم الملک احمد حسین خاں کے قبضے میں آئی کیننگ کالج میں مولوی سید علی نقی صاحب ایک باکمال شیعہ عالم اور دوسرے مولوی فضل اللہ صاحب فرنگی محلی عربی اور فارسی کورس پڑھاتے تھے۔

پیڑائن کا باغ: ۔ اس باغ کا بھی پتہ نہیں ہے صرف پیڑائن کی رہیں روڈ نیورپے کی مسجد موجود ہے جس کے اونچے منارے لمبا چوڑا صحن خوبصورت اور بہترین نمونے کے دوسری مسجدوں سے علیحدہ وضع کے گنبد پہلو میں داہنے ہاتھ کی طرف ایک بڑا حوض اور کچھ آراضی جس پر ممکن ہے کہ عمارت ہو۔

پیڑائن کا باغ ۱۲۲۶ھ ڈیڑھ سو برس پہلے تک موجود تھا رقعہ نمبر ۶۰ میں ہے "دیروز کہ تاریخ دہم ربیع الثانی ۱۲۲۶ھ روز چہارشنبہ بود دستگیر در باغ پیڑائن کہ از حضور میاں آمرزش شدہ" واقعہ یہ تھا کہ نواب مرزا ملک نے خوشامدی محمد تقی صوبیدار اکبرآبادی کی لڑکی سے کی تھی اس کے ساتھ ایک ہندو خدیجہ خانم تھی نواب کی یہ بیٹا بی بی کے مرنے پر یہ کنیزاں کی ریتیں ہی بنی اور اس سے ۱۲۱۲ھ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صدر النساء رکھا گیا خدیجہ خانم نے جو باغ لگایا تھا یہ اس کی مسجد ہے اس کے ساتھ ایک حمام بھی مسماۃ ہے کنور کی معرفت ماحس کا پتہ نہیں ہے کنور قوم کی پنڈتائن تھیں مگر اسلام لے آئی تھیں عوام نے اس لفظ کو پیڑائن کر دیا خدیجہ خانم جب قید زندگانی سے آزاد ہوئیں تو اپنی ان رہیں پر سپرد خاک ہوئیں۔ امین الدولہ پارک میں جو اس وقت ہشت پہل چبوترہ ہے وہ انھیں کی قبر ہے اور شہید مرد کا مزار سمجھا غلط ہے قبر پر جو عمارت تھی وہ ۱۹۱۳ء میں گر گئی۔

گونگے نواب کا باغ: ۔ آپ کا نام اور لقب شرف الدولہ حکیم الملک احمد حسین خاں تھا گونگے تھے اور اشاروں سے بات کرتے تھے۔ ان کا عکس کربلائے امین الدولہ کے برآمدے میں فریم میں آویزاں ہے کلاں کوٹھی آپ کا آبائی ورثہ تھا۔

امامباڑہ سکندر شکوہ: ۔ آپ شاہزادہ مرزا محمد اکبر شاہ دہلی کے حقیقی بھائی تھے باغ پیڑائن میں آپ نے امامباڑہ بنوایا جس کی تعمیر عہد نواب سعادت علی خاں میں باہتمام جنرل میکلوڈ انجینئر ہوئی نواب اکثر صبح کو اس امامباڑہ کی تعمیر دیکھنے آتے تھے اور ان کے مناسب مشوروں سے اس کی تکمیل ہوئی۔ امامباڑہ کے سامنے کوٹھی اور محلسرا بھی تیار ہوئی امامباڑہ کے ساتھ زنانہ امامباڑہ لنگرخانہ درباری کوٹھی مسافرخانہ اور ۴۲ قطعہ محلسرائیں تھے اور سات سو دوکانیں اور کئی قطعہ حمام اور مساجد، اصطبل، فیلخانہ اور ایک باغ ترشا ہوا تھا ۱۲۳۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی اس امامباڑہ کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ بانی امامباڑہ نے اپنے بھتیجے بہادر شاہ ظفر کو سابق ولیعہدی لکھنؤ دعوت نامہ بھیجکر قطعہ آراضی کی آرزو

لے ماہنامہ الواعظ بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۰ء ۔ سے رقعات مرزا قتیل ص ۲۲

ظاہری اور جو پتھر نصب ہوا وہ نواب سعادت علی خاں اور بہادر شاہ نے نصب کیا تھا اس پر یہ عبارت کندہ تھی ــــــ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ

چوں سکندر شکوہ کرد ما   مقام تعزیہ شاہ امام حسن دلستر

پے کو مان وحشتم بم تاریخ   قلم گرفت رقم زد کہ روضۂ اطہر

انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اہل البیت و یطہرکم تطہیرا کتبہ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی دہلی سنہ ۱۲۷۲ھ ۔ اس تاریخی پتھر کے نقش ہونے کے بعد ایک عظیم الشان مجلس منعقد ہوئی جس میں بہادر شاہ مع اپنے رفقا و علمائے کرام، روئے سا شہزادہ نواب سعادت علی خاں و دیگر ۔ کان سلطنت شریک تھے بعد مجلس شرکائے مجلس کے سامنے کل جائداد وقف کی گئی جس کی آمدنی ۲ ہزار روپے سالانہ تھی اور مرزا محمد عباس شکوہ متولی ہوئے جو سنت جماعت تھے ۔ دردمند مرزا قتیل ان کی طرف سے جائداد کا انتظام کرتے رہے وہ بھی سنیہ تھے وہ ہر جمعرات کو اپنے والدین اور دیگر عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جاتے تھے عباس شکوہ نے اپنے والد سکندر شکوہ کو مرزا کے بیٹے امام باڑے میں دفن کیا تھا اور ان کی ماں بھی اسی جگہ مدفون تھیں اور وصیت سکندر شکوہ دردمند مرزا قتیل بھی دفن کئے گئے ۔ سکندر شکوہ کی قبر پر سرخ رنگ کا بیش قیمت پتھر لگا تھا اور دوسری قبروں پر بھی قیمتی پتھر لگے تھے یہ امام باڑہ جس کا ابھی نشان باقی ہے جو ہری ٹیلی ابراہیم اور محمود علی کی بڑی دے کی عمری کے دوران ممتاز حسین سپرسٹر کے قبضے میں آیا ۔ تحلیت سکریٹری مجلس اصلاح المسلمین صرف تین ہزار روپے کو ۱۹۳۰ء میں میونسپل بورڈ سے خرید کر دوبارہ بنیاد کا دیا ۔

کھجور والی کوٹھی :۔ یہ اس کی مسجد کے قریب تھی اس کا ایک نمبر اور کھجور کا درخت اب تک موجود ہے اس میں خاندان شاہی کے ایک معزز رکن پرنس مرزا ہمایوں قدر بہادر رہتے تھے ان کے بیٹے مرزا مسعود قدر حیدرآباد چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی ۔ عبدالحلیم شرر نے مانگ جانے والوں کے سلسلے میں ہمایوں قدر کا ذکر کیا ہے بڑے خوش مزاج، خوش فکر خوش طبیعت رئیس تھے ان کے گھر میں جو کوڑی کٹری ہوئی کھائی جاتی تھی اور اس ڈلی کے دیکھنے والے موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ ڈلی ایک ہونے کے ساتھ مربع صورت کی ہوتی تھی اور ہر دانہ اس صفت سے خالی نہ تھا ۔

اس زمین پر جو عمارتیں بنی ہیں ان میں ــــــ

مسجد خواص :۔ یہ مسجد امین آباد ناشر کالج کی سائڈ میں ہے جس خواص حسین خواص دو بھائی تھے سنی شیعہ یہ مسجد حسن خواص اور ۱۲۶۲ھ کی تعمیر ہے سقف مسجد سرتا سر عمیر گنبدوں کے ہرتی قبر کا نمونہ ہے مسجد مسلمانوں کی توجہ سے اچھی حالت میں ہے ۔ خواص کا امام باڑہ بھی تھا جو کھد گیا اور اب نہیں ہے ۔

یاگاؤں

لکھنؤ کی زمین جب باشندگان شہر کی کثرت سے تنگی کرنے لگی تو امین آباد کے پچھواڑے یا گاؤں بسایا گیا اور یہاں کے معزز و تجارت پیشہ باشندوں میں ــــــ

نواب اصغر جان :۔ آپ مشکور الدولہ عہد شاہی کے فوٹوگرافر کے بیٹے تھے پرانے طرز کی تصویریں جو قدیم البموں اور میوزیم

[illegible] اکتوبر ۱۹۳۵ء کی درمیانی شب میں فالج سے انتقال کیا (روزنامہ ہمدم لکھنؤ جمعہ ۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء جلد ۱۳ نمبر ۲۳۶ کالم ۳، ایڈیٹر سید جالب دہلوی) قدیم ہنر ص۲۱۳

<u>مرزا جیون بیگ</u> :۔ امین آباد میں آئے گاذی کے مشہور لوگوں میں تھے جن کے کئی بیٹے تجارت میں کافی شہرت اور عزت کے مالک ہوئے ان میں حاجی نواب مرزا صاحب ایک خاص طرز کے نوحہ و ماتم کے موجد تھے جو مرزا قمر صاحب حمید کے نظم کردہ ہوتے تھے اور عزاداری میں ان کی وجہ سے رونق تھی۔ انسانی ہمدردی، سچائی قول و قرار کا پاس ہونا ان کی خاص صفتیں تھیں مقدس زیارت میں کاظمین پہونچکر ان کی رحلت ہوئی لکھنو و کراچی میں ان کی اولاد مغربی تعلیم میں بلند ہو کر باعزت حیثیت میں موجود ہے۔

گھسیاری منڈی

گھوڑوں اور مویشیوں کے لئے گھاس چھیل کر بیچنے والے گھسیارے کہے جاتے ہیں اور یہ محلہ گھاس کی منڈی ہے احمد شاہ نے لکھنؤ پہونچکر پہلے آغا میر کی سرا میں پڑاؤ ڈالا تھا پھر گھسیاری منڈی پہونچے۔ پیر اور جمعرات کے دن ان کے پاس جو مجمع نظر آتا تھا واقعہ نگار ورش نے حال اور قال کے ساتھ ان کے دوسرے کرتب بھی دکھائے ہیں اس محلہ کے مشہور لوگوں میں

<u>نواب آغا علی حسن خاں</u> :۔ اس قدر موٹے اور جسیم و شحیم تھے کہ ان کے قد و قامت کا شہر میں دوسرا شخص نہ تھا ان کے نفاست مزاج اور تنومندی کی وجہ سے خود آب دست کرنا ممکن نہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ ہاتھ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ لونڈیوں کے ذریعے اس طرح طہارت ہوتی تھی کہ کاڑھے کی لنگیاں چادر لئے ہوئے ایک ادھر اور دوسری ادھر رہتی۔ مہتری ڈالے ہوئے سقہ پانی ڈالتے ہوئے ازالہ نجاست کے بعد مشکوں سے پاک کرکے چوکی سے برآمد ہوتے ان کی ڈیوڑھی پر نوکر چاکر، مصاحب، پیش خدمتیں، مغلانیاں، آتو، داروغہ، خواجہ سرا، باورچی، سواری سب کچھ تھا اور پھاٹک میں ایک بڑا تمغہ مثال کے بمبار لٹکتا تھا۔ موصوف کے دسترخوان سے بادشاہ کے لئے روغنی روٹی اور گھی جاتا تھا روغنی روٹی موٹے کاغذ سے زیادہ دبیز نہ ہوتی تھی اور ممکن نہ تھا کہ چپتیاں پڑنے کے داغدار ہو جائے یا کچی رہ جائے ان کے نواسے سید شفیع علی خاں صاحب شیعہ ٹریکٹ آن بال کے رئیس تھے اور لکھنؤ کے باقی ماندہ رؤسا میں ممتاز تھے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا

<u>نانبائی</u> :۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہر سمت انگریز بہت پھیل جانے پر خورد و نوش میں بھی ولایتی مذاق کی چیزیں بازار میں آئیں اور ڈبل روٹی کی دکان گھسیاری منڈی میں صرف ایک تھی۔ انگریزوں سے نفرت رکھنے والی وہ پبلک جس نے توپ کو اکھاڑ دیا تھا کہ کارتوسوں میں سور کی چربی ہے اس کو شبہ ہوا کہ ڈبل روٹی میں شراب ملی ہے اس مرحلہ میں مولویوں سے فتوے حاصل کئے اور ممتاز العلما فخر المدرسین نے یقینی نجاست نہ ہونے کی صورت میں استعمال کا حکم دیا۔

<u>مسجد حمیدہ خانم</u> :۔ یہ مسجد عہد شاہی ۱۲۶۸ھ میں بطاہر یادگار دوازدہ صد سالہ واقعہ کربلا بنائی گئی رو کار پر جو کتبہ ہے وہ پڑھا نہیں جاتا۔ آخری قطعہ تاریخ کی لفظ والسلام ہے مسجد سے متصل امامباڑہ تھا جو مصطفیٰ منزل نام مکان کی صورت میں ہے مسجد کی خصوصیت اوّل یہ ہے کہ حوض ہشت پہل ہے دوم یہ کہ مینار سکڑی ہیں اور ہر رخ سے نئے انداز سے دکھائی دیتی ہے۔

[illegible]

مینارے کا بالائی حصہ گرنے پر سنترہ کے برابر طلائی پیتل کی گری نکلی اور مسجد کے حجروں سے کھدائی میں ہاتھی کی بیش قیمت حلقہ برآمد ہوئی عمارت اولاً کالے نواب کے قبضے میں پھر امیر مرزا نواب کی تولیت میں اور اب ان کے داماد بیٹے صاحب ستمبر جولائی کی نگرانی میں ہے ۔

دوسرا بڑا اماباڑہ :۔ آگے بڑھ کے تھا جو راجہ ٹانپارہ کے قبضے میں اور اس کے روبرو گھاس بکتی ہے اس جگہ کو لال کڑھا کہتے ہیں تانگے والے یہاں رہتے ہیں

خیالی گنج

یہ محلہ بھی نواب آصف الدولہ کا آباد کردہ ہے اور پرانی بستی ہے آخری تاجدار اودھ نے اس مقام کو دو ہزار تین سو روپے میں اپنی بیگم سلطان محل کو دی تھی اور دو صوبہ فرمان شاہی سے اس پر قابض تھیں وارد میر واجد علی منتظم تھے میاں گنج میں زیادہ تر نئے طرز کی کوٹھیاں دوکانات اور منڈیاں ہیں آثار قدیمہ ختم ہو گئے ۔

نظیر آباد

میر نظیر علی ولد دار وعہ میر واجد علی کا آباد کردہ ہے اور یہ محلہ امین آباد کو قیصر باغ سے ملاتا ہے یہاں بعض مسجدیں پرانی ہیں جن کے بارے میں تاریخ خاموش اور ذریعہ تشریح مفقود ہے اس محلہ میں مرزا سلیمان قدر بہادر کا ایک چھوٹا اماباڑہ تھا جس میں نواب سردار علی خاں درانی رہتے تھے اور جہلم کے بعد مجلسیں کرتے تھے اب اس جگہ سینما ہے اور شیشے اور چینی کے برتنوں کا مارکٹ ہے اور نظیر آباد میں جوتے کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں آثار قدیمہ باقی نہیں ہیں ۔

باغ منّو

یہ جگہ کسی زمانے میں باغ منو کے نام سے مشہور رہی گاؤں اور گھسیاری منڈی کے بیچ میں تھی اور گرد و نواح سے مسلمانوں کی قبریں برآمد ہونے کے بعد پہلا نام طاق نسیاں تک پہونچا اور اس مقام کو

روشن علی کا تکیہ :۔ کہا جانے لگا ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ روشن علی وہی ہیں جن کی وزیر گنج میں مسجد ہے یا کوئی اور ۔ اس تکیے کی پختہ قبروں کے پاس ایک چھوٹی مسجد ہے ۔ جو مسجد قدیم کا نقش ثانی ہے اور مسجد لال بیگی ماتمی لوگوں کے زیر انتظام ہے روشن علی کی قبر مسجد اور انگنائی میں ہے مسجد آباد اور اچھی حالت میں ہے

بو اقطبن :۔ اس محلہ میں ایک خاصہ مذکورہ بالا نام کی تھی جس نے تو بہ کر کے زیارتیں کیں اور ارادہ یہ تھا کہ جائداد وقف کر دے عزاداری سے خاص شغف تھا ۔ تعزیہ خانہ میں سونے اور چاندی کے علم تھے ایک دن تفنن طبع میں چنے پھانک رہی تھیں کہ ایک چنا حلق میں پھنس گیا اور فوراً موت واقع ہوئی ۔ تعزیہ داری کا سامان اہل محلہ نے کسی شیعہ عالم کے پاس بھیج دیا مکان پر گورنمنٹ کا قبضہ ہو گیا سونے کی گھنیاں (اشرفیاں) اور زر و مال پر جس کا قابو چلا وہ قابض ہو گیا ۔

شریمتی قطبن اگرچہ عہد شاہی کی نہ تھیں مگر فنی کمالات اس زمانہ میں فقط انھیں میں پائے جاتے تھے اور وہ اسلاف کے ہنر کا مجموعہ تھیں اس لئے ان کا ذکر مناسب معلوم ہوا ۔

گنگنی شوکل کا تالاب

امین آباد کے آگے سمت مشرق واقع ہے تالاب کا نہ کہیں وجود ہے نہ یہ علم ہے کہ تالاب کہاں تھا خاندان شاہی کی دو ڈیوڑھیاں اس وقت یہاں تھیں (۱) پرنس مرزا محمد رضا علی خاں دارا سطوت جو لڑکپن میں یتیم ہو گئے تھے پھر یہ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد جب بھائیوں کی نذریں گزرنے لگیں اور دارا سطوت حاضر ہوئے تو بے تبدل شاہ بھائی کی کرسی پر بٹھا دیا اور صورت دیکھ کر دعائیں دیں۔ دارا سطوت بڑی شان و شوکت کے رئیس تھے ان کی کوٹھی پر بارہ پوربیوں کا گارڈ کا پہرہ رہتا تھا شہر سے دور ہونے میں چوروں کو سرقہ کا اچھا موقع تھا اور کئی مرتبہ چوری ہونے پر یہ پہرہ مقرر کیا میر تقی میر نے اسی کی شکایت کی ہے۔

دس تلنگے ہیں در پہ یک درگاہ　　جاؤں سے تانتی جس کے گھر + پہونچا اس تلک بہت دوبھر

میرے سامنے ایک میموریل ہے جس پر ممدوح کی مہر کے ساتھ یہ الفاظ ہیں

رضا علی بہادر ۱۲۵۵ھ
دارا سطوت مرزا محمد

خلف جنت مکان امجد علی شاہ بادشاہ والد نواب ملکہ کشور صاحبہ

(۱) دارا سطوت کی محلسرا میں ایک مسجد تھی جس میں ان کے کنبے کے لوگ نماز پڑھتے تھے (۲) ڈیوڑھی قدیم نواب ممتاز الدولہ؛ اس عمارت کا پتہ نہ تھا۔ مدت سے لگتا ہے موتی محل کے زمانے میں نواب کلبی متوکل کے مالات بعد تعمیر چلے گئے تھے اور اس قائم ہوئے تب وہاں رہے تالاب پر نواب ممتاز الدولہ کی ایک مسجد بھی موجود ہے اس کا منارہ مسجد سے قریب تھا جس کی بنیاد اب نہیں ہے۔ دارا سطوت جب مکان سے برآمد ہوتے تھے جیب میں مختلف رقوم کی پڑیاں ہوتی تھیں اور مصاحبین و متوسلین کو سلام کرنے پر یا کسی حاجت مند کو جو کچھ ہاتھ میں آتا دے دیتے (دو صد سالہ لکھنؤ ص ۳۲)

بانسی کی مسجد:- یہ مسجد عہد شجاع الدولہ کی تعمیر اور اس کے بانی نواب زادہ میر افضل علی رضوی تھے ان کے عزیزوں کی قبریں اٹاوہ میں ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اٹاوہ سے کوئی تعلق ضرور تھا افضل علی کی قبر مال گودام چارباغ میں ہے جب تک ہے بانی مسجد کے دو بیٹے تھے ایک کا نام نذیر علی خاں تھا جن کو معتمد الدولہ آغا میر کی دامادی کا فخر حاصل تھا اور پانچ سو ساٹھ روپیہ وثیقہ تھا اس مسجد میں ۳۰ ایکڑ زمین شامل تھی جس پر کوٹھیاں اور بنگلے بنے ہوئے نظر آتے ہیں افضل علی بلحاظ تحصیل بانسی کے افسر تھے ان کے کنبے کے کچھ معزز افراد کراچی میں موجود ہیں

احاطہ میر لندنی:- تاریخ سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ایلچی خاں کی موت کے بعد جو لوگ یہیں بستی پر مقرر ہوئے تھے ان میں مرزا ابو طالب خاں لندنی بھی تھے جو اس زمانے کے دشوار گذار سفر لندن سے زندہ واپس ہوئے تھے اور لوگوں کی زبان پر نام کے بجائے میر لندنی کی شہرت باقی رہی۔

تالاب پر نواب شہنشاہ دولہ جن کا اصل نام نواب صادق علی خاں تھا بہت بڑے طاقتور رہتے تھے ان کی تنومندی سے لوگ سفید دیو کہتے تھے ان کی طاقت کے حالات اس سے پہلے گذرے اور بعد کے صفحات میں آئیں گے۔

اس علاقے سے ۱۸۶۰ء میں بنگالی ہندو رگھناتھ بخش نے ایک آٹھ ورق کا ہفتہ وار اخبار "ہندوستانی" نکالا جو ہر جمعرات کو اردو میں شائع ہوتا تھا۔

حسین گنج

بہت بڑا اور آباد محلہ ہے اس کی پہلی تاسیس کا تاریخ میں ذکر نہیں ہے شرح حالات اور آئینہ بی بی کا باغ اسی محلہ کے ... میں تھے ... حسین ... صاحب تو پوری معاصر کے بیان اور دیگر رجحانات سے ثابت ہوتا ہے کہ آغا ابوطالب کا امام باڑہ جو لکھنؤ کا پہلا امام باڑہ تھا آئینہ بی بی کے باغ میں دفتر بہر کے قریب تھا اور یہ عمارت عہد شجاع الدولہ یادر مرحوم کی تھی دوسرا قول یہ ہو کہ یہ عمارت ... میں تھی اور یہ رائے بھی کچھ کم وقیع نہیں ہے آئندہ اپنے محل پر ہم اس کا ثبوت پیش کریں گے۔

انگریزی ... سکندر باغ پر قابض ہوگئے تو باغیوں نے ... کیا اور حسین گنج کے پل کو توڑ دیا اور ریلی گارد اور لشکر عالم باغ کی آمد و رفت رک گئی۔

گنیش گنج

اس محلہ کو نصیر الدین حیدر نے آباد کیا تاریخ بنیاد ... کا پتہ چلتا ہے

بشیرت گنج

اس محلہ پر آزادی کے حامی گروہ نے غدر سے پہلے قبضہ کر لیا تھا اور ۱۹ ستمبر کے حملے میں انگریزوں نے ۲ میل تک دشمن کو دبا کے بشیرت گنج پر قبضہ ... گورے داخل ہوئے تو شرف الدولہ نے اپنے کارندہ امراؤ مرزا کو بھیج دیا اور خیر خواہی ثابت کرتے ہوئے پندرہ ہزار روپے کا غلہ خرید کر بھروا دیا۔ جنرل اوٹرم کے آگے بڑھنے کے وقت رسد کا پہونچنا بہت مشکل تھا کوئی ... بھرتا تھا شرف الدولہ کا یہ حسن انتظام تھا کہ مسلمانوں کو خمیری روٹی اور ہندوؤں کو پوری کچوری مٹھائی تقسیم کی۔ ... ہمارے ... کا بیان ہے کہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کمانڈر انچیف ... جنرل اوٹرم گنگا سے عبور کرکے باغیوں کو پسپا کرتے ہوئے بشیرت گنج میں آ پہونچے تو ... کمک پہونچانے سے سخت لڑائی اور گھمسان کی ... ہوئی اور انگریزوں کے جان و مال کا بہت نقصان ہوا ... حملے میں ... مارا گیا۔

فتح گنج

یہ محلہ بھی نواب آصف الدولہ کا آباد کردہ ہے اور ... آباد سے چار باغ کی راہ میں ہے مسلمانوں کی مسجدیں اور کہیں کہیں ... دوکانات اور ... کی ... ہوئے کی دوکان اور ... کی قدیم آبادی ہے۔ جس میں ... درست

مسجد ... سوتوا۔ ... سامنے ... حکیم کو جاتی ہے اور ... دونوں کی دوکانات ہیں یہ سوتوا کی مسجد کا جز ہیں خانہ ... کی عبادت گاہ ہے دوکانات کے بیچ سے مسجد پر جانے کا زینہ ہے۔ بارہ سیڑھیوں کے بعد صحن مسجد نظر آتا ہے۔ ... خوشنمائی عمارت معلوم ہوتی ہے امام مسجد کے بیان ... کے بعد فیصلہ ہوتا ہے کہ قدیم حدود میں حکیم کی دیوار ... ہے اور مسجد بانی مسجد کی تعمیر اول کے بعد دو بار مرمت کی گئی ... قدیم ہے ... درجے ہیں ایک چوکور چھت کی تحت میں ہے جس میں پیش امام کے سجادہ کو علیحدہ ... کرکے چھ صفیں ... آسانی سے آسکتی ہیں موجودہ تعمیر میں گنبد اور

۱۔ احسن ... سرور ... لکھنؤ یکم محرم ۱۳۵۸ھ ۲۔ گزشتہ لکھنؤ ۳۔ نگارہ عظیم ص ۱۲ ۴۔ احسن التواریخ ص ۲۳۳

جا سے نہیں ہیں قبلہ کی اندرونی دیوار میں پانچ محرابیں ہیں صحن مسجد میں داہنے ہاتھ کی طرف کچھ پرانی عمارت کے آثار ہیں جو
ملحق ہے کہ سودا کے رہنے کا مکان جو اہل محلہ اور عوام کی زبانوں پر ہے "مسجد شہداء" اور یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ کبھی زبان عطلے
لفظ کو "آتش" کہیں اور سودا کو شہدا ۔ اگر یہ زمان کا قصور ہے تو چہ در ۔ یہ بھی شبہ ہے کہ کسی تعصب کی وجہ سے سودا کا نام
چھپا گیا ہو مسجد میں کتابوں کی ایک الماری بریو بورڈ بھی ہے ۔

باب المسجد رحانی و مدرسہ رحانیہ ۱۳۶۶ھ
سابق مسجد مرزا سودا
جنگلی گنج
امین آباد

مسجد کے دروازے جدید اور چوبی ہیں اور اس بورڈ سے واضح ہوتا ہے کہ آخری
تعمیر کو دس برس ہوئے ہیں مدرسے میں ۲۰ لڑکے قرآن شریف کی تعلیم اور حفظ
کے لئے داخل ہیں قاری عبدالغفور قرآن حفظ کراتے ہیں اور محمد حسن مدرس
اور امام جماعت ہیں اور عبدالحمید سلطانپوری چندہ وصول کرتے ہیں مؤذن کا حجرہ پشت پر اور اس کے سامنے آبدار خانہ اور
بچوائے ایک عمارت افسر مرل ۱۳۶۶ھ کی بورڈ سے موجود ہے زیر مسجد کی دو کانیں مسجد کے قبضے میں نہیں ہیں پہلو کی دوکانوں
پر قبضہ ہے مسجد میں بجلی کی روشنی اور پنکھا موجود ہے انتظامات اہل محلہ کے چندے سے ہوتے ہیں مرزا رفیع کا مومن ملاحظہ ہو۔
سودا کی شاعری میں، جو کبھی علم اور دوا اور حکمت را ہوتی تھی ایک طبیب کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

کہہ دیا محموں کو شربت تند　　　　کہہ دیا مستسقی سے فاصد کر

طبی اصول علاج سے پاگل کے لیے فصد کھولکر ناقص اور جوش کھایا ہوا خون خارج کرنا اور جلد مریض تیر ستہ جو مکتب ہے
مقرر ہے ۔ یہ کہ استسقا کے مریض کو فصد کھولکر اور تمرد کرنا اور پاگل کو گدھی کا دودھ پلانا علاج نہیں بلکہ مرض بڑھانا ہے اس نصیحت بھر گفتگو
کے بعد مرثیہ کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

یا روسو تو حالق اکبر کے واسطے　　　　انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گر سی تھی پیمبر کے واسطے　　　　یا ظالموں کے پرستش حجر کے واسطے

۱۱۹۵ھ میں اس تاجدار مملکت سخن نے دنیا کو خیرباد کہا ۔ سودا کی قبر کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ۔ عصر حاضر کے تحقیقات
سے واضح ہوتا ہے کہ سودا نعمت خان عالی کی نسل سے تھے ۔
دیوٹ، بورڈ مسجد کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ مسجد جنگلی گنج میں ہے اور اس تاریخ کی ترتیب کے وقت کوچہ مسجد کو پھول والی گلی کہتے ہیں
اور بعض کاغذات سے واضح ہوتا ہے کہ یہی محلہ

امانی گنج

بھی کہلاتا ہے مرزا امانی نواب آصف الدولہ بہادر کا نام تھا گزشتہ لکھنو میں بھی امانی گنج کا ذکر ہے ۔ عہد سلطان عالم میں اس محلہ
میں ایک رنگریز تھا جو کپڑے کا ایک رخ سرخ اور دوسرا سبز رنگتا تھا ۔

درگا سنگھ کی سرائے

لکھنؤ کا وہ قدیم مسافرخانہ جہاں مسافروں کا ہجوم رہا کرتا تھا اور بیشتر کاروباری تاجر، صاحبان ہنر سب اسی سرائے میں ٹھہرتے تھے
اور ریلوے لائن سے پہلے اسی سرائے کے سامنے سے یکہ اور اونٹ گاڑی دیہاتوں اور چھوٹے شہروں کی طرف روانہ ہوتی تھی اور

ناصر مانی سرار کا بہار اور ڈرگ بجے سنگھ تھا جو بلرامپور کے فرمانروا تھے۔

شیدی فولاد کا اکھاڑا۔ حبشی قوم کے مشہور پہلوان تھے اور ان کا اکھاڑا سرائے ملا ہوا تھا ان کو عہد شاہی میں رسالداری کا عہدہ تفویض ہوا تھا شہر کا بچہ بچہ ان کو جانتا تھا ان کی کشتی میں خلائق کا ہجوم ہوتا تھا دوسرا اکھاڑہ شیدی غلام علی کا تھا وہ بھی نامور پہلوان تھے اور دونوں اکھاڑوں میں تھوڑا فاصلہ تھا یہاں "استاد سکندر" کی قبر ہے جو بہت بڑا طاقتور انسان اور فن میں شہرۂ آفاق تھا اس وقت ہر دو مقامات پر چکوے آباد ہیں۔

چارباغ

تاریخ کی سیر سے واضح ہوتا ہے کہ اس نام کے دو باغ دنیا میں گذرے ہیں ایک اصفہان میں اور دوسرا دہلی میں نواب اعتماد الدولہ نے تعمیر کیا تھا۔ مرزا صائب کا شعر ہے ؎

نسیم آسا اگر در سیر گردم چار باغش را ۔۔۔ بہ ما عیکر میتد دل من آشیاں سازم

لکھنو کا یہ باغ عہد آصفی کی تعمیر ہے ہاشم علی رضوی لکھتے ہیں۔

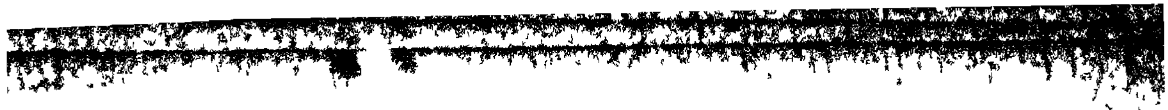
انار کلہ باغات آں کریم نصرات محمد باغ ماہی باغ وزیر باغ چار باغ کہ ہر چہار جانب ان شہر بانا سد گلستان ارم ساختہ[1]
صفی باغوں میں محمد باغ اور ماہی باغ کا تو وجود نہیں ہے چارباغ اور وزیر باغ باقی ہے۔ اس عبارت تاریخ سے واضح ہوتا ہے حدود لکھنؤ آصف الدولہ کے مقرر کردہ ہیں اس سے ان کی سیاست مدن پر روشنی پڑتی ہے اور یک جہتی کا حال کھلتا ہے کہ وہ پی منصرم سلطنت میں لکھنؤ شہر کو آباد کر گئے مرقومہ بالا عبارت کا مفہوم میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ لکھنؤ کی چوحدی میں ہر طرف ایک باغ تھا وزیر باغ عالی حد میں اب بھی موجود ہے ممکن ہے کہ ماہی باغ اور محمد باغ پر بھی کچھ معلومات آئندہ ۔۔۔ اس باغ میں کیا تھا، اس کی تفصیل سے تاریخ قاصر ہے چارباغ کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ شہر کے گرد تین باغ اور تھے اور یہ چوتھا باغ تھا اور یہ بھی معانی ہو سکتے ہیں کہ یہاں مسلسل چار باغ ہوں اگر یہ وجہ درست ہے تو عیش باغ اور چارباغ دونوں کا قرب قریب ہونا تو واضح ہے اس باغ میں

کوٹھی منور الدولہ۔ چارباغ میں وزیر اعظم منور الدولہ کی کئی کوٹھیاں تھیں جس میں وہ اور ان کی اولاد مقیم تھی جب چارباغ اسٹیشن کی انگریزی عملداری میں بنیاد پڑی تو خاندان منور الدولہ کو شیش محل معاوضہ میں دیا گیا اور ان کی کوٹھیاں منہدم کر کے ریلوے لائن کی پٹری بچھی نواب منور الدولہ نے لکھنؤ میں راہروؤں کے لئے بھی کچھ حجرے مسافر خانے کے طور پر بنوائے تھے۔[2] ایسے امراء اودھ کے پبلک خدمات وہ رہے مگر ان کا نام باقی ہے۔

چارباغ اسٹیشن:۔ انگریزوں کے دور اول کا پہلا نقش کانی ستاماراور ہندوستان بھر کی گاڑیوں کی گذرگاہ تھا اور تیسرے درجے کے ٹکٹ آفس کے سامنے اونچی کرسی کی ایک مسجد تھی جس میں کبھی کبھی کسی مسافر کی متابعت میں ہم نے حضرت جاوید لکھنوی کے ساتھ نماز پڑھی اور ۱۹۵۰ء کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال پندرہ شعبان کی صبح کو سید محمد عسکری نقوی ممی پوری نے پختہ کنوئیں میں عریضہ دیا اس مسجد و چاہ عمیق کا بھی اب کہیں پتہ نہیں ہے اور اس حصہ اسٹیشن پر ہے فصل

---

[1] مراۃ البلاد مخطوطات [2] سفرنامہ حاجی حسن علی مرحوم



لگے فروٹ اور جو میوہ یا پھل کسی ما ... میں منڈی فروخت ہوتے تھے ڈیڑھ سو برس تک چوک سے چار باغ کا راستہ ویران سا اور راستے میں کہیں آبادی نہ تھی درختوں پر چمگادڑیں، سڑک پر سور ہیووں میں کہیں کہیں کھیت اس کے سو کچھ نہ تھا یہاں تک کہ موجودہ اسٹیشن ۱۹۲۳ء میں ۰۰ لاکھ روپیہ کے صرفے سے تیار ہوا جو اس وقت ہندوستان میں بہت دلکش سمجھا جاتا ہے ۲۱ دسمبر کو اس کا افتتاح ہوا اور یہ عمارت اس قدر سربلند ہے کہ مسجد تحسین کے کوٹھے سے نظر آتی ہے یہ اسٹیشن شہر کی طرف ہٹ کر بنا اور پرانا مقام چھوڑ دیا گیا ۔ اس اسٹیشن کی عمارت ۲۲۵ فٹ لانبی ہے اور آبادی بڑھتے بڑھتے اسٹیشن سے ملحق ہو گئی ۔ انگریزی حکومت ختم ہونے کے بعد ... راج میں چار باغ اکیلے دس لاکھ روپے کے ... ہزار روپے ماہوار آمدنی ہو گئی اس کے بعد چھوٹا اسٹیشن بن کر رونق اور زیادہ ہو گئی

تالاب فتح علی :- یہ تالاب بہت بڑی تاریخی یادگار ہے جس کا اب نشان بھی نہیں پتہ کے لئے راہگیری رہا ۔ عیش باغ سے ہوتی ہوئی ہیں چار باغ سے گذر کر راہ گھوڑ ... پر ہے ۔ فتح علی وہی شخص ہیں جو کپتان کے لقب سے مشہور تھے اور جن کا کنواں چوک میں اور مقبرہ موہنی کے گرد ہیں ہے یہ مقام کسی زمانے میں تفریح گاہ تھا قدیم تاریخ میں ہے ۔

"مولوی عبدالقادر صاحب ورقہ دار ایشان دا ۔ ایں شہرستہ مدوس چپاں شد مدک رو ... تالاب میاں فتح علی، لتہ و دم وایں جاگر دستہ یعنی بمیلہ ہوماں"

مولوی عبدالقادر خاں اپنے روزنامچے کے تیرہ گھنٹہ پہ میں اور خود سے چکے ہوئے ہیں کہ ایک دن فتح علی کا تالاب ان کو دکھاؤں ہوماں بند کے میلے کا ان کو شوق ہے ۔





ساتواں باب

سجانی ٹولہ سے دلکشا و جہت تک

سجانی ٹولہ:۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس جگہ سجانی کب آباد تھے موجودہ زمین ملا بارک کی تاریخی اور امتداد زمانہ سے قدآدم اصل ثابت ہے اور جو سور ایک ملبہ دوترے پر دکھائی دیتے ہیں وہاں پہلے تھی یہاں اما مباڑہ آصف الدولہ کے اینٹوں کا ذخیرہ تیار ساتھا جس لیے اس کے مزدور مندوں نے کھود کھود کر راکھ استعمال کرنا شروع کی اور مزار شیر خاں فقیر کا کہا جاتا ہے یہاں دق کے مریضوں کو لاکر عقیدت مند چڑھا کرتے ہیں اور مزار کے برکات سے محلہ میں سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے اور آسمانی بلائیں اس محلہ سے دور رہتی ہیں۔

رستوگی ٹولہ

بہت پرانا محلہ اور مہاجنوں کا اڈہ ہے دو پھاٹکوں کے بیچ میں سارے مکانات اگر ایک قلعہ کی طرح محفوظ ہیں اور پرندہ پر نہیں مار سکتا اس محلہ میں

دلنہ وحدہ بخش شاہزادہ فرخندہ بخت فدا علی مرزا حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے فرزند ارجمند تھے اور ان کی صاحبزادی [illegible] پوتی بیگم بادشاہ کی پوتی تھا اب اور بیٹی نے یہی جائداد وقف کردی تھی جس میں ایک شاندار اما مباڑہ تھا جو [illegible] برج کی تحویز سے مگو ہیں داس کے قبضے میں آیا اور مرزا محمد سجاد علی خاں استادہانگ نے اپیل کی مگر سرمایہ نے ساتھ نہ دیا اور جائداد جدید عمارات کی صورت میں آئی۔

بازار راجہ

نواب آصف الدولہ بہادر نے شری تکیت رائے کایستھ سری باستم کو عہدہ دیوانی سپرد کیا تھا راجہ کی لائف بزبان اردو بتی لال جی نے ۱۸۸۵ء میں نولکشور پریس سے طبع کی تھی ما نارا وقتا لاب ان کی یادگار اس وقت موجود ہے اور جہاں تک تاریخ اور مشاہدے سے مدد لی جاتی ہے اس بازار کی آبادی نوابی سے آج تک ایک حالت پر باقی ہے اور کسی با دفنا کا ادھر سے گزر نہیں علاوہ ہر چیز کی دوکانوں کے صبح کو روزانہ پھل اور ترکاریوں کا بازار لگتا ہے اور رستوگیوں یا دوسرے اہل محلہ کو منڈی جانے

کی ضرورت نہیں پڑتی سال بھر کے بعد عشرہ محرم سے پہلے اور کچھ روز چاند رات کے بعد تک یہاں تعزیہ اور ضریحیں بھرے پڑے رہتے ہیں خصوصاً ۹ ذی الحجہ کو ۹ بجے دن سے تعزیوں کے سلسلے میں مسلمانوں کا وہ مجمع ہوتا ہے کہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور سواری گذر نہیں سکتی کھریوں کا بھی یہیں ہونا بھی اس بازار کے ہٹ پرنے خصوصیات میں ہے۔

شکر کے بتاشے جو تبرکات میلاد کے موقع پر یا کسی میلاد شریف میں تقسیم ہوتے ہیں راجہ کی بازار میں صرف ہندو بنانے والا شہر بھر تک پہنچاتا ہے اور یہ خلوص کے ۔۔۔ ۔۔۔ اس کی تاریخ کہتے حضرت ۔۔۔ ہے مرے

درین ۔۔۔ ۔۔۔ بستر ۔۔۔ ۔۔۔ گر گرد ۔۔۔

اس ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ کا اور خاندان شاہی کے ارکان ہیں ——————

(۱) ۔۔۔ صاحب کی ۔۔۔ ڈیوڑھی تھی ۔۔۔ کے بعض حالات اور شخصیت کا تذکرہ ان کے ۔۔۔ کے سینے ۔۔۔ ۔۔۔ کلکتہ ۔۔۔ کے ۔۔۔ ۔۔۔ سلطنت کے صدمے میں آوارہ وطن ہو گئے اور ۔۔۔ میں انہوں نے دوسرا نکاح کر لیا ۔ ۔۔۔ عورت ہو کر بھی ساری جائداد کا انتظام خود کرتی تھیں ۔ رات کو چوکیداروں کا پہرا بٹھاتی تھی حاجی مہر علی ۔۔۔ کے ۔۔۔ کے مختار رہتے ۔۔۔ ڈیوڑھی کے حکم احکام کی تعمیل کرتے ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ کی ۔۔۔ ان کی محلسرا کے سامنے جب کیننگ سٹریٹ نکلی تو ۔۔۔ مکانات CANNING STREET میں کھد گئے ۳۵ سال ہوئے تک ان کی محلسرا موجود تھی یہ وہی محلسرا ہے ۔ جہاں ۔۔۔ صاحب کے مرنے کے بعد ان کے وارث مرزا سلیمان قدر بہادر کے دوست ۔۔۔ گنج تک ۔۔۔ پیسوں میں جواہرات اور مال و دولت بھر بھر کے بھیجا گیا ایک بیش ساماں ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ نے اپنے گھر میں اتروالی ۔۔۔ دیکھ کر حساب ہوئے پریشان ۔۔۔ عالمت ۔۔۔ کا سامان شامل نہیں ہے ۔ وہ جیب بھر گئے اور ۔۔۔ مالا مال ہو گئے۔

(۲) سیاں شہدے کی سبیل ۔ راجہ کے بازار میں وہ جگہ جہاں ۔۔۔ کے ۔۔۔ ٹھنڈا پانی پیتے تھے یہ لکھنؤ کے ایک شہدے کی ۔۔۔ داری کا نتیجہ اور رفاہ عام کا کام تھا سیاں کا اسی گروہ سے شہدوں کے تعلق تھا جو شادی بیاہ غمی میں رئیسوں امیروں کے دروازے پر جا کر منظم ہو کر مبارکباد اور دعائیں دیتے ہیں ۔ ایک دعا کرتا ہے اور سب یک زبان آمین آمین کہتے ہیں اور جب ۔۔۔ اور حسب طلب سے کام نہیں نکلتا تو پھبتیاں کہہ کر ۔۔۔ کے ۔۔۔ ہوتے ہیں ۔ پھر بھاراں کا یہیں مسکن تھا پھر کچھ شہدے حسین آباد میں بس گئے مگر چودھری راجہ کے بازار میں رہا اور جو صاحب پر سبیل رکھی ظریف کہتے ہیں ؎

خوب نقد دل عشاق کو لوٹا تو نے ۔۔۔ شہدپن ہے یہ اسے کہتے ہیں سیاں ہونا

سیاں شہدے کا پوتا حسین بخش نامی سیہ فام محرمی رنگ کے کالے کپڑے پہنے ہوئے نویں محرم کی مجلس اماماڑہ ۔۔۔ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں اپنے علم کا خود اعلان کرتا تھا ——— ۔۔۔ سلامی ۔۔۔ ۔۔۔ کی سلامتی میں ۱۵ ارصغر نواب میر محمد حسین کا مکان نہ بھولے گا جہاں تک ۔۔۔ ۔۔۔ ——— علم ڈیوڑھی آغا میر سے اٹھ کر درگاہ حضرت

عباس جاتا تھا کوئی امیر اور رئیس ایسا نہ ہوتا جو شریک نہ ہو ہر گلی اور ہر چوراہے پر کچھ شہدے موجود رہیں جو شرکت کرنے والوں کو مجمع سے نہ نکلنے دیں اس کی خوشی یہ تھی کہ سارا مجمع سیہ پوش اول سے آخر تک شریک رہے یہاں شہدے کی بھیل کے سا... تاشے اور کھٹیاں بجتی ہیں اور دور دور کے گاہک آتے ہیں ۔

(۳) مٹیا برج میں لکھنؤ کے صاحبان کمال کا ذکر ہو رہا تھا بعض حاضرین نے مجھ سے کہا کہ لکھنؤ کے آخری دور میں یہاں بنوٹ کے جاننے والے حسین بخش رہتے تھے جو اپنے کمال میں جواب نہ رکھتے تھے ۔

راجہ ٹکیت رائے کا مکان :- بازار راجہ کا سب سے بڑا مکان جس کا ⅔ حصہ مدرسۃ الواعظین کی عمارت کی صورت میں موجود ہے پھاٹک بازار راجہ میں اور پچھواڑہ کیننگ اسٹریٹ نمبر ۱۶ سے ملا ہوا ہے، تہ خانہ، دیوان خانہ، امام باڑہ، پرانے نقش و نگار کے دیوار و در نقلی مچھلیاں غلام گردش نوکروں چاکروں کے کمرے لق و دق صحن ۔ زمین میں لکھوری اینٹوں کا فرش پہلے تو بعض گلیوں میں بھی تھا مگر اب صرف اس مکان میں باقی رہ گیا ہے کئی اشخاص کی ملکیت میں رہنے کے بعد مدت سے مدرسۃ الواعظین کے استعمال میں ہے اور زمانہ نوابی کی یہی ایک عمارت باقی ہے منشی کالی پرشاد نے بھی راجہ کی ایک مختصر لائف لکھ کر طبع کی تھی ۔

مسجد ٹکیت رائے :- راجہ کی مسجدوں کا حال اس تاریخ کے اوراق میں بارہا آ چکا ہے بازار راجہ میں بھی ٹکیت رائے کی ایک مسجد اوسط درجے کی موجود ہے جو عمارتی تبدیلیاں ہوئی ہیں رستوگی ٹولہ کے ایک گوشے میں آ کر رہ گئی ہے یہ مسجد ۱۲۰۶ھ کی تعمیر ہے اور بڑے خوشنما حرفوں میں سفید پتھر محراب پر یہ آیت تحریر ہے ۔ ولیطوفوا بالبیت العتیق پ ۱۷ رکوع ۱۱ ۔ یہ مسجد نواب منّن صاحب کے سکونتی مکان میں پڑتی ہے اور اس مکان میں کچھ حجرے اور برج عہد نوابی کے موجود ہیں ۔ آپ لکھنؤ کے خوش خوراک لوگوں میں آخری شخص ہیں ۔ ایک سو بیس طرح کا قورمہ پکانے کی ترکیبیں آپ کے کان میں پڑی ہوئی ہیں اور آٹھ طرح سے گوشت بھونتے ہیں ۔ ہندوستانی کھانے اور ان کی خوش ذائقگی کے راز معلوم ہیں اگر ان کی بتائی ہوئی ترکیبیں انسان لکھنے بیٹھے تو ایک کامیاب رسالہ پخت و پز ہو جائے ۔

نواب چٹی :- بازار راجہ میں نواب شجاع الدولہ کے خاندان کے چند علم دوست اور غریب پرور معزز افراد کے مہمان ایک شخص نواب چٹی تھے ۔ جو بنارس سے آئے تھے اور تہذیب لکھنؤ کے فریفتہ تھے ۔

پریس مکان سیف الدولہ :- بازار میں ایک عظیم الشان پھاٹک رہ گیا ہے جو مکان سیف الدولہ ہے یہاں ایک پریس تھا جس سے بادی لنڈر کی رد میں ارمغان یوسف کتاب طبع ہوئی ۔

اس محلہ میں ایک اور چھاپہ خانہ تھا جس کے مطبوعات عہد شاہی کے خصوصیات کا عکس تھے اور ٹائٹل پر یہ عبارت دیکھی گئی " در بیت السلطنت لکھنؤ محلہ بازار راجہ ٹکیت رائے بمکان راجہ مذکور باہتمام کارپردازان مطبع مولائی طبع شد" اس مطبع کے بعد تصویر عالم پریس ۱۹۱۰ء میں شہرت پذیر ہوا جس کے منیجر سید مجتبیٰ حسین اور مالک داروغہ سید محمد عرف چھدن صاحب گراں کوش تھے مطبع علمی اور ادبی خدمتیں انجام دیتا رہا اور اب الواعظ صفدر پریس سے نشر و اشاعت معلوم ہوتی ہے ۔

ۂ منشی کی مشہور کتاب [illegible]

[illegible] رستوگی ٹولہ اور راجہ ناراین کی موجودہ سڑک پر کئی مساجد ہیں جن کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہے کہ وہ کس کی بنوائی ہوئی اور کس سنہ کی تعمیر ہیں۔ منشی عبدالستار سندیلوی عہدہ صفی کے جو سنوسیوں میں تھے اور ٹکیت رائے کے یہاں نوکر [illegible] کے قریب پہلا پختہ جو بنا وہ ہے مولانا تھا اس دیوان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ سنگ مرمر پر کندہ ہے۔ ٹکیت رائے نے اپنے [illegible] اعلیٰ گر طوائف کا جو مجرا کیا تھا وہ تاریخی واقعہ ہے۔ (مرقعٔ قدیم مصر)

نیکس والی گلی:- اس نام کی دو گلیاں [illegible] تمام پالکیوں کی مرمت اور رنگ سازی [illegible] اور پرانی نیسیں کمی بھی تھیں اور جب نیکس کا عام رواج تھا تو [illegible] نیکس والی گلی [illegible] نیکس والی گلی۔ نیس عموماً لکی [illegible] وہاں اب بھی کم حالت [illegible] دو [illegible] کی نیسی ہوتی ہے اور سہری نیس گورکھپوری ہوتی ہے جو کنڈی میں بھی [illegible] گر [illegible] کا وہ



لوہا جس میں ڈنڈے پھنسے جاتے ہیں [illegible]

عام پالکیوں میں سلاخوں کا [illegible] پالکی کے لئے چھپر موم جامہ تاکہ بارش میں سواریاں بھیگنے سے بچیں پہلو [illegible] کہاروں کے پیسے کا ناریل اور چلم اور پینے کا تماکو [illegible] نیس کی [illegible] کا دھول پر رکھنے کی [illegible] دو گٹھریاں [illegible] ہوتا ہو تو کچھ کہار یا آٹھ کہار [illegible] بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر سواریاں اٹھائے ہوئے اور مسک حرامی [illegible] ایک قطرہ گرے نہ پائے سے

چلو ہوے ہولے دھمک ست [illegible] مسک میری چوری کہار

کہاروں کی اصطلاحیں بھی [illegible] کوئی [illegible] بچانا ہو تو معصوم بائیں کو کتا بیٹھا ہو تو شکاری [illegible] بیٹھے کا بار ساہی ڈھلوانی میں اتفاق ہوا اور دو چار کوس پالکی میں سفر کی [illegible] دیہاتی کہاروں کے اشارات یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک مرتبہ بھری برسات میں کئی کوس [illegible] گیا راستہ میں [illegible] ملا تو کہار کہتے جلیاری بائیں کو کسی مویشی کے پاس سے گزرتے تو کہتے [illegible] رستہ تنگ میں مل جاتا تو کہتے [illegible] بانواں" یعنی السان ناطق دست چپ پر ہے سے

میرے معرکے [illegible] [illegible] کہار

سواری اترنے کے بعد نیس پر گرد پوش ڈال دیا جاتا اور اگر زنانی سواری ہوتی تو پالکی میں دو دو تین عورتیں [illegible] جاتیں نیس پر چھتکا پڑا ہوا اور کبھی صرف ایک [illegible] دو پٹہ پردے کے بیچوں بیچ میں جھانکنے کا ایک گوٹ دار چھید اور جن کو پردے کا زیادہ ذوق ہے وہاں نیس پر بعورتوں کے ساتھ آڑی ترچھی ڈوریاں کسی ہوئی کہاروں کی یہ [illegible] کہ دو عورتیں ڈولی میں بیٹھ جائیں تو صاف کہہ دیں کہ دوہری سواری ہے ایک لڑکی اور ایک عورت ہو تو کہا یلتے

وقت کہیں ڈیوڑھی سواری ہے دوست احباب کے گھروں کا فاصلہ کہاروں کے کرایہ ڈولی سے دریافت ہوتا ہے

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کرلو
یہاں سے ہے کیسے پیسے ڈولی کہار دو

"سواری منگوا دو" عورتوں کی زبان میں ڈولی کو کہا جاتا۔ جان صاحب کہتے ہیں ؎

سارے سیدوں کی محبت کے میں قربان گئی
جاؤں میکے مجھے منگوا دو سواری مرزا

چاہنے والے مرد عموماً ڈولی کے ساتھ عورتوں کی چلتے تھے ؎

ساتھ جاتا پری جان کے وہ سایہ کی طرح
عشق اگر ہوتا تو ڈولی کے برابر چلتا

ڈولی کے لئے لکھنؤ کی نسائی زبان میں مرد عورتیں "کھاری کہتی" ؎

وہ آئے ہیں گھر کو بس یاد رکھیے ہاں
مانگا گئے کہار کہاری تمام رات

مشہور ہے کہ کہار اور سپاہی کو جو کام رہے۔ بندوق رکھ کر چلنے کا عادی ہو ہوا میسر نہیں ہوتی اور کہار کو وردی اسی سرکار سے ملی ہے جہاں وہ نوکر ہوتا

افغانستان میں کھدائی[1] کرنے والی طالبوں نے کابل سے ۹ میل جنوب کی طرف ۴ ہزار سال پرانا ایک شہر دریافت کیا ہے جس میں ایک آہنی ڈولی دستیاب ہوئی ہے خیال ہے کہ اس وقت بھی ڈولی کا رواج تھا۔

یہ نواب صاحب۔ عہد شاہی کا وہ خاندان جس کے ہاتھ میں خزانہ اودھ کی کنجیاں تھیں آپ کا ننہیال ہے آپ شیشے پر نقش نگاری آیات قرآن لکھا دیا طغرے اور ہندسوں کے کتبے بنانے میں ایسے کامل تھے کہ حکام ضلع نے آپ کو سرٹیفکیٹ دیئے اور گورنمنٹ نے معافی میں مواضعات بلئے آخر وقت تک جو کام کرتی رہی انڈے کے چھلکے پر آپ رد دور بھی بناتے تھے اور اپنے فن میں آپ یکتا تھے جون ۱۹۵۹ء میں اس دنیا سے آپ کا کوچ ہوا۔

ڈیوڑھی آغامیر

سلطنت اودھ کے بہت بڑے مدبر نواب معتمد الدولہ سید آغا میر کا نام صفحۂ تاریخ پر باقی رہے گا ان کو شاہ جمجاہ غازی الدین حیدر بہادر کی وزارت کا شرف حاصل تھا اور نہایت ہوشیار معاملہ مدبر تھے مگر واقعہ نگاروں کے خیالات ان کے بارے میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں عدل و داد کی تفصیل کے ساتھ ظلم و استبداد پر توجہ دلانے والے قلم بھی ان کے خلاف لہر اٹھے اور ناظر حالات کو ایک مشکل کا سامنا ہے مخالف آوازوں کو کیونکر نظر انداز کیا جائے۔ وہ یہ تھی کہ جس کا دامن گل امید سے بھر دو تنا خواں اور جس کے مقاصد پورے نہ ہوئے وہ دشمن جان بن گیا۔ کتنے آدمی ان کی عمارتوں کے طویل سلسلے کو بے گھر نہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہنے میں بات آتی ہے کہ یادان محل۔ وڈکی سرار آغا میر سے سوئی کالج تک ان کے مکانات کا سلسلہ تھا نام کی ڈیوڑھی ہونے سے پہلے اس علاقے کو دولت پور کہتے تھے جوبلی اسکول کی بلڈنگ آغا میر کا امامباڑہ تھا پہلا اور آخری جو رفاہ عام کے لئے تھا وہ تو باقی رہ گیا اور ریچ کی املاک تہس نہس ہوگئی۔ آرام گاہ دربار، پائیں باغ، کتب خانہ، باورچی خانہ، ہاتھی خانہ، توشک خانہ، سلاح خانہ، چڑیا خانہ، دواخانہ، مہمان خانہ، دیوان خانہ، اصطبل، محلات کے قطعہ مکانات، عملہ

---

[1] سدرنامہ جنگ کراچی ۸ جنوری ۱۹۶۱ء

...کا عقیدہ تھا کہ اس ہال کا پتہ دینے والا کوئی نہیں جہاں مدرکے لیے سادات بلائے گئے تھے۔ جب پھاٹک توڑنے والوں کی بھیڑ پہ دیکھ کر عقل حیرت ہو گئی کہ راستے میں آگ بھی ہوئی ہے اس امتحان انتظام وقت پر سب پراگندہ ہو گیا ...شخص تو آغا میر کے ساتھ دستر خوان تک ... سے آ دھر گئے اور ایک آدھے راستے سے واپس ہو گئے یہ بات تھی کہ ان کا ...ستار لکھو میں ذعالی مستید ہیں" اس زمانے کی اصل تہذیب ... تو عقل میں نہیں آتا۔ اعلان عام پر تمام سادات پہونچ گئے ہوں کی تہذیب مٹ جانے پر لکھنؤ کے خود دار ایسا نہیں کرتے ... کے معنی یہ ہیں کہ جیسے دعویداران سیادت جمع ہوئے تھے ویسی شکست کھائی۔

آغا میر ایرانی نسل کے سید تھے اور بعض واقعہ نگاروں کا یہ لکھنا کہ آغا میر از قوم کھتری تو صحیح نہیں ہے ان کی وزارت میں سبحان علی خاں کا ہاتھ تھا جب غازی الدین حیدر کی تاج پوشی کا دربار عام ہوا اور تمام امرا پر تکلف لباس پہنے ہوئے وزارت کی آرزو میں تھے آغا میر جو ایک سید ... دیدار ولیعہدی کے وقت میں مصاحب ہو گئے تھے ہاتھ باندھے عقب میں کھڑے تھے ریذیڈنٹ نے پوچھا کہ خلعت وزارت کس کو عطا ہو گا سبحان علی خاں نے کہا آغا میر دست بستہ مستحق کھڑا ہے۔ آغا میر وزیر ہو گئے جب سے آپ وزیر ... مشہور ہو گئے۔ آغا میر کی سیاست ... زندگی کے واقعات کثرت سے ہیں جس کے احاطے کتاب طولانی ہو جائے گی وہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہ جو ... دن دہاڑے محلسرا کے ایک حصے میں ڈاکہ ڈالا ... چھکڑوں پر مال ... بیگموں سے مدد طلب کریں کہ میں معتمد الدولہ کی ساس ہوں یہ ڈھول بجا کر ... کانوں میں پہونچے ... بڑی شان سے مدار حکومت کی اور سلطنت کے آڑے وقتوں میں ... مخالف گروہ نے ۲۰ دسمبر ۱۸۲۷ء کو عہدہ سے معزول کرکے چھوڑا۔ اکتوبر ۱۸۳۰ء تک ... جو ان کے وقار کا دشمن تھا لکھنؤ سے کانپور ... یہ تاریخ کہی ... نواب کا سامان آٹھ سو چھکڑوں اور بے شمار اونٹوں اور ہاتھیوں پر بار کرکے کانپور لایا گیا جس کی قیمت کا[۲۴۳] اندازہ ... کر دیا گیا ہے۔

وزارت کی ابتدا پر یہ واقعہ بھی ... بیان کیا ہے کہ جب فکر معیشت میں لکھنؤ آئے تو مالی کمزوری نے بہت ستایا باپ کی وصیت تھی کہ جس تاریخ وہ مجلس کرتے ہیں ... جو مجلس کا دن جب آیا تو گھر میں کچھ نہ تھا ماں باپ کی رائے سے پتیلا فروخت کرنے چلے راہ میں ایک سید نے سوال کیا ... مدد طلب کی آپ نے بلا تکلف پتیلا اس کے حوالے کر دیا سید نے دعا دی کہ خدا ... کو وزارت کے عہدے تک پہونچا دوسرے ہی دن ولیعہدی کی مصاحبت کا منصب ملا اور رفتہ رفتہ وہ ترقی کرکے وزیر ہوئے ایک مدت تک پبلک ان کو پتیلا والے نواب کہتی رہی۔

یہ بیان اس دور ... کے خلاف ہے جو کافی شہرت رکھتا ہے کہ آغا میر نے خلعت وزارت کے ساتھ اپنے ذاتی جواہرات کی فہرست پر ... حکومت کی دستخط حاصل کی تھی تاکہ اگر کبھی لکھنؤ چھوڑنا پڑے تو ان کی ملکیت مشتبہ نہ ہو۔

قصر وزارت میں جو تاریخی مشاعرے ہوئے ان میں آغا میر عام پبلک کے سامنے نہ بیٹھتے تھے پس پردہ رہتے تھے لیکن بعض

---

۲۴۳ ... ص ۱۶۱

شعراء آپ کو تعریف پر مجبور کر کے مجمع میں لے آتے تھے

یادگار مشاعرہ:۔ شعر و سخن میں معتمد الدولہ کو ناسخ سے تلمذ تھا اور جو مشاعرہ کرتے تھے وہ بڑی دھوم سے ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ ہوا تمام شہر میں مصرعہ طرح تقسیم کیا آتش کو ایک روز پیشتر اطلاع کی۔ آپ نے فرمایا کہ شاید معتمد الدولہ کو میرا امتحان منظور ہے جو طرح میں وقت اطلاع پر بھی خبر لیوں تو ہم مشاعرے میں جاتے یا نہ جاتے۔ اب ضرور جائیں گے۔ غزل کہی۔ تلوار کمر سے لگائی کج دار ٹوپی رکھ سر پر شاگردوں کے ہمراہ عصر سے مشاعرے میں تشریف لے گئے دیکھا تو نواب صاحب نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے اس مشاعرے کی صحبت گرم ہے آپ نے مکان کو دیکھ کر برجستہ یہ شعر کہا ؎

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے   زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

اور جب شمع آئی تو اسی مطلع کو شروع کیا شعر برمحل تھا مشاعرے میں ہلچل پڑ گئی۔ دوست تو دوست دشمن بھی تعریف میں بے چین ہو گئے اور معتمد الدولہ نے خلعت عطا کر کے رخصت کیا معتمد الدولہ کی مدح میں مرزا فصیح مرحوم کے بھی بکثرت اشعار ہیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں۔

لکھنؤ سے ہجرت کے بعد معتمد الدولہ نے کانپور میں شاہانہ زندگی بسر کی ان کے بیٹے نظام الدولہ اور خاندان کی دوسری فردوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں انجام دیں۔ گوالٹولی کا سارا محلہ اور بیرِ شہر کے حدود میں ان کے کنبے کے لوگ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے صدف وار زندگی بسر کرتے رہے اور خاندانی کروفر ایک داستان ہے جو دہرائی نہیں جا سکتی معتمد الدولہ نے ۲ مئی ۱۸۳۲ء کو رحلت کی ناسخ نے تاریخ کہی ؎

دلا نواب صمصم جنگ امروز   گذشت از دار فانی ناگہاں ہائے

نوشتم سال تاریخش دو فانش   دو شنبہ پنجم ذی الحجہ ایوائے   ۱۲۴۷ھ

نظام الدولہ کی علمی یادگار ایک عظیم لائبریری تھی جس کے بخط ولایت نسخے اور قدیم مخطوطات آب زر سے لکھی ہوئی کتابیں زمانے نے تلف کیں جو باقی رہ گئیں وہ مدرسۃ الواعظین کی لائبریری لکھنؤ میں بعض روشن خیال لوگوں نے بھیج دیں اس کتب خانے سے بارہویں صدی کی وہ یادگار کتاب تالیف ہو کر منظر عام پر آئی جس کا نام اس سرکار کے عالم جلیل مفتی میر عباس صاحب نے روح القرآن قرار دیا تھا اور سید العلماء کی بارگاہ سے اس گرانقدر خدمت پر اجازہ عطا ہوا جب سلطان العلماء کے سامنے کتاب پیش ہوئی تو جیسی مبارکباد پیش آگئی۔ اور نام ناپسند کرتے ہوئے مولوی روم کا شعر پڑھا مقصد یہ تھا کہ کتاب رد ناصبیت ہے کوئی یہ نہ کہے ما ز قرآں مغز را برداشتم۔ فرمایا روح القرآن کردند یہ وہ اصلاح تھی جس نے چار چاند لگا دیے۔ اس کتاب میں وہ آیات قرآں یکجا ہیں جو شان آل محمد میں اسلامی طرق سے نازل ہوتے ہیں زبان عربی ہے۔ عبارت مقفیٰ مسجع اور ہر صفحہ میں وہ اسلوب نگارش موجود ہے جس کے مفتی صاحب موجد تھے نظام الدولہ نے اس کتاب کو چھپوایا وہ مفتی صاحب کی یہ قدر کرتے تھے کہ جب کانپور میں سڑک سے سواری گذرتی تھی تو گاڑی پر پہلو میں نہیں بیٹھتے تھے دوسری سیٹ پر کوچوان سے متصل ان کی جگہ تھی اور گڑگڑی لیے ہاتھ سے پیش کرتے تھے۔

بعض قدیم مطبوعات میں میں نے کانپور لکھے ہوئے دیکھا۔

بنگلہ کا پور کی عمارت میں مکان مفتی صاحب کا سہ حت یہ مدت دراز تک باقی رہا جو شاہ نگاہ کی نشانی اور مفتی صاحب کی قیام گاہ کہلاتا تھا نظام الدولہ بھی باپ کی طرح قد آور اور بڑے تن و توش کے مرد تھے مبالغہ آمیز ناقلوں نے کہا ہے کہ وہ دو رکی قبریں پہنتے تھے اور بعد وفات بھی ان میں اتنی طاقت باقی تھی کہ جب قبر میں لاش اتاری گئی تو کسی اعصابی کشش سے وہ اٹھ گئے اور قہر تھے۔ اتارنے والے لوگوں اور غسال نے سنبھالا اور پٹرے دینے میں جلدی کی ان کی نماز جنازہ کے لئے لکھنؤ سے جناب میر آغا صاحب قبلہ مجتہد بلائے گئے تھے۔ اس واقعہ کو ... نے سید محمد عرف ... صاحب مرحوم نے اپنی طفولیت کا چشم دید بیان کیا۔

تذکرۂ تعشق: یہ آپ ڈیوڑھی ... میر ... محمد حسن خاں مرحوم رئیس اعظم لکھنؤ میں رہتے تھے اور سید صاحب تعشق سے مشہور تھے شعر کہا کرتے تھے اور ... گزشتہ ... میں ان کا ... تھا وہ دنیائے شاعری میں محتاج تعارف نہیں ہیں ... کلام ... مضامین ... ان کا نام ... رہے گا اور آئندہ بھی باقی رہے گا۔

... ڈیوڑھی ... میر ... کی ... سے ... اور ستارہ صبح کو اپنی ڈیوڑھی میں اتارا جو ... اب تک ... موجود ہیں ... اس ... کی صحبت دیکھی تعشق کا ... اسی گھر میں رہا اور ... صاحب کے ... کلام کو مجلسوں میں ... حاصل کرتا ہے ایک مرثیے میں آمد ... ان کی فکر ملاحظہ ہو۔

یکہ کر تیغ ... کبھی کیا ساتھ ... ہولی میاں رہیں دامن صحرا تھا
مجلیاں ... دے ... یہ ... ... کیا کہ سر تمام دل اتنا تھا
مہر ... کو تو ... ... در چلی ... دھوپ بھی صحرائے دے پاؤں چلی

مہرہ

اس محلہ کو تاریخی حیثیت حاصل ہے لکھنؤ کی قدیم آبادی میں مشہور ... تھے اور ریزیڈنسی کے کھنڈر سے قریب ان کی آبادی تھی اس وقت عمارت سلطان المدارس کے ... کو مہرہ کہتے ہیں اس علاقے میں کبھی قصر ... اور عہد سعادت علی خاں مرحوم میں حکیم مہدی علی خاں کرسی وزارت پر تھے ان کی املاک سے مہرہ بھرا پڑا تھا موصوف ... نسل سے تھے ان کی مدح و ثنا میں میر قمر کے یہ اشعار قابل ملاحظہ ہیں۔

سحر کو میں گو ... ... و ... میں مشغول با عمدہ یار
کہ آیا ... ایک فرستادہ ... لگا کہنے کہ اے خوش مقال
طلب ہے تیری در حضور ... ... قدسی مآب
... وہ مہدی علی خاں والا نژاد
ہوا اس سے دل ... کیا حق نے اگر یہ مرکز قرار

دیا انتظام امورات شاہ　　ملک اور رعیت کا ہے خیرخواہ
ہوئیں گردنیں جو سرکشوں کی پست　　زہے حکم ناطق زہے بندوبست
ادھر گرگ ہے اور ادھر گوسفند　　اب اک گھاٹ ہوتے ہیں فیض بہرہ مند
جدا آنکھ میں اور مردمک ہاں　　ولیکن ہے ایک سے علی قدرداں
وہ خورشید تاباں یا ماہ مہر　　عجب شاہ ہے اور عجائب دہر

میر ضمیر سے کی ملاقات میں واقعات معراج نظم کرنے کی فرمائش ہوئی اور ضمیر نے ریحان معراج مثنوی نظم کی جو اس موضوع پر پہلی اور آخری مثنوی ہے کہ جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

معتمد الدولہ کی طرح حکیم مہدی پر بھی اہل قلم کی متضاد تعریفیں ملتی ہیں موافق اور مخالف رائیں ان کی سیاست کے نتائج۔ حکیم مہدی نے جب سربفلک عمارت بنوانا شروع کی تو شہر کے پردہ دار مکانوں میں عورتوں کا سامنا ہوتا تھا پبلک نے شکایت کی اور عادل نواب نے وزیر کا کچھ خیال نہ کیا اور دروازے بنا نہ مکانات کی سمت کے بند کرادیئے۔

<u>حکایت:</u>۔ حکیم مہدی انیس کے اور مرزا دبیر کے کلام سے دلچسپی نہ تھی کبھی کبھی ان کے دربار کے مسخرے مرزا صاحب کے پرخلوص پڑھنے کی نقل کرتے تھے اور محفل گرم ہوتی تھی ایک مرتبہ سند میر صاحب ان کے آخری دور میں مرزا صاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ لڑکی کی شادی کے لئے حکیم مہدی سے کچھ دلوا دیجئے۔ مرزا صاحب نے عذر کیا کہ مجھ سے رسم نہیں ہیں میر صاحب ایک نہ سنی۔ مرزا صاحب فینس میں سوار ہوئے اور میر صاحب کو لے کر ٹھیک اس وقت پہونچے جب چند آدمی مزاح مرزا صاحب کی نقل کر رہے تھے۔ اطلاع ہوئی اندر سے جواب آیا کہ مرزا صاحب یہاں نہ آئے ہوں گے تم غلط کہہ رہے ہو۔ خدمتگار نے عرض کیا کہ مرزا صاحب ہی تشریف لائے ہیں۔ خلاف معمول آمد سنکر صحبت میں بے چینی پھیل گئی اور ہر شخص دم بخود ہوگیا مرزا صاحب فینس سے اترے حکیم مہدی نے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ساتھی کو سائلانہ صورت میں دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہی مرزا صاحب کو اپنی سفارش کے لئے مجبور کرکے لائے ہیں حکیم مہدی پر ان کی روحانیت کا وہ اثر ہوا کہ کچھ کہنے سے پہلے عرض کیا کہ میں تعمیل حکم کو حاضر ہوں اور میر صاحب کی اس قدر امداد کی کہ وہ مالامال ہوگئے اس دن سے پھر حکیم مہدی کی صحبت میں مرزا صاحب کی نقل نہیں ہوئی اور ان کے خدمت خلق کے جذبے نے سخت دلوں کو نرم کردیا۔

حکیم مہدی زمانے کے نشیب و فراز سے ۱۲۳۵ھ میں وزارت سے ہٹا دیئے گئے اور شاہجہانپور چلے گئے ناسخ نے آغا میر کی شان میں تاریخ کہی ہے "کاستو برائے پختن شلغم گریختہ"۔ قصر حکیم مہدی کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں ہے۔

<u>مقبرہ حکیم مہدی</u>:۔ یہ قبرستان بہت کافی زمین گھیرے ہوئے اب بھی موجود ہے اور گول دروازہ سے امین آباد جانے والے راستے سمت چپ پر واقع ہے کرسی بلند اور شاندار وسیع عمارت درمیان میں ہے جس کے بیچ کا گنبد تقریباً ۲۰ برس ہوئے بارش میں گر گیا چھوٹے گنبد باقی ہیں۔ چہار دیواری بھی کہیں کہیں سے گر گئی ہے امرائے شیش محل اور اس کے خاندان کی یہاں قبریں ہیں نواب سید یوسف حسین خاں طباطبائی عہد امجدی کے ایک کنکوا بنانے والے بھی اس عمارت میں دفن ہیں۔

سے قدیم ہنر صفحہ ۲۱۲

امام باڑہ عتیق اللہ۔ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ امام باڑہ عتیق اللہ شہر میں کہیں تھا مگر کوئی بتلانے والا نہیں کہ کہاں تھا اور عتیق اللہ کون تھے یہاں مرزا علی کی مشہور دوکان تھی ایسے لذیذ اور خوشبودار کباب بناتا تھا کہ شاہی باورچی خانہ میں بھی اس کی نظیر نہ تھی پانچ سیر بکری کے گوشت کا قیمہ ان عطریات سے درست کرکے شام کو ٹھیکے کے کباب بیچنا شروع کرتا تھا وزن ہر کباب کا ۵ تولہ اور قیمت ایک پیسہ تھی زعفران اور خالص گھی ڈالتا تھا مرزا علی دوکان پر خریداروں میں نمبر تھا جو پہلے آیا۔ اس کو پہلے کباب ملتے تھے۔

امام باڑہ بوٹا صاحب:۔ اس امام باڑہ کا پتہ ۱۸۵۸ء تک تھا یہاں نصیر الدین حیدر بہادر کی بیگم کنگلے محل کی لاش سونپی گئی تھی جو ایک عرصے کے بعد عراق[1] روانہ کی گئی۔

مطبع علوی۔ عہد شاہی میں اس نام کے کئی پریس تھے اور شہر ڈیوڑھی ... مرحوم میں ایک چھاپہ خانہ تھا۔ جس کے مہتمم حسین علی تھے اس پریس نے اس شان و شوکت کی لکھائی چھپائی ہوئی تھی جو عہد[2] قدیم کا طرۂ امتیاز تھا ربیع الاول ۱۲۸۰ھ تک یہ پریس علمی اور مذہبی اور تاریخی کتابیں زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ چھاپتا تھا۔

کوٹھی میر جعفر۔ شہر میں ایک ایرانی شخص نے فروغ حاصل کیے کوٹھی ... تھی جو شوستر کے رہنے والے تھے ایران میں شوستر کا ریشمی کپڑا اور اطلس بہت مشہور ہے ممکن ہے کہ یہ شخص ریشمی کپڑے بیچتے ہوں ۱۲۶۰ھ تک ان کی کوٹھی موجود ہے اور مطبع علوی اسی کوٹھی میں تھا

امام باڑہ مرزا ابو طالب خاں۔ عہد قدیم صدر منگلے کے مشہور آدمی ... سب سے پہلے لکھنؤ میں امام باڑہ بنوایا ان کا ذکر فوقانی ہو رہا ہے۔ ہمارا یہ ... کے دل میں عہد نامہ[3] میں موجود ہے اس کے ... کا نام حاجی محمد بیگ تھا اس امام باڑہ کے بارے میں مدیر ... جوہری کی رائے ہے کہ محلہ گستہ حال ... کی ... میں ہے دفتر شہر سے متصل مگر میرے سامنے اس سے بہتر اور معتمد دیا ہے ... سے پہلے کے اہل قلم کو جو علماء ... میں ملا محمد علی راست گو کے تذکرہ میں کہتے ہیں۔

"شش پسر داشت کہ ایشاں ہم بزیور علم و حلم آراستہ بودند محمد علی و ملا تقی ... و ملا جواد ... در لکھنؤ در حسینیہ مرزا ابو طالب خاں قریب غسلخانہ حکیم مہدی علی خاں واقع۔ ملا اکبر علی کہ درس ... ملا محمد رضا و نصیر علی در فیض آباد در عنفوان ... وفات یافتہ احمد علی در مرز ... ملا محسن کہ در حسینیہ آقا ابو طالب[4] خاں مدفون شد" اس نوٹ میں امام باڑہ آقا ابو طالب خاں میں ملا جواد اور ملا محسن کے دفن ہونے کا ذکر ہے اور امام باڑہ کو حکیم مہدی کے غسلخانے سے قریب بتایا ہے آئینہ ... کے ... میں حکیم مہدی کی کوئی جائداد ثابت نہیں۔ غسلخانے کو مقبرہ حکیم مہدی کا جز ہونا چاہیے غسلخانہ اصطلاح اہل لکھنؤ میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مردے نہلائے جاتے ہیں جو امام باڑہ ابو طالب خاں ہو۔ جو حکیم مہدی کے مقبرے کے گرد و نواح میں اس لئے ہمارا بیان کو دفتر شہر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۹۵ھ تک اس امام باڑہ کے آثار باقی تھے۔

حکومت اودھ میں جب گردو پیش کی سیاست میں ابو طالب خاں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا تو کلکتہ گئے اور ۱۲۱۰ھ میں

---

[1] بیگمات اودھ [2] واجد علی شاہ کے موضوع پر مشتمل ... پریس میں چھپ ہے [3] مطبع نولکشور ص ۱۵ [4] سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۵ھ ص ...
[5] ... جعفری ...

یورپ اور افریقہ کا سفر کیا اور فارسی زبان میں سفرنامہ ترتیب دیا جس کا نام رکھا "سیر طالبی در بلاد افرنجی" اس قلمی خدمت کا اردو ترجمہ مرزا علی رضا مخزون ابن مرزا محمد تقی ابن مرزا عبدالہادی بن عبدالقادر نے کیا اور سفرنامہ[1] دو جلدوں میں ۱۹۰۴ء میں برقی پریس مرادآباد سے طبع ہوا۔

اس وقت شہرہ آفاق ہے ایک ٹوٹی ہوئی مسجد جناب سردار صاحب کی اور ان کا امام باڑہ شکستہ حالت میں موجود ہے اور آگے بڑھ کر روزنامہ حقیقت کا دفتر ہے اور اس کے بعد سیوٹ انجینیرنگ اسکول کی عمارت اور مقابل میں چھوٹی لائن کی سڑک بلندی پر سے بظاہر مرقومہ بالا عمارات شاہی انجینیرنگ اسکول سے ریل کی پٹڑی اور جامعہ سلطانیہ کی زمین پر تھیں لکھنؤ کی قدیم آبادی میں شامل شہر میں تھے جن کی زمین[2] ریزیڈنسی کے کھنڈر تک تھی۔

پیاز و طوائف ۔ ۔ ایک خوبصورت عورت تھی اور نواب منتظم الدولہ حکیم مرزا مہدی علی خاں کی آشنا تھی اس لئے بہت کچھ روپیہ جمع کر رکھا تھا حکیم صاحب نے اس سے نکاح کر لیا تھا اور جب تک پیاز زندہ رہی خوش و خرم زندگی بسر کی حکیم صاحب کی ترقی کی بنیاد پیاز ہی سے پڑی جس نے دس ہزار[3] روپے کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے حکیم صاحب کو ایک صوبہ کی نظامت کا عہدہ دلوا دیا پیاز بعد سعادت علی خاں کی عورت بھی حکیم صاحب کی صحبت میں حج کا ارادہ ہوا اور مکہ کی راہ میں سہاگن مر گئیں۔

شہرہ میں میرے ہمعصر شفاء[4] الملک حکیم سید فضل علی عرف میرن صاحب اور شیخ یوسف حسین خاں صاحب بیرسٹر کے آبائی مکانات بھی تھے۔

کھٹیری ٹولہ

تانبے کے ورق بنانے والے کو کھٹیرا کہتے ہیں پرانے زمانے میں یہاں ورق بنتے تھے سرکاری کاغذات کے علاوہ اس محلہ کو کھٹیری ٹولہ کہنے والا اب کوئی نہیں ہے اس وقت محلہ کو باورچی ٹولہ کہتے ہیں اور عہد شاہی سے اس وقت یہاں کھانا پکانے والے باورچی رہتے ہیں اور گھر میں کھانا پکنے اور باورچی کے ہاتھ کی چیزوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے درزی کے ہاتھ کی سلائی گھریلو سینے پرونے سے بہتر اور صفائی کے ساتھ بطرز فرود ہوتی ہے۔ باورچی کی اس وقت بہت بڑی قدر تھی اور اچھا کھانا پکانے والا بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی نہ ملتا تھا۔ اس وقت کا لٹریچر[5] دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نوابی میں باورچی کے لئے جو صفتیں ضروری تھیں اس وقت کا عصر حاضر میں تصور بھی نہیں کیا جاتا طرح طرح کے انگریزی اور ہندوستانی کھانے پکانا تو اس کو جاننا ہی چاہئے مگر خوبصورتی، کمسنی، خوش پوشاک ہونا بھی شرط تھا اور یہ سب اوصاف مشکل سے ملتے تھے۔ مسکین نوجوان کو یہ عہدہ بڑی خوشی سے دیا جاتا تھا اور راز اس کا یہ تھا کہ دسترخوان پر اس کا ہونا لازم تھا تاکہ کھانے کی بدمزگی کا جواب دہ اور عمدگی کی داد دینے میں نفاست پسند ہیتے کو بدصورتی یا میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھ کر نفرت نہ ہو۔ ڈیڑھ سو برس کے کچھ خطوط میرے سامنے ہیں ان کے ترجمے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کھانا پکانے والا کیسا ہو (۱) کیا تم چاہتے ہو کہ میں[6] سوکھے ٹکڑے کھاؤں تم سے مجھے پوری توقع ہے کہ خوبصورت کھانا پکانے والا دس روپے مہینہ پر راضی کر کے بھیجو اور ایک حقہ بردار بھی آئے جو فقط چلم پر آگ رکھ دیا کرے گا۔ صورت

---

[1] دیکھو علم و عمل جلد دوم و وقائع عبدالقادر خانی ترجمہ معین الدین افضل گڑھی طبع اکیڈمی پریس کراچی [2] گزشتہ لکھنؤ ص۱۸ [3] تعلیم نمبر ص۔
[4] سوانح مختصر شفاء الملک حکیم میرن صاحب نظامی پریس ۱۹۳۸ء [5] رقعات مرزا قتیل [6] ص۔

آپ کا باورچی جوان ہو، انگریزی اور ہندوستانی کھانے پکانا جانتا ہو (۲) اچھا باورچی لکھنؤ میں دس روپے ماہوار پر نہیں ملتا - جو کہ انگریزی اور ہندوستانی کھانے پکانے والا ہو، اس قیمت واضح ہوتا ہے کہ عہد آصف الدولہ میں دسترخوان شاہی پر مغربی کھانوں کی پہونچ چکی تھی (۳) تنخواہ بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں دی جا سکتی بشرطیکہ خوبصورت ہو (۴) میں آپ کے انگریزی اور ہندوستانی کھانے اچھے پکائے گا (۵) پیر بخش کو بھیجئے انہوں نے پچیس برس سے زیادہ عمر کا نہیں ہے در صورت کی اچھی ہے (۶) محمد جمال باورچی مرحوم کہتے ہیں کہ میں نواب صاحب کی سرکار میں فقط مربیٰ پکاتا تھا اس کے سوا کوئی کھانا نہ پکاؤں گا دوسرے باورچی بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم جس قسم کا پکاتے ہیں (۷) ... ڈیڑھ ... زیادہ تعداد میں نہ پکائیں گے (۸) رقعہ نمبر ۲ کی اصل عبارت ... انگریزی ... ہندوستانی ... برائے صاحب خوابدار سید قدرت "انتظار سایہ کشید ... ہندوستانی ..."

باورچی ... ہندوستانی ... عہد ... صاحب انگریز ... دن چڑھے پر حاضر کروں گا ... ہیں۔

میر مہر علی انیس میر ... کے بھائی اور ... مرثیہ ... سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۵ محرم سنہ ۱۲۹۱ھ میں ... اگلے ... قلمی مراثی بھی نظر آتے ہیں ایک مرثیہ کا مطلع ہے ... یادگار ہے

عاشق ... رہ گیا ... سلسلے ... رہ گیا

اس مرثیہ ... مشہور بیت ہے ... راضی رہیں نہیں

میر وحید :- ... باکمال شاعر تھے ... ۱۲۶۲ھ ولادت کا سال ہے اور ۲۳ محرم سنہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۶ء سال وفات ہے عمر ۵۰ سال

مزار شاہ عبد الرحمٰن

آپ لکھنؤ کے نامی فقرا میں تھے پرانی کتابوں اور صوفیائے کرام کے حالات میں آپ کا نام بار بار نظر آتا ہے کہا جاتا ہے[1] کہ آپ سندھ کے رہنے والے تھے آپ کی چھپی ہوئی کتابوں میں آپ کے نام ... اور ... کی لکھی ہیں عہد سعادت علی خاں میں آپ کا وطنی ... لکھنؤ پہونچے پر آپ سے مزار شاہ مینا ... قیام کیا جیسا کہ آئندہ اسی محل پر تفصیل آئے گی - آخر میں مادری ... لکھنؤ کی شیعہ ... ان کو ... اور سب اہلسنت بھی ان کے دوست تھے - ایک عالم مذہب امامیہ کی تحریر ملاحظہ ہو -

حکایت می کند کہ عبد الرحمٰن صوفی در لکھنؤ مسجدے نشستہ ... دراں ... آمد و چراغ را خاموش کرد صوفی مذکور خدا ناشناس گفت کہ ... خود ... چراغ کرد[2]

"آپ مسجد میں بیٹھے کہ ... چراغ بجھا گیا تو فرمایا کہ ... گھر کا چراغ آپ بجھا دیا" اللہ جانے کس مصلحت سے ایسا کہا اور

---

[1] واقعات مرزا ... شاہی [2] ... الاخیار [3] ذکر ...

کس جذبہ میں یہ حضرات زمان تک آئے اس کو تو وہی جانے جس کی ماحول پر نظر ہو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ عزاداری کے بانی اور مجلسوں کے دلدادہ تھے اور یہ جذبات محبت ان کی کتاب سے ظاہر ہیں مزار کی عمارت ایک لمبی چوڑی زمین کو گھیرے ہوئے ہے جس میں بلند دیواریں اونچا پھاٹک خوبصورت عمارت مزار اور بہت پرانی مسجد پہلو میں ہے قبر پر گنبد اس قدر خوشنما تعمیر ہوا ہے کہ حضرت محمد جد علی شاہ جب زیارت کو آئے تو معمار کی صنعت پر تعریف فرمائی۔ گنبد کے نیچے شاہ صاحب اور ان کے چیلے فتح علی شاہ کی دو قبریں ہیں حالی کے چاند پہلی سے لے کر چھٹی تک عرس ہوتا ہے ورتاریخ وصال ۶ ذیقعدہ ۱۲۲۵ھ ہے پہلوئے مزار میں کچھ پرانی قبریں اور بھی ہیں جن میں ایک سنگ مرمر کی جالی جو لوح مزار کی جگہ کسی قبر پر رکھی ہے دو زنصب ہے دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مسجد ۔ لکھنؤ کی تمام مسجدوں کے کتبے سامنے رکھنے پر ماننا پڑتا ہے کہ یہ مسجد بہت پرانی اور عہد ماضی کی یادگار ہے شاہ صاحب نے اسی مسجد کا سہارا لے کر یہاں ڈیرہ ڈالا مسجد کی موجودہ جو حالت ہے اس میں گنبد اور منارہ نہیں ہے بانی عمارت "کوکب" نام کوئی امیر زادہ گذرا ہے جیسا کہ اس قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے جو سنگ مرمر پر اب تک لکھا ہوا محراب کے اوپر جو نصب ہے۔

چو گردید کوکب از صدق دل　　　ایں خانہ گردش فردوس واعست

تاریخ او ز عالم علوی بدل رسید　　　ایں مسجد معمور از در کوکب است　　۱۱۸۰ھ

سو برس کے بعد مسجد گری اور دوسری تعمیر فرید علی خاں کے ہاتھ سے ہوئی۔ دوسرے پتھر میں سال اول کا ذکر ہے اور مندرجہ اشعار میں کہیں کہیں لفظیں پڑھی نہیں جا سکیں پھر کچھ نظر آنے والے الفاظ کی نقل ملاحظہ ہو ۔

ایں خانہ حق کہ داشت بنیاد قدیم　　　گشتہ　　تعمیرش شکست است

از سال سلئے آں دلم تو دست فکر　　　فرمود سر دکش بیت معمور است　　۱۲۹ھ

برآمدہ بہت بوسیدہ ہو چکا تھا اور گرنے کا ڈر تھا کہ شہر کے دل چالاک رئیس اور تاجر فقیر محمد نے مرمت کرائی جو اس شعر سے واضح ہے ۔

لکھی اس کی تاریخ یہ میر نے　　　مرمت نہیں اصل تجدید دیکھ　　۱۳۷۶ھ

احاطہ تلسی رام ۔ یہ احاطہ پادری ٹولہ میں افتادہ زمین کی صورت میں اب بھی ہے اس کو حکیم سید مہدی نے کشمیری حضرات کی قبروں کے لیے وقف کیا تھا اور کثرت سے صاحبان کمال یہاں سپرد خاک ہیں میر محمد شاہ صاحب بڑے ذاکر لکھنؤ کے جن کی زبان دری اور شیریں بیانی کے اب تک ڈنکے بج رہے ہیں ۱۳۰۵ھ میں دفن ہوئے پھر سید حسن علی شاہ اور حاجی مرزا جعفر علی کربلائی ۱۳۰۵ء میں مدفون ہوئے یہ مقبرہ بولہ گنج کے مشاہیر ہیں ۔

فیلخانہ ۔ محلہ پادری ٹولہ میں ایک حصہ آبادی فیلخانہ کے نام سے مشہور ہے اور ایک عالیشان بلند مسجد ہے جس پر شمس آبادی امراء کی تعمیر مسجد کے جانب غرب ایک بڑا کنواں ہے یہی فیلخانہ کا حرم تھا اور شاہی ہاتھی یہاں رکھے جاتے تھے کنوئیں میں زیادہ سے زیادہ پانی تھا جس سے ہاتھی پیاس بجھاتے تھے ہاتھی پر تین آدمی مقرر ہوتے تھے فیلبان گردن پر اس کے بعد جمادت اور پیچھے ... ہوتا جس سے آب و دانہ کا تعلق تھا عہد غازی الدین حیدر میں ہاتھی کا ہودہ اس صورت کا تھا کہ شکاری جس طرف رخ کرے

۔ ... رحمن مطبوعہ لکھنؤ ۔ شاہ صاحب کی کتاب ارشاد الرحمن اردو ترجمہ ہو کر چھپی ہے اس میں خاص تحقیق یہ ہے کہ یزید نے قتل امام پر دس عالموں کے فتوے حاصل کئے تھے ۔

...مت گھر جلنے۔ زنجیر کھنچی

کئی نیلی وہ فیل خانے میں ہیں   کرے مثل وہ سارے سلسلے میں ہیں

باندی خانہ: یہ بادشاہی گھر سے ملا ہوا جو آبادی ہے یہاں بادشاہ دوم اودھ نصیر الدین حیدر بہادر کی بیگم ممتاز الدہر کی بارہ دری تھی اس کو لنگری سادات کی کثرت سے باندی خانہ کہا جاتا تھا۔ بادشاہ جب بیگم بڑی کمسن اور جدید تھیں۔ شاہ نے ان کی خدمت گذاری سے "کنگلے محل" کا خطاب دیا تھا ان کے بیٹے کا نام مرزا مراد علی تھا بیگم نے غدر کے بیس برس کے بعد اسی مکان میں دنیا سے سفر کیا۔

مسجد ممتاز محل: یہ محلہ میں گویا متبرک یادگار ہے کی جو مسجد ہے وہ باندی خانہ کی مسجد کہی جاتی ہے اس کو ممتاز محل ثانی ملکہ زمانی شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ اول اودھ نے اپنے پیسے سے بنوایا تھا ممتاز محل کی علمی لیاقت اچھی تھی اور دینیات سے باخبر ہونا ذاتی خصوصیت تھی ان کے استاد خواجہ تحسین علی خاں جو دیکھے جس کی مسجد کا حال اسی سلسلہ میں آرہا ہے مسجد کے سامنے پھاٹک اور دو کانات کا حصہ منہدم ہوکر دوبارا سامنے مدتوں صحن مسجد کے بعد ملا رہا مسجد میں قطعہ تعمیر بھی ہے جو زیادہ تر مٹا ہوا ہے۔

عاشق نامہ ممتاز محل   صاحب عفت

زوج او شاہ غازی الدین حیدر   خور خورشید

کرد تعمیر جوار حرمت   اندر خاک

محلسرائے سراج الدولہ: یہ عالیشان قصر بھی اسی محلہ کے آثار قدیمہ میں تھا شیخ تصدق حسین کا بیان ہے کہ اس کے آثار ابھی باقی ہیں واقعات غدر میں اسی محلسرا کا اس طرح ذکر آیا ہے کہ ان ہی ایام میں بیدر شاہ خاندان تیموریہ سے لکھنؤ میں آیا جس کا مختصر حال یہ ہے کہ بیدر شاہ بس از حصول رہائی ... ان ہی ایام بغاوت میں اپنے وطن یعنی دہلی کو واپس آیا تھا کسی گروہ باغی نے اس کو اپنا بادشاہ قرار دیا چونکہ فوج انگریزی تدارک باغیاں اطراف دہلی میں معروف تھی اس پر بھی حملہ آور ہوئی تب بیدر شاہ بمقام فرخ آباد کہا گیا وہاں کی فوج نے پھر تعظیم کرکے اس کو بادشاہ بنایا فوج انگریزی نے اس فوج کو بھی مار بھگایا بیدر شاہ لکھنؤ میں جان بچا کے آپہونچا۔ اہالیان دربار برجیس قدر نے بیدر شاہ کو بعد ادب و تعظیم کے مکان سراج الدولہ بہادر میں ٹھہرایا اور واسطے آسائش و آرام کے جگہ دی۔

کنگلے محل کا امام باڑہ: یہ امام باڑہ حکمت رائے رد ڈپرب اور شیخ تصدق حسین کی رائے ہے کہ ہیوٹ انجینیرنگ اسکول اسی عمارت میں ہے۔

ڈیوڑھی نواب مہدی علی خاں: یہ بادر جی ٹولہ کی پشت پر واقع ہے اس کا نام نامی معتمد الدولہ معظم الملک نواب مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر یار جنگ تھا۔ لکھنؤ کے امیر کبیر تھے شمس العلما سید محمد ابراہیم صاحب مجتہد سے دلی عقیدت تھی عید کے دن ہاتھی پر سوار ہوکے قبلہ کی فیلس پر سے روپیہ لٹاتے ہوئے عید گاہ تک جاتے تھے یہ محلسرا ایک بلندی پر تعمیر ہوئی ہے وسیع صحن اور احاطے میں زمین کے ٹکڑے ہوکر کرسیاں اور بہو دسے بکنے لگے۔ پھاٹک سے پہلے ایک مسجد خانہ بھی بہت خوشنما

ملہ بیگمات اودھ

اسی وقت کی تعمیر کردہ موجود ہے۔ اس عمارت میں سہ نثار اور بلند دروازہ بڑے بڑے ہال وسیع کمرے ہیں پیچھے گولہ دراتہ
ہے امین آباد جانے والی سڑک اور محاذ میں جھولے لال کی پٹری اور ریل کا جوڑا پل ہے جس پر ڈالی گنج اسٹیشن کا
راستہ ہے۔

نواب صاحب کے بعد اس ڈیوڑھی کے مالک ان کے فرزند ملک جاہ تھے جو اعلیٰ درجے کے مصور اور بلند پایہ
خوشنویس تھے ان کے دسترخوان کا کھانا ہمیشہ کو کٹریکٹ کھائے چھوئیں کی لو ہو۔

چھوٹے تحسین کی مسجد

ماورجی ٹولہ کی یہ مسجد بڑی آثار مسجد ہے اس کو تحسین علی خاں خوجہ نے بنوایا بڑے تحسین عہد شجاع الدولہ بہادر
کے خواجہ سرا اور چھوٹے عہد نصیر الدین حیدر میں محل خانہ میں داخل ہوئے۔ آپ اعلیٰ نسل حضرت پور اور ببدہ سرار
کے رہنے والے تھے باپ کا نام دلیل خاں تھا۔ ان کو شمس العلما سید محمد ابراہیم مجتہد مرحوم نے اپنے وصیت نامے میں
میاں محمد تحسین علی خاں مرحوم "کے نام سے یاد کیا ہے باپ ان کے سپاہیوں میں نوکر تھے ایک مرتبہ ان کو قزاقوں نے راستے
میں دوست کر قتل کردیا اور تحسین علی بردہ فروش کے ہاتھ پڑے۔ اس ظالم نے طمع زر میں ان کو خواجہ سرا بنایا اور ۱۲۴۳ھ
نصیر الدین حیدر کی ولیعہدی میں محل شاہی میں پہونچے پانچ برس کا بچہ دیکھ کر ولیعہد بہادر نے بڑے ناز و نعم سے پالا نواب
شمس الدولہ پرورش کے نگراں تھے موصوف نے خود قرآن مجید پڑھایا بعد حمد پڑھائی اردو چلنے پر وہ نوحہ مرثیہ پڑھنے لگے۔
نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ان کی ایمانداری اور نیکی دیکھ کر کے عہدے عطا فرمائے پہلے باورچی خانہ، پوشاک
خانہ سپرد ہوا پھر بیگمہ سدھور کے چکلہ دار ہوئے اس عہدے پر پہونچکر تحسین کو فارسی میں کمال پیدا کرنے کا ذوق ہوا گلستاں
بوستاں پڑھنے پائے تھے کہ ان کے ہمعصر درشن سنگھ نے بادشاہ کے بڑھتے ہوئے کرم کو غصہ کی گھٹاؤں سے تبدیل کردیا۔ اور
۱۲۵۰ھ میں میاں تحسین قید کرلئے گئے جیل پہونچ کر آپ نے فارسی میں کمال حاصل کیا اور دستور الصبیان، انشاء خلیفہ مادھورام
جلد دفتر ابوالفضل انشاء مرزا طاہر وحید تابع نعمت خاں عالی سہ نثر ظہوری، پنج رقعہ مینا بازار توقیعات کسریٰ رقعات مرزا قتیل،
قصائد عرفی رسائل عروض قید میں رہ کر پڑھے یا تو جیل میں کوئی ان کا پڑھا ہوا بیرون تھا یا کوئی قیدی فارغ التحصیل ہو جس نے ان کو پڑھایا
چھ برس کی قید میں شرح جامی تک پڑھکر باہر آئے تو دیکھا کہ جو جائداد کارندوں پر چھوڑ دی تھی وہ خرد برد کردی گئی۔
مرزا ابوتراب کے قبضے میں محل سرا آئی اور اسی ہزار کے مکان پر مرزا صاحب کا قبضہ ہوگیا۔ جب بادشاہ نے انتقال فرمایا اور
محمد علی شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے تو منور الدولہ کی سفارش سے ۷ ہزار روپے پیشکش کرکے قید سے چھوٹے علم فقہ پڑھنا شروع
کیا سید العلما سید حسین مجتہد العصر اور شیخ تفضل حسین دوسرے عالم جلیل کے درس میں شرکت کی اور فضیلت کے درجے پر پہونچے
امجد علی شاہ کا زمانہ آیا اور ایک چھوٹا قرآن شریف خوشخط اور بہترین لکھا ہوا نذر کرکے منصور پلٹن کی سرداری حاصل
کی اور گاد خانہ کے منتظم قرار دیے۔ نیکی اور پاک طینتی سے محلات شاہی میں ملائے جاتے تھے اور بیگمات اور وہ مسئلہ مسائل پوچھکر
ایک عالم کی حیثیت سے ان کی عزت کرتی تھیں۔

امجد علی شاہ بہادر نے کھیٹری ٹولہ میں کچھ جائداد جو کسی مصلحت سے اپنے غلام قربان علی کے نام کردی۔ قربان علی کو

[illegible] کر مسلمانوں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ اس جائداد پر سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں قیصر باغ کی
[illegible] اور جعفری تو ۔ یہ جائداد تو کاغذات کی رو سے اس کی ملکیت تو تھی ہی ۔ انگریزی دور میں عدالت کا
[illegible] کھٹکھٹانا پڑا ۔ خاندان سر ... آپ کے شاگرد اور عقیدت کیش اور قابل اعتماد تھے اس لئے سلطان العلما مجتہد العصر
[illegible] شہادت دی ... معزز گواہوں کی شہادت پر مقدمے میں کامیاب ہوئے مگر جوڈیشل کمشنر نے عدالت ماتحت
[illegible] منسوخ کر دیا اور ... قبضے میں نہیں آئی ... دکھائی یا بتایا ہوئی کے ... مدار حمند سید عبداللہ صاحب نے اپنی
[illegible] تحسین علی خاں کا نام اس طرح سپرد قلم فرمایا ہے "گل سرسبد گلستان محمد نور حدیقہ حشمت و جلال دوستدار
[illegible] جاں نثاران اہلبیت رسول خدا صلوات اللہ علیہم اجمعین مجمع جود و احسان خان عالیشان محمد تحسین علی خاں" شعر و
سخن میں بھی کمال تھا اور بڑے زود گو تھے یہ میر ... سے ... پر اصلاح لیتے تھے امجد علی شاہ کے زمانے سے غزل کہنا
چھوڑ دی تھی میر انیس سے اصلاح لیتے تھے ایک مناجات ... کہ رہی ہے حج کی تمنا بھی دل میں تھی دو مرتبہ حجاز کے
سفر پر تیار ہوئے ... پہنچے کے قریب تھے کہ ہوا کے مخالف ... اسٹیمر کو پلٹنا دیا ۔ اس سفر میں ان کے بیٹوں نے طرح طرح سے
دھوکا دے کر ... اشرفیاں، جواہرات، قیمتی انگوٹھیاں حتی کہ ... ہدایت تک غائب کر دیا اور دوسری مرتبہ بھی حج
سے محروم رہے ... افسوس ... مدینہ کی زیارت نصیب ہوئی سفر عراق کا ان کے خود نوشت[1] حالات میں ذکر
نہیں ہے ... کی سلطنت میں ... بڑی تکلیف میں ان کی ... بسر ہوئی پھر بھی ان کا وقف محلہ ...
میں ... ہے اور ... کی تفصیل ... ہے۔

مسجد: عمارت بڑی نہیں ہے ... اس وقت یہ مسجد "علی کی مسجد" کہی جاتی ہے علی دور آخر کے مؤذن تھے جن کے خس
خدمات نے تحسین کا نام لینے کے بجائے ... ان کے نام کو شہرت دی۔ حلقہ مسجد کا ملبا اور ... کے بعد صحن مسجد ...
پہونچے سے تحسین کی قبر پر سنگ مرمر لگا ... سارے گر چکے ہیں ... گنبد کی ہے اور صرف ایک درجہ ہے صحن
کے پہلو تک حوض اور دروازے سے قریب بیت الخلا ہے ۔ پشت مسجد پر مؤذن کا مکان پیچھے چند دکانات ہیں مسجد کا ذکر میاں
تحسین کے اپنے لکھے ہوئے حالات میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے ۔

"الف خاں فاری مؤذن مسجد تعمیر کردہ حقیر واقع محلہ ... متصل ڈیوڑھی معتمدالدولہ مرحوم عقب مکان معصوم ۔
نواب بیگم جو سید ... عبد ... حرام ... کے ... پر استادہ ہے مسجد پر جو کتبہ ہے وہ ...
خود تحسین علی خاں کا نظم کردہ ہے ۔

مسجد مبارکست بناء اللہ — سال تاریخ خواستم دلخواہ
ناگہان آمدہ ندا از غیب — کرد تحسین خانہ بیت اللہ ۱۲۶۳ھ

مسجد آباد ہے اور اہل محلہ کی طرف سے ... نماز جماعت ہوتی رہتی ہیں ۔ بانی مسجد کی طرف سے عشرہ محرم میں سہ
کو روزانہ مجلسیں اور ہر ماہ کی اٹھارہ کو ایک ماہوار مجلس مقرر کی گئی تھی جس میں پیش خوانی میں خاندان میرزا دبیر یا ان کے ...
میں سے کسی کا مرثیہ پڑھنا ضروری تھا ۔

---

[1] خلاصۃ الاعمال ص۳ طبع مطبع سلطانی ۱۲۹۲ھ کی تالیف ... ذات الیقین مخطوطات

کوٹھی میاں تحسین: ۔ مسجد کے پچھواڑے ایک خوشنما عمارت تھی جو شیشہ آلات اور قدیم فرنیچر سے آراستہ تھی اور دو قطعہ مکان اس کے علاوہ تھے جس کی قدیم صورت اور ہیئت پچاس سال پہلے تک باقی تھی۔ تحسین علی خاں نے اپنے وصیت نامے میں اس کو شمس العلما سید محمد ابراہیم صاحب کی تولیت میں دیا اور آٹھ ہزار روپے کے پرامیسری نوٹ مخصوص کئے یہ سرمایہ اس وقت بھی باقی اور وقف ممتاز العلما کا حرج ہے۔ تحسین علی خاں کا رہائشی مکان یہی جائداد ہے مسجد کے عقب میں دو قطعہ مکان بھی ہیں جو وقف سے متعلق ہیں اور ٹرسٹ کا ان پر قبضہ ہے۔

شمشیر جنگ کا باغ

نواب برہان الملک فرمانروائے اودھ کی دختر ہما بیگم عرف بدی بیگم کی شادی اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ ہوئی ان کا نام نثار محمد خاں بن میر محمد باقر خاں تھا اور بادشاہ دہلی کی طرف سے شمشیر جنگ خطاب تھا یہ باغ انھیں کی طرف منسوب ہے اب باغ میں ایک درخت بھی نہیں ہے چھوٹی لائن اسٹیشن کا مال گودام تاڑی خانہ لکڑی کی ٹال اور قدیم قبرستان ہے جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور لکھنؤ کے کتنے صاحبان کمال شعرا امرا اہل علم زیر زمین سو رہے ہیں یہاں ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا کنواں موجود ہے جو اب جدید پارک اور نئی مدرسے سے متصل ہوگیا ہے پہلے اس کنوئیں کا پانی دور دور سے بھر کے لے جاتے تھے اس مقام کے تاریخی حالات میں وہ مجرا ہے جو طوائف کا جو نصیر الدین حیدر نے اپنی ولیعہدی میں دیکھا تھا ہم اس کا ذکر نہیں کرتے (قدیم نمبر ص۶۹)

بلند باغ

چھوٹے اسٹیشن سے گذر کر جو راہ دفتر وقف بورڈ اور ریلوے اسپتال جاتی ہے یہی کبھی بلند باغ تھا اب زمین کی پستی اور بلندی کے سوا آثار قدیمہ میں کچھ باقی نہیں یہ باغ نواب معتمد الدولہ آغا میر کا تھا اور ضبطی جائداد کے بعد نواب ملکہ جہاں کے قبضہ میں آیا۔ ریل کا بڑا پل اور نواب مہدی علی خاں بہادر کی ڈیوڑھی جس کا ذکر پادری جی ٹوڈ لر کے ذیل میں ہوا انھیں حدود میں ہے ریلوے کے پل کے بعد ایک چھوٹی مسجد ہے اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی وقت قبرستان تھا کچھ قبریں اب بھی باقی ہیں اکثر دھوبی اس زمین پر کپڑے سکھاتے ہیں نعوذ مسجد کے روبرو آفتاب دیکھئے ادب میر تقی میر کی ابدی آرامگاہ ہے مگر میری رائے ہے کہ وہ اس سے آگے ہے اور لوہے کے پل کا قبرستان جس کا ذکر آگے آئے گا یہاں تک تھا اور یہ اس محلے کی آخری قبریں ہیں جس کے بعد ریلوے لائن ہے۔ اس وقت یہاں سلطنت منزل اور حامد پارک بلند باغ کی آراضی پر ہے جس کو بلند حیثیت حاصل ہے۔

وزیر گنج

نواب آصف الدولہ کے لے پالک نواب وزیر علی خاں کا آباد کیا ہوا ہے اور وہ اسی محلہ میں رہتے تھے آثار قدیمہ میں

خاقان منزل: ۔ وہ مشہور عمارت ہے جو اب تک موجود ہے حضرت محمد علی شاہ بادشاہ مرحوم کے ایک صاحبزادے ملکہ جہاں کے بطن سے تھے جن کا نام تھا ہمایوں بخت مرزا احمد علی خاں۔ ان کی شادی نواب نور بیگ خاں رئیس مدراس کی بیٹی سے ہوئی تھی اس خاتون کو سسرال سے خاقان بہو کا خطاب ملا تھا۔ خاقان منزل انھیں کی یادگار ہے جو سڑک سے بلند چبوترے پر واقع ہے

شاندار پھاٹک وسیع میدان نما وسیع صحن اور انگنائی میں امام باڑہ، دالان اور شاہ نشین کو نوں پر خوبصورت برجیاں، خوشنما محراب در و دیوار، باقی کے عز و جاہ کا پتہ دے رہے ہیں۔ حاقان محل کے رؤسا میں سید محمد مہدی صاحب نے ۱۰ رجب ۱۳۱۸ھ اور نواب سید محمد حسین ولد حکیم میر صادق صاحب نے ۱۱ صفر ۱۳۱۳ھ کو انتقال کیا۔ اس خاندان کے افراد کراچی میں موجود ہیں۔

محلسرائے ڈپٹی محمد عظیم خاں :- یہ عمارت جو کہ اب تک موجود ہے۔ دوسرا خاقان محل کا امام باڑہ تھا اور عزاداری کی سب سے بڑی علامت یہ تھی کہ عمارت کی کرسی بلند ہونے کے باوجود پھاٹک سے اوپر تک لکھوری اینٹوں کی ڈھال تھی جس پر سے دلدل آسانی سے گذرے۔ اس عمارت میں ۴۵ کمرے ہیں۔ مدت تک ذاتی استعمال میں رہنے کے بعد روشن خیال وارث عمارت نے وقف کرکے امام باڑہ عزائے حسین نام رکھا ہے اور اپنی حیثیت سے امام باڑہ کی کتنی درستی آلات میں اور یہ صرف کرکے نمایاں حیثیت دی ہے ڈپٹی صاحب کی بہو نواب ... بیگم ... اپ کی لڑکی نواب خورشید زمانی بیگم بھی اس محلسرا میں مقیم تھیں ... اس خاندان کی وہ بیگمات تھیں جو ملکہ زینت محل کے بھائی کا کنبہ تھا دہلی کے غدر میں ... معلوم نہیں کہاں رہے بیگم صاحبہ موصوفہ کے پاس جواہرات اور زیور ... سیاہ ... تھا جو دستبرد کے حوالے میں تھا ماہی شغفور اور عرش ... کی قیمت ... لاکھوں روپیوں میں کوئی ایک سیاہ رنگ دار ہوگا ... کوئی حرکت نہیں کرتا کچھوے کی شکل کا یہ ایک سنگ تھا جو حوالے میں محفوظ رہتا تھا اس پر ... پیدا ہوا کرتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی نقرئی مہر اور ایک موئے کی تسبیح بھی اس گھر میں تھی بیگم صاحبہ کی رحلت کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے ان کی تاریخ وفات "ہائے مغفورہ" ہے۔

قصر ملکہ جہاں :- سلطنت اودھ کی بااقتدار خاتون حضرت محمد علی شاہ بادشاہ ... بیگم اس عالیشان محل میں رہتی تھیں۔ وہ ڈپٹی صاحب کی محلسرا کے سامنے سڑک کے اس پار بلند سڑک کی جگہ تھی اور ایک دیوار اب تک باقی ہے اس عمارت کا سلسلہ جوبلی اسکول تک چلا گیا تھا اور سٹی اسٹیشن ملکہ جہاں کی آراضی پر بنا ہے ... ملکہ جہاں کی رنانی ڈیوڑھی کا کنواں جواب تک اسٹیشن کے سامنے واقع ہے اور پیاسے سیراب ہوتے ہیں۔

ملکہ جہاں بیگم :- حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی بااقتدار بیگم مدتوں عراق میں رہیں اور وہیں ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا۔ آغا محمد مرزا لکھنوی اپنے سفرنامہ عراق میں لکھتے ہیں "یہاں عورتوں کے واسطے مثل ہندوستان کے ڈولی میانہ یا فینس نہیں ہے بلکہ امیر و غریب عورتیں سب پیدل چلتی پھرتی ہیں۔ عرب، عجم اور ہندی کی چال میں بھی فرق ہے۔ متمول اور غریب چادر سے معلوم ہو جاتی ہے غریب عورتوں کی چادر معمولی سیاہ رنگ اور امیر کی ریشمی سیاہ رنگ ہوتی ہے ہندوستانی بڑی متمول معزز عورتیں بھی اسی طرح زیارت کو پیدل جاتی ہیں۔ سب سے بڑی اور متمول معزز ہندی معظمہ لکھنؤ کی نواب ملکہ جہاں تھیں جن کو باسلامتی نے اس طرح دیکھا کہ آگے آگے مسلح سپاہی ان کے بعد یہ ہیئت مذکورہ سیاہ ریشمی چادر پنجہ میں بوڑھی بیگم

صاحب مرحوم جن کے قدم بہ سبب خلافِ عادت ضعیفی کے بہت آہستہ آہستہ اٹھتے تھے ان کے داہنے بائیں دو بڑے بڑے سردار بغلوں میں ہاتھ دیئے اور پیچھے پیچھے خواص و لونڈیاں سب کے بعد پھر چند سپاہی ہوتے تھے اثنائے راہ میں ۔ بیگم اکثر سر کے اشارے سے سلام کرتے جاتے اور خاص کر ہندی لوگ تو جھک جھک کر اپنے ملکی طریقے پر تسلیم بجا لاتے تھے ۔

__جان صاحب__ :۔ اسی سرکار کے متوسلین میں تھے سرکار کے عراق چلے جانے اور شہر کی ویرانی کے بعد ان کی زندگی رامپور میں بسر ہوئی جان صاحب مرد سیہ فام یعنی کالے دھبو رہتے ۔ ہاتھ میں لوہے کا کڑا پڑا ہوا غرارہ دار پیجامہ چڑھوا ں جوتا سر میں اگر کھا سر پر زلفیں جن کے سرے پر انگوٹھیاں اور چھلے بندھے ہوئے ہاتھ میں ڈنڈا ۔ یہ وضع تو ہمہ وقت تھی مگر مشاعرہ میں ریختی کلام پڑھتے وقت جسم میں زنانہ جوڑا ہوتا یا کم از کم بھاری دوپٹہ سر پر ہوتا رامپور میں جب پہلی دفعہ گئے اور مشاعرہ میں شرکت کی تو ملکہ جہاں کا بھاری جوڑا جسم میں تھا شہر میں پہونچنے کی اطلاع پر نواب نے مشاعرے کی خبر دی اور جان صاحب سے ناخواندہ مہمان ہونے کا عذر کرتے ہوئے سب سے پہلے خود ہی پڑھ کر مجمع کو درہم برہم کر دیا شعر کیا تھا؟ ایک چوٹ تھی۔ حاضرین پر شمع سامنے پہونچتے ہی کہا ؎

میں تو بوڑھی ہوئی اب میری مروت کیا ہے ۔۔۔ مری نوچیوں میں کیجئے سرکار پسند

ہاتھ کا اشارہ حاضرین کی طرف ہوا اور سامعین میں یہ اداءِ خواندگی ایسا پُر اثر ہوا کہ چھتیں پھٹ گئیں حاضرین کی رائے ہوئی کہ آج کا مشاعرہ انہیں پر ختم ہو پھر کوئی نہ پڑھا ۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

لئے پھری مجھے قسمت کہاں کہاں میری ۔۔۔ کسی نے قدر نہ کی زیرِ آسماں میری

پہاڑی کوے موئے کاؤں کاؤں کرتے ہیں ۔۔۔ منہ دکھاؤں جو پیدا کرے نشاں میری

جان صاحب[۱] نے ۱۲۹۴ھ رامپور میں قضا کی ۔

ملکہ جہاں خطِ نسخ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں سوانح عمری جناب فاطمہ دختر حضرت سرورِ کائنات اپنے ہاتھ سے ۲۵۰ صفحات پر لکھی تھی جو ان کے پروتے پرنس عابد مرزا صاحب کے پاس موجود تھی اور ایک قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھا جس کے پندرہ پارے کربلا اور پندرہ پارے نجف میں روضوں پر چڑھائے یا امام رضا کے مزار پر (واقعہ نگار کو بیان میں شک ہے) ملکہ جہاں نے خوشنویسی جینا بیگم سے سیکھی تھی یہ محمد علی خوشنویس کی رفیقۂ حیات تھیں ۔

ملکہ جہاں نے ۸ جولائی ۱۸۸۲ء کو وطن آکر انتقال کیا اور لاش کربلا بھیجی گئی ۔

(۱) میاں تقی میر مہدی حسین منجم :۔ رضوی سادات اور کھرے سیدوں میں تھے اس قدر دولت مند تھے کہ اپنی بی بی کا ڈیڑھ لاکھ کا مہر آسانی سے ادا کیا علم نجوم اور جفر میں ید طولیٰ حاصل تھا اور بہت بڑے عامل شمار کئے جاتے تھے غدر سے پہلے فوت ہوئے در چہلم نہیں ہونے پایا تھا کہ بھگدڑ ہوئی ۔ ان کے علم و عمل کے کارنامے بہت ہیں جن میں دو واقعے قابلِ ذکر ہیں (۱) ان کی رفیقۂ حیات کا ایک تقریب میں جو ان کے گھر ہی میں تھی جوتے کا بکسوا کسی مہمان عورت نے گھما دیا اس پر جواہر ٹکے تھے وہ پریشان ہوئیں اور سید صاحب سے اصرار کیا کہ ابھی مل جائے کچھ ایسا کیجئے ۔ سید صاحب تیار نہ تھے کہ مہمان کی ہمارے گھر میں فضیحت ہو خانہ نامی کا باعث ہے مگر بی بی نے کہا کہ ایسی عورتوں کو بے عزت کرنا ہی آئندہ محفلوں میں چوری نہ ہونے کا انسداد ہے ۔ آپ مزید

---

[۱] تذکرہ ... ۱۸۸۸ء [۲] نیا دور

ک کریں سید صاحب نے نقش لکھ کر گلے میں رکھا اسی وقت آنے والی عورتوں میں ایک خاتون سراسیمہ ہوکر بکھوا دے گئیں بیتابی میں
ان کا یہی نعرہ تھا کہ "یا سید علی" (۳) ایران زیارت کے لئے گئے شاہ ایران کی بیٹی پر کچھ آسیب تھا اور کسی طرح اس کی حالت نہ سنبھلتی
ان کا کمال چھپا ہوا تھا اہل قافلہ سے ملک میں کبھی خبر تھی کہ ایک سید عامل زائروں میں موجود ہے حکومت کے ادنیٰ سے علی
سے ان کو قصر شاہی لے جانا چاہا مگر یہ انکار کرتے رہے کہ میں زیارت کو آیا ہوں بادشاہ کی ملاقات کو نہیں آیا عمر مسلمانی میں
کسی سمجھنے آپ کو توجہ دلائی کہ آپ سید ہیں اور آپ کے جد نے یہ نہیں کہا ہے کہ کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھو اور مدد نہ کرو - اس
استمداد پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک [illegible] پاؤں کے انگوٹھے کی کھال میں دبا لی مریضہ کے قریب پہونچے اس سے [illegible]
میں بات چیت کی کہ میں نے تمہاری [illegible] سے لکھنؤ چھوڑا تم یہاں بھی میری جان پر بلا لے ہوئے۔

روشن لال کا کنواں :- وزیر گنج میں یہ کنواں مشہور جگہ ہے روشن لال عہد امجد علی شاہ یا اس سے پہلے عہدہ [illegible] پر سرفراز
ان کے بیٹے لالہ گنگا پرشاد [illegible] کے [illegible] وقت مشت میں ان کی [illegible] کا عمل [illegible] کا انتقال [illegible]
اور شاہ کی مدت کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے

ڈیوڑھی ممتاز الدولہ :- نواب ممتاز الدولہ [illegible] تھے یہ [illegible] رئیس تھے تاریخ اودھ میں ان کا نمایاں ذکر ہے [illegible]
سرکار تھی نواب [illegible] کے وقت تک دروازے پر ہاتھی بندھا رہتا تھا دہلی دربار میں شرکت کے بعد ان کا
انتقال ہوا اور یہ جائداد وارثوں سے [illegible] محمود آباد کے ہاتھ فروخت کر دی جس پر اقبال منزل کی عمارت تعمیر ہوئی اس ڈیوڑھی
کے آخری کارپرداز ماسٹر ابو محمد تھے [illegible] کہ جہاں شہر میں چلنے کے رواج سے پہلے جلوس تک کی محفلوں میں [illegible]
تقسیم ہوتی تھی۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں — [illegible] لکھنؤ کی مشہور [illegible] ہوا لفت تھی اور فیاض بھی - ایک بار ریحان صاحب کو قصیدہ
لکھنے پر سو روپیہ انعام بھی دیا مگر تھی [illegible] انتظام اور کارداک - ایک بار نواب ممتاز الدولہ کے جلسے میں مجرا کر رہی تھی
مستی کی دھڑی ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی کمر پاں کا لکھوٹا [illegible] تھا اس لئے بہت [illegible] آ رہی تھی سید حسن لطافت [illegible] تھے انھوں
نے نواب کو مخاطب کرکے کہا حضور ملاحظہ فرمائیے - آج تو [illegible] کھا کر آئی ہے نواب یہ پھبتی سن کر بے ساختہ ہنس پڑے۔

وزیر گنج کے صاحبان کمال میں شیخ فدا حسین کاتب منشی شمس الدین کے ہمعصر تھے آصفی دور ہے مانے میں ان کا جواب نہ تھا
ان کے علاوہ میر بنیاد حسین صاحب لکڑی کے استاد تھے شرافت اور رکھ رکھاو میں بھی وہ قابل تعلیم سمجھے جاتے تھے شہر کے علما
رؤسا اطبا ان کے شاگرد تھے۔

اصغر حسین نامی ایک بزرگ بانس منڈی کے رہنے والے اکثر وزیر گنج میں ٹھہرتے تھے یہ بھی لکڑی میں استاد تھے اور ہاتھ کی یہ
صفائی تھی کہ کوڑی پر ان کی تلوار چلتی تھی اور ریشم کاٹ دیتی تھی۔

مسجد روشن علی :- آپ علم رمل کے جاننے والے تھے ممکن ہے کہ اسی محلہ میں رہتے ہوں مسجد اوسط درجہ کی ان کی یادگار باقی ہے فن
کتابت میں بھی ان کو کمال تھا چنانچہ حاجی سید سعادت حسین مرحوم کے تجارتی کتب خانہ میں ان کے ہاتھ کا شاہکار رضیاء الرمل مایہ نارنسخہ تھا
سید روشن علی کے شاگردوں میں مولوی حفیظ اللہ صاحب تصنیف تھے ان کی شرح زبدۃ الرمل مشہور کتابوں میں ہے اس محلہ میں فرا ستخانہ جو

ملہ [illegible] تحفۃ الساکنین بابت ماہ رمضان [illegible] نشر کردہ میر عابد علی صاحب مالک مطبع

مشہور ہے وہ فراشخانہ میر روشن علی کے نام سے سو برس پہلے مشہور تھا۔

گھانسی کی بغیہ :۔ اس محلہ میں سلطنت اودھ ختم ہونے کے بعد ایک بزرگ حاجی حسن علی رہتے تھے جن کا سفرنامہ بسلسلہ زبان فارسی عہد قدیم میں مطبع حیدری میں طبع ہوا ان کی دوسری تالیف تحفۃ العوام ہے اور ۱۲۷۱ھ میں یہ ایک پریس کے مالک بھی تھے تحفۃ العوام اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک شیعہ پریس نے لکھنو، دہلی اور معلوم نہیں کہاں کہاں طبع کرکے لاکھوں چھاپے اور کتاب کی مقبولیت[1] پر سو برس کے قریب ہو رہے ہیں حرف نہیں آیا۔

حاجی حسن علی کی قبر مکان رحمن صاحب پسر حکیم شمس الحسن شاہ صاحب مرحوم کے پہلے ایک چھوٹے مکان کے دروازے کے روبرو رہی دور مگر پختہ رہیں کی صورت میں اب بھی ہے گھانسی کی بغیہ کو چہ غیر آباد ہے اور کسی وقت میں گلی کے پہلے پھاٹک تھا جس کے بند کرنے سے محلہ محفوظ ہو جاتا تھا گھانسی کی بغیہ کے آخری مکانات کسی قبرستان پر تعمیر ہوئے ہیں بعض مکانات کی مرمت میں یہاں سے قبریں نمودار ہوئی ہیں

نواب سید محمود علی خاں۔ نسل دریاباد کے ایک باکمال شخص تھے جو علوم مشرقیہ میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے دستکاری میں ان کا جواب نہ تھا کپڑے کے جاجدان اور کبھی قفل ایسا ساتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بدر کا کام ہے پختگی مصنوعی نقش و نگار سنہرے اور روپہلے پھول دیکھنے کے قابل تھے جلد سازی میں بھی فرد فرید تھے اور ان کی محاسنت کا اچھے اچھے دفتری مقابلہ نہ کرسکتے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں ان کے ایک شاگرد جلد سازی کے اعلیٰ عہدے پر اس وقت بھی کام کر رہے ہیں طبی معلومات بھی نواب صاحب کو تھی ربیٹھے کی ایک کھیر پکاتے تھے جو ایک مرتبہ کھانے پر تاحیات قوت بصر میں کافی طاقت، چشمے کی ضرورت نہ رہتی تھی وہ مرتے دم تک عینک نہیں لگاتے تھے دوسرا نسخہ نواسیرکا ان کے پاس تھا جس میں مرغ کو سرخ مرچیں کی لونڈی کھلا کر کچھ دیر کے بعد اس کو ذبح کرکے یہ لونڈی اس کے شکم سے نکالتے تھے مجھے دونوں نسخے دیدیے کا وعدہ تھا جو زبانی ممدوح کو یاد نہ تھے مگر ضعف پیری نے مہلت نہ دی اور حیات نے وفا نہ کی اور کمالات قبر میں لے گئے ایک کتب خانہ ممدوح نے چھوڑا جو میرے نام وقف کیا اور میں مدرسۃ الواعظین کے سپرد کر چکا۔ نواب صاحب نے ۲ شعبان ۱۳۶۳ھ میں قضا کی اور باغ ستیر جنگ میں سپرد خاک ہوئے۔

اس حلقے کے مشہور لوگ

طوبار میں ڈیوڑھی نواب معتمد الدولہ دوریہ گنج وبازار راجہ باورچی ٹولہ کی تحت میں حسب ذیل لوگوں کے نام درج ہیں

نواب ممتاز الدولہ بہادر مع مرشد زادہ دارو غہ دلدار خاں، داروغہ محمد خاں، سید حسن صاحب، ملا حامد میر موسیٰ علی نواب سیف الدولہ نواب صادق علی خاں صاحب، نواب میر محمد حسین صاحب، نواب جعفر علی خاں صاحب، شیخ علی حسین صاحب، میر حیدر صاحب، وارث علی خاں نیر، سید محمد مہدی صاحب، حکیم میر صادق صاحب، حکیم میر کاظم صاحب، اچھے صاحب، میر علی سجاد صاحب، میر علی نقی صاحب۔ نواب ناظر اعتماد علی خاں صاحب، حاجی بشیر علی خاں صاحب، شیخ محمد تقی صاحب، حاجی عبدالعلی صاحب، محمد سجاد حسین خاں صاحب، میر رضا حسین صاحب، نواب سراج الدولہ بہادر میر محمد جان صاحب، سید محمد صاحب، تحسین علی خاں صاحب، نواب سرفراز الدولہ بہادر، آغا مہدی علی خاں سید صادق حسین صاحب، سید مہدی حسین صاحب، میر صادق حسین صاحب، نواب نظر علی خاں صاحب، نواب ابوالحسن خاں صاحب، شیخ سعادت علی صاحب مع برادران منجھو صاحب، سید رضا علی خاں صاحب، حیدر مرزا صاحب، میر محمد رضا صاحب، میر مہر علی صاحب

[1] حاجی حسن علی کی دوسری کتاب احکام الائمہ نولکشور پریس نے ۱۲۹۵ھ میں طبع کی۔

...نس، میر احمد شاہ صاحب، حاجی حسن علی صاحب، حاجی حسین علی صاحب، میر حامد علی صاحب، مطبع مرزا علی حسن صاحب، نواب مرزا مہدی علی خاں صاحب، نواب حافظ امین خاں صاحب، مرزا محمد باقر صاحب کشمیری، منشی عبداللہ صاحب ملازم نواب صادق علی خاں صاحب۔

مشک گنج

بہشتی کی مشکیں جانی جاتی ہے یہ محلہ مشک گنج مشہور رہا اور اس محلہ کی بنیاد بھی عہد آصفی میں قائم ہوئی تھی مشکیں بہشتیوں کے کاندھے پر رکھ کر گھر گھر پانی پہنچایا جاتا تھا کھاروے کی سرخ لنگیاں اور کمر پر مشک سقوں کا پرانا پہناوا ہے امیروں اور محلات میں بہشتی منہ پر اندھیری ڈال کر پکارنے کے بعد چلا جاتا اور اندر سے آنے کی اجازت کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔ اندھیری ٹاٹ کے ایک حصہ کو چہرہ پر ڈالنے کا نام ہے سی پی میں مشکیں بیل یا بھینسے پر رکھ کر بھی گھر گھر آب رسانی ہوتی ہے اور عراق میں گدھوں سے اس باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اور بازار کے گشت کرنے والے کے ہاتھ میں کٹورے کا ہونا بھی ضروری تھا جو مشک سے کٹورے کا ٹھنڈا پانی بھر کر راہگیروں کو پلاتے تھے۔

مسجد آصف الدولہ۔ اس محلہ میں جو مسجد وسیع چوک پر موجود ہے یہ خانہ خدا عہد آصفی کی عمارت ہے جس کو ملا سید علی اصغر صاحب عربی پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ نے دوبارہ تعمیر کیا۔ آثار قدیم پر جدید عمارت ہے حوض اور کنواں پرانا اسی وقت کا ہے دوسری مسجد موسری والی مسجد کہلاتی ہے اور بعض لوگ اسی مختصر مسجد کو مسجد آصفی کہتے ہیں جو غلط ہے یہ چھوٹی مسجد زمانہ شاہی میں کوئی گوہر بیگم تھیں ان کی تعمیر کردہ ہے۔

محلہ کے صاحبان کمال میں۔ بہت سے افراد قابل ذکر ہیں جن کے علم و عمل کے موتی بھی اسی زمین میں دفن ہو گئے کچھ کے نام اور آثار باقی ہیں (۱) وزیر خاں، لکڑی کے کام میں استاد تھے اور پنجاب کے مشہور لوگ ان کے شاگرد تھے فارسی کے مشہور ادیب منشی احمد حسن صاحب اور ملا علی اصغر صاحب مرحوم ان کے شاگرد تھے۔ ۲۔ میر حامد علی صاحب مرحوم عہد شاہی کے بعد سٹیم پریس کی بنیاد میں سب سے پہلے اقدام کرنے والے مطبع اثنا عشری اور مطبع حسینی اور مطبع امامیہ مختلف ناموں سے چھپائی کا کام شروع کیا اور علمی ادبی لاتعداد کتابیں چھاپ کر شائع ہوئیں پریس کا لٹریچر زیادہ تر اس وقت کا کاغذ ایسا تھا جو پڑھتے پڑھتے چاک ہو جاتا تھا اور کتاب کی عمر ختم ہو جاتی تھی۔ میر صاحب کو ساڑھے کی مشہور کتاب کشاف چھاپنے کے جرم میں قید بھی ہونا پڑا۔ جس سے باہو کر وہ ہر کتاب کے ٹائٹل پر لکھتے تھے کہ "یہ کتاب واسطے مذہب شیعہ کے چھاپی گئی ہے حضرات اہلسنت و جماعت ملاحظہ نہ کریں"۔ لکھنؤ میں سب سے پہلے شیعہ پیپر "اخبار امامیہ" انھوں نے جاری کیا جس کے کالم پرانے چال کے مقالات اور مسئلے مسائل سے بھرتے تھے ۱۹۱۵ء میں اس اخبار کو سیاسی رنگ دے کر روزانہ کیا گیا اور جنگ عظیم کے موقع پر یہ اخبار زیر ادارت حکیم سید ذاکر حسین اختر بھرتپوری نکلتا رہا اور پریس ایکٹ کے شکنجے میں آ کر ختم ہو گیا۔

میر صاحب کے کئی بیٹے تھے اور سب یہی کاروبار اختیار کیے ہوئے تھے مطبوعات کی فہرستوں پر کہیں کہیں ان کا نام ملتا ہے سید سجاد علی کو دعا تعویذ کا شوق تھا اور افسانہ نگاری قدیم سے واقف تھے حبیب نامہ، تات نامہ، واقعہ کربلا کے مابعد پر ان کی ادبی تصنیف ہے جو "مختار نامہ" کے ضمیمہ ہیں اسلوب نگارش میں ان کا زور قلم قاتلان حسین کی ہلاکت کے موقع پر بڑے دھڑک لکھتا تھا انسان وا لستر مع الجدود ابیدو اور اس زمانے کے حوادث زمانہ کا ذریعہ تھا دعائے نور کبیر اور بڑی اور علی بھی انھیں کی شائع کردہ ہے اردو ہو یا عربی ان کی تحریرات میں داستان امیر حمزہ کا رنگ ضرور ہے اور امیر خسرو شہرہ کے مرنے والے کو یاد دلا دیا یہ وہی دعا نور ہے جو عوام میں زیر کفن رکھتی تھی میر حامد علی

صاحب نے عید کے دن مسجد آصفی کے مجمع میں بڑی عمر پاکر اچانک دنیا سے سفر آخرت کیا عباد علی بنیاد علی ان کے بیٹے تھے جن کی نسل ان کی موجود ہے وہ منشی گنج کے جز فراش خانہ کے رہنے والے تھے (۳) اس محلہ میں سید ہدایت اللہ خاں کے نبیرہ مخبر الدولہ سعید الممالک حکیم سید ماشاء اللہ خاں اسد جنگ نجفی الجعفری رہتے تھے ان کی تقویم نوروز ملک کے طول و عرض میں محتاج تعارف نہیں ہے یہ فن ان کا خاندانی تھا اور اس وقت ان کے نواسے سید فصیح اللہ خاں عرف سید محمد سجاد ان کی یہی موروثی علم کی ماہ ہیں اور تقویم و زائچہ سالانہ نوروز کے موقع پر چھپتا ہے اور شیعہ علماء میں ان کے مقرر کردہ احکام قرۃ العین مستند سمجھے جاتے ہیں (۴) تاج العلماء سید علی محمد صاحب مرحوم۔ آپ قبلہ وکعبہ مجتہد العصر والزمان کے فرزند ارجمند تھے باپ کی اولاد میں سب سے زیادہ علم رکھنے کے باوجود دوسرے بھائیوں کی قائم مقامی پر راضی تھے اور گدی نشینی کا سودا دماغ میں نہ تھا مشرقی علوم میں یکتا تھے اور فلسفہ و منطق فقہ و اصول و علم ہندسہ کے ساتھ عبرانی بھی جانتے تھے اور اس علم کو آپ نے ایک عیسائی پادری سے حاصل کیا تھا جس نے آپ سے عربی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی وہ تو ماضی مضارع کے صیغوں میں الجھ کر رہ گیا اور آپ اس کے پڑھانے سے عبرانی کے زبردست عالم مانے گئے ان کے دور تک عبرانی لٹریچر دنیا کی لائبریریوں میں موجود تھا چنانچہ تاج العلماء کے اکثر تصانیف میں کہیں کہیں عبرانی عبارتیں نظر آتی ہیں تاج العلماء خطاب مرحوم شاہ اودھ کا عطیہ ہے جو خاندان غفرانمآب پر ان کی آخری مرحمت تھی۔ آپ کے تصانیف عظیم آباد جونپور وغیرہ میں طبع ہوئے اور کتنے تالیفات استداد زمانہ نے باقی نہ رکھے عربی شاعری میں ان کا کلام پختہ اور ٹھوس ہوتا تھا اردو کے شعر و سخن میں ان کا ذوق عنوان مزاج نمایاں ہے جو زبان لواری کا قابل قدر جوہر تھا ان کے کلام میں پچاس برس پہلے وہ چاشنی موجود ہے جو مولوی اسمٰعیل کے نصف صدی کے بعد اشعار میں پیدا کی ملاحظہ ہو۔

مسلمانوں کو یارب اب نہ ترسا[۱]	تھا حکم مینھ کرم سے اپنے برسا
یہی تجھ سے ہے ہم سب کی گذارش	بھریں جل تھل یہ شدت کی ہو بارش
نہ ترسیں ڈونگرے یارب نہ ٹھلے	ٹھڑی دل کی تمنائیں نکلے
سب ہی فانی ہیں ماسوائے اکرم	ایک فقط اُس کی ذات باقی ہے
نی سکندر نے راہ ملک عدم	اور آب حیات باقی ہے
نہ سلیماں رہے نہ تخت ان کا	اور سب کائنات باقی ہے
حب آل نبیؐ بکاء حسینؑ	بس یہی راہ راست باقی ہے
کربلا سے ہوئے امام حسینؑ	اور نہر فرات باقی ہے[۲]

تاج العلماء نے ۱۳۱۲ھ میں آغوش لحد کو آباد کیا ان کا مادۂ غفرانمآب ان کی ابدی آرامگاہ ہے ہندوستان کے طول و عرض میں ستاروں کی طرح ان کے شاگرد بکھرے ہوئے تھے جن میں شیخ محمد ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ عبرانی کے آخری ماہر تھے اپنے استاد کی ذات پر فخر کرتے تھے ذیل کا علامہ کا پیام موت تھا جو مرتے مرتے نہ گیا۔

---

[۱] چودھویں رات کا چاند ص ۱۸۵ [۲] مرقع ص ۲۷۵ طبع دی الحو ۱۳۱۲ھ مطبع میر حامد علی لکھنؤ

گولہ گنج

وزیر گنج سے گذر کر دو محلے مشرقی سمت پڑتے ہیں جن کو بارود خانہ اور گولہ گنج کہتے ہیں دونوں کا تعلق شاہی توپ خانہ سے تھا یہ نہیں معلوم کہ محلہ کب آباد ہوا۔ قیصر باغ کی راجدھانی سے قریب ہوتے ہوئے ممکن ہے کہ عہد واجدی میں محلہ آباد ہوا ہو۔ یہاں بھی رؤسا، امراء، شعراء، صاحبان کمال آباد تھے اور محلہ کے بعض آثار قدیمہ باقی نہیں رہے بعض ایسی اعلیٰ شان و شوکت پر اب بھی گواہ ہیں۔

مطبع کارنامہ ۔ ابتدا انگریزی عہد نواب محسن الدولہ بہادر میں محمد یعقوب انصاری نے ایک پریس کھولا جو شاہی خصوصیات کا حامل تو نہ تھا لیکن اس کے قلم برداشتہ مطبوعات دیکھے ہیں اور ایک کتاب کا آخری نوٹ یہ ہے "در مطبع کارنامہ واقع امامباڑہ ملکہ زمانیاں رونق طبع یافت" امامباڑہ پر آگے چل کر بحث ہوگی

مطبع آئینہ حق نما ۔ یہ چھاپہ خانہ ۱۲۸۲ھ میں چل رہا تھا لکھنؤ کی مختلف لائبریریوں میں اس کے نشریات نظر آتے ہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ کہاں تھا

مخبر صادق ۔ یکم اپریل ۱۸۵۶ء کو میر اصغر علی نے اس محلہ سے ہفتہ وار اخبار مخبر صادق زیر ادارت مرزا اثر محمد[1] جاری کیا۔

امامباڑہ نواب میر مرزا صاحب ۔ گولہ گنج کے امامباڑوں کا ذکر ہم عنقریب شروع کرتے ہیں اس امامباڑہ کا اب کوئی پتہ بتانے والا نہیں ہے تیس برس پہلے کا یہ مطبوعہ نوٹ اور اس امامباڑہ کی مجلس کا اعلان میرے سامنے ہے ظاہر یہ امامباڑہ محمد یوسف کاظمی کے مکان کے قریب تھا

حکیم صادق صاحب ۔ آپ[2] سادات کے ہر دلعزیز طبیب اور شاہی حکیم تھے نہایت خوش رو اور گورے شخص تھے مقیم الدولہ راجہ نواب علی خاں آف محمود آباد اور حکیم صاحب سے بہت روابط تھے رہنے والے سمرود کے تھے اور مطب گولہ گنج میں تھا گرمیوں میں ململ کا کرتا چوڑی گوٹ لگی ہوئی ٹخنوں کے نیچے تک پہنتے تھے ٹوپیاں ان کا نام جاتا درست سی کلیاں طرحداری کی وجہ سے اس میں پڑی رہتی تھیں شفاء الملک حکیم میرن صاحب آپ کے شاگرد رشید اور بھتیجے چچا کی یادگار تھے سلسلہ نسب ان کا یہ ہے۔

حکیم صادق	حکیم مرتضیٰ
حکیم سید فضل علی عرف میرن شفاء الملک	سید لطیف حسین عرف سید و وکیل حیدرآباد گراں گوش اور ثقل سماعت
حکیم سید محمد قاسم عرف صاحب عالم و برادران	تھا آخر عمر میں لکھنؤ آئے اور یہاں تک مرید امامباڑہ غفران مآب
جن کی اولاد کراچی اور حیدرآباد وغیرہ میں ہے	دفن ہوئے۔

حکیم فضل علی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فارسی ترک کر کے اردو میں نسخہ لکھا ورنہ اس کے قبل اطبا فارسی میں نسخے لکھتے تھے

مولوی انور علی ۔ گولہ گنج میں مشہور مولوی تھے خوشنویسوں میں نام تھا شاہ عبدالرحمن سے سلسلہ مریدی تھا اور ان کی کتا—

---

[1] ورالند ردساعون ممتاز اور خوش ضمیر مطبوعہ ۱۲۸۲ھ و یکم اعوام حاشیہ رمیہ۔

[2] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

[3] مختصر سوانح عمری شفاء الملک حکیم میرن صاحب

تسویدالرحمن کا آپ نے اردو میں عام فہم ترجمہ کرکے ارشادالرحمن ۱۲۹۹ھ میں مطبع شام اودھ سے چھاپ کر شائع کیا۔

<u>جعلیئے میرن</u> :۔ ایک منڈی گولہ گنج کے قریب کے رہنے والے تھے جنھوں نے نقلی دستخط، فرضی دستاویزات، جعلی تحریریں بنانے میں خوفناک مہارت پیدا کی تھی ۱۸۹۰ء کے پہلے یا بعد کا ذکر ہے کہ فریب کاری کھل گئی اور مقدمہ چلنا شروع ہوا ہفتہ وار اخبار تفریح لکھنؤ میں عدالتی کارروائیاں چھپتی تھیں اور یہ اخبار ایک پیسہ کو نولکشور پریس سے چھپ کر نکلتا تھا آخر میں سزا ہوئی اور سلسلہ مقدمات کچھ شخصیتوں کی طرف سے روک دیا گیا ورنہ معلوم نہیں کون کون اور ماخوذ ہوتا بعض نامور وکیل کہتے رہے ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

<u>حیدر خاں گویئے</u> :۔ سلطنت اودھ میں موسیقی کو بھی فروغ ہوا اور خوصاحبان کمال یہاں ہوئے وہ اپنے وقت کے تان سین ہے چنانچہ عہد غازی الدین حیدر بہادر میں حیدر خاں کا ایسا خوش گلو اور ماہر فن کوئی نہ تھا ان کے کمالات کے تذکرے مدتوں زبان زد رہے۔

۸ <u>محمد ہادی رسوا</u> :۔ تیرہویں صدی کے آخری صاحب کمال تھے شمس العلما سید محمد ابراہیم مجتہد سے تلمذ تھا علوم مشرقیہ اور مغربیہ پر یکساں عبور رکھتے تھے کیننگ کالج لکھنؤ نے ان کے علمی خدمات کو بلغز حاصل کیا۔ آزاد مزاج اور بے پرواہ طبیعت کے آدمی تھے کبھی کئی دن کالج میں جاتے تھے اور جب جاتے تھے تو جس شعبے کا پروفیسر غیر حاضر یا رخصت پر ہوتا اس درجے کے طلبا کو آسانی سے پڑھاتے اردو ادب میں بھی ان کا نظیر نہ تھا نمونہ سخن سے

چٹکیاں ملتی ہیں سوز عشق کی تاثیر سے — چارہ گر پچھتا رہا بدلہ ہے تو آتشگیر سے

(ولہ) کربلا جنت میں جا پہونچے تو میرا کیا قصور — خود زمیں اٹھی نہ اٹھا میں در شبیر سے

(ولہ) دست قدرت نے جو زینب کی ردا تیار کی — کتنے ہی رشتے نکالے چادر تطہیر سے

(ولہ) کھینچ گیا گنج شہیداں کا مرقع بے مثال — پھوٹ نکلے ہیں بہتر رنگ اس تصویر سے

آپ نے ۱۹۳۱ء میں اس دنیا نا قدر شناس کو چھوڑا ۱۳۲۰ھ میں آپ نے امامیہ مشن کھولا تھا اور ایک پرچہ الحکم لکھنؤ سے جاری کیا جو علمی جریدہ تھا۔ دوسری تالیفات یادگار ہیں وہ بہترین ناولسٹ بھی تھے ان کے ناولوں میں جنون عاشق، خونی مصور، شریف زادہ، ذات شریف، امراؤ جان، خونی شہزادہ۔

رسوا کے تصانیف میں تحفۂ اثنا عشریہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی رد میں کئی جلدیں بڑی تقطیع پر تحفۂ سبہ شیعہ کانفرنس کے جلسۂ عام لکھنؤ میں مزدور ٹوکرے میں رکھ کر لایا تھا اور قوم نے اس عظیم تصنیف کی زیارت کی ان کے فاضل ورثہ نے یہ کتاب کتب خانۂ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں داخل کر دی۔ رسوا کے حالات ان کا عکس ادبی جرائد میں وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا ہے اور ملک کے طول و عرض میں ان کے شاگرد بھی لاتعداد ہیں منجملہ ان کے مولوی محمد حبیب اللہ رشدی دکھن کے عظیم صحافی تھے جنھوں نے پدرتا دیو یورسٹی سے ایم اے کیا اور نظام گزٹ جاری کیا آخر میں ہفت روزہ ابلاغ کی ادارت کی اور ۱۹۶۶ء میں رحلت کی۔ ان کی ناول امراؤ جان ادا کا روسی زبان (تاجکستان) میں ترجمہ ہوا ہے۔

سرگزشت لکھنؤ ص ۹۱ ؎ دیکھو کتاب کریم ۵ ترجمۂ ابراہیم ؎ روزنامہ جنگ کراچی صفحہ ۱۲ فروری ۱۹۶۹ء ؎ جنگ ۱۲ فروری ۱۹۶۹ء

فیروز فنا الدولہ :۔ گولہ گنج میں ان کا بھی مکان تھا پستا ہی خواجہ سرا بڑے مالدار آدمی تھے مرزا دبیر ان کی مجلس میں پڑھا کرتے اور بڑی مہر کی اور خواندگی ہوتی تھی۔ دبیر کی وفات کا ان پر گہرا اثر تھا والد کے بعد جب مرزا اوج صاحب کسی تعزیت میں ان کے یہاں گئے تو دلی تمنا ظاہر کی کہ وہ مرحوم کا پختہ مقبرہ بنوانا چاہتے ہیں اوج نے انکار کیا کہ ان کی وصیت ہے کہ غیر کے روپیہ سے نہ بنے۔ فیروز نے اوج کو رخصت کرتے وقت ہزار روپے کا توڑا فیس میں رکھ دیا کہ اگر یہ خدمت قبول نہ کی تو میں خودکشی کر لوں گا مرزا اوج نے بعد چند دن کے ان کا جوش کم ہونے پر یہ رقم واپس کر دی (حیات دبیر)

اخبار اودھ :۔ ۱۸۸۸ء میں عاشق علی عاشق نے گولہ گنج سے یہ ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

قاری یعقوب علی خاں نصرت :۔ گولہ گنج کے باشندوں میں مشہور شخص علم قرأت اور شعر و سخن میں ممتاز فن شاعری کے ماہر مشرقی تہذیب کے مجسمے۔ قوم کے معمار تھے ممتاز العلماء فخر المدرسین کی صحبت میں مقدر نے پہونچایا مجھ سے خود کہتے تھے کہ میں نے تقرب کی صورت یہ پیدا کی کہ جب بازار سودا لینے جاؤں تو جو دو پیسے کی ڈیوڑھی سے منگائی جائے وہ میں تین پیسے کی لاؤں اور اندر سے باہر تک تعریفیں ہوں کہ بڑا ایماندار شخص ہے اسی طرح سودا سلف لاکر عزت حاصل کی۔ ادھر فیض صحبت نے دینیات کا ماہر بنانا شروع کیا۔ شاعری لکھنؤ کے یکے والے تک جانتے تھے مگر کم ہوں گے ایسے جو موزوں طبیعت نہ ہوں استادوں سے فن حاصل کر کے شاعر ہوئے کسی قاری نے قرأت سکھا کر قاری بنا دیا یہ سب صدقہ تھا ممتاز العلماء کی کفش برداری کا ورنہ اس وقت کے اساتذہ شاگردوں سے کام لیتے تھے قرأت کا چلہ سوا لیتے تھے اور سستے کو شاگرد نہیں بناتے تھے رفتہ رفتہ صاحب جائداد ہو گئے مگر بڑھاپے میں آخر عمر تک "کتی سوتی" کو یادگار سمجھ کر گھر میں رکھا اور ہر مرحلے میں عزت کی زندگی بسر کی آخر وقت ۱۹۱۹ء میں جو مقدمہ اولاد ممتاز العلماء کے خلاف دفعہ ۹۲ کی تحت میں دائر ہوا اس میں مدعی کی طرف سے گواہی دی اور ۱۳۴۲ھ میں بغیر اولاد نرینہ چھوڑے ہوئے دنیا سے گذر گئے بیٹیوں کی اولاد موجود ہے نمونہ سخن ملاحظہ ہو ؎

اے مومن جب ضعف میں قصد بیاباں ہوگا — دست وحشی میں عصا جائے گریباں ہوگیا

کوشش انساں سے کیا ہوتا ہے ہونگے وہی — لکھ دیا تقدیر میں جو کاتب تقدیر نے

نصرت کے انتقال پر اخبارات نے نوٹ لکھے اور ان کی رحلت سے قدیم تہذیب میں خلا واقع ہوا۔

مسجد آتو جی :۔ یہ مسجد بہت کشادہ اور بلند خوبصورت عمارت ہے اگرچہ بہت زور و شور سے بنتے ہوئے مالہ پر بنائی گئی ہے مگر اپنے بائیں آباد دو سڑکیں ہونے سے پُر رونق ہے مینار زیادہ اونچے نہیں ہیں اور چھت پر خلاف دوسری مسجدوں کے پانچ گنبد ہیں بڑا پھاٹک وزیر گنج سے گذرنے والی سڑک پر اور چور دروازہ حکمت نرائن روڈ کی سمت تھا جو اب بند ہے صحن میں املی کے بڑے درخت پانی کا حوض چبوترے کے پہلو میں حجرے ہیں مسجد دور سے دکھائی دیتی ہے۔ رئیسوں کے محل میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاق کی دیکھ بھال جس عورت سے متعلق ہوتی ہے وہ آتو کہلاتی ہے آتش کہتے ہیں ؎

جھانکا تو نہ کر عبث فضیحت ہوگی — آتو یہ سنیں گی تو قیامت ہوگی

عبد الغنی نے ان کے چال چلن پر تاریخ اودھ میں متضاد بیان سپرد قلم کیا ہے اور یہ نہ سوچا کہ جس عورت کا کردار مشتبہ

۱؎ نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

ہو وہ آغا کے عہدے پر نہیں آ سکتی دو کاتبوں سے ان کی محبت اور راجہ جھاؤلال کی منظور نظر عورت کی خدمت میں عہدہ خواص حاصل کرنا صحیح نہیں ہے۔ آغا جی کا تلاش معاش میں روشن الدولہ کے گھر آنا اور حکیم مہدی کا ان کو قدسیہ بیگم کے محل میں پہونچانا قصہ گوئی اور بادشاہ کی سرکار میں تقرب اور بہ فروغ کر بادشاہ بیگم کے کھانا کھلاتے دسترخوان جل گئے اور پھر آغا جی کا نان وشبینہ کو محتاج ہونا وہ بیانات ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ آغا جی عمر کے کسی حصے میں تنگدست نہیں ہوئیں ان کا قدسیہ بیگم کی طرف سے پانچ ہزار روپے روز محتاجوں کو بانٹنا تاریخی واقعہ ہے ان کے بیٹے کا نام قادر علی خاں تھا اور مسجد مغلیں کی تعمیر کردہ ہے ماں کے نام پر پبلک نے مسجد کا نام مشہور کیا تیرہویں صدی میں مسجد کے آخری متولی قادر علی خاں تھے اور اب ان کی نسل ختم ہے

امامباڑہ داروغہ میر واجد علی :- میر واجد علی پسر میر عباس ڈیوڑھی سلطان محل کے داروغہ تھے شاہ اودھ نے مثنوی میں خود ان کا ذکر کیا ہے ؎

میرا ایک ہمت مدار داروغہ تھا   وطن سے یہ خط اس نے مجھ کو لکھا
جو واجد علی کی پڑھی عرضداشت   وہ حاصل ہوئی تھی مجھے وقت چاشت[1]

سلطان محل کے پاندان کا خرچ دو ہزار روپے ماہوار تھا۔ انقلاب سلطنت کے بعد وہ کلکتہ نہیں گئیں اور غدر میں میر واجد علی کے مشورے پر دو یوروپین خواتین کو اپنی محلسرا میں چھپایا اس رحمدلی کے صلے میں ان کی جاگیر برقرار رہی لوٹ قبضے میں رہے۔ میر واجد علی کے سیاسی کارنامہ اور اس پر آشوب دور میں ملکہ کو بچانا اپنی جان کو خطرے سے دور رکھنا حد درجہ قابل تعریف ہے امامباڑہ محلہ کی ایک قدیم مسجد کے قریب میر واجد علی کے اہتمام سے بنا اور عام دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ مسجد بھی میر واجد علی کی تعمیر اور جز امامباڑہ ہے مسجد میں دوسری عمارتوں کے برخلاف پتھروں کی جڑائی بتاتی ہے کہ اس کا امامباڑہ سے تعلق نہیں اور یہ عہد قدیم کی یادگار ہے۔ مسجد کا ایک حجرہ سنگی فرش سے کسی زیر زمین دفینہ یا قبر کا پتہ دیتا ہے۔ امامباڑہ میں معمولی درجے کا پھاٹک کشادہ صحن پہلوؤں میں کمرے مع سہ نشینیں تین درجے اور صحنچیاں ایک منزلہ عمارت ہے غربی صحنچیوں میں بالائے بام کچھ کمرے ہیں۔

امامباڑہ میں عشرہ اور شبوں میں معمولاً مجلسیں ہوتی ہیں اور وہ مہندی شہرۂ آفاق ہے جو ساتویں محرم کو وکٹوریا سٹریٹ سے اٹھ کر گولہ گنج آتی ہے ۱۹ رشعبان ۱۲۷۵ھ کو سلطان محل نے پچاس ہزار روپے کے پرامیسری نوٹ اور دو ہزار روپے ماہوار کی جاگیر اور دس ہزار روپے کے جواہرات اور سات ہزار روپے مالیت کے باغ جلوس مہندی کے لئے وقف کئے مہندی اب تک داروغہ صاحب کی اولاد کے زیر اہتمام اٹھتی ہے۔

میر واجد علی کے آثار باقیہ میں امامباڑہ غفراں مآب کی وہ امداد ہے جو انھوں نے ایک دروازے کی صورت میں قائم کی۔ اور امامباڑہ کی مرمت میں بھی حصہ لیا۔ اس دروازہ کا سنہ تعمیر اس قطعہ سے ظاہر ہے ؎

ایں تعزیت سرا کہ ز غفراں مآب ہست   ماسد کعبہ قبلہ حاجات مرد و زن
ایں جا ہزار مرتبہ مجلس بپا شدہ   از قطرہائے اشک فتادہ در عدن

---

[1] مثنوی حزن اختر ص۱۴۵

ہر مشہور و معاق سے دہر خیرہ اش	پاکیزہ منزل مرکاست بے سخن
این خوابگاہ مجتہد العصر والزماں	سید محمد است و حسین است و ہم حسن
در ہر مقام وسے کرستوں ستادہ است	سرو لیست از حدیقہ و شمعیست در لگن
چوں از جہانِ دہر دراں رخنہ فتاد	بشکست خامہ دل ما از غم و حزن
والا نژاد سید واجد علی شاہ	توفیق یافت زحد او مدد ذوالمنن
یکجا سعادت دو جہاں در مدوح اوست	در جا بعمد است تولائے بختن
از حب اہلبیت کہ دارد آب و گل	گردید در ما حسینیہ تطرہ زن
تکمیل تمام شد از اہتمام او	نامہ طلسم بیت نہ کلک زماں من
دروازہ جدید سا کرد یک طرف	چوں اب سہ ہیں روی جانجس
دو شبہ التماس من گرد عالے	آ ہے سا کر پسند اہل فن
چوں مجدم ز جامہ من یکت رتبہا	با رضا کشود و وصد با دمتن
گل کرد سال این ہمہ تعمیر از قلم	ستدہ و مو سائے عزا خانہ کہن ۱۲۹۰ھ

یہ دروازہ میڈیکل کالج کی سمت ہے جو ایک میر واجد علی کی یادگار ہے۔

میر واجد علی کو شعر وسخن سے بھی ذوق تھا اور سفیر تخلص تھا میر حسن ولد ع ان کے بیٹے اور حضور سید حسن مہر نواسے تھے۔

میر واجد علی نے ۱۴ دسمبر ۱۸۹۵ء کو داعی مفارقت دیا۔ وہ اور سلطان محل دونوں اس امامباڑہ میں دفن ہیں اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں کی قبروں سے امامباڑہ بھرا ہے۔

اس امامباڑہ کے قدیم ذاکر میر تقی شاہ تھے جو مقبرہ جناب عالیہ میں رہتے تھے اور امامباڑہ کے مجالس کے لئے مخصوص تھے

علی بخش :۔ باورچی عہد نصیر الدین کا کھانا پکانے والا عہدہ کے عہدار رہ میر واجد علی کا نوکر ہوا اس سے پوچھا گیا تھا تو اس نے کہا کر سال بھر تک دونوں وقت اردیاں سی طرح بنا سکتا ہوں یکم اکتوبر ۱۹۱۰ء کو لکھنؤ میں اس کا جام عمر لبریز ہوا۔

چھوٹے صاحب :۔ گولہ گنج میں عہد امجدی میں اس نام کی ایک طوائف رہتی تھی جو گانے اور ناچنے میں جواب نہ رکھتی تھی اس کی ہمعصر چینی جان، نورجہاں، امراؤ جان وغیرہ تھیں۔

ممتاز محل کی ڈیوڑھی :۔ آپ شاہ غازی الدین حیدر کی ملکہ تھیں اور اشرف الدوران کا علیں ان کے رشتہ دار تھے شاہ نصیر الدین حیدر انھیں بیگم کے پیٹ سے تھے اور وثیقہ گیارہ سو روپے ماہوار تھا وہ محل کے قریب قصر شاہی میں رہتی تھیں وہاں سے گولہ گنج آگئیں اور عالیشان قصر بنوایا جو زمانہ گزرنے سے گر چکا بیرونی پھاٹک اور مسجد باقی ہے اس مسجد سے چوک منڈی کو راستہ جاتا ہے۔

امامباڑہ ملکہ زمانی :۔ یہ امامباڑہ محلہ گولہ گنج تکیہ پیر جلیل کے سامنے شاندار عمارت کی صورت میں موجود ہے محترمہ بانی امامباڑہ حضرت نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کی ملکہ تھیں امامباڑہ کا نقشہ شہر کے دوسرے عزاخانوں سے بالکل الگ ہے۔ پھاٹک عظیم الشان بلندی پر پہرہ داروں کے کھڑے ہونے کی جگہ اور دیدہ بان کا مقام بڑی خوبصورتی سے بنایا گیا ہے بڑی لمبی چوڑی

انگنائی جس میں لق و دق نہر کے بعد عمارت شروع ہوتی ہے پہلو میں دو منزلہ صحنچیاں اور علما کے شریک مجلس ہونے کا ٹھکانا چوڑے دالان مسند نشین حق کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ امام باڑہ اپنی وسعت کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے۔ امام باڑہ آصفی، امام باڑہ جھاؤلال، امام باڑہ ملکہ زمانی بزرگ ترین عمارتیں ہیں ممکن ہے کہ امام باڑہ جھاؤلال کو اس سے تھوڑی کی نسبت حاصل ہو پیمائش پر لانے کا صحیح حال معلوم ہوسکتا ہے۔

امام باڑہ کی تیاری محمد احسن خان کے زیر اہتمام ہوئی اس امام باڑہ کے علم اتنے وزنی تھے کہ ایک آدمی مشکل سے ایک علم اٹھا سکتا تھا امام باڑہ کا سال اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے ؎

جناب ثانیٔ مریم معظمہ ملکہ — کہ در زماں ندارد نظیر خویش اصلا
امام باڑہ بنا کردہ بدل بے مثل — عیاں بروئے زمیں شد سا عرش علا
باہتمام جناب محمد احسن خاں — بطرز نو شدہ تیار ایں خجستہ بنا
بنا خلد بگویم اگر روا باشد — چرا کہ ہست مزار امام راہنما
امام آنکہ فدا سر نمود بہر امم — قتیل تیغ جفا و ذبیح راہ خدا
کلیم فکر رسا گفت سال تاریخش — امام باڑہ[1] بے مثل سید الشہدا ۱۲۵۶ھ م ۱۸۳۷ء

ملکہ زمانیہ کے باورچی خانے کا تین ورق روپیہ[2] روزانہ کا خرچ تھا اور سیکڑوں فقیر غریب دسترخوان سے پرورش پاتے تھے سو برس سے زیادہ گذر جانے پر عمارت کی حالت قابل رحم ہے منقولہ سامان کب تلف ہوا اس کا کوئی پتہ تاریخ میں نہیں ہے اب جامہ اصلی بھی اتر رہا ہے یہاں تک کا کچھ حصہ گر گیا۔ عمارت کی دیواریں رہ رہیں استرکاری نے ساتھ چھوڑ دیا لکھوری اینٹیں دکھائی دے رہی ہیں نہر جس سے صحن کے دو ٹکڑے ہوتے تھے خود پاش پاش ہے یہ وہ ملکہ تھیں جن کے آٹھویں دن درگاہ حضرت عباسؑ جانے میں دس ہزار روپے خیر و خیرات اور نذر و نیاز میں صرف ہوتے تھے آج ان کے عزا خانہ میں ایک چراغ بھی نہیں ہے وہ بتاریخ ۲ دسمبر ۱۸۴۳ء اس دنیا سے کوچ کر گئیں اور امام باڑہ میں سات برس عزاداری کرنے پائی تھیں عہد محمد علی شاہ بہادر میں اسی امام باڑے میں سپرد خاک ہوئیں۔

امام باڑہ کے سامنے سڑک کا ایک حادثہ عبرتناک

تاریخ اودھ میں نجم الغنی نے اس امام باڑہ کے سامنے نواب امداد حسین خاں پر دشمن کا اچانک حملہ ہو جانے کو اس قدر مکروہ انداز[3] میں بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وزیر کا کوئی وقار عوام میں نہ تھا اور بدنظمی اس حد پر پہونچ گئی تھی کہ نواب کو گاڑی سے کھینچ کر پیٹ دیا اور یہی بے عزتی ان کے عہدۂ وزارت سے سبکدوش ہونے کا سبب ہوئی۔ دوسری تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس حملے میں طرفین سے تلوار چلی تھی اور وزیر اودھ[4] کے ساتھ دشمن بھی زخمی ہوا اور اس سفاک کا حملہ انگریز حکام پر بھی ہو چکا تھا واقعہ یہ تھا کہ شیخ فضل علی ملزم جیل سے بھاگ کر شہر میں روپوش ہو گیا تھا اور ایک دن ڈپٹی کمشنر گونڈہ لے بایو صاحب پر بھی چار سوار کے ساتھ حملہ کر چکا تھا وزیر اودھ پر حملے میں بھی وہ کامیاب

---

[1] دیوان برق [2] گلدستۂ لکھنؤ ص ۲۱۳ [3] تاریخ اودھ ص ۱۲۶ ج ۵ وغیرہ
[4] وضعداران لکھنؤ ص ۳۲

۱۰ آخر میں لفٹیننٹ لارنس نے نیپال کی حد میں وادی سے مقابلہ کر کے فضل علی اور ساتھیوں کو قتل کیا ظاہر یہ کامین الدولہ کا بیٹا تھا جس نے ۲۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا تھا۔

۱۱ مبارک کے ساتھ پچھم کی طرف بہت بلند ایک مسجد بھی ہے جو اپنے حدود اور خوشنمائی میں دوسری مسجد ولیسے کسی طرح نہیں ہے اور پشت کا دروازہ مقبرہ جناب عالیہ کے محاذ میں واقع ہے اس مسجد کو اہل محلہ نے کسی قدر اچھی حالت میں رکھا ہے اس مسجد کا منارہ برخلاف دوسری مسجدوں کے پہلوؤں کے بیچ میں ہیں اور اس مسجد کا اصلی نقشہ ایک یورپین عورت نے کئی دن میں تیار کیا تھا۔

<u>مقبرہ جناب عالیہ:</u>۔ سربلند اور پرشکوہ عمارت ہے یہاں نواب سعادت علی خاں بہادر کی والدہ دفن ہیں زیجوں کے بعد مدفن ہے گرد قبہ کے وسیع آراضی پر چہار طرف رہائشی مکانات اور بہت اونچا پھاٹک ہے جس میں کبھی فقد دروازے تھے جو مد دزار سے یہ آراضی اہل کشامرو کے قبضے میں ہے۔ ان کے اودھ میں داخلے کی مختلف حکایتیں ہیں اور مشہور اس بات کو ہے کہ دریہ علیخاں آصف الدولہ کے لے پالک کی جب شادی ہوئی تو لکھنؤ دو بہن کی طرح سجایا گیا دور دور سے لوگ آئے مہاراجہ کشمیر نے شرکت کی اور شالی تحفے میں مع خدم وحشم، رونق افروز ہوئے علاوہ دستکاران واس دولت بھی ساتھ ہو گئے تھے جب راتی رخصت ہوئے تو نوعبار و مہمانوں نے اکثر عارضی طور پر رک گئے اور مہاراجہ کے ساتھ۔ جانے کے اور شہری دلچسپیوں میں ایسا فریفتہ ہوئے کہ نواب کو عرضی دی کہ ہم کو وطنی قرار دیجئے۔ حکم تھا کہ اگر مہاراجہ بھی پسند کریں تو کیا مضائقہ ہے ان رہ جانے والوں میں زیادہ تر شال بافے والے کاریگر تھے اور کچھ افراد ذی داخل شیعہ کے تھے اجازت وطن ملنے پر کچھ لوگ کڑے لو تراب خاں میں سکونت پذیر ہوئے اور داروغہ رمضان علی کی نسل وہاں رہی۔ شال بنانے والے دریا پار چلے گئے اور وہاں کشمیری محلہ سب سے پہلے آباد ہوا۔ کچھ غیر مسلمین نے رستم نگر کے پہلے محلہ بسایا چنانچہ جو ہندو کشمیری محلہ میں اب تک ہیں وہی نسل ہے ان میں بھی ادیب، شاعر، قانون داں اور معزز طبقہ اور اعلیٰ تعلیم کے اصحاب موجود ہیں ایک گروہ کوئی بہرہ جانا تھا۔ اس کو کھیل تماشے کی سوجھی اور شادی بیاہ میں ناچ گا کر زنانہ لباس پہن کر جوتیاں سر میں رکھ کے پیٹ پالا۔ لکھنؤ کی مردم خیز اور علم نواز زمین نے کشمیریوں کو بڑے بڑے درجوں تک پہونچایا وہ عقل وفہم اور خوبصورتی دونوں سے آراستہ تھے۔ مقدر راستے سے ملا۔ لکھنؤ پہونچ کر تدبیر نے تقدیر میں جوہر پیدا کئے اور اپنے عقل وشعور کی مدد سے بڑے بڑے عہدوں تک پہونچے۔ بار ویران ہوا اور ان کی آخری قیامگاہ جس میں حسن حدملت کا صنعت بھی کارفرما تھا مقبرہ جناب عالیہ قرار پائی جس پر وہ آج تک قابض ہیں۔

بعض کو دعا تعویذ کا شوق ہوا شیخ محمد جان شاد کہتے ہیں ؎

کیا محتسب شہر کے نائب کا لکھوں حال   کماس کا دلال ہے کشمیر کا رمّال

اگر کسی گھر میں غمی ہو جاتی تو اس طبقے میں ایسے بھی تھے جو غسل وکفن کے لئے خود آمادہ ہو جاتے میت کے گرد قرآن خوانی ہوتی ہے تمام رات تلاوت کلام اللہ میں بسر ہوئی۔ عزیزہ طبقہ ان کی پرخلوص خدمت کی جزا بھی دینے پر تیار رہتا جو دوشالہ میت پر اڑھایا جائے وہ ان کا۔ جس چھپر کھٹ یا مسہری پر وقت آخر دم نکلے وہ انھیں کو دیدیا جائے وہ جس کو چاہے دیدیں اسی طرح جسم میت کے کپڑے

---

۱۰ اخبار الاعظم ۱۹ صد یکم مئی ۱۹۵۸ء و ۲۶ر مارچ ۱۹۵۸ء اریا مدور لکھنؤ صفحہ ۲۵-۲۷ بابت اگست ۱۹۵۸ء

اس کے علاوہ عاشقی جوڑا عرق ہر طرح خدمت کی جاتی تھی اور دم نکلنے کے وقت کی سورۂ یٰسین سے آخری تلقین تک تمام خدمتیں یہ انجام دیتے گویا خداشناس اور احکام میت سے ماہر یہی طبقہ تھا زنانی میت کی تجہیز و تکفین مشرف ہوتے سے پہلے میت کے قریبی ورثہ پہلے سنار کے یہاں آدمی بھیجکر "بتانا" بنواتے اور تولہ بھر یا دو تولہ سونے کی ایک جوڑی الٹی جلد سادی موڑ کر میت کے ہاتھ میں ڈال دی جاتی یہ غسل دینے والے کا ایک پر تکلف حق خدمت تھا جس کو مل جاتے ہوئے وہ میت کو آرام سے نہلائے اور یہ نہ ہو کر بعد غسل اجرت سمجھ کر کچھ دیں جو مذہبی لحاظ سے خالی از اشکال نہیں - بتانا گھٹ کر اب ایک چھلے کی صورت میں یہ رسم رہ گئی - ابتدا میں تو ان حضرات نے یہ خدمت قربۃ الی اللہ انجام دینا شروع کی تھی جب روایتی ثروت نہ رہی تو رفتہ رفتہ اس خدمت کو بعض نے پیشہ قرار دیا اور اقتدار دولت اور وہ ختم ہونے پر جعفر علی غسال اور پھر نواب علی غسال رئیسوں کے مردے نہلاتے تھے - اول الذکر بڑے مالدار اور صاحب ثروت تھے نواب علی کی نسل نے کام چھوڑ دیا اور امیری اور غریبی کا فرق اٹھ جانے کے بعد اب ہر مرنے والے کو وہی غسال غسل دیتے ہیں جو ہمیشہ عام اموات کو نہلاتے رہے - اس وقت امرا فخر سے بیان کرتے تھے فلاں مرنے والے کو ابل کشا مرنے غسل دیا۔

کشمیریوں میں قابل فخر ہستی پنڈت جگت نرائن وکیل اور ڈاکٹر ہری ہر ناتھ کو وہ مشہور اور باکمال لوگ گذرے ہیں جن پر لکھنؤ کو بجا طور پر ناز تھا اور ان کے قانونی وطنی خدمات زمانہ صدیوں فراموش نہ کرے گا۔

علم جفر کے جاننے والے مقبرہ میں میر مہدی صاحب مرحوم کے بیٹے مولوی سید ابوالحسن تھے جنھوں نے الواح الجواہر کا اردو ترجمہ کیا - یہ کتاب عربی میں افلاطون کی طرف منسوب ہے ۱۳۰۱ھ میں اخبار محمدی میں طبع ہوئی قواعد تسخیرات و اصول دونوں میں بہترین ذخیرہ ہیں - موصوف کی کسی اور تصنیف کا اور سنہ وفات کا علم نہیں یہ مؤلف مجمع قاعدہ کے علاوہ کوئی بزرگ تھے

کشمیریوں کے قبروں کے لئے ان کے دور رس اسلاف نے ادھر تو مقبرہ حکیم مہدی ادھر تلسی رام کا احاطہ مخصوص قرار دیا۔ چار کشمیری تمدن میں اسی گھر سے رائج ہوئی مگر شال کا کام بہت تھوڑے زمانے کے بعد ختم ہو گیا - کشمیری مجلسیں بھی اپنے رنگ میں مخصوص عزاداری تھی جو عہد داروغہ رضا حسین صاحب تک مقبرہ میں ہوتی تھی صبح سے شام تک فرش عزا پر نوحہ خوانی، ذکر اہلبیت حلقے کا ماتم ہوتا تھا ذاکر اپنی وطنی زبان کو سو برس نہیں کھولے - اب میرے خیال میں کوئی کشمیر زبان کا ماہر نہیں محمد صادق نامی کوئی بزرگ کشمیری زبان میں پڑھتے تھے جو ۶۰ برس کی عمر میں پٹنہ میں انتقال کر گئے مولوی شاہ محمد مرزا ذاکر تھے - مرزا عباس صاحب، میر تقی شاہ، مرزا محمد علی، سید نقی شاہ، حسن علی شاہ، حسین شاہ صاحبان منبر تھے مولوی سید احمد گوہر مرزا عرب جو صاحب قدیم روضہ خوانوں میں اور سید مرتضیٰ اور سید رضا میرے دور میں نامی ذاکر گذرے ہیں اور سر آمد ذاکرین میر محمد شاہ صاحب کی ہستی تھی جو اسی خاندان کے فرد کامل تھے ان کا حال اپنے محل پر لکھا - جو گروہ عہد آصفی میں وارد لکھنؤ ہو چکا تھا اس کے بعد بھی کشمیر کے اعلیٰ خاندان لکھنؤ کی طرف ہجرت کرتے رہے - لطف علی میر مشہدی ایک بزرگ سرینگر کے رہنے والے پونچھ میں منڈی جو شہر سے ۱۲ میل ہے آکر رہے - اس نسل کے رمضان علی نے شہر سے سفر عتبات عالیات کیا - بیل گاڑی اور کشتیوں پر منزل پہونچے - جاتا آتا تین برس کی لمبی مدت میں ہوا بجائے وطن آنے کے عہد محمد علی شاہ میں لکھنؤ آگئے اور رئیس کی حیثیت میں بڑی قدر و منزلت ہوئی ان کی نسل یوں بڑھی۔

کرم علی | فتح علی | عنایت اللہ علی

رمضان علی

آخوند میرزا قاسم علی ولادتش در لکھنو بود | حیدر علی ولادتش در لکھنو بود

فتح علی کے پوتے محمد دلی کلکتہ میں ہیں اور حال میں علم سے بے بہرہ ہیں مرزا قاسم نہ المعاش شرعۃ المعاش کے مؤلف جن کو کاتب دراق نے اپنی طفولیت میں دیکھا تھا ان کے بیٹے مولوی مرزا علی حسن معاصر فی الحال کراچی میں ہیں اور ان کی اولاد پشاور میں بحیثیت وطن مقیم ہے۔

خدمت خلق ۔ اہل کشمیرہ دینی لحاظ سے ملک میں قابل احترام تھے اور عام لوگوں کی مدد سخت اوقات میں پڑتی تھی کوئی بیمار ہوتا اس وقت دعا پڑھنے کے لئے مقبرہ سے کسی متولی کو طلب کیا۔ جنازہ گردہ کسی کے ہاں غمی ہوئی یہ لوگ جاتے گئے تجہیز و تکفین ان کی نگرانی میں ہوتی بعض قربۃ الی اللہ خدمت انجام دیتے تھے

مسجد ۔ مقبرہ میں داخل ہوتے وقت بائیں ہاتھ ایک مسجد واقع ہے یہ عمارت ہی کے کسی شخص کی بنوائی ہوئی ہے عمارت پرانی تھی پیچھے توخانہ تھا۔ زمانہ وزارت مسجد منہدم ہوگئی تھی ... شاہ مرحوم جو بڑے عبادت گذار تھے اس مسجد کو نئے سرے سے خود بنوایا اور سرداب بند کر دیا اس کا سنہ تعمیر تو باقی نہیں رہا دوسری تعمیر کا سال اس قطعہ سے دریافت ہے ؎

رئیس ذاکریں عابد یگانہ | فرید دہر یکتائے زمانہ
عیاں سب پر ہے یوں نام حق آگاہ | تقی کے نسل میرا اور بعد شاہ
ہوئے جب طالب سال اہل سنت | کہا دل نے عبادت خانہ صاف

بانی مسجد نے بڑھاپے میں ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی اور ... کسی رام میں دفن ہوئے

احاطہ فقیر محمد خاں

فقیر محمد خاں شجاع الدولہ کے غلام تھے اور اپنی سیاست سے نوبت حسن رضا خاں کے بعد وزارت کے عہدے پر پہنچے۔ حسام الدولہ کا خطاب پایا۔ لکھنؤ اس وقت علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ شعر و سخن میں بھی ناسخ کی شاگردی سے فیضیاب ہوئے ناسخ و آتش میں جو رقابت تھی ایک دوسرے پر چوٹ کرتا تھا اس وقت فقیر محمد خاں جن کا گویا تخلص تھا استاد کا پاٹ لیتے تھے ان کے سپرد نام ہوئے پر جو کچھ پھبتیاں ہوتیں دم گنا بیسا وغیرہ اس کے جواب میں کہتے ہیں ؎

ہے یقیں گل ہو جو دیکھے گیسوئے دلبر چراغ | آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ

دیوان گویا ۸۰۰ صفحات پر نولکشور پریس سے طبع ہو چکا ہے اور ان کی تصانیف سے بستان حکمت ترجمہ انوار سہیلی بھی ہے۔ جو پانچ سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ وزارت معتمد الدولہ میں فقیر محمد خاں نے کچھ دن تک ان پر بھی قابو پایا تھا اور حسن تدبیر سے فوائد اٹھائے وہ نصیر آباد کے جلوس خواہ امارت کو بند کرانا چاہتے تھے۔ تین سو دو پہلے سپاہیوں کو ساتھ لے کر سلطان العلماء کے پاس گئے۔ ان کو

فقیر محمد خاں کی ذہنی کروٹ کا اچھی طرح علم تھا ایسی گفتگو کی جس سے آنے والے لاجواب ہو سکے ۔ درگاہ حضرت عباس میں فقیر محمد خاں کا تبدیل مذہب کرنا اور حاضری کھانے میں یہ سیاست تھی کہ زمانہ نظامت میں فقیر محمد خاں پر کچھ اعتراضات جس کو وہ تبدیلی مذہب سے خطرات سے محفوظ رہے ان کے ادب نواز ہونے میں شبہ نہیں ہے آتش کی امداد ... تھا کہ ان کی جیب سے زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف ہوا ۔ زمانۂ تشیع میں مدح اہلبیت میں انھوں نے جو قصیدہ[۱] کہا منجملہ اس کے ایک مطلع یہ ہے ؎

چلے جو سہر صفت ہائے بوتراب[۲] قلم   تو رکھے کعبۂ ایماں میں پا تراب قلم

یہ قصیدہ تقریباً ۱۲۰ اشعار کا میں نے دیکھا ہے فقیر محمد خاں ۱۲۶۵ھ میں موت کی نیند سو گئے احاطہ فقیر محمد خاں سے ان کا نام باقی ہے اور وہ عالیشان عمارت بھی موجود ہے جس میں فقیر محمد خاں رہتے تھے ۔ کئی انتقالات کے بعد یہ مکان رئیس نواب حیدر مرزا کے ورثے میں آیا تھا پھاٹک کی صورت بالکل تبدیل کردی گئی ۔ اور اب اس عالیشان محل میں آر یہ یتیم خانہ ہے نواب حیدر مرزا ملکہ جہاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وقف حسین آباد کے ستاندار ٹرسٹی تھے ۔

فقیر محمد خاں فطرتاً ایسے عالی دماغ اور ذی ادراک تھے کہ درخت آم کا پتا سونگھ کر بتلاتے تھے کہ آم میٹھا ہے یا کھٹا ۔ (قدیم لکھنؤ صفحہ ۲۰۳)

نام باڑہ داراب علی خاں ۔ عہد آصفی میں نواب ناظر محمد داراب علی خاں خواجہ سرا ولد عبداللہ جوہر علی خاں کی جگہ پر مقرر ہوئے ہوشیاری، وفا، دیانتداری سے ترقی کی سرکار نواب ملکہ عہد رو جہ امجد علی شاہ مرحوم میں بھی کافی رسوخ تھا اور ان کی ڈیوڑھی کے نگراں تھے ان پر بہت اعتماد تھا چنانچہ اگست ۱۸۶۶ء کے وصیت نامہ میں اپنے چشم و چراغ مرزا سلیمان قدر بہادر کو مامور کیا کہ ناظر موصوف کو سو روپے ماہوار ملتے رہیں اس وقت اس امام باڑہ کو مولوی گنج میں شمار کیا جاتا ہے مگر قدیم حدات احاطہ فقیر محمد خاں میں قرار دے چکے ہیں اس لئے مؤلف نے قدیم رائے پر عمل کیا امام باڑہ اچھی حالت میں ہے محرم چہلم اور دوسرے مواقع پر مجلسیں ہوتی ہیں ۔ وقف کا دفتر پہلو کی صحنچیوں پر ہے ۲۹ اپریل ۱۸۹۱ء کے وصیت نامے میں امور خیر کے لئے ۵۲ ہزار روپے کی جائداد وقف کی ہے ۔ مرض تنفس میں مبتلا ہو کر میاں داراب نے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا اور لاش کربلائے معلیٰ گئی ۔ امام باڑہ لکھنؤ کے ایک معزز طبقے کی کمیٹی کے زیر نگرانی ہے ۔

تاریخ لکھنؤ میں لکھتے ہیں کہ جواہر علی خاں خواجہ سرا ملکہ کشور مرحومہ کے یہاں گولہ گنج میں ہر مہینے کی ۲۲ کو اور نواب ناظر یسرور الدولہ خواجہ سرا شاہی کے یہاں ہر مہینے کی ۱۲ کو مرزا دبیر صاحب مرثیہ پڑھتے تھے یسرور الدولہ کا مکان گولہ گنج میں اس ترتیب پر تھا جہاں سے اب ایک سڑک شفاخانہ درسکے سنگھ کو جاتی ہے مجلسیں بھی عہد سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ہوا کرتی تھیں اب نہ مکینوں کا نام و نشان ہے نہ کوئی مکان ہے لہٰذا

فلک نے ہیں کر برباد کردئے وہ محل   اجل یہ کس کی نظر کھا گئی مکینوں کو

(حیات دبیر صفحہ ۹۰) درسکے سنگھ سے مراد بلرام پور اسپتال ہے ۔

---

[۱] ذکر الخلفاء از مولوی محمد رضا حاشی صفحہ ۲۶
[۲] مجموعہ مادہ ہائے تاریخ صفحہ ۶۵ چھاپہ میرٹھ

ل لکھنوی :- منور خاں خاکی احاطہ فقیر محمد خاں میں رہتے تھے مصحفی کے شاگرد تھے ان کے کلام میں سوز و ساز، وصل و فراق سبھی کچھ ہوتا تھا مصحفی کا نام روشن کرنے میں ان کا شاگرد ہوا برسوں استاد کو یاد دلاتا رہا نمونہ سخن ملاحظہ ہو ؎

نگاہ یار رحم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے — کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے
مرقع ہے میری آنکھوں میں کیا یاران رفتہ کا — جو سطروں کے تلے ہر ایک کی تصویر پھرتی ہے
ترا دیوانہ جب سے اٹھ گیا صحرائے وحشت سے — بگولے کی طرح سے ڈھونڈتی زنجیر پھرتی ہے

۱۲۳۲ھ میں ان کا دیوان چھپا۔

مزار حاجی میر خادم علی شاہ :- حاجی میر خادم علی شاہ[1] اپنے وقت کے مشہور فقیر اور آزاد منش صوفی تھے ان کو دیوان شریعت کے مشہور فقیر حاجی وارث علی شاہ کی سگی بہن بیاہی تھیں انہوں نے حاجی وارث علی شاہ کو پڑھایا لکھایا اور خرقہ ولایت دیا۔ کرسچین کالج کا وہ حصہ جہاں پرنسپل کالج رہتے ہیں آپ کی قبر شریف ہے جو نظروں سے پوشیدہ ہے۔

تکیہ پیر جلیل

شہر میں مسلمانوں کے آثار قدیمہ کا سب سے پہلا مرکز ہے اور صوفیائے کرام کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالجلیل نے ۱۹ ربیع الآخر ۱۰۱۰ھ میں اس سرزمین[2] پر وفات پائی یہ بھی روایت ہے کہ پیر جلیل چار بھائی تھے دوسرے بھائی پیر محمد شاہ تیسرے صدر الدین عرف شیخ مہدی تھے۔

جھاؤ لال کا پل

جھاؤ لال وہی شخص ہیں جن کا حال امام باڑہ ٹھاکر گنج کے ذیل میں گزرا مقبرہ جناب عالیہ اور امین آباد کے درمیان میں ان کا بنوایا ہوا پل ہے جس پر سے گول دروازہ کی طرف سواریاں گزرتی ہیں اور پہلوؤں میں لوگ آباد ہیں محلے کے پرانے رہنے والوں میں کالکا کتھک اور بندا دین دو بھائی تھے جو ناچنے گانے میں یکتا تھے۔ اردو ادب میں ان کا ذکر ہے ؎

جان لیتی روح بندا دین کی ہے وجد میں — جب تبسم کو لب جاناں پہ رقصاں دیکھئے

بندا دین کو اپنی مشق پر اتنا قابو تھا کہ جب وہ پیروں میں گھنگرو باندھ کر ناچتا تھا تو جس گھنگرو کی چاہتا آواز نکلتی اور باقی جگہ سے نہ ہلتے جھاؤ تلے میں بھی بندا دین رہتا تھا۔

مولا بخش حلوائی کے یہاں ایک کوتاہ قامت آیا کرتا تھا اور خوب طبلہ بجاتا تھا۔ لوگ اسے سڑک کوٹنے کا درمٹ کہنے لگے اور یہی اس کا نام پڑ گیا۔

اودھ گزٹ :- اودھ اخبار کے بعد لکھنؤ سے اودھ گزٹ ۱۸۶۸ء میں مسٹر جیکٹ[3] نے جاری کیا اڈیٹر منشی گنگا پرشاد تھے۔ دفتر جھاؤ لال کے پل پر تھا۔

زرد مسجد

چوک سے مقبرہ جناب عالیہ کو چھوڑتے ہوئے شیشہ گر والی روڈ پر جو زرد رنگ کی مسجد بائیں ہاتھ پر پڑتی ہے یہ داروغہ غلام حیدر خاں

---

[1] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ سیلاب آرٹس اکتوبر ۱۹۵۸ء عام ایڈیشن [2] وفیات الاخیار [3] یادگار بابتہ دسمبر ۱۹۵۸ء

کی تعمیر کردہ عہد غازی الدین حیدر کی عمارت ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے۔ مسجد بغیر زینہ کی زمین دوز اور دو در جوں پر مشتمل ہے صحن سے رو کار پر نظر کرنے میں نمونے کے پھول بیل نازک پتیاں اور پتھر پر یہ اشعار نظر آتے ہیں ؎

غازی الدین حیدر ستہ ہمدمانی صد ہزار مسجد — ساخت دار وغہ غلام حسین چوں بعہدش بدیں معا مسجد
ثانی کعبہ خلیل آمد بہر ایجاب ہر دعا مسجد — گفت ہاتف ز سال تعمیرش ما دب ساختہ بنا مسجد ۱۲۳۶ھ

پہلے دالان میں نمازیوں کی دو صفیں اور صدر دالان میں تین صفوں کی جگہ ہے۔ پہلوؤں میں کامپ چونا کی کٹا قدا رجالی جو لاہو کا خاص ہنر تھا ساتھ خوبصورت دروں سے مسجد میں ساری آتے جاتے ہیں عمارت زیر اہتمام شاہد علی ایڈوکیٹ ہے اور امام جماعت محمد ادریس بہاری متوطن چھپرہ ہیں نمازیوں کا فرش پچھلے صحن کے پہلو میں کھجور کا درخت ہے اور کچھ مکانات ہیں مجموعی آمدنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔

اس مسجد کے سامنے ۱۸۵۷ء کے غدر میں آزادی کے حامی یکجا ہوکر دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے اور زمین پر بے گناہوں کا خون بہہ رہا تھا دلیری کے ساتھ لڑنے والوں میں ریاستی فوج اور بہٹوا منو کے چند سپاہی تھے۔ گوروں کا جب رخ گم کردہ راہ اور پردیسی سورے سے عیش باغ کی سمت ہو گیا تو لڑنے والے غلام حسین کی مسجد پہونچکر دوسروں سے کٹرے نبی بخش خاں وغیرہ سے قابل ذکر مقابلہ ہوا۔ اس وقت اس جانب بہٹوا منو کے تینوں بھائی اور ان کے برادر نسبتی شیخ احمد حسین فتحپوری اور میر حسین علی تیر گاؤں کے رہنے والے نبی بخش خاں مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی وغیرہ دیگر مصاحبین وخاص برادر جن میں حاجی اکبر علی محمود آبادی بھی تھے کے سوا باقی کل بیان ہوا اس راہ کی تحقیقات سے نہیں ملتی کہ یہاں طرفین سے بندوق چلنے لگی اولاً تجمل حسین خاں زخمی ہوئے ان کے ہاتھ پر گولی لگی حاجی اکبر علی نے بڑھ کر نبی بخش خاں کو اطلاع دی بعدہٗ کاظم حسین خاں زخمی ہوئے بائیں پیر میں گولی لگی پھر حاجی اکبر علی نے نبی بخش خاں سے کہا کہ دیکھئے چھوٹے صاحب بھی زخمی ہوئے نبی بخش خاں نے جھلا کر ان کو قریب سے ہٹا دیا اور کہا کہ تم جوان بھائی کا خون دکھا کر میرا دل لو دا کرتے ہو۔ اسی واسطے یہاں آئے ہو مرتے دو لڑو پیر پڑے یہاں نہیں بیٹھے نبی بخش خاں کی نسبت جیسا کہ بیان ہو چکا وہ جنگ میں نہایت کہنہ کار تھے مگر تجمل حسین خاں اور کاظم حسین خاں کا پہلا سابقہ ایسی باقاعدہ فوج سے مقابلے کا تھا مگر واہ رے حواس کہ حالت جنگ میں کاظم حسین خاں کی پتھر دار بندوق کا نشانہ خالی ہو گیا خاص سردار قریب کھڑا تھا اس سے دوسرا پتھر لے کر نہایت اطمینان سے بدلا پھر بندوق بھری نشانہ لگایا اس مدت میں مخالف کی جانب سے مینہ گولیوں کا برس رہا تھا نبی بخش خاں گوشۂ چشم سے دیکھ رہے تھے احمد حسین بھی زخمی ہوکر۔۔ نبی بخش خاں کی کنپٹی پر گولی لگی فوراً تیورا کے گرے اور شہید ہوئے میر حسین علی بھی کام آئے خدا کو بات رکھنا تھی۔ گورے منہ پھیر کر پلٹ گئے۔ مارٹین کی کوٹھی کی جانب سے جو سڑک شہر میں آتی ہے اس طرف سے داخل ہوئے بیگم صاحبہ کو عزت و آبرو کے ساتھ شہر سے نکل جانے کا موقع ملا قریب ظہر یہ لڑائی ختم ہوئی۔ نبی بخش خاں میں ہنوز جان باقی تھی کاظم حسین خاں نے اپنے کو جس طرح سا ان تک پہونچایا چہرے پر آزردگی پائی سمجھ گئے کہ ایک ہمدرد کی لاش ان کے ہم پہلو ہے اس کا خون ابل کر ان کے قریب آ رہا ہے اس سے کراہت ہے فوراً اس لاش کو ہٹا دیا ادھر نبی بخش خاں کی روح نے مفارقت کی انھوں نے دو فرزند چھوڑے بادشاہ حسین خاں مرحوم دوسرا درحسین خاں جو حی القائم ہیں اس لڑائی میں ۹۔ ادھر کے مجروح و مقتول ہوئے ۱۸۵۷ء

[illegible]رت کے کام آئے وہ ہمراہی جدا سے کی تحقیق میں گئے تھے پلٹ کر آئے کہار و مینس مہیا کی لیے مجروحین و مقتولین [illegible]کو فرودگاہ پر آئے یہاں دیکھا تو گوروں نے قبضہ کر کے کل مال و اسباب لوٹ لیا تھا دوسرے روز صبح ہوتے [illegible]پہنچے تینوں بھائیوں کی پینس زنانہ مکان میں رکھی گئی نبی بخش کی والدہ نے آکر تین جوان بیٹوں کا یہ حال [illegible] اور حلق میں جاں بلب اور ایک کا کام تمام ہو چکا ہے۔ کہا خداوندا شکر ہے تیرا، یہ لوگ لڑ بھڑ کر اس طرح میرے سامنے آئے ہیں خاندان کا نام رکھ لیا میں راضی اور دودھ بخشتی ہوں مقتولین دفن اور مجروحین کا علاج ہوا۔ بیگم صاحبہ مع مرزا برجیس قدر شہر خالی کر کے گھاگھرا پار اتر گئیں لکھنؤ میں سرکاری عملداری ہوئی مگر باہر قتل و قمع لوٹ مار انگریزی فوج کرتی رہی (آثار باد کا ص ۱۲۲ - ۱۰۳)

روشن الدولہ کی کوٹھی

یہ کوٹھی بادشاہ اودھ نصیر الدین حیدر بہادر کے وزیر [illegible] کی تعمیر ہے اور شاہی انقلاب کے بعد کچھ زمانہ گذر کر اس کا نام قیصر پسند ہو گیا کوٹھی اب بھی موجود ہے روشن الدولہ کے ابتدائی دور میں مرزا فصیح شعر و سخن کے تاجور تھے اور وہ بار بار اپنے اشعار میں روشن الدولہ کی مدح میں رطب اللسان تھے آپ نے ان کی تاریخ میں یہ شعر نظم کیا ہے

روشن الدولہ بہادر کہ بایثار و عطا حاتم کشتم دستش و بقعدن رستم

روشن الدولہ کی کوٹھی شہر میں بہت مشہور اور [illegible] قیصر باغ سے پہلے واقع ہے اور روکار پر بالائے بام چار دائرہ اور ایک تلنگے کی پہرہ دار کی صورت میں مختصر پہلوؤں میں دو خوشنما مسجدیں ایک سمت قبلہ سے رو بہ پشت ہو سرکاری دفاتر کے استعمال میں ہے اس عمارت کی صورت میں ہے دوسری مسجد انتہائی پر محل اور خوشنما ہے مجرموں کے لئے وقتی حوالات اور [illegible] ڈپٹی کمشنر کا دفتر، پاسپورٹ سے متعلق آفس اور دوسرے محکمے محدود ہیں ہے اس سر فلک عمارت کا پھاٹک چوکی کی طرف تھا وزیر موصوف جب عہدے سے معزول ہوئے اور جائداد ضبط ہوئی تو یہ کوٹھی آخر میں واجد علی شاہ بادشاہ نے معشوق السلطان [illegible] کو عطا فرمائی حکومت کے استعمال میں ہونے سے اس کوٹھی کے کمرے اور دالان وغیرہ پر تفصیل نگاہ نہیں کی جاسکتی۔ ایک مسجد مجسٹریٹ کے اجلاس کے سامنے واقع ہے جو اسی سلسلہ عمارت کا جز معلوم ہوتی ہے انگریزوں کے وقت سے یہاں کوٹھی کے سامنے وکیلوں کے کثرت سے تخت بچھے ہوئے ہیں جن پر محرر منشی عرائض نویس اپنے کاغذات کے بستے لئے ہوئے سامنے صندوقچے قلم دوات لئے بیٹھے رہتے ہیں موکلوں اور مقدمات کی پیروی کرنے والوں کا [illegible] سے ۴ بجے تک اژدہام رہتا ہے۔

۲ فروری ۱۹۶۲ء کو میں نے الہ آباد دریائی منڈی میں حسین خاں صاحب مرحوم کے نوادر میں روشن الدولہ کی قلمی تصویر دیکھی پہلو میں نواب مظفر حسین خاں خلف اکبر نواب سبحان علی خاں ہیں۔ اور گلے میں روشن الدولہ کے جواہرات کا ایک ہار ہے اور لاکٹ میں جو چنے کی دال کے برابر ہے واجد علی شاہ کی تصویر ہے تو کا دلکش اور دلفریب ہونا احاطہ تحریر سے باہر ہے۔

اس کے بعد ۹ اگست ۱۹۶۳ء کو میں نے سلطان مرزا دفتری ساکن [illegible] گنج لکھنؤ المتوفی ۱۳۸۳ھ کے ہاتھ میں اٹھارہ بائیس سائز کی ایک قلمی کتاب دیکھی جس کا نام تھا "خلاصۃ العیش" اور آخر کتاب میں یہ عبارت درج تھی "قد تمت ہذہ

الشعرۃ التا درۃ ابا حیہ مسمی کلامتہ العیش (کیڑا لگنے سے پڑھا نہیں جاتا) بعون اللہ جل و علا من تصنیف اضعف خلق اللہ محمد مظہر بن روشن الدولہ رستم جنگ ظفرخاں عفی عن جرائمھا" کتاب فارسی زبان میں تھی اور اس کے باب یہ تھے ۔ قوت کے نسخے، طرب انگیز حکایتیں، ایک کنیز شاہی کے بیانات، رقص و سرود پر تبصرہ مؤلف جامع محمد مظہر پسر روشن الدولہ

روشن الدولہ کی کوٹھی کے سامنے ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو کلکٹری کے لئے نئی عمارت کا سنگ بنیاد وزیر اعلیٰ نے رکھا ہے اور ۲۲ لاکھ روپے کے سرمائے سے عمارت بن رہی ہے۔

روشن الدولہ کے چابک سواراں فتح خاں اور دلاور خاں دریاباد کے تھے ان کی سرکار میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ روشن الدولہ کا ماورچی کچے بھٹوں کے لچھے اس نفاست سے کاٹتا تھا کہ کہیں سے ٹوٹنے نہ پاتے تھے اور ان کا رائتہ ایسی اچھی طرح بناتا کہ جو چکھتا عش عش کرجاتا (قدیم بہرصفحہ ۱۴۶ و ۱۷۸)

امیرالدولہ لائبریری ۔ ریاست محمود آباد کے بے شمار علمی و ادبی خدمات کی غیرفانی یادگار جہاں معاد عامہ پر کتابوں کا بے بہا ذخیرہ موجود ہے۔

سرا مینڈو خاں

مرزا مینڈو خاں گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے اور باہر سے جو گھوڑے آتے تھے وہ اسی سرا میں ٹھہرتے تھے ۔ سرا کا پھاٹک قدیم وضع کا موجود ہے چھت اور پلاسٹر باقی نہیں رہا ۔ پھاٹک کا ایک پٹ بھی باقی ہے اور پہلو میں پن چکی ہے ۔ دروازے کی ہر محراب میں کلائی کے بعد لکڑی کی نوکیں رہ گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم طرز کاریگری کا یہ بھی تھا آج کل کی طرح لوہے کے بجائے لکڑی لگائی جائے سرا کی چوحدی میں پچھواڑے کی دیوار گر چکی ہے اور اسلامیہ کالج کی طرف عام راستہ ہوگیا ہے ۱۹۰۸ء تک سرا میں مظہر خاں یکہ والا گھسٹے کھٹیا رہتا تھا ۱۹۱۵ء کے سیلاب میں دروازہ گرا اور یہاں ایک ہاتھی ڈباؤ پانی تھا جدید عمارتی اسکیم کے تحت میں عنقریب یہ جگہ پیمائش ہو کر کسی عالیشان عمارت کی صورت میں آنے والی ہے احاطے کے آخر میں مینڈو خاں کا مکان اور اس کے سامنے تکیہ ہے جہاں پرانی قبریں ہیں۔

مسجد :۔ دوہرے درجے کی قدیم دیواروں پر جدید چھتیں پہلا درجہ وسیع آگے برآمدہ چوبی محراب کے پہلو میں منبر شمالی قدیم دیوار مسجد سے ملحق حجرہ اور کنواں دست چپ پہلو کی دیوار میں دروازے کے اندر ہی اندر دوسری مسجد کا راستہ اس مسجد کی اندرونی محراب پر ایک پتھر تھا جس پر یا علی کندہ تھا اس پتھر کو تعمیر جدید میں علیحدہ کردیا ہے ۔ موجودہ منتظم عبدالوہاب بیر بتلاتے ہیں کہ یہ مدرسہ ہے مسجد نہیں ہے مسجد کے پیش امام حافظ معین الدین جونپوری ہیں۔

(نوٹ ، سبطین آباد کا ذکر حضرت گنج کے ذیل میں آئے گا چھاؤنی مینڈو خاں بھی اسی علاقے میں تھی جس کے نہ نشانات ہیں نہ کوئی تاریخی واقعہ زیر نظر ہے ۔

لال باغ

امین آباد اور حضرت گنج کے بیچ میں عصر حاضر کا آباد ترین محلہ ۔ اس باغ کے نام کی وجہ تاریخ اودھ میں کہیں نظر نہ آئی ۔ معتبر ذریعہ سے طے کیا تھا کہ بیگم وزیر کے دفینے اس مقام پر تھے اس رعایت سے لال باغ نام رکھا گیا اور صاحب موصوف کی میم

لی بعد وسا شہرے ظاہر کیا کہ میں ۲۰ سال سے لال باغ کی اصلی حدوں کے معلوم کرنے کی فکر میں ہوں پرانے نقشے، قلمی تصاویر
دیاد داشت سے باغ کی رجہاں خزانہ اودھ تھا) حد بندی نہیں ہو سکی اور جہاں سونے کے ڈھیر ہیں وہ تہ خانہ غائب ہے لال باغ

مدرسہ اسلامیہ:۔ ملاذ العلماء سید نجم الحسن صاحب قبلہ مرحوم کی تحریک سے امیر الدولہ نے یہاں بھی ایک درسگاہ قائم کی جس
میں فقہ جعفری کی تعلیم مدت دراز تک ہوتی رہی۔

رام داس کا احاطہ:۔ اس جگہ کچھ عمارتیں ہندو رنگ کی قدیم شان و شوکت کو ظاہر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جو قیصر باغ کے ڈرائی
کی ہیں اور ہندو مسلم لوگوں کا قبضہ ہے۔

نور منزل:۔ عہد شاہی کی وہ عمارت ہے جو عہد میں بیوہ خانہ کے نام سے مشہور ہوئی اور اب اس کوٹھی میں پاگلوں کا علاج ہوتا
ہے اور ڈاکٹر ہاک (HOCK) رہتے ہیں اسی عمارت کے کھوانے امریکن پریسبیٹیرین نے یہاں سے اپنی تبلیغ شروع کیا تھا
انگریزی حکومت میں اس سڑک کا نام رنلج روڈ تھا اور اب اس کو دلکی مارگ کہتے ہیں۔

لال باغ اسکول:۔ یہ عمارت بھی شاہی ہے اس کے پیچھے ملکہ ہاگسٹ جو دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

ترھئی

حضرت گنج سے آگے بڑھ کر جو آبادی ہے اس کو ترھئی کہتے ہیں کبھی یہاں ترکھا جاتا تھا اور بہت آباد ہے نواب اصغر حسین
فاخر کا ایک مکان یادگار ہے اور کوئی ترھئی پر یہی مکان تو قابل ذکر نہیں مگر مکین کا نام نظر انداز نہیں ہو سکتا اور وہ بے شمار
خصوصیات کے حامل تھے مرزا سلیمان قدر بہادر کے ہمعصر تھے اور تاج محل کے سرمائے سے دولت پائی تھی ان کی داد و دہش
فیاضیاں زبان زد ہیں۔ مصاحبین کے علاوہ شعراء اور صاحبان حاجت ان کو ہمہ وقت گھیرے رہتے تھے جو شاعروں اور
مسخروں کا بھی ان کے در پر ہجوم تھا ان کے نوکر کا تخلص اس طبقے سے تیتا رکھا تھا جس کا نام تقی تھا یہ دو بھائی تھے کف علی
وغیرہ۔ دربان کتب خانہ ممتاز العلماء اور تقی یہ پچھلا اس نام کے ساتھ تھا کہ وہ بات بات پر وغیرہ کہتے تھے اس لئے یہ بھی
شیخ مزونام ہو گیا تھا بھی موزوں طبیعت تھے اور گلستان فاخر میں بلبل کی طرح چہکتے تھے۔ دونوں بھائی پڑھے لکھے مگر عصر
کے ذہین تھے فاخر کا قیام آخر میں ترھئی پر رہا اور دولت ختم ہوئے پر شہر (پاٹا نالہ) چھوٹا وہاں بھی جشن ہوئے۔ ایک مرتبہ کسی
سے ایک ہزار قندیلوں کا آرڈر دیدیا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس قدر قندیلیں کیا ہونگی کچھ دن کے بعد معلوم ہوا کہ مرزا سلیمان قدر
کی دعوت ہے۔ حضرت گنج سے ترھئی تک چراغاں ہوا چھٹی محرم کو فاخر علم اٹھاتے تھے جو مکمل جلوس اور اعلیٰ شان و شوکت کے
ساتھ شہر آتا تھا۔ فاخر کی اولوالعزمی کی ایک حکایت بڑی دلچسپ یہ ہے کہ وہ کربلا ابو تراب کی مسجد میں ماہ رمضان کی دعوت میں
آئے حکیم محمد رضا خاں رئیس اتفاق سے کرتہ پہنے ہوئے شریک دعوت تھے اور فاخر کی شان نہ دیکھ سکے اٹھ کر گھر گئے اور اچکن پہن کر
مسجد میں دوبارہ آئے۔ بات گذر گئی دوسرے دن فاخر کے جسم میں وہ پوشاک نہ تھی جو پہلے روز پہن کر آئے تھے۔ آج پھر حکیم محمد رضا
خاں گھر آئے اور دوسری اچکن پہنی اس وقت سے روزانہ فاخر کے جسم میں بدلا ہوا لباس اور حکیم صاحب نے بھی کوشش کی کہ نئی
اچکن روز زیب جسم کریں فاخر کے یہاں کپڑوں کی کمی نہ تھی حکیم صاحب کے گھر پر درزی بٹھا دیا گیا اور آن بان میں روز کپڑے سلنے لگے

تا آخر کی دولتمندی دیکھو ان کے خدمت گاروں کی وردی، گاڑی کے گھوڑے ساتھ کا پورا سامان مرادآبادی للیا، پنکھا، خاصدان سب تبدیل کیا ہوا۔ حکیم صاحب لٹنے کے قریب پہونچ گئے یہاں تک کہ ۲۹ کا چاند ہوگیا اور عید کے دن سے خود بخود صحبت درہم برہم ہوگئی۔ اس مقابلے پر وعظ کا مجمع بڑھ گیا کتنے لوگ دیکھنے آتے تھے کہ نواب اصغر حسین کے جسم میں آج کیسے کپڑے ہوتے ہیں اور حکیم صاحب رحمت اٹھا کر کیسی اچکن بنواتے ہیں۔

کربلا معتمدالدولہ:۔ یہ کربلا حضرت گنج اور بنارسی باغ کے بیچ میں محلہ رحیم پور ہے عہد نصیرالدین حیدر بہادر ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء امام موسیٰ کاظم اور امام محمد تقی علیہم السلام کی قبر کی نقل نواب آغا میر نے بنوائی۔ عمارت کے چار گوشوں میں چار گلدستے ہیں جن میں چکردار زینے بنے ہوئے ہیں اور بالائی جانب تین گول قبہ ایستادہ، بڑی وسعت کے دو دو اماموں کے گنبد، اور تیسرا مسجد مابین سرکی نقل روضہ میں اندرونی جانب صرف ایک درجہ تھا جو اب تک بدستور قائم ہے روکار اور پشت کی طرف چھ چھ کھڑکیوں دار جوڑیاں ہیں تین تین ویسی ہی جوڑیاں بغلی دروازوں میں ہیں پھاٹک اور چار دیواری گر چکی ہے ایک چھوٹی مسجد بھی کربلا کے بیچوں بیچ میں تھی جو ٹوٹی پھوٹی اب تک موجود ہے یہ عمارت ۱۲ بیگہ دس بسوہ زمین پر تعمیر ہوئی تھی اور تعزیہ دفن ہونے کی جگہ بیٹھا اور یتا ورکی آمدنی سے مبلغ چار سو روپے ٹھیکہ پر سالانہ آمدنی تھی۔ اس کی تعمیر میں لوسے یک کروڑ روپیہ صرف کیا تھا۔ ۲۹ برس تک عہد سلطان عالم میں حسب دستور انتظام چلتے رہے فروری ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کے ساتھ کربلا بھی ایسٹ انڈیا کے قبضے میں آئی ۱۹ اگست ۱۸۵۹ء کو کربلا اور دوسری عمارتوں کے ساتھ واگذار ہوئی اور معتمد الدولہ حکیم مرزا مہدی کے زیر انتظام لی گئی مرزا صاحب جنرل سکندر حشمت کے استاد تھے اس کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کی رپورٹ مرتبہ منشی کرامت حسین داروغہ نزول اپریل ۱۸۶۰ء کو پھر نزول ہوگئی اور نزول ہے نہیں کہا جا سکتا کہ محکمہ CSATTISH MASAN LODGE کا کب قبضہ ہوا۔ اب تک وہاں جادو گھر دامن لاج ہے۔ کرامت حسین داروغہ نے اپنی رپورٹ نزول میں اس کربلا پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے کربلائے ... موجب پروانہ ۲۷ جون ۱۸۵۹ء صدور ڈاکٹ کمشنر بہادر نمبری ۶۵۲ مورخہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء نزول قرار دیا گیا اور ٹھیکہ ... ۲۷ پر طرف سرکار سے بنام ہیکس کے ہے کیفیت یہ تھی جو گذارش کی گئی۔ کرامت حسین داروغہ نزول مورخہ ۲۹ اگست ۱۸۵۹ء

دلکشا

جنرل مارٹین عہد آصفی کے ان سربرآوردہ لوگوں میں تھے جنہوں نے حکومت اودھ میں خاص اعزاز پیدا کیا تھا اور سب سے پہلے غیر ملکی ہوتے ہوئے شہر میں عمارت بنوانے کی اجازت حاصل کی پہلی بلڈنگ جو ۵ ہزار روپیہ صرف کرکے بنوائی وہ سعادت علی خاں نے ۵ ہزار کو خرید لی اور اپنی عمارتوں میں شامل کی اس کوٹھی میں نواب سیر و شکار کے موقع پر ٹھہرتے تھے۔ پہلو کے جنگل کو چراگاہ بنوائی اور شکاری جانوروں کا انتظام کیا نیل گائیں، ہرن، چکارے، بارہ سنگھے چھوڑے۔ آبادی کا نام دلکشا سعادت علی کا رکھا ہوا ہے۔

دوسری کوٹھی وہ اونچی عمارت ہے جس کا کالا مینار الہ آباد سے لکھنؤ آنے والی گاڑی سے لکھنؤ کے پہلے سے دور سے دکھائی دیتا ہے اس کوٹھی کا نام کانسٹنٹیا (قسطنطنیہ) رکھا تھا اور جو مدرسہ یہاں کھولا تھا اس میں اسکیم تو تھی کہ ہر مذہب و ملت کے طلبا

۱؎ تاریخ اودھ ۵ ص ۴۵ ۲؎ گذشتہ لکھنؤ ۳؎ ص

جن میں کئی گرمیت صاحان کھیلا کرتے تھے یہ عمارت بڑی سربلند اور خوبصورت اور وسیع حالت میں اب تک موجود اور انگریزوں کے اقتدار کی پہلی یادگار ہے لا مارٹینیر کالج اسی عمارت میں ہے عہد نصیر الدین حیدر میں اسی جگہ سے ایک فرانسیسی غبارہ میں بیٹھ کر اڑا تھا اور بادلوں میں غائب ہو گیا پھر موتروں کی چھتری پر جو شہر سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھی اترا اور چودہ ہزار روپے انعام پائے شجاع الدولہ کی معزولی کے بعد [illegible] کا عروج ہوا اور آخر میں علی خاں معتوب ہوئے اور محاسبہ میں ان کے کارندہ مہر علی بخش قید ہو کر [illegible] آئے یہ [illegible] کی کوٹھی ان کو سزا میں ملی تھی [illegible] جنرل ریذیڈنٹ کی سفارش سے رہا ہوئے۔ لا مارٹینیر کالج میں لکھنؤ کے [illegible] تین مستمبہ تدر نواب سید محمد علی خاں[1] صاحب قیصر نے ایک قلمی تصویر اگروپ مرحمت کیا جس میں نواب آصف الدولہ، شجاع الدولہ، نواب سعادت علی خاں اور جنرل مارٹین رئیسانہ ٹھاٹھ سے جلوہ افروز ہیں۔

عہد امجد علی شاہ بادشاہ میں اس محل میں کا وحلہ تھا اور منور الدولہ کی سفارش سے اس کے داروغہ تحسین علی خاں خود مقرر ہوئے تھے اور اس خدمت پر ڈیڑھ سو روپے ماہوار پاتے تھے۔

کوٹھی بی بی پور

یہ دو منزلہ ہوادار کوٹھی قصر دلکشا کے مشرق جانب تقریباً میل بھر کے فاصلے پر واقع ہے اس کو نواب آصف الدولہ سے پیشتر جنرل کلاڈ مارٹین CLAUD MARTIN اپنے دیہی قیامگاہ کے طور پر تعمیر کرایا تھا اس کی ساخت بالکل سادی ہے۔ برخلاف اور عمارتوں کے مت کاری یا گلکاری [illegible] نہیں ہے اس کی زیب و زینت نہیں [illegible] سادگی ہی اس عمارت کا بڑا جوہر ہے نواب اس میں کبھی کبھی قیام کرتے تھے اس کا خاص مصرف یہ تھا کہ جب نیا ریذیڈنٹ مقرر ہو کر آتا تو وہ شہر کے باہر اسی کوٹھی میں ٹھہرایا جاتا۔ دوسرے دن دربار [illegible] اودھ کے [illegible] طمطراق سے فوج اور جلوس کے ساتھ لکھنؤ لے جا کر ریذیڈنسی میں پہونچا دیتے ۱۷۹۷ء میں سرجان شور گورنر جنرل نے اسی کوٹھی میں آصف الدولہ کے لے پالک بیٹے نواب وزیر علی خاں کو مسند حکومت سے محروم کرکے معزولی کا حکم سنایا تھا اور گرفتار کرکے بنارس روانہ کر دیا تھا بعدہٗ اسی کوٹھی میں دربار منعقد کرکے نواب سعادت علی خاں کو بڑے تحمل اور شکوہ سے لکھنؤ لے گئے تھے جہاں ان کی مسند نشینی بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔ یہ بلڈنگ بہت دن سے حسب ایکٹ نمبر ۱۹۰۴ء زیر تحفظ آثار قدیمہ آ چکی ہے اور اس کے چوڑے چکلے صحن میں ۱۸۹۹ء سے گورنمنٹ ڈیری فارم (مکھن کا کارخانہ) قائم ہے۔

تاریخ ۵ ستمبر ۱۸۵۶ء جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ ہو کر آئے تو ان کے داخلہ لکھنؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک آدمی آنکھوں سے دیکھا ہوا حال بیان کرتا ہے۔

سورج کے نکلنے کے پہلے ہی سے سڑک اور ہر مقام پر جہاں جہاں سے جلوس سواری کی سیر ہو سکتی تھی ہزارہا انسانوں کا مجمع ہو گیا صاحب ریذیڈنٹ کی سواری کے لئے اودھ کی دوسری ایسویں پلٹن اور چوتیسویں رجمنٹ کے دستے مع پرچموں کے صبح سویرے سے پارک میں قطار در قطار کھڑے ہو گئے یورپین فوجی افسران بھی زیر کمان میجر ٹروپ TROUP مع ایسویں رجمنٹ کے شاندار بینڈ باجے کے موجود تھے۔ جلوس میں تین سو سے اوپر ہاتھی اور اونٹ تھے جن پر نہایت نفیس چمک دار جھولیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ دیگر ساز و سامان تھا سب شاہزادے اور امیر زرق برق پوشاک میں جواہرات مرصع سے جگمگا رہے تھے پیدل اور سوار شاندار

---

[1] یادگار [illegible] [2] ماخوذ از مقالہ شیخ تصدق حسین صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ شائع شدہ بار در لکھنؤ [illegible] مئی ۱۹۵۶ء

دمڑیاں پیسے ہر طرف کثرت سے نظر آتے تھے بیرقیں اور جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے اور بے شمار نقرئی اور طلائی عصا بردار عہدہ دار جلوس کے ہمراہ تھے یہ شاہی جلوس خراماں خراماں ریذیڈنٹ کی قیامگاہ کی طرف روانہ ہوا ادھر سے ریذیڈنٹ کی پالکی گاڑی بھی بڑی شان اور دبدبے سے شاہی جلوس کی طرف روانہ ہوئی جب بادشاہ سلامت اور ریذیڈنٹ کے دوران راہ میں ملاقات ہوئی تو سلامی کی توپیں سر کی گئیں ریذیڈنٹ بادشاہ کے پہلو میں آ بیٹھے اور سارا جلوس لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا۔

ولیعہد نے حسب دستور بارہ سو روپے کی تھیلی ریذیڈنٹ کو پیش کی کہ وہ ان غربا اور مساکین کو تقسیم کر دیں جو گلے پھاڑ پھاڑ کے بخشش اور خیرات کے لئے چلا رہے ہیں ۱۸۵۶ء میں جیمس جرنل اوٹرم نے لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند کی ہدایت پر آخری شاہ اودھ سے ایک معاہدے کی تکمیل کے لئے سلسلہ جنبانی کی جس کی رو سے ان کا خطاب شاہ اودھ قائم تھا اور وہ کوٹھی بی بی پور اور دلکشا جیسی سنسان اور غیر آباد مقامات اور اسی لکھنؤ قیامگاہ میں بالکل آزاد اور خود مختار رہے مگر باقیماندہ ملک مقبوضات انگریزی میں شامل ہو جاتا لیکن بادشاہ نے اس عہدنامے کے شرائط منظور نہ کئے اور کلکتہ جا کر اپنی والدہ نواب ملکہ کشور صاحبہ اور چھوٹے بھائی مرزا سکندر حشمت جواد علی معروف بہ جرنیل صاحب اور ولیعہد پرنس حامد علی کو لندن روانہ کیا تاکہ وہاں کے ارباب اقتدار سے دادخواہ ہو کر واپسی سلطنت کی کوشش کریں امید کی کچھ جھلک نمودار بھی ہوئی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں آزادی حاصل کرنے کی ایک لہر دوڑ گئی اور بغاوت کا ایک طوفان امنڈ پڑا جس سے اہل انگلستان کو اس شاہی قافلے سے ایک پرخاش سی ہو گئی اور ساری کوششوں پر اوس پڑ گئی اور گوہر مقصود حاصل نہ ہوا۔

میری رائے یہ ہے کہ کوٹھی بی بی پور کے بانی آصف الدولہ نہ تھے بلکہ یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کی بنوائی ہوئی ہے اور تاریخ کی اصل عبارت یہ ہے ۔ کوٹھی سوئم کہ بمیں راہ بی بی پور واقع شدہ قابل دیدن است تعلق بہ صاحبان ریست کہ کوٹھی باریں مدیدہ ام کوٹھی نیست مرقعیست تماشا گری صاحب موصوف مردے بود حکیم (عماد السعادت ص ۱۳۸)

یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں کی بنوائی ہوئی تیسری کوٹھی جو بی بی پور کے راستے میں واقع ہے دیکھنے کے قابل ہے اور سیر کرنے والوں کا اتفاق ہے کہ ہم نے اس سے بہتر بلڈنگ نہیں دیکھی یہ کوٹھی نہیں ایک مرقع ہے دل بہلانے کا اور کیوں نہ ہو بانی عمارت بہت ہی عقلمند شخص تھے۔

ولایتی باغ ۔ اس باغ کو شاہ نصیر الدین حیدر نے بنوایا تھا اور اس کے چمن میں وہ پھول تھے جو دیسی نہ تھے واجد علی شاہ نے اس کی دیواری کو بیگمات کے پردے کے لحاظ سے بلند کیا تھا یہ کوٹھی دلکشا کے آگے کنار دریا بی بی پور کی کوٹھی جاتے ہوئے بائیں جانب تھا (تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص ۳۴۹)

چنہٹ

لکھنؤ سے آٹھ میل پورب کی طرف ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں چکر دار کوٹھی مشہور تاریخی عمارت تھی نہ عمارت کا نقشہ سامنے ہے ۔۔ یہ ہے کہ نام کس لئے رکھا گیا بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر بہادر کو جب خبر ہوئی کہ ان کی ملکہ قدسیہ بیگم نے سنکھیا کھا لی اور اگست ۱۸۳۲ء ۲۴ برس کی عمر میں قضا کر گئیں تو بادشاہ گھبرا کر روتے ہوئے اسی کوٹھی میں آئے اور کالے کپڑے پہنے سیہ پوشی کا عام حکم دیا اس پیکر وفا کی لاش تو تعمیر کربلا میں سپرد خاک ہوئی "حیف بلقیسے زپہلوئے سلیمان جاہ رفت" اس مرگ جذبات کش کی تاریخ

بیگم کی جائداد موسوما فاں بجو رسٹیڈی[۱] کا کوری آٹھ پرگنوں میں تھی۔

زمانہ غدر میں یہاں اودھ کے مشرقی اضلاع کے ۴ ہزار ہندوستانی سپاہی جمع تھے اور انگریزوں کی اصطلاح میں باغی سپاہیوں کا یہ اجتماع لکھنؤ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا اس اثنا میں خبر آئی کہ انگریزی فوجیں شہر سے باہر نکل کر ان پر حملہ کرنے آرہی ہیں اس اطلاع پر ہندوستانی افواج نے طے کیا کہ انگریزوں کا نام کے مقابلہ چنہٹ میں پا جائے۔ فوج نے اس جنگ کے لئے برکات احمد کو سپہ سالار مقرر کیا اور میدان میں فوج دشمن صف آرا ہوئی اور ۳۰ جون کی صبح کو اس جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ آدھے انگریز کام آگئے بچے کچھے عیسائیوں نے بھاگنے میں مصلحت سمجھی[۲] اور دوسرے دن کے اصل الفاظ میں چنہٹ کا اس طرح ذکر آیا ہے۔ ۲۹ جون کو کچھ فوج چنہٹ جو پانچ چھ کوس پر ہے آ پہونچی اور مشہور ہوا کہ دو کل ۳۰ جون کو منگل کے دن پہلے مہاراجہ کے مندر علی گنج میں درشن کریں گے پھر لکھنو میں در آئیں گے۔

ککرال

یہ مقام شہر سے چار میل کے فاصلہ پر ہے کوکر ہندی میں کتے (سگ) کو کہتے ہیں یہاں جو ندی ہے اس کے پانی کا یہ اثر ہے کہ جس کے کتے نے کاٹا ہو وہ اس پانی سے نہلا دیا جائے تو زخمی کو پھر کوئی نقصان آئندہ نہیں پہونچے گا اور عوام کہتے ہیں کہ یہاں کے کنویں میں جھانکنے سے سگ گزیدہ لوا علیان ہو جاتا ہے پاگل کتے کی پہچان یہ ہے کہ زخم پر آملے کی ایک ٹکیہ رکھ کر مرغے کے آگے ڈال دے اگر وہ اسے کھا لے تو اندیشہ نہیں ہے اور اگر نہ کھائے تو زخم میں زہر موجود ہے علاج کرانا چاہئے مرزا غالب کے ایک شعر سے واضح ہوتا ہے کہ جس کو کتا کاٹے لے وہ دریا یا پانی سے ڈرا محسوس ہوتا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد — ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ککرال میں جنگ آزادی کے کئی مورچے قائم کئے تھے ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو تحت خان سردار فوج نے ایک مورچہ توپچہ والی کوٹھی کی طرف لگایا غلام رضا خان لور سدر رسالہ کا عہدہ ملا تھا جو اکے والے، ناکولات، مشروطات تر وحشک ہے۔ جا پہونچے طرفین سے لڑائی ہو رہی تھی۔ اس عرصے میں انگریزی فوج جو سلطان پور سے آئی تھی وہ بھی شریک معرکہ ہوئی۔ شرف الدولہ جو عہد برجیسی میں وزیراعظم قرار پائے تھے ہاتھی پر سوار ہو کر مع فوج دھاوے کو چلے ککرال پر مقابلہ ہوا۔ ایک گولہ نواب کے ہاتھی کے پاس سے گزر کر اس رسالدار پر پڑا جو ہمراہ رکاب تھا وہیں ختم ہو گیا۔ نواب یہ سانحہ دیکھ کر گھر واپس آئے اور فوج نے اپنی راہ پکڑی۔

۳۰ جون کو چنہٹ کی لڑائی میں جب انگریزوں نے ہندوستانیوں سے شکست اٹھائی تو ککرال ندی کے پل پر انگریز تھوڑی دیر کے لئے رک گئے تھے تاکہ وہ اپنی فوج کی بھگدڑ کو روک سکیں مگر فوج نے پل کا رخ نہ دیکھا بے تحاشہ بھاگ کر دم لیا۔[۳]

---

[۱] بیگمات اودھ صفحہ ۔۔۔ ساد ۔۔۔ اگست ۱۹۵۶ء ص ۳۳ ۔۔۔ ۱۹۵۶ء ص ۳۲

آٹھواں باب

شاہ پیر محمد کے ٹیلے سے قیصر باغ اور گرد و نواح تک

پچھلے سات بابوں میں حتی الامکان اس بات کا لحاظ کیا گیا تھا کہ آثار قدیمہ کو سلسلہ وار بیان کیا اور ہر عمارت کو اس کے محل پر سپردِ قرطاس کیا اس باب میں اگر ترتیب بگڑ جائے تو مؤلف معذور ہے اور کتنی عمارتیں ایسی ہیں جن کے نشان باقی نہیں اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کو محلہ وار کیونکر درج کیا جائے یہ باب آخری باب اور ان عمارات پر حاوی ہے جو عہد رفتہ کی پہلی بنیاد اور لکھنؤ کی جان تھا اس باب کو سب کے آخر میں اس لئے سپردِ قلم کیا گیا کہ دوران تالیف میں زیادہ سے زیادہ معلومات یکجا کر دئے جائیں اور تاریخ تشنۂ تکمیل نہ رہے اس تاخیر کو ناظرین معاف فرمائیں نوابی اور شاہی عمارات یہی ہیں (مؤلف)

دائرہ شاہ پیر محمد

لکھنؤ کی آبادی میں شہر کی تقسیم اور محلوں کے نام کٹرہ، نگر، ٹولہ، گنج وغیرہ الفاظ کو نمایاں محلہ کے ساتھ انتساب کے بعد استعمال کیا اور دائرہ کی لفظ کہیں صرف نہیں ہوئی دوسرے شہروں میں اس طرح کے محلے موجود ہیں الہ آباد میں دائرہ اجمل شاہ ہے اور دائرہ احاطے کے معنوں میں سب سے قدیم اصطلاحات کی بنا پر لکھنؤ میں یہ لفظ استعمال ہوئی اور دریائے گومتی کے کنارے آج جس کو "شاہ پیر محمد کا ٹیلہ" کہتے ہیں وہ پرانے کاغذات میں دائرہ شاہ پیر محمد تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہریت کی بنیاد پڑ جانے کے بعد یہ معدوم ہو گئی اور پھر استعمال نہیں ہوئی چونکہ اکبری دروازہ کو شہنشاہ اکبر کی طرف منسوب اور شہریت کا پہلا نقش مان لیا گیا تو شاہ پیر محمد کے نام پر دائرہ کی بنیاد دوسرا شہری نقش ہے عہد اکبر[1] و جلوس اورنگ زیب میں کم و بیش پچاس ترپن برس کا فاصلہ تھا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ شاہ پیر محمد عہد اورنگ زیب میں لکھنؤ آئے ان کے پہنچنے پر محلہ آباد ہوا خواہ چند گھر ہی کیوں نہ ہوں شاہ پیر محمد صوفی خیال اور سلجھی ہوئی طبیعت کے ایک جید عالم تھے ان کا تاریخی کتب[2] میں بھی ذکر ہے اور ان کے تالیفات بھی میں نے پڑھے ہیں وہ بہت بڑے عالم اور ریاضت میں شہرۂ آفاق تھے ان کی روحانیت اور کمالات نے مسجد اور ٹیلہ کو انھیں کی طرف نسبت دیکر اپنایا اور شہرت دی اور "شاہ پیر محمد کا ٹیلہ" بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

مزار شاہ پیر محمد:۔ گومتی کے کنارے بلندی پر ایک بلند قبہ کی صورت میں اب بھی ہے اور دیکھنے والا مسجد کا جز سمجھتا ہے حالانکہ مسجد اس سے پہلے کی عمارت ہے اس گنبد کے نیچے شاہ صاحب کی قبر شریف ہے اور کہا جاتا ہے کہ صدور رصد کا ایک نقش ہے۔ جو وہاں سے نقل کرے پر تو صحیح نکلتا ہے اور باہر پہنچ کر غلط نکلتا ہے میرے خیال میں یہ شاہ صاحب کی کرامت نہیں ہے۔ بلکہ نقل نویسی میں اعداد غلط ہو ہی جاتے ہیں اگر اس نقش میں شک ہو تو کسی کتاب سے صدور رصد کا نقش لکھنا شروع کرو اور تحریر کو ختم کرنے کے بعد اصل سے مقابلہ کرو نقش پہلی کتابت میں ہرگز صحیح نہ ہوگا اور چار بار کی جانچ پڑتال میں صحت ہو سکتی ہے شاہ صاحب نے ۱۲ جمادی الآخر ۱۰۸۵ھ میں ارض وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑا اور جہاں آئے تھے وہیں پیوند خاک ہو گئے۔

---

[1] جلوس اکبر ۹۶۳ھ جلوس اورنگ زیب ۱۰۶۸ھ [2] دیکھو سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان [3] معارج الطالبین حیات میں قلمی نسخہ [illegible] دیکھئے۔

[illegible] کا ٹیلہ :- لکھنؤ کی بنیاد قائم ہونے سے پہلے شاہ پیر محمد کا ٹیلہ زبان زد ہے تاریخ اور پرانے حالات کی روشنی میں تحقیق کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں رام چندر جی کے بھائی لچھمن جی یہاں آ کر ٹھہرے تھے اور اس دور کی پبلک نے لچھمن پور یا لچھمن ٹیلہ نام رکھا تھا اور دریائے گومتی کی یہ جگہ ہمارے دعوے کے استعمال میں تھی مسجد کی بلندی بھی بتاتی ہے کہ اس جگہ کی رفعت زیادہ سے زیادہ قدیم ہے شاہ پیر محمد [illegible] قیام سے اس زمین کو ان کی طرف منسوب کر دیا اور ٹیلہ کی توسیع تھا وہ ملبہ بھی شامل ہو گیا جو انگریزوں نے رومی دروازے کی [illegible] عمارت کو [illegible] [illegible] دروازے کی مٹی نے زمین کو اور زیادہ دور تک بلند کیا شاہی عمارت کا ذکر اس [illegible] تھا کہ [illegible] کے محاذ میں دوسرا جمالی گوشہ، ہر کمرے کے سامنے دو [illegible] ٹیلے کے دو پھاٹک ۔ ایک وہ دروازہ جس پر عظیم اللہ خاں کا نام [illegible] گیٹ [illegible] کے [illegible] کے سات [illegible] کو ویسی ہی جوابی عمارت اور خود امام باڑہ [illegible] میں [illegible] دروازہ [illegible] ٹیلہ کا [illegible] ہے جواب پر نوبت خانہ ہونا سر عمارت تھا [illegible] ان کو انگریزوں نے دکھاوے کے لئے مسمار کیا اور یہ تمام ملبہ دریا کنارے [illegible]

مسجد شاہ پیر محمد :- ٹیلے پر [illegible] مسجد اور [illegible] کی ایک پرانی اور پہلی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ [illegible] عمارت اور منسوب [illegible] اور ٹیلے کی مسجد بھی سے پہچانی جاتی ہے ہم نے مدرک[illegible] [illegible] کے بنوانے والے کا نام مؤلفین [illegible] نظر انداز [illegible] صحیح معلوم [illegible] نواب [illegible] خاں [illegible] : بیٹھتے نواب ابراہیم خاں پسر نواب علی مراد خاں کے [illegible] علی [illegible] کے خاندان سے متعلق تھے نواب [illegible] خاں نے اپنی نظامت کے زمانے میں ٹھیک ہندوؤں کی تیرتھ گاہ کے مقابل میں مسجد [illegible] جس کی بلندی اور مینارے کئی میل سے دکھائی دیتے ہیں اور چھت پر سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے گاؤں اور بستیاں [illegible] کے اوپر سے نظر آتے ہیں خاندان علی مراد خاں کا یہ عمل یا تو اس وقت کے تعصب پر مبنی تھا یا وہ [illegible] دونوں فرقوں کو شیر و شکر کر رہے تھے کہ [illegible] دور ہو ہندوؤں کو اپنی اکثریت کے باوجود [illegible] باقی رکھنے میں کوئی ضد نہیں ہوئی زمانہ گزرتا گیا [illegible] مسجد آج بھی موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ لچھمن جی کی طرف انتساب محض خیال تھا

مسجد کے گنبد چھوٹے چھوٹے والان وسیع مینارے کھوکھلے [illegible] اوپر کے بالائی حصے میں طائروں کے آشیانہ بنانے کا موقع ۔ محراب مسجد پر کوئی پتھر نہیں ہے اس لئے سن تعمیر کا صحیح فیصلہ دشوار ہے مسجد اس وقت ہی جب لکھنؤ کی بزم [illegible]

---

[1] مراۃ البلاد (از مخطوطات کتب خانہ ممتاز العلماء) [illegible] عمارت قدیمہ [illegible] دائرہ شاہ پیر محمد است و آں ٹیلہ ایست بلند بر لب دریائے گومتی [illegible] لچھمن [illegible] [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳ کتاب [illegible] [3] [illegible] نواب علی مراد خاں [illegible] عہد نظامت [illegible] مسجد [illegible] عمارت مرتفع رفیع ساختہ [illegible] مسجد [illegible] اطراف شہر [illegible] عالم مرتفع جلوہ گر است ۔ مراۃ الملاقطی ۔

صحن آراستہ نہیں ہوئی تھی اور کندہ کرنے والے صاحبان ہنر کا کہیں پتہ تھا امام باڑہ آصفی کے ساتھ اس مسجد پر بھی [illegible] انگریزوں کا قبضہ ہوا ماتم کدہ کو قلعہ اور جائے عبادت کو ڈسپنسری بنایا اور ایک مدت کے بعد امام باڑہ کے ساتھ واگذار ہوئی اگر یہ صحیح فیصلہ نہیں ہے کہ مزار پہلے ہے یا مسجد لیکن مسجد کی اولیت میں قوت نظر آتی ہے اور مسجد ہی نے شاہ پیر محمد کو یہاں ٹھہرایا مسجد راجہ جہانگیر آباد کے زیر انتظام تھی اور حال میں فقیہ محمد خاں تاجر تمباکو خورد نی نے اپنے سرمائے سے صدر دار لعبہ کو محدود کر دیا اور مزار احاطہ مسجد میں ہے نیچے گومتی بہہ رہی ہے۔

موسیٰ باغ میں کارتوسوں کے استعمال پر جب جھگڑا ہوا اور بغاوت کی صورت پیدا ہوئی انگریزی فوج نے شبخون مارا جو چند قتل کئے گئے ان کی حمایت لینے کے بعد قیدیوں کو ٹیلہ کی مسجد کے سامنے پھانسیاں دیا شروع ہوئیں اور عام مجمع نے انگریزوں کا یہ ظلم آمیز منظر دیکھا

کوٹھی سرفراز الدولہ:۔ مسجد کے قریب نواب سرفراز الدولہ کی ایک کوٹھی کا بھی ذکر صفحہ تاریخ پر موجود ہے اس عمارت میں عرصے تک سیکریٹری کمشنر آف سول ہاسپٹل کا دفتر رہا اور یہ کوٹھی ۱۹۰۹ء میں کھد گئی۔

تکیہ شاہ پیر محمد:۔ یہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان بھی تھا جو پنچ محلہ کے آمنے سامنے واقع تھا محرم علی خاں کی حویلی اور منشی فضل حسین خاں کے رہنے کا مکان غدر کے پہلے یہاں تھا کھنڈر میں اس کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔

پنچ محلہ یا مچھی بھون

شیخوں کی عمارت اور ان کی اس بلڈنگ کا نام جو بطور قلعہ انھوں نے بنا رکھی تھی مچھی بھون یا پنچ محلہ تھا یا کی لفظ اس لئے استعمال نہیں ہوئی ہے کہ واقعہ نگار حالات کی ترجمانی میں سہو اور لسیان کا شکار ہوگئے ہیں بلکہ "یا" کا مطلب یہ ہے کہ پنچ محلہ باعتبار پانچ عظیم الشان سربلند قطعات ہونے کے اور "مچھی بھون" اس لئے کہ عمارت کے دروازوں میں جو مچھلیاں سنگوں میک سمجھ کر بنائی گئی تھیں ان کی تعداد زیادہ تھی کثرت استعمال سے مچھلی بھون نام رکھا مچھلی کو سنگا لی مچھی اور عمارت کو ہندی میں "بھون" کہتے ہیں اس لحاظ سے بھی یہ ترکیب صحیح تھی عبداللہ خاں ادیبؔ کہتے ہیں ؎

ہیں مچھلیاں سونوں کی جیں رشک کے اندر | الٹی ہے بہتی گنگا مچھی بھون کے اندر

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی میں بھی کوئی عمارت مچھی بھون تھی اور فتح دہلی کے بتا رہے ہیں۔

اس کے بانی کون لوگ تھے، سید سالار مسعود غازی یہ سالار کے ساتھ ۴۲۱ھ میں جو فوج تھی لکھنؤ کے شیخ اسی نسل سے ہیں ان شیخوں نے گومتی کے کنارے جو عمارت تعمیر کی تھی وہ بھی یہی بلڈنگ تھی اور اس گروہ کے ایک سپاہی کا نام شیخ عبدالرحیم تھا عبدالرحیم دہیلکھنڈ کے رہنے والے تھے جب اکبر کی حکومت میں پرگنہ لکھنؤ کے مستقل قرار پائے تو اپنی بیبیوں کے رہنے کے لئے پانچ مکان بنوائے اور پنچ محلہ کے جانب شمال قلعہ تھا جس میں ۲۶ دروازے تھے ہر دروازے پر کاریگروں نے دو دو مچھلیاں بنائی تھیں جو تعداد میں [illegible] تھیں۔

تاریخ میں مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ فتحپور سیکری میں بھی ایک عمارت پنچ محلہ مشہور تھی مگر اس کی ساخت تلے اوپر پنچ [illegible]

سے ماہ دور اگست ۱۹۵۶ء ص ۳۳   سے تاریخ فتحپور سیکری ص ۱۲

عمارت کی صورت میں تھی یہ بہت لانبا اور چوڑا دوسرا طول و عرض میں اس سے کم و بیش ملی بنا۔ پانچویں منزل سب سے ہوئی تھی انتہائی شاندار۔ یہ عمارت اس ڈھنگ سے بنی تھی کہ جس کا اس پر قبضہ ہو وہ سارے شہر کا حاکم مان لیا گیا۔ شیخ عبدالرحیم کی دلیری اور بہادری کے متعلق روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کا نامہ نگار صلاح الدین عثمانی رقمطراز ہے "جوتشیوں نے اکبر سے کہا کہ آئندہ دن کی دو ساعتیں شہنشاہ کے جلوس تخت کے لئے اچھی نہیں ہیں اور صاحب تخت کے لئے جان کا خطرہ ہے۔ اس سے بچنے کے لئے صلاح دی گئی کہ کسی اور شخص کو اگلے دن تخت نشین کر دیا جائے تاکہ شہنشاہ ہند خطرے سے دو چار نہ ہوں اکبر نے عبدالرحیم کی طرف دیکھا یہ محسوس کرتے ہوئے کہ شہنشاہ اس دن کے لئے اس کو اپنا جانشین بنانا چاہتا ہے وہ نادیدہ خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور دوسرے دن جلوس تخت کے وقت شیخ عبدالرحیم حاضر دربار ہوئے۔ بادشاہ نے پوشاک شاہی شیخ عبدالرحیم کو پہنانے کے لئے طلب کی خادم سرا خلعت شاہی اور تاج لایا۔ اتفاق دیکھئے ایک سانپ تاج شاہی میں آکر بیٹھ گیا تھا اس لئے خواجہ سرا کی انگلی میں کاٹ لیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا تڑپ کر جان دی جوتشیوں نے کہا یہی آنے والی آفت تھی جو اس پر گزر گئی اب خطرہ نہیں ہے حضرت جلوس فرما ہوں شیخ عبدالرحیم تخت شاہی سے اتر آئے اور شہنشاہ نے اپنی جگہ پر آکر اس خدمت کے صلے میں شیخ عبدالرحیم کو پرگنہ لکھوا اور کوٹ جاگیر میں عطا کئے یہ علاقہ اس وقت نظامت بہرائچ میں شامل تھا[1]

لفٹیننٹ جنرل ایس L T GEV MACLCODINNS مچھی بھون کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مچھی بھون کی عمارتوں پر مشتمل قلعہ کی شکل کی عمارت ہے جو ایک سطح بلند پر قائم ہے اس کو پتھروں اور اینٹوں سے مضبوط کیا گیا ہے اور پھر اس پر مضبوط دیواریں اٹھائی گئی ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ستارے کی طرح کی گول برجیاں سی بنی ہوئی ہیں شہر کی طرف یعنی عمارت کے مغربی رخ پر ایک بلند دروازہ ہے دروازوں کے دونوں جانب برجیاں ہیں جہاں سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے مشرق کی طرف دو بڑے ٹیلوں پر بڑے بڑے صحن ہیں جو چاروں طرف کمرے اور دالانوں سے گھرے ہوئے ہیں دریائے گومتی کے رخ پر بلند اور شاندار محراب دار دالان تھا

نواب صفدر جنگ نے جس کا نام محمد مقیم تھا اور خطاب نواب ابو المنصور خاں صفدر جنگ تھا شیخوں کو شکست دیکر اس مقام پر سب سے پہلے قبضہ کیا ان واقعات کی تفصیل اس سے پہلے اور بعض آئندہ صفحات سے ناظرین کے سامنے آ چکی ہیں مسٹر ایں آر گبنس N R GUBBINS اپنی کتاب بغاوت اودھ میں لکھتے ہیں کہ ریذیڈنسی (بیلی گارد) حسین آباد کے راستے میں مچھی بھون کی پر عظمت عمارت ہے یہ تین ٹیلوں پر بنائی گئی ہے جو ایک دوسرے پر قائم ہے سب سے بلند ٹیلے پر شیخان لکھنؤ کی بنائی ہوئی بھون ہے جس کی حالت خستہ ہو چکی ہے پہلے ٹیلے سے اتر کر دوسرے ٹیلے پر سنگ مرمر کی ایک خوبصورت بارہ دری ہے اور کچھ دوسری چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں اس سے اتر کر تیسرے ٹیلے پر ایک بڑا صحن اور بلند چار دیواری ہے دیواریں سڑک سے شروع ہو کر سب سے اونچے ٹیلے کی بلند عمارتوں تک پہونچی ہیں۔ مچھی بھون شیخوں کے قبضے سے نکلنے کے بعد سے سلطنت اودھ کے آخری سلطان کے قبضے میں رہی اور نواب واجد علی شاہ بہادر کے آخری زمانے تک مچھی بھون کے دروازے پر نقارہ بجتا تھا۔

بادشاہ کے بھائی کا قیام :- انگریز مذکور کے بیان سے واضح ہو گیا ہے کہ اس کے زمانے تک شاہ اودھ کے بھائی نواب ... کی

---

[1] قومی آواز جلد ۱۱ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء

جہاں سکونت تھی نواب یحییٰ علی خاں وہی با اقتدار شخص ہیں جن کی سرکار میں عالم علی باورچی ماہی مسلم پکانے میں شہرۂ آفاق تھا
اس سے بہتر مچھلی پکانے والا کسی رئیس کے دسترخوان پر کوئی خانساماں[1] نہ تھا۔

فروری ۱۸۵۶ء میں ضبطی اودھ کے بعد مچھی بھون کو انگریزوں نے فوج کے سپرد کر دیا اور اس سے بہتر قلعہ انگریزوں کے لئے دوسرا نہ تھا گبنس کے بیان کے مطابق[2] ۱۸۵۷ء کی ابتدا میں تقریباً دو سو بڑی اور چھوٹی توپیں نصب تھیں اور انگریز اور دیسی فوج کا دستہ تعینات تھا بارود اور گولوں کا بھی اسٹاک قرار دیا تھا اور اس موقع پر قلعہ سے انگریزوں کے بہت کام آئی۔ قلعہ کی توپیں ایک طرف شہر پر گولہ باری کر سکتی تھیں تو دوسری طرف پتھر والے پل کو جو اب ہارڈنگ برج کہلاتا ہے اپنی زد میں لئے ہوئے تھیں اس زمانے میں بھی ایک پل تھا جو شہر کو گومتی کے شمالی علاقے سے ملاتا تھا۔ سر ہنری لارنس چیف کمشنر اودھ اور اودھ میں انگریزی فوجوں کے امیر اعلیٰ نے اس بات کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ مچھی بھون کے ذریعے ایک طرف تو شہر کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مڑیاؤں میں پڑی ہوئی ہندوستانی فوج کو شہر میں داخل ہونے سے روکا جا سکتا ہے اس قلعہ سے اہل شہر کو خطرے کے وقت ریزیڈنسی کی طرف بڑھنے سے روکا جا سکتا تھا چنانچہ گبنس کا خیال ہے کہ شہر میں ہنگامہ نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ قلعہ مچھی بھون کے انتظامات تھے۔

۳۰ مئی کی شب کو مڑیاؤں میں مقیم ہندوستانی افواج نے چڑھائی کر دی مگر چونکہ توپ خانہ ان سے پہلے ہی لیا جا چکا تھا۔ انہیں کامیابی نہیں ہو سکی۔ اہل شہر نے بغاوت کا حال سن کر پل سے گذر کر مڑیاؤں جانا چاہا لیکن چونکہ پل قلعہ کی توپوں کی زد میں تھا اس لئے نہ جا سکے لڑائی دو دن میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد نئے حاکموں کے انتقام کا مہیب سلسلہ شروع ہوا مچھی بھون کے مغربی پھاٹک کے سامنے گذرنے والی شاہراہ پر پھانسیوں کی ایک لمبی قطار لگا دی گئی جس پر ستر آدمیوں کو پھانسیاں دی جاتی تھیں مشہور ہے کہ ایک دن میں ۳۰-۴۰ آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان شہیدان وطن کی لاشوں کو پھانسیوں پر اس وقت تک لٹکا رہنے دیا جاتا تھا جب تک کہ اسیروں کا دوسرا جتھہ پھانسی کے لئے نہ آ جاتا اس لرزہ خیز منظر کو بعض برطانوی مصنفین نے بہت لطف لے لے کر بیان کیا ہے۔ ۳ مئی کو ناکام بغاوت کے بعد قلعہ مچھی بھون شہر کے سربرآوردہ لوگوں کا قید خانہ بن گیا ان اسیران فرنگ میں خاص خاص حضرات میں نواب مصطفیٰ علی خاں برادر ہمایوں جاہ مرزا محمد شکوہ رکن الدولہ اور راجہ تلسی پور تھے رکن الدولہ قید ہی میں راہی ملک عدم ہوئے ان کی قبر بیلی گارد میں اب بھی ہے۔

۳۰ جون کو جب معرکہ چنہٹ میں انگریزوں کو مولوی احمد اللہ شاہ کی راہنمائی میں لڑنے والی فوجوں کے ہاتھ سے شکست فاش اٹھانا پڑی تو انگریز ریزیڈنسی اور قلعہ مچھی بھون میں پناہ گزیں ہوئے ہنری لارنس نے محسوس کیا کہ دو قلعوں اور ریزیڈنسی والوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے چنانچہ لارنس کے احکام کے مطابق یکم جولائی کی شب کو رات کی تاریکی میں انگریز سپاہی مع اپنے اسیروں کے مچھی بھون سے نکل کر ریزیڈنسی پہونچ گئے۔ مچھی بھون میں اس وقت ہزاروں من بارود جمع تھا جب انگریز سپاہی بحفاظت بیلی گارد کے حصار میں داخل ہو گئے تو پیچھے میں آگ لگا دی گئی۔ بارود میں آگ پہونچتے ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا جس سے پورا شہر لرز اٹھا اور مچھی بھون سے شعلے بلند ہوئے۔ چنگاریاں آسمان سے اڑتی ہوئی نظر آئیں دھوئیں اور گرد و غبار کا ایک ستون آسمان تک بلند ہوتا چلا گیا تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد دھواں اور گرد و غبار صاف ہوا تو اس تاریخی عمارت کی جگہ ملبہ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس طرح لکھنؤ کی یہ

---

[1] گذشتہ لکھنؤ ص ۱۳۱ [2] قومی آواز

کی مٹی منٹو ہستی سے مٹ گئی مچھی بھون کے کھنڈروں پر پچاس سال بعد ایک نئی عمارت تعمیر کی گئی اور وہ میڈیکل کالج کا کنوکشن ہال کہلاتا ہے[1]۔

مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد شہر لکھنؤ تقریباً پندرہ دن تک لٹتا رہا ہزاروں بے گناہ قتل کر دئے گئے سیکڑوں باعصمت خواتین نے عصمت ناموس کی خاطر خودکشی کر لی دولت مند مالدار شیعہ کو محتاج ہو گئے مگر سامراج کا غیظ و غضب اس پر بھی کم نہ ہوا اور یہ حکم ہوا کہ جہاں جہاں باغیوں نے قیام کیا ہو اور جہاں سے باشندوں نے ان کی مدد کی ہو ان سب محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے چنانچہ حسین آباد سے لے کر ارمنیہ تک دریائے گومتی کے کنارے جتنے بھی مکانات تھے یا تو نذر آتش کر دئے گئے یا بارود لگا کر اڑا دئے گئے شہر کے کتنے محلے اور بازار تھے جن کا آج نام و نشان بھی نہیں ہے غدر کی تاریخ لکھنؤ ستہ خراب واویلا ہے مچھی بھون کے اڑانے کی آواز دور دور تک گئی اور کمزور دلوں کے ہارٹ فیل ہوتے حاملہ عورتوں کے پیٹ گرے اس وقت کی دنیا میں اس سے بلند دھماکے کا کسی کو تصور بھی نہ تھا۔

شیخن دروازہ

مسلمانوں میں مغل، پٹھان، سید، شیخ چار ذاتیں وہ ہیں جن کو دوسرے طبقے سے ممتاز سمجھا جاتا ہے عربی زبان میں شیخ بوڑھے کو کہتے ہیں اور تعظیم کے لحاظ سے کہیں کہیں سید کو بھی اس لفظ سے یاد کیا جاتا ہے شیخ کی جمع شیوخ اور اردو زبان میں اس قوم کی عورت کو شیخانی کہتے ہیں نوابوں سے پہلے اس شہر میں شیخوں کا جو قبضہ تھا اس کا مورد مچھی بھون اور شیخن دروازہ تھے یہ پھاٹک حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول کے دروازے کے سامنے چڑھائی پر سرخ رنگ کا تھا اور علامت کا صدر مقام سمجھا جاتا تھا شیخوں کی ساری طاقت اس دروازے پر صرف ہوئی تھی سعادت خاں برہان الملک نے جب ۱۱۵۱ھ میں شیخوں سے مقابلے کے لئے گومتی گھاٹ عبور کر کے دروازے میں آئے تو ہاتھی پر سوار تھے دیکھا کہ دروازے میں سنگوں کے طور پر ایک تلوار لٹک رہی ہے آپ نے پسند نہ کیا کہ اس تلوار کے نیچے سے نکلیں شمشیر آبدار ہاتھ میں تھی پہلا حملہ تلوار پر کیا اور وہ تیغ استادہ گر پڑی جاہل شیخوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جس نے اس دلیری سے قلعہ میں پہونچ کر تلوار کاٹ دی وہی غالب آیا نواب کا خیمہ دروازے کے قریب نصب ہو گیا اور شیخ آنے والے مرد دلیر کی بہادری اور ہیبت کے قائل ہو گئے یہ دروازہ بھی کنگ میڈیکل کالج میں کھود کر گرا دیا گیا اور صفحۂ تاریخ پر صرف یاد باقی ہے شیخوں کی نسل میں علامہ فدا حسین قریشی ایک عربی داں میرے ہمعصر گذرے ہیں جن کا لامیۃ الہند قصیدہ لکھنؤ میں مشہور ہے۔

وضعداران لکھنؤ کے مؤلف نے شیخن دروازہ پر حسب ذیل الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے۔ شیخ احمد بخش ادیب شیخو میں ہیں جن کی یادگار شیخن دروازہ کل تک کھڑا اپنی وضعداری کا ثبوت دے رہا تھا مگر آہ جس طرح زمانے نے ان وضعداروں کی قبروں کے نشان تک مٹا دئے اسی طرح اس نادر یادگار کو بھی میڈیکل کالج کے بننے کے بہانے سے ملیامیٹ کر دیا ؂

اڑا دو خاک میری ٹھوکروں سے — اگر منظور ہو برباد کرنا

گولاری مل جا کی جس کی تحویل میں تو جگہ کے لئے دو کروڑ روپیہ موجود رہتا تھا اس کی املاک بھی شیخن دروازہ کے قریب تھی

---

[1] قومی آواز ۱۱ نمبر ۶۰ صفحہ ۴، ستمبر ۱۹۵۸ء

یہ قوم کا منیا تھا اس کے مکان کا عالی شان دروازہ حیدر باغ کے صحن اور سنگین محل[۱] کے سامنے تھا۔

دولت خانہ

یہ نام ہے نواب آصف الدولہ مرزا یحییٰ علی خاں بہادر عرف مرزا امانی ہزبر جنگ صوبیدار اودھ کی دولت سرا کا۔ سنگی دروازے سے پچھم کی طرف آؤ تو دولت خانہ کی عمارت تھی یہاں عہد آصفی کا عملہ رہتا تھا اور "محل قدیم" یا "آصفی کوٹھی" بھی کہتی تھی جب نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے تو فرح بخش کو دار السلطنت بنایا اور یہ عمارتیں خالی پڑی رہیں اور گر گئیں یہ واقعہ دریا کنارے کوٹھی کا ہے۔ سردی کا زمانہ تھا رات کا وقت سناٹے کا عالم، سیاروں کے شور سے نواب کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا خدا کی پناہ کتنا شور و غل ہے۔ کان پڑی آواز نہیں آتی ذرا دیکھنا تو کیا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا حضور گیدڑ سردی کے مارے ٹھٹھرے جاتے ہیں روتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں۔ پوچھا کتنے سیار ہوں گے عرض کیا بچے کچے ملا کر چھ سات سو ہوں گے کہا اچھا سب کو دو شالے بانٹ دو حکم کی دیر تھی سات سو دو شالے سیاروں کے نام سے عطا ہوئے اور سب کے سب ہر بچہ بوڑھے مرد و عورت پر تقسیم ہو کر مال دوستوں کا ہوا دوسرے دن پھر وہی صدائیں آئیں تو نواب نہیں پرسش کے ساتھ کہا کیوں جی کل تم لوگوں نے کہا کہ سیار سردی سے روتے ہیں ہم نے ان کے اوڑھنے کو دو شالے دلوا دیے یہ اب کیوں آواز آتی ہے عرض کی حضور یہ آپ کی جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں مسکرا کے چپ ہو گئے سوجھ بوجھ کا امتحان کر لیا اور فرمایا کہ امیر خسرو، ملا دو پیازہ نعمت خاں عالی جو اپنے فن میں طاق تھے تو ہمارے دربار میں بھی کمی نہیں ہے۔

نواب کے اخلاق و عادت و اطوار کا اس سے پہلے کے صفحات میں بھی ذکر آ چکا ہے چونکہ مکان سے مکین کی زینت ہوتی ہے اس لیے دولت خانہ کے ذیل میں نواب کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ تاریخ اودھ کے ماہر خواجہ عبدالرؤف عشرت[۲] لکھتے ہیں کہ نواب دو گھڑی رات سے بیدار رہتے تھے اور نہایت خوش الحانی سے قرآن شریف کے دو رکوع ملا محمد استاد سے سماعت فرماتے تھے اور فرصت نماز سحر صحن میں خاک پر بیٹھ کر نہایت عاجزی سے مالک حقیقی کا سجدہ شکر ادا کرتے تھے اور قصر حکومت سے برآمد ہو کر جھالردار چوکی پر بیٹھ کر چار باغ ہوا خوری کو جاتے تھے نواب اور ان کی بیگم دونوں شعر و سخن میں بڑے ماہر تھے۔ ان کا ایک مصرعہ یہ ہے ؎

تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گذر تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

آصف الدولہ کے خانوادہ کا ذکر جنت العالیہ ج ۲ فارسی ۱۸۵ میں ہے

نواب کے اشاف میں زیادہ تر ایرانی لوگ تھے اور وہی تمدن و تہذیب ہندوستان کی آب و ہوا کی آمیزش کے بعد تہذیب اودھ قرار پایا مرزا محمد علی[۳] بیگ خراسانی نواب کے منہ چڑھے ملازم تھے۔ آغا محمد[۴] ندیم شاہی مجلسیں پڑھتے تھے اور نجم الدین مورخ اودھ نے اقرار کیا ہے کہ وہ روضہ خوانی، مرثیہ گوئی اور خوش بیانی میں کمال رکھتے تھے۔

فیل خانہ میں دو ہزار ہاتھی تھے نواب اس قدر فیاض تھے کہ لکھنؤ میں دو سو برس تک ہندو مسلمان دکاندار اپنا کاروبار

---

۱ تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۳ ص ۱۳۵ ۲ ہسٹریکل البم آف اودھ

۳ گزرا لکھنؤ آپ کی مشہور کتاب حدیث عمادانیہ ہے ۴ عماد السعادت

کرنے وقت اور روپے کا ان کو یہ خیال کرکے بخشتے تھے جس کو جتنا دے سوا اس کو دے آصف الدولہ۔ ایسا ہر دلعزیز اور رعایا پرور تاجدار اودھ پیدا نہیں ہوا۔ آپ کے سارے حکومت میں کوتوالی کھو خاں[1] کے سپرد تھی۔

نواب نے مرض استسقا میں جان دی۔ حکیم شفائی کا علاج تھا سنبھل کر حالت بگڑی ۵۱ برس کی عمر میں عدل و انصاف کے شیدائی ہوئے ۲۲ سال چند ماہ صوبہ داری کو ایسا بلند کیا کہ منصب نے شاہی کا لباس پہنا۔

روح نکلنے سے پہلے زندگی کی آخری رات کچھ لوگوں نے "نواب بھائی نواب بھائی" کی ہولناک صدا سنی اور شہر خوفزدہ تھا وفات کے دن ۳ کے ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ ملک عدم کی طرف پہنچ گئے تو صدارجان[2] نے غسل دیا رات کا تھوڑا حصہ گزرنے پر امام باڑہ میں دفن ہوئے تحسین علی خان[3] پر یہ اثر ہوا کہ جسم سے خلعت اعزازی اتار دیا قبر پر بیٹھ گئے اور ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے متعلق کے آداب مجاورت قبر کے سوا کوئی کام نہ کروں گا۔ بڑی مشکل سے دوست احباب نے ان کو مزار نواب سے اٹھایا۔

نواب کی وفات حسرت آیات پر اردو، فارسی، عربی، ہندی شعراء نے اچھی اچھی تاریخیں کہیں ایک عربی تاریخ کا آخری مصرعہ یہ ہے "اصبحا روح وریحان وجنات النعیم" اردو میں یہ[4] مادہ تاریخ ہے ؎

پوچھا آصف سے کیوں یہ کہتے ہیں امام — کہا جرأت سے ہر ایک سے بارہ بارہ

ایضاً ؎ ہوئے جنت رو آصف نامدار — گشت تاریخش غریب از اتفاق ۱۲۱۲

آصف الدولہ بفردوس بریں منزل کرد

نواب کے ایک وفادار غلام کا ذکر اس محل پر ہے۔ جب مرزا قتیل کو معلوم ہوا کہ حیرت علی کے بارے میں لکھا گیا کہ اس نے بعد وفات نواب امیر الدولہ کی نوکری کی گفتگو پر انکار کر دیا۔ مرزا نے اس خبر کی رد اس طرح کی ہے کہ امیر الدولہ تو آصف الدولہ سے آٹھ برس پہلے مر چکے تھے۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ امیر الدولہ سے مراد حسن رضا خاں تھے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ امیر الدولہ خطاب حیدر بیگ خاں کا تھا اور حسن رضا سرفراز الدولہ[5] کہے جاتے تھے آصف الدولہ کے باورچی خانہ کا صرف ۲۰ سو روپیہ روز کا تھا۔ اور بارہ[6] سو روپیہ ماہوار باورچی خانہ کے ملازمین کو ملتا تھا جو کھانے کو مقوی اور نئے شکل و صورت میں لانے پر ہمہ وقت تحقیق کرتے رہتے تھے نعمت خان عالی نے دسترخوان کو وہ فروغ نہیں دیا جو شاہان اودھ نے دیا۔

آصف الدولہ کا دیوان کہا جاتا ہے کہ کتب خانہ آصفیہ دکن میں موجود ہے آصف الدولہ کے جانور[8] خانہ کا ذکر بعض کتابوں میں ہے مگر تفصیل معلوم نہ ہونے سے عنوان قائم نہیں ہو سکا۔

کھو خاں کوتوال نے آصف الدولہ کی حیات میں رحلت کی ان کے بھائی میر عزت علی اقتدار کے مالک ہوئے۔ یہ لکڑی باز رستم خاں کے شاگرد تھے ان کی نخوت اور غرور کو عمادالسعادت نے حد سے فزوں قرار دیا ہے۔

۱؎ ہسٹوریکل البم آف اودھ ۲؎ عمادالسعادت میں ہے کہ کھو خاں حیات نواب میں مر گئے ان کے بھائی کا نام رستم خاں تھا فن شمشیر زنی اور رستم خانی انہیں کے تعلیمات اور فن کا نام ہے ان کے شاگرد میر عزت علی بانکیت تھے

۳؎ عمادالسعادت ص۱۵۱ ۴؎ ایضاً ۵؎ گل صد برگ ص۲۳ ۶؎ رقعات مرزا قتیل ص۲۲ طبع قدیم ہندوستانی

۷؎ قدیم ہنر ص۱۳ ۸؎ جنت العالیہ جلد دوئم فارسی ص۵

پکا پل

لکھنؤ میں پختہ پل کی دریائے گومتی پر سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی دریا پار کے کتنے گاؤں اور پرگنے دوسرے [illegible] سے مرکز سے جدا تھے اور درآمد و برآمد میں کشتیاں کام میں لائی جاتی تھیں نواب اودھ نے دریا پر پل اپنے مرحلے سے بنوایا اور یہ راہ یہاں سے سیدھی بارہ بنکی سیتاپور پہونچ گئی بحر الغنی نے اس پل کی تاریخ [illegible][1] ظاہر کی ہے اور یہ قطعہ درج کیا ہے ؎

پل نو ساخت گشت بر گومتی   بتدبیر نیک و لعل زریں

چو از بہر خود سال او خواستم   بگفتا پل استوار و متیں ۱۲ ۶ھ

اس پل کو انگریزوں نے اپنے زمانے میں خطرہ پیدا ہو جانے سے کھدوا دیا اور ۱۹۱۴ء میں وہ پل بن کر تیار ہوا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اور دونوں طرف سفید پتھروں میں یورپین انجینیروں اور رسالدار کمیر کا ذکر ہے یہ پل اصل جگہ سے ہٹ کر بنایا گیا ہے۔

پکے پل پر دونوں طرف دھوبی کپڑے دھوتے ہیں جو ستھرا و اپنے اپنے گھر سے گدھے یا بیل یا ٹھیلے پر کپڑے رکھ کر لے جاتے ہیں مسلمان دھوبی ہمیشہ بیل پر سامان لاتے ہیں ہندوؤں کے یہاں گدھے پر لانے کا رواج ہے وقتی طور پر غربا یا جلدی پسند اصحاب یا مسافروں کے لئے کچھ دھوبی گاہک کا انتظار کرتے ہیں اور اسی وقت کپڑے دھو کر دیدیتے ہیں اس کو کھڑے گھاٹ کے کپڑے کہتے ہیں ؎

گھڑی بھر رو کے کوئے یار میں یوں رنگ دل کھویا ؛ کہ کپڑا جیسے مفلس نے کھڑے گھاٹ آکے کلپایا   (آتش)

دشمن کے مار ڈالنے کا ایک ٹوٹکا وقت ضرورت اگلے زمانے کے لوگ اختیار کرتے جس کو پاٹہ الٹوانا کہتے جس چوبی تختے پر دھوبی گیلے کپڑے مار مار کر دریا میں اتر کر صاف کرتا وہ دشمن کا نام لے کر الٹ دیا جاتا اور وہ مر جاتا اس کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے مگر یہ معلوم ہے کہ اس عمل کو گازر مشکل سے تیار ہوتے اور جو تحریک کرتا اس سے انکار کرتے۔

منشی رام سہائے تمنا کی تحریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں[2] نے دریائے گومتی کے گرد دیواریں اٹھوا دی تھیں اور ندی کو نہر کی طرح سکونتی مکان تک میں پہونچا دیا تھا اس دیوار کے آثار ندی کے کنارے کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور گذرے ہوئے زمانے کے چار ہلاک سیلاب بنیاد کو مٹا نہیں سکے۔

مسجد اشرف النساء بیگم

پل پختہ سے کچھ دور جا کر دست راست کی طرف جو سڑک میڈیکل کالج ہوسٹل کی سمت مڑتی ہے ایک فرلانگ کے فاصلے پر سیر پلاسٹر کی ایک شکستہ حال مسجد ہے اور اینٹیں بوڑھے کے دانت کی طرح ہل رہی ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ آصف الدولہ کی بہن نے بنوائی شہر کی تمام مسجدیں دیکھ جاؤ ہمیشہ دو دالانوں میں اندر کے در پر گنبد ہوتے ہیں اس مسجد میں اگلے دالان کی سقف پر گنبد ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلا دالان نمازیوں کے لئے کافی نہ رہا تو پیچھے دالان کا اضافہ کیا گیا محلات شاہی میں یہ اضافہ نحوس بھی سمجھا جاتا ہے مگر درحقیقت مسجد والا مبالغوں کی تعمیر میں عاملوں کی بات چلتی تھی اور عوام اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے تھے۔

---

[1] سنہ ۱۲۵۰ھ میں ۱۸۳۴ء ہوتے ہیں بحر الغنی کی رائے صحیح نہیں ہے   [2] امن التواریخ ص۱۱

تینوں گنبدوں میں سونے کی کلسیاں تھیں جو اب نہیں ہیں اور میناروں کے طلائی کلس اب تک باقی ہیں پہلے درجے سے زیادہ چوڑا دوسرا درجہ ہے اور نقشہ انتہائی حسین اور دیدہ زیب ہے مسجد کے متعلق لق و دق زمین تھی جو اب باقی نہیں رہی صحن مسجد کی آغوش میں ایک چھوٹی مسجد اور ہے جو بظاہر جدید اور بے ربط دے محل ہے دروازہ پر پتھر ہے جو پرانا ہونے اور دوری کے لحاظ سے مکمل پڑھا نہیں جاتا جو مصرعہ صاف ہیں وہ یہ ہیں ؎

بانی اشرف النساء بیگم — مادر پروردہ پاک دامانی
نور چشم وزیر ابن وزیر — شرف دودمان سلطانی
بانی مسجد — ٹکر برر ضائے حقانی
فکر تاریخ تھی مرے دل میں — پے کس لطف یزدانی
ہاتف غیب سے ندا آئی — ہے وہ بیت المعمور

آخری لفظ جس سے مصرعہ ختم ہوتا ہے پڑھی نہیں جاتی ممکن ہے کہ "۔۔۔ ربانی" ہو اور سن تعمیر [illegible]ھ ہو

<u>میر تقی کا کنواں</u> :۔ مسجد کی سمت جنوب ایک چھوٹا کنواں ہے جو تقی کا کنواں کہلاتا ہے ممکن ہے کہ میر تقی ہوں بعض قدیم مکاتیب[1] سے میر صاحب کے برادر نسبتی اور ان کی زوجہ کا تو ذکر ملتا ہے مگر یہ خبر نہیں کہ وہ کس محلہ کے رہنے والے تھے کنواں پٹا ہوا ہے پانی کا کہیں پتہ نہیں مگر اس چاہ میں خاص بات یہ ہے کہ جدید منڈیر سے کچھ نیچے دو سوراخ دار پتھر لگے ہیں جن میں زنجیر پہنا کر آہنی توا حال وار سطح آب پر پہونچایا گیا تھا تاکہ کنوئیں میں جو گر جائے وہ ان زنجیروں کی مدد سے اوپر کھینچے سے بلا تکلف نکل آئے اور ڈوبنے نہ پائے توا کھٹولے کی طرح زنجیروں سے کھینچے میں ڈوبنے والے کی جان بچ سکتی ہے ہمارداں نواب شجاع الدولہ بہادر کے ایک محترم فرد نے مجھ سے یہ راز بیان کیا جس کے قبول کرنے میں عقل سلیم کو عذر نہیں ہے۔

برج طلائی

سونے کا برج وہ مکان تھا جہاں بہو بیگم صاحبہ مادر نواب فیض آباد سے آکر ٹھہرتی تھیں عمارت ستاندار کرسی بلند اور کئی زینے طے کرنے کے بعد پہونچ ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ تاریخ میں راہنمائی نہیں ہے دریا کے کنارے اس قصر کا بھی وجود تھا۔ اب کہیں پتہ نہیں ہے۔ امام باڑہ دار و غہ حیدر بخش گومتی پار کا عزا خانہ تھا جس کے بارے میں معلومات نہیں۔

پنچ پلیہ

نوابی کے تذکرہ میں اس قصر عالیشان کا بھی ذکر ہے نواب سعادت علی خاں کے وقت میں جب دریا چڑھا ہے تو برج طلائی اور پنچ پلیہ کو نقصان پہونچنے کا ڈر تھا مگر انگریزی کے مشرقی ماہروں نے اپنے حسن تدابیر سے تدارک کر دیا۔

باولی امامباڑہ آصف الدولہ

گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا کہ معمول سے زیادہ بڑے کنوئیں کو شہر میں باؤلی کہتے ہیں" باولی حید ربیگ" چاہ کشمیری محلہ پر بحث ہو چکی نواب آصف الدولہ کی باولی شہر کے تمام بڑے کنوؤں اعتباروں سے ممتاز ہے۔

---

[1] رقعات مرزا قتیل ص ۴۲ طبع قدیم عہد شاہی

باولی کا ذکر عماد السعادت میں بھی ہے اور ہم باولی کو امامباڑہ کے پہلی قرار دیتے ہیں یہ کنواں حسین آباد گورنمنٹ اسکول جاتے وقت آہنی کٹہرہ میں جدید منڈیروں کے ساتھ ہے اور ہشت پہل ساخت میں موجودہ سطح اب تک پانچ درجے منزلیں ختم کرنے کے بعد پانی نظر آتا ہے دیکھنے میں آب چاہ سیاہ ہے اور اندر سے صحن امامباڑہ تک سہ منزلہ کشادہ زینہ دالا راستہ بتاتا ہے کہ تعمیر عمارت میں تحصیل آب کی سہولتوں میں ایسا ہوا تھا امامباڑہ کے مزدور یا راج ہر آنے والا اپنے ہاتھ سے اندر یکے اندر بغیر ڈول اور رسی کے پانی بھر سکتا تھا اس وقت تیسرے درجے سے ملا ہوا پانی ہے باولی کا راستہ صحن امامباڑہ کے وسط میں نہیں بلکہ عظیم الشان درجوں سے قریب ہے اور یہی فاصلہ باولی کے مقام میں ہونا چاہیے جس کی مدد سے آسانی سے پانی پہنچے امامباڑہ سے اندر پہونچنے میں ۸۳ زینوں کے بعد پانی ہاتھ سے بھر لیا جاتا ہے

باولی کے گرد جو عمارت ہے اس میں پہلے، اسے ٹھہر کر غوطہ زنی بھی کر سکتے ہیں اور کنویں کی عمیق ہونے کے ساتھ ساتھ جو عمارت ہے وہ بھی پانی کے گھٹنے اور بڑھنے پر ٹہلنے والوں کے کام آتی ہے۔

رومی دروازہ

رومی دروازہ بڑے امامباڑہ کے پھاٹک کا نام ہے جو اپنی جگہ خود ایک مستقل عمارت اور سر بفلک بلڈنگ ہے اس کی بلندی کا تخمینہ بعض نے پچاس گز سے زیادہ تجویز کی ہے۔ بمبئی میں سمندر کے کنارے انڈین گیٹ اور شہر حیدرآباد کے پھاٹک اس کو دیکھتے ہوئے نظروں میں نہیں سماتے۔ دکن میں پھاٹک کو کمان کہتے ہیں جو اس سے بلند نہیں ہیں۔ رومی دروازہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ نقشہ یا نقشہ مرتب کرنے والا رومی تھا شہر والوں نے اس کے کام کو فراموش نہیں کیا حکومت اودھ میں یورپین کاریگر اور غیر ملکی انجینیئر کثرت سے تھے زیادہ امکان ہے کہ نام میں صانع کی وطنیت باقی رہے۔

سابق کے صفحات میں گذر چکا کہ جو اولی عمارت رومی دروازہ کی جو اس سے چھوٹی تھی پورب کی طرف تھی اور انگریزوں نے اس کو باقی نہیں رکھا۔ رومی دروازہ ایک عالیشان محراب دار پھاٹک ہے جس کی وضع مسجد کی اس محراب سے مشابہ ہے جس میں پیش امام نماز پڑھاتا ہے رفیع الشان محراب پر ایک خوشنما برجی ہے اور کلائی پر سرتا سر کشادہ دار کنگرے ہیں اس محراب کو پیچھے کی طرف سے تین دروازوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس سے پبلک اور گاڑیوں کی آمد و رفت ہوتی ہے جوڑان میں دونوں طرف پہرہ داروں کے بیٹھنے کے لئے مونڈھے ہیں جن کو پہل پایہ بھی کہتے ہیں نیچے اوپر سنگی قمقمے ہیں جس میں کسی وقت یقیناً جوٹیاں تھیں یا اب چوبی و آہنی دروازہ لگائے جا سکتے ہیں۔

رومی دروازہ کے پاس میاں الماس نے ایک مسجد کسی مدت سے بنوادی تھی اور رنڈیوں نے کچھ کمرے بنا رکھے تھے سلطان العلما مجتہد العصر والزماں نے اپنے مراسلہ مورخہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۲ھ میں شاہ اودھ سے اپیل کی کہ مسجد کی مرمت کردی جائے اور پیشہ ور عورتیں ہٹا دی جائیں۔ بادشاہ نے مسجد کی مرمت اور طوائفوں کو ہٹوانے کا حکم دیا اور وحید حسین خاں کے ذریعے سے تعمیل ہوئی

(تاریخ اودھ ص۲۱/۲۴)

پہلوئے رومی دروازہ میں اس قدر وسعت اور سہ منزلہ نیچے سے اوپر تک اتنے کمرے ہیں کہ مدت تک یہاں شیعہ اسکول قائم رہا۔ اور ہر مذہب و ملت کے لوگ (طلباء) انگریزی تعلیم حاصل کرکے نکلے۔

رومی گیٹ میں اندر سے اوپر جانے کا راستہ بھی ہے اور سب سے اونچی برجی میں سیاح پہونچ جاتے ہیں اور تمام شہر کا نظارہ آسانی سے ہو سکتا ہے اس پھاٹک میں عموماً شہد کی مکھیاں چھتہ لگاتی ہیں اور اس سے اونچی جگہ ان کو شہر بھر میں نہیں ملتی ایک پونڈ شہد جمع کرنے کے لئے شہد کی مکھی کو چار سو پھولوں کے پاس جانا پڑتا ہے اور ایک بوند شہد کے لئے پچاس ہزار میل کی مسافت طے کرنی ہوتی ہے یہ فاصلہ زمین کے محیط سے دو چند ہے ذیابیطس کے مرض میں ہر قسم کی شیرینی نقصان کرتی ہے مگر شہد اس کے لئے بہترین دوا ہے شہد کے استعمال سے ہاضمہ، کان، دانت، آنکھ، خون، کھانسی وغیرہ کے صدہا امراض کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ قدرت کی ایک بخشش ہے۔

کرامت حسین خاں سیاح عظیم آبادی نے سوانح لکھنؤ میں رومی دروازے کے حال میں لکھا ہے کہ اس نام کے دو دروازہ ہیں ایک قدیم تعمیر اور دوسرا نو تعمیر یہ دروازہ بہت بلند اور اس پر طلائی برجیاں ہیں۔ خاں صاحب کا دو دروازے لکھنا رومی دروازے کی جدا جدا عمارت پر دلیل ہے جو انگریزوں نے منہدم کی مگر نو تعمیر کہنا ان کی اطلاع کی غلطی ہے۔

باغ آصف الدولہ

رومی دروازے سے نکل کر داہنے ہاتھ کی طرف ایک اور پھاٹک ہے جو باغیچہ کہا جاتا ہے یہ درحقیقت مسجد آصفی کے ایک پہلو کا نشیبی حصہ ہے جس کو نا کارہ ہونے کے لئے درخت لگائے ہیں امامباڑہ کی سطح سے مسجد کا طبقہ بلند ہے اور زمین مسجد سے باغ کی آراضی بہت پست ہے زمین باغ اور رومی دروازے سے گذرنے والی سڑک متوازی ہے۔

محمد علی شاہ کا محل: ایک سیاح نے اپنی تفریح کے سلسلے میں رومی دروازہ کے سامنے شاہی محل کا پتہ دیا ہے جس دروازے سے بادشاہ داخل ہوتے تھے اس کا نام فرح بخش تجویز کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر سونے کے پتے چڑھے ہوئے تھے۔

مسجد آصفی

رومی دروازے سے گذر کر باغ آصف الدولہ کو داہنے ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے نوبت خانہ اور امامباڑہ کا دروازہ ایک دوسرے کے سامنے نظر آتا ہے جو ایک زمانہ ہے تین درجوں میں سے امامباڑہ دیکھنے والے گذرتے ہیں اور اندر پہونچ کر عمارت کا صحن کو چک اور گول دائرہ میعادی کی شکل میں سبزہ اور گرد سڑک جس پر پہلی محرم کو حسین آباد کی ضریح کا جلوس سلسلہ وار مرتب کیا جاتا ہے اور چکر ختم ہونے پر پھاٹک سے ضریح نکلتی ہے اس جلوس عزا کا فوٹو تم نے رومی دروازہ میں دیکھا۔ اسی گھاس پر دس بارہ سال سے ۸ محرم کو آگ کا ماتم ہوتا ہے اور ہزارہا لوگوں کا ہجوم آدھی رات تک رہتا ہے اس گراؤنڈ اور صحن کو چک ختم ہونے پر سنگی سیڑھیاں اور ۹ زینے کے بعد صحن امامباڑہ میں داخل ہونے کا ایک دوسرا پھاٹک ہے اس دروازے کے بغلی کمروں میں چپراسی اور پہرہ دار اور آثار قدیمہ اودھ کے ٹکٹ فروخت ہوتے ہیں داخلے کے قوانین بورڈ پر لکھے ہیں یہاں سے گذر کر لق و دق صحن اور پہلو میں مسجد کی عمارت ہے پہلے اس پر تبصرہ ضروری ہے۔

مسجد لمبان چوڑان کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اور مسجد جامع احاطہ مرزا علی خاں کے بعد سب مسجدوں میں بڑی ہے۔ صحن مسجد تک پہونچنے میں پتھر کے خوشنما اور دیدہ زیب ۲۸ سیڑھیاں ہیں بیچ بیچ میں کچھ سیڑھیاں زیادہ چوڑی ہیں۔ جن

گنبد نے والوں کو رفتار میں آسانی ہوتی ہے آخری زینے کے بعد کنواں ہے جو نواب آصف الدولہ کی موت کے بعد کسی شخص نے بنایا ہے کنویں میں دونوں طرف جالدار سنگی ستون اور جگت کے روبرو زمین پر سفید پتھر میں چار پانچ سطریں اوپر بخط نستعلیق لکھے ہیں جو رنگ اڑ جانے سے صاف پڑھے نہیں جاتے پہلی سطر کی ناتمام صورت یہ ہے " پیش مسجد شاہ زمن چاہ • آخری سطر میں مسجد بلند آماجاں ۱۲۴۹ سنہ بہت صاف پڑھا جاتا ہے اور یہ کتبہ حافظ نور اللہ مشہور کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

کنویں کا سوائے والا کوئی غیر متعلق شخص ہے کنویں سے قریب چوکور حوض ہے جس میں بیچ ایک دیوار اٹھا کر دو حصے کر دیئے ہیں اور پانی بھرے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حوض کافی گہرا ہے یہ وضو کرنے کے لئے تعمیر اول کا جز ہے صحن مسجد چبوترہ کی صورت میں مارا لو بلند ہے اور گرد آہنی حدید کٹہرا لگا دیا ہے انگنائی کتنی لانبی ہے اس کو فرش صحن کے سرتاسر پتھروں میں ایک پتھر کی پیمائش اور تمام پتھروں کو شمار کرنے سے تخمینہ ہوتا ہے کہ چبوترہ ۱۸۰ فٹ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

<u>مسجد:</u>۔ عمارت میں آگے پیچھے دو درجے ہیں اور رو کار کو اس طرح تقسیم کیا ہے کہ درمیانی محراب سب سے بلند اور نمایاں اور پہلوؤں میں پانچ پانچ در کے داہنے اور بائیں دو دارے چھت بلند اور زیادہ سے زیادہ جگہ گنبد عالی شان منارے طویل کلسیاں طلائی بالائے محراب سنگ مرمر پر قطعہ تا۔ یخ ہے جو پڑھا نہیں جا رہا ہے فرقہ شیعہ کی نماز عیدین اور جمعہ مدت دراز سے اسی مسجد میں ہو رہا ہے۔ مدرسہ سلطان المدارس کی عمارت تیار ہونے سے پہلے جامعہ سلطانیہ کے عربی طلبا صدر الافاضل اور سند الافاضل کی تعلیم مسجد کی انہیں صحنچیوں میں حاصل کرتے تھے اور جو طلبا اس وقت فارغ ہو کر یہاں سے نکلے وہ منتخب روزگار تھے۔

فرقہ امامیہ میں عیدگاہ اسی مسجد کے راستے میں رومی گیٹ کی سڑک پر کہی جاتی ہے اور کھلونے اور دوسری دلچسپی کی چیزیں بچے نماز عید کے بعد مول لیتے ہیں اور ہنسی خوشی اپنے گھر واپس ہوتے ہیں۔

مسجد حسین آباد ٹرسٹ کے زیر انتظام ہے اور موذن و پیش نماز تنخواہ لے کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں سب سے بڑا اجتماع اس مسجد میں جمعۃ الوداع کے دن ہوتا ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس مسجد پر انگریزی فوج کا قبضہ تھا اور نئی گورنمنٹ نے قلعہ بنا رکھا تھا آگے کے بیان سے واضح ہو گا کہ مجتہد العصر والزمان کے چشم و چراغ نے اپنے ذاتی اثر سے حکام سے استخلاص کر کے مسجد کو واگزار کیا اور جمعہ و عیدین بدستور پھر اسی مسجد میں ہونے لگا۔ مسجد اور امامباڑہ پر قبضہ ہونے کے بعد قبلہ و کعبہ کے نوکر چاکر امیر علی جو فینس کے ساتھ فانوس لے کر دوڑتے ہوئے چلتے تھے اور بھوریئے منصب علی اور نجف علی وغیرہ کتف حاء۔ در ماغ ممتاز العلماء کے دربان وقتی طور پر نگرانی کرتے رہے اور نوکروں چاکروں کو امامباڑہ کے راستے میں" سا ہی" سے کا نِ خبرہ محسوس ہوتا رہا عہد شاہی کی آبادی ختم ہونے پر جنگلی جانوروں نے راہ مخذدسش کر دی تھی

نواب آصف الدولہ نے مسجد پر جو اشعار خود نظم کئے وہ ان کے کلیات میں موجود ہیں اور نصیر الدین ہاشمی نے نواب سالار جنگ بہادر کی حلی لائبریری واقع میوزیم حیدرآباد دکن سے نقل کئے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

؎ قدیم خبر ص۱۵۱

مسجد کا گرچہ سب سے بڑا احترام ہے — لیکن اماماڑہ بھی عالی مقام ہے
وہ آستانِ حق ہے یہ مکانِ امام ہے — سجدے تو ہیں سعادت دل ان کا پیام ہے
سجدہ اگر ادھر ہے تو ادھر سلام ہے
دونوں مکاں عرش سے رکھتے ہیں برابری — جس میں قصرِ جنتِ اعلیٰ سے برتری
اوجِ بیاں سے ان کی صفت ہی بہت بڑی — کہتے ہیں دیکھ حور و ملک آدمی و پری
سجدہ اگر ادھر ہے تو ادھر سلام ہے

بڑا امامباڑہ

پیغمبر اسلام کے وہ نواسہ جو ان کی امت کے ہاتھ سے کربلا میں بڑی بیدردی کے ساتھ تین دن کے بھوکے پیاسے مع اپنے عزیزوں اور دوستوں کے قتل ہوگئے ان کا نام ساری دنیا میں "حسین" مشہور ہے اور اس کی یاد ہر اس شخص کو آتی ہے جو ان سے ہمدردی رکھتا اور ان کے کردار کو پسند کرتا ہو۔ دنیا کی بہتیری بستیوں میں جہاں دوستدار حسین بستے ہیں یادگار کے طور پر ان کے نام پر کچھ عمارتیں بطور یادگار بنائی گئیں جن کی صورت حیثیت شکل کی کوئی حد بندی نہیں ہے اگر ... تعزیہ رکھ دیا گیا تو اس کے نیچے ایک چبوترہ اور نام اس کا چوک اگر کسی نے تعزیہ داری اپنے گھر میں شروع کی ... اس کے درجے کا نام "بیت الحزن" یا تعزیہ خانہ رکھا۔ اس سے زیادہ کسی دوستدار حسین کے سرمایہ میں جو سکت ہوئی تو اس نے خود عمارت مرتب کی نقل ہو کر "کربلا" کہا اور کہیں میں اس حسینی یادگار کو عاشور خانہ اور اطراف ... آستانہ ایسی دہلیت اور تحریر سے عقیدتمند کہتے رہے عراق کے باشندوں نے حسینیہ کہا اور یہ بہت پرانی رسم تھی کہ غم زدہ اپنی عمارتیں تو بہت علیحدہ ہو کر کھڑے ہوئے محبوب کو یاد کرے خود حافظ شیرازی نے

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور — بیت ... شود روزے گلستان غم مخور

فردوسی نے کہا ہے

یکے خانہ پرداخت از درد و دست — دراں خانہ در بستہ تنہا نشست
دراں بیت الاحزان نہادہ بنام — کہ در خانہ ... دادہ و مدام
دراں خانہ یعقوب ماتم حزیں — نشستہ در ... و خوں بر زمیں

لکھنؤ نے اس عمارت کا نام "اماماڑہ" رکھا اور اس نام میں حسینیت کے ... اور جذبہ شہادت کی پوری تصویر ہے اس لئے لکھنؤ میں قدم قدم پہ اماماڑے نظر آئیں گے۔ اور جس انسان کی عمارت پر نظر پڑے گی امامت کا اعلان ہوگا۔

نواب نے اودھ میں کال پڑنے کے زمانے میں یہ اماماڑہ بنوایا اور جی کھول کر روپیہ لگایا اور یہ یادگار ان کی عجائبات دنیا میں شمار کی جانے لگی اس عمارت کی بنیاد کا خیال پہلے دریا کے اس پار تھا۔ ایک شخص تھے آصف جس جو افضل الدولہ مظفر الملک افضل علی عرف چھوٹے بھیا خلف منشی اسیر کی صحبت میں رہتے تھے اور ان کی آخری عمر پس نواب باقر مرزا مرسی حسین آباد مبارک کی

لہ نیا دور ص ۱۵ مئی سنہ [illegible]ء

موقع پر گزری اور مقدمہ ملاحظہ کے لوازمین میں بھی میں نے ان کا نام دیکھا یہ شخص پچاس برس پہلے مجھے کھدرے میں امام باڑہ کے پہلے آثار دکھاتے تھے۔ دریا کے اُدھر عمارت بننے دانی تھی گومتی کے بہاؤ سے روکا اور نیز جب زیر آب آگئی تو دانشمندوں نے دریا سے اتنی دور اس پہلو پر سنگ بنیاد رکھا کہ گومتی کا پہلا سیلاب ۱۸۹۴ء میں دوسری باڑھ ۱۹۱۵ء میں تیسری طغیانی ۱۹۲۳ء میں آئی پانی بڑے زور و شور سے بڑھا اور آخری بار اس کتاب کے دوران تالیف سیلاب آیا لیکن دریا امام باڑہ کی چوکھٹ کو چوم کر رہ گیا فقط ۱۹۲۳ء میں پہلے صحن میں پاؤں ٹیکی تھی قحط سال میں نواب نے شریفوں اور سادات کو مزدوری کا درس دیا۔ وہ رات کو پردہ شب میں اینٹ سیدھا کام کرکے مزدوریاں لے جاتے اور صبح کو کاریگر سے برے ہلتے۔

گزشتہ صفحات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اندھیری رات میں سادات جو بوجھ بھرتے تھے صبح کو وہ مصالحہ اٹھا کر تحسین علی چوک لے آتے اور مسجد تحسین کی تیاری ہوتی' ایک کرشمہ دو کار" نواب کی اولوالعزمی کا یہ بھی ایک باقی ثبوت ہے۔

امام باڑہ کی بنیاد کا دوسرا واقعہ یہ بھی ہے کہ جب نواب آصف الدولہ تفریح کرتے ہوئے مانک پور پہونچ گئے اور سید حامد شاہ درویش سے ملاقات کی وہ فقیر لوار رکھتے ہی' آثار ک' ندیا دیکھ کر ان کو ایک علاقہ دیدیا جہاں ایک امام باڑہ بھی آپ مکمل دیکھ آئے تھے اس کے سوا نے کا وعدہ کرلیا اور لکھنؤ سے عمارتی سامان بھیجنا شروع کیا۔ اس عرصے میں شاہ صاحب کا وصال ہوگیا اور بیٹے نے تعمیر امام باڑہ پر کوئی توجہ نہ کی۔ نواب کو رنج ہوا اور اپنا سامان وہاں سے اٹھوالیا اور لکھنؤ میں امام باڑہ کی اسکیم شروع کی حامد شاہ کا مقبرہ مانک پور میں اب تک موجود ہے اور نواب کا دیا ہوا علاقہ ان کی نسل راجہ اقبال حسین کے قبضے میں اس وقت بھی ہے اور خطاب راجہ انگریزوں کا دیا ہوا ان کی گزشتہ عزت کا ثبوت دے رہا ہے۔

امام باڑہ کفایت اللہ ایرانی کاریگر کے مشورے اور نقشے کی تحت بنا بہتیرے نقشے نامنظور کردئے گئے اور خدا کو کفایت اللہ کا نام رکھنا منظور تھا۔ کفایت اللہ کی قبر کا پتہ ہم گزشتہ صفحات میں دے چکے ہیں نواب نے شروت میں طے کرلیا تھا کہ ایسا امام باڑہ نہ جیسا کبھی نہیں بنا۔ ویسا ہی ہوا اور ایسی عمارت بن کر تیار ہوئی جو کہیں نہیں بنی تھی۔

صحن امام باڑہ (جس میں کہا جاتا ہے کہ نہر بھی تھی) طے کرکے امام باڑہ کی سیڑھیاں ہیں اور ۱۸ خوبصورت پتھر کے ریبوں کے بعد عظیم الشان چبوترہ ہے اور روکار پر کھمبیوں کے دروازے شامل کرنے پر بس تیرہ دروازے ہیں جن میں جالی دار چوبی دروازے انگریزی حکومت کے وقت کے لگے ہیں اور پرندوں کی آمدورفت سے روکا ہے۔ نجم الغنی نے دالان کی لمبائی ۶۰ گز اور چوڑائی ۲۰ گز لکھی ہے اور بعض اہل قلم نے یوں لکھا ہے کہ اس کی وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۵۲ فٹ تک ہے۔ نجم الغنی نے امام باڑہ کی دس لاکھ میں تیاری پر تعجب کیا ہے اور اس رقم کو مبالغہ سمجھا ہے۔ حالانکہ مستند بیانات میں پچاس لاکھ سے ایک کروڑ تک تخمینہ صحیح سمجھا جاتا ہے یہ عمارت دس سال میں بن کر تیار ہوئی اور مسجد کو امام باڑہ سے اس خوبصورتی سے ملایا ہے کہ آج کل کے انجینئر بھی اس سے بہتر صورت اختیار نہیں کرسکتے اور میڈیکل کالج کی عمارت میں ایک کو دوسرے سے ملحق کرنے میں وہی طرز اختیار کیا ہے جو بڑے امام باڑے میں موجود ہے۔

<u>تعمیر امام باڑہ کا ایک ادب افروز واقعہ</u> :۔ آصف الدولہ بڑے نظرباز اور مردم شناس تھے صاحبان کمال کو پہلی فرصت میں پہچانتے تھے پھر بھی بشریت تھے کثرت کار میں کبھی مسامحہ ہوجاتا تھا میر مہر علی جو دہلی کے ارباب دقت میں نہ صرف ممتاز بلکہ ان کی ہجرت سے دہلی کو

نقصان ہوتا جب گھٹ جاتے اور اپنا کام عمارت خود کر لیتے احتیاط دیکھ کر نواب نے کہا امام باڑہ بن رہا ہے آپ مزدوروں کو اتنا کیوں غرض کیا مجھے وہ بے پردگی شمار کرنا نہیں آتے نواب نے کہا بہتر پھر آپ ایسا کیجئے کہ جب مزدور کام شروع کریں تو پردے کو پکار دیجئے۔ لکھنؤ میں آج تک یہ رواج ہے کہ جس کے گھر میں مرد لگے تو مزدور کوٹھے پر چڑھنے وقت ملدآ وار سے پکاریں پردے والی پردہ کرلو کوٹھے پہ مزدور چڑھتا ہے کسی محلے کے تیر پر لڑکے ان کی نقل کرتے اور کہتے پردہ ڈالو پردہ کرلو مزدور پر کوٹھا چڑھتا ہے سننے والے ہنس پڑتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام باڑہ اور مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں نواب کو بجز اس فکر کے کوئی خیال نہ تھا کہ کسی طرح عمارت تیار ہو جب مزدوروں کو بانٹنے سے انکار کر چکے تھے یہ کام اس سے بھی سخت تھا اگر نہیں کرتے تو شاید حاضر ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا مگر کیا کرتا۔ نواب کی تجویز کو منظور کیا۔ سیڑھی پر کبھی کا ہے کو چڑھے تھے ڈرتے ڈرتے چڑھے اور پکار کر کہا۔

عرش بریں کے رہنے والو دوڑ دوڑ کے پردہ کرلو مہر چڑھا ہے بام فلک پر پردہ ڈالو پردہ کرلو

نواب آواز سنتے ہی پھڑک گئے۔ ناواقفیت پر معذرت کی۔ مناسب ہوئے یہ سرفراز کیا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اس وقت اس قدر گنجان آبادی تھی کہ مزدور بغیر پکارے بالائے بام نہ آسکتے تھے۔

عمارت میں تین درجے ہیں پہلا درجہ شہ نشین کا جس کی پشت پر وہی تیرہ دروازے نظر آتے ہیں دوسرا بیچ کا دالان ہے جہاں درمیان میں نواب کی قبر ہے اس سے بڑا ہال ملک میں کہیں نہیں ہے اور یہ درجہ کسی شہر کا محلہ ہو سکتا ہے نواب کی قبر کے پہلو میں ان کی بیگم شمس النساء کی آرامگاہ ہے دونوں پر کٹہرے لگے ہیں اور مزار پر کامدار چادریں دو دو رحل پر کھلے ہوئے قرآن شریف انگیٹھی اور کشتی کے ساتھ روشنی کا خصوصی سامان کنول، مردنگی شمعدان لیمپ رکھا ہے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ جب امام باڑہ بن رہا تھا تو کسی بڑھیا کا مکان پڑتا تھا اس کو کافی لالچ دی گئی کہ اپنا گھر بیچ دے اور عمارت میں کمی پیدا نہ ہو وہ کسی قیمت پر اپنا قبضہ اٹھانا پسند نہ کرتی تھی آخر اس شرط پر اس نے مکان دیا کہ میرے نام کا بھی امام باڑہ میں ہمیشہ ایک تعزیہ رکھا جائے اس کی شرط منظور ہوئی اور آج تک امام باڑہ میں بڑھیا کا تعزیہ رکھا جاتا ہے اس امام باڑہ کی تعمیر میں جو قطعات تاریخ شعراء نے نظم کئے ان میں ایک ملاحظہ ہو ؎

وزیر ہند سلیمان جناب آصف جاہ ہنر بر جنگ خدیو جہاں کلاہ کبار
رفیق گشت چو توفیق حق بنا کردش امام باڑہ گردوں اساس بہشت آثار
بگوش اہل جہاں گفت عقل تاریخش رواق عرش جناب ائمہ اطہار

اس سے بہتر مادۂ تاریخ "آستان شہید ابن شہید" ہے عمارت تیار ہونے پر لاکھوں کا سامان قیمتی خرید کر امام باڑہ
1202
سجایا گیا اور کانچ کا قیمتی سامان لاکھ روپیہ کا ڈاکٹر ملشن کی معرفت جو منگایا گیا تھا اور جو نواب کی وفات کے بعد پہنچا روشنی میں خوشبودار تیل استعمال ہوتا تھا اور علم امام باڑہ میں اس کثرت سے تھے کہ شمار کرنے والے گنتے گنتے بھول جاتے تھے جھاڑ فانوس قمقمہ ہانڈیاں دیوار گیریاں قندیلیں بھی لاتعداد تھیں اور امام باڑہ کا سالانہ صرفہ ۲۵ لاکھ روپے تھا

اس عمارت کے خصوصیات یہ ہیں ۔ (۱) اتنی بڑی قالب دار چھت جو بغیر کھمبوں کے دیواروں پر رکھی گئی ہے۔ یورپ امریکہ مصر کہیں نہیں ہے اور دنیا کے آثار قدیمہ میں اس کی واحد حیثیت ہے (۲) امام باڑہ جتنا بلند ہے اگر اتنا نہ سہی تو اتنا زیادہ

سے زیادہ بلندی میں پھیلے ہوئے ہیں اور دیوار و در اور ستونوں میں اترنے اور چڑھنے کے راستے ہیں جس کو بھول بھلیاں کہتے ہیں بالا حصے کے پیچیدہ راستے تو وہ ہیں جہاں سیرگاہ عام ہے مگر اندرونی حصے میں کوئی گذر نہیں سکتا بعض انگریزوں نے پہلے کر شاید مسدود کر دیا ہے انجینئری کی اس سے بہتر مثال دنیا کے پردے پر نہیں ہے اور نہ کسی نقشہ نویس نے آج تک اس عمارت کا اندرونی اور بیرونی نقشہ کھینچا بھول بھلیاں بنا کر معماروں کے نکلنے کے بعد پھر کوئی اندر نہیں گیا (۳) لکڑی یا لوہا کہیں استعمال نہیں ہوا ہے صرف پتھر اور مصالحے پر یہ عمارت دو سو برس ہونے والے ہیں اور آج تک قائم ہے (۴) اتنی بڑی چھت اور وسیع دالان کے کوٹھے کا پانی گرنے کے لئے صرف ایک پرنالہ ہے جو کچھ رخ پر ہے اس سے تمام پانی گر کر نیچے آجاتا ہے عوام کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کے بیشتر امامباڑہ نالے پرنالے گئے ہیں بلکہ اس امامباڑہ کی چھتوں کا پانی اس قدر زیادہ ہوا کرتا تھا جو نالے کے بغیر نکل نہیں سکتا اور نالہ اس کے پرنالے کا نام ہے۔ لکھنؤ کے نامور شاعر رشید سے کاظم حسین محشر کو پرنالے کے معنی سمجھائے اور لعنا کو یہ کہہ کر غلط کہا کہ اس لفظ پر نہیں لگے ہیں لفظ پرنالہ ہے اور مادہ پانی ہے مراد یہ ہے کہ پانی نکلنے کی جگہ۔

نواب کو اس امامباڑہ میں مجلسیں کرنے کی بڑی بے چینی تھی اور مشہور ہے کہ انہوں نے جلدی کی اور چھت میں سقف کے قائم رکھنے کے لئے جو بھراؤ دیا گیا تھا اس کو محرم نزدیک آنے سے قبل از وقت کھلوا دیا مگر دور اندر کفایت اللہ سب خطرہ محسوس کر رہے تھے اور جان پر کھیل کے بھراؤ کو علیحدہ کر دیا گیا مجلسوں میں شرکت کے لئے شاہی مہمان اور بڑے طبقے کے لوگ ہاتھی پر بٹھا کے لائے جاتے تھے۔ آنے والوں میں خواجہ حاجی عبداللہ میر عبداللہ ایک ہاتھی پر ہوتے تھے اور دوسرے پر خواجہ صالح خواجہ رحمت اللہ خاں اور میر تقی میر لائے جاتے تھے یہ چونکہ نازک مزاج تھے لہٰذا اوقات ان کے لئے جو پہلے بھیجا جاتا تھا۔[۱]

کچھ لوگوں نے غلط فہمی پھیلا دی تھی کہ امامباڑہ میں تبرا ہوتا ہے لہٰذا ہم شریک مجلس نہ ہوں گے نواب نے بڑی رواداری اور عدل پروری کے ساتھ صفائی پیش کی۔ اس سرگذشت کا ذکر کل جائے پر مجھے لذت محسوس ہو رہی ہے فارسی سے اردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے ——— کل حضور پُر نور میں مجلس عزا امام ہے صبح کو مجھ سے فرمایا تھا کہ مرزا امامی سے کہہ دیا کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کو لیکر جا۔ گھڑی دن چڑھے پہونچ جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ خواجہ امامی ان مجلسوں میں بہت کم جاتے ہیں فرمایا اس کے کیا معنی ہیں کہ آدمی حضرت سید الشہداء کی مجلس تعزیت میں نہ آئے ہمارے گھر کا قاعدہ نہیں ہے کہ کوئی صحابہ کو گالیاں دے۔ میں نے عرض کیا خواجہ امامی متعصب تو نہیں ہیں اور اگر کوئی برا کہے تو اس کے برا کہنے سے وہ برا نہ ہو جائے گا وہ امام ان امام سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر کوئی کہے گا تو اس کی سزا خود بھگت لے گا۔ کوئی لیاقت دار آدمی تو ایسا نہ کرے گا کہ مجمع عام میں تبرا بکے اور کبھی اگر کوئی کمینہ کہہ دے تو اس کا شکوہ نہیں بہر صورت یہ سب حاضر ہوں گے آپ سن رکھیں کہ کل دونوں صاحب کے ہاتھی اور سواریاں مرثیہ خوانوں اور کتاب خوانوں کے لئے رک جائیں گی اور کوئی سواری خالی نہ ہوگی جو آپ کے پاس روانہ کی جائے بہتر ہوگا کہ آپ اور عبداللہ میانہ میں بیٹھ کر اور خواجہ اسمٰعیل خاں کو چچا صاحب کے گھوڑے پر سوار کر کے وقت مقررہ پر لے آئے بعد مجلس یہاں سے آپ تینوں بھائی واپس کئے جائیں گے بہر صورت شرکت ضروری ہے اس لئے کہ حضرت نے خود فرمایا ہے کہ نہ آنے میں تعصب ثابت ہوگا اور بہت ہی مکروہ بات ہے کہ وہ ناچ رنگ کی صحبت میں تو شریک ہوتے ہیں اور تعزیت فرزند رسولؐ سے کنارہ کش ہوتے

---

[۱] رقعات مرزا قتیل ص۲۳ طبع قدیم [۲] ص۲۵

(واقعات مرزا قتیل ص۵۳)

لکھنؤ میں صدا قتل کے صحیفہ خوانوں میں حاجی ابوطالب اور شاہ حسین تھے ان کے شاگردوں میں حضرت محمد علی بن حاجی محمد بیگ ابن ... علی کھاپلی کا نام منو قرطاس پر باقی ہے یہ قوم ترک سے تھے اور تبریز سے ۳ میل پر آر دیبہ دیہات کے رہنے والے تھے آذربائیجان ... آئے اور پھر دہلی و لکھنؤ دیکھا ان کے بیٹے محمد حسین روضہ خوان تھے جن کی بہت ہی ضخیم کتاب اخبار ماتم ۱۲۸۵ھ میں طبع ... اس کتاب کے بڑے سائز پر ۴۴۲ صفحے ہیں اس وقت کی مجلس ختم ہوئے پر ــــ پہلے ظہور امام زمان کی مخصوص الفاظ میں دعا پھر بادشاہ اور شہزادہ و منبر کے جاری باری دعا پھر علماء کے لئے دعا کی جاتی تھی اور آخر میں حاضرین مجلس کے لئے دعا پر ... گھنٹہ ہوتا اور تبرک تقسیم ہوتا تھا اور لوگ اپنے اپنے گھر جاتے اس دعا میں ہی آدھا گھنٹہ گذر جاتا۔ اس وقت چونکہ علما جو ... حکومت کر رہے تھے اس لئے بادشاہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی زبانوں پر آتا تھا کتابوں کے دیباچے اور مثنویوں کے ابتدائی اوراق کی یہی نشانی تھی اور اس آیس کی ابتدا جہاں صفی سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ دعائیہ کلمات طولانی ہیں جو کھاپلی روضہ خوان نے منذر قرطاس کئے ہیں دعا علماء کے تحت میں ان کی بعض ایک یا دو کا سے ہیں

سیما پیشوایان زمرۂ مسلمین و پیش رمان کا دو مومنین مجمع الناس قدیہ مرجع اقتباس ملکیہ جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول سید العلماء و سید الفقہا دام اللہ ظلہ ما لقاء و مواہہ فضلہ" حاضرین کے دعا کے بعد ذاکر کہتا ہے ؎

الٰہی جہاں کی سرانجام کار | تو خوشنود باشی شمار ستگار

بحق الحق و نبی المطلق رحم اللہ من قرا سورۃ الفاتحہ

غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسجد اور امام باڑہ کو قلعہ بنایا ٹیلہ کی مسجد ڈسپنسری قرار دی ۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء تک فوج باغیوں کی مدافعت میں مصروف رہی ۵ مارچ کو آبادی شہر کا اشتہار جاری کیا گیا اور تحفظ جان و مال رعایا کا اعلان ہوا۔ سڑکوں کی تیاری کے لئے انجینئر مقرر ہوئے کرنل ہیرو ڈپٹی کمشنر پر شدے پورنے لو اسطہ عہدی اسپیشل کمشنری واسطے حاضری و تجویز بیست مالگذاروں کے علیحدہ دفتر کھولا اور کلاں امام باڑہ میں عدالت فوجداری قائم ہوئی۔ یہ حکومت کے قبضے پر مدت تک پبلک خاموش رہی یہاں تک کہ شمس العلما سید محمد ابراہیم مجتہد نے اعلیٰ افسران حکومت سے احتجاج کر کے ملٹری کو ہٹایا اور ۱۲ جون ۱۸۸۴ء کو فوج انگریزی ہٹی اور یہ مقامات واگذار ہوئے ٹیلہ کی مسجد مسلمانوں کو دے دی اور مسجد آصفی میں فرقہ شیعہ کی جماعت شروع ہوئی جو آج تک جاری ہے۔

۱۸ شوال ۱۳۳۳ھ کو جب لکھنؤ میں مسلسل بارش سے طوفان باد و باراں آیا اور ساتھ ہی اس کے گومتی بڑھی مکانات گرے اس وقت امام باڑہ نے پبلک کو پناہ دی یہ ۱۹۱۵ء کا سیلاب تھا جس پر شعرا نے مستقل مثنویاں تیار کیں۔ افسوس ہے کہ حکیم سید محمد نواب صاحب مرحوم کی مثنوی عالم آب میرے سامنے نہیں ہے۔ ایک دوسرے شاعر ہاشم انصاری کے تاثرات ملاحظہ ہوں ؎

نوح کے طوفاں سے کچھ کم نہ تھا طغیان آب | لکھنؤ سا بہہ گیا جس سے کہ تھا لاجواب

ابر طوفاں زا کا وہ اللہ رے جوش و خروش | دامن دریا ہوئی تھی شہر کی سطح تر آب

۱؎ صفحہ ۱۱۶ اخبار ماتم مقامات ۲؎ احسن التواریخ ص۱ ۳؎ اس تاریخ کے مصنف کے پردادا کے والد ۴؎ مصنف کے دادا

بعض سڑکوں پر گذر ممکن نہ تھا کشتی بغیر — موجزن تھی ہر طرف یہاں گومتی کی جوئے آب

مسجدوں اور تعزیہ خانوں میں دی ان کو پناہ — جب ہوئیں بے خانماں پردہ نشیں عصمت مآب

کلکِ ہاتف نے لکھی تاریخ طوفاں خوب ہے — آب باراں سے مٹی اب لکھنؤ کی آب و تاب

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں دریا بڑھا اور ۱۹۱۵ء کے نشان کو بھی مات کر دیا اور اس ہلاکت آفریں موقع پر بھی جن لوگوں کے گھر اجڑے وہ امامباڑہ میں بھر آئے اور مہینوں ٹھہرے رہے ان مواقع پر لوگ سمجھتے تھے کہ آصف الدولہ نے امامباڑہ اسی مقصد کے لئے بنوایا تھا کہ بے گھر پناہ لیں ۔

کانگریس گورنمنٹ کی مخالفت میں مدح صحابہ کی تحریک نے اسی امامباڑہ سے فروغ حاصل کیا اور ہزارہا شیعہ جیل گئے ۔ گولی چلنے پر بھی ایجی ٹیشن جاری رہا اور سڑک کا نام تبرا نگر ہو گیا یہاں تک کہ مدح صحابہؓ کی تحریک ختم ہوئی ۔ امامباڑہ قومی تحریکوں میں کام آتا رہا اور اس عمارت پر مشہور اہل قلم چکبست کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوانِ بلند — جس کی صنعت کا ہے دنیا میں نرالا انداز

پارۂ چوب کے احساں کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے ملکر یہ کھایا اعجاز

اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ — ہے یہ تہذیب اودھ کے لئے سرمایۂ ناز

جس کے فیضان حکومت کا کرشمہ ہے یہ — اس کے سایہ میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز

اس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اس کی — اس کے اخلاق کی وسعت کا ہے اس میں انداز

جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں — چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پا مہ اینجا کہ عجب درگاہ است — سجدہ گاہِ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد نواب محسن الدولہ ٹرسٹی حسین آباد نے امامباڑہ کی اس سامان کی فہرست جب انگریزوں کے سامنے پیش کی جو انگریز لوٹ کر لے گئے تھے اس سامان کی قیمت شاید ۲۶ لاکھ روپے قرار پائی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ امامباڑہ سے سکے در و دیوار قد آدم آئینوں سے ڈھکے ہوئے تھے سونے چاندی کی گھڑیاں اور جواہرات جڑا ہوا سونے کا آرائشی سامان کثرت سے لگا ہوا ہے چار پانچ سو بلوری جھاڑ چھتوں میں لٹکے ہوئے تھے اور دو ہزار فرشی جھاڑ زمین پر رکھے ہوئے تھے ان میں بے شمار کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں ان کی روشنی میں طلائی مرصع سامان آرائش کا عکس آئینوں میں پڑتا تھا تو ایک نور کا دریا لہریں لیتا ہوا نظر آتا تھا (قومی آواز ۲۳ نومبر ۱۹۵۹ء)

امامباڑہ میں عشرہ محرم اور دیگر تاریخوں میں وقف کی طرف سے شاندار مجلسیں ہوتی ہیں عمدہ تبرک تقسیم ہوتا ہے ۔ سیکڑوں غربا، فقرا، محتاج مسافر اب بھی حصہ سے شکم سیر ہوتے ہیں امامباڑہ میں ذاکرین کے سلسلے میں مرثیہ خوان سوز خوان حدیث خوان تنخواہ پاتے ہیں اور نواب کی قبر پر روزانہ قرآن خوانی ہوتی ہے کتاب خوان اور نثر خوان اب باقی نہیں ہیں دور اول میں ہر صنف ذاکری کو اعلیٰ مشاہرہ ملتا تھا علاوہ شاہی مجلسوں کے پبلک کی طرف سے کسی قومی یا مذہبی تحریک کے موقع پر اگر ایسا کیا جاتا

---

۱ میم و طوا از چکبست لکھنوی ص۹ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۶ء چکبست کی رحلت ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ہوئی ۔

[illegible] کسی امام باڑہ میں نہ تھی اس موقع پر امام باڑہ آصفی اجتماع کے لئے منتخب ہوتا مجتہد العصر والزمان سلطان العلماء [illegible] کی امامت [illegible] کو ممتاز العلماء کی اقتدا میں اسی امام باڑہ میں ہوئی۔ اگر میری یادداشت مدد کرتی ہے تو میری [illegible] پہلے امام باڑہ میں پہلی مجلس نواب آغا تو صاحب مرحوم کی طرف سے ہوئی جس میں مولوی عنایت علی ساماں کی گنٹہ [illegible] بہار ہند کے مؤلف اور [illegible] تک زندہ تھے دوسری تقریب [illegible] میں فرقہ وارانہ کشمکش دور ہونے پر برابر ہر دو دن ہوئی۔ [illegible] کی طرف سے مولانا عبدالشکور صاحب اہل سنت کی طرف سے مجلس عزا ہوئی جس میں مولوی سبط حسن صاحب نے اپنے آغاز کمال میں فصاحت کے دریا [illegible] اور مولوی محمد حسین محقق ہندی نے جن کی قادر الکلامی کا آج دور دورہ تھا آیہ مجمع البحرین آپ شور دشیریں کی یکجائی پر سحر آفرین [illegible] ایک تیسرا موقع مرزا محمد تقی شیرازی مجتہد اعلم فرقہ شیعہ کی فاتحہ خوانی کا اجتماع عظیم اور مولوی سبط حسن کا خطیب اعظم ہو کر منبر [illegible] ارشاد [illegible] اور سید ابو محمد صاحب ریٹائرڈ ممبر پبلک سروس کمیشن یو پی نے مجلس کی اور چشم و چراغ میر انیس سید [illegible] عرف دولہا صاحب مرثیہ خواں، المتخلص بہ عروج رئیسے۔ اس کے بعد تبرا ایجی ٹیشن کے اجتماع مسلسل اور متواتر ایسے [illegible] ہوئے جو گولی چلنے پر بھی درہم برہم نہ ہوئے۔ حافظ اکرام کا بیان امام باڑہ رقیہ ماتع کے حال میں آئے گا۔

امام باڑہ نواب حسن رضا خاں

سرفراز الدولہ نواب مرزا حسن رضا خاں کے باپ کا نام مرزا علی رضا اور دادا خاں بیار خاں شاہجہاں بادشاہ کے معتمد خاص تھے اگرچہ بے پڑھے لکھے تھے مگر فارسی بول چال میں مہارت تھی دس ہزار آدمی ان کی سرکار سے فیض پاتے تھے اور پرورش ہوتی تھی شعر و سخن میں بھی بہرہ ور تھے رضا تخلص تھا شعراء کے بڑے قدر داں تھے۔ مرزا علی خوشتر نے ایک قدیم بیاض سے ان کے چند شعر نقل کئے ہیں ؎

ٹپک رہی ہے ہواؤں سے کچھ عجب مستی — چمن میں آج مقرر کوئی شراب ہے
وہ گل کی طرح نہ آئیں گے آج بھی ہمدم — کہ آپ ہی آپ مرے دل کو اضطراب ہے
رضا کی لاش جو مزار اے رہ میں تھی — اسے نثار رہ ہو خاک تو تراب ہے

قدرت نے ان کو قیامت کا سلیقہ دیا تھا اس زمانے کی خطرناک سازشیں جو آن واحد میں امیر کو فقیر کر دیتی تھیں ان کی سیاست کے سامنے تار تار ہو جاتی تھیں آصف الدولہ بہت عزیز رکھتے تھے نواب وزیر یا نواب بھائی کہہ کر بات کرتے تھے۔

آپ نے دو امام باڑہ اور مسجدیں بنوائیں۔ ایک امام باڑے کا ذکر کتاب کے پہلے باب کیمپ باغ کے ذیل میں آچکا اور دوسری امام باڑہ ان کا آصفی امام باڑہ کے نزدیک نقار خانہ کی سائڈ پر تھا جہاں گورنر گارڈن اس وقت ہے یہ امام باڑہ کالا امام باڑہ کہلاتا تھا۔ اور مسجد بھی حسن رضا خاں کی اسی جگہ تھی سنہ ۱۲۱۱ھ میں جب راجہ ٹکیت رائے نائب سرفراز الدولہ کے پیش کردہ حسابات راجہ جھاؤ لال کی جانب سے مشکوک ثابت ہوئے اور مرزا حسن رضا خاں کی بھی خود سلطنت سے غفلت ثابت ہوئی تو نواب کا ارادہ ہوا کہ ٹکیت رائے کو معزول کر دیں۔ ٹکیت رائے نے جب دیکھا کہ میری آبرو پر بن جائے گی تو مرزا صاحب کے پاس اپنا قصور معاف کرنے پہنچے اور نماز سے فراغت کر کے امام باڑہ میں رو برو ضریح مبارک ریاست پڑھ رہے تھے ٹکیت رائے قدموں پر گر پڑے اور عرض کی۔ [illegible] آپ کے ہاتھ ہے۔ مرزا صاحب نے رحم دلی سے کام لیا اور ضریح کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ اگر میں منیب رہوں کا تو تم

مطمئن رہیں نائب رہو گے اطمینان رکھو تمہارے علاوہ کسی اور کی نیابت قبول نہ کریں گا حسن رضا خاں کی صورت میں بہت مل کی بہت میں ہو گی اور سرفراز الدولہ عہدے سے ہٹ گئے نواب کی بارہ دری کا ذکر بارہ دریوں میں آئے گا۔

شیخ عابد علی: - شیخ عابد علی جہد شاہی کے نامور پیراک تھے اور حاجی احمد علی عرف نھے مرساکے شاگرد تھے حاجی صاحب ان کو ایسا صاحب کمال سمجھتے تھے کہ اپنے بیٹوں کی موجودگی میں شیخ جی کو اپنا جانشین بنایا یہ ہے رہانہ شاہی کے پیراک کا شیخ عابد علی بدفاتر ہوا شیخ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مرگئے اور موضع بری برائن کے باغ میں دفن کئے گئے سو برس کے قریب عمر پائی۔ شیخ عابد علی تیر کو پیراکی سے مثل پیرتے تھے اور ڈیلوٹ کی پیراکی بھی نہایت اچھی پیرتے تھے۔ صفت یہ تھی کہ پانی سے بھرا ہوا کٹورہ پیروں کے تلووں پر رکھ دیا اور یہ پیرتے چلے جاتے ہیں محال کیا کہ پانی کٹورے سے چھلک تو جائے اپنے جسم کو بے حد قائم رکھتے تھے۔ ایک خاص صفت عابد علی میں یہ تھی کہ کنارے پر بیٹھے ہیں اور کسی کو ڈوبتے دیکھا پس پلک جھپکتے اس کے پاس پہونچ گئے اور پھول کی طرح اٹھا لیا۔ عابد علی دریائی کشتی یعنی جلبا تک بھی خوب جانتے تھے۔ بہت سے پیچ در پیچ جانتے تھے کھڑی لگانے کے بھی استاد تھے برسات کے موسم میں جبکہ دریا خوب پر طغیانی پر ہوتا تھا یہ موضع کانکڑا باد سے دریا میں اترے اور اپنے سینے پر ایک لکیر سالی اور کھڑی لگاتے چلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی پر کھڑے ہیں مطلق جسم کو حرکت نہ ہوتی تھی اور نہ وہ لکیر بھیگنے پاتی تھی غرض یہ کہ اسی طرح کلا گھاٹ تک آتے تھے۔ (قدیم ہنر ص ۱۳۵)

زنانہ گھاٹ

اس گھاٹ کو خواجہ عشرت نے رومی دروازے کے داہنی طرف بتایا ہے اور میرا گمان ہے کہ اس گھاٹ کا نام بعد میں کلیا گھاٹ ہوا ہے اب کلیا گھاٹ بھی اصل حالت پر نہیں رہا۔ ۴۰ سال پہلے کا ذکر ہے جو سڑک رومی دروازے سے داہنے ہاتھ پر جاتی ہے وہاں دریا کی طرف ایک تنگ و تاریک نیچی سڑک گئی تھی جس کے کنارے بورڈ پر لکھا تھا " یہ صرف ہندوؤں کا گھاٹ ہے یہاں پانچ برس کے بچے کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس راستے میں دو دو پردہ کے لیے بیول کے درخت تھے۔ ہم مذکور کے باوجود مسلمان اس راستے سے گذرتے تھے مگر ساحل تک پہونچ کر بائیں سمت ان کا جانا ممنوع تھا زمانے کے گزرنے سے دریا کے کنارے کے۔ تین منٹ پر پڑے کے طلسم ٹوٹی اور یہ صرف ہاتھ برابر ہو کر درخت گرے انگریزوں کے وقت کا بورڈ بہتر ہونے کے باوجود عرصہ ہوا کہ ہٹ پڑا ہندو و مسلم عورتوں میں بے پردگی کا عام رواج ہوا وہ گول دروازہ، سعدی ٹولہ، چوڑی والی گلی کے معزز محلے کی وہ عورتیں جو گومتی اور صبرے مر جاتی تھیں مرگئیں با کرامت حسین گرلز اسکول کی تعلیم سے ذہنیت تبدیل ہونے سے ان کے ملتے دیا و قات بدلے اور ۴۰ سال پہلے کا کلیا گھاٹ کمف دست میدان ہوا۔ حامد صاحب نے اپنے ایک مقالے میں زنانہ گھاٹ کا حال لکھتے ہوئے اس حقیقت کو بے نقاب کیا تھا کہ یہاں راجہ جھرا کا مکان تھا اور وہ عمارت مکان بے کیں کی صورت میں ان کے وقت تک موجود تھی مجھے اس علاقے میں راجہ جھرا کا مکان ہونے کی تصدیق میں کوئی عذر نہیں ہے۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنے مراسم بڑھانے راجہ جھرا سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم پیر خاں کی گڑھی سے اٹھ کر ہمارے قریب آ جاؤ اور کسی آباد جگہ کو پسند کرو تو تمہارے لئے ایک عمارت بنوا دی جائے۔ راجہ جھرا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی شریف آدمی کا مکان لے کر میرے لئے عمارت بنائی جائے اگر دریا کنارے زمین جہاں ہو اگر اس پر عمارت بنے گی تو میں خوشی سے رہوں گا اس واسطے ان کی عمارت

آبادی سے دور دریا کے کنارے خوانی گئی اور بیکار زمین آباد ہوئی۔[1]

مخدوم شاہ مینا

لکھنؤ کی پہلی مسلم بستی یہی علاقہ ہے جس پر اس وقت شاہ مینا روڈ کا سنگی بورڈ لگا ہے یہاں سب سے پہلے کون آیا؟ اس سوال کے جواب میں شیخ عبدالحق دہلوی کی رائے سے کچھ مدد ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کا زمانہ حکومت ۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء یعنی ۷۵۲ھ سے ۷۹۰ھ تک تھا اس عہد سے پہلے یہاں "حاجی الحرمین" آئے حاجی الحرمین نام نہیں ہے بلکہ جو شخص مکہ و مدینہ جا چکا ہو اس کو حاجی حرمین کہتے ہیں چونکہ اس زمانے میں پیادہ حج ہوتا تھا اس لئے لقب کی بڑی اہمیت تھی اور شہر میں حاجی وہ ایک ہی تھے نام آپ کا قوام الدین تھا اور رہنے والے بھی دہلی کے تھے چھیاسٹھ مرتبہ حج کر چکے تھے اس لئے نام پر صفت غالب آگئی سلسلۂ نسب میں عباسی تھے اور ان کے پیر و مرشد شیخ نصیر الدین اودھی (وفات ۷۵۷ھ) تھے جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت جلال الدین حسین بخاری (وفات ۷۸۵ھ) کے قائم مقام تھے سلسلۂ خلافت میں اوپر کی کڑیاں بھی کتابوں میں تلاش کرنے سے ملتی ہیں جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے آپ نے اسی میدان میں چھپر ڈالا اور ایک عرصے کے بعد پختہ خانقاہ بن گئی جس کے آثار ۱۸۵۷ء تک اس مقام پر دیکھے گئے ہیں جہاں میڈیکل کالج کے پروفیسروں کے بنگلے ہیں یہی پہلا نقطۂ آبادی ہے جو پھیل کر شہر ہوا۔

مخدوم قوام الدین کو شروع ہی سے کچھ ذوق تھا اور صوفیت میں ڈوبے ہوئے ان کے اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ؎

میراں سمند وحدت یا مال کن دو کون   اے شہسوار قرب چہ ریاست صفدری

"توحید کے گھوڑے کو دونوں کونین کو پامال کردے اے قرب الٰہی کے شہسوار یہ کس قدر اعلیٰ دلیری ہے" شاید یہ ایک حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے جو بہتیرے علماء کی کتابوں[2] میں نقل کردہ ہے دوسرا شعر ان کا یہ ہے ؎

نادیدہ رخ دوست مراں لاف تجلی   زیں پرتو عیاں است قوام فکر نگہدار

بے نور رخش حسن و جمالش نتواں دید   بے تابش خورشید نتواں دید رخ یار

یہ لاف گزاف صحیح نہیں ہے کہ جمال یار کی تجلی ہو چکی ہے کیونکہ یہ چیز بالکل ظاہر ہے اور اس کو خوب یاد رکھو کہ خود اس کے نور رخ روشن کے بغیر اس کا حسن و جمال نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ سورج کی روشنی کے بغیر رخ یار نظر نہیں آ سکتا۔

فقیرانہ زندگی میں بال بچے انوکھی بات ہے مگر حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی شرع میں ترمیم کرنے نہیں آئے تھے ان کی گھریلو زندگی کی کچھ کرامتیں گڑھ کا واقعہ بی بی موجود ہونے پر گواہ ہے غرض انہیں کا ایک بیٹا تھا جس کا نام شیخ مینا تھا اور صاحبان تحقیق کے نزدیک یہ نام درست ہے بلکہ چھ سو برس پہلے میاں کی لفظ مینا کہی جاتی تھی مثلاً آج جس کو قطب میاں کہا جائے تو اس وقت "قطب مینا" کہتے تھے۔ بیٹا باپ کے اقتدار روحانی سے فائدہ اٹھا کر فوج میں ملازم ہوا باپ دنیاوی ترقی پر خوش نہ تھے فقیرانہ زندگی کے خلاف دنیا پرستی تھی۔ لوگوں نے بیٹے کو باپ کی ناراضگی کی خبر دی اور یہ جواب پایا کہ میں قبلہ گاہی کو گھر پہنچ کر راضی کر لوں گا کچھ ڈر نہیں۔

حاجی الحرمین نے جب یہ ارادہ سنا تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ کمبخت یہاں آئے اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ

[1] نیرنگ ادب صفحہ — [2] قال الشیرازی چہارم علی شاہ مدار دل سوار۔ اور حدیث یہ ہے حمل فی السبعة وائر رسالہ وجل فی علی الفرد سبحانہ رمع المطالب

جو ہونہار لڑکا گھر سے دور قضاء الٰہی سے مرگیا اور فقیر نے جو کہا تھا وہی ہوا گھر آنے کی نوبت نہ آئی۔ شاہ آئی مگر شیخ کے سمجھانے
بجھانے پر لوگوں نے پرسا دیا وہ خاموش تھے اور بزم عزا کی مہر سکوت یوں توڑی گئی کہ شیخ نے اپنے ایک چیلے قطب الدین کی طرف
اشارہ کرکے کہا کہ اس کے لڑکا ہونے والا ہے وہ مرنے والے کا نعم البدل ہوگا اسی سال شیخ قطب الدین کو خدا نے اولاد عطا کیا
دیا اور بیٹے کا نام محمد رکھا حاج الحرمین اس بچے کو "شیخ مینا" کہتے رہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس بچے نے آپ کی بیوی کا دودھ پیا
مگر یہ صراحت نہیں ہے کہ کس بچے کا دودھ پیا اور وہ بچہ کیا ہوا اس کا کیا۔ م تھا یا کرامت سے دودھ اترا غرض نومولود کی پیدائش
کے مژدہ کے ساتھ کہیں ذکر نہیں ہے کہ حاج الحرمین نے عملاً اس کو اپنا قائم مقام کیا بلکہ اس بات کی صراحت ہے کہ صحبت کے ایک مرید
شیخ سارنگ :۔ کی طرف توجہ مبذول رہتی تھی۔ اور انھیں کو گدی نشین کرنے کا ارادہ تھا جب حاجی صاحب کا آخر وقت ہوا تو
شیخ سارنگ سامنے نہ تھے کہا افسوس سارنگ موجود نہیں ہے خرقہ کس کو دوں۔ بہتر ہے کہ قبر میں لیتا جاؤں اور ایسا ہی کیا۔ اور
یہ کہہ کے آستین کی دے کر پاس والوں سے کہا کہ جب سارنگ آئیں تو ان کو دیدینا سارنگ نے اس خرقہ کو وسیلہ حاصل کرکے
مدتوں اپنے پاس رکھا حاج الحرمین کی قبر میڈیکل کالج کے کنگ جارج اسپتال کے پورب دروازے کے نزدیک بس اسٹینڈ کے
سامنے ہے یہ حادثہ آٹھویں صدی ہجری کے شروع کا ہے شیخ سارنگ رہنے والے اس بستی کے تھے جو بھوپال تال کے قریب
تھا اس کا وطن اب بھی ہے اور شیخ سارنگ کا مطلب یہ ہے کہ شیخ بھوپال مثلاً اور بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ وہ سیاہ فام شخص
تھے اور اس وقت کے لب و لہجے میں سیہ رنگ ان کی پہچان تھی جو کثرت استعمال میں سارنگ ہوگئی۔ آپ کو حاج الحرمین کی
خدمت میں مدتوں رہنے کی توفیق حاصل ہوئی تھی آخر عمر میں آپ اس گدی کو چھوڑ کر مجگواں چلے گئے اور وہیں ۷ شوال ۸۵۵ھ
کو آپ کا وصال ہوگیا یہ مقام اس وقت مضافات لکھنؤ میں تھا اور آج کل کے جغرافیہ سے دو وہ ضلع بارہ بنکی سے چار میل
پر واقع ہے لکھنؤ سے دیوہ تک پختہ سڑک اور وہاں سے مجگواں تک کچی راہ ہے ان کی قبر پر عرس ہوتا ہے علی حتری ۱۹۳۶ء
لاہور میں عبداللہ علم صوفی نے ان کا عرس ۱۲ شوال اور سن وفات ۸۶۵ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے اور کتابت کے
اعداد کی اختلاف میں مدخلیت ہے۔

شیخ سارنگ کی بہن فیروز شاہ تغلق کو بیاہی تھیں اور یہ لاکھ کے گھر کو خاک سمجھ کر حاج الحرمین کی صحبت میں اپنے راحت
اور سحر سمجھتے تھے شیخ سارنگ کو راشد قتال سے بھی خرقہ ولایت حاصل تھا اور ان کو قتال اس وجہ سے کہتے تھے کہ ان کی نظر
کے سامنے جو مشرک آیا کلمہ پڑھنے لگا۔ نام ان کا صدر الدین تھا شیخ سلسلہ کے لحاظ سے اور سید حسب کے لحاظ سے تھے۔ حالات میں
مذکور نہیں ہے۔

شاہ مینا :۔ گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا کہ حاج الحرمین کے بیٹے شاہ میاں صاحب پردیس میں مرگئے تو شیخ کی صحبت کے ایک مرید نے اپنا
بچہ فرزند کا نام شاہ میاں رکھا اور اس طرح غریب الوطن فرزند کی یاد کو تازہ کیا اور ان میں حاج الحرمین کے وقت
خلافت جانشین ہونے کی صلاحیت رہتی قائم مقامی شیخ سارنگ نے کی۔ مگر وہ عزم واراده کہ باپ کا قائم مقام مرجانے سے بیٹا۔ ہو سکا
سے پہلے اسی کا قائم مقام ہو کر گدی پر آئے بلا فاصلہ تو پورا نہ ہوا شیخ سارنگ کے وسیلے سے اس طرح پورا ہوا کہ انھوں نے ۱۲۰

۱آپ ۶ جمادی الآخر ۷۸۳ھ کو ملتان میں ملک بقا کے راہی ہوئے ان کی لحد زیارت گاہ خلق ہے اور ماہ تاریخ اس طرح موجود ہے ع ولی خدا الدجهان رفتہ گئے

برس کے بعد بھی فقدان اس مرحلے میں بڑھاپے کے سبب سے بھلا روزہ کہاں رکھ سکتے تھے دن کو بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور چونکہ رمضان شریف کا تھا شاہ مینا حاضر خدمت تھے اور روزہ تھا استاد کو کھانے پر دیکھ کر دل میں آیا کہ اس وقت ان کا اشغل کھانے کا اچھا موقع ہے ساتھ روزہ بھی ہے رکھ کر کفارہ دیدوں گا شیخ قیافے سے سمجھ گئے اور ترش ہو کر کہا کہ مجھے تو شریعت نے اجازت دی ہے مگر تم روزہ توڑنا سخت گناہ ہے اگر یہی آرزو ہے تو رات کو میرے ساتھ کھانا کھا لینا شاہ مینا افطار کے وقت آئے اور اسی کھایا ہم طعام ہونے سے ان کی خلافت ثابت ہے اور کہا جاتا ہے کہ شیخ سارنگ کے دو خلیفہ تھے۔ حسام الدین صوفی اور شاہ مینا۔

دلچسپ، فوائد سعدیہ میں شاہ معظم علی نے حالات شاہ مینا لکھے ہیں۔

میاں قطب الدین انصاری کی لال کی قبر میں جلالا مست کے اکھاڑے کی زمین رہیں اور مکان ان کا سنر منڈی رجوعہاری محلہ، میں تھا یہ ساری سرگزشت اہلسنت وجماعت کے کئی تذکروں اور سوانح حیات سے ماخوذ ہے جس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ بڑی شخصیتوں میں صحیح حالات کی تلاش بڑا اہم کام ہے خصوصاً اس کی زندگی پر بحث جس کے زمانے کو پانچ سو برس گذر چکے ہوں، اس لئے میں اس سلسلے میں دو رائیں اور درج کرتا ہوں جس میں ایک رائے 'میل'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اگر یہ کتاب عرفی میں ہیرد قبل ہوتی تو میں قبل کے بعد لکھتا کہ بعض کہتے ہیں کہ شاہ مینا کشمیر کے رہنے والے تھے ان کے باپ کا نام محمد مختار تھا چونکہ شعر و سخن سے شوق اور مینا تخلص تھا اس لئے وہ شاہ مینا مشہور ہو گئے کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ مخطوطات میں ملفوظات شاہ مینا ایک کتاب پائی جاتی ہے جو ان کی یادگار ہے آخری رائے یہ ہے کہ نام ان کا تاج الدین تھا اور وہ مشہدی کہے جاتے تھے چنانچہ حافظ عبدالسلام صاحب رئیس پھانی ٹولہ لکھنؤ کی مہربانی ہے ان کی نسل کے سید منتظم حسین انادے آتے تھے اور فخر کہتے تھے کہ ہم شاہ مینا کے خاندان سے ہیں اور ہماری ابائی زمینداری جس پر کورٹ کے فیصلے اور حکام کے تجاویز گواہ ہیں۔ دعوے کی دلیل ہیں۔

شاہ مینا کا مزار کئی سو برس سے آباد اور میڈیکل کالج کی زمین پر ایک نو تعمیر بڑی مسجد سے قریب واقع ہے ۲۳ صفر ۸۸۴ھ ان کی تاریخ وصال ہے میرے نزدیک اس موقع پر آزاد بلگرامی کی رائے ۸۷۰ھ صحیح ہے اور مزید سہولت کے لئے اس سلسلے کے اسمار اس شجرے سے واضح ہو سکتے ہیں جو سلسلۂ بیعت ہے۔

یہ سلسلۂ نسب ——— جلال الدین حسین بخاری
|
نصر اللہ اودھی
|
حاج الحرمین قوام الدین دہلوی
|
شیخ سارنگ
|
شاہ مینا

سلہ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان عربی

قوابی میں شاہ مینارہ وزیادہ سے زیادہ آبادتھی بعض خبروں سے واضح ہوتاہے کہ مینا بازار بھی اسی علاقہ میں تھا محلہ کوئن میری اسپتال تک پھیلا ہوا تھا۔ داروغہ عاشق علی کے بھائی قمرالدولہ خواجہ محمد سلیم عرف علی جان جو مصاحب خاص امجد علی شاہ اور ملازمت کوبادشاہ کے کرے کے پاس سوتے تھے ان کا سکونتی مکان کوئن میری اسپتال کی جگہ تھا۔ مچھی بھون بارود سے اڑانے کے سلسلے میں یہ سب مکانات منہدم ہوئے۔

شاہ عبدالرحمٰن کا مزار شاہ مینا پر ٹھہرنا

مادرچی قول کے حال میں ہم لکھ چکے ہیں کہ شاہ عبدالرحمٰن مزار شاہ مینا صاحب میں ٹھہرے اور عہد سعادت علی خاں تک ان کا قیام اسی جگہ تھا غوث میں مولوی انورعلی صاحب کا بیان اور پوری شو برس کی روداد ملاحظہ ہو۔

زمانہ سعادت علی خاں میں حضرت شیخ مسجد مخدوم شاہ میناکے تشریف رکھتے تھے اس زمانے میں مولوی ذوالفقار علی رہنے والے دیوہ کے مولانا کی تکفیر کے فتوے لے کر سعادت علی خاں سے استدعا کی کہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں ان کو شہر سے خارج کر دیجئے نواب نے اس عرض کو مولوی مدن خاں استاد اپنے کو ملاحظہ کرایا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ایسا عالم بادرسانہ کا حسن اتفاق سے تمہارے شہر میں وارد ہوا ہے جو لوگ فتوی تکفیر کا دیتے ہیں انھیں کو حکم ہو کہ ان کے پاس جاکر تحقیق ایمان کریں۔ دریں کہا کہ اگر ایسے عالم ہیں تو ان کو ہمارے پاس لاؤ عرض کیا گیا کہ بادشاہ و وزیر سے کلام نہیں کرتے۔ روز وشب اپنی مسجد میں مشغول رہتے ہیں۔ تعارف کے بعد نواب کو ملاقات کا شوق ہوا اور پہلے شاہ عبدالرحمٰن سے "ادخوا ابدا حت رزدی علی + افتخار ہر بی دہر دل" کے معانی پوچھے موصوف عقیدت میں ڈوبی ہوئی ایسی تقریر کی کہ خود قصر حکومت سے ———

مکان بھوانی مہرا:- دیکھنے کے جلسے جو مخدوم شاہ مینا کے قریب رہتا تھا آئے اور قریب پہونچ کر پوچھا کہ مولانا کہاں ہیں ہرکارے نے جاکر دیکھا تو آپ غائب تھے نواب مایوس چلے گئے۔

شاہ صاحب موصوف نے اپنے مقام سے ایک ضرورت مندکو رقعہ لکھ کر دیا تھا کہ سبحان علی خاں کو دیدو وہ تمہاری مالی امداد کریں گے سبحان علی خاں نے رقعہ دیکھ کر جواب دیا کہ ہم عبدالرحمٰن بن ملجم قاتل جناب امیر کا کہا نہیں مانتے رقعہ کو پھینک دیا اور شاہ صاحب کی شان میں کچھ سخت کلمات بھی کہے۔ جانے والے واپس ہوکر ماجرا بیان کیا اور شاہ صاحب نے دوسرا رقعہ لکھا سبحان علی خاں تم تو خوب سمجھا مگر تجھے بھولی معلوم ہے کہ آقا جناب امیر نے اپنے قاتل کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ جو شربت اس حالت میں آپ کے لئے آیا تھا وہ پلایا تجھ کو پیروی اپنے امام کی کرنا چاہئے سبحان علی خاں نے کہا واللہ مولانا مس نہیں رکھتے۔

راج گھاٹ

مسلمانوں کے نہانے دھونے کے لئے یہ پختہ گھاٹ بنایا گیا تھا اور بعض واقعہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں راجہ مہرا کا ہاتھ تھا۔ اس گھاٹ کے آثار اور ایک برجی اب بھی باقی ہے لکھنؤ میں اموات علماء اور رؤوسا معروف جلتے کو یہاں غسل دیا جاتا ہے۔ مقبرہ سید طباطبائی بھی اسی علاقے میں کہیں تھا۔ سید صاحب عہد صمصدر جنگ میں حاکم نگینہ تھے برہان الملک کے ساتھ ادھر گئے اور بعد

---

۱ ۔ بیگ اودھ ۵ ہ محمد العین ص۱۳۱ ۲ اس جملے سے واضح ہوکہ مزار کی مسجد قدیم عمارت کا نقش ثانی ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ پہلی مسجد کتنی بڑی اور کس شان کی تھی ۳ ارشاد الرحمٰن اقتباس تنویرالرحمٰن مطبع گنگا پرشاد دوار ایس آباد ۱۸۹۰ء ص۱ ۴ ارشاد الرحمٰن ص۱

بعد ہنگام مرگ یہ دریائے گومتی کے ساحل سے قریب دفن ہوئے اور عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا اس مقبرے کا بھی کوئی جز باقی نہیں ہے
سید احمد طباطبائی :- خوشنویس تھے عالموں میں بہت باکمال شخص تھے ہر شخص ان کی قدر و منزلت کرتا تھا قرآن شریف ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے لوگ آنکھوں سے لگاتے تھے مؤلف قدیم ہمر لکھتے ہیں کہ مقبرہ ان کا راج گھاٹ میں دریائے گومتی پر تعمیر ہوا اور وہ مزار پاک مرجع ارباب حاجت تھا لوگ پھول اور چراغ لاکر روشن کرتے تھے ۔ یہ بیان طلسم ہند سے ماخوذ ہے اور میری رائے یہ ہے کہ ہر دو مؤلفین میں نام لکھنے کا اختلاف ہے مقبرہ ایک تھا سید مصطفیٰ طباطبائی اور احمد طباطبائی کے دو مقبرے اس علاقے میں محتاج ثبوت ہیں ۔
طباطبائی وہ خاندان سادات ہے جس کے مورث اعلیٰ اسمٰعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی تو تلے تھے درزی جب ان کی قبا سی کر لایا تو وہ کہاتے تھے کہ طبا طبا کہہ رہے جو طباطبائی نسل مشہور ہو گئی

راج گھاٹ کا بھی کلام شعرا میں ذکر ہے ریختی میں ہدایت لکھنوی کا ایک شعر میرے سامنے ہے جس کا پہلا مصرعہ نامناسب ہے آخری مصرعہ ملاحظہ ہو ؎ مستی ہوں راج گھاٹ پہ لاکھوں اتر گئے

احاطہ رمضان علی خاں

پکے پل سے لوہے والے پل تک نواب سعادت علی خاں کے سالے نواب رمضان علی خاں کی کوٹھیاں، باغات، اصطبل تھے اور احاطہ رمضان علی خاں مشہور تھا بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ سنہرا برج بھی اسی طرف تھا ۔ یہاں ایک ——— مسجد عرف ماتی ہے اس مسجد کا نام اس وقت خانہ خدا تھا آج اس کے دونوں طرف دو سڑکیں چلتی ہیں عوام اس کو جنوں کی مسجد کہتے ہیں مسجد تین دروزا اور اوسط درجے کی مسجدوں میں شمار ہے اس مسجد سے بعض اہل ہنود کو فوائد پہونچے اور ان کی مرادیں پوری ہوئیں اس لئے مسجد کی سپیدی اور انتظام کے چند وسیع الخیال غیر مسلم ذمہ دار ہیں نواب نے اس علاقے کی واپسی کے سلسلے میں جو ریذیڈنٹ کو تقرری سلطنت کی خبر دینے سے پہلے اس کے اخبار حقیقت اور مکر پر مارس میں وعدہ کر لیا تھا کہ اگر حکومت اودھ مل جائے تو علاقہ مذکور دیدوں گا ریذیڈنٹ نے اس وعدے کے بعد پروانہ تقرری دکھایا اور اس فریب پر مدتوں غور کرتے رہے آخر میں انگریزوں سے طے کیا تھا کہ اگر روپیہ دیدیا جائے تو صوبہ واپس مل سکتا ہے اسی وقت سے روپیہ جمع کرنا شروع کیا جس میں درختوں کے پتوں کی قیمت تک تھی جس دن خزانچی نے اطلاع دی کہ رقم پوری ہو گئی اس دن دربار میں منہ سے نکل گیا کہ کل ریذیڈنٹ کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے دیکھوں گا یہ ارادہ وہاں تک پہونچا اور اس نے رمضان علی خاں کو زہر دینے پر تیار کیا ۔ ان کے ہاتھ میں باورچی خانہ تھا یہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے جب یہ اقرار کیا کہ کل تخت پر رمضان علی ہوں گے اس وقت رمضان علی خاں نے یخنی میں زہر دیدیا اور نواب کو احساس ہوا کہ مجھے ارادے سے پہلے ختم کر دیا ۔ وہ ملک عدم کے راہی ہوئے مگر رمضان علی خاں وارث تخت نہ ہوئے ۔

محلہ سوٹی

یہ بستی آکر گرد نواح میں تھی اور یہاں نامور فضلائے و نبلائے ادب میر ببر علی انیس رہتے تھے اور ان کا قدیم مکان اور امام باڑہ تھا میر صاحب کے ہر دلعزیز ہونے کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس ایریا میں خاندان شاہی کے مکانات اور عمائد شہر کی کوٹھیاں ہوں وہیں کاشانہ

؎ طلسم ہند

انیس بنا یہ عمارت میر انیس کے ابتدائی قیامگاہ کی یادگار تھی جو غدر ۱۸۵۷ء میں مسمار ہوئی اور وہ حلقہ چوک میں منتقل مکانات پر ہو
ہوئے خاندان انیس کے باکمال مرد سید ظفر حسین عرف بابو صاحب فائق کے بیان سے واضح اور آشکار ہوتا ہے کہ راج گنج ...
سے آہنی پل ٹھنڈی سڑک ہوتے ہوئے جاؤ تو بائیں ہاتھ کی طرف ان کی املاک تھی اور ریلی گارڈ کے نزدیک جو پہاڑ ...
مسلمانوں کی قبروں کا تھا اس سے محلہ کے حدود دارالعہ میں ایک حد ملحق ہوتی تھی یہ وہ زمانہ ہے کہ میر انیس غزل گوئی میں بھی ...
ہیں مگر افسوس ہے کہ جس دن سے وہ مرثیہ گوئی پر متوجہ ہوئے پھر غزل نہیں کہی اور کلام ابتدائی بھی محفوظ نہیں رکھا جن لوگوں
کو ان کی غزلیں یاد تھیں وہ بھی صفحۂ ہستی سے رفتہ رفتہ اٹھ گئے جن یادداشتوں پر اس وقت کے ادبا نے ان کے اشعار لکھے تھے
وہ بھی ناقدر شناس ہاتھوں میں باقی نہیں رہے مجھے برسہا برس کی تلاش میں انیس کی غزلوں کے چند شعر دستیاب ہوئے ملاحظہ ہو

قطعہ۔ یئن کے افشاں لطف اس مرنے کی جو تاروں پر آسماں رشک سے لوٹا کیا انگاروں پر

رکھ کے منہ سو گیا ان آتشیں رخساروں پر دل کو چین آیا تو بیٹھا گئی انگاروں پر

حکایت ہے کہ ایک شخص ملنے آئے ملاقات ہوئی انیس اثنائے گفتگو میں کسی ضرورت سے زنان خانہ میں گئے انھوں نے سامنے
جو بیاض رکھی تھی اٹھا کر دیکھی تو اس کا یہ شعر صفحۂ دل پر نقش ہو گیا ؎

یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا دھواں آنکھوں میں لگتا ہے کسی کے دل کے جلنے کا

ولہ

دل لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

ولہ

لکھ کر زمیں پر نام ہمارا مٹا دیا ان کا ہے کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

میر مونس بھی غزل میں دوسرے شعرا سے کچھ کم نہ تھے ان کے مراثی میں کیا کچھ تغزل نہیں ہے بظاہر اس لئے کہ حضرت خلیق
نے جس وقت سے بیٹوں کو غزل کہنے سے منع کیا پھر غزل نہیں کی۔ مونس کی غزلیں اس قدر زبان زد ہو چکی تھیں کہ ہر طرف رقص و سرود
میں گائی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ دونوں بھائی کسی راستے سے گذر رہے تھے ایک شعر سنائی دیا۔ لطف زبان نے بے قصد وارادہ روکا اور
کہا کہ یہ زبان تو ہمارے گھرانے کی ہے جب پورا شعر سنا تو مونس کا نتیجہ فکر یہ تھا ؎

مونس کی گلستاں میں ابھی آنکھ لگی ہے اے بلبلو یہ شور مچانا نہیں اچھا

ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ مونس سوار ہو رہے تھے پالکی میں بیٹھتے ہوئے ایک عورت نے آکر کہا کہ اس مصرعہ پر مصرعہ لگا دیجئے

ع اتنی سی بلا میں مبتلا ہوں۔ فرمایا کہہ دو ع خالِ رخِ یار پہ فدا ہوں۔

امامباڑہ میر انیس :۔ میر انیس نے مرقومہ بالا محلہ میں ایک عالیشان امامباڑہ بھی بنوایا جو شیشہ آلات اور بہترین تبرکات اور ساز و سامان
سے آراستہ تھا یہ امامباڑہ جب تک تیار رہا تو جناب مفتی میر عباس نے تاریخ کہی۔ اس قطعہ تاریخ میں میر انیس کے کمالات اور ...
بھی موجود ہے ؎

یکتائے عصر میر علی آنکہ مثل او نے چشم چرخ دید نہ گوش جہاں شنید

آں سید امیں لقب عندلیب ماتمد   کاوصاف او تواں نہ زمین و زماں شنید
آں ذاکرے کہ گفت سر منبر آشکار   کر رازیکہ جبریل بگردوں نہاں شنید
آں نغمہ کہ سرنزد داز طائران قدس   در حیرتم کہ بلبل گلشن چساں شنید
ہر جا کہ خواند مرثیہ از بام و در تمام   گرسنگ ہا ما بود از ان ہم فغاں شنید
غیر از زباں ملک نتواند فغاں کند   آنکس کہ نظم پاک وے ارگوش جاں شنید
نازک دلے کہ ہرچہ بگفتند گوش کرد   آیا بہ حال دار مس ناتواں شنید
لعنتیم حرمت ہم زسر گذشت مس   از دیگراں اگرچہ دو صد داستاں شنید
آوازہ ساز عزاخانہ کہ ساخت   از کشش جہت ما دہ وہمگی سماں شنید
معمار وقت صحت ایں خانۂ عزا   شاید کہ بیتے از لب آں نکتہ داں شنید
ہر کس سر نیاز برایں آستاں گذاشت   آواز خیر مقدم کرد بیاں شنید
ہر ذرہ کہ بار دریں بارگاہ یافت   آیات نور خود درستہ جاوداں شنید
سید باین مقام رسید کہتم دید   کیفیتکہ از ارم دار جہاں شنید
چوں بر ضریح پاک نگاہ مس افتاد   آہے زدم کہ گوش کر آسماں شنید
سال بنائیش گشت رقم از سرالم   ایجا مدام نالہ زہرا تواں شنید ۱۲۷۱ھ

اس تاریخ میں اس چشمک کی طرف بھی اشارہ ہے جو انیس اور مفتی میر عباس صاحب کے درمیان میں ہو گئی ہے۔
انیس اس عزاخانہ میں دو تین برس سے زیادہ مجلسیں نہیں کر سکتے تھے کہ دست برد زمانہ نے متوکل عباسی کا کام کیا اور یہ یادگار حسینی بھی کھد گئی۔

امامباڑہ انیس سے قریب ہی میر خلیق کی قبر ہے اور یہ ایک عام تکیہ تھا جہاں وہ ۱۲۶۰ھ میں سپرد خاک ہوئے موزوں کس لالحاظہ

ایسا رحمی ہوا صحرائی بدن دولہا کا   ہو گیا بیاہ کا خلعت بھی کفن دولہا کا
شرم سے ملنے کو تو منع نہ کر سکتی تھی   تھی مگر چھوڑتی دامن نہ دولہن دولہا کا
رن کو جاتے ہیں تو کچھ تو بول تو ہم سے صاحب   کبھی دولہن کو یہ کھولا یہ سخن دولہا کا
شام کو لے چلے سر ننگے دولہن کو ظالم   بن میں لاشہ رہا بے گور و کفن دولہا کا
کہتا تھا کون ہے یہ دولہا دولہن کہتے حرم   باپ دولہن کا حسین اور حسن دولہا کا
شاہ روتے ہوئے میداں آئے جو خلیق   مر نا لس دل پہ دولہن کے گیا غش دولہا کا

حکایت: میر ضمیر اور خلیق ہمعصر تھے ضمیر علمی کمالات میں ممتاز اور خلیق جادۂ شریعت کے راہرو، لطف زباں کے بادشاہ درد کے عاشق ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ واہ واہ کے نالہ و آہ کا زیادہ طلب گار تھا مگر دونوں صاحبان کمال کبھی ایک جلسے میں جمع نہ ہوتے تھے

۱ تاریخ عباس ص ۲۴۳ حصہ اول   ۲ عبارالالحار جلد ۲

آتا دیکھتے ہیں۔

آخر ایک شوقین[۱] نیک نیت نے روپیہ کے زور اور حکمت عملی کی مدد سے قانون کو توڑا وہ بھی فقط ایک دفعہ ۔ مسعود کہ نواب شرف الدولہ مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دے کر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیر مرحوم کے مکان پر گئے گفتگوئے معمولی کے بعد پانچ سو روپے کا توڑا سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کل مجلس ہے مرثیہ آپ پڑھئے گا بعد اس کے میر خلیق کے یہاں گئے ان سے بھی وہی مضمون ادا کیا اور ایک کو دوسرے کے حال سے آگاہ نہ کیا لکھنؤ شہر روز معین ہزار در ہزار آدمی جمع ہوئے ایک بجے کے بعد میر ضمیر منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا ان کا پڑھنا سبحان اللہ مرثیہ نظم اور اس پر شعر کے حاشئے کبھی رلاتے تھے اور کبھی تحسین و آفرین کے غل مچواتے تھے کہ میر خلیق بھی پہونچے اور حالت موجودہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور دل میں کہا کہ آج کی شرم بھی خدا کے ہاتھ ہے میر ضمیر نے جب انہیں دیکھا تو زیادہ پھیلے اور مرثیہ کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تحسین ملک وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا وہ ابھی منبر سے اترے ہی تھے کہ چوبدار ان کے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں آپ بھی سامعین کو داخل حسنات فرمائیں۔ اس وقت ان کے طرفداروں کی بالکل صلاح نہ تھی مگر یہ متوکل خدا اٹھ کھڑے ہوئے اور منبر پر جا کر بیٹھے چند ساعت توقف کیا آنکھیں بند خاموش بیٹھے رہے ان کی گوری رنگت جسم نحیف و ناتواں نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں لہو کی بوند ہے یا نہیں جب انہوں نے رباعی پڑھی تو اہل مجلس کو پوری آواز بھی سنائی نہ دی چند مرثیہ کے بند بھی اسی حالت میں گذر گئے دفعتاً ماکمال نے رنگ بدلا اور اس کے ساتھ ہی محفل نے بھی رنگ بدلا آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا اور نالہ و زاری نے آنسو برسانے شروع کئے۔ بندرہ بیس بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا ۲۵ یا ۳۰ بند پڑھ کر اتر آئے۔ اہل مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو منبر خالی تھا نہ معلوم ہوا کہ میر خلیق صاحب کس وقت منبر سے اتر آئے دونوں کے کمالات پر صاد ہوا اور طرفین کے طرفدار سرخرو گھروں کو پھرے۔

اس بیان کے بعد آزاد نے اپنی احتیاط پسندی سے واقعہ مذکور کو دوسرے پہلو سے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ موقع ایک غریب مگر پُرخلوص عزادار کے گھر کا ہے جس کی نیک نیتی سے ذاکرین و سامعین کو ہمدردی تھی۔ آزاد کی لفظیں یہ ہیں ——— "یہ معرکہ اس خوش اعتقاد کے مکان پر ہوا تھا اور میر ضمیر کے اشارے سے ہوا تھا"[۲] آزاد اگر یہ لکھتے کہ میر خلیق کے اشارے سے ہوا تھا تو اگر ان کی مدیحی سے قطع نظر کی جاتی تو ایک حد تک صحیح تھا کہ انہوں نے آخر میں خود پڑھ کر میر ضمیر کو بیشتر حواس بنایا یہ لکھنا کہ میر ضمیر کا ایما تھا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب کمال اور بیشتر دوسرے صاحب کمال کی پیش خوانی پر خود اپنے سامان فراہم کرے اس کے علاوہ ایک نادار شخص کی مجلس میں ہرگز یہ صلاحیت نہ تھی کہ دو شکر کے پڑھنے والے جمع ہوں اور وہ دونوں کو یکے بعد دیگرے پڑھوا بھی سکے اگر بانی مجلس کی نیک نیتی سے ہمدردی کر کے انفرادی صورت میں ضمیر و خلیق دونوں آگئے تھے تو میر کے بعد خلیق ہرگز بالائے منبر نہ جاتے۔ یہ شرف الدولہ کا حیلہ ... دولت کا کرشمہ تھا جو کامیاب ہوئے۔

مولوی حیدر علی .. آزاد کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی حیدر علی مشہور عالم جو مذہب امامیہ کے خلاف کتاب لکھی میر انیس کے

---

[۱] آب حیات صفحہ ۳۸۲ [۲] آب حیات

…ملا تھے اور ایشیں نے ان سے متداولات بھی پڑھی تھیں میاں مشیر کے کلام میں برابر مولوی حیدر علی کا ذکر ہے۔

حکایت :- مونس چوک سے گزر رہے تھے وہ بڑے خوبصورت تھے اور پھبتی کہنے میں بھی ان کو کمال تھا بالاخانہ سے ایک نوبالغ لڑکی نے ان کو دیکھ کر اپنی نوکری سے کہا ارے سامنے سے ہٹ جا مونس دیکھ لیں گے اور پھبتی کہیں گے تو دھوئے دھوئے نہ چھوٹے گی اس بالاخانہ کا ایک دروازہ بند کرکے دوپٹہ کی آڑ سے مونس کو دیکھا حسن اتفاق سے ان کی نظر اٹھ گئی اور فوراً کہا ؎

عاشق کو دیکھتے ہو دوپٹہ کو تان کے
دیتے ہو ہم کو شربت دیدار چھان کے

سورج کنڈ کا تالاب

یہ جگہ لوہے کے پل سے قریب پل کے دست راست کی طرف اب بھی ہے اور کسی زمانے میں لکھنؤ کی بہترین سیرگاہ تھی قدیم تاریخ[1] میں اس تالاب کا کئی مقام پر ذکر ہے خواجہ ماجی کو مرزا قتیل نے جو خطوط لکھے ہیں پہلے خط میں ہے کہ سال بھر سے اسد اللہ خاں کے چھوٹے داماد مجھے تنگ کر رہے ہیں ایک دفعہ میں ان کو سورج کنڈ کے میلے میں اپنے ساتھ لے جاؤں میں نے وعدہ کر لیا ہے اب کی مرور خدا نے چاہا تو تم کو لے جاؤں گا اس لئے تم سے کہا تھا کہ تنخواہ گاہی سے کہہ دو کہ ایک اور ہاتھی کی ضرورت ہے ورنہ میرے میانہ اور ایک ہاتھی کافی تھا۔ دوسرے رقعہ میں ہے کہ میں جس دن سے لکھنؤ آیا ہوں تمہارے سر کی قسم اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی قسم میلوں کی جگہ تک نہیں دیکھی۔ ایک بار جمعہ کے وقت دو گھڑی کے لئے آٹھوں کے میلے میں چلا گیا تھا اب ہنومان جی کے میلے اور سورج کنڈ کے میلے میں گومتی کے کنارے شرکت ہوگی۔ تیسرے رقعہ میں ہے کہ آج کل حضور پر نور کے دسترخوان پر پارچہ اور تیتر اور بیل درج حالت عالیہ کی طرف سے آتا ہے۔ کباب اور قورمہ اور ... کا پالا پلاؤ وقت یاد تازہ ہوتی ہے چلنے کے دن جو مسافت طے کرنا پڑتی ہے وہ تمہارے گھر سے سورج کنڈ کی آمد و رفت یا زیادہ سے زیادہ تمہارے گھر سے ہنومان تک کی اوائی جوائی کے برابر ہوگی۔ ریختی کا یہ شعر وہاں کے مجمع پر گواہ ہے ؎

گئی تھی دیکھنے باجی میں سورج کنڈ کا میلہ
کہیں ہوں پسنے پستے مردوں کا یہ ہوا ریلا

لوہے کا پُل

دریائے گومتی پر نواب آصف الدولہ بہادر کے تعمیر کردہ پل کے بعد بھی دوسرے پل کی ضرورت تھی اور شہر کے عرفی حصہ کا دریا سے قریب ہو جانا مستلزم تھا شرقی حصہ شہر کو بھی ندی سے ملا ہوا رکھا جائے۔ غازی الدین حیدر بہادر نے اس ضرورت کا احساس کیا اور انگلستان سے نمونہ حاصل کرکے پل بنوانا چاہا سامان آنے سے پہلے جام عمر لبریز ہوگیا۔ ان کے بعد نصیر الدین حیدر بہادر نے سکرفٹ کو ٹھیکہ دیدیا مگر پل تیار نہ ہوا اور امجد علی شاہ کے زمانہ حکومت میں پل تیار ہوا[2] منشی اسیر نے تاریخ کہی ؎

آں بادشاہ عادل کز حکم محکم او
گردید آہنی پل بر گومتی نمودار

فرمود حکم سلطاں تاریخ نظم کردم
چوں حکم شاہ محکم چوں عدل شاہ ہموار

دوسری تاریخ کسی عربی داں شاعر کی یہ ہے ؎ استوی العرش علی الماء دو سال بنا" ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ اس کی بنوائی میں علاوہ قیمت پل صرف ہوئے عبدالحلیم شرر کی رائے ہے کہ موجودہ آہنی پل انگریزوں کا بنایا ہوا ہے جو پل عہد شاہی میں تھا وہ جا رہا ہے

---

[1] رقعات مرزا قتیل صفحہ ۵ و ۱۴۳ طبع قدیم عہد شاہی میں اصل الفاظ میں ترجمہ درج کیا گیا ہے [2] تاریخ اودھ صفحہ ۳ ج ۵

اطلاع اصل کتاب میں امیر ایمس کا شجرہ اور اولاد کی تفصیل ہے طول ہو جانے سے مجبوراً ترک کیا ہے من قلت الزاد۔ مصحح

کے کھمبوں پر لنگر رہا تھا جب زنگ آلود ہو گیا تو بدل کر موجودہ صورت میں آیا اس پل پر رات بھر پندرہویں شعبان کا جلسہ عام ہوتے دریا میں عریضہ دینے والوں کا ہجوم رہتا ہے اور نماز صبح کا وقت آنے پر میدان میں لکھنؤ بھر کے بڑے آوازے اذان دیتے ہیں۔ کے وقت خوش الحانی کا مظاہرہ عجب منظر ہوتا ہے کوئی پل کی ڈھال پر پہونچکر اللہ اکبر کہتا ہے کسی نے اس سے نیچے کچھ فاصلے پر تکبیر کہی کوئی سطح آب سے نزدیک کوئی فرش محفل پر۔ یہ ذکر ہے ۵۰ برس پہلے کا اور قصیدہ خوانی اور فضائل ختم ہونے کے بعد کا اب اس عالم یا والہی کے مرکز کو پڑاؤں کی نامہذب رفتار سے محرب اخلاق بنا دیا ہے آتشبازی پہلے بھی چھوٹتی تھی مگر مجمع سے دور دور صرف تفریح طبع کے لئے۔ مگر اب وہ حال ہے جو آنکھوں کے سامنے ہے یہ محفل اور صبح کی نماز جماعت۔ میر عابد علی مالک مطبع کی طرف سے عہد شاہی میں قائم ہوئی تھی اور اب تک ہوتی رہتی ہے۔

لوہے کے پل کے سامنے غدر ۱۸۵۷ء میں دست بدست جنگ بھی ہوئی اور پھانسیاں دی گئیں چنانچہ خاندان میر کاظم علی برچھیت کے میر قاسم علی کیدان کو جو فوج شاہی میں ملازم تھے ممو خاں صاحب امیٹھی کے ساتھ اس جرم میں کہ انہوں نے برجیس قدر کو ان کی ماں کے ساتھ نیپال پہونچا دیا تھا لوہے کے پل کے روبرو پھانسی دی گئی۔

قبرستان :۔ لوہے کے پل کی واپسی میں جو ریل کا پہلا پل پڑتا ہے پتلا اس پل کے جانے میں کم و بیش ۵۰ قدم جب رہ جائیں تو بائیں جانب وہ قبرستان ہے جس میں لکھنؤ کے چیدہ لوگ شعراء اور مار دفن ہیں میر خلیق مورث اعلیٰ خاندان انیس اور مولوی سید علی شاہ ابن صفدر شاہ کشمیری مجتہد اور میر تقی میرؔ یہاں دفن ہیں پندرہ شعبان کو عریضہ دینے کی واپسی میں لوگوں نے سید محمد باقر صاحب مجتہد مرحوم کو اسی زمین پر پہونچکر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتے دیکھا اور نشان دہی کی کہ میرے جد کی یہاں قبر ہے اور حضرت عارف نے اپنی اولاد کو بتایا کہ خلیق یہاں سپرد خاک ہوئے ہیں اس جگہ ——————

نہیم کا اکھاڑہ کبھی تھا اور میر خلیق کی قبر کا پتہ دیتے ہیں بعض علمی بیاضوں میں اس کا ذکر ہے باقر العلوم نے تصدیق کی ہے کہ یہاں معززین شہر سپرد خاک ہیں نشان قبر ممدوح کو بھی یاد نہ تھا۔ صاحب تذکرہ بے بہا نے ——————

قبر علامہ سید علی شاہ :۔ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ مقبرہ منتظم الدولہ میں دفن ہوئے منتظم الدولہ خطاب تھا حکیم مہدی کا اور مقبرہ حکیم مہدی اس وقت روزنامہ حقیقت اخبار کے دفتر کے سامنے ہے اس مقبرے میں ان کے مدفون ہونے کی تصدیق نہ واقعات سے ہوتی ہے نہ خاندان باقر العلوم سے تائید ہوتی ہے لہذا یہ بیان صاحب تذکرہ کا صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ اس زمانے میں خاندان منتظم الدولہ کے اموات عام یہاں دفن ہوتے ہوں اور اس وقت اس کو مقبرہ منتظم الدولہ کہا جا رہا ہو اس کے بعد منتظم الدولہ نے اپنے خصوصی عمارت مقبرہ اس صورت میں بنوائی جو کہ موجود ہے سید علی شاہ وہی بزرگ ہیں جن کے سفر لکھنؤ میں راہ میں شیر سد راہ ہوا اہل قافلہ درختوں پر چڑھ گئے ان کا سجادہ بچھا رہا اور مصروف نماز رہے وہ آپ کو دیکھ کر کچھ دیر ٹھہر کر خود چلا گیا ساتھیوں نے آپ کے کپڑے تقدس کی بدولت تبرک سمجھ کر پھاڑ کر تعویذ بنائے یہ سرگذشت تاریخ علماء میں موجود ہے۔

قبر میر تقی میرؔ :۔ اسی قبرستان میں میر تقی میرؔ کی بھی ابدی آرام گاہ ہے آپ ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے اور ۲۸ برس شہر میں رہ کر شمع حیات کو خاموش کر گئے ۱۲۲۵ھ میں یہ قبرستان محدود اور پھاٹک سے گذر کر داخلہ ہوتا تھا اب سب قبریں زیر فلک ہیں اور آسمان کے سایہ کے سوا کچھ نہیں ہے اور کوئی کہنے والا نہیں ہے ؎

—

سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کلیات میر دیدہ زیب سے آراستہ ہو چکا ہے ان کے اشعار لکھنؤ یونیورسٹی بی اے کے نصاب ۱۹۵۵ء میں طبع ہوئے جنھیں ڈاکٹر شاہ سلیمان نے فیڈرل کورٹ اور سو برس سے معلوم نہیں کتنے مفکرین نے ان پر تبصرہ کیا ہے۔

اس علاقے میں ایک اوسط درجے کی مسجد بھی تھی جس کا اب نام و نشان نہیں ہے۔

دریا پار کی عمارتیں

اب ہم گومتی کے پار جن عمارتوں کا پتہ چلتا ہے ان کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اگرچہ مسجد شمس النسا بیگم پہ پل پختہ کا بنایا ہونے سے گذشتہ صفحہ میں ضمنی تذکرہ ہو چکا ہے مستقل حالات اس باب کے حسب ذیل ہیں ان عمارات کو ذکر کرکے پھر لوہے کے پل سے پلٹے ہوئے شہر کی بقیہ عمارتوں پر سیر حاصل بحث کرکے کتاب ختم کی جائے گی۔

مکہ گنج

مکہ درزی خیرآباد ضلع سیتاپور کا رہنے والا تھا نصیرالدین حیدر بادشاہ کے دور حکمرانی میں درزیوں میں نوکر ہوا نہایت چالاک اور دستکار اعلیٰ درجے کا تھا کام کی اچھائی سے درزیوں کا ہیڈ ہو گیا اور چلتا پرزہ ہونے سے مصاحبت کی آخری عزت بھی حاصل کی کٹرہ ابو تراب سے متصل مکہ کا باغ اسی کی یادگار ہے جس کا حال مدرقہ طاس ہو چکا مکہ گنج اسی درزی نے بسایا اور مکہ کی سرائے بھی آباد سرا تھی یہاں طوائفوں کے ڈیرے ایک وقت میں تھے عید کی چوتھی ۱۲۵۲ھ اس کے لئے نحس دن تھا کہ عتاب شاہی سے علیحدہ ہوا اور افسری کلو درزی کے بیٹے کو عطا ہوئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ چاندی کے ہودے میں بیٹھ کر ہاتھی پر سواری نکلتی تھی اور جدھر جاتا تھا لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ مکہ درزی کا امامباڑہ خیرآباد میں مشہور ماتم کدہ ہے۔ سلائی کی مشین ۱۸۴۶ء میں ایجاد ہوئی۔

کربلائے نواب ملکہ آفاق

پل پختہ سے دو فرلانگ پر بائیں ہاتھ کی طرف نشیب سے اس زیارت گاہ کا راستہ ہے جس کو کربلائے ملکہ آفاق اور عسکریین کہتے ہیں یہ عمارت مکہ گنج میں ہے اور بانی کربلا حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی بیگم تھیں گنبد اور میناروں کی سنہری کلسیاں دور سے جگمگاتی ہیں کربلا میں داخلہ ایک بلند اور عظیم الشان پھاٹک سے ہوتا ہے کچھ دور جا کر داہنی طرف دوسرا خوشنما پھاٹک ہے۔ جو شکستہ حالی سے نوحہ خواں ہے دروازے پر نیچے دھات کی ٹھپہ کی ہوئی تختیاں اور بالائی حصے پر گوشوں میں ٹھیکہ دار علم بنے ہیں اس سے گذر کر ایک لمبا حوض ہے جس کے سامنے پہلے امامباڑہ کی عمارت نظر پڑتی ہے آگے حصہ کی چادروں کا سائبان اور دونوں جانب صحنچیاں تمام گردش چھت پر دو بڑے گنبد ہیں جن پر مختلف رنگ کے دیسی چوکے لگے ہوئے ہیں۔ امامباڑے کے اندر شہ نشین پر تعزیہ اور پشت پر علم کھڑے ہیں دیواروں کو قطعات اور مرقعوں سے آراستہ کیا ہے فرش زمین انتہائی خوبصورت اور دیسی ساخت کی زرد و سرخ اور مختلف وضع و قطع کی روغنی چمکدار چوکوں کے ساز سے شطرنجی فرش تیار کیا گیا ہے جو چیک ملک میں جاپانی چینی کے چوکوں سے ٹکر کھاتا ہے امامباڑہ کے بائیں جانب دوسرے ملحقہ احاطے میں ایک دوسری عمارت ہے۔ جس میں حضرت امام حسن عسکری و امام علی نقی علیہما السلام کے مزارات واقع شہر سامرہ کی نقل ہے اس روضہ کی گلکاری اور رنگ آمیزی

---

۱ تاریخ اودھ حصہ ۴ صفحہ ۳۲۲ مؤلفہ نجم الغنی رامپوری   ۲ ایضاً صفحہ ۳۲۴   ۳ مقائع نعیمانی

کا قابل ذکر عمارت ہے باقی حصہ میں ایک قبہ اور دو گلدستے بنے ہیں جن کی سنہری کلسیاں نہایت ہی جاذب نظر ہیں اس روضہ کے صحن میں اندر کی سمت بنی ہوئی ایک مسجد ہے جس کے نیچے بہت دور تک تاریکی میں پیچ دار زینے چلے گئے ہیں جو ایک سرداب پر جا کر ختم ہوتے ہیں یہ اس مقام کی نقل ہے جہاں سے بارہویں امام غائب ہوئے تھے اس جگہ کا فرش بھی رنگین چوکوں سے بنایا گیا ہے یہ کربلا عہد محمد علی شاہ میں زیر نگرانی حاجی مرزا محمد علی بنائی گئی تھی ملکہ آفاق نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۰ء قریب شام اپنے سکونتی حسن باغ میں ہیضہ وبائی سے قضا کی اور دوسرے روز اسی امامباڑہ میں دفن ہوئیں قبر پر پتھر میں جو تاریخ نصب ہے اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

کن دعا صائع چنیں بہر ایلئے مغفرت — حق بیرفردوس منزل ملکہ آفاق را ۱۲۶۷ھ

ملکہ آفاق راتیں عبادت خدا میں بسر کرتی تھیں اور اس قدر دور اندیش تھیں کہ سترہ لاکھ روپیہ سے اپنے ورثہ اور کربلا کے اخراجات پر وثیقہ نامہ لکھا اور حسین آباد ٹرسٹ حسب قواعد مندرجہ انتظامات کرتا ہے عہد شاہی میں مکہ گنج بہت آباد محلہ تھا۔ اور کربلا میں روز عاشورہ و شب عاشور زیارت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں اس کربلا کو کئی مرتبہ کشت و خون کی آماجگاہ بنایا جا رہا تھا اور ہر طبقہ کی نگاہ عمارت پر تھی ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اخبار میں ایک نوٹ نکلا جس سے واضح ہوا کہ پندرہ محرم ۱۲۷۳ھ کو سراغرسانوں نے شہرت دی کہ محسن الدولہ کی کربلا میں تین سو آدمی نوکر ہوئے ہیں اور ہتھیاروں سمیت اس گرد و نواح میں رہتے ہیں اور قادر علی شاہ فقیر کے پاس بھی جگھٹا رہتا ہے وہی بانی فساد ہے اور اس کی تحریک سے یہ فوج نوکر رکھی گئی ہے اور ملکہ جہاں کے میلغانہ میں چار شخص کریم بخش اور شیرازی اس کام پر مقرر ہیں دو دو روپیہ چٹھا دے کر کہا جاتا ہے کہ وقت ضرورت تمہاری طلب ہو گی پہلے آنا جو کام پڑے عذر نہ کرنا جان تک لڑانا۔ ۱۷ دسمبر کو نواب محسن الدولہ سے واجد علی شاہ بہادر نے فوج بھرتی ہونے کی تصدیق چاہی اور شب عاشور کربلا میں خلاف قانون مجمع اور پھاٹک بند کرنے کی وجہ پوچھی کربلا کے دروازہ بند ہونے کی خبر بلوہ اور فتنہ انگیزی کی دلیل ہے۔" نواب نے جواب میں فرمایا کہ دروازہ بند کرنا میرے حکم سے نہ تھا وہاں کے کارپردازوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم نے بھی شورش سن کر دروازوں کو بند کر لیا تھا کہ وہاں ہزاروں روپے کا اسباب عزاداری تھا۔ اس کے لٹ جانے کا خوف طاری تھا۔

اس کربلا میں حدیث خواں قرآن خواں ملازم ہیں اور پندرہ شعبان کی صبح کو زائروں کی مخصوص میں چہل پہل رہتی ہے۔

حسن باغ

مچھلی بھون کے شرقی حصہ میں واقع تھا اور یہاں ایک عالیشان بارہ دری تھی شاہ نصیر الدین حیدر کی شادی میں محفل سرود اس بارہ دری میں ہوئی تھی غدر میں جو عمارتیں انگریزوں نے قلعہ کا میدان صاف رکھنے کے لئے کھدوائیں حسن باغ اور بارہ دری منہدم کر دی گئی۔ بارہ دری کے کھنڈرات پر میڈیکل کالج کے طلبا کے لئے دارالاقامہ بنا ہے۔ اس عمارت کی بعض دیواروں کے نشان ۱۹۵۰ء تک اس کے گرد تھے شیخ غلام حیدر صغیر صاحب عاشق جان عالم نے اپنی مثنوی میں اس باغ کی بربادی پر افسوس کیا ہے —— غدر کے واقعات بھی اس اقتباس سے واضح ہوں گے اور جو تباہ کاری ظالم انگریزوں کے ہاتھ سے ہوئی منظوم اس کی تصویر ہے ؎

---

[1] اخبار طلسم ۲۰ محرم ۱۲۷۳ھ ماہ اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱ میں اس مضمون کو دیکھو [2] سیار دہر ۱۹۵۶ء بابت اگست صفحہ ۲

ہوا دوسرا روز نکلی کرن | فرنگی گئے سوئے مچھی بھون
لگانے رہے دیر تک دوربیں | طرف سے دیکھا نشیب زمیں
میاں حصار ایک شہزادہ تھا | اٹھایا اسے دوسرا گھر دیا
کیا انگریزوں نے اس میں مقام | بنائے لب بام ردے تمام
جہاں تک تھی عمارت گرد حصار | وہ کھودی گئی گھر بے شمار
غرض کھود ڈالے ہزاروں مکاں | حسن[۱] باغ کو کردیا بے نشاں

۲ شاہزادہ سے اشارہ اس نظم میں مرزا یحیٰی علی خاں خلف حضرت محمد علی شاہ کی طرف ہے۔

۴ <u>**سیدوں کا احاطہ**</u> :- حسن باغ کے متصل سیدوں کا احاطہ تھا یہاں مختار الدولہ کی جو آصف الدولہ کی پیشی میں کام کرتے تھے چیدا اور کوٹھیاں تھیں اور جو آسمان سے باتیں کرتی تھیں مختار الدولہ کی املاک نے وہ ترقی کی کہ محلہ کا نام بدل گیا اور لوگ مختار الدولہ کا احاطہ کہنے لگے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی مٹی لکھنؤ کی نہ تھی اور پردیس میں قتل ہوتے اٹاوہ سے دو کوس پر ان کی تیرا در مقرہ ہے۔

بارہ دری نواب حسن رضا خاں

کئی جگہ نواب کا نام اس تاریخ میں آچکا ہے اوراق پارینہ سے واضح ہوتا ہے کہ نواب کی ایک بارہ دری پاٹے[۱] میں تھی میر تقی میر کو نواب حسن رضا خاں سے خاص محبت و عقیدت تھی چنانچہ جب وہ موصوف کی سیاست کے زمانے میں آصف الدولہ کے طلبیدہ لکھنؤ پہونچے تو اس طرح مدح کی :- ایں سرداراست ناتمکیں متواضع منصف بحس خلق صفت کرم صفت بائے حمیدہ اش غالب الطاف عمیمتر ماپو اکثرے مادرمی آید" میر کا پہلا قیام نواب سالار جنگ کے مکان میں تھا۔

منشی گنج

یہ محلہ نواب مظفر علی خاں اسیر کا آباد کردہ دریا کے پار واقع ہے بانی محترم کا پورا نام یہ تھا تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیر آپ عہد واجد علی شاہ بہادر کے مسلم کمال شاعر تھے۔ مرمر توحید ان کی قادر الکلام زبان کا ملاحظہ ہو سہ

ہمہ آفاق نقش صنعت اوست | ہمہ عالم گواہ قدرت اوست
بشبنم قطرہ از ساغر اوست | ورق ہر برگ گل از دفتر اوست
بذکرش چرخ چوں شب زندہ داراں | زانجم تا سحر تسبیح گرداں

غدر کے بعد آپ نواب کلب علی خاں[۲] کے یہاں رامپور تشریف لے گئے اور بڑی قدر افزائی ہوئی۔

منشی اسیر نے جو علمی اور ادبی خدمات انجام دئے ان میں مفاتیح الفصائل، درۃ التاج، ریاض المسلمین، زر کامل عیار ترجمہ اردو شرح معیار الاشعار ۱۲۳ صفحات گلدستۂ امامت، چراغ اعجاز، شجرۃ العروض، روضۃ القوافی، کربلا نامہ[۳] منظوم وغیرہ وہ قلمی جہاد ہے جو کسی شاعر نے نہیں کیا کئی دیوان ان کے تھے اور بعض زیور طبع سے آراستہ ہوئے ایک دیوان دس روپے کو آسی نے خریدا اور وہ شاعر بن گئے۔ فارسی دیوان کا نام گلشن کعشق ہے جو ۲۲۲ صفحات پر طبع ہوا ہے ۱۲۹۶ھ میں یہ محمد سعید خاں مدمغرب تھے میں قدمہ

---

۱ مثنوی آئینہ اختر ۲ تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۲ ص ۱۵۱ ۳ کربلا نامہ منظوم ص ۳۳۵ طبع نولکشور ۱۲۹۶ھ

گیا اور دو بیٹے چھوڑے جو بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کے نام سے مشہور رہے۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے میر مہدی حسین آبر صاحب دیوان عشق، ظہور حسن ظہور، تفضل حسین مانوس، واجد حسین واقف، بہادر حسین خاں انجم، مرزا حسین بیگ جبار فیض آبادی، نواب احمد حسن خاں عزت اچھے صاحب دیوان چمنستان جوش مشہور تلامذہ ہیں۔

منشی اسیر کے شاگردوں میں نواب یوسف حسین خاں ملیح حکمت اور پھبتی میں کمال رکھتے تھے نیاز فتحپوری ناقل ہیں کہ ایک بار ان کے دوست شبیر حسین خاں رسا جو دراز قامت گورا رنگ کرتہ ڈھیلے پہنے انسان تھے ان سے ملنے آرہے تھے دور سے دیکھتے ہی اپنے احباب سے کہنے لگے دیکھئے سیب لٹکا چلا آرہا ہے۔

میر غضنفر علی حکیم :- باپ کے بعد اسیر کے جانشین ہوئے اور بڑے بھیا کے نام آثار میں ایک واسوخت اور ایک مثنوی جس کی تاریخ جاوید نے یہ کہی تھی ؎

مثنوی میں ہیں عجب ہیں شعر بلیغ کیوں نہ دل جائے نہ اب صورتِ قلب
ہر رگ و پے میں اب لہو دوڑ گیا بڑھ گئی پڑھ کے ایسی طاقتِ قلب
طبع کا سال یہ جاوید لکھو مثنوی ہے سبب قوتِ قلب ۱۳۲۳ھ

حکیم تخلص ہونے کی رعایت سے شاعری فائدہ اٹھایا ہے بڑے بھیا حکیم نے ۱۳۱۳ھ میں قضا کی ان کا نام اور لقب یہ نواب عمدۃ الدولہ بہادر الملک سید محمد غضنفر علی خاں صولت جنگ۔ حکیم نے بھی کثرت سے شاگرد چھوڑے جن میں صادق حسن صداقت ہدی حسین مہدی مارہروی میں ان سے اصلاح لیتے تھے اور ۱۸۹۲ء تک زندہ تھے

چھوٹے بھیا :- آپ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مدتوں زندہ رہے اور مسند اسیر پر رونق رہی آپ کا نام افضل الدولہ مظفر الملک سید محمد فضل علی خاں بہادر شوکت جنگ المتخلص بہ افضل تھا پرانی تہذیب کے مجسمہ تھے اور لکھنؤ میں اس لحاظ سے کسی کو اختلاف تھا کہ جس کو مشرقی تہذیب سیکھنا ہو وہ ان کے گھرانے کو دیکھے اور ان کی صحبت میں بیٹھے۔ افضل کو میں نے عنفوان شباب میں دیکھا اور ان کی صحبت میں گھنٹوں رہا ان کی محلسرا پر کئی مرتبہ جانے کی نوبت آئی نظم کے ساتھ نثر میں بھی وہ ہنرمند تھے۔ ایک ۔ کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔ ترو تازگی شاخ قلم بہ نگارش توصیف سلطانیست کہ تاجداران گلستان را بہ چتر سحاب سرافراز یدہ و رنگینی گل ہر رقم بار آرایش تعریف جہانبانیست کہ تخت نشینان بوستان را با اکلیل بازکی دست تصرف رسانیدہ و حشمت ربوبیت المآل عنایتش زر دریہ دار و حسن و انس از جوان مرحمتش وظیفہ خوار پرتو ذاتش در ظلمات عالم ہویدا و نور صفاتش ۔۔۔ شش جہت پیدا۔ نظم میں نمونے کے طور پر مطلع ملاحظہ ہو ؎

کوئی تھا راز اس میں خلق کے مشکلکشا ہو کر علی نے ہاتھ جو بند حوالے دستِ خدا ہو کر

ولہ

راہ حق گر نہ دکھانے کی ضرورت ہوتی یا علی آپ ہی پر ختم امامت ہوتی
ایک ہی نور سے دونوں کی ہوئی تھی خلقت کیوں امامت نہ بھر شان نبوت ہوتی
لعل و گوہر کی نہ زر و سیم کی خواہش کرتے پاس اپنے نہ اگر دین کی دولت ہوتی

افضل نے ۱۲۳۸ھ م ۱۸۲۳ء اپنے ہی باپ دادا کے مکان میں اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا۔ ان کی زندگی عمر مقدمہ بازی اور زمینداری کے تحفظ میں گزری اور آخر تک سکون و راحت نصیب نہ ہوا۔ افضل اور ان کی صحبت کے بعض رفیقوں کا گروپ (عکس) میرے پاس موجود ہے۔

عسکری بیگم :- آپ منشی اسیر کی بیٹی تھیں اور غدر کے بعد انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنا کر قتل ہوئیں ان کی وفات پر ایک قطعہ ابھی تاریخ میں پایا جاتا ہے جو بخوف طول نقل نہیں کیا۔

اسیر کے مشہور اشعار میں یہ ابیات زبان زد ہیں اور دنیا کے نقش بر آب ہونے کی تصویر ہیں ؎

آہ از نیرنگیٔ عالم کہ ہست اندر جہاں — ہر گلے را روال و ہر بہارے را خزاں
بے نشانہ پا بما رفتہ چار ارکان بود — بے نشانے ما کمال صاحب فوج و نشاں
راہی اند از شہر ہستی ہر سحر سوئے عدم — ساکنان شہر ہستی کاروان در کارواں
ہر کہ دارد گفتہ است امروز و فردا دیگر است — رہرو آنجا قطع منزل می کند شب در میاں
حشمت اسکندر و سلطانی دارا نماند — شد شکار بچہ گرگ اجل تو شیرواں
مایہ داراں بتول تاجداران شکوہ — جملہ زیر خاک گردیدند گنج آسمانیاں

محمد علی خاں آزاد :- منشی افضل کے نواسے اور خاندان کے آخری فرد تھے ان کے بعد یہ گھرانا ختم ہو گیا تیس بتیس برس اس طرف تک ان کا دیوان خانہ اور زنانہ مکان باقی تھا۔ اس قدر مشہور تھے کہ اس دیہات سا بستی میں جب کسی شریف بھلے مانس نے قدم رکھا تو گیہوں اور غلہ کے آڑھتے صورت دیکھتے ہی گھر کا پتہ بتاتے تھے اور راہگیر اناج سے بچتا ہوا سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا مکان تک پہونچتا تھا گنج اب تک آباد ہے اور صرف مسجد باقی ہے جو مکان کے زنانے حصے کی طرف تھی اور امیٹھی کے راستے میں ایک کربلا ہے جو میرے ہیں دیکھی شہرت ہے کہ یہ منشی اسیر کی بنوائی ہوئی ہے وہ امیٹھی کے رہنے والے تھے۔

حسن گنج

پار کا محلہ جس کو حسن رضا خاں نے اپنے نام پر آباد کیا اس محلے میں ——

بادشاہ باغ :- وہ مشہور باغیچہ ہے جس کی کمرکیں ایک زمانے میں پکار پکار کر کہتی تھیں یہاں کی منظر کشی شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

تاجدار اودھ نصیر الدین حیدر نے اپنے زمانہ شہریاری میں گومتی کے کنارے پر محلہ حسن گنج میں یہ باغ باہتمام راجہ بختاور سنگھ ۲۵ لاکھ روپے میں تیار کرایا باغ کے وسط میں بارہ دری تھی جس میں سنگ مرمر کے خوشنما ستون تھے اس عمارت میں امراء سلطنت مرغوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے تھے اور دیگر تقریبات کے موقع پر شرکت کے لئے آتے تھے فینی پارکس FANNY PARKES ایک معزز فرانسیسی خاتون نے ۱۸۳۱ء میں اس باغ کی سیر کی تھی وہ اس پُر بہار کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

اس باغ میں تین قطعہ عمارتیں اور دو پھاٹک ہیں پہلی عمارت نہایت خوشنما اور دلکش ہے اس کی ہر شئے نادر اور عجوبہ

سلہ ۱۲۳۸ھ سے پہلے آپ نے دنیا چھوڑی۔

روز گار ہے کمروں کی چھتیں قالب دار اور فرش مختلف رنگ کے چوکوروں سے شطرنجی کے شکل بنائے گئے ہیں دوسری منزل
تک میں سنگ مرمر کے دلفریب ستون پر قائم ہے اس کی آرائش اور زیبائش سرخ رنگ کے پردوں سے کی گئی ہے جس میں
جھالر ہے جو زنانخانہ کا کام دیتی ہے اس میں سنگ مرمر کی لمبی سیدھا در چکدار استرکاری کی گئی ہے اور جا بجا گلکاری کی گئی
اور سفیدہ سے پوتا گیا ہے باغ میں ایک دخانی انجن لگا ہے جو حوض میں پانی پہونچاتا ہے باغ کے زنانخانہ میں جو چار دیواری
پردے کی اونچی اونچی دیواروں سے محصور تھا بادشاہ کی محبوب بی بی قدسیہ بیگم رونق افروز تھیں ان کے زمانہ قیام میں باغ
کی صفائی اور ستھرے پن کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف دربار اودھ رقمطراز ہیں۔ باغ میں جا بجا نقرئی لالٹینیں نصب تھیں جن کے
ستونوں پر رنگ کیا ہوا تھا پانچ سو نوجوان اور حسین مالنیں باغ میں کام کرتی تھیں ان مالنوں کو ہفتہ میں ایک رنگ کے
جوڑے ملا کرتے تھے اور باغ میں جو مالن پرانا جوڑا پہن کر آتی تھی تو چشم کمالی کے سوا اس پر کچھ جرمانہ بھی ہوتا قدسیہ بیگم انتہائی
مجبورا ور سیرچشم تھیں بیلچوں اور کھرپیوں کے دستے نقرئی ہوا کرتے تھے جو مالن ہیڈ تھی اس کے کپڑوں میں علاوہ امتیاز کے کھرپے اور
بیلچے کا دستہ جڑاؤ تھا۔ باغ کی صفائی آئینہ کو مات کرتی تھی مجال کیا کہ کوئی پتہ کسی وقت درخت سے نیچے پڑا ہوا مل جائے۔
۲ اگست ۱۸۳۴ء کو قدسیہ بیگم نے بادشاہ سے رنجش کے باعث زہر کھا کر اپنی کشتیٔ حیات بحر فنا میں غرق کردی بادشاہ نے اس
سبب سے باغ کی سکونت ترک کردی ان کا ترک قیام باغ کی بے رونقی کا باعث ہوا۔

غدر کے بعد مہاراجہ رندھیر سنگھ والی کپورتھلہ نے باغ کو ۳۵ ہزار میں خرید کر اپنے طور پر درست کیا اور مہاراجہ پٹیالہ بھی لال
مع عدم وحشم گھوڑ دوڑ میں شرکت کے لئے لکھنؤ آتے تو اسی باغ میں ٹھہرتے ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ کپورتھلہ نے باغ کی ۹۰ ایکڑ زمین بطور
پٹہ استمراری صرف تیس روپے سال کرایہ پر کیننگ کالج کے ارباب بست وکشاد کے حوالے کردی SIR JOHN PRESCOTT HEWETT
سرجان پرسکاٹ ہیوٹ حاکم اعلیٰ صوبہ متحدہ نے ۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا اور ۷ فروری ۱۹۱۱ء کو رسم افتتاح
عمل میں آئی جو ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی سے تبدیل ہوئی اور کیننگ کالج کا جو رشتہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے قائم تھا توڑ دیا۔ کئی
شاندار عمارتیں تعلیم گاہ کے لئے تعمیر ہوئیں۔ قدیم شاہی عمارتوں میں صرف لال بارہ دری کا کچھ حصہ محل اور شمال مشرق جانب کے
پھاٹک اس کی عظمت اور شان کی یاد دلانے کو باقی رہ گیا ہے۔[1]

کیننگ کالج میں تعلقہ داران اودھ کا چندہ اور تعاون تھا اور کالج کی تحریک انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے ہوئی تھی
در انجمن نے لارڈ کیننگ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے طے کیا تھا کہ ایک روپیہ فی صدی مالگزاری پر جو وقتاً فوقتاً مشخص ہو۔ تعلقہ
داروں کے چندے سے لیا جائے ۸ آنہ مصارف انجمن کے لئے اور ۸ آنہ کالج کے لئے رجسٹری شدہ قرار داد سے کام شروع ہوا اور تعلقہ
داروں کی طرف سے راجہ امجد علی حسین نے وقف نامہ کی تکمیل کی اور کالج کی تعمیر ختم ہونے پر اس کے درمیانی ہال میں منجملہ دیگر تعلقہ
داران کالج تجمل حسین خاں کا نام بھی کندہ ہے۔[2]

کیننگ کالج میں ۱۳۱۰ھ میں درجہ اول کے عربی شیعہ مدرس مولوی سید علی نقی صاحب اور حنفی عالم درس وتدریس کے
لئے مولوی محمد فضل اللہ فرنگی محلی تھے۔

• یادگار لکھنؤ بابت مئی ۱۹۵۹ء   [2] آثار یادگار ص ۱۳۱

منشی گنج کو ڈالی گنج بھی کہتے ہیں اور نام رکھنے کا سبب یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی ہے جو بندروں کو اپنا معبود فرض سمجھتے ہیں اور عورتیں بندر کو ڈالی والا کہتی ہیں میرے ہمعصر محشر جو تھے ان سے بہت پہلے دو دوہے مشہور ہیں ــ

ددا دیکھا ایک گوری کیا اچک کرلے گیا — اچکے کا ہے دادا یہ چاچا ہے ڈالی والے کا

غرضیکہ وہ شہرت حاصل کی کہ اسٹیشن کا نام ڈالی گنج ہوا۔

محمد حلیم الشعراء یہ ایک مرد غریب تھے ڈالی گنج میں رہتے تھے بڑے خلوص سے مسجد بنوائی جس کا تاریخ میں ذکر ہے قومی خدمتوں میں ان کی زندگی بسر ہوئی اور دنیا سے اٹھ گئے اور محلہ کھدرا عقب جوگی پولیس ستیہ قبرستان میں دفن ہوئے۔

ارادت نگر

کربلا شاہ نصیر الدین حیدر

سٹی اسٹیشن ڈیوڑھی آغا میر سے ریل پر جانب شمال بارہ ملک یا سیتاپور ریلوے لائن کے سیتیش کا نام ہے ڈالی گنج اس اسٹیشن کی پشت پر ایک بغیر پلاسٹر کی عالیشان عمارت نظر آئے گی جس پر دو بڑے گول سے گنبد اور دو نامکمل مینار ہوں گے۔ یہی نصیر الدین حیدر کی کربلا ہے جس کا نام انہوں نے "شبیہ کربلا" رکھا تھا پھاٹک کا کہیں پتہ نہیں روضہ کے چاروں طرف غلام گردش ہے دیوار حصار کہیں کہیں باقی ہے روضہ کے بیچ میں دو درجے ہیں پہلے درجے میں ایک خوشنما چوبی ضریح رکھی ہے دوسرے میں بادشاہ کی قبر ہے جس پر سنگ مرمر لگا ہے اور چونکہ ضریح ہے جیسی سب کربلاؤں سے زیادہ دیکھی ہیں اندرونی حصہ میں کہیں کہیں نقاشی کاری ہوچکی تھی جو خراب خستہ حالت میں اب تک موجود ہے مگر بیرونی حصہ بالکل عریاں ہے اس پر پلاسٹر کاری کہیں نام کو نہیں ہے روضہ کے صدر دروازہ کے بائیں جانب اس ستون کی نقل ہے جہاں شمر ملعون نے سر مظلوم کربلا جسم سے جدا کیا کربلا کی چار دیواری کے باہر احاطہ میں قبریں دفن ہوتے ہیں کربلا بن رہی تھی کہ ۲ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو بادشاہ زہر دئے جانے سے رخصت ہو گئے دوسرے روز اپنی ہی بنائی ہوئی کربلا میں آغوش لحد میں سوئے۔ کربلا کے لئے کوئی وقف بھی نہ کر پائے تھے قبر پر یہ قطعہ تاریخ نصب ہے

بادشاہ نامدار دریں تخت و چتر و تاج — رفت از دنیا سوئے گلزار عقبیٰ آہ آہ
آفتاب عالم آرا شد نہاں زیر زمیں — تیرہ و تاریک دنیا شد ز مرگش در نگاہ
مسکن خود ساخت جنت دفن شد در کربلا — حامی دین عدل گستر داد رس ظل اللہ
از سر افسوس گفتہ سال تاریخش سخنور — مردلے وائے نصیر الدین حیدر بادشاہ ۱۲۵۳ھ

پہلے امام باڑہ شاہ نجف میں دفن کی رائے تھی مگر کچھ لوگوں نے کہا کہ جب ولیعہدی میں موافقت مزاج نہ تھی تو وہاں جگہ دینا مناسب نہیں ہے راجہ بختاور سنگھ نے چاہا تھا کہ میں مرقد اقدس کے نیچے جگہ ملے مگر مرزا محمد علی داروغہ تعمیر کربلا نے عذر کیا۔ کہا کہ پہلے میرا سر کاٹ لو پھر قبر کھودنا محمد علی شاہ مرحوم کی طرف سے محافظت کے لئے مقرر ہوئے تھے۔

ملہ بہار ہند

سید کمال الدین حیدر نے اس جگہ کے لئے بھی عذر کیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ مسجد ہے آخر میں یہ طے کیا گیا کہ یہ تو لطف [illegible]
اور شیعہ مسجد مالین سرہے مسجد نہیں ہے اور غرض بانی تعمیر ایوان ہے نہ مسجد۔ فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق نے یہ تاریخ [illegible]

دہ سال پنج روز حکومت محمود شاد ۱۲۵۴ھ

<u>زندگانی شاہ مرحوم</u> :- نصیر الدین حیدر سا اس قدر زہر دلعزیز ہمہ دانا بادشاہ روشن خیال تاجدار کئے سلاطین اودھ میں ان کی نظیر
نہ تھی خدمت خلق کا جذبہ ان کی رگ و پے میں تھا ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو وہ ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ راجپوتوں میں [illegible]
لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے ستی ہونے کی عام رسم ہندو عورتوں میں تھی بردہ فروشی کا بازار گرم تھا ارمئی ۱۸۳۳ء سے شاہ موصوف
نے ان ظالمانہ رواسم کو جرم قرار دیا خواجہ سرا نکلنے کو بھی شاہ موصوف نے خلاف قانون قرار دیا تھا علم پروری اور فقراء نوازی
میں وہ بہت مشہور تھے شاہ قطب اعظم صوفی کی اس قدر عزت کی کہ لوگ سمجھے کہ وہ بیعت کر رہے ہیں ان کے ایک مصاحب نے
اس طرح ان کا حلیہ بیان کیا تھا ــــــ چہرے کی رنگت سیب کی ایسی تھی اس کے ساتھ سر کے بالوں ٹھکوں اور مونچھوں
کی سیاہی رخسار وں پر بھلی معلوم ہوتی تھی آنکھیں چھوٹی اور چمکدار تھیں۔

بہر حال باقرخانی انھیں کی شہریاری میں میاں ممدوح باورچی نے سب سے پہلے تیار کی۔ ڈھیلے پائچوں کا پیجامہ اور
پنج گوشیہ ٹوپی خود بادشاہ کی ایجاد ہے میر ضمیر ان کی مدح میں کہتے ہیں سہ

رہے بادشاہ رعیت نواز — رہے عادل و با دل و کارساز
سعید اس کے طالع اور بیدار بخت — وہ زینت دہ افسر و تاج و تخت
سخن اس طرح کا کہیں ہے شنا — کہ شاعر کو بخشش از سخن دیں صلا
رفاہ رعیت کا خواہاں ہے وہ — کہ اس عہد میں فخر شاہاں ہے وہ
محرم کے عشرہ میں گریاں و زار — یہ روتا ہے مانند ابر بہار
غم آل احمد میں ہے دل حزیں — سیہ پوش رہتا ہے تا اربعیں
رہے دبدبہ روز ہے رعب دام — کہ تھرا رہے ہیں پڑے روم و شام
ہو تیغ اس کی برّاں سر کوہ قاف — تو گاو زمیں کی دریدہ ہو ناف
ثبت مسعود ہے اس دعا میں فقیر — سلامت رہیں بس شاہ و وزیر

کرامت حسین دارو مہ نزول کی ایک رپورٹ کی لفظیں یہ ہیں ــــ کربلائے نصیر الدین حیدر موجب حکم پروانہ مورخہ ۱۷ رجون
۱۸۵۸ء موجب روبکاری صاحب کمشنر بہادر مندرج نزول رجسٹر ہے اور ٹھیکہ اس کا چالیس روپے پر صرف سرکار بنام چتری کے ہے۔

کربلا مذکور کو تاریخ نے محلہ ارادت نگر کی تعمیر بتایا ہے اس لئے قدیم بندوبست کا لحاظ رکھنا ضروری تھا شیعہ ڈگری کالج کی عمارت
اس کربلا سے متصل ہے اور طلباء شیعہ کالج کی عمارت کی کچھ خبر لیتے رہتے ہیں۔

<u>امامباڑہ سلطان صاحب صفوی</u> :- یہ امامباڑہ بھی ارادت نگر میں اب تک باقی ہے عمارت صفوی خاندان کی پرانی یادگار اور
اوسط درجے کا عزاخانہ ہے صحن میں بعض قبریں بھی ہیں صفوی کیلنڈر میں اس امامباڑہ کا تذکرہ اور مقبرہ شاہ صفی کا کچھ [illegible]

[illegible] اسی علت پر بقول نواب جان عالم صاحب تھی جنھوں نے سنہ ع کی واپسی میں بصرہ پہونچکر مفارقت کیا۔

چاند گنج

یہ محلہ بادشاہ نصیر الدین حیدر بہادر نے آباد کیا تھا جو اس وقت بھی آباد ہے کسی یادگار قدیم کا پتہ نہیں ملتا [illegible] کے جو ماہ سیدہ بنام افتخار الدولہ کی اولوالعزمی کا نقش باقی ہے ۱۸۶۸ء کی بنیاد ہے اور آئی ٹی روڈ کیوں [illegible] ملحق ہے اس کے سامنے کی زمین جہاں ماہ محمود آباد کی ملکیت بتائی جاتی ہے۔

اسرار حسین خاں لکھتے ہیں کہ چاند گنج کے ہاتے میں ایک عظیم الشان مویشی خانہ تھا جسے ——

زندہ جانوروں کا عجائب خانہ کہنا چاہیے۔ اس کے بانی نصیر الدین حیدر تھے اس میں اس قدر کثیر اور عجیب و مختلف اقسام کے جانور تھے جس کا اندازہ کرنا غیر ممکن تھا بادشاہ کے پاس ایک شیر تھا جس کا نام بھوریا تھا یہ شیر کوہ ہمالیہ کے دامن کے ایک دیہات بھوریا سے پکڑ کر آیا تھا اور اس وجہ سے اس کا یہ نام ہوا بادشاہ کے یہاں ایک چیتا لگرا نامی گراں ڈیل تھا۔ بہت سی لڑائیاں جیتے ہوئے تھا اس کی کھال پر دھاریاں نہایت خوشنما تھیں۔ ایک ہاتھی صرف ایک دانت کا ایسا زور آور اور کوہ پیکر تھا کہ تنہا اس نے سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کی تھی اس کا نام بلیر تھا۔ ایک گھوڑا مردم خور کے نام سے مشہور تھا کیونکہ وہ بہت سے لوگوں کو ہلاک کرچکا تھا جس کو شیر اور ہاتھی نے کھیلنے تک نہ مار سکے بلکہ خود زخمی ہوگئے "بھوریا" کے بارے میں مجھے عہد شاہی کے نجف علی جن کا عرف "وغیرہ" تھا کا بیان بھی یاد ہے۔ ایک مرتبہ یہ کٹہرے سے باہر ہوگیا اور ہلچل پڑ گئی بادشاہ خود منظر دیکھنے آگئے اور ڈانٹ کر کہا "بھوریے یہ کیا" شاہی اقبال تھا کہ وہ خود کٹہرہ میں گردن نیچی کرکے چلا گیا۔

علی گنج

اس محلہ کو نواب آصف الدولہ بہادر نے ۱۷۹۰ میں آباد کیا اور ٹھیک اسی دن ان کی ماں نے نگریاں ساتی جیٹھ کے پہلے منگل کو یہاں مہابیر کے مندر میں ہندوؤں کا بڑا میلہ ہوتا ہے گرد و نواح سے ہزار ہا شرکا رپکریاں کرتے ہوئے اپنے قد سے زمین ناپ کر وہاں پہونچتے ہیں مونی چور کے لڈو اور ہار پھول یہاں چڑھائے جاتے ہیں ہر طبقہ کے ہندو درشن میں مصروف رہتے اور بعض مسلمان بھی پرشاد لیتے ہیں ؎

مہابیر جی کا میلہ چار روز میں آنے والا ہے تماشہ دیکھا ہر یادلی کے جوش طوفاں کا

آزادی کے حامی اپنی فوج سے کر مندر کا درشن کرتے ہوئے ہر جون کو جھٹ سے منڈیا ڈل چلے اور ایک حصۂ فوج گلزار کبیں گاہ میں انگریزوں کی گھات میں بیٹھ رہا۔ علی گنج میلہ کے میدان میں ایک سربلند اور شاندار مسجد ہے جس کے بانی کا نام نہیں معلوم۔

مکارم نگر

یہ محلہ پارک کی آبادی میں بہت پرانا اور شیخ عبد الکریم خاں صوبیدار کا بسایا ہوا ہے۔ کرم نگر کو عوام نے مکارم نگر میں تبدیل کیا اور دور کے آخری دور میں یہاں زنانہ اور ہیجڑوں کی بستی ہوئی۔ خواجہ سرا کا عہدہ حکومت شام معاویہ کے دماغ کا نتیجہ تھا اور وہ [illegible] دیکھ کر رکھنا چاہتا تھا جس سے حرم سرا کی عورتوں کو گزند نہ پہونچے اور ہیجڑوں کی تعداد اس جذبے میں بڑھ کر

[illegible] ۔ ۲ احسن التواریخ صفحہ ۔ ۳ سرولی معاویہ

جو مرد عورت بن کر ناچنے کی آرزو رکھتے ان کو زنانہ ہو کر ناچنے کا موقع ملے شادی بیاہ میں بھانڈوں اور کشمیریوں کے ساتھ ان کی کمائی کا بھی ایک قبیح ذریعہ پیدا ہو نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں لکھا ہے کہ مجتہد العصر کے حکم سے مکارم نگر سے ہجڑے نکالے گئے اور اس سلسلے میں اس نے سید العلماء کا ایک خط نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پبلک کی فلاح اور اخلاق اصلاح کا عالموں نے بیڑا اٹھالیا[1] تھا اور حکومت انھیں کی تھی ۔

انا ردوانہ :- اس غول کا ایک نمایاں انا ردوانہ نامی تھا عہد شاہی کے مسخروں میں یہ اور مرزا مچھو شہرۂ آفاق تھے دونوں کی پرورش اسی علم خیز لکھنؤ کے درزوں میں کھیل کر ہوئی تھی کسی رئیس کی ظرافت طبع تھی کہ اس کو ابھار دیا وہ سلطان العلما کی دعوت کرے ۔ اس نے سواری روک کر بہت ادب سے عرض کیا کہ حضور یہ ناقص وکمتر کی دعوت کرنا چاہتا ہے رد دعوت حضور کا شیوہ نہیں ہے جناب نے فوراً یہ جواب دیا کہ اپنی وضع قطع بدل دے تو مجھے آنے میں کوئی عذر نہیں (مرد مرد کا مہمان ہوتا ہے) نہ وہ کرتی اور لہنگا اتار سکتا تھا اور نہ جناب جا سکتے تھے تھرکتا ہوا بڑھتا تھا اور عرق ندامت میں ڈوب کر پلٹا ۔

یہ واقعہ صحیح ہے کہ ہجڑے کا جنازہ اٹھتے کسی نے کبھی نہیں دیکھا یہ ہمیشہ اندھیری رات میں میت اٹھاتے ہیں ۔

محسن باغ

پار کے باغات میں یہ گلستاں میر مہدی حسین ماہر نے خریدا تھا اور نہ اپنے نام پر نام رکھا نہ بیٹوں کے نام پر بلکہ آثار قدیمہ کی محبت میں وہی نام رہنے دیا جو باغ لگانے والے نے رکھا تھا پھر اس باغ کا نام دوسرے مالک نے شہنشاہ باغ اپنے نام پر رکھا ۔ میں نے یہ باغ تقریباً ۵۵ سال پہلے دیکھا تھا اور ماہر کے بیٹے نواب سید عابد حسین عرف چھوٹے صاحب بیمار ہو کر پاٹا نالے سے تبدیل آب و ہوا کے لئے کچھ دن کے لئے گئے تھے میں اپنے والد کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر مزاج پرسی کو گیا تھا پر فضا جگہ تازہ آب و ہوا میں ایک خوبصورت اور کشادہ عمارت تھی ۔

کوٹھی دل آرام :- یہ کوٹھی چھتر منزل کے پچھواڑے ہے دو منزلہ عمارت ہے کہا جاتا ہے کہ رمنہ کے حدود[1] میں ہے ۔ ۴۰ سال ہوئے کہ اس عمارت کو گرا دیا گیا ۔ بعض فارسی تاریخوں[2] میں آصف الدولہ کے عجائب خانہ کا ذکر ہے جو طول کے لحاظ سے دوہرا نہیں گیا

عہد نصیری میں ایک شخص تھے جو دو پٹھے لے کر ایک کا داہنا بازو اور دوسرے کا بایاں بازو کاٹ دیتے تھے اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ دونوں کو ملا کر ٹانکے دیتے اور ایک دوہریا کبوتر بنا لیتے تھے ان کو بڑی داشت سے پالتے تھے اور وہ دونوں ایک ساتھ اڑتے تھے ۔ اکثر معمول تھا کہ جب بادشاہ بجرے پر سوار ہو کے چھتر منزل سے دریا پار[3] جاتے اور کوٹھی دل آرام میں بیٹھ کر دریا کی سیر دیکھتے تو یہ اس پار سے اپنے عجیب الخلقت دوہریا کبوتروں کو اڑا دیتے تھے جو بادشاہ کے قریب جا کر بیٹھ جاتے بادشاہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور انعام پاتے ۔

سراری باغ :- یہ باغ دریا کے پار تھا اور میلوں سبزہ زار پر مست ہاتھی اور کبھی گینڈے لڑائے جاتے تھے نوبت بخش فضا کا ذکر تاریخ ہونے کے صفحہ پر باقی ہے عبدالحلیم شرر کی تحقیق ہے کہ یہ باغ رمنہ میں تھا اور رمنہ[4] دریا پار تھا رمنہ کے تاریخی خصوصیات پر ہم مستقل بحث کریں گے

---

[1] تاریخ اودھ ۵ صفحہ ۲۹ — [2] رسالہ آج کل دہلی ماہ جنوری ۱۹۵۵ء — [3] جنت العالیہ ۲ صفحہ ۹۹

[4] قدیم شہر صفحہ ۲ — [5] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۳۹

رمنہ

یہ لق ودق زمین چھتر منزل کے عقب دریا کے اس پار تھی ندوۃ العلما[1] اور گورنمنٹ آرٹ اسکول کی عمارتیں رمنہ کی زمین پر ہیں۔ نصیر الدین حیدر کے وقت میں یہاں ہاتھی گینڈے اور بارہ سنگھے رکھے جاتے تھے خلائق کا ہجوم ہو جاتا تھا ہاتھیوں کی لڑائی اور [illegible] کا منظر ۱۹۵۱ء کے ٹکٹ ڈاک میں چھپا ہے۔

ہاتھیوں کی لڑائی کا بڑا مہیب منظر ہوتا ہے کمزور دل کا آدمی نہ اس کی چنگھاڑ برداشت کر سکتا ہے نہ ٹکر کی آواز اس ڈرونے جنگ کے لئے ایک لمبی چوڑی زمین پر مضبوط دیواروں کا احاطہ تماشائیوں کے لئے مناسب نشست اور حسب مراتب جگہیں مقرر کرنے کے بعد چار دیواری کے نزدیک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تنومند اونٹ باندھے جاتے ہیں ہاتھی اونٹ سے ڈرتا ہے جب ہوشیار فیلبانوں کے ذریعے اولاً مست کر کے ہاتھی لائے جاتے ہیں تو ہاتھیوں کو چھوڑنے والے بھی جان پر کھیل کر ہمت کرتے ہیں اور دو مختلف سمتوں سے جب یہ کوہ پیکر لا کر چھوڑے جاتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی طرف جھپٹتا ہے سونڈ بازی سے کبھی پہل ہوتی ہے کبھی ذرا لڑا لگی ٹکر کے دھماکے سے ایک کو دوسرا پیچھے ہٹاتا ہے اور پچھڑ جانے والا جوش انتقام میں اگر اس سے بڑھ کر حملہ کرتا تو دونوں طرف سے غصے کی آگ بھڑک اٹھتی اور ہر ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کرتا کبھی دانت پر دانت پڑتے کبھی گھٹنے ٹیکنے کی نوبت آتی۔ اور عروج وزوال کا نقشہ کبھی گرنے کا دھماکہ اور فتحمند ہاتھی پیچھا کرنے پر تلا ہوا۔ ہار جیت کا معیار یہی تھا کہ جو محاذ سے بھاگ کھڑا ہو۔ اونٹ سے ہاتھی ڈرتا ہے اونٹ نہ ہوتے تو وہ دیوار پر ٹکر مار کر نکل جاتا۔ خوف ستر راہ فرار سے روکتا ہے اور دنیائے عالم اسباب ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتا ہے۔

نوابی میں تمام لکھنؤ گلیوں اور تنگ راستوں سے بھرا پڑا تھا صرف ایک سڑک رمنہ میں تھی جہاں راجہ مہرا آصف الدولہ کے کہار اور ریزیڈنٹ کی گھوڑا گاڑی کا مقابلہ ہوا تھا۔ ادھر صاحب اپنی بگھی پر بیٹھا ادھر پیر کے دن ۹ بجے صبح کو نواب کا بوجھ کہاروں کے کاندھے پر چلا آدھ کوس تک گاڑی اور بوجھ برابر رہا اور جب کندھا بدلا تو سرتی آگے بڑھ گیا اور آٹھ کہاروں نے جو اس کی مدد کو ساتھ تھے امتحان کی حد نا گزر کر بسم اللہ کہہ کر سواری رکھ دی تماشائیوں[2] میں واہ واہ کا غل مچ گیا نواب نے سرتی کو اس صلہ میں راجہ کا خطاب دیا اور سرتی کہار کا نام راجہ سورج برائی ہوا اس قصہ کو گھاسی رام ایم اے نے بڑی تفصیل اور لطف سے کتاب مذکور میں نقل کیا ہے" رمنہ کی زمین میں وسعت نواب حسن رضا خاں کی ایک کوٹھی کھود کر کی گئی تھی جو رمنہ میں تھی۔ لوہے کے پل کا سامان جو نواب سعادت علی خاں نے برمنگھم سے ۳ لاکھ روپے میں منگوایا تھا اور نواب نے اس سامان کے پہونچنے سے پہلے قضا کی یہ سامان مدت تک رمنہ میں غیر مرتب پڑا رہا منشی علاء الدین احمد اکبرآبادی سلطان عالم کے حال میں رقمطراز ہیں "تعلیم فوج کا شاہ کو اس قدر خیال تھا کہ بنفس نفیس رمنہ میں چار گھڑی رات سے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے تھے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر فوج کی قواعد[3] اور فنون جنگ کی مشاقی دیکھتے اور با کمال سپاہیوں کو انعام سے سرفراز فرماتے۔

روپ پور کھدرا

اس موضع میں شیخ اکرام علی ولد شیخ محمد واصل بہار پوری رہتے تھے واصل عہد آصفی میں لکھنؤ آئے بچوں کو پڑھانے کے علاوہ

---

[1] [illegible] جنوری ۱۹۵۱ء   [2] روح الادب حصہ سوم ص ۸۳ مؤلفہ گھاسی رام ایم اے ایل ایل بی   [3] اخبار [illegible] مورخہ ۲ جولائی ۱۹۳۸ء

خطاب ملے سو روپیہ ماہوار بہ پرانی بانس منڈی کے قریب ان کو زمین دی گئی۔ شیخ واصل نے اپنے بیٹے شیخ اکرام علی کو بھی بادشاہ عہد نواب یمین الدولہ میں سکھوایا ان کے استاد شیخ شہاب و شیخ گلن دلدار خاں تھے جو اس فن میں جواب نہ رکھتے تھے۔ اکرام علی نے عہد واجد علی تک وابستہ رہنے کا فخر حاصل کیا ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کی فرمائش سے مصری کی روٹی پکائی اور تمام تان [illegible] رکھا تان بادام بھی ان کی ایجاد تھی اکرام علی اشرفی اور روپیہ کام تر بناتے تھے اور تیار ہونے پر نقش اور حروف [illegible] اور جس سنہ کا سکہ ہوتا صاف پڑھا جاتا کھاتے میں کسی قسم کی گرانی معلوم نہ ہوتی اور نہ کشتہ کی صورت اور [illegible] ۱۸۵۸ء میں جو تمغے ملے تھے وہ ان کے پوتے شیخ اعظم علی کے پاس اب تک موجود ہیں۔ کلکتہ کی نمائش میں اکرام علی نے انڈے کی زردی کو ابال کر دو حصے کر دیئے سابہر کو دور کیا اور زردی پر کارچوب بنایا اور اچاری میں مع سفیدہ رکھ کر پیش کیا دوسرا مرتبہ آم کی پھانکوں کا تیار کر کے حاضر کیا ایک پھانک پر سونے سے مصرعہ لکھا اور دوسری پھانک پر چاندی سے دوسرا شعر لکھا

رہا ان سے زیں ہے حکام ملک گیتی　　　یہ تدبیر سے سارا جہاں ہے

ان کے ہاتھ کی قاشوں کو ایک ڈبے میں انگریز دیکھ کر پھڑک اٹھے ۱۸۹۶ء میں اکرام علی مر گئے۔

<u>تکیہ تارہ شاہ</u>: یہ میں دفن ہوئے شیخ اکرام علی ایک ایسی روٹی پکاتے تھے کہ جس میں کئی مزے ہوتے تھے ایک طرف سے کھائیے تو میٹھی دوسری طرف سے کھائیے تو نمکین تیسری طرف سے معمولی روکھی روٹی کا ذائقہ چوتھی طرف سے سلونی۔ یہ بالائی کی گلوری ایسی بناتا تھا کہ اصل اور نقل میں کچھ بھی فرق نہ ہوتا تھا اندر میوہ بھرا ہوتا اور بالائی کے اوپر کی پرت کی گلوری پستہ کی کیل اور رنگ ایسا سبز دیتا کہ بالکل پان معلوم ہوتا۔

حضور باغ

یہ لب نہر بھی دریا پار نواب سعادت علی خاں نے بنوائی تھی یہاں ہاتھی اور گینڈے لڑائے جاتے تھے ان دو جانوروں کی لڑائی کے لئے بہت بڑی جگہ کی ضرورت تھی اس کو باغ کی آرامی پورا کرتی تھی نواب اور ارکان سلطنت یہاں سے اس ہیبت ناک لڑائی کا منظر دیکھتے تھے ۱۲۲۹ھ کے بعد باغ کا مالک نہ رہنے سے خصوصیات بھی دفن ہو گئے اور نہیں معلوم کہ یہ باغ کہاں تھا اس باغ میں ۵۰ گز لانبا اور ۵۰ گز چوڑا حوض تھا جس میں فوارے لگے تھے پانی موتی کی طرح چمکتا تھا کیاریاں روشیں چمن بندی میں باغ بے نظیر تھا۔

محلسرا سلیمان شکوہ

دریا کے ساحل پر جو عمارتیں تھیں ان میں سلیمان شکوہ کے قصر کا بھی پتہ ہے اس بلڈنگ میں چشم و چراغ دہلی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انشاء اللہ خاں کے بہتے دریا بلنے کا منظر دیکھا تھا کسی اشنان کا میلہ تھا اور سید انشاء اللہ خاں رنگت کے گورے بدن کے فربہ صورت کے جامہ زیب تھے ان کو مزاح میں یہ سوجھی کہ کشمیری پنڈتوں کے کپڑے پہن کر پوجا پاٹ کا سامان تیار کیا صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے پنڈت دھرم صورت بن کر بیٹھ گئے اور خوب زور سے اشلوک پڑھنا شروع کئے اور منتر جپتے رہے لوگ اشنان کے لئے آئے عورت مرد بچہ بوڑھا جو آتا الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر انھیں کی طرف جھکتا یہ انھیں پوجا کروا دیتے تھے تلک لگاتے تھے جن دوستوں [1] راز کہہ رکھا تھا انھوں نے مرزا سلیمان شکوہ کو خبر کی وہ مع حلہ اسی وقت لب بام آئے دیکھیں تو فی الحقیقت [illegible]

---

[1] قدیم لکھنؤ ص ۱۵۳ اور ۱۵۴

... جیسی مشکل ہی ہو کر اور سب سے زیادہ اس میں لذت کہ یا لطف تہ کے ساتھ کٹتے، تماشا ...
... دیکھیں واس شاعری کا پابند جائیں جس کوچے میں جائے گا اوروں سے کچھ ایمان لٹے گا۔

کبوتر والی کوٹھی

یہ کوٹھی چھتر منزل محل کے بغل میں بادشاہ باغ کی جانب آج بھی موجود ہے اس کوٹھی کو آخری تاجدار اودھ نے اپنے کبوتر خانہ کے لئے ... ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء جہاں جہاں نادر کبوتر تھے ان سب کو جمع کیا چھوٹے خاں رئیس الدولہ کبوتر خانہ کے داروغہ تھے اور شیخ محمد ... جن کا نام لکھتے تھے علی مرزا وغیرہ جمعدار تھے ... کے مرد فہمید کا بیان ہے کہ سیاہ بکرے کی مسلم کھال کی چھپیاں بنائی گئی تھیں اور جب ملکہ کبوتر اڑاتے تھے تو ... کچھ دیر کے لئے دھوپ جاتی رہی اور زمین پر سایہ نظر آنے لگا شاہی کبوتروں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پیروں میں جھانجھن سونے چاندی کی تھیں کبوتر جو شاہی تھے جو شہر بھر کے کبوتر بازوں سے خرید کر آج ہی کے دن کے لئے رکھے گئے تھے زیادہ تر کبوتر اپنے مالکوں تک پہنچے اور وہ دوہرے فائدے میں رہے کبوتر کی اصلی قیمت بھی پائی اور کبوتر کچھ سونا چاندی لے کر گھر آ بھی گیا یہ بھی فائدے میں رہے اور جو کبوتر غیر متعلق لوگوں کے گھروں پر گرے وہ بھی نفع میں ہیں ایسے کبوتر ان کو کہاں ملتے ۱۹۲۱ء میں جب لکھنؤ یونیورسٹی قائم ہوئی تو یہ کوٹھی وائس چانسلروں کی قیامگاہ رہی آج کل طلبا کا ہوسٹل ہے۔

کبوتر کی قسمیں بہت ہیں جو مختلف قد و قامت اور مختلف رنگ کے ہوتے ہیں گرہ باز، خورد نوکا، چوا چندن، جنگلی، لقہ، لکّھی، شیرازی، لوٹن، غلوری، ملیہ، گولہ، طرقیہ، رنگ کے لحاظ سے بھی ہر رنگ کے کبوتر کا علیحدہ نام ہے میلا، زاغ، جوگیا، کا ہرا، عنبر سرا، تیلیا، تیلیچڑا، اگرہ مار، داغ، ہرا، چھوٹا کبوتر فاختہ کے برابر اور شیرازی قد ہوتا ہے شیرازی کبوتر کی اعلیٰ قسم کا نام ہے کبوتر سے دانشمندوں نے طرح طرح کے کام لئے ہیں عشاق نامہ بری کی خدمت لیتے ہیں ؎

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار تک
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار میں

ایضاً

بھیجوں اس صیاد کو نامہ تو مارے خوف کے
مثل مرجاں جسم میں خوں کبوتر خشک ہو

اطبا فالج کے مریضوں کو اس کا آب گوشت یخنی کر کے پلاتے ہیں لا ولد جس کے بچے نہیں جیتے کبوتروں کے پر کی ہوا گھر کی بیماریوں کا دفعیہ سمجھتے ہیں اہل علم عمل کبوتر سے بیماروں کو اچھا کرتے ہیں جراح اس کی بیٹ کو زخموں کے بھرنے میں بھی کام میں لاتے ہیں کبوتر بین الاقوامی جانور ہیں عرب کا بلند ذوق ہے کہ جنگلی کبوتر کو یمام کہتے ہیں اور شعرا نے لفظ حمام جہان کی زبان میں کبوتر کے معانی میں بہ کثرت سے استعمال کیا ہے خطبات میں کبوتر کا تمثیلاً ذکر ہے مرغشی اور راعی کبوتر اس طرف بڑے مبارک اور اچھے سمجھے جاتے ہیں کبوتر کی کنیت اپنے محاصمات کے مطابق ابو عکرمہ قرار دی ہے میدان جنگ میں کبوتروں سے فوجوں نے کام نکالا اور طوفان نوح کے عام سیلاب میں سفینۂ نوح پر سے کبوتر کے ذریعے دریافت حال میں تعاون حاصل کیا ہے ارباب ادب لال چیزوں کو خون کبوتر سے مثال دیتے ہیں۔

شریک رنج غیر اس طرح سے ہونا مناسب ہے
مری آنکھوں میں سرخی رہ گئی خون کبوتر کی (جاوید لکھنوی)

خون کبوتر کا شراب سے بھی کنایہ ہے ؎

۱؎ آب حیات ص ۲۹۳   ۲؎ آج کل دہلی بابتہ جنوری ۱۹۵۸ء   ۳؎ نیا دور بابتہ مئی ۱۹۵۸ء

زلفیں چمن گشت طاؤس دیم   بدن آمد فزون کبوتر زقم — جامع اللغات

کچھ شریعت میں کبوتر کا شکار بہت بڑا جرم اور گناہ سمجھا جاتا ہے گھروں میں کبوتر پالنے کا رواج بہت پرانا ہے کہتے ہیں کہ اس وقت جو موجود ہیں وہ اس نسل کے ہیں جو آسمیل نبی کے پالے ہوئے کبوتروں کی تھے کنعان میں غدار سے دو لوگ کنویں کے پاس کبوتر یوسف باپ کے پاس اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

کبوتر امن کی نشانی مانا جاتا ہے اور ہمارے معزز نا جو رنہرو جی کو جو نسٹری سالگرہ کے مبارک موقع پر کبوتر اڑائے گئے تھے کبوتروں کی نگہداشت اس قدر کہ بڑا شوق ہے کہ اس سبجکٹ پر مختلیں کے رسالے لائبریریوں میں ملتے ہیں ان کے مطالعے سے دلخواہ رنگ اور قطع کے بچے پالے جا سکتے ہیں اور کبوتروں کی بیماریوں کے علاج مفردات اور مرکبات سے ایک علیحدہ علیحدہ باب میں اس کو کتنی مت فن کے اعلیٰ ماہروں کو دالبستہ کر رکھا تھا۔

کتب ممتاز العلما میں کبوتر بازی پر ایک قلمی رسالہ موجود ہے جو بہت پرانا تو نہیں ہے پھر بھی صد سو برس سے کم کتابت کو دیکھئے بطلاسگے زبان فارسی ہے اور سوا سو سے زیادہ صفحات ہیں نہ مصنف نے اپنا نام لکھا ہے نہ کاتب نے۔ آخر میں سطر گزشتہ سے تحریر ہے ——
تمت لعون الملک الوہاب بموجب حکم عظمت وحشمت دستگاہ بندگان والا مکان علی محمد خان دام اقبالہٗ۔ ممکن ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا نسخہ ہو کتاب پر کہنگی کے زیادہ سے زیادہ آثار ہیں اور کیڑا لگنے سے کتاب چھلنی ہو رہی ہے۔ کاتب بدا طلب پیاز کو فن سے مثال کو سرے جا بجا لکھا ہے اس کتاب میں زیادہ تر کبوتروں کی حفظ صحت پر ادویہ اور تدابیر ہیں اور آخر میں چرند و پرند کو مست کرنے کے نسخے بھی درج ہیں۔ افزائش نسل پیل و شتر و اسپ و گاؤ کتاب کا خاص باب ہے اس کتاب کو علم الحیوان کی ایک نادر کتاب سمجھنا چاہئے۔

کبوترباز

عہد غازی الدین حیدر میں اس فن کے کامل میر عباس تھے وہ کبوتروں کو اس طرح سکھاتے تھے کہ جہاں سے چاہتے تھے ان کو اڑاتے تھے اور جب سیٹی بجاتے تھے کبوتر آکر پنجرے پر بیٹھ جاتے تھے۔

نصیری عہد میں ایک استاد تھے جو دو پٹھے لے کر ایک کا داہنا بازو اور دوسرے کا بایاں بازو کاٹ دیتے تھے اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ دونوں کو ملا کر ٹانکے دیتے تھے اور ایک دوہرا کبوتر بنا لیتے تھے ان کو بڑی داشت سے پالتے تھے اور دونوں ایک ساتھ اڑتے تھے۔

میر امان علی کبوتر کو رنگ کر جیسا چاہتے بنا دیتے تھے اکثر پر اکھاڑ کر دوسرے رنگ کا پر اس کی جگہ رکھ کر اس طرح جما دیتے کہ وہ اصل پروں کی طرح جم جاتا اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے مگر ایسا مضبوط اور پختہ رنگ ہوتا کہ محال کیا جو ذرا بھی پھیکا پڑ جائے سال بھر تک یہ رنگ قائم رہتا بعد سال بھر کے کریز میں جب پر گر پڑتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا تھا وہ ایسے کبوتر امرا کے ہاتھ پندرہ بیس روپے میں فروخت کر ڈالتے میر صاحب، ایک مشہور کبوترباز کا نام قلی علی تھا۔

بھانڈوں کا باغ

بارہ کا مشہور مقام ہے اور مہورتہ کی اس یادگار کا نام ۱۹۳۰ء میں بیگم باغ رکھا گیا تیس برس پہلے اس باغ پر فضل حق کا قبضہ تھا

سلہ قدیم لکھنؤ   سلہ نسیم اللغات ص۹۲

اب سے حکیم مرزا محمد تقی صاحب طبیب گھسیاری منڈی نے مول لیا اور زمینداری ختم ہونے تک حکیم صاحب کی ، بلکہ زمین پر ملکیت باقی ہے اس باغ میں دو مسجدیں تھیں ایک گر کے ختم ہو گئی دوسری مسجد موجود ہے جس کو عوام جناتی مسجد کہتے ہیں اور مرد و عورت حاضر ہو کے منتیں مانگتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ باغ محلہ ارادت نگر میں شامل ہے اس کی تھوڑی سی زمین میں دو معمولی پختہ کنویں اور تیسرا اتنا بڑا کنواں ہے جو لکھنؤ بھر کے اناروں اور باولیوں سے بڑے کنویں سے قریب تر حال ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کنواں اسی باغ کے آخری مالک نے کنویں سے آب رسانی کے لئے رہٹ کا انتظام کیا اور بیل جوت کر رہٹ کے ذریعے پانی کھینچتا ہے۔ اور اس قدر بڑی مقدار میں پانی ہے کہ کبھی کمی محسوس نہیں ہوتی پانی اس کا ہلکا اور ہاضم اور پیشاب کھول کر لانے والا بتایا جاتا ہے مرزا محمد اصغر صاحب محدث و رئیس جوہری محلہ لکھنؤ نے اس کنویں کو دیکھ کر اپنے بزرگوں کا قول نقل کیا ہے کہ یہ چاہ بہت بڑا جہاں دار الدولت کا ذکر ہوتا ہے اور پانی چھن کر اوپر پہونچتا ہے ۔ باغ میں حکیم صاحب کے لگائے ہوئے درختوں میں دسہری آم اور فالسہ اور دوسری قسم کے درخت ہیں ۔

سادھو جی کا مٹھ

کھویا منڈی و محل گنج کے راستے میں یہ جگہ بڑے پرانے آثار کا پتہ دیتی ہے اور ایک چوکور چبوترہ ہے جس پر گنبد نظر آتا ہے۔ اسی جگہ پرانے زمانے کے سادھو نے بیٹھ کر پھیرا اٹھا اور وہیں پیام موت آ پہونچا اور اسی سمادھی پر سپرد خاک ہوا یہاں سے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا ایک تکیہ ہے جہاں بہت سی قبریں ہیں

عہد شاہی کی چار دیواری

مذکورہ بالا مقام پر وہ پختہ لکھوری اینٹوں کا احاطہ بھی ہے جس کے بارے میں کچھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دیواریں کس عمارت کا جز تھیں مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ فقیر کا باغ تھا جو جنگ آزادی کے سلسلے میں اپنی پوری جمعیت لے کر پامردی سے لڑا تھا اور انگریزوں کے استعمال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس مورچے کی لڑائی کا حال میرے پردادا کی پالکی کا جمعدار لوکھار جو نگینہ کا رہنے والا خالی کی داستان گو رہا جو جوش میں بیان کرتا تھا اس سے بڑھ کر لکھنؤ کی گلیوں کا جاننے والا دوسرا شخص شہر میں نہ تھا۔

کندھئی کا مندر

یہ وہ اونچا اور بہت بڑا مندر ہے جو شہر بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا مندر سے قریب اس کے بانی کی املاک تھی بادشاہ کو علم ہوا کہ اس نے ایک قیمتی ہیرا خزانہ شاہی کا چرا لیا ہے اس بنا پر مندر چھوڑ کر پورا گھر اور املاک کھدوا دی ۔ اس مندر میں اس قدر وسعت ہے کہ قدیم طرز تعمیر اور سہ دروں میں مورتیاں رکھی گئی ہیں اندر سے اما باڑہ اور باہر سے مندر معلوم ہوتا ہے پجاری کو شاہی عطیہ زمین اور ماہوار وظیفہ ملتا ہے ۔

چھاؤنی دھنے خاں

شہر کا ناکہ ہونے کے باعث چھاؤنی پر دھنے خاں میواتی تعینات تھا اور مسلمانوں کی اچھی خاصی بستی تھی کچھ شیعہ بھی آباد تھے اور غالباً محرم میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہو گیا اور بلوائیوں پر شاہی پلٹن کی طرف سے استعمال ہوئیں کچھ آدمیوں کی جانیں گئیں۔ مرزا مستان بیگ کوتوال سے جب فساد نہ رکا تو منظور علی جمعدار تلنگوں کی پلٹن لے کر توپ خانہ سمیت پہونچے اور میواتی پسپا ہوئے ان کا

مال و اسباب لٹا ہاتھی اور گھوڑے ضبط ہوئے۔

بانس منڈی

دریائے گومتی کے شمال میں واقع ہے یہاں بانس کے تاجر یہاں زمانہ دراز سے رہتے ہیں اور بہت سے گھر کشمیریوں کے ہیں مقبرہ جناب عالیہ آباد ہونے سے پہلے سب کے سب اسی جگہ بسے ہوئے تھے ۹ مارچ ۱۸۵۹ء کو ایک مسجد میں جس سے تھانہ حسن گنج میل بھر ہوگا شیعوں کی اذان کے وقت ایک دو ترا فساد ہوا سرفراز علی عرف حافظ جی تھانیدار اور بشیر الدین سب انسپکٹر ہ بجکر امنٹ پر موقع واردات پر پہونچے گرفتاریاں ہوئیں ذلو ایک کتاب قادر مقام کشٹ مجسٹریٹ کے سامنے زیر دفعہ ۱۴۷ استغاثہ دائر ہوا اور اس آگ کے شعلے عرصہ تک بھڑکتے رہے پہلا فساد اس محلہ میں عہد شاہی میں ہوا تھا اور یہ اختلافات کی وبا عہد ملکہ وکٹوریہ میں پھیلی مدت تک فریقین نقص امن کا شکار ہوتے رہے اس فساد میں ایک ہمدرد سوتیلے ہے اقلیت کی نمایاں مدد کی اس معلوم لوار کے پاس عرف لوٹیا بیتل کی اور سدھال تھا جس نے مجمع پراگندہ کیا۔

مزار شاہ عبداللطیف:- دریا کے کنارے اس طرف شاہ عبداللطیف دہلوی کا مزار ہے اور شاہ صفا کی قبر بھی بتائی جاتی ہے یہ دونوں باپ بیٹے اپنے زمانے میں صاحب کشف و کرامات تھے شاہ عبداللطیف کو لوگ بادشاہ گر کہتے تھے جو قبریں اس وقت موجود ہیں ان پر سنگی برآمدے اور کچھ اور آثار نمایاں طور پر باقی ہیں۔

پار:- یہ محلہ رکاب دار عہد شاہی میں آم کی کچی قاشیں گودتا تھا کہ یہ بشکل قاش مسلم رہتی تھی عارف امام بخش عہد غازی الدین حیدر میں باورچی خانہ کے منتظم تھے۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا منشی لطف علی لکھنؤ میں موم کے کام کا پہلا شخص گذرا ہے عہد محمد علی شاہ میں مومی مربے اسی نے بنائے۔ واجد علی شاہ نے لطف علی کو منشیوں میں جگہ دی اور انقلاب اودھ کے بعد پھر کسی کی نوکری نہیں کی اور ۱۹۰۶ء میں مرگئے ان کے بعد سے منشی محمد احمد اسی محلہ پار کی مومی مربے تیار کرتے ہیں یہ مربے امام باڑہ حسین آباد مبارک کے لئے بہت بلند بنتی ہے طرح طرح کے نقش و نگار اور دریچے بنائے جاتے ہیں۔ پار میں ایک عرب کی شعبدہ بازی کا واقعہ بھی تاریخی ہے جس کو قدیم ہنر نے نقل کیا ہے۔ اور میں بخوف طول کیفیت نقل نہیں کر رہا ہوں۔

شامت لکھنوی نے میر انیس صاحب مرحوم کا مقولہ درج کیا ہے۔ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اس وقت دو شخص اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے ایک میر مداری جو پار میں رہتے تھے دوسرے مرزا سلامت علی دبیر۔ میر مداری اگرچہ ہی بزرگ ہیں جن کا اشرف تخلص تھا تو ان کا حال اس کتاب میں آچکا ورنہ آج کوئی بتانے والا نہیں کہ ان کا کیا تخلص تھا (حیات دبیر ۴۹)

ختم دریا کنارے پار کا باب

وہ کوٹھیاں جن کی خبر نہیں کہ کہاں تھیں

اس تاریخ میں اپنے امکان بھر ناظرین کو بتایا گیا ہے کہ عمارتیں شاہی کہاں تھیں اس سلسلے میں ان عمارتوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کا ٹھکانہ مجھے نہیں معلوم۔

لہ تاریخ اودھ جلد ۴ صلہ، از نجم الغنی   کہ کتاب ابراہیم کی ترجمہ ابراہیم مخطوطات

مینڈھے والی کوٹھی:۔ اس کوٹھی کو صاحب الدولہ نے عمارات شاہی کے گرد و نواح میں بنوایا یہاں مینڈھے لڑائے جاتے تھے۔ صاحب الدولہ کے حالات محلہ صاحب گنج میں گذر چکے ہیں۔

حیات بخش:۔ اس کوٹھی کو نواب سعادت علی خاں بہادر نے تعمیر کیا تھا مگر نواب کے استعمال میں نہیں آئی میجر بینک اس میں مارے گئے جب کشنر اودھ نے یہاں قیام کیا منور بخش خورشید منزل چھتر منزل کا اصطبل ماہ منزل بھی نواب نے بنوائے مگر نہیں معلوم کو کہاں تھے خورشید منزل کے حالات میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ سعادت علی خاں نے بنوانا شروع کی اور غازی الدین حیدر نے اسے مکمل کیا۔

کاٹھ کا پُل

اس مقام پر شاہ نصیر الدین حیدر بہادر نے سپیدی کے آزار اور کوڑھ کا اسپتال کھولا تھا جس کو بعد کی حکومتوں نے بھی باقی رکھا یہ عمارت اس قدر وسیع ہے کہ آدھے میں نارمل ٹریننگ اسکول اور آدھے میں اسپتال مذکور ہے جس کا یکم اپریل ۱۹۲۹ء سے کنگ جارج میڈیکل کالج سے الحاق ہو گیا ہے۔

بیلی گارد RESIDENCY

اس عمارت کو بیلی گارد کہتے ہیں جہاں انگریزوں کی طرف سے رزیڈنٹ رہتا تھا اور وہ منافرت جو عہد شجاع الدولہ سے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے تھی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی اور مٹھی بھر غیر ملکی جماعت سمجھتی تھی کہ ہم کو ہندوستان سے خطرہ ہے خصوصاً اودھ انگریزوں کا آخری کرتوت تھا جس کو برداشت نہ کرکے چپے چپے میں بے چینی بدامنی قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور جس طرح سانپ کو دیکھ کر ایک تمیز بچہ بھی پتھر سے اس کی سر کوبی کر دیتا ہے وہی حال انگریزوں کی مسلسل ریشہ دوانی کا تھا کہ پورا ملک ان کا دشمن جان ہو رہا تھا اور اودھ پر قبضہ ان کے لئے لقمۂ شیریں ہونے کے بجائے وہ کڑوا گھونٹ بن گیا کہ جدھر انگریز نظر آتا تھا تہ تیغ ہوتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کو ان سے اصولی اور بنیادی اختلافات تھے اور منافرت کی تخم ریزی مدت دراز سے ہو رہی تھی۔ خود دار طبیعتیں غیر ملکی کو حکومت کا اہل نہیں سمجھتی تھیں یہاں تک کہ چربیلے کارتوس کے مسئلے نے جذبات نفرت کو مذہبی جامہ پہنا کر فوج میں اختلاف کی ہوا دی اور خود افسران حکومت کو اپنی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ صوبہ بھر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا انگریز اپنی اقلیت محسوس کرتے ہوئے اماماڑہ آصفی کو قلعہ سا کر بڑے اماماڑے مچھی بھون بیلی گارد کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کر چکے تھے اور تدبیروں پران کو ناز تھا مگر نہ بڑا اماماڑہ اس یلغار میں ان کو بچا سکا نہ مچھی بھون میں وہ آغوش مادر کی طرح بے حفاظت رہے یہ پبلک مقامات اور فی الحقیقت آزادی کے حامیوں کی جاگیریں تھیں ان سے فائدہ اٹھانے کا غیر کو کیا حق تھا۔ انگریزوں پر ہر سہ محاذ سے حملہ ہوا وہ افسوس ہے کہ اجتماعی نہ تھا نہ اصول جنگ کی تحت میں تھا۔ نہ سب کے سب نیک نیت تھے کچھ صرف لوٹنے کے لئے امن کو برباد کر رہے تھے، جو سچے محب وطن تھے بھی وہ اصول جنگ سے ناواقف تھے منظم نہ تھے ان کی طاقتیں ہر چہار طرف پراگندہ تھیں وہ بیک وقت مچھی بھون اور بیلی گارد دونوں پر حملہ کر رہے تھے اور مستقبل کی ان کو خبر نہ تھی رہے سہے انگریز ان کی یہ

لہ [illegible] ۹۰ صفحہ ۸۸ لہ صفحہ ۹۵۶

تمام کمزوریاں جانتے تھے مگر ہندو مسلم اتحاد سے مرعوب تھے۔

پہلا حملہ قلعہ مچھی بھون پر:- وہ انگریز جو اپنے تدابیر سے اودھ میں قدم جما کر مستقبل میں شہنشاہیت کے خواب دیکھ رہے تھے اور ان کو اس کی تعبیر مل جانے کا یقین تھا ان پر پہلی یلغار نہتے شہدوں کی طرف سے ہوئی یہ بھی کوئی جنگ تھی ان کی یا لومڑیوں کی حیثیت تھی شیروں کے بیشہ میں ایک مورخ لکھتا ہے۔

لکھنؤ میں شہدوں کی جماعت دو فرقوں میں تھی ایک فرقہ عرصہ دراز سے ملازم کوتوالی عہد شاہی چلا آتا تھا اور پہلے آلات حرب، ایک لٹھ ان کے ہاتھ میں رہتا دوسرا غول بازاری تھا جس کی روٹی اس انعام و اکرام میں محدود تھی جو سوار کا امرا میں پھینکا اور لٹایا جاتا تھا۔ یہ دونوں فرقہ دارالطرف سے والی رومی دروازے میں جو قلعہ مچھی بھون کا بڑا پھاٹک مقرر کیا گیا تھا رہا کرتے تھے جب تو رجب حکام انگریزی کو حصار میں کر دیا ان دونوں گروہ شہدوں نے محاذی رومی دروازے پر اپنا مورچہ قائم کر لیا ۳ر جولائی کو وقت شب مردان روند گشت شہدوں[1] کے مورچے پر پہونچے شہدے کمال استقلال کے ساتھ اپنی آوازوں کا آوازہ کھینچ کھینچ کر مار مار کا شور و غل مچا رہے تھے جب مردان روند نے دیکھا اپنے مقام سے قدم آگے بڑھایا ترچھی وقرنا لواروں نے اس حال کو دیکھ کر ترچھی اور قرنا سے کڑکھا مار مار کا آوازہ خوب بلند کیا جس کے سبب سے محافظان قلعہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ہنگامہ اور حملہ اس تھوڑی جماعت موجودہ سے رک نہیں سکتا لہذا انھوں نے اس سرنگ کو جو ایسے وقت کے واسطے راستے پر تیار کر رکھی تھی آگ لگا دی جس کی آواز اور دھمک سے تمام شہر میں زلزلہ پڑ گیا اور خود مع ضروریات حرب و ضرب وغیرہ جو اس وقت ممکن تھا اپنے ساتھ لے کر بیلی گارد میں صحیح و سلامت جا پہونچے 'دریوں بھی سنا گیا ہے کہ صاحب چیف کمشنر بیلی گارد میں محصور ہوئے تھے محافظان قلعہ کو چھوڑ دینے کا حکم ہوا جس کی تعمیل میں قلعہ چھوڑ گیا۔ پیپے بارود اور سات لاکھ کارتوس جنگی میں آگ دے دی"۔ دوسری تاریخ میں مچھی بھون اڑانے اور بیلی گارد پہونچنے کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر ہے۔

لارنس نے مقیمان مچھی بھون کو حکم بھیجا کہ بوقت شب مقام مذکور کو خالی کر کے اڑا دو اور مقام رزیڈنسی میں داخل ہو۔ آدھی رات کو فوج مچھی بھون سے تمام اسباب و خزانہ اور سامان جنگ اور توپ لے کر بغیر آفات نقوص رزیڈنسی میں داخل ہوئے اور ۲۴۰ پیپے بارود کے اور سات لاکھ کارتوس چھوڑ دئے تھے ان میں آگ دیدی تا کہ دشمن کے ہاتھ نہ آسکے ۲ر جولائی ایک سیل کا گولہ ۸ انچ کا اس مقام میں آیا جہاں لارنس صاحب بیٹھے تھے ان کے اور کوپر صاحب کے بیچ میں پھٹا مگر کسی کو ضرب نہ آئی۔ دوسرے دن اسی مقام پر دوسرا گولہ پھٹا[2] مسٹر ہنری لارنس ہلاک ہوئے اس کے بعد میجر بنگس بھی ہلاک ہوئے۔ دوسری تاریخ نے میجر بنگس کی ہلاکت کو اس طرح نذر قرطاس کیا ہے۔

۲۰ر اگست کو محاصرین نے محصورین پر حملہ کیا اور ایک بڑی سرنگ اڑائی اور گولہ سیل و بم سے ایک آفت ڈھائی احاطہ کے اندر پہونچ گئے ۱۲ر جولائی کو میجر بنگس صاحب کمشنر لکھنؤ جو بعد وفات سر ہنری لارنس کے چیف کمشنر کے حصار بیلی گارد میں کام کر رہے تھے گولی بندوق سے جاں بحق ہوئے[3]۔ تیسرا بیان ان الفاظ میں ہے بیلی گارد میں جو ہندوستانی فوج محصور تھی اس کی بہادری اور محبت و شجاعت کی داستانوں کو انگریزوں نے بہت شہرت دی ہے لیکن شاید ہم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ملازم محصورین

1. احسن التواریخ ص۷۶ 2. محاربہ عظیم ص۹۹ 3. احسن التواریخ ص۱۰۸

بے شک انگریز نے عالموں کے پاس بقول انگریز مصنفین کے نہ توپیں تھیں اور نہ توپوں کے لئے شیل اور گولے برخلاف بیلی گارد کے حصار بند کرنے کی حفاظت کے لئے سیکڑوں کی تعداد میں ہر قسم کی توپیں موجود تھیں چاروں طرف اونچے اونچے دمدمے اور گھاٹیاں بنا کر اس کو ایک مضبوط قلعہ کی شکل میں منتقل کردیا تھا سامان خورد و نوش یہاں تک کہ شراب کے قرابے اس کثرت سے تھے کہ ساڑھے چار ماہ بعد جب انگریزوں نے بیلی گارد خالی کردیا تو بہت کثیر سامان چھوڑ دینا پڑا اس استحکام کے باوجود ہندوستانی سپاہیوں نے بیلی گارد کے دیوار و در کو چھلنی کردیا انگریزی کمانڈر جنرل انگلس نے آواز بلند کی کہ ہم کو کمک نہ پہونچی تو ہم ختم ہو جائیں گے۔[1]

باغیوں نے علاوہ حملہ مذکورہ کے ایک حملہ دسویں ماہ اگست کو کیا یہ بڑی جماعت تھی اس حملے میں ایک سرنگ اڑائی جس کے صدمہ سے بیلی گارد میں سوراخ ہوگیا اور اس سوراخ سے اندر پہونچ کر حملہ کیا دیوار قلعہ پر سیڑھیاں لگادیں اور فصیلوں پر چڑھ کے ایک قیامت برپا کی اور قریب تھا کہ اندر پہونچ جائیں مگر محصورین نے اول تو خوب دلیری کی اور دوسرے باغیوں کو بہ دلی اور لاچار باہمی نسبت نقصان اپنے مورچے پر بھاگ گئے اور ۱۸ اگست کو پھر ایک سرنگ اڑا کر حملہ آور ہوئے اور محصورین تک پہونچ کر دیر تک[2] بازار کارزار گرم رکھا

ریزیڈنسی کی عمارت کو انگریزوں نے لکھنؤ کی پبلک کا دست تعدی اور بغاوت ظاہر کرنے کے لئے شق شدہ دیواروں کو تار سے باندھ کر جو گولوں سے پھٹ گئی تھیں ان کو سہارے دے کر تاخت و تاراج کی صورت میں باقی رکھا انگریزوں کے دل کا کانٹا اس وقت نکلا جب لندن سے فوج آئی اور "غدر" کو لاگیا اور خون کی ندیاں بہتی رہیں اس رستخیز کا ناقل ایک چوتھا مولف ہے جس کا نام ہے آغا محمد مرزا نائب ریاست گوالیار رسد بلکھنؤ و اسسٹنٹ منیجر ریاست ٹونکی ملک اودھ آپ لکھنؤ کے ان اشخاص میں تھے جن کے بزرگوں نے عراق کی طرف ہجرت کی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ اس مصیبت گزشت کا کیا حال لکھا جا سکے جس کے نہ زبان گویا ہو نہ چشم بینا ہو تھوڑے روز پیدا ہونے کے بعد مشہور عالم ۱۸۵۷ء کی خوفناک اور مہیب غدر ہندوستان میں پڑ گیا اور گھمسان لڑائی کا غل توپوں کی گرج، گولوں کے پھٹنے، مکانوں کے دھما دھم گرنے سے دہل دہل کر گودیوں میں دبکتا پھرے اور اپنے دلی تلاطم کو ظاہر نہ کر سکے۔ وہ شریف عورتیں جنھوں نے اپنے دروازے پر کبھی قدم نہ رکھا تھا جن کی تمام وسعت دنیا گھر کی انگنائی پر محدود تھی۔ پیدل بھاگنا جس کے وہم و خیال میں بھی نہ آتا تھا اس کو تمام مال و متاع پر ترجیح دے کر اپنے گلے کا ہار بنائے باچشم پر آب و دل بیتاب گرتی پڑتی حل تو حلال تو کمال تو آئی ملا کوٹال تو کہا لکھنؤ کاکوری وغیرہ مواضعات کی طرف لے بھاگیں۔ پھر خدا جانے کتنی مصیبتیں جھیل کر کراچی بندر سے بغلہ دریائی جہاز پر بیٹھ کر سمندر کی جان جوکھوں طوفان سے گذرتی مسقط بصرہ وغیرہ ہوتی ہوئی نجف اشرف اور وہاں سے کربلائے معلی پہونچا دیں۔[3]

بیلی گارد میں ایک خوبصورت مسجد اور شاندار امام باڑہ بھی ہے جو نیم منہدم صورت میں رہا اور پہلو میں قبرستان ہے اور ان افسران فوج کی قبریں ہیں جن کی قربانی انگریزوں کے نزدیک اہم تھی پتھروں پر ان کی بہادری کے کارنامے بھی کندہ ہیں۔

لوہے کا پل اسی عمارت کے محاذ میں دریائی حصے پر بننے والا تھا مگر یہاں کی زمین ریتیلی تھی انجینئر نے اس مقام پر کام شروع کیا جہاں کہ اس وقت بیلی گارد کے مغربی پھاٹک کے سامنے ایک گول پایہ پل پر نصب کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا جو اب تک وہاں

---

[1] نادر اگست ۱۹۵۶ء [2] احسن التواریخ ص۲۹۰ [3] تذکرہ کربلا چھاپ منشی نولکشور

۔۔۔۔ ہے۔

تکیہ بھیم شر

نصیرالدین حیدر بہادر کا زمانہ ولیعہدی میں نکاح سلیمان شکوہ کی لڑکی کے ساتھ ہوا تھا اور شفیق باپ نے بیلی گارد کے قریب قبرستان سے ملحق کئی لاکھ روپے صرف کرکے ایک عالیشان قصر بنوا دیا تھا جس میں آپ نوعروس کے ساتھ رہتے تھے۔

مبارک منزل:- یہ زرد کوٹھی کا نام ہے جہاں مٹیا جان کو ٹھہرایا گیا تھا یہ عمارت کی سفارت ما ۔ سے قریب تھی شاہ عازی الدین حیدر نے اس کوٹھی کو تیار کرایا۔

عنایت باغ

عہد شاہی کا خوبصورت باغ جو بیلی گارد سے قریب تھا تاریخوں میں اس باغ کا بار بار ذکر آتا ہے اور صراحت نہیں ہے کہ مالک کون تھا بعض مورخین نے پتہ دیا ہے کہ میاں آفرین علی خاں عہد خاص نواب آصف الدولہ نے ایک باغ لگوایا جو امام باڑہ ملکہ زمانی سے بیلی گارد تک چلا گیا تھا اور آفرین علی خاں کا سکونتی مکان بھی اسی باغ میں تھا اس باغ میں نواب ممتاز الدولہ بہادر نے بھی عرصے تک سکونت اختیار کی اور جب شہر میں فوج داخل ہوئی تو آپ گنگنی شو کل کے تالاب پر نقل مکان کرکے تشریف لے گئے۔

عنایت باغ کے داروغہ کا نام قاسم بیگ تھا شیخ تصدق حسین صحو کی رائے ہے کہ عنایت باغ میں ڈاکٹر رام لال چکروتی کی کوٹھی تھی جہاں اب سھالیہ صحت گاہ ہے باغ کے بانی یعنی آفرین علی خاں اور معتمد الدولہ سے رنجش رہا کرتی تھی جس تاریخ میر فضل علی ان کو نائب بنانے والے تھے اسی شب کو آفرین علی خاں مر گئے ان کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

جو محمد آفریں رحلت از این عالم نمود — مدرس او شد کاک آستان شاہ دیں

جو نمودم فکر بہر سال تاریخ وفات — ہاتفے گفتا کہ ہے ہے کرد رحلت آفریں ۱۲۲۳ھ

کربلائے تالکٹورہ پہلوئے میر خدا بخش میں مرنے کے بعد ان کو جگہ ملی۔

چولکھی

لکھنؤ کی وہ مشہور عمارت جس کا نام بچہ بچہ جانتا ہے اس قصر عالی کو نواب عظیم اللہ خاں بار بر خاندان شاہی نے بنوایا اور مشہور ہے کہ کاب چوا میں عطر ملایا گیا ہے ایک تاجر بیش بہا عطر لے کر آیا تھا جس کی دربار اودھ میں شنوائی نہ ہوئی مایوس ہو کر جارہا تھا عظیم اللہ خاں کا سامنا ہوگیا انہوں نے کنٹروں کو مسالے کے گارے میں انڈلوا دیا اور حوصلے کے مطابق قیمت دی لوگوں نے کہا کہ عظیم اللہ خاں تم نے گستاخی کی شاہی سرکار سے جو عطر ساز پلٹا تھا اس کو خریدنا اچھا نہ تھا جواب دیا کہ میں نے یہ اقدام بالکل عقیدتمندانہ کیا وہ اپنے گھر جاکر یہ کہے گا کہ بادشاہ تک تو رسائی نہ ہوئی ان کے نائی نے عطر خرید لیا اور میری ہمت سے زیادہ انعام دیا یہ بات ظل اللہ کے یہاں سودا ہو جانے میں نہ تھی۔

کوٹھی بن کر تیار ہوئی واجد علی شاہ کا گذر ہوا عمارت دیکھ کر سواری رد کی عظیم اللہ خاں گھبرائے ہوئے رومال پر نذر دینے کے لئے سامنے آئے اور آداب کورنش بجالائے ظل اللہ نے پوچھا یہ کوٹھی مجھے پسند ہے کتنا صرف ہوا ہے عرض کیا جارلاکھ، خزانچی کو حکم

لہ تاریخ نجم الغنی ص ۲۵ ح ۴

[illegible] وقت اس کے تمام سامان [illegible] کر بڑے بڑے آئینے یا جو کچھ سامان آرائش ہے وہ بھی لے لیا جائے۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا سامان وغیرہ ان کا تھا واپس کر دیا اور فرمایا میں نے قیمت عمارت کی ادا کی نہ کہ آراستگی کی بادشاہ نے نام [illegible] مشرقی منزل رکھا تھا۔ مگر چار لاکھ کے وزن نے نام مشہور نہ ہونے دیا اور شہرت اسی چولکھی کو رہی۔ اس عمارت کے [illegible] اندر دروازے اس قدر چھوٹے اور پتلے تھے کہ ہاتھی مع ہودے کے اندر آجاتا تھا اس عمارت میں خاص محل یعنی والدہ [illegible] بیگم صاحبہ [illegible] رہتی تھیں گو یہ عمارت باقی نہیں ہے تعزیہ خانہ کا کچھ حصہ موجود ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ فرنگی اشکال [illegible] حضرت محل لکھنؤ چھوڑتے وقت اس عمارت سے برآمد ہوئیں۔

حکیم اللہ خاں نے اپنی رسائی محنت سے جو عزتیں حاصل کی تھیں[1] اس میں یہ بھی شرف تھا کہ پنشن داروں کو ان کے ہاتھ سے [illegible] تقسیم ہوتا تھا عہدنامہ میں ان کے اختیارات کا ذکر ہے فقرہ جبش اور امن ان کی دو بیبیاں تھیں جن کو وہ پچاس پچاس روپے ماہوار دیتے تھے۔

غدر کے بعد یہ کوٹھی بارہ ہزار روپے کو فروخت ہوئی اور انگریزوں کے زمانے میں پرنس مرزا والا قدر مرحوم نے خریدی۔ انگریزی حکومت میں اس علاقے میں والا قدر روڈ کا پتھر اب تک لگا ہوا تھا آپ چشم و چراغ تھے مرزا کیواں جاہ ولیعہد حضرت نصیر الدین حیدر بہادر کے جو علوم مشرقیہ کے ماہر اور ہندی کے استاد تھے۔

(نوٹ) عصر شاہی کے کاغذات میں ہندی کا لفظ اردو کے معانی میں استعمال ہوئی ہے چنانچہ بچوں کی دینی تعلیم کے سلسلے میں اس وقت بعد حمد فارسی کے مقابل میں جو نام آتا تھا "بعد حمد ہندی" اس کا مطلب یہ تھا کہ بعد حمد اردو اور اس کتاب کا پہلا مصرعہ یہ تھا "اول تو کہہ زباں سے نام خدا" ہم نے جو کیواں جاہ کے لیے دعویٰ کیا ہے کہ وہ ہندی کے ماہر تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ عصر حاضر کی ہندی وہ سو برس پہلے جانتے تھے ان کا کلام جو ایک دوہے کی صورتوں میں ہے ملاحظہ ہو ؎

تم کا دیکھ چاند چھپ چھپ جات ہے کل کدر سائیں — ماس ماس لیت ہے جنم پر ہودت تم سا ناہیں

حمد و نعت میں ان کا نمونہ سخن دیکھئے ؎

کریم رحیم اور داتا تجھ کو سب ہی کا رب جانا — چاہئے تھا جانا جو وہ نہیں پہچانا
داتا تو کرتار تو اور ہے سرجن ہار — کوئی تجھ کو رستے چپے اور کوئی پالن ہار
بدیا نہ ہاتھ بل کام کرے نہ کوئی — کرم کئے ہیں ترے بدھنا کچھ بھلا نہ ہوئے
ایک دھیان سے منو بنایا کرنے کو یہ دھیان — ایک آدم سے لاکھوں دم ہیں اسی طرح سے جان
ایک آنکھ سے ایک دکھایا دونوں سے بھی ایک — ہر ایک کو سجھایا الگ کہ تم جانو ہر ایک
پربت آوے جنگل آوے نینوں بیچ سمائے — تل دھرنے کی جگہ میں اپنی قدرت یوں دکھلائے
گنتی دھنی اور گیانی چاتر کہنے کو ہیں نام — گنتی جہاں تہاں سکیں ما برستی کو لیں تمام
سورج سے سب کے بڑھ کر تجھ میں اور بہت سے بل — بل کو چاہے جگ کر دے اور جگ کو چاہے بل

---

[1] عہد نامہ ملکہ عالیہ لکھنؤ

[illegible]

اشعار طولانی ہیں میں نے سلسلۂ توقف کچھ شعر لکھے ہیں قدر مخلص تھا جس کو اوپر کے شعر میں "کدر" نظم کیا ہے [illegible] "کدر" میں فروتنی اور خاکساری کا بھی پہلو ہے۔

نواب والا قدر کے زمانے میں چوکھی میں بارہ سو ملازم باہر اور آٹھ سو عورتیں اندر نوکر تھیں مدار المہام کا عہدہ مولوی مردار ضامن علی صاحب مرحوم مناظر کو تھا نواب منشی مرزا تک پہر دیا اور عالم پر کوئی حاکم نہ تھا۔

<u>حکایت</u> :- چوکھی کی امیرزادیوں اور روٴسا کو مرزا دبیر صاحب سے بڑا خلوص تھا اور مرزا صاحب بہت ہی غریب پرور فیاض واقع ہوئے تھے جو کچھ خود کماتے تھے نادار طبقے پر بانٹ دیتے تھے اور جب کچھ نہ ہوتا تھا تو رئیسوں کو سفارشی رقعہ لکھتے تھے خود ان کی ڈیوڑھیوں پر جاکر زبانی مدد کراتے تھے ایک میر صاحب نے مجبور کیا کہ ان کی لڑکی کی شادی میں چوکھی میں چلکر سفارش کر دیں کنیا کا معاملہ اٹھ کھڑے ہوئے پالکی میں بیٹھے نخاس سے قیصر باغ تک سواری گئی کہاروں نے حسب عادت پہنچ کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا جنھیں نہیں معلوم تھا وہ تاڑ گئے کہ کوئی مہمان آرہا ہے مرزا صاحب پالکی سے اترے بیگمات بیشتر اوقات میں بزرگان دین اور عالم و فاضل سے خود بات کرتی تھیں خواہ سرا یا کنیزیں درمیان میں نہ ہوتیں اوٹ رکھا گیا۔ صاحب سلامت مخلصانہ کے بعد مرزا صاحب خاموش تھے بیگم نے خود پوچھا۔

<u>پردہ سے</u> :- کہاں تکلیف کی ؟

<u>مرزا صاحب</u> :- مجھے یہ سید صاحب لائے ہیں ان کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے بہت نادار ہیں۔

<u>بیگم صاحب</u> :- جو کچھ فرمائیے حاضر ہے۔

<u>مرزا صاحب</u> :- آپ خود ہی جو مناسب ہو عطا کریں یہ سید قابل احترام ہیں اگر آپ زیادہ مرحمت کریں اور میں کم عرض کر دوں تو اولاد رسولؐ کا نقصان ہوگا امراء کی پرانی عادت اور سرشت مزاج ہے کہ جو کہہ دیں سہی ہو۔ علیا مکرمہ نے وہی فرمایا جو پہلی مرتبہ کہہ چکی تھیں اور مرزا صاحب نے احترام میں سادگی سے کہہ دیا کہ جو کچھ آپ پہنے ہوں وہی اتار دیجئے۔ مرزا صاحب سمجھے تھے کہ گھر کی میلی پوشاک میں نہ بیگم کو کچھ عذر ہوگا نہ میں نقصان رساں ثابت ہوں گا ان کے جسم کے کپڑے وہ ہوں گے جس سے سید کا مرحلہ حل ہو جائے گا وہاں لڑکی کی قسمت چمک رہی تھی علیا مکرمہ کہیں سوار ہو رہی تھیں پوشاک بدل چکی تھیں مرزا دبیر کو پردے کی آڑ میں اس کی کیا خبر تھی خادمہ کو اشارہ کیا وہ چادر لائی اور اپنے تمام کپڑے اتار دئے اور زیور اتار دیا اور آخر میں مرزا صاحب سے معذرت کرتی ہوئی اجازت چاہی کہ کہئے تو ناک میں کیل رہنے دوں یہ سہاگ کی نشانی ہے مرزا صاحب نے دل و جان سے قبول کیا خادمہ جو دست بقچہ لائی تو وہ جوڑا تھا جو جیسے مرد ہے۔ دیکھا تھا قسمت کے قائل ہوگئے یہ خبر بجلی کی طرح شہر میں دوڑ گئی ایک دوسرے رئیس نے دس ہزار روپیہ بھیج کر وہ گہنا پاتا اور پوشاک خریدلی بہت دنوں کے بعد ان رئیس کے روپے کی ضرورت پڑی اور زیر جامہ کا کمر بند ۲۶ ہزار روپے پر رہن ہوا۔

<u>افسر بہو کا چوکھی میں قیام</u> :- محافظ خانہ لکھنؤ میں وارد و صادر کی ایک رپورٹ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصر عالیشان میں افسر بہو صاحبہ زوجہ سرفراز الدولہ ہمشیرہ واجد علی شاہ ٹھہری تھیں وارد نہ لکھتا ہے۔

افسر بہو اور امام باڑہ میں ہمراہ بیگم باقیہ (حضرت محل) چوکی میں رہیں اور داروغہ بیگم مسمات شیریں ان کے ساتھ تھی اور جب بیگم باقیہ شہر سے فرار ہوئیں تو یہ بھی ان کے ساتھ تھیں یہ شنیدہ نہ دیدہ بلکہ مشکل دیدہ ہے کہ اولا بیگم کے ساتھ مینہ بعد ڈپٹی بخش کے گھر میں رہیں اور اس کی ماں نے بہت مدارات کی جب لشکر لاٹ صاحب بہادر کا واسطے قتل باغیوں کے اندر آیا تو افسر بہو ساتھ ڈپٹی بخش کا چھوڑ کر داخل شہر ہوئیں یہ نہیں معلوم کہ کس کے پروانے کے سبب سے یہاں داخل ہوئیں یہ رپورٹ ۲ مئی ۱۸۵۸ء کی ہے۔

نواب والا قدر کو موسیقی میں بھی کمال تھا اور ٹھمری اس خوبی سے کہتے تھے کہ سلطان عالم کے بعد انھیں کے سُر درجہ شہرت کو پہونچے۔ جماعت ایک ... مجرا کرتا تھا معراج پڑھا جاتا اور قرآن شریف کھولنے کو بتایا اور طالب داد خواہ ہوا۔ نواب نے فرمایا غلط بلند اقبال نے دوبارہ ... پھر حضور نے کہا غلط، ہر بار منتے انداز سے واقعہ کی ترجمانی ہوتی تھا اور وہ بلند اقتدار نے پھر غلطی پر ٹوکا اس نے کہا اب حضور سمجھا دیں۔ نواب نے کہا قرآن شریف داہنے ہاتھ سے کھولا جاتا ہے اور داہنے صفحے سے سطروں کی تلاوت کرتے ہوئے فرمائیں جناب پہونچی ہے تم غلطی یہ کرتے ہو کہ بائیں ہاتھ سے کھولتے ہو بلند اقبال قائل ہو گیا۔

تارہ والی کوٹھی

یہ کوٹھی قیصر باغ کے دروازہ شمال و مشرق پر بڑی عالیشان صورت میں موجود ہے اس کو شاہ نصیر الدین حیدر نے اپنے شہرۂ آفاق رصد خانہ کے لئے بنوایا کپتان ہربرٹ سترہ سو روپیے ماہوار پر نوکر ہو کر انجینئری کے فرائض ادا کرتا تھا ہربرٹ کے مرجانے کے بعد کرنل ولکاکس نے یہ خدمت انجام دی اور ساڑھے چار لاکھ روپے میں عمارت بن کر تیار ہوئی شاہ نے پچیدہ پارچہ کا خلعت دیا اس رصد خانہ میں مولوی اسمٰعیل شہید طالب علمی کے زمانے میں داخل ہوئے اور دس سال میں کواکب و سیارگان کا معائنہ کر کے رپورٹ تیار کی اور بادشاہ کی طرف سے سات ہزار روپے مرحمت ہوئے طباعت کے لئے مگر ۱۸۴۷ء میں مولوی صاحب مر گئے اور نئے بادشاہ نے اس اسکیم کو ختم کر دیا اس کوٹھی میں اس وقت اسٹیٹ بنک ہے اونچی اونچی دیواریں، وسیع ہال، خوبصورت اور کشادہ کمرے نئی طرح کی کھڑکیاں بلند سقف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جو آلات ریاضی بادشاہ نے فراہم کئے تھے جس کی بنا پر نام تارہ والی کوٹھی ہوا اب نہیں ہیں وہ دوربین جو تارے دکھاتی تھی تلف ہو چکی۔

اس کوٹھی کو غدر ۱۸۵۷ء کے حملہ اور جنگ آزادی سے گہرا تعلق ہے حضرت بیگم والدہ برجیس قدر بہادر نے جب شاہزادہ کی سلطنت کا اعلان ہونے پر تعلقہ داران اودھ کو طلب کیا تھا تو یہ معزز مہمان اسی کوٹھی میں ٹھہرائے گئے تھے اور اتحاد عمل پر ایک عہد نامہ مرتب ہوا تھا جو بخیال طول نہیں لکھا جاتا۔ اس عہد نامہ[1] پر مقیم الدولہ راجہ نواب علی خاں قیام جنگ راجہ جگت سنگھ چردہ راجہ گورو بخش سنگھ رام نگر، تجمل حسین خاں بھٹوامئو، راجہ عباد علی خاں تعلقہ دار بہرہ ڈپٹی کاظم حسین خاں بھٹوامئو، ماؤ میشر بخش سنگھ ما پور، ٹھاکر گمان سنگھ کی دستخطیں تھیں۔ دوسری نومبر ۱۸۵۷ء کو اس کی تکمیل ہوئی اور بیگم نے کل تعلقہ داروں کو انگریزوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا اور سب کے سب محصورین بیلی گارد سے لڑنے پر تیار ہوئے اور ہر ایک نے مورچے باندھے نبی بخش خاں کا مورچہ آہنی دروازے کے برابر تھا مہینوں شب و روز مورچوں پر سے توپ اور بندوق چلا کی نبی بخش خاں وغیرہ تینوں بھائی کئی مہینے

۱؎ [illegible] ص ۱۲۶   ۲؎ آثار یادگار ص ۱۱

لکھنؤ میں رہے۔

جب داخلہ[1] فوج انگریزی کی دھوم شہر میں ہوئی عالم باغ سے لڑائی شروع ہوئی ۲۶ صفر روز جمعہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء دن کے بجے دن کا وقت تھا کہ بیگم صاحب کے یہاں سے چوبدار تارہ والی کوٹھی میں واسطے طلبی تحمل حسین خاں وغیرہ کے پہونچا۔ یہاں دسترخوان بچھا ہوا تھا سب ہاتھ دھو کے لقمہ اٹھایا چاہتے تھے کہ دوسرا آدمی پہونچا تار سدہ گیا بیگم صاحب کا پیام آیا کہ جب میرے موئے گوروں کے ہاتھ میں ہوں گے تب وہاں سے چلو گے سنتے ہی اس کام کے تینوں بھائی دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے ہتھیار لگا گھوڑوں پر سوار ہو ہمراہیوں میں سے کچھ آدمی فرودگاہ پر چھوڑے کچھ بیلی گارد کے مورچے پر باقی قریب دو سو نفر ساتھ لے کر در دولت پر آئے۔ ممو خاں نے بیگم صاحب کی جانب سے حکم فوج انگریزی سے مقابلے کا دیا اور دس ہزار روپیہ بغرض مصارف جنگ پیش کیا سی بخش خاں وغیرہ نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا اور وہیں سے جانب ناگ ہنڈولا روانہ ہوئے۔

<u>مولوی احمد اللہ شاہ</u>۔ جنگ آزادی کے مجاہدوں میں تارہ والی کوٹھی کے قریب ذکر ہے (۱) مولوی احمد علی چنیا پٹن مدراس کے رہنے والے تھے جن کی عمر ۱۲۰۵ھ کی پیدائش کے حساب سے ستر برس تھی احمد اللہ شاہ لقب تھا مزاج میں صوفیت تھی سلطنت پر غیر مسلم تسلط سے جہاد واجب ہونے کا فتویٰ دیا اور اس دلیری سے کہنے لوگ ان کو دلاور جنگ کہنے لگے فیض آباد، لکھنؤ، شاہجہانپور جب دورہ پر نکلے تو نقارے کی آواز پر لوگ جنگ کے لئے جمع ہوتے تھے تقریر میں غضب کا اثر تھا اپالستان جنگ انہوں نے چپاتی بنایا تھا ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۵ جون ۱۸۵۸ء کو لوایاں ضلع شاہجہانپور[2] میں لڑ کر مر گئے موضع جہاں گنج میں ان کا مرقد ہے۔

(۲) عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ جب ڈنکا شاہ[3] نے لکھنؤ پر دھاوا کیا تو ان کا قیام اسی کوٹھی میں تھا کچھ تعجب نہیں اگر ڈنکا شاہ سے مراد احمد اللہ شاہ ہوں۔

(۳) مبارک شاہ کا بھی تارہ والی کوٹھی کے سامنے ڈیرا تھا اس فقیر کامل کے بارے میں اس زمانے کا یہ نوٹ ملاحظہ ہو۔

بظاہر حرکت اور جبہ نہیں عریانی لباس ہے کسی شخص نے جاڑے کی گرد اول پر نہ پسند کی اپنا لبادہ اوڑھنے کو دیا وہ خادم کے حوالے کیا ہر دم وہاں مجمع ہوتا ہے خلق کی کثرت سے میلہ رہتا ہے مشہور ہے کہ کریم شاہ اسولی بن جو تھے ان کے یہ دیکھنے والے ہیں ان کا یہ قول ہے کہ بعد استرداد سلطنت یہاں سے[4] جاؤں گا بادشاہ کو تخت پر بٹھاؤں گا۔

انگریزی فوجیں جب ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چار باغ پہونچ گئیں یہاں ایک بار پھر ہندوستانیوں نے دشمن کو شہر میں داخل ہونے سے روکا سیکڑوں ہندوستانی سورماؤں کے کام میں آنے کے بعد پل غازی الدین حیدر کی نہر کو عبور کیا اور [illegible] باغ پہونچ کر حضرت گنج اور سکندر باغ ہوتے ہوئے تارہ والی[5] کوٹھی کے سامنے انگریز پہونچ گئے۔

انگریزوں کے تسلط پر غلام رضا خاں شرف الدولہ گیارہ دن تک اسی کوٹھی میں قید رہے اور ان کو لب پھانسی دیے جانے کا یقین تھا مگر کارنگی صاحب کی وجہ سے رہا ہوئے اور یاوری قسمت سے پھر مستاجری اور کارفرمائی پر مصاحب انگلش مستند ہوئے۔

---

[1] آثار یادگار ص ۱۲ و ۱۲۱ — [2] یادو رہات اگست ۱۹۵۷ء — [3] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۴۳

[4] اخبار طلسم ۱۸ دسمبر ۱۸۵۶ء — [5] یادو رہات اگست ۱۹۵۷ء ص ۳۶

چھتر منزل

یہ عمارت نواب غازی الدین حیدر بہادر نے محلات کے لئے تعمیر کی تھی جو دریا کے کنارے ابھی تک اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے اصل عمارت اور اس کے قصر دونوں پر سنہری چھتر نصب ہے اور یہی وجہ اس عمارت کے چھتر منزل نام قرار پانے کی سبب ہوئی بلند منزلیں اور چھوٹی منزل پر اونچی اور وسیع برجیاں ہیں اندرونی کمرے بہت چوڑے چکلے نئے انداز کی ساخت بالاستقبال سے دریا اور شہر کا منظر، اساس عمارت میں تہ خانہ اور سرنگ عمارت کے خاص اجزاء ہیں انگریزوں کے زمانے میں یونائیٹڈ سروس کلب مدت تک رہا۔ سلطان عالم کے کلکتہ جانے کے بعد چھتر منزل میں مقیم شہزادے اور شاہزادیوں کو انگریزوں نے بڑی بے دردی اور بے عزتی کے ساتھ ۲۴ گھنٹے میں تخلیہ کر دینے کا حکم دے کر نکالا گورے زنان خانے میں در آئے ایک ایک کو پکڑ کے باہر کیا سامان سڑک پر پھینک دیا اس ظالم برتاؤ کے بعد گزشتہ دور سے اس وقت تک عمارت مذکور میں مختلف دفاتر اور کلب رہنے کے بعد اس وقت CENTRE DRUG RESEARCH INSTITUTE ہے حکومت کے استعمال میں رہنے سے پبلک کو اس عمارت کی سیر کا موقع نہیں ہے مجھے ایک بار عمارت مذکورہ میں جانے کا موقع ملا اور میں نے وہ نو ایجاد مشینیں فوٹوگرافی کی دیکھیں جو اندھیرے اور بند کروں میں تصویر کھینچنے کے لئے گھڑی دیکھ کر کام میں لائی جاتی ہیں اور برخلاف عمومی کرنے کے تصویر اترنے میں تاخیر نہ کی جاتی ہے۔

موتی محل

یہ عمارت موتی محل اس لئے کہی جاتی ہے کہ یہاں ایک برج تھا جو موتی کی شکل کا تھا غدر میں کھد گیا اس عمارت کو نواب سعادت علی خاں صاحب مرحوم نے بنایا اور شاہ غازی الدین حیدر کی آخری قیامگاہ یہی عمارت تھی آپ اس محلسرا میں اپنی حیات کے آخری لمحات میں رہے دستوں کی شکایت میں آپ کی موت ہوئی خاص محل سے ناموافقت تھی بیگم حالت نازک سنکر مع اپنی خواصیوں کے تشریف لائیں مگر ظل اللہ نے بات نہ کی دوشالہ منہ پر کھینچ لیا ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ ۶۵ برس کی عمر میں جام حیات لبریز ہوا دیوالی کے دن کا یہ حادثہ ہے۔ جنازہ دھوم سے اٹھا افواج اور ارکان سلطنت ساتھ تھے وقت عصر شاہ نجف میں دفن ہوئے ناسخ کے تاثرات وفات شاہ پر ملاحظہ ہوں ؎

از وفات جناب شاہ زمن ۔۔۔ گویا عالمے ہلاک شدہ
دہر گردید بے سر و ماہ و درج ۔۔۔ بہشت آں جناب پاک شدہ
دیدہ ماتمیاں بمغاک ۔۔۔ سینہا آہ دردناک شدہ
رفت داماں صبر از دستم ۔۔۔ جیبِ صبر و شکیب چاک شدہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ موتی محل سے فیض آباد تک سرنگ ہے جس میں روشنی ہوا تمام سہولتیں بہم کی گئی ہیں شیعہ کالج کی تحریک میں پہلا جلسہ موتی محل ہی کی عمارت میں ہوا اور یہ شعر موتی محل کی تاریخی خصوصیت کا مظہر ہے ؎

شیعہ کالج کی ذرا تاریخ پر کیجے نظر ۔۔۔ جلسۂ موتی محل کچھ یاد ہے المختصر

صباحت اگست ۱۹۵۶ء ص ۳

امامباڑہ قدسیہ بیگم :- شاہ نصیر الدین حیدر بہادر کی بیگم نے چھتر منزل کے قریب ایک امامباڑہ بنوایا تھا جو غدر میں انگریزوں کے ہاتھ سے برباد ہو گیا۔

(نوٹ، شاہ منزل اور مبارک منزل موتی محل کے جانب شمال تھی۔

سکندر باغ

سلطان عالم نے ولیعہدی کے زمانے میں سکندر بیگم کے ساتھ عقد کر کے ان کے لئے جو باغ بنوایا تھا اس کا نام سکندر باغ ہے تاریخ نے باغ کی اہمیت اور غدر ۱۸۵۷ء کا مورچہ ہونے سے بار بار اس گارڈن کا نام قلمبند کیا ہے مگر یہ نہیں واضح ہوا کہ اس باغ کی کیا خصوصیت تھی۔

واجد علی شاہ نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد حیثیۃ السلطان مکرمت الزمانی کا خطاب دیا اس محبوب محل کے لئے جو کچھ بھی باغ میں اہتمام رہا ہو وہ تھوڑا ہے باغ پانچ لاکھ روپے کی لاگت کا تھا اور تیاری کا ٹھیکہ غلام رضا خاں اور معتمد علی خاں دیانت الدولہ ثابت علی خاں اور کاشی رام مصور کو دیا۔ باغ کا ایک ایک پہلو ہر شخص نے اپنے اپنے اقدام سے تیار کرایا اس لئے سال بھر میں تیار ہو گیا اس میں ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی جو باغ کے بیچ میں تھی مسجد اور باغ کا عالیشان پھاٹک موجود ہے۔ جس میں نہایت خوبصورت مست بنی ہوئی ہے باغ سے دریا تک ایک نئی سڑک بھی بنوائی گئی تھی جس کی دونوں جانب پھل دار درخت نصب کئے گئے تھے یہ سڑک اتنی چوڑی تھی کہ تین بگھیاں بلا تکلف گذر سکتی تھیں اور پھر بھی سڑک کے دونوں پہلوؤں میں ایک ایک گز جگہ خالی رہتی تھی سکندر بیگم نے دق میں مبتلا ہو کر اس دنیا کو چھوڑا بادشاہ سے ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سکندر محل کی حیات تک تو سکندر باغ ان کے قبضے اور تصرف میں رہا چونکہ ان کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے ان کے مرنے کے بعد باغ پھر ملکیت شاہ ہو گیا اور ضبطی سلطنت کے ساتھ یہ باغ بھی ضبطی میں آ گیا۔ انگریزوں کے آخری دور میں اس باغ میں سرکاری درختوں کا ذخیرہ پودے اور گملے فروخت ہونا شروع ہوئے پرانی عمارت میں صرف مسجد اور پھاٹک رہ گیا ہے اب اس باغ کا نام بوٹانیکل گارڈن رکھا گیا ہے اور لکھنؤ کے ممتاز مقامات میں سمجھا جاتا ہے پکنک کرنے یہاں ہیں۔

قدم رسولؐ :- سکندر باغ کی ایک پرانی یادگار ہے جو عہد غازی الدین حیدر بہادر میں بنائی گئی تھی اور اس کی بنیاد کا سبب یہ تھا کہ ایک عرب سنگپارہ لایا جس پر قدم مبارک حضرت رسولؐ کا نشان تھا بڑی قدر و منزلت سے اس کا ہدیہ قبول ہوا اور ایک بلندی پر شاہ نے خوشنما عمارت بنوا کر زیارت گاہ عام قرار دیا شاہ موصوف کا زمانہ ۱۸۳۶ء تک رہا عمارت مذکورہ اس سے پہلے کی بنیاد ہے اور اس قدر مضبوط ہے کہ گولیوں کی بارش ہونے پر بھی منہدم نہ ہو سکی غدر کے ہنگامے میں قدم رسولؐ کا سنگ محترم تو باقی نہ رہا مگر عمارت اب تک گولہ باری کا پتہ دے رہی ہے آزادی کے حامی اور دیسی فوجوں نے اس عمارت کو بارود کا گودام بنا رکھا تھا حامیان وطن بیلی گارد کی مسجدوں میں جمع ہو کر بیلی گارد کو نقصان پہونچاتے تھے یہ راز تھا کہ انگریز انجینیروں نے ایسی تمام مسجدوں کو ٹھنڈا کر دیا حالانکہ سر ہنری کی رائے تھی کہ مسجد کو باقی رکھنا چاہیئے اس لئے کہ ان کو یقین تھا کہ ان کی بارود کا راز افشا نہ ہو گا ۱۲ اگست کے حملے میں جب جنرل ہولاک نے حسام الدولہ اور ماچھی بھون سے گذر کر

۱؎ بیگمات اودھ ۲؎ بیگمات اودھ ص ۲۵۵

انگریزوں نے چھتر منزل کے بعد موتی محل پر قبضہ کیا تارہ والی کوٹھی چھتر منزل قبضے میں آئی اور محصورین قلعے سے نکلے اس وقت انہوں نے سکھوں کا پڑاؤ تھا اور قریب سو آدمیوں کے کھانا پکا رہے تھے اچانک لشکر آگیا اور وہ تلوار اور سنگینوں سے لڑے اور کوئی دقیقہ شجاعت کا اٹھا نہ رکھا کمک پہونچنے پر دوبارہ ۲۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو گھمسان کی لڑائی یہاں ہوئی۔ یہاں باغ خون سے رنگین اور لالہ زار ہوا انگریز اپنی اکثریت سے کامیاب ہوئے اور بیلی گارد کی طرف پلٹے۔ قدم رسولؐ کے ٹیلہ پر سپاہیوں نے بے جگری اور دلیری سے مقابلہ کیا مگر آخر میں پسپا ہوئے اور سکندر باغ پنجاب کی پیدل فوج کے قبضے میں آگیا۔

محمد حلیم شرر نے عمارت کو ولایتی باغ کا جزو قرار دیا ہے قدم رسولؐ کا اس علم ارون عہد میں جو ارباب دانش سے چھلک رہا تھا نصب ہونا علمائے فریقین کے ایمان غیرت تھا اور یہی مقبولیت کا راز تھا مگر ۱۸۵۷ء کی لوٹ میں یہ مقدس یادگار غائب ہوئی۔

حیدر آباد

اس محلہ کو غازی الدین حیدر بہادر نے آباد کیا اور تاجپوشی کے سلسلے میں بسایا گیا مانسے ممدوح کی تاریخ تاجپوشی ع "شاہ اسکندر وزیر ارسطا طالیس" کہی ہے کچھ تعجب نہیں اگر

ولایتی باغ:۔ بھی اسی علاقے میں ہو جہاں سب ولایتی پھول اور پودے تھے جو شو عموماً ہندوستان کی قسمت میں نہ تھی اور قسام ازل نے غیر ملکی پودوں کو صرف خوبصورتی اور خوشنمائی عطا کی شمیم سے وہ محروم رہے بیرونی چیزیں عموماً وقیع نظروں سے دیکھی جاتی ہیں اس لئے ولایتی پودوں کی وقعت تھی۔

محلسرا ممتاز محل:۔ شاہ موصوف کی بیگم ممتاز محل کی محلسرا بھی حیدر آباد میں تھی جو دریا اور نجف کے بیچ میں تھی ۱۹۱۳ء میں جب بٹلر روڈ دریا کے کنارے نکالا گیا تو یہ قصر کھد گیا اور ایک دیوار کنارہ دریا ۱۹۴۲ء تک باقی رہی

روضہ حضرت قاسم:۔ شیخ تصدق حسین اپنے مقالات میں لکھتے ہیں کہ بارہ بنکی روڈ پر جس عمارت کو عہد غازی الدین حیدر بہادر کی جنت البقیع ظاہر کیا ہے اور پولیس اسپتال اس کے سامنے ہے یہ جنت البقیع نہیں ہے اس درگاہ کی چھت تو بالکل گر گئی ہے۔ اور پچھم کی دیوار کا کچھ حصہ بھی نہیں رہا خودرو درخت اُگ آئے ہیں سرخ پلاسٹر باقی ہے جو شاید لال درگاہ نام ہونے کا سبب قرار پایا۔

اس عمارت کا جنت البقیع ہونا صحیح نہیں ہے اور یہ روضہ حضرت قاسمؑ ہے جن کی مہندی ایام عزا میں اٹھتی ہے۔

لال درگاہ:۔ روضے کے روبرو دھیوں سے پٹا ہوا سائبان تھا جس کے نشان دیوار میں اب تک ہیں اندر جانے کے لئے چھوٹا دروازہ ہے جو تار سے بندھا ہوا ہے اور ایک چھوٹا چبوترہ اندرون حجرہ ہے جس کے گرد جالیاں لگی ہیں اور نشان مزار ہے۔ دروازوں کی جوڑیاں نکال لی گئی ہیں اور در بند ہیں اوپر گول گنبد ہے جس کی حالت ابھی تک خراب نہیں ہے پولیس اسپتال نے دیا سے گاہ کے حصے کو چھوڑ کر دو ہیں اپنے کوارٹر بنلئے ہیں اور یہ دونوں مقام ایک ملد زمین پر ہیں آج سے پہلے رقبہ وسیع ہوگا ایک واقف کار نے بتایا ہے کہ کنواں جو تخمیناً ۲۰ گز کے فاصلے پر ہے عمارت کا جز تھا۔ ۴۰ سال پہلے اس پر قابض جھنڈے شاہ تھے وہ دورے تو حسینی شاہ قائم مقام ہوئے اور آخر میں گھور دسپاہی جو بارہ بنکی کا رہنے والا تھا اس نے اس زمین پر مکان بنا لیا تھا

اندر تعزیہ درگاہ میں رکھتا تھا اس کی طرف سے چہلم میں مجلسیں بھی ہوتی تھیں اور ۸ ربیع الاول کو تعزیہ اٹھتا تھا گذشتہ اب بھی ہوتی ہے جس میں کبھی اس طرف کے تعزیے دفن ہوتے تھے۔ کربلا کی تنائی دیوار کے گرد چاروں طرف بنے ہیں اندر شمالی رخ کچھ مسلمانوں کے ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ درگاہ منشی اسیر مرحوم کی تیار کردہ ہے۔

شاہ نجف

رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر بہادر شہامت جنگ نے ۱۲۳۲ھ موتی محل سے کچھ فاصلے پر سکندر باغ کی بغل میں شبیہ روضہ حضرت امیرالمومنین بنوائی عہد نامہ صفحہ ۱۶۳ میں امامباڑہ جدید یعنی نجف اشرف کی لفظ سے یاد کیا ہے داخلہ ایک عظیم الشان پھاٹک سے ہوتا ہے جس پر پورے قد کے دو شیر بنے ہوئے ہیں پختہ راستہ طے کرکے دوسرا پھاٹک ہے پہلوؤں میں سبزہ زار ہے دوسرے پھاٹک میں داخل ہونے سے روضہ کی پشت جانب جنوب ملتی ہے اس دروازے میں اوقات دریافت کرنے کا گھنٹہ ہے جو پابندار آواز سے دن رات وقت بتاتا ہے روضہ کے چاروں طرف غلام گردش ہے اور اوپر کے حصے میں بڑے قد کا خوبصورت گنبد ہے جس پر سنہری کلس لگا ہے امامباڑہ میں داخلہ شمالی جانب سے ہوتا ہے جس کے برساتی سے ایک پختہ راستہ سامنے کی طرف چلا گیا ہے آخر میں پھر ایک پھاٹک ہے پھاٹک کے باہری جانب چند ہی قدم پر دریائے گومتی لہریں لے رہا ہے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے جس میں سفید و سیاہ چوکوں سے شطرنجی بنائی گئی ہے۔ دیواروں پر نسخ و نستعلیق کے بخط عرب و عجم طغرے کتبے قطعات فریم میں آویزاں ہیں جس سے فن خطاطی کی قدیم شان یادرستی ہے داخلے کے دروازوں میں صوبہ برما کی بنی ہوئی خوشنما نقشی جوڑیاں ہیں جن کے نعل پاکھوں میں بانی امامباڑہ اور نواب سرمحسن الدولہ اور نواب ممتاز الدولہ کی تصویریں فریم میں آویزاں ہیں عمارت کا سنگ بنیاد اس قطعہ سے واضح ہو رہا ہے ؎

ماحسن عقیدت نجف اشرف را   فرمود ساہند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از عقل   ہاتف گفت عجب نجف شد تعمیر

۔ دیواریں بکثرت خوشنما شیشہ آلات اور آئینوں سے مزین ہیں اور ہر قسم کے سو سو بتی والے عالیشان جھاڑوں کے درمیان زرد و نیلی و سبز رنگ کی ہانڈیاں روشنی کی تڑپ کو حد اعتدال پر قائم رکھتی ہیں امامباڑے میں داخل ہوتے ہی بادشاہ کا مرقد سامنے نظر آتا ہے جس پر چاندی کا کٹہرہ لگا ہے داہنی جانب مبارک محل کی آخری آرامگاہ ہے جس پر کٹہرا جنگی ہے اور تمام قبروں سے اس کا ساز و سامان زیادہ ہے بادشاہ کی قبر کے بائیں جانب نواب ممتاز محل بادشاہ کی دوسری نومسلم بیگم کی قبر ہے اس پر چاندی کا حظیرہ ہے اور بائیں جانب کے گوشے میں بادشاہ کی تیسری ملکہ سرفراز محل کا مدفن ہے جس پر لکڑی کا کٹہرہ ہے مبارک محل کے باپ یوروپین اور ماں انڈین تھیں۔

بادشاہ کا ایک کروڑ روپیہ جس میں سے گیارہ سو ستائیس روپیہ دس آنہ آٹھ پائی ماہوار خرچ کے لئے جمع ہے مبارک محل کا قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

افسوس مبارک محل این مریم عصر   رو کرد سوئے گلشن رضوان اے ہائے
تاریخ وفات خامہ رشک نوشت   ہشتم بود ماہ شعبان اے ہائے

[illegible] بعہد جان عالم موصوف نے موت کی چاشنی چکھی شاہ کی قبر پر یہ تاریخ ہے ؎

چوں رفت شہ زمن ز دنیا ماتم دل خاص و عام گرفت
از روئے بکا و آہ گفتم حیدر بہ نجف مقام بگرفت ۱۲۴۳ھ

۱۸۵۷ء کے بلوہ عظیم میں سپاہ وطنی نے سکندر باغ اور شاہ نجف میں بھی مورچہ لگایا اور ۱۷ نومبر کو انگریزی فوج زیر کمان SIR COLIN COMPBILL محصورین بیلی گارد کی کمک کے لئے شاہ نجف سے گذری دونوں مقاموں پر گھمسان کی لڑائی ہوئی اس ہنگامے میں شاہ نجف کا بہت سا سامان تہس نہس ہو گیا اور طلائی کا ولایتی تعزیہ ٹھنڈا ہو گیا۔

شاہ نجف میں چند تبرکات قابل تذکرہ ہیں (۱) چندن کی کل منقل مرثیے (۲) آئینہ جس میں آدمی منہ دیکھے پر سر کٹا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کو کیوں ایسا کیوں کیا گیا ہے کوئی بتانے والا نہیں ہے (۳) بھدی صورت والا دوسرا آئینہ آتشی شیشے کا اس میں نظر تو آتا ہے مگر بھیانک صورت سے مشہور ہے کہ بیمار کو اس آئینہ میں منہ دیکھنے سے صحت ہوتی ہے۔

غازی الدین حیدرؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حضرات کا نام دہی اور بالائی کا نام ملائی رکھا ست دیگ نان آفتاب اور نان کلاں جس کا وزن دو من ہوتا تھا میوہ اور قند سے تیار کی جاتی تھی ان کی ایجاد تھی۔

بنارسی باغ

اس نام کا تاریخ اودھ میں کہیں ذکر نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے دور حکومت میں یہ نام قرار پایا پہلے اس جگہ کا نام حضرت باغ تھا۔

نگینہ والی بارہ دری :- اس وقت بنارسی باغ کا خوبصورت ترین حصہ ہے اور سنگ مرمر کی جو ایک دالان کی مختصر عمارت ہے اس میں نگینہ جڑے ہونے کے اب بھی نشانات ہیں یہ جواہر پارہ غدر میں بلوہ کرنے والوں نے لوٹے اور دیوار و در کو چیچک رو آدمی کی طرح داغدار بنا دیا اس باغ کا سال تعمیر اس قطعہ تاریخ سے واضح ہوتا ہے ؎

زہے قصر مرصع شد بحضرت باغ تعمیر اساس آں می نماید ناز بر خلد بریں ہند
پے سالش چو جستم کلک شمشیار ایں رقم کرد تہ از بارہ دری ساکنیں دیر نگین ہند ۱۲۲۹ھ

نجم الغنی نے اس عمارت کو قیصر باغ کی عمارتوں میں شمار کیا ہے مگر ہم نے اصل الفاظ تاریخ سے تمسک کرکے حضرت باغ کی عمارت تسلیم کیا ہے حضرت گنج کے باغ کا حصہ حضرت باغ تھا۔ اوپر کے بیانات میں گذرا کہ غلام رضا خاں شرف الدولہ کو فوج انگریزی میں رسد پہونچانے کا عہدہ ملا تھا چنانچہ دس ہزار روپے کا غلہ نگینہ والی بارہ دری کے پیچھے بھروا دیا تھا وہ کسی کو کھانا نصیب نہ ہوا بعد فتح اسے گوروں اور سکھوں نے نوش جان کیا۔

مسجد نور محل :- شاہ نصیر الدین حیدر مرحوم کی ایک بیگم کا نام نور محل تھا شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں کہ ان کی عالیشان مسجد بنارسی باغ میں جانب شمال واقع ہے۔

شیر دروازہ

قیصر باغ کے قریب وہ دیوار ہے جس کے دروازے پر دو شیر آمنے سامنے بیٹھے ہیں اس کے قریب ٹیلیفون ایکسچینج آفس [illegible] تاریخ میں صراحت نہیں ہے کہ بنوانے والا کون ہے؟ لیکن اوسطے روح شیروں پر وہی ہیبت ہے جو ایک شاہی [illegible] پر ہونی چاہیے دروازے کے سامنے قیصر باغ کا سارا گرد و پیش اس وقت کوئی عمارت نہیں ہے۔

درگاہ دوازدہ امام :- نصیرالدین حیدر نے شیر دروازے اور فرح بخش کے قریب یہ عمارت بنوائی تھی جس میں بارہ [illegible] کمرے تھے کمروں میں زربفت کے پُر تکلف شامیانے آبدار موتیوں کی جھالریں لگی ہوئی جو میں گنگا جمنی نصب تھے زمین پر رکھے ہوئے خوشنما جھاڑ جس میں ہم شمعیں روشن ہوتی تھیں قیمتی اور قد آدم آئینے ہر کمرے میں نصب تھے اور طلائی و نقرئی فرنیچر عمارت مذکورہ کی تاریخی یادگار ہیں ہر امام کی تاریخ ولادت و وفات کے موقع پر اسی کمرے میں محفل و مجلس ہوتی تھی جو اس امام سے منسوب تھا فسانۂ عجائب نے اس درگاہ کے بارے میں لکھا ہے۔

" دوازدہ امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ گردوں کو خواب میں نظر آئی روز تولد ہر امام و وفات جگر بندان خیرالانام لاکھ روپے کا صرف تھا"[1]

ان بابرکت مقامات پر پھولوں کی بارگاہ بھی تیار کی جاتی شاہی باغوں کے پھولوں کے علاوہ پانچ ہزار روپے روز کے پھول عشرہ محرم تک بازار سے مول آتے اس زمانے میں خوشبودار پھول دولت مندوں کو بڑی مشکل سے ملتے بارگاہ کا طول اندازاً سو قدم اور عرض ۱۵/۲۰ قدم سے زیادہ ہوتا تھا اور کبھی پھولوں کے بجائے سنہری اور روپہلی مقیشی اور بادلے اور ستاروں کی جھالر لگائی جاتی تھی عطریات سے بھی وہ مکان بسایا جاتا تھا۔ ہر امام کی تاریخ ولادت میں چھ دن تک اور تاریخ وفات میں کئی روز تک اور سیدالشہدا کی شہادت کے زمانے میں چہلم تک بادشاہ نفس نفیس وہاں کی خدمت بصدق دل انجام دیتے تھے اماموں کی پیدائش کی تاریخوں میں پُر تکلف اور لذیذ کھانے، مٹھائیاں اور میوے تقسیم ہوتے تھے اور نفیس کپڑوں کے جوڑے وابستگان دولت کو پہنائے جاتے تھے وفات اور شہادت کے دنوں میں مرثیہ خوانی ہوتی تھی شربت اور مٹھائی بٹتی تھی۔

تاریخ عباس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عمارت کی بانی بادشاہ بیگم زوجہ غازی الدین حیدر بہادر تھیں۔ لیکن پہلا بیان صحیح ہے۔

مسجد مکہ مسجد مدینہ :- یہ دو مقدس عمارتیں حرم خدا اور حرم رسولؐ کی شبیہ تھی اسی علاقے اور درگاہ دوازدہ امام کا [illegible] حقیقی مفتی صاحب کے پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مؤلف لکھتا ہے۔ نماز ظہر کی جماعت میں شرکت کے بعد آپ وزارت کی کچہری کا عزم کرتے تھے کہار پہلے سے فینس لگائے رہتے تھے وہ خاص سردار دست بقبضہ شمشیر دونوں جانب فینس کے ہوتے تھے کسی مقدمے یا سرکاری میں اگر طول ہو گیا اور وزیر اعظم جلوہ افروز وزارت رہے تو خیر ورنہ مسجد مکہ مسجد مدینہ متعلقہ درگاہ بارہ امام میں نماز پڑھنے کے مکان آتے تھے اور سر شام غروب کی توپ سر ہوتی تھی ادھر نقار خانہ شاہی میں نوبت [illegible]

۱؎ مقالہ کاظم حسین [illegible] مندرجہ [illegible] اپریل ۱۹۶۲ء   ۲؎ تجلیات باب دوم ص۳۱

... بھی باقی ہے وہ زمانہ ہے وہ لوگ ؎

پردہ داری میکند بر طاق کسریٰ عنکبوت　　　چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

فرح بخش:- یہ کوٹھی عہدِ آصفی کی تعمیر ہے اپنی خوبصورتی اور شان و شوکت کے لحاظ سے ممتاز عمارت تھی پانی کی چادر تہ خانے میں پہونچائی گئی تھی۔ نواب نے جب اپنے بالک وزیر علی خاں کی شادی رچائی تو اسی عمارت کے سامنے دو بیچے شمرنگ اور زعفرانک نصب کئے گئے تھے اور پانچ سو چھکڑے چاندی کے اس تقسیم میں رکھے گئے تھے شیخ ممتاز حسین جونپوری لکھتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں جلوس کے دن کوٹھی فرح بخش سے فرش زمین پر بیٹھ کر دور ہی سے امام باڑہ آصفی کے جلوس ضریح کی زیارت کرتے نظر آتے تھے پیادہ ہو کر جاتی تھی اور روتے جاتے تھے"۔ یہ تذکرہ افسانہ ہے۔ فرح بخش غیر دروازے سے امام باڑہ آصفی کا جلوس دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے نواب سعادت علی خاں نے اس کوٹھی کے چار چاند لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ تاریخ کی چند لفظیں ملاحظہ ہوں۔

عمارتیکہ جد کلان عالی گرد کوٹھی مذکور تعمیر فرمودہ اند نگارستان مانی است و کوٹھی ہم بر صورت اول نماندہ است اگرچہ پیشتر ہم خوب بود لکن حالات خوب تر شد۔[1]

یمین الدولہ نے فرح بخش کے گرد جو عمارت بنوائی ہے وہ ایک مارع ہے قلم کار اور نقش و نگار کی مدح نہیں ہو سکتی کوٹھی اگلی شکل پر نہیں باقی رہی اگر پہلے کوٹھی بہترین تھی تو ابھی سے اچھی ہے۔

پنجشنبہ ۱۰ جمادی الاول ۱۲۲۳ھ نواب سعادت علی خاں کی سالگرہ کا جشن فرح بخش میں منایا گیا۔ جناب عالی نے حاضرین کی جانفشانی سے ماہانات کی شاعروں نے تہنیت کے قطعے اور قصیدے پڑھے انشاء نے وہ قطعہ پیش کیا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

جب تک عقد ثریا رہے انشاء اللہ　　　یوں ہی پڑتی رہے یہ تا صدوسی سالگرہ

عہد نصیر الدین حیدر میں شاہی محلات چھتر منزل میں اور آپ خود فرح بخش میں تشریف رکھتے تھے شاہ جب کوٹھی دولت خانہ سے سرطان میں مبتلا ہو کے یہاں آئے تو صحتیاب ہوئے اور موذی مرض سے نجات حاصل کرنے پر اس کوٹھی کا نام فرح بخش ہوا۔

جنرل[2] مارٹن کی موت ۱۳ ستمبر ۱۸۰۰ء کو اسی کوٹھی میں ہوئی۔

مکتبہ سلطانی:- غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے فرح بخش میں کتب خانہ LIBRARY شاہی تھا کتب خانہ پر صلاح الدین عثمانی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:-

اودھ کا شاہی کتب خانہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا جس میں دو لاکھ سے زائد کتابیں تھیں زیادہ تر مخطوطات تھے قلمی نسخے ایشیا کے ہر گوشے سے خرید کر جمع کئے گئے تھے اور دو سو آدمی نگہداشت کے لئے نوکر تھے جس پر شاہ کو فخر تھا انگریز کارندوں کے ہاتھوں یہ اہل ذخیرہ الماریوں سے نکال کر سڑک پر پھینک دیا گیا اور اسی کے ساتھ مشرقی دستکاری مصوری اور خطاطی کے وہ نادر نمونے بھی تھے جن کا ثانی ملک میں[4] نہ تھا۔

کتب خانہ شاہی کی ایک کتاب زاد المعاد دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا اس کتاب پر سیاہی اور شنگرف کی دو مہریں بعض عبارت

---

[1] ... ۱۸۵۷ء ص ۲　[2] عمادالسعادت فارسی ص ۱۰　[3] تقریر ... ص ۱۰　[4] نیا دور بابتہ اگست ۱۹۸۰ء

[illegible] گا۔

خاتم ساجد کل سلطان عالم برکتاب
۱۲۶۳
ثابت و پر نور باد تا فروغ آفتاب

ایں نسخہ رعنایت سلطان عالم
۱۲۶۳
ثابت و تابندہ بر جلد عالم

آصف الدولہ کے دور میں راجہ جھاؤ لال بھی اس کتب خانہ کے داروغہ قرار پا چکے تھے جو اگرچہ ابتدائی فارسی کتابیں ختم ہو کر عربی یا درسیات کی تحصیل میں بھی قدم رکھا تھا اور لائبریری کی خدمات میں اس کا تقرر نامعلوم نہ تھا۔ پہلی مہر کی عبارت یہ ہے " خاتم ساجد کل سلطان عالم برکتاب ثابت و پر نور باد تا فروغ آفتاب " دوسری مہر میں یہ کندہ تھا " ایں نسخہ رعنایت سلطان عالم ثابت و تابندہ بر جلد عالم " مجھے خیال ہوتا ہے کہ عالم کی جگہ آدم ہو مہر اچھی طرح نہیں اُبھری ہے۔

<u>قرآن شریف</u> :۔ یہ مصحف پاک ایک ریاست میں یو۔پی کی اس وقت موجود ہے اور اس کی دستیابی اس طرح ہوئی کہ جب تعمیر باغ لال تو کلام اللہ اس خدمتگار کے ہاتھ آیا جو اسی تعلقہ کا باشندہ تھا اس نے قرآن شریف تعلقہ دار صاحب کو دیا پہلی جلد میں پندرہ پارے تھے جلد اوّل ہاتھ آنے کے بعد بہت عرصہ گذر کر دوسری جلد بھی اسی علاقے میں ہدیہ ہونے لائی گئی اور اس طرح پورا قرآن ایک مرکز سے جدا ہو کر دوسرے قدرداں کے پاس پہونچا یہ قرآن بحفاظت موجود ہے اور پہلی جلد بہتر حالت میں ہے ۔ دوسری جلد اوراق کے پراگندہ ہونے سے اچھی حالت میں نہیں سائز اس قرآن کا ۲ انچ طول ۱۱ انچ عرض، کاغذ دبیز حروف خوشخط اور ہر صفحہ میں چوکیاں بنا کر کتابت شطرنجی کی صورت میں کی گئی ہے حاشئے پر تفسیر حسینی زبان فارسی باڈر میں ہر طرف سونا چڑھایا۔ رکوع پر تاج اور بیل بوٹے انتہائی دیدہ زیب اور حسین زرد سرخ نیلا رنگ جہاں جہاں دیا گیا ہے نیلم اور یاقوت زرد محلول روشنائی میں صرف ہوا ہے ہر سطر میں چار چوکیاں ہیں۔

داروغہ کتب نے مختلف اوقات میں فہرست سے مطابق کرتے وقت جو یادداشت سپرد قلم کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت داروغہ کا نام فضل الٰہی تھا اس طرح کی کئی تحریریں سرخ رنگ کی روشنائی سے ثبت ہیں۔

(۱) باہتمام فضل الٰہی ۷ ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ بجائزہ رسید (۲) ۲۹ ربیع الاول ۱۲۶۰ھ بجائزہ رسید [illegible] برس کے بعد ہوا (۳) بتاریخ شہر صفر یوم پنجشنبہ ۱۲۶۲ھ بجائزہ رسید۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔



جلد ایرانی وضع کی گلکاری میں اعلیٰ نمونہ اور سرورق کی لوح دیکھنے کے قابل ہے صفحہ اوّل پر قرآن [illegible] سرکاری نشانات اور علامات پانی سے مٹا دئیے [illegible] جس سے ایک سیاہ داغ بنا ہوا ہے اس قرآن کے خصوصیات میں اس سے زیادہ نقل کرتا مگر قدرداں مالک کی طرف سے بہت تھوڑی دیر کے لئے میرے دیکھنے کے واسطے قرآن مذکور لایا گیا اور واپس ہو گیا۔ کتب خانے کے ذمہ دار نگراں ۱۲۲۱ھ میں [illegible] خاں اور ۱۲۲۷ھ میں مصطفےٰ خاں تھے۔

---

[1] [illegible] حصہ سوم صفحہ [illegible]   [2] میاں دور میں ۱۲۶۹ھ

سنگی محل

عہد نوابی کی عمارت جس میں پتھر زیادہ صرف ہوا اس قصر کا تذکرہ ۱۱۹۶ھ کے واقعات میں ہے کہ جب امیر الدولہ کی بیگمات نے ... سعادت ... نے تنخواہ کی تقسیم کے سلسلے میں جھگڑا کیا اور پنج محلہ پر یورش کا ارادہ ہوا تو نواب سعادت علی خاں بہادر نے ... اپنی فوج کو مسلح ہونے کا حکم دیا اور خود بھی مسلح ہو گئے ایک توپ توپخانے کی سمت اور دوسری سنگی محل کے دروازے سے ... قیصری جس باغ میں ... پل بجھتہ کے مقام پر نصب کردی گئی۔ مورخ لکھتے ہیں "آں روز جناب عالی خود بنفس نفیس شمشیر حمائل ... سپر بکتف فرمودہ بود ... بگردشت" اس دن نواب نے بھی تلوار لگائی اور سپرلے کر تیار ہو گئے تھے مگر معاملات خوبی سے سلجھ گئے۔

ٹیڑھی کوٹھی

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں بہادر نے ریذیڈنٹ کے لئے تعمیر کرائی تھی اور اس کوٹھی میں نواب پرنس جہاں[1] بخش کے ٹھہرنے کا بھی تاریخ میں پتہ ہے (محل اختلاف الاقوال) اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کوٹھی میں امور مملکت[2] پر غور ہوتا تھا۔

کنکر والی کوٹھی : ... کوئی خصوصیت اس عمارت کی معلوم نہ ہو سکی۔

مقبرہ سعادت علی خاں بہادر

یہ عالیشان[3] اور پُرشکوہ مقبرہ قیصر باغ کے جانب جنوب واقع ہے۔ نواب سعادت علی خاں نواب شجاع الدولہ کے فرزند اور نواب آصف الدولہ کے ... بھائی تھے جو نواب و... علی خاں نے پالک آصف الدولہ کی معزولی کے بعد شروع جنوری ۱۷۹۸ء میں مسند ریاست پر جلوہ گر ہوئے اور سولہ برس تک نہایت تدبیر دانشمندی اور تدبر سے حکومت کی اور ایسی سیاسی چالوں اور ... سے مسٹر بیلی (BAILLIE) ریذیڈنٹ اودھ کے ... میں تیر دیدئے جس سے وہ تلملا اٹھے آخر کار صاحب سلامت میں بھی فرق آگیا مگر ... جولائی ۱۸۱۴ء کو ان کے بدخواہوں نے یخنی میں زہر دے کر ان کے رشتۂ حیات کو منقطع کردیا بوقت رحلت ان کے بڑے بیٹے ... غازی الدین حیدر خاص بازار سے متصل ایک بنگلے میں مقیم تھے جس کے چاروں طرف وسیع احاطہ تھا نواب کے بعد غازی الدین حیدر ان کے جانشین ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ چونکہ اب میں مسند اور محل پر قابض ہوا ہوں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قیامگاہ ان کے حوالے کر دوں۔ اس خیال کے تابع حکم دے دیا کہ میرا بنگلہ منہدم کرکے اسی مقام پر نواب مرحوم کو سپرد خاک کر دیا جائے چنانچہ بنگلے کو توڑا ہی کھود کر اس کی آرامی پر نواب مرحوم کو آغوش لحد میں سلا دیا گیا اس کے بعد مدفن پر کئی لاکھ روپیہ کے صرف سے ایک عظیم الشان اور خوشنما مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا جس کے بالائی حصے کی ایک شاندار طلائی کلس بھی نصب کر دیا گیا۔ مقبرے کے اندر اور باہر مناسب مقاموں پر قابل دید مہت کاری ہے فرش سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کے چوکوں سے شطرنجی وضع کا بنایا گیا ہے مقبرے کی بیرونی جانب مبتی کام کو سفیدی سے اور باقی ماندہ حصوں کو چھوئی مٹی کے ہلکے رنگ سے پوتا گیا ہے۔

محراب کی قبر تہ خانے میں خام ہے جس کے دونوں جانب ان کے دو بھائیوں، تین بیبیوں اور تین بیٹوں کی قبریں بھی ہیں۔

---

[1] عماد السعادت ص ۳۲۔ [2] تاریخ اودھ مولانا نجم الغنی ص ۱۷۲ ج ۳ [3] تاریخ اودھ ج ۴ ص ۸۹

[4] مقالہ شیخ تصدق حسین مدیر یادگار لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۱۸

اطلاع میں مقبرے کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں اور اس کی جنوبی دیوار قیصر باغ کی شمالی دیوار سے بالکل متصل تھی مقبرے میں داخلہ کے لئے ایک عالیشان پھاٹک بھی جانب مغرب تعمیر کیا گیا تھا جو تا حال بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہے یہ خود تعمیر بھی مقبرے سے بالکل ملا ہوا ہے یہ پھاٹک اتنا بلند ہے کہ عماری دار ہاتھی بھی اس کے نیچے سے با سانی گذر سکتا ہے پھاٹک مدحکار بطرز قوسین تھی جیسے لکھنؤ کے کونسل چیمبر کی بہت عرصہ بعد ۱۹۲۳ء میں تعمیر کی گئی پھاٹک کے شمالی بازو کی عمارت منہدم کر کے ایک مکان میں شامل کر لی گئی ہے لیکن جنوبی سمت کی کل عمارت مع برجی اب تک موجود ہے جس سے شمالی جانب کی کل عمارت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے مقبرے کے چاروں طرف غلام گردش بھی تھی جس میں حضرت امجد علی شاہ پسر حضرت محمد علی شاہ نے اپنے زمانہ شہریاری میں جس کا سلسلہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک رہا امامیہ فرقہ کے طلبا کے لئے ایک تعلیم گاہ بنام مدرسہ سلطانیہ قائم کی تھی جو مقبرے کی غلام گردش میں تھا مدرسے کے متعلق سید محمد کاظم طالب مدرسہ مذکور اپنی خود نوشت سوانح عمری ——

——میں لکھتے ہیں (ترجمہ ملاحظہ ہو) جناب قبلہ و کعبہ کے زیر اہتمام مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد پڑی جو جنت آرام گاہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے میں قائم ہوا تھا اس مقبرے کی عمارت نہایت دسیع ہے جس کے چاروں طرف دالان اور حجرے بنے ہیں مدرسے میں تقریباً ۳۰ مدرس تھے ان میں سے بعض مثل مولوی میر احمد علی و مفتی سید محمد عباس و شیخ اظہر علی و مولوی میر محمد علی صاحب و مولوی سید حامد حسین صاحبان بہت سربرآوردہ اور عالم متبحر تھے یہ کل حضرات معقول و منقول کے بحر اور اصول و فروع پر حاوی تھے مگر دوسرے معلم ان کے مرتبہ کمال کو نہ پہونچتے تھے لیکن قبلہ و کعبہ کی عنایت و نوازش سے عہدہ مدرسی پر فائز ہو گئے تھے انھیں صف اوّل کے مدرسین کی تنخواہ ایک سو یا ستر روپے ماہوار ملتی تھی مگر دوسرے درجے کے معلموں کو صرف تیس یا چالیس یا بیس روپے ماہوار ملتے تھے لیکن تنخواہ ماہ بماہ فوراً وصول ہو جاتی تھی۔ مدرسے کے طالب علموں کو بھی وظیفے عطا ہوتے تھے نیچے درجے والوں کو چار روپے، درمیانی درجے والوں کو چھ روپے اور بڑے درجے والوں کو نو روپے ماہوار ملتے تھے مدرسے کے کل افراد پر جہاں پناہ کی ہمیشہ نظر لطف و کرم رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہوادار میں سوار ہو کر خود بھی مدرسے تشریف لاتے اور ہر طرف گھوم پھر کر معائنہ کرتے سیکڑوں خوان طرح طرح کے کھانوں، مٹھائیوں اور میووں کے جو امرا اور سرمایہ دار اپنے یہاں کی تقریبوں کے موقع پر بادشاہ کے لئے بھیجتے تھے ان کے لئے حکم دیدیا تھا کہ اہل مدرسہ کو تقسیم کر دی جایا کریں اس دور میں ہر شخص کو درس و تدریس اور تحصیل علم کا بے حد شوق تھا چنانچہ مدرسے میں بہت سے طالب علم ایسے بھی تھے جن کو کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا تھا مدرسے کے افتتاح کی تاریخ نجم الغنی نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۹ھ تحریر کی ہے اور بتایا ہے کہ مجتہد العصر والزماں اور ان کے بھائی کی تحریک پر نواب امداد حسین خاں نے ہاتھ بٹایا۔ افتتاح کے دن قصیدہ خوانی ہوئی اس دینی درسگاہ کی تاریخ یہ ہے ؎

بیت معمور ہدیٰ مدرسہ سلطانی نزہہ کاربلا مدرسہ خاقانی
۱۲۵۹ ۱۲۵۹

مدرسے میں تعلیم[1] کے فرائض اور بورڈنگ کی نگرانی جس میں دس حجرے تھے مفتی میر عباس صاحب کے سپرد تھی چنانچہ وہ فرماتے ہیں

ومبدم قافلہ تازہ دریں کہنہ سراست از ثریٰ تا بہ ثریا ہمگی ملک خداست
زیر نہ پنجرہ چرخ دریں جا دو سہ روز تا بہ حجرہ دیک خانہ تعلق ما است

[1] تجلیات ۱۸۸۱ء

[illegible] کے نام یہ تھے سید علی اکبر، میر علی نقی، میر محمد، میر باقر، محمد حسین، میر حسین اصغر، میر باقر شاہ۔ [illegible]
[illegible] داخل ہونے پر ان لڑکوں پر ایک ٹیچر مقرر ہوا۔ طلبا کا وظیفہ ان کی تحقیق کی بنا پر پانچ روپے
[illegible] انگریزی میں کو دیا مدرسے کے بورڈنگ میں جو لوگ رہتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ سید محمد تقی
[illegible] سال ان سے چھوٹے اور چار سے بھائی علی نقی، محمد ہادی، محمد باقر سید بند مستقل طور پر مدرسے میں
[illegible] میں رہا اور [illegible] جلوس واجد علی شاہ میں اما باڑہ آصفی چلا گیا۔ غفران مآب کے پوتے
[illegible] سید محمد تقی جن کا بعد وفات [illegible] آپ لقب ہوا مدرس اعلیٰ پرنسپل تھے۔

مدرسہ [illegible] جواد تو علامہ سید نظام حسین کنتوری نے حسینیہ ممتاز العلماء میں قائم کی تھی مگر کچھ تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ جب
[illegible] اور کام آگے بڑھا تو ممکن ہے کہ یہ مدرسہ بھی نئے شاہی علاقے میں منتقل ہوا۔ ثابت لکھنوی حیات دبیر
[illegible] [illegible] کے قریب مدرسہ ایمانیہ کے یہ بزرگوار منتظم اعلیٰ تھے اور ارسکا اس زمانے میں دبیر و انیس زندہ تھے۔
[illegible] اور فضیلت کی بحث ہر جلسے اور ہر طبقے میں ہوتی تھی۔ مدرسہ ایمانیہ کیوں اس سے مستثنیٰ رہتا ہر چند شاعر کہا کریں کہ یاں؟
[illegible] کے بڑے اور مدرس لاکھ کوشش کریں کہ شعر و شاعری کا چرچا مدرسے میں نہ ہو کہ اس سے لڑکوں کے سبق یاد کرنے میں
[illegible] مگر لڑکے کب مانتے ہیں وہ یہی زمانہ تھا کہ میاں مشیرؔ نے کہا ہے

جھگڑا ابکر کا ہے نہ جناب امیر کا　　اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

[illegible] کی جنگ آزادی میں وطنی سرفروشوں نے مقبرے میں توپیں وغیرہ لگا کر خوب قلعہ بندی کی تھی جس سے انگریزوں کی
[illegible] امدادی فوج کو جو [illegible] ستمبر [illegible] کو زیر کمان جنرل اوٹرم OUTRAM و جنرل ہیولاک HAVELOCK بیلی گارد کے
[illegible] کو نجات دلانے آئی تھی بے پناہ نقصان پہونچا تھا مگر ۱۲ مارچ [illegible] کو انگریزی فوج کا ایک دستہ مقبرے کے صحن تک
[illegible] میں کامیاب ہوا اور وہاں سے انھوں نے قیصر باغ پر یک دم دھاوا بول دیا اور اس کے اندر داخل بھی ہو گیا شروع
[illegible] مقبرے کے چاروں طرف دیدہ زیب چمن بھی تھے جن کی آرائش و زیبائش خوشبودار پھولوں اور طرح طرح کے خوشرنگ
[illegible] دلفریب پودوں سے کی گئی تھی ان کے علاوہ جابجا سنگ مرمر کے جاذب نظر فوارے بھی لگے تھے جنھوں نے اس پر فضا
[illegible] کی دلکشی اور رعنائی میں چار چاند لگا دیے تھے [illegible] میں جب انگریزوں کا لکھنؤ پر دوبارہ تسلط ہوا تو انھوں نے پہلے تو
[illegible] مقبرے میں فوجی ساز و سامان جمع کیا پھر فوج کے پادریوں کے حوالے کر دیا جو چند سال تک اس کو بطور کلیسا (گرجا گھر) کے
[illegible] استعمال کرتے رہے مقبرے کی چار دیواری منہدم کرا کے خاص مزار کی کل دوکانیں و عمارتیں بھی بڑھا دیں اور فوارہ وغیرہ کھود کر
[illegible] برابر کر دی۔

[illegible] شاہ معزول یعنی نواب فخر الدولہ سرفراز الدولہ اشرف السلطان [illegible] طلب بہ افسر بہو صاحبہ نے حکومت کے ارباب بست و
[illegible] مقبرے کی واگذاشت کے لئے درخواست بھی دی مگر حکام نے آپ کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی آخرکار جب فوج نے از خود
[illegible] کر دیا تو موصوفہ کو مقبرے کی نگہداشت اور انعقاد مجالس کا حق حاصل ہوا۔ ان کی رحلت پر مقبرہ ان کی بیٹی بادشاہ

[illegible]

[illegible] صاحب کے قبضے میں آیا جنہوں نے پہلی لڑائی کے بعد کمپنی کا انتظام اور اہتمام [illegible]
آخری دور میں مقبرہ اور پھاٹک کے درمیان جو پہلے گھاس کا میدان تھا اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فروخت کر دیا گیا [illegible]
مقام پر مختلف اشخاص کی عمارتیں بن کر ایک نئی بستی قائم ہو گئی اور مقبرے سے متصل جانب مغرب ایک [illegible]
کر کے مقبرے کو آہنی کٹہرے سے محصور کر دیا گیا جس کی وجہ سے مقبرہ اور پھاٹک میں کوئی رشتہ اور [illegible] باقی نہیں [illegible]
مقبرے کی شان و شوکت میں بھی فرق آ گیا گبنس صاحب GUBBINS چیف کمشنر کی کتاب بغاوت اودھ [illegible] IN OUDH [illegible]
میں مقبرے کی تصویر ہے جس میں غلام گردش، چمن، فوارے وغیرہ سے پھاٹک سب موجود ہیں۔[1]

سڑک مقبرے کا ایک واقعہ اور عمارت مقبرے کا تذکرہ تاریخ بھٹوا مئو میں

فاصل واقعہ نگار تاریخ مذکور میں رقمطراز ہے۔ راجہ تجمل حسین خاں [illegible] وفات یہ ہے کہ ۴ر جون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ سے بارہ بنکی اپنے بھانجے شیخ [illegible] تیموری کی ایک ضرورت سے آ رہے تھے گرمی کے سبب عمدہ شکرم کی [illegible] بیٹھے اور گاڑی کے اندر ملازمین وغیرہ تھے۔ قیصر باغ سے نکلتے وقت نواب سعادت علی خاں بہادر کے مقبرے سے متصل سڑک [illegible] پر گاڑی اُلٹ گئی گرنے سے داہنے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ابرو پر بل نہ تھا ڈاکٹر دشا سول سرجن کا علاج ہوا قیصر باغ پلنگ پر [illegible] گئے پاؤں جوڑ گیا ایک روز امتحان کے لئے پاؤں اٹھایا پھر اکھڑ گیا۔ راجہ نواب علی خاں تعلقہ دار سلیم پور عیادت کو [illegible] چہرے کا رنگ بہت متغیر پایا کہا معلوم ہوتا ہے اس وقت درد کی شدت ہے اور آپ ضبط کر رہے ہیں کراہ لیجئے تو تسکین [illegible] فرمایا ہاں بھائی اگر اس علاج سے فائدہ ہو تو مجھے عذر نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے کراہنا نہیں آتا تم کراہ کے سکھا دو [illegible]
مقبرے کا ایک پھاٹک باقی ہے جس کے بند کرنے سے آثار قدیمہ سے محبت رکھنے والوں نے قومی آواز لکھنؤ مورخہ [illegible]
میں احتجاج کیا ہے۔

مقبرہ سعادت علی خاں پر افسران نزول کی رپورٹیں :- اس عنوان کے خلاصے پر ہم چند رپورٹیں حکام وقت کی [illegible] ہیں جن سے حالات پر روشنی پڑتی ہے اسسٹنٹ کمشنر کے اجلاس کی پہلی تحریر۔ شرافت پناہ سید کرامت حسین [illegible] بمعانیت باسعند چٹھی صاحب کمشنر بہادر نمبری ۱۵۳ مورخہ ۱۳ اگست سنہ حال ترسیل چٹھی سکریٹری چیف کمشنر بہادر نمبری [illegible] ۸ اگست ۱۸۵۹ء اس مضمون سے کہ صحت الدولہ نے عرض گزرایا بابت قبضہ پانے مقبرہ مفصلہ ذیل کے اس کا حال [illegible] کیفیت لکھو کہ اب وہ کس کے قبضے میں ہے اور اس کے واگذار کرنے میں کچھ تکلیف تو کسی کو یا حرج سرکار ہوگا یا نہیں [illegible] کربلائے حسینی یعنی مقبرہ نصیر الدین حیدر، مقبرہ سعادت علی خاں، مقبرہ جناب عالیہ، مقبرہ جنت مکاں، امجد علی شاہ صاحب [illegible] تم کو لکھا جاتا ہے کہ ان مکانات میں کون کون لوگ رہتے ہیں اور کیا حال ہے اور نزول میں درج ہیں یا نہ اگر [illegible] ہوں تو بحکم صاحب کمشنر بہادر نزول ہو چکے ہیں حال مفصل اس کا دریافت کر کے لکھو تحریر بتاریخ ۲۰ اگست [illegible] پر جو جواب لکھا گیا وہ حسب ذیل ہے گذارش ہے کہ مقبرہ نواب سعادت علی خاں حسب الحکم پروانہ مورخہ ۱۵ [illegible] بصورت ڈاکٹ صاحب کمشنر بہادر نمبر ۱۸۵ مورخہ ۱۰ مارچ سنہ حال نزول ہوا اور سالہا سال میں اس میں [illegible]

---

[1] اقتباس مضمون نیا دور بابت دسمبر ۱۹۵۹ء کا متن
[2] آثار یادگار ص ۱۵۸

لا مقبرہ امجد علی شاہ بن گیا۔ بالفعل انتھونی صاحب اس میں فروکش ہیں ۱؎ مقبرہ جناب عالیہ درج رجسٹر نزول جیں
پہلے مقبرے بعد شاہی میں کشمیری لوگ رہتے تھے اسی طرح اب بھی رہتے ہیں ۲؎ مقبرہ امجد علی شاہ حسب الحکم بہادر
مورخہ ۱۸۵۸ء بصدر چٹھی سکریٹری چیف کمشنر نمبر ۴۹ و ڈپٹی کمشنر صاحب کمشنر بہادر نمبری ۴، نزول قرار پایا اور اس
بجائے گرجا گھرے اگر واگذار ہو جائے گا تو ہر دو گرجا گھر کا ہوگا ۳؎ کربلائے نصیر الدین حیدر بموجب حکم پروانہ مورخہ ۱۰ ار
جون ۱۸۵۹ء بموجب ریذیڈنٹ صاحب کمشنر بہادر مندرج رجسٹر نزول ہے اور ٹھیکہ اس کا ۴۰ روپیہ بصرف سرکار بنام جوہری
کے ہے ۴؎ کربلائے تربیت بموجب پروانہ ۲۷ رجون ۱۸۵۹ء بعد و رپورٹ کمشنر بہادر نمبر ۶۵۲ مورخہ ۲۱ رجون ۱۸۵۹ء نزول
قرار پایا اور ٹھیکہ اس کا ۲۰۰ روپے پر بصرف سرکار بنام بھگن کے ہے۔ کیفیت یہ تھی:۔ گذارش ہے کمترین کرامت حسین
سپرنٹنڈنٹ نزول کی آخری رپورٹ مورخہ ۱۹ راکتوبر ۱۸۵۹ء سے واضح ہوتا ہے کہ مقبرے کی زمین مع مقبرہ مرشد زادی دس
بیگہ تھی مقبرہ سعادت علی خاں حسین آباد ٹرسٹ سے متعلق ہے اور عشرہ محرم میں روزانہ مجلسیں ہو کر عمدہ حصہ تقسیم ہوتا ہے۔
غریبوں کا بھلا ہوتا ہے نواب کی رحلت کے وقت سترہ کروڑ روپیہ خزانہ اودھ میں جمع تھا کوس پہیہ نواب کی ایجاد تھا جو
سواریوں میں لگانے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کتنی راہ طے کی۔

مقبرہ مرشد زادی:۔ مقبرہ نواب سعادت علی خاں کے پہلو میں جانب مشرق نواب موصوف کی شریک حیات خورشید زادی
کا مقبرہ ہے جو نواب کے مقبرے سے تاؤ بھاؤ میں چھوٹا ہے مگر وضع قطع میں اس سے بہت مشابہ ہے مقبرہ سعادت علی خاں پر جو
یلغار زمانے کے ہاتھوں ہوئی اس میں ان کی رفیقہ حیات کا مقبرہ بھی برابر سے شریک رہا اس عمارت کو سرکاری کاغذات میں
مرقومہ بالا لفظ سے یاد کیا ہے غازی الدین حیدر بہادر انھیں خورشید زادی سے بتاریخ ۴ راگست ۱۷۶۹ء بنیاد منزل میں روز
چہارشنبہ پیدا ہوئے تھے اس خاتون کی قبر بھی تہ خانہ میں ہے۔

خاص بازار

قیصر باغ کے پھاٹک سے پہلے جو بازار تھا اس میں بلند طبقے کے امراء و رؤسا اور ارکان سلطنت کے لئے خریداری تھی
عام لوگ اس مارکیٹ سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید نہیں سکتے تھے مقبرہ سعادت علی خاں خاص بازار ہی میں تعمیر ہوا اور غازی الدین
حیدر بہادر کی رہائش زمانہ ولیعہدی میں اسی بازار میں تھی۔

طاہر پیر کا میلہ:۔ خاص بازار میں طاہر پیرؒ کا میلہ بڑی
چہل پہل اور دھوم دھام سے ساون میں ہوتا تھا۔

جعفری پریس:۔ خاص بازار میں یہ چھاپہ خانہ باہتمام
محمد جعفر اعلیٰ کتابت و طباعت کے نشریات میں ہر طرف سے خراج
تحسین و آفرین حاصل کر رہا تھا ۱۲۶۲ھ کی چھپی ہوئی کتابیں
ذخیروں میں موجود ہیں ایک کتاب کا ٹائٹل پیج ملاحظہ ہو جو

افوض امری الی اللہ

للہ الحمد والمنہ کہ از تصانیف ملا محمد باقر مجلسی علیہ الرحمہ

رسالہ حدود

در ۱۲۶۲ ہجری نبوی مطبع جعفری واقع خاص بازار

باہتمام محمد جعفر علیہ طبع پوشید

۱؎ رسالہ نیا دور بابت جولائی ۱۹۵۸ء ۲؎ رسالہ حدود مجلسی اس مطبع کا اصل شاہکار میرے پاس ہے۔

[illegible] بڑے سائز سفید کاغذ پر مجلد میرے سامنے ہے۔ پہلے صفحے پر جو اقلید الدر الی قسم کے گل بوٹے [illegible] کی خوبصورتی کا اندازہ دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے کتاب ۱۴۴ صفحے کی ہے۔

<u>مصاحب منزل</u>:۔ مقبرہ سعادت علی خاں کی دس بیگھہ آراضی پر تعمیرات کا پہلا اثر غازی الدین حیدر کے مکان کی جگہ پر [illegible] شاہ دریا ہوا اور داروغہ نزول کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں کی کچھ دوکانیں کھدیں اور بعض مکانات عہد واجدی میں [illegible] تعمیر ہوئے محلسرا قدیم کا کچھ حصہ باقی تھا جو عمارتیں بن کر تیار ہوئیں ان کے نام رئیس منزل وغیرہ قرار پائے اور سلطان عالم نے [illegible] کا نام مصاحب منزل رکھا تھا مکانات صحن مقبرہ کے Rs 6/8 ادر آمدنی ، اقطعہ دوکانات متعلق دروازہ مقبرہ ۶/۶ [illegible] ماہوار تھی۔

<u>محلسرا مصاحب الدولہ</u> :۔ یہ عمارت قیصر باغ کے پچھم کی طرف تھی کمشنری کچہری سے قریب یہاں ایک مسجد بھی تھی اور اس سے ملا ہوا امامباڑہ بھی ہے اس میں تحصیل کا دفتر ہے اور نائب تحصیلدار اجلاس پر بیٹھتے ہیں بعض لوگ اس کو امامباڑہ انیس الدولہ کہتے ہیں۔

چینی بازار

یہ وہ بازار ہے جس میں صرف سچی چینی کے ظروف برتن ، اور دوسرا سامان فروخت ہوتا تھا جو اسی حلقے کے ارباب سلطنت کے ذوق اور ان کی اعلیٰ نفاست کے مطابق عام پبلک کے بس کی بات نہ تھی جو اس بازار سے کچھ مول لے سکیں انگریزی تعلیم پھیلنے پر تعلیم یافتہ طبقے کی زبان پر اس بازار کا نام CHINA BAZAR چائنا بازار رہ گیا جس سے سننے والے کو یہ تصور ہوتا ہے کہ کوئی چینی یا مفقود بازار کا انجیئر تھا اصل حقیقت یہی ہے جو ماضی کے گزرنے سے مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ چینی کے برتن میں کھانا پینا فقط مسلمان تمدن کا چلن ہے ورنہ اہل ہنود پتروں میں پیتل اور پیتل کی تھالیوں کو کھانے کے برتنوں میں استعمال کرتے ہیں اور بھی چینی بلند طبقے کے دسترخوان پر اس لئے کمی آتی تھی کہ وہ اثر رہ قبول نہیں کر سکتی ٹوٹ جاتی ہے۔

<u>چینی باغ</u> :۔ تاریخ میں اس کا بھی ذکر ہے اور تارہ والی کوٹھی سے گزر کر چینی باغ کا پتہ دیا ہے اور چینی باغ نام قرار پانے کی یہی وجہ ہے تمام سامان آسائش چینی کا تھا بعض واقعہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ باغ کے داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔

<u>امامباڑہ بشیر الدولہ</u> :۔ یہ امامباڑہ باغ مذکور کے پھاٹک پر جانب شرق تھا اور امامباڑہ سے ملا ہوا محمد بشیر بشیر الدولہ کا رہائشی مکان تھا غدر کے بعد یہ عمارت راجہ نوشاد علی خاں کے قبضے میں آئی انہوں نے کچھ ردوبدل کی اور عمارتوں کو اپنی کوٹھی بنا دیا۔ بشیر الدولہ کے یہاں ایک مجلس میں سلطان عالم تشریف لائے تھے جس خاص پھاٹک سے وہ داخل ہوتے تھے وہ بدستور عرصے تک قائم رہا راجہ نوشاد علی خاں کے مرنے پر یہ کوٹھی راجہ جہانگیر آباد کے قبضے میں آئی اور پرانی عمارتوں کو کھود کر جدید وضع کی کوٹھی ہی اور جہانگیر آباد پیلیس کے نام سے تبدیل ہوئی اور جب پھاٹک کا تاریخی یادگار ہونا زیر بحث آیا تو اس کی مرمت ہو گئی اور منہدم ہونے سے بچا بشیر الدولہ عہد غازی الدین حیدر میں خواجہ سرا تھے اس کے بعد نصیر الدین حیدر کے وقت میں ولایتی محل کے ناظر ہوئے۔ ان کے مرنے کے بعد زمانہ محمد علی شاہ میں نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں خدمتگاروں میں ملازم ہوئے امجد علی شاہ بہادر نے [illegible] امجد علی شاہ کی ولیعہدی کے زمانے میں واجد علی شاہ کے اسٹاف میں بھی رکھا اور اس وقت یہ ناظر محلات ہوئے اور بشیر الدولہ [illegible] حسن خدمات [illegible] یہ تاریخی واقعہ ہے کہ انہوں نے پریوں کے جلسے کو درہم برہم کیا اور داروغہ نجم النساء کے پھندے سے چھڑایا۔

[illegible] سلطنت [illegible]

[illegible] کی نفاست بھرو [illegible] اور کام کی کثرت [illegible] بشیر الدولہ نے میر جعفر [illegible]

[illegible] کا اہتمام مولوی امیر علی "جھنگی میاں" کے نواسے تھے امیٹھی سے [illegible]

[illegible] اور سلطنت کے زوال کی بنا پڑی میر جعفر مولوی کے عزیز تھے بشیر الدولہ نے میر جعفر کو [illegible] میر جعفر مولوی صاحب کو کٹہرے آئے بشیر الدولہ نے استقبال کیا اور مسلمانان شہر جمع ہوئے ان سے [illegible] شروع ہوئے۔ اس واقعہ کا [illegible] سلطنت آباد کے زوال میں ملاحظہ کیجئے ۱۸۵۷ء میں جب فتنہ و فساد کی آندھیاں چل رہی تھیں تو بشیر الدولہ کے مکان کے سامنے بھی [illegible] ۲۰ ستمبر کو جنرل اوٹرم نے کہا کہ ہم آج بیلی گارد میں جا کر کھانا کھائیں گے [illegible] موتی محل پر [illegible] کر پھر وہاں سے دھاوا کیا کچھ گورے چھتر منزل میں داخل ہوئے وہاں بھی باغیوں کی پلٹن موجود تھی وہ بھاگ کھڑی ہوئی کچھ سپاہی [illegible] گئے کچھ جابجا چھپ گئے قیصر باغ سے گولے پڑ رہے تھے سب سپاہی بھاگ گئے مگر بشیر الدولہ کے دروازے پر ایک لڑکا دھاڑی کا خدا بخش نامی اور ایک نیا سپاہی نوکر ایک توپ خانہ کھینچ کر لے گئے اور [illegible] کی مدد سے گولے مارنا شروع کئے جب چینا بازار سے گولے آتے تھے اسی طرف کو مارتے تھے جو چھوٹے اسپتال سے آتا تھا اسے بھی [illegible] کرتے تھے یہاں تک گولہ باری کی کہ گوروں کو آگے نہ بڑھنے دیا پھر گوروں نے پشت سے آکر توپ لے لی اور [illegible] تھیں ان کے رسالوں پر کیلیں ٹھونک دیں وہ لڑکا بھاگ گیا غدر کے بعد بشیر الدولہ کیا ہوئے کب مرے لاش کہاں دفن ہوئی کچھ پتہ نہیں۔

امامباڑہ مفتاح الدولہ

یہ امامباڑہ مفتاح الدولہ نے اسی علاقے میں بنوایا تھا ان کا نام مرزا محمد علی خاں کپتان تھا عہد سلطان عالم میں امامباڑہ کی بنیاد پڑی عمارت جہانگیر آباد پیلس اسی سے متصل بنی ہوئی ہے اس سے زیادہ حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔

امامباڑہ اعتماد الدولہ

اعتماد الدولہ کا نام جعفر علی خاں تھا اور وہ نواب سعادت علی خاں کے بیٹے تھے ۱۸۳۸ء میں امامباڑہ بنوایا اور اسی امامباڑہ میں دفن ہوئے مقبرہ اعتماد الدولہ بھی اسی عمارت کو کہا گیا ہے ۱۹۴۳ء میں یہ بھی کھد گیا۔

مہتاب بخش

وہ کوٹھی ہے جس میں عہد برٹش سے ڈپٹی کمشنر رہتا ہے عمارت عالیشان ہے حکومت کے زیر استعمال ہونے سے اس کے نقش و نگار اور طول و عرض پر کسی نے بحث نہیں کی ہے آخری بادشاہ اودھ کا قیام بھی اس کوٹھی میں رہا ہے اور کسی جلوس کے گذرنے پر سلطان عالم اس کے برآمدے تک تشریف لے آتے تھے۔

کوٹھی دارالشفا

یہ کوٹھی جو [illegible] کے پاس JOSEPH QUIRAS نامی ایک یوروپین نے موجودہ کونسل ہاؤس کے مقابل [illegible] بنائی

[illegible] تھی

[illegible]
[illegible] ایک ہسپتال کا [illegible]
[illegible] اس ہسپتال سے منتقل ہوا کہ اس ہسپتال کے سب سے پہلے [illegible] ڈاکٹر [illegible]
[illegible] میں امجد علی شاہ نے عمارت مذکور اپنی بیگم ملکہ جہاں کو [illegible] اور انگریزوں کی [illegible]
[illegible] بھرتے ہے اب یہ کوٹھی اتر پردیش کی مجلس قانون ساز کے ممبروں کے ٹھہرنے کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے [illegible]
اس ملکہ کے نام سے موسوم کی گئی ہے [illegible] میں اسپتال کی نئی عمارت محلہ حیدر گنج میں تھی اور دارالشفا [illegible]
عمارت [illegible] شہرت اس حد پر تھی کہ اب تک یکے اور تانگے سے دارالشفا کہنے پر سواریاں یہاں پہنچ جاتی ہیں [illegible]
میں بہت لمبی چوڑی زمین باقی تھی جس پر پہلے پنج سالہ منصوبے کے تحت میں جمہوری حکومت اتر پردیش نے سہ منزلہ عمارت [illegible]
جو شروع اور آخر میں نیم دائرہ کی شکل سے مدور بنائی گئی ہے دونوں طرف کی نصف گولائی پر خوشنما عمارت [illegible] میدان میں
گھاس اور مہمانوں کی تفریح کے لئے زیادہ سے زیادہ صحن ہے۔

حضرت گنج

انگریزی دور کی سول لائن اور عہد شاہی کا وہ محلہ جو حضرت بیگم کے نام پر آباد ہوا۔ اس علاقے میں پہلے سے اونچی اونچی کوٹھیاں اور عالیشان قصر تھے قیصر باغ اور چھتر منزل سے قریب ہونے کے لحاظ سے اس کی آبادی کو زینہ پھر اس وقت بھی گلزار تھا اور برٹش راج میں بھی جنت نظیر رہا انگریزی تاجروں کی بڑی بڑی دوکانیں سی ایل ڈی مول فوٹوگرافر ویٹ وے حول مرچنٹ تمام گورے چرچوں کے دوکاندار سب سے زیادہ چوڑی سڑک ایبٹ روڈ ساری سہ پہر کو گذرگاہ منزلگاہ عام ہے سرمایہ داروں کے سوا کوئی ان دوکانوں پر سودا نہیں کرسکتا ساہے جہاں راجے شاہزادگان اور حکام کے دوکانوں پر جمع نظر آتے۔

__کوٹھی ملکہ جہاں__ :- اس محلہ میں ایک عالیشان کوٹھی امجد علی شاہ نے ملکہ جہاں کے لئے تیار کرادی تھی [illegible] میں جب غدر کا ہنگامہ آمادگیاں پورے شباب پر تھیں تو بکا اس گورے حضرت گنج کے مشرقی پھاٹک سے داخل ہوئے اور خاص بردار [illegible] میاں وامابت علی خاں کے حکم سے دونوں طرف کوٹھیوں پر چڑھ کر گولیوں کا مینہ برسایا گورے وہاں سے پلٹ گئے اور [illegible] پڑی یہ کوٹھی بھی اپنے مکین کے ساتھ فنا ہو چکی۔

__سبطین آباد__ :- سرائے میٹھو خاں کا حال سابق کے صفحات میں گذرا رسالدار موسومی کی چھاؤنی میں حضرت [illegible] کے دفن ہونے پر یہ امامباڑہ واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے میں تیار کیا اور اپنے باپ کی بہترین یادگار [illegible] پر رکھی ڈالی اس عمارت کی تاریخ "آرام گاہ ظل اللہ ہے" امامباڑہ مذکور کے دوہرے پھاٹک [illegible] سامانات [illegible] صنعتیاں نقش و نگار کی خوبیاں یادگار کے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دنیا کے عبرت کو [illegible] کی [illegible] امامباڑہ [illegible] کے باوجود جس کا ذکر ہم عنقریب کرتے ہیں محفوظ رہا۔ انگریزوں کے [illegible] و [illegible] کے [illegible] شروع ہوئی۔ [illegible] کے [illegible] زمین [illegible] انگریزوں کی [illegible]

[illegible] کا لوہے کا جنگلا بھی ٹوٹ گیا ہے لاوارثوں کے سرہانے پر بھی کم نہ ہوں گی پہلوؤں پر قبریں کے بہت [illegible]
[illegible] میں چھینٹے سے ایک بالشت زمین بھی یہاں کی ایک گز قیمت کے برابر تھی اور وہ پھاٹک جو حضرت گنج
[illegible] کو فیض آباد والوں کے لیے ہاتھوں ہاتھ اٹھا لیا تھا وہ بھی بگڑنا شروع ہوا اور نواب سلطان بہادر کے زمانے سے ہوتا ہوا شہر کا
[illegible] کا ان کے بیٹے کے دور میں خاتمہ ہو گیا جو وقت سے پہلے نابینا ہو کر گوشۂ گمنامی میں ہیں سلطان بہادر لین کا مقبرہ
[illegible] ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس احاطہ میں ۵۰ برس پہلے ۱۰ صفر کو سلطان بہادر کی طرف سے ۳ بجے دن کو ایک مجلس ہوتی تھی
[illegible] بہادر جب تک زندہ رہے سہ پہر کو ہوا خوری میں ادھر سے گزرتے اور قبر پر فاتحہ پڑھتے تھے۔

[illegible]ء میں ملکہ جھنڈے کے قیصر باغ حضرت گنج سے جب گورے پٹ کر نکلے تو سبطین آباد کو قصر شاہی سمجھ کر حملہ کر دیا گولہ انداز ڈنکے مارے توپ چھوڑ کر بھاگا مصاحب الدولہ کے اردلی ان کے حکم سے توپ پر کیل لگا کر مینی کو گھسیٹ کر لے گئے جب گورے حجرہ میں آئے تو کسی نے کہا کہ یہ قبرستان ہے یہاں مردے دفن ہیں ایمان شاہی آگے ہے گورے وہاں سے نکل آئے توپ کا کچھ خیال نہ کیا۔
سبطین آباد آج بڑی کسمپرسی میں اپنے شانے والوں پر مدتے نفرین بلند کر رہا ہے اور آخری تاجدار اودھ کے پدر بزرگوار کی آرامگاہ وہاں ہے۔

اس مقبرے میں سونے والے کی مدح میں غالب نے کہا تھا ؎

شاہیکہ نخل دولت او را صلاح دین   سرسبز آبجوے لقاکرد روزگار

شمس الاخبار:۔ ۱۸۶۹ء میں حضرت گنج سے امریکن مشن نے ایک خبر جاری کیا کرتا تھا پادری مسمور اور ٹی کرین تھے ۸ برس کے بعد نام کوکب ہند رکھا گیا۔

مسجد حضرت گنج:۔ اس علاقہ میں ایک وسیع اور سربلند مسجد ہے جس کے مینار اور خوشنما گنبد داہنے ہاتھ پر دور سے دکھائی دیتے ہیں اس وقت مسجد کی آمدنی اور ایک پہلو میں پھاٹک سے قریب انگریزی ڈسپنسری اور ایک اسپتال ہے جہاں بیماروں کو دوا ملتی ہے صحن مسجد میں حوض پمپ دست چپ پر کچھ عمارت اور پشت پر بھی بالائی حصے کے عقب میں آثار قدیمہ ہیں اور مسجد میں خاص بات یہ ہے کہ امام جماعت کے آنے کی جگہ اندرون محراب اور عقب سے ہے یہ بات صرف اسی مسجد میں ہے متعلقہ آمدنی پر دوسرے لوگ قابض اور وقف حسین آباد کے زیر انتظام ہے مسجد کا مؤذن با تنخواہ ٹرسٹ کی طرف سے اذان دیتا ہے۔

میر حید ملک کی تحریک پر جب مولوی امیر علی جنگ آزادی کے پہلے حامی لکھنؤ پہونچے تو مسجد حضرت گنج میں مع پچاس ساٹھ جانبازوں کے ٹھہرے اور بشیر الدولہ کی طرف سے خاطر و تواضع ہوئی نواب علی نقی خاں سے ملوایا اور بر وقت ملاقات پہلے آپ نے سلطان العلماء مجتہد العصر [illegible] کا فتویٰ نواب کے ہاتھ میں دیا جس کا مضمون یہ تھا " حکام عصر را بمناسبت حکم شرع دفع شر کفار از اہل ایمان و اسلام و اجرا حدود بر محاربین مشرکین و قصاص خون مسلمانان واجب است " نواب نے بقول فسانۂ عبرت فتویٰ پڑھ کر عرض کیا کہ ہم مجتہد العصر کی تحریر پر عمل کریں گے مسجد بنا دیں گے اور انتظام بھی لیں گے۔

[illegible] کا گرجا:۔ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کے روبرو [illegible] کا گرجا انگریزوں کے قدیم آثار میں ہے۔

پینالن PENHEALLAN ۔ حضرت گنج میں ایک انگریز موسیو [illegible] کا نیلام گھر تھا جو جملہ اسباب اور گھر کا سامان وغیرہ کو نیلام کرتا تھا اور شہر کے بڑے لوگ اس نیلام سے اپنی ضرورت کی اچھی چیزیں سستے دام میں خرید لیتے تھے [illegible] تذکرہ کرنا تیرھویں صدی کے لکھنؤ میں" ناقابل تلافی تھا

منشی نولکشور پریس

عہد شاہی کے پریس ختم ہوتے ہوتے انگریزی حکومت میں بمقام حضرت گنج ایک چھوٹا پریس تھا جس کے انتظامات یا کسی وجہ سے باقی نہ رکھ سکے اور نولکشور کو جو کہ نورالہدیٰ سے علیحدہ ہو گئے تھے سپرد کر دیا۔ نولکشور نے پیسہ لگا کر چھاپہ خانہ کو نومبر ۱۸۵۸ء میں اپنایا اور مضبوط بنا دیا اور رفتہ رفتہ مطبع نے فروغ حاصل کیا عہد برطانیہ کا یہی پہلا پریس ہے جس میں کام کی بہتائی مذہبی اسلامی کتابوں کی طباعت میں احتیاط پریس کی مقبولیت کا اساس ہوئی اور سرمائے اس پریس کی موجودگی میں عہد شاہی کے مطابع کو ٹھپ کرنا شروع کیا ان مطابع کا زوال اور جدید مطبع کا عروج شروع ہو کر علمی حلقوں میں ہر طرف نولکشور کا نام آ گیا۔ اور انصاف پسند طبقہ آج یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ نولکشور کا مسلمانوں پر خصوصی احسان ہے کہ انہوں نے سنی شیعہ فریقین کی کتب اس وقت چھاپنا شروع کیا جب عیسائیت اسلام کو کچلنے کے سامان کر رہی تھی اور نولکشور کی تجارت کے فروغ میں مسلم امراء و رؤساء کے سرمائے نے جڑوں کو ایسا مستحکم کیا کہ وہ سرکاری خطابات اور اعلیٰ عزت کے مستحق قرار پائے ۱۸۵۸ء میں روزانہ اودھ اخبار جاری کیا پھر "تفریح" ایک پیسے کا ہفتہ وار اخبار نکالا ۱۹۱۲ء کے بعد "تفریح" بند ہوا اور ۱۹۳۲ء میں اودھ اخبار بھی ختم ہو گیا۔

نولکشور کے کارکنان پریس میں اشرف علی نسخ و نستعلیق کے بہترین ماہر تھے نور خاں طغرا نویسی میں استاد تھے احمد علی عکس نویس تھے اور یہ بھی مدت ۱۹۳۱ء تک رہ چکے تھے۔ پریس میں ابتدائی زمانے میں امیر بیگ اور نواب علی تھے جو آخر میں گورکھپور چلے گئے تھے اور حکیم برہم مدیر مشرق گورکھپور نے ان کو نوکر رکھا تھا مصحح ۱۸۸۸ء میں سید عنایت علی زیدی مارہروی تھے ان کے بعد مولوی سید تصدق حسین صاحب کنتوری اور آخر میں مولوی سید مظفر حسین صاحب مرحوم معاصر تصحیح کرتے تھے نولکشور کو سی آئی اے کا خطاب تھا اور مسلمانوں کی کتابیں زیادہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ چھپتی تھیں سنی کارکن اہلسنت کی اور شیعہ مذہب امامیہ کی کتابیں کافی احتیاط سے چھاپتے تھے۔ انیس و دبیر مرثیہ گو شعراء کے کلام کی نشر و اشاعت میں نولکشور نے وہ خدمت ادب انجام دی جو بے نظیر ہے واقعہ کربلا کی ایک کتاب میں وہ خود اپنے کارکنوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کارپردازان مطبع نے چاہا کہ اب کی مرتبہ اس کتاب لاجواب کی طبع میں ایسا اہتمام ہو کہ یادگار زمانہ ہو خیالات چند کاتب اور مصحح اور مطبع سنگ اور چھاپنے والے سب کے سب اثنا عشری ہوں تاکہ ایک نقطہ کی بھی تحریف و تصحیف ہونے نہ پائے۔ (خلاصۃ المصائب ص ۴۳۵) اس کتاب کے ساتھ روضہ امام حسینؑ کا ایک نقشہ بھی طبع کیا جو حاجی محمد علی کربلائے معلیٰ ۱۲۶۲ھ کے سفر میں تیار کر کے لائے اور فہرست کتب خانہ میں اس ایڈیشن کی خصوصی تعریف سے خریداروں کو رغبت دلائی اور مطبع کے اہتمام پر متوجہ کیا۔ نولکشور کی موت ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ ان کے بیٹے کا نام جگل کشور تھا۔ آخر میں پریس سیٹھ کیسری داس سپرنٹنڈنٹ پراگ نرائن کی زیر نگرانی چلتا رہا اور آخر میں وارثوں نے بٹوارہ کرا لیا مطبع کی شاخ کانپور سرسیا گھاٹ میں کھل گئی۔

شکرم

[illegible] میل گھنٹے سے پہلے قریبی دیہاتوں میں یکے اور دور کے قصبات میں شکرم (گھوڑا گاڑی) چلتی تھی [illegible]
شکرم چلانے کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور شکرم اسی پالکی گاڑی (بگھی) کو کہتے تھے جس کا [illegible] گاڑی اڈی کے [illegible]
[illegible] شکرم لکھنؤ سے براستہ بریلی ۴۹ میل کا راستہ ۶ گھنٹے میں طے کرتی تھی اور فی نفر ایک روپیہ آٹھ آنے کرایہ تھا۔ چھ آدمی
گاڑی میں بیٹھتے تھے اور چھ جگہ گھوڑے بدلے جاتے تھے (۱) کٹھوارہ (۲) ہرچند پور (۳) نگوہاں (۴) بچھراواں (۵) موہن لال
گنج۔ اس تاریخ کی ترتیب کے وقت بعض بوڑھے زندہ ہیں جو شکرم پر سفر کر چکے ہیں گھوڑے پانچ کوس پر بدلے جاتے تھے۔ [illegible]
تک شکرم چلتی تھی۔

اونٹ گاڑی



کہا جاتا ہے کہ اونٹ گاڑی کا مرکز کسی حضرت گنج
تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ مدہے سنگھ کی سرا سے اونٹ
گاڑی پر مسافر بیٹھتے تھے اونٹ گاڑی ۴ بجے دن کو
لکھنؤ سے چھوٹ کر دوسرے دن شام کو ۴ بجے رائے بریلی
پہونچتی تھی چھ آدمی نیچے اور چھ آدمی اوپر بیٹھتے تھے اوپر بیٹھنے
والوں کو اونٹ کی پشت سے قریب ہونے کی بدبو سے تکلیف رہتی
تھی ظریف کے کلام میں بھی اونٹ گاڑی کا ذکر ہے۔ اونٹ گاڑی کی تصویر یہ ہے۔

امامباڑہ انیس الدولہ:۔ یہ امامباڑہ چھوٹے میاں (دھاڑی) سے دہلی سے آکر بنوایا تھا سلطان عالم کے زمانے میں ہوئی اور بانی امامباڑہ
کا فروغ بھی اپنے کمال فن میں ہوا۔ یہاں اس وقت مدرسہ [illegible] کا دفتر ہے۔

امامباڑہ غلام حسین خاں سائیس:۔ غلام حسین کا تعلق شاہی اصطبل سے تھا اور اس نے وہ فروغ حاصل کیا تھا جو اس کے ہمجنسوں
کو نصیب نہیں ہوا۔ اس عمارت کے عقب میں چھوٹے تحسین کی جائیداد تھی جس کا ذکر گذرا۔

قیصر باغ

روم کے ہر بادشاہ کو قیصر کہتے ہیں حالانکہ رومی زبان میں قیصر صرف اس طفل کو کہتے ہیں جس کی ماں اس کے پیدا ہونے سے پہلے
مر جائے اور پیٹ چیر کر اس کو نکالیں چونکہ شاہان روم کا پہلا تاجدار اغسطوس اسی طرح پیدا ہوا تھا اس لئے اس کو قیصر کہا گیا اور اس
کے بچ جانے اور طول عمر ہونے اور سلطنت کے تعجب خیز کمال کو دیکھ کر اس دن سے ہر بادشاہ کو قیصر کہنے لگے۔

رفتہ رفتہ لفظ نے غیر ملکی ارتقا حاصل کیا اور لقب ہندوستان تک پہونچ کر گلی گلی پہونچا اور آخری تاجدار اودھ ابوالمنصور
ناصر الدین سکندر جاہ، بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ غازی نے اپنی آخری یادگار کا نام قیصر باغ

۱؎ نصیر الدین ہاشمی [illegible] نے اپنے ایک مقالے میں شکرام لکھا ہے اور میرے خیال میں یہ تصرف اسی طرح ہے جیسے [illegible] گاڑی کیا [illegible] بجائے [illegible]
ہے (قومی آواز ۳ نومبر ۱۹۵۸ء)   ۲؎ ذات یقین محظوظات   ۳؎ نصیر اللغات

[illegible] مستحکم عمارتیں جو نسبتاً بہ مقابلہ پورے شہر کو قیصر باغ سے حاصل ہے یوں تو نوابی کی عمارتیں الگ [illegible]
[illegible] اسلوب سے بنائی گئی ہیں لیکن قیصر باغ کی عمارتیں الگ رنگ رکھتی تھیں قیصر باغ نے مکمل ہو کر واجد علی شاہ کی شان [illegible]
[illegible] عمارت کو ۱۸۴۸ء میں شاہ نے بنانا شروع کیا اور صرف دو سال ۱۸۵۰ء میں بن کر تیار ہو گئی [illegible]
[illegible] کے سامان تک اسی لاکھ روپے صرف ہوئے پھاٹکوں پر حبشی سواروں کا پہرہ تھا یہ قوم بڑی وفادار [illegible]
پائی گئی تھی کبھی کسی حبشی نے مالک کے ساتھ غداری نہیں کی سلطان عالم جس دروازے سے برآمد ہوتے تھے اور جہاں [illegible]
بیٹھتے تھے اس گیٹ کی تیاری میں ایک لاکھ روپے صرف ہوئے تھے جان عالم کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ قیصر باغ تھا مگر اس کا [illegible]
اور حسین ترین حصہ جو چینی بازار گیٹ کے اندر تھا ۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہوا تو توپ کے ہاتھ سے مسمار
ہوا۔ جن عمارتوں میں بادشاہ بنفس نفیس رہتے تھے ان کا اب پتہ بھی نہیں ہے اس سربلند قصر کو دیکھنے کا ہر شخص کو اشتیاق
رہتا تھا اب صرف وہ حصہ باقی ہے جس میں بیگمات اور محبوبات رہتی تھیں اس وقت سے انگریزوں کے راج تک بھی طرح طرح تعمیرات و تبدیلی ہوتی چنانچہ [illegible]

HIS EXCELLENCY THE EARL OF DUFFERIN VICEROY AND GOVERNOR GENERAL OF INDIA ——————

لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے ——————

وقت کا البم قیصر باغ کے جو مناظر دکھاتا ہے اس کی اب جھلک بھی موجودہ قیصر باغ میں نہیں ہے بیشتر تصاویر میں نمایاں فرق ہے اور
فوٹو نمبر ۱۱۵ جس میں قیصر باغ میں ناریل کا درخت دکھایا گیا ہے اس کا اس وقت کہیں پتہ نہیں ہے یہ وہی ہرا بھرا درخت ہے جس
کے سائے میں شاہ گیروے کپڑے پہن کر فقیرانہ بھیس میں بیٹھتے۔ عمارت کے پھاٹک پر دو جل پریاں اور تاج شاہی ماڈل اب تک
نظر آتا ہے۔ لکھنؤ میں ایک سادہ کار حافظ اکرام تھے جن کے باپ کا نام اسمٰعیل تھا وہ سادہ کاری میں ممتاز کاریگر تھے مغل قوم سے
ان کا تعلق تھا سو برس سے زیادہ کی عمر میں ان کی موت واقع ہوئی غدر کے بعد گوشہ نشین ہی تھے ملک حکومت جانے کے صدمے میں گھر سے
نکلنا چھوڑ دیا تھا اس وقت کے لوگ کھانے پینے میں استغنا کی نعمت سے مالا مال تھے آج کل کی ایسی قدم قدم پر زحمتیں، بیماریاں اور
مصائب نہ تھے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہی نہ تھی پھر بھی زندہ حال ہوتے ہوئے دو دفعہ گھر سے باہر نکلے ان کے دادا سلطان عالم کے
خاص ملازم تھے اور یہ تمام مناظر عیش و طرب اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے پہلی دفعہ اما ماتم آصف الدولہ پر لڑکی اور دوسری دفعہ
قیصر باغ کو دیکھا تو صدمے سے تین وقت بے آب و دانہ رہے اور اس کی بیسری یاد کر کے صدمہ اٹھایا۔ قیصر باغ کی بنیاد سے پہلے عہد نواب
سعادت علی خاں میں یہاں جو عمارتیں تھیں پہلے ان کا حال ملاحظہ ہو۔

<u>بادشاہ منزل</u> :۔ اپنے زمانے میں مشہور عمارت تھی جس میں مختلف قسم کے جانور لڑائے جاتے تھے شیروں کی لڑائی کا مقام [illegible]
کٹہرے اور پنجروں کی جگہیں تماشائیوں کے ٹھہرنے کے مقام لیے سلیقے اور بہترین نقشے کے تحت میں تیار کیا تھا جو فقید المثال تھا۔ [illegible]
کوٹھی کی عمدگی اور ساخت کے اعلیٰ پیمانے پر ہونے نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ قیصر باغ کے نقشے میں اس کو اپنا لیں لفظوں میں [illegible]
[illegible] طاقت نہیں جو یہاں کی تصویر کھینچی جائے۔

<u>خاص باغ</u> :۔ بادشاہ منزل سے قریب تھا یہ وزیر مستغنی عن البیان خصوصیات اسم کا حسن کے ذمہ دار۔

<u>چاندی والی بارہ دری</u> :۔ اس بارہ دری کی چھت میں چاندی کے پتر اور وہ نقش و نگار تھا جو نہ دیکھا نہ سنا۔

[illegible] :- اس عمارت کی خصوصیت یہ تھی کہ چالیس گز لمبا اور پندرہ گز چوڑا پانی کا حوض تھا جس میں فوارے لگے [illegible]
[illegible] اس حوض میں مصنوعی مچھلیاں بنائی گئی تھیں۔ جس کا نمونہ کسی باغ میں نہ تھا پانی موتی کی طرح چمکتا تھا۔

[illegible] منزل :- خالص ہی شام کے بیٹھنے کے لئے دھوپ کے رُخ پر بنائی گئی تھی اور رنگستانی کے بیچوں بیچ ایک [illegible] میں تھا جو نہایت حسین تھا۔

مکان خاص :- گومتی کے دن سیر کرنے کے لئے شہنشاہ منزل کے سامنے اس عمارت کی تعمیر ہوئی یہاں کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔

[illegible] سیر :- برسات میں شاہ کا قیام رہتا تھا صحن میں خوبصورت بنگلہ تھا درختوں کا حسین منظر انتہائی نظر افروز تھا۔

[illegible] بارہ دری :- اپنی انتہائی شکوہ اور عظمت کے ساتھ آج بھی موجود ہے گورنروں کی پارٹیاں سرکاری دربار اور آخر یادگار [illegible] کے اجلاس سنہ [illegible] میں یہاں ہوئے یہ برمحل تعریف تھا اس لئے کہ بادشاہ نے اس کا نام قصر بکار رکھا تھا۔ اس عمارت کو بیتر وافی بارہ دری بھی کہتے ہیں تعلقہ داران اودھ کی بعض شادی بیاہ کی تقریبیں بھی یہاں ہوا کرتی ہیں مگر اندرونی نظارے سے واضح ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اما مباڑہ شاہی تھا میرانیس اس کوٹھی میں مجلس پڑھ چکے ہیں اور حکومت کی خاص بلڈنگ ہوتے سیاح عام طور پر دیکھ نہیں سکتے جو ہم تفصیلی نقشہ کشی کریں۔

لال بارہ دری :- یہ سرخ رنگ پھری ہوئی بہت ہی عالیشان عمارت ہے جو میوزیم (مردہ عجائب خانہ) کے نام سے آج بھی موجود ہے عجائب خانہ میں مگر مچھ گھڑیال بڑے جانوروں کے مجسمے اور اوپر جملہ عجائبات عالم چرند پرند مصنوعات و تصاویر و آثار قدیمہ [illegible] نقارے، چھریاں وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ہے۔ پھاٹک کے زینے ختم ہونے پر دفتر ہے جس میں آثار قدیمہ کی لائبریری اور [illegible] منیجر رہتے ہیں تصاویر کے فریم میں ۳ برس پہلے شیعہ علما کے تصاویر بھی تھے جو اب تعیر و تبدل میں جگہیں تبدیل ہونے [illegible] سے نظر آتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عمارت[1] عہد سعادت علی خان کی تعمیر ہے اور قصر السلطان اس کا نام تھا اور صحیح یہ ہے کہ یہ بارہ دری غازی الدین حیدر کی تیار کردہ[2] ہے اور تاج و تخت سلطنت اسی میں تھا۔

سنگی بارہ دری :- اس عمارت کو بادشاہ نے کربلائے معلی سے آنے والے زائروں کے ٹھہرنے کے لئے بنوایا تھا اور ان کی تجویز سے زوار عام مہمان خانے میں نہیں روکے جاتے تھے بلکہ ان کے لئے خاص عمارت تھی اس بلڈنگ کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

فرمود این بارہ دری سنگین لعبد حو بی بہا — از بہر تشریف آوری و مقدم شاہ امم
از حسن نیت چونکہ نذر چہار دہ معصوم شد — نظارہ عتبات عالیات گردیدہ ہم
آید چو کس بہر زیارت اندران رضوان دہد — آواز طبتم فادخلوھا خالدین در ہر قدم
قمشیر چو تاریخ آن پرسید الروح الامین — گفتہ مکرر از ادب قصر ارم قصر ارم ۱۲۶۵ھ

[illegible] شاہ پسند درخت :- قیصر باغ میں وہ درخت یادگار ہے جس کے نیچے سنگ مرمر کا فرش تھا اور اس کے تلے شاہ جوگی کپڑے [illegible] پہنے میں بیٹھتے تھے۔ ایسا درخت کسی نے دیکھا نہ منظر دیکھنے والوں کو مدتوں بھولا اس درخت کا فوٹو لارڈ ڈفرن گورنر [illegible] کے البم میں تھا جو میرے پاس اصل کاپی موجود ہے جوگیوں کا میلہ ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۲۹ھ سے شروع ہوا۔

---

[1] [illegible] لکھنؤ [2] [illegible] احسن التواریخ صفحہ

[illegible] اور [illegible] کا سلسلہ [illegible] سے [illegible] معلوم کیا ہے کہ اودھ [illegible]
[illegible] ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ چاند شاد کی کب ہے یا یہ اصلیت ہے میرا کام واقعات کو بیان کرنا ہے [illegible]
[illegible] کی قوت ہے کہ مشہور ہے کہ اعلیٰ حضرت جہاں فقیر بن کر بیٹھے تھے وہاں جو بیمانگ تھا اس کو [illegible]
[illegible] :- شاہی پیڑ کے آگے چوک خاص شروع ہوتا تھا یہاں شاہی عورتیں رہتی تھیں اگست کے میلے میں عام پبلک کو قیصر [illegible]
[illegible] دیکھنے کی اجازت تھی۔

چشمہ حسن :- یہ سنہرے پتھر کے فرش سے تیار ہوئی تھی اور کوثر و تسنیم کی غلامی کا دم بھرتی تھی اس کی بنیاد اس قطعہ تاریخ سے [illegible]

حضرت سلطان عالم ابر جود و بحر عدل — ساحل دریائے رحمت قلزم حسن صفات

ہر سنگ ایں از عکسش باشد یاب و تاب — صورت عین کرم شد چشمۂ بحر التفات

سال تاریخش سروش غیب از شمشیر گفت — چشمۂ حسن و آبروئے منبع آب حیات

۱۲۶۹ھ

مینا بازار و کپتان بازار :- قیصر باغ[1] میں جہاں وکٹوریہ پارک ہے مینا بازار اور کپتان بازار تھا۔

باورچی خانہ :- جن زمینداروں اور علاقہ جات سے روپیہ وصول نہیں ہوتا تھا اس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بادشاہ اس آمدنی کو باورچی خانہ کا صرف لکھوا دیتے تھے اور وہ زمیندار ہرگز یہ گوارا نہ کرتے تھے اس قانون شکنی کریں اور باورچی خانہ کا صرف بند ہو چنانچہ راجہ بانسی کا وہ علاقہ جو آصف الدولہ نے ضلع بستی میں اس کو اس بات پر دیا تھا کہ اس نے لاٹھی سے ہرن کا شکار کیا تھا یہ علاقہ باورچی خانہ کے صرف میں مختص تھا باورچی خانہ میں اس کثرت سے کھانا پکتا تھا کہ نوکر چاکر اور ادنیٰ طبقے کے طالبین خوان میں کھانا رکھ کر صرف دو دو پیسے کو ایک خوان بیچتے تھے اور لوگ فیضیاب ہوتے تھے اس وقت کی صحبتوں میں بے تکلف دوست احباب مذاق میں طنزیہ کہتے کہ یہ کھانا گھر کا نہیں ہے قیصر باغ کا خوان ہے۔

واجد علی شاہ کی سیرت پر ہم نے ایک مکمل مقالہ نظامی جنتری ۱۹۵۶ء اور رسالہ الواعظ بابت ماہ مئی ۱۹۵۵ء میں [illegible] لکھا ہے اس کی تکرار کی یہاں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ہم نے کسی نواب یا بادشاہ کا پورا حال قلمبند کرنا اس کتاب کا موضوع نہیں قرار دیا ہے ورنہ بہت زیادہ طول ہو جاتا پھر بھی قیصر باغ کا حال لکھتے ہوئے اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ بادشاہ نے اس [illegible] سے کہ جو اردو ادب کی خدمت کی اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ لا تعداد نام (اسمائوں) عمارتوں اور ضروریات زندگی کے اشیاء کے تجویز کئے اور وہ اپنے وقت کے آدم تھے جن کو علم الاسماء تعلیم ہوا تھا وہ تکیہ کو آرام سر، تکیتی کو آرام پہلو، شراب کو آب حرام اور [illegible] کو منقوص، رضائی کو شب عرابی، جوتا کو آرام پائی، حقہ کو لب معشوق، تمباکو کی ہوردی کو خوش طلب کہتے تھے اور جس چیز کا جو نام رکھ [illegible] ممکن نہ تھا کہ بھول جائیں۔ اس کو اسی نام سے پکارتے تھے قیصر باغ۔ تھا ایک جنت کا نمونہ تھا جو بہت تھوڑے دن آباد رہا اور [illegible] وزارت[2] پہلے اعتماد الدولہ دلکش الملک سید حامد علی خاں بہادر جنگ کے ہاتھ میں تھا۔ انقلاب سلطنت میں خزاں آئی اس [illegible] منظر پر روشنی ڈالنا میرا تو کام نہیں ہے محمد رضا عاشق[3] ایک نمونہ کلام کا پیش کر سکتے ہیں ؎

کہوں کیا جو اس دم تھا ماتم بپا — بلا شک وہ دن تو محرم کا تھا

---

[1] [illegible] ۱۹۵۶ء — [2] خلاصۃ المصائب — [3] مثنوی محمد رضا عاشق

[illegible] مر جائیں گے — کہاں ڈھونڈیں حضرت یا پائیں گے
کوئی کہتی تھی ہائے کیا ستم — ہوا مجھ کو سونے نہ دے گا یہ غم
کوئی کہتی بیٹا ادھر آؤ تو — کدھر ہیں کنہیا خبر لاؤ تو
کوئی نوچ کے اپنے سنبل سے بال — یہ کہتی تھی رو رو کے اے ذوالجلال
مرا شاہ ہووے جو غم سے رہا — میں چوک چڑھاؤں گی مسجد میں جا
کسی نے کہا میں کروں رت جگا — ہوئے اور مریم کا جو ہووے برا
کوئی کہتی چھاتی کو یہ کوٹ کر — کہ جھاڑو پھیرے اور ہم کے بھی گھر
یہ کہتی تھی کوئی کہ شاہ نجف — بچھے گھر میں اور ہم کے ماتم کی صف
کوئی انگلی لب پہ دھرے تھی کھڑی — کوئی غش سے بستر کے اوپر پڑی

بادشاہ نظر بند ہو کر کلکتہ گئے برجیس قدر کی ہوئی مدد ہوا یہ سب حالات جہاں تک آثار قدیمہ سے تعلق تھا اپنی اپنی جگہ [illegible] قیصر باغ سے نکلتے وقت شاہ کی زبان پر تھا ـــہ

شہر پر کیا اداسی چھائی ہے — تخدار کے میں جدائی ہے
یا حسین آیئے دہائی ہے

۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریز محاصرہ قیصر باغ میں کامیاب ہوئے اور لوہے کے پل سے باغیوں کو ہٹا کر شہر پر قبضہ کیا۔
[illegible] انگریزوں کے وقت میں قیصر باغ میں ایک نمائش ہوئی جس کا عکس میرے قدیم البم میں موجود ہے اچھا اب میں رخصت [illegible] ہوئی آپ کو اس تاریخ کے پڑھنے میں ۔ معاف کیجئے گا۔

آغا مہدی الرضوی

۲۷ جمادی الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ء
(اصلاحات و کتابت بحد اہتمام رسید ۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء)



کربلا کا [illegible]



روضہ کاظمین کے سامنے
چیپ تعزیہ کا جلوس



[illegible]
اکثری مجلس [illegible]



انگریزوں کے ابتدائی عہد کے پہلے رئیس مختلف سکے

